

جدید

تحریکِ نسواں اور اسلام

www.KitaboSunnat.com

پروفیسر ثریا بتول علوی

بنت عبدالرحمان کیلانی مرحوم

سابق صدر شعبہ اسلامیات

گورنمنٹ کالج برائے خواتین، سمن آباد لاہور

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس
پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 library@mohaddis.com

جدید تحریکِ نسواں اور اسلام

پروفیسر ثریا بتول علوی
بنت عبدالرحمان کیلانی مرحوم

سابق ہیڈ شعبہ اسلامیات
گورنمنٹ کالج برائے خواتین، سمن آباد لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب	:	جدید تحریک نسواں اور اسلام
مصنفہ	:	پروفیسر ثریا بتول علوی
اشاعت اول	:	اکتوبر 1998ء
اشاعت پنجم	:	جولائی 2021ء
تعداد	:	1000
ناشر	:	قاسم گرافکس، منصورہ لاہور (0322-4464573)
کمپوزنگ	:	آغا علی حسن
قیمت	:	1200 روپے
ملنے کے پتے	:	1۔ تنظیم اساتذہ (خواتین) پاکستان 47 ایک پارک، 3 بہاول شیر روڈ تنظیم منزل، مزنگ لاہور
	:	2۔ منشورات، منصورہ لاہور
	:	3۔ 106 حبیب پارک، منصورہ ملتان روڈ لاہور
	:	4۔ مکتبہ السلام، سٹریٹ نمبر 20، وسن پورہ لاہور

انتساب

والد محترم

مولانا عبدالرحمن کیلانی مرحوم

اور

والدہ محترمہ

حافظہ حمیدہ بیگم مرحومہ

کے نام

جنہوں نے اپنی بے مثال عملی زندگی اور بہترین تربیت کے ذریعے
مجھے اسلام کے صراطِ مستقیم پر چلنے کا شعور، عزم اور حوصلہ بخشا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِمْ
دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾

”عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے کے مطابق ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ زائد حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔“ (البقرة: 228)

فہرست

7	از مصنفہ	پیش لفظ
13	کچھ باتیں نئے ایڈیشن کے بارے میں	
15	طالب الہاشمی	تقدیم
23	عطاء اللہ صدیقی	تقدیم
33	مغرب کا نظریہ مساوات مرد و زن	1
61	موجودہ مسلم معاشرے اور نظریہ مساوات مرد و زن	2
167	مساوات مرد و زن کا اسلامی تصور	3
193	گھریلو نظم میں مرد کی سربراہی	4
215	عورت کا مقصد و وجود	5
233	اسلام اور پاک دامنی	6
267	ستر و حجاب کے احکام	7
315	عورت اور معاشی مسائل	8
331	ولایت نکاح کا مسئلہ	9
361	مہر	10
377	تعدّد ازواج	11
391	مسئلہ طلاق	12
425	خلع کا حق	13
445	اسلام میں عورت کی نصف شہادت	14

475	اسلام میں عورت کی نصف وراثت	15
485	اسلام میں عورت کی نصف دیت	16
503	اسلام اور عورت کی سربراہی	17
563	غیرت کا قتل اور اسلامی احکام	18
593	صرف اسلام ہی طبقہ نسواں کا محسن ہے	19
621	قانونِ الہی نہ ماننے والے مسلمانوں کا انجام	20
629	موجودہ مسلمان عورت کی زبوں حالی اور اصلاح احوال	21
653	تذکرہ چند اولوالعزم باکمال خواتین کا	22
677	جدید مغربی نو مسلم خواتین کے اسلام کے بارے میں تاثرات	23
695	مضبوط اور باختیار عورت کون؟	24
721	ضمیمہ۔ اسلام اور ملکِ یمین	25
733	کتابیات	26
735	تبصرے	27

پیش لفظ

نَحْمَدُهُ وَنُصَلِّي عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

1994ء میں مسلمان ملک مصر کے دار الخلافہ قاہرہ میں اسلام دشمن قوتوں کی ایک میٹنگ ”بہود آبادی کانفرنس“ کے نام پر منعقد ہوئی، جب اس کی تفصیلات منظر عام پر آئیں تو پڑھ کر انتہائی دکھ اور قلق ہوا۔ مگر جب اگلے سال 1995ء میں خواتین کی چوتھی عالمی کانفرنس جمہوریہ چین کے مشہور شہر بیجنگ میں منعقد ہوئی تو اس کے ایجنڈے نے میرے اس قلق اور اضطراب میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ مسلمان مرد و عورت میں بے حسی، بے حیائی، بے غیرتی اور بے حمیت پیدا کرنے کے لیے کیسے کیسے عجیب ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

مادہ پرستی کی مغربی ملحدانہ تہذیب اس حقیقت کو جان چکی ہے کہ جب تک مسلم معاشرے کے گھروں میں گھس کر نقب نہ لگائی جائے اور ان کی خواتین کو نہ بگاڑا جائے، نیو ورلڈ آرڈر کا مقصد پورا ہو سکتا ہے نہ ہی اسلام کے احیاء کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مغربی تہذیب کے علمبردار عموماً اور امریکی ورلڈ آرڈر بالخصوص ”عورت بگاڑ تحریک“ جاری کر کے سرگرمی سے ہماری خانہ بربادی کے درپے ہو رہے ہیں۔ ابتداء میں اس تحریک کا آغاز بے پردگی اور فیشن پرستی کے راستے سے ہوا اور اس کا اولین شکار مسلم معاشرے کے ارباب اقتدار و جاہ کی بیگمات تھیں، جو خانہ داری کے جنجال سے بالکل فارغ تھیں اور جنہیں وقت گزاری اور لیڈری کے لیے کوئی سنسنی خیز سرگرمیاں چاہئیں تھیں، اب ان کی مدد سے درمیانے طبقے کی خواتین کو بھی گھروں سے نکال کر شمع محفل بنانے، تفریح و نشاط کی محفلیں چکانے، ثقافت کے نام پر رقص و سرود میں لگانے، پھر فیشن پرستی، عریانی کی راہ پر ڈالنے کی مہم زور و شور سے جاری ہے۔ یہ سارا کام تو پاکستان بنتے ہی بوجہ شروع کر دیا گیا تھا، ٹی وی کے عام ہونے سے اس تحریک میں بہت سرگرمی پیدا ہوئی، ضیاء الحق مرحوم کے دور میں جب اسلامائزیشن کا کچھ کام شروع ہوا تو اس وقت ”اپوا“ کی بیگمات نے

حقوقِ نسواں اور مساوات مرد و زن کے نام پر بہت مظاہرے کیے، اسلام پر، علماء پر بہت سے نازیبا اعتراضات کیے۔ پھر پیپلز پارٹی کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے سے اس رقص و سرود، ویڈیو فلموں، وی۔سی۔آر، ڈش انٹینا کی ثقافت کو مزید کھل کے کھیلنے کا موقع مل گیا۔ اسلامی قانون کا کھلم کھلا مذاق اڑایا جانے لگا، اس کو قدیم دور کی یادگار کہا گیا جو ”آج“ کے مہذب دور میں ناقابلِ عمل ہے اور یہ سارا کام خاص عورت کو نشانہ بنا کر کیا گیا۔

اس وقت عالم اسلام ایک شدید تہذیبی کشمکش اور تصادم کے دور سے گزر رہا ہے۔ مسلمانوں پر چاروں طرف سے حملے جاری ہیں۔ کشمیر، فلسطین، بوسنیا، چیچنیا کے محاذوں پر باقاعدہ مسلمانوں کی نسل کشی جاری ہے۔ دوسری طرف دین اسلام پر نئے اعتراضات اٹھائے جا رہے ہیں۔ تیسری طرف مخرّب اخلاق رسائل و جرائد، الیکٹرانک میڈیا، عریاں تصاویر، پروپیگنڈے کے ذریعے سے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام میں مالی و معاشی امداد اور غیر محسوس سازشوں کے ذریعے سے مسلمانوں پر تباہ توڑ حملے جاری ہیں۔ اوپر سے جوہری اسلحہ کی تیاری کے سلسلے میں مسلمانوں پر شدید بندش ہے، مسلمانوں کو اکھاڑے میں باندھ کر دنیا کی ساری قومیں گویا مسلمانوں پر پل پڑی ہیں۔ اس ساری پلاننگ کے پیچھے یہودی دماغ کا فرما ہیں۔ مسلم معاشروں کی اخلاقی اور معاشرتی تباہی کی تمام منصوبہ بندی انہی یہودی مکاروں نے گہرے سازشی انداز میں کر رکھی ہے۔ مسلمانوں کے حرم پر تباہ توڑ شبخون مارے جا رہے ہیں۔

1994ء کی قاہرہ کانفرنس اور ستمبر 1995ء کی بیجنگ کانفرنس نے بلاشبہ وہ عریانی اور فحاشی جو

مغربی معاشروں میں موجود ہے، اس کو یو۔این۔او کے ذریعے سے قانونی طور پر مسلمان معاشروں پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ ”کنواری ماؤں“، ”کنڈوم کلچر“، ”استقاطِ حمل کے جواز“، ”بچے پیدا کرنے کے لیے عورت کے ذاتی اختیار“، ”ایڈز سے بچنے کے لیے قربت کے لمحات میں احتیاط“ جیسی فضول اور واہیات اصطلاحات مسلمان معاشروں میں عام کرنے کی بھرپور کوشش جاری ہے، حالانکہ یہ الفاظ سننا کیا، ان کو سوچنے اور تصور میں لانے تک سے ہمیں گھن آتی ہے۔ لیکن اب عملاً مسلمانوں کو ان ”ناقابلِ تصور“ باتوں کا عادی بنانے کی کوشش جاری ہے۔

چونکہ اس ساری سازش کی ابتدا پہلے ”حقوق نسواں“ اور پھر بے پردگی، پھر ”مساوات مرد و زن“ کے نعرہ سے ہوئی تھی، اس لیے مسلمان خواتین کو ان موضوعات پر بہت زیادہ تربیت دینے کی ضرورت ہے۔ اسلام میں خواتین کے حقوق کے موضوع پر غیر مسلموں کے کیے گئے اعتراضات تو بہت پرانے نہ سہی مگر ایک تسلسل سے جاری ہیں، بہت سے مسلمان علماء نے تفصیلاً ان اعتراضات کے جواب بھی دیئے ہیں، جو کتاب و سنت کی روشنی میں مدلل و مستند جوابات کہے جاسکتے ہیں۔ مگر ہمارا فرنگ زدہ طبقہ بڑی معصومیت سے ان کو بار بار دہراتا رہتا ہے۔ لہذا میں نے ایک عورت ہونے کے ناطے اس موضوع پر کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

تہذیب جدید اس بات کی دعویدار ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب نے عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق ہی سمجھا ہے۔ البتہ اسلام نے دوسرے معاشروں اور مذاہب کے مقابلے میں چند زیادہ حقوق دیئے ہیں۔ مگر عورت کو اس کے اصل حقوق جدید تہذیب نے ہی دیئے ہیں۔ ایک صدی قبل تک تو شاید یہ بات کہنا قرین قیاس تھا کہ واقعی اسلام نے اس کو اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ مگر اب تو اسلام بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اس ضمن میں تہذیب جدید بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ اس نے مرد و زن میں مکمل مساوات پیدا کر دی ہے۔ ان کے اس گمراہ کن دعوے کا تجزیہ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

پھر وہ دلیل دیتے ہیں کہ اس وقت مسلمان عورت کتنی زیادہ زبوں حالی اور پسماندگی کا شکار ہے۔ اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ آج اسلام عورتوں کو حقوق، آزادی اور مساوات دلانے میں ناکام ہو گیا ہے۔ ہم مان لیتے ہیں کہ اس وقت مسلم ممالک کی عورتیں بالعموم پسماندگی کا شکار ہیں۔ انہیں معاشرے میں کوئی عزت و وقار حاصل ہے نہ احترام۔ وہ اس وقت حیوانوں کی سی زندگی بسر کر رہی ہیں..... یہ بات درست سہی مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ حالت کی ذمہ داری کیا اسلام پر عائد ہوتی ہے، کیا اسلامی تعلیمات نے عورت کو اس بے وقاری بلکہ استحصال تک پہنچایا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمان عورت کی موجودہ حالت زار نتیجہ ہے ان معاشی، سیاسی اور نفسیاتی حالات کا جن سے آج کے مسلمان ممالک بالعموم شکار ہیں، گو آج بیشتر مسلمان ممالک آزاد ہیں، مگر گزشتہ دو تین صدیوں سے وہ مسلسل اہل مغرب کے بڑھتے ہوئے تابڑ توڑ حملوں،

ذہنی مرعوبیت اور غربت و افلاس کا شکار ہیں۔ عموماً مسلمان ممالک میں وہ سماجی بے انصافی پیدا کر دی گئی ہے جس کے باعث ایک طبقہ تو لوٹ کھسوٹ اور کرپشن کے ذریعہ ممالک کے بیشتر وسائل پر قابض ہے۔ وہ خود داد عیش دیتا ہے تو دوسری طرف ملک کی اکثریت خط افلاس سے بھی نیچے زندگی گزار رہی ہے، ان کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا ہے نہ کھانے کے لیے روٹی، سیاسی گھٹن اور استبداد نے تمام ملکی آبادیوں کو حاکم اور محکوم کے دو مستقل طبقوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ حکمران طبقہ ملک کے بیشتر وسائل پر قابض ہے۔ تمام مراعات و سہولتیں ان کو حاصل ہیں جبکہ وہ عوام کو قربانی کے بکرے بنائے رکھتے ہیں۔ خود کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتے اور عوام کو کوئی حق دینے کو تیار نہیں ہیں۔ اس طرح معاشرتی زندگی بھی شدید گھٹن اور جبر کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ مشرقی عورت کی موجودہ تذلیل اور مصائب و آلام کے ذمہ دار یہی حالات ہیں۔ ان گھٹے گھٹے حالات میں مرد خود بتلائے آلام اور زخم خوردہ ہے۔ ایسے ماحول میں وہ عورت کو محبت و احترام کیسے دے؟ اگر مرد گھر میں عورت سے بدسلوکی کرتا ہے تو یہ رد عمل ہے اس سختی اور بے انصافی کا، جو کسب معاش کے سلسلے میں باہر کے ماحول میں اس سے روارکھی جاتی ہے۔ گاؤں کے چودھری، وڈیرے، جاگیردار، کارخانہ دار، حکام، پولیس وقتاً فوقتاً اس کی عزت نفس مجروح کرتے رہتے ہیں، معاشرے میں اس کو ہر جگہ ذلت و نامرادی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تو پھر وہ سارا غصہ گھر آ کر اپنے بیوی بچوں پر اتار دیتا ہے، یہ افلاس اور جہالت کی لعنت خود مرد کو اس طرح نچوڑ لیتی ہے کہ وہ خود محرومیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سے محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کیسے کرے، یہی وجہ ہے کہ عورت کو اپنے خاوند کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار بننا پڑتا ہے۔ وہ دم نہیں مارتی کیونکہ وہ جانتی ہے، اگر خاوند نے گھر سے نکال دیا تو وہ کہاں جائے گی۔ وہ اپنے قانونی حقوق کا مطالبہ کرنے کی جسارت ہی نہیں کر سکتی۔ مبادا اس کا خاوند ناراض ہو کر اس کو طلاق نہ دے دے۔ خود اس کے والدین اتنے مفلس ہوتے ہیں کہ وہ اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ لہذا وہ اپنے خاوند کا ظلم و ستم برداشت کرنے پر مجبور ہے، مسلمان عورت کی ذلت و تحقیر کی یہ اہم وجہ ہے۔

دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ جدید مادی دور میں پیسہ اور دولت ہی قدر احترام بن چکی ہے،

جس کے پاس پیسہ ہے، وہ قوی اور قابل احترام ہے اور جو دولت کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے وہ کمزور و ناتواں بن کر رہ جاتا ہے، اس وجہ سے اسے ذلت اور تحقیر کا نشانہ بنایا جاتا ہے چونکہ اس افلاس زدہ اور گھٹے گھٹے ماحول میں مرد جو عورت کے مقابلے میں بہر صورت طاقتور بھی ہے اور کماتا بھی ہے وہ عورت کے احترام، اس سے محبت اور ہمدردی کے جذبات سے عاری ہو جاتا ہے۔ عورت اس کے نزدیک محض حیوانی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ ہوتی ہے۔ بحیثیت انسان اس کی کوئی عزت باقی رہتی ہے نہ وقار۔ اسلام نے جن اعلیٰ اخلاقی اقدار کی آبیاری کی تھی۔ اس افلاس زدہ ماحول میں وہ سب اعلیٰ قدریں دم توڑ دیتی ہیں اور زندگی کو محض حیوانی خواہشات کے پیمانے سے ناپا اور تولا جانے لگتا ہے۔

آج عورت کی تحقیر و تذلیل انہی اسباب کی پیدا کردہ ہے۔ مگر یہ اسباب اسلام کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ نہ صحیح اسلامی روح سے کوئی مطابقت رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کہ اسلام ناکام ہو گیا ہے، بودی دلیل ہے اور عورتوں کو ورغلا نے کا بہانہ ہے۔

میری ساری زندگی درس و تدریس میں گزری ہے۔ کالج و یونیورسٹی سے بھی گہرا تعلق رہا ہے اور مدارس کے ماحول سے بھی میں بخوبی آگاہ ہوں۔ اس طرح دونوں قسم کے ماحول میں ”عورت“ کے موضوع پر جو افراط و تفریط پائی جاتی ہے اسے کتاب میں مد نظر رکھا گیا ہے۔ دیہات کی سیدھی سادھی بھولی بھالی مگر دینی تعلیمات سے دور اور جاہل خواتین، جو میڈیا، نیٹ اور فیس بک وغیرہ کی وجہ سے ورغلائی جا رہی ہیں وہ بھی میرے پیش نظر ہیں۔

اس کتاب کے آغاز میں جدید نسوانی تحریکوں کا مرحلہ وار ارتقا (مغرب میں اور پھر مسلمان ممالک میں) بیان کیا گیا ہے۔ بعد ازاں مرد و زن کے درمیان مساوات کے موضوع پر مغربی تہذیب اور اسلامی احکام کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ متنازع فیہ تمام موضوعات کو ترتیب وار بیان کر کے اسلامی احکام کا مبنی بر حکمت اور قابل عمل ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ آخری باب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اب خود مغرب کے سنجیدہ، دانشور اور پڑھے لکھے طبقے اسلام کی پر حکمت، متوازن اور جاندار قابل عمل تعلیم کی حقانیت کے معترف ہو کر بکثرت حلقہ گوش اسلام ہو رہے ہیں۔

ان میں بھی خواتین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

میں محترم جناب طالب الہاشمی صاحب کی صمیم قلب سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری گزارش پر اپنی گونا گوں مصروفیات اور پیرانہ سالی کے باوجود کتاب کے مسودے کو بغور پڑھا اور اس پر گراں قدر مقدمہ تحریر فرمایا اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ یہ کتاب میری بہنوں کے لیے مفید اور سبق آموز ثابت ہوگی، ان شاء اللہ! اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور میرے لیے سرمایہ آخرت بنادے، آمین!

السعی منی والایتمام من اللہ

پروفیسر ثریا بتول علوی

7 جمادی الثانی 1418ء

بمطابق 10 ستمبر 1997ء

کچھ باتیں نئے ایڈیشن کے بارے میں

الحمد للہ! اللہ پاک نے کتاب جدید تحریک نسواں اور اسلام کو بڑی پذیرائی بخشی۔ اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن 2007 میں منشورات سے چھپا تھا..... اس کے بعد میں نے اس کتاب پر ”نظر ثانی“ کا ارادہ کیا.....

زمانہ برق رفتار تبدیلیوں کی زد میں ہے۔ 1998ء سے 2021ء تک دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ اس دوران 9/11 کا المیہ رونما ہوا۔ جس کے بعد گویا امریکہ کی چھتری تلے تمام دنیا کے لوگوں نے عالم اسلام کے خلاف خاموش اتحاد کر لیا۔ ہر طرف سے باطل کی یلغار ہو رہی ہے۔ امریکہ، اسرائیل اور بھارت کے ہنود و یہود و فرنگ کے مکروہ اتحادِ ثلاثہ نے جسدِ اسلام کو لہو لہو کر دیا ہے۔ امریکہ نے جہاد کو دہشت گردی قرار دے کر، دنیا بھر میں مسلمانوں پر اسلحے کے ساتھ جہاد پر پابندی لگادی مگر خود عالم اسلام پر آتشیں اسلحے کے ساتھ حملہ آور ہو گیا۔ افغانستان کو تورا بورا بنایا، تمام مشرق وسطیٰ کو اٹھل پٹھل کیا، عراق و لیبیا کو تباہ و برباد کیا۔ شام اور یمن میں مسلمانوں کا وسیع مقتل سجایا۔ ایغور مسلمانوں اور برما کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم ہوا، کشمیر اور فلسطین میں ظلم کے نئے باب رقم کیے گئے جبکہ امریکہ پاکستان پر زبردست فکری اور تہذیبی یلغار کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان، تو وہ اکھاڑہ ہے جہاں کفر و اسلام کے تمام فکری و نظری معرکے لڑے جاتے ہیں۔ یہاں پر NGOs کی برسات تلے، آزاد میڈیا کے سائے تلے، پاکستان کے کٹھ پتلی حکمرانوں کے ذریعے، یکے بعد دیگرے خلاف اسلام، کفر و الحاد کے حادثے رونما ہوتے چلے گئے۔

1۔ پہلے ہمارے طلباء کے تعلیمی نصابوں پر 2004ء میں تیشہ چلایا گیا۔ ان کو مغربی طرز فکر دے کر نظریہ پاکستان اور اسلام سے باغی بنایا جا رہا ہے۔ دوسری طرف مساجد اور مدارس پر دہشت گردی کا الزام لگا کر لوگوں کو ان سے دور کیا جا رہا ہے۔

2۔ کراچی میں ”سیکس ورکرز“ کی کانفرنس کرائی گئی جس میں فاحشہ عورتوں کی ”سکائی“ کو مغربی ممالک کی طرح جائز اور قانونی قرار دینے کا مطالبہ ہوا۔

3۔ امریکہ نے اپنے سفارت خانے میں ہم جنس پرستوں کا کنونشن بلایا، اس طرح پاکستان میں ہم جنس پرستی کی برائی کو عام کرنے کی بنا ڈالی گئی۔

4۔ حدود قوانین کے خلاف زبردست پراپیگنڈا ہوا جس کے نتیجے میں ”تحفظ نسوان ایکٹ“ مشرف حکومت نے دھونس و دھاندلی سے منظور کر دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پاکستان میں ریپ، میں اضافہ ہوا اور چھوٹے نو خیز بچوں، بچیوں، جوانوں بلکہ بوڑھی عورتوں کے خلاف جنسی درندگی کا ایک طوفانِ بلا خیز اُٹ آیا جو مسلمانوں کی حیا کو تنکوں کی طرح بہا لے گیا۔

- 5۔ خود ”ناموس رسالت“ کے خلاف طوفان اٹھایا گیا، مغربی ممالک میں، بلکہ خود پاکستان میں بھی توہین الہی اور توہین اسلام پر مبنی ڈرامے بنتے چلے گئے۔
- 6۔ 8 مارچ عالمی یوم خواتین بھی اسی فکری اور عملی بے حیائی و غریانی کو پاکستان میں عام کرنے کا باعث بنا۔
- 7۔ ہندو و انہ و مغربی رسوم و رواج خصوصاً ان کے تہوار پاکستان میں میڈیا کے ذریعے عام کرنے کی کوشش کی گئی۔

ان حالات میں راقمہ کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کتاب میں حسب حالات مجھے جدید حوالے دینے چاہئیں مگر حالات اور صحت ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

پھر میں نے اپنے بڑے بیٹے حافظ عبدالجلیل حسن، ڈائریکٹر فنانس اینڈ اکاؤنٹس ”آفاق“ (ایسوسی ایشن فار اکیڈمک کوالٹی) لاہور اور اپنی بہو عیشہ راضیہ (وزٹنگ پروفیسر، پنجاب یونیورسٹی لاہور) کو اس کتاب پر کام کرنے کا پابند کیا۔ ان کے تعاون سے نئے ایڈیشن میں درج ذیل تبدیلیاں کی گئی ہیں:

- 1۔ ”غیرت کا قتل“ میں حسب ضرورت اضافہ و تبدیلی کی گئی ہے۔
- 2۔ ابواب کے اختتام پر دیے گئے حوالہ جات کو متعلقہ صفحہ پر ہی لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔
- 3۔ باب کا عنوان، متعلقہ باب کے ہر صفحے پر بھی دیا گیا ہے۔
- 4۔ فونٹ بھی موٹا کر دیا گیا ہے۔
- 5۔ ”ایمپاورمنٹ آف دو مین، پر میں نے ایک نیا باب ”مضبوط مگر باوقار عورت کون؟“ کے عنوان سے کتاب میں شامل کیا ہے۔

اب نقش ثانی آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے میرے لئے صدقہ جاریہ اور آخرت میں نجات کا سبب بنائے، معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور قارئین کے لیے ہدایت و رہنمائی کا باعث بنائے اور وطن عزیز پاکستان میں مغربی تہذیبی یلغار کو ختم کر کے اسلامی شرم و حیا کی قدروں کو فروغ دینے کا باعث بنائے۔

السَّعْيُ مِثْلُ وَالْإِحْسَامُ مِنَ اللَّهِ

قارئین کرام سے دعاؤں کی طالبہ
ثریا بتول علوی بنت عبدالرحمان کیلانی

۱۵/ شعبان، ۱۴۴۲ھ

30 مارچ، 2021ء

تقدیم

طالب الہاشمی

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيدنا ومولانا
محمد وآله وصحبه اجمعين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين
اما بعد! یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغرب سے اٹھنے والی تحریک نسوانیت یا تحریک
آزادی نسواں (Feminist Movement) نے گزشتہ ایک صدی کے اندر نہ صرف سارے
یورپ اور امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے بلکہ اس نے اکثر ایشیائی اور افریقی ممالک میں بھی
اپنے پنچے گاڑ لیے ہیں۔ ان میں نہ صرف اشتراکی بلکہ بہت سے مسلمان ممالک بھی شامل ہیں۔
یہ تحریک جو اب تہذیب مغرب کا جزو لاینفک بن چکی ہے، اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں کہ
عورت کو معاشرتی، اقتصادی، سیاسی غرض زندگی کے ہر شعبے میں وہی حقوق حاصل ہوں جو مردوں
کو حاصل ہیں۔ ان کی شخصی آزادی پر کسی قسم کی قدغن نہ ہو۔ دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت ہو
یا آزاد تجارتی اور صنعتی پیشے، مختلف قسم کے کھیل ہوں یا دوسرے تفریحی مشاغل، عورت ان سب
میں مردوں کے برابر حصہ لینے یا ان کے شانہ بشانہ چلنے کا حق رکھتی ہے۔ ازدواجی زندگی کی ذمہ
داریاں، بچوں کی پرورش اور تربیت، خاندان کی خدمت، بزرگوں اور شوہر کا احترام وغیرہ سب
دقیانوسی باتیں ہیں۔

اقوام مغرب کا دعویٰ ہے کہ (مادی اعتبار سے) ان کی تہذیب ترقی اسی تحریک آزادی نسواں
کی مرہونِ منت ہے کیونکہ انہوں نے ہر شعبہ زندگی میں اپنی خواتین کو مردوں سے مسابقت کا موقع
دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل مغرب نے گزشتہ ایک صدی میں مادی اعتبار سے حیرت انگیز

ترقی کی ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان کی یہ ترقی محض آزادی نسواں کی بدولت ہے فی الحقیقت اس ترقی کے اور بہت سے اسباب بھی ہیں جن میں بے پناہ قدرتی وسائل اور سائنسی علوم کے حصول کا بے پناہ جذبہ سرفہرست ہیں جہاں تک اس تحریک کا تعلق ہے تو اس کے نتیجے میں ان کے ہاں عورتوں کی آزادی اور بے باکی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ان میں نسائیت کی پاکیزگی اور اخلاق و عفت کی رمت تک باقی نہیں رہی۔ ان میں برائی کا احساس تک مٹ چکا ہے۔ شرم و حیا ان کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی ہے اور غیرت ان کے نزدیک ایک بے معنی لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ بقول مولانا مہر القادری مرحوم وہاں (یورپ) کے پارکوں، باغوں، چوراہوں اور تفریح گاہوں میں مرد و عورت کے اختلاط کے شرمناک مناظر دیکھ کر ضمیر چیختا ہے کہ یہ انسان نہیں جانور ہیں جنہوں نے خوشنما لباس پہن لیے ہیں۔ انسان سے لغزش اور بھول چوک تو ہو سکتی ہے مگر وہ اس قدر بے حیا اتنا بے شرم اور اس درجہ بے غیرت تو نہیں ہو جاتا، آخر گراوٹ کی کوئی حد تو ہونی چاہیے۔^[۱]

تحریک آزادی نسواں نے مغرب کی عورت کو اخلاقی اعتبار سے جس قعرِ مذلت میں گرا دیا ہے اس نے صحیح الفکر مغربی مفکرین اور دانشوروں کو بھی شدید ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا ہے اور اب وہ اپنی تحریروں میں عورتوں کی مادر پدر آزادی پر برملا تنقید کر رہے ہیں۔

لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ ایک ایسا ملک (اور دنیا کا واحد ملک) جس کی تخلیق کے پیچھے یہ نظریہ کار فرما تھا کہ مسلمان غیروں کی سیاسی، ذہنی اور اقتصادی غلامی سے آزاد ہو کر اسلامی اقدار و افکار کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کے معاشرے کا ہر فرد اسلام کا انسان مطلوب ہو (اور جولا کھوں جانوں کی قربانی کے بعد معرض وجود میں آیا) اس کی تخلیق کے فوراً بعد آزادی نسواں یا مغرب زدگی اور بے حجابی کا فتنہ اس پر پوری قوت سے حملہ آور ہو گیا۔ اس کا بیج ملک کے پہلے وزیراعظم کی بیگم صاحبہ نے اپوا (APWA آل پاکستان ویمینز ایسوسی ایشن) کی صورت میں بویا۔ اس کے بعد آج تک ہر حکومت اس کی آبیاری کرتی رہی ہے۔ یوں حکومت کی سرپرستی اور ذرائع ابلاغ (بالخصوص ریڈیو اور ٹیلی ویژن) کے بھرپور تعاون کی بدولت یہ فتنہ اب

ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ ٹیلی ویژن پر دکھائے جانے والے ان سوقیانہ پروگراموں سے کیا جاسکتا ہے جو نہایت بیہودہ ڈراموں اور شرمناک ناچ گانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اخلاقی اور معاشرتی شعبوں میں ترقی معکوس کی ہے اور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے والا تبرج جاہلیہ کا دور واپس آ گیا ہے۔ وہی تبرج جاہلیہ جس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مذمت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جسے (متعدد احادیث صحیحہ میں) سخت ناپسندیدہ بلکہ فعل حرام قرار دیا ہے۔

”تبرج“ کا لفظ اصل میں برج سے ماخوذ ہے۔ ”برج“ اونچی عمارتوں بلند و بالا محلوں، قلعوں کی چوٹیوں اور نمایاں ترین کنکروں کو کہتے ہیں۔ ایک متبرجہ یعنی بے حجاب اور خودنمائی کی دلدادہ عورت ہر نوع کے تصنع اور تکلف کو کام میں لا کر اپنے حسن و جمال کے ایک ایک زاویے کو غیر محرم مردوں کے سامنے پیش کرتی ہے اور ہر گھورنے والے کو اپنی جانب لطف اندوزی کے لیے اسی طرح راغب کرنا چاہتی ہے جس طرح ایک برج اپنی رفعتِ شان کا اعلان کرتا ہوا ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو اپنی جانب ملتفت کر لیتا ہے۔ قرآن اور حدیث کی روشنی میں تبرج جاہلیہ کے معنی ہیں..... عورت کا اپنی زینت، حسن و جمال اور بناؤ سنگھار کا بے محابا اظہار کرنا، اپنے چہرے مہرے کے نکھار اور خدو خال کی خوبیوں کا اشتہار دینا، اپنے جسم کے فتنہ خیز ابھار اور اپنے لباس، زیور اور زیب و زینت کی جگہوں کو غیر محرم مردوں کے سامنے ظاہر کرنا اور ہر اس شے کو چھپانے کی کوشش کرنا جو مردوں کی آنکھوں کو ناگوار معلوم ہوتی ہو تبرج جاہلیہ عورت کی بے حیائی اور بے غیرتی کی سب سے بڑی نشانی ہے یہ عصمت و عفت کی طرف سے اس کی بے پروائی کی ناقابل تردید شہادت ہے۔ یہ تبرج اور بے حجابی اللہ تعالیٰ کے دین حق اور شریعت اسلامیہ کی کھلی توہین اور تضحیک ہے۔ قرآن پاک میں تو مسلمان خواتین کے لیے واضح حکم ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى ۚ
 ”اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور قدیم جاہلیت کے زمانے کی سی سج دھج نہ

دکھاتی پھرو۔“

یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو خواتین کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار آواز میں گفتگو کرنے سے سخت منع فرمایا ہے:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ ۖ

”دبی زبان یعنی لوچدار آواز سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے۔“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ”تفہیم القرآن“ میں سورۃ الاحزاب کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار انداز گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلا ضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے، کیا وہ کبھی اس کو پسند کر سکتا ہے کہ عورت اسٹیج پر آ کر گائے، ناچے، تھرکے، بھاؤ بتائے اور ناز و خمر دے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سریلے نغموں کے ساتھ فحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (Air Hostess) بنائی جائیں اور انہیں خاص طور پر مسافروں کا دل بھانے کی تربیت دی جائے؟

یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گھل مل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے برآمد کیا گیا ہے؟ خدا کا نازل کردہ قرآن تو سب کے سامنے ہے اس میں کہیں اس کلچر کی گنجائش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشان دہی کر دی جائے۔“ (مولانا کی یہ تحریر پاکستان میں ٹیلی ویژن آنے سے پہلے کی ہے) (۴)

[۱] الاحزاب: 32

[۲] سورہ احزاب حاشیہ نمبر 47 تفہیم القرآن ج 4 از سید مودودی

جب تک وطن عزیز میں ٹیلی ویژن نہیں آیا تھا، عورتوں کی بے حجابی اور مغرب زدگی کے طوفان بدتمیزی کی رفتار قدرے ست تھی لیکن ٹیلی ویژن آنے کے بعد اس نے جس طرح ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اسے دیکھ کر حساس اور غیرت مند مسلمانوں کو جس قدر اذیت ہوتی ہے اس کا لفظوں میں اظہار نہیں ہو سکتا صرف خون کے آنسو ہی اس کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ٹیلی ویژن جسے تبلیغ اسلام، اشاعت تعلیم، تطہیر اخلاق اور تعمیر سیرت و کردار کا سب سے بڑا ذریعہ ہونا چاہیے تھا وہ (اپنے چند دینی اور معلوماتی پروگراموں کو چھوڑ کر) مرد و زن کے آزادانہ اختلاط، بے حجابی، فحاشی اور تہذیب مغرب کی آشوب سامانیاں اور برائیاں پھیلانے کا سب سے بڑا آلہ بن گیا ہے۔ آزادی نسواں کی علمبردار مغرب زدہ عورتیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سے کھلی بغاوت پر اتر آئی ہیں۔ انہوں نے اپنی مادر پدر آزادی کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ قرآن حکیم اور احادیث مقدسہ میں خواتین کے بارے میں جو احکامات وارد ہوئے ہیں وہ ان سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کر رہی ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس طوفان بدتمیزی کے آگے بند باندھنے کے بجائے ملک کے اربابِ حل و عقد نے ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کی ہے اس کے نتیجے میں وطن عزیز میں اناٹ و ذکور کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کی فطرت مغربی تہذیب اور مادی فلسفوں نے مسخ کر دی ہے اور وہ ان ساری حدود و قیود سے آزاد ہو چکا ہے جو اسلامی معاشرے کا طرہ امتیاز ہوتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے عورتوں کی ہوسِ جلوت کو افکار کی پراگندگی اور ابتری کا موجب ٹھہرایا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ آئینہ دل ہے مکر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرہ نیساں کبھی بتا نہیں گوہر

پھر وہ دخترانِ ملت کو یہ سبق دیتے ہیں ۔

اگر پندے ز درویشے پذیری
ہزار امت بمیرد تو نمیری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

اس میں کوئی شک نہیں کہ مردوزن کے آزادانہ اختلاط، بے حجابی، عریانی اور فحاشی کے فتنہ عظیم کے بارے میں تمام دینی مکاتب فکر اور دینی جماعتیں دورائے نہیں رکھتیں سب کو اس مضرت اور اس کے ہولناک نتائج کا احساس ہے مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ابھی تک سوائے گنتی کے چند علمائے کرام اور اصحاب فکر و نظر کے، دینی جماعتوں نے منظم طریقے سے پوری قوت کے ساتھ اس فتنہ عظیم کی مزاحمت نہیں کی جب کہ ارباب اقتدار، مغرب زدہ طبقے اور متعدد بے ضمیر اباحت پسند صحافیوں کی سرپرستی اور بھرپور تعاون کی بدولت یہ فتنہ عظیم اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تمام دینی جماعتیں یک دل و یک جان ہو کر اس فتنہ کے خلاف عملی جدوجہد کریں۔ اہل پاکستان کی اکثریت میں ابھی تک اللہ کے فضل سے احساس غیرت اور دینی حمیت باقی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ اکثریت اس ہولناک فتنے کے خلاف کسی بھی منظم تحریک کا بھرپور ساتھ دے گی۔ اس تحریک کا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایسے صالح لٹریچر کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کا اہتمام کرے جس میں خواتین کو موثر انداز میں بتایا گیا ہو کہ اسلام میں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے، ان کے فرائض و حقوق کیا ہیں اور یہ کہ تبرج جاہلیہ میں مبتلا عورتیں اسلام کی خواتین مطلوب نہیں ہیں بلکہ اسلام کی مطلوب وہ خواتین ہیں جن کو قرآن حکیم میں مسلمات، مومنات، قانات، محصنات، ذاکرات، خاشعات، صادقات، صابرات، متصدقات، صائمات اور حافظات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس کے برعکس متبرجہ خواتین کی قرآن و حدیث میں جو تعریف کی گئی ہے اس کی تحقیق وہ خود ہی کر لیں یا کسی عالم دین سے پوچھ لیں۔

محترمہ پروفیسر ثریا بتول علوی صاحبہ دین اور وطن سے محبت رکھنے والے تمام لوگوں کے

شکریہ کی مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی پاکستانی بہنوں کو عذابِ آخرت سے بچانے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ نہایت درد مند دل عطا کیا ہے۔ چند سال پہلے انہوں نے ”اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ“ کے نام سے ایک معرکہ الآرا کتاب قوم کے سامنے پیش کی جس میں وطن عزیز کی مسلمان خواتین کو بتایا کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو کتنا بلند مقام و مرتبہ عطا کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کو اتنے شاندار حقوق دیئے ہیں کہ کسی دوسرے معاشرے میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اب انہوں نے یہ زیر نظر کتاب ”جدید تحریک نسواں اور اسلام“ لکھ کر نہ صرف یہ کہ وقت کا ایک اہم ترین تقاضا پورا کر دیا ہے بلکہ دین اور اخلاق کی بہت بڑی خدمت بھی انجام دی ہے۔ اس میں انہوں نے ”جدید تحریک نسواں“ کا ہمہ پہلو جائزہ لے کر ہر اس اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے جو تہجدِ زردہ خواتین (اور مردوں) کی طرف سے خواتین کے متعلق اسلامی احکام پر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ستر و حجاب، نکاح، طلاق، مہر، خلع، شہادت (گواہی)، وراثت، دیت، عورت کی سربراہی وغیرہ مختلف مسائل پر قرآن و حدیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان معاملات میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو لائحہ عمل متعین فرمایا ہے اور جو احکام دیئے ہیں وہ ہر اعتبار سے امت کے لیے نفع مند اور باعثِ رحمت و برکت ہیں۔ ان کا انکار کرنا یا خواہش نفسانی کے تحت ان کو ہدفِ تنقید بنانا دین اور دنیا کی بربادی کا موجب ہے۔ انہوں نے چند اولوالعزم باکمال خواتین کے ایمان افروز تذکرے بھی کتاب میں شامل کر دیئے ہیں۔

یوں اپنے موضوع پر یہ ایک شاہکار تالیف بن گئی ہے۔ اس کی فہرست مضامین، عنوانات پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے اس کی جامعیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولفہ کا انداز نگارش بڑا پراثر اور عام فہم ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ خلوص اور خیر خواہی امت کے جذبہ نے ان کی تحریر کو دو آتشہ بنا دیا ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا وہ اس بلند پایہ کتاب کی تالیف پر ہر اعتبار سے مبارکباد کی مستحق ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب نام نہاد آزادی

نسواں کے فتنے پر ضرب کاری ثابت ہوگی۔ دین اور وطن سے محبت رکھنے والے ہر فرد اور ہر دینی جماعت کا فرض ہے کہ وہ اس کتاب کو ہر مسلمان گھرانے اور ہر کتب خانے، لائبریری تک پہنچانے کا اہتمام کرے۔ اس کی جتنی زیادہ اشاعت ہوگی، فواحش و منکرات کی چولیس ڈھیلی کرنے میں مدد ملے گی۔ ہماری دعا ہے کہ یہ کتاب مولفہ کے لیے توشہ آخرت ثابت ہو اور اللہ تعالیٰ دوسرے دردمند اہل قلم کو بھی توفیق دے کہ وہ بے حیائی، بے غیرتی اور اسلام سے روگردانی کے طوفان بدتمیزی کا منہ موڑنے کے لیے اپنے قلم کو حرکت میں لائیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

خاکسار

طالب الہاشمی

16 جون 1998ء

118۔ ڈی، رضوان بلاک، اعوان ٹاؤن، ملتان روڈ لاہور

تقدیم: عطاء اللہ صدیقی

گزشتہ چار صدیوں کے دوران مغرب کے چشمہ ظلمات سے ضلالت اور گمراہی کے جتنے بھی فتنہ پرور فوارے پھوٹے ہیں ان میں ”آوارگی نسواں“ کا فتنہ اپنی حشر سامانیوں اور تہذیبی ہلاکتوں کی وجہ سے سب فتنوں سے بڑا فتنہ ہے۔

سیکولر ازم، لبرل ازم، سوشلزم، فاش ازم جیسے باطل نظریات نے مغرب کی مذہبی اساس کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا لیکن ان کی یلغار سے خاندانی اقدار اور سماجی قدریں بڑی حد تک محفوظ رہیں۔ مرد و زن کے سماجی رشتوں کی وجہ سے قائم خانگی توازن خاصی حد تک قائم تھا لیکن ”عورت ازم“ (Feminism) کے ہوش ربا فتنہ نے خاندانی نظام کی عمارت کو اس قدر زمین بوس کر دیا ہے کہ مغرب میں سماجی ادارے کے طور پر خاندان کا تصور تک معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

موضوع کی اہمیت اور پس منظر:

بیسویں صدی کے آخری عشرے میں یورپی دانشور خاندانی نظام کی تباہی پر نوحہ کناں ہیں اور اس کی بحالی و تحفظ کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں، یہ ہمارا قومی المیہ ہے کہ

□ محترم عطاء اللہ صدیقی صاحب ایک مایہ ناز مفکر اور لکھاری ہیں۔ انہوں نے دراصل میری کتاب پر اپنا ماہرانہ تبصرہ لکھا تھا۔ اسی تبصرہ کو یہاں مقدمہ کے طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔ ان کا یہ تبصرہ ماہنامہ محدث میں جنوری 1999ء میں طبع ہوا تھا۔ ویسے وہ حکومت پنجاب میں سیکرٹری معدنیات تھے۔ 12 ستمبر 2011ء کو وہ ڈینگی کے بخار میں مبتلا رہ کر دنیا سے فانی سے دارالبقاء کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کی ایمان پرور تحریریں دل کو حرارت و ایمانی سے گرمادیا کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کو اپنی جوار رحمت میں لے کر ان کو اعلیٰ علیین میں داخل فرمائے۔ آمین۔ ان کی بیشتر ایمان افروز تحریریں 15 سال تک ماہنامہ محدث میں شائع ہوتی رہی تھیں۔

پاکستان میں ایک مغرب زدہ متحرک اقلیت ”روشن خیالی“ اور ”مساوی حقوق“ کے نام پر ہمیں خاندانی نظام کی اس عظیم نعمت سے محروم کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے کہ جس سے ہمارے اسلامی اور مشرقی تشخص کی اب تک آبرو قائم ہے۔ حالیہ برسوں میں مغربی سرمائے سے چلنے والی این جی اوز کے ٹڈی دل نے ایک خطرناک سیلاب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان کی بڑھتی ہوئی پذیرائی اور ذرائع ابلاغ کی سرپرستی فی الحقیقت ہمارے فکری گلستان کی ہریالی کی بقا کے لیے عظیم خطرے کا روپ دھار چکی ہے۔ اس خطرناک فتنے کا سد باب کرنے کی بجائے اس سے چشم پوشی کا مظاہرہ ایک قومی غفلت کہ جو ہمیں بالآخر انسانی اور سماجی پستی کے اس اندھی غار میں دھکیل سکتا ہے جہاں اس وقت مغربی سماج پہنچا ہوا ہے۔

عورتوں کے حقوق کے مطالبے پر آج سے دو سو سال پہلے یورپ میں چلائی جانے والی تحریک افراط کا شکار ہو کر بالآخر ”تحریک بربادی نسواں“ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ مغرب سے اٹھنے والے ہر فتنے کو محکوم اقوام کے بزعم خویش ”روشن خیالوں“ نے ہمیشہ جدید فکر کے روشن چراغ سمجھ کر قبول کیا ہے اور اس ”روشنی“ کے پھیلاؤ کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کی ہیں۔ مغرب کی ثقافتی استعمار کے تنخواہ دار ایجنٹوں نے پاکستان میں عورتوں کی سماجی حالت کی مبالغہ آمیز تصاویر کھینچ کر اچھے خاصے معصوم ذہنوں کو غیر محسوس طریقے سے متاثر کیا ہے، ان کے پروپیگنڈہ کا اصل ہدف اس نام نہاد اور خود ساختہ نا انصافی کے لیے اسلام کو مورد الزام ٹھہرا کر خواتین کو بغاوت پر آمادہ کرنا ہے۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد اور دیگر بڑے شہروں میں ان کی اس مکروہ سازش کے اچھے خاصے جال پھیل چکے ہیں۔

ملت کا درد رکھنے والے حساس دلوں نے خاندانی نظام کو خطرات سے دوچار کرنے والے اس تازہ ترین فتنے کے ہولناک نتائج سے فرداً فرداً قوم کو خبردار کرنے کا فریضہ تو ایک حد تک انجام دیا ہے لیکن اس فتنے کی سرکوبی کے لیے جس اجتماعی جدوجہد اور تحریک کی ضرورت تھی، وہ ابھی تک برپا نہیں کی جاسکی۔ ہماری مذہبی اور دینی جماعتیں بھی شاید اس خطرناک فتنے کے گھمبیر نتائج کا ابھی تک مکمل ادراک نہیں کر سکی ہیں۔ یہ امر بے حد خوش آئند ہے کہ بربادی نسواں کے عظیم فتنے

کے خلاف مؤثر ترین آواز ایک خاتون محترم نے اٹھائی ہے۔ پروفیسر ثریا بتول علوی صاحبہ نے اپنی تازہ ترین تالیف ”جدید تحریک نسواں اور اسلام“ کے ذریعے بلاشبہ پاکستانی قوم کے لیے کفارہ ادا کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس کتاب کے موضوعات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ مصنفہ نے تحریک آزادی نسواں کے تقریباً تمام اہم مقدمات کا معروضی اور مفصل جائزہ لے کر بالآخر واضح کیا ہے کہ ”صرف اسلام ہی طبقہ نسواں کا حصن حصین (مضبوط قلعہ) ہے۔“

ایک عورت ہونے کے باوجود محترمہ نے جس جرأت مندی اور خود اعتمادی سے مغرب کے نام نہاد ”عورتوں کے حقوق“ کا ابطال کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کتاب کا صفحہ صفحہ گواہی دے رہا ہے کہ (اقبال کے الفاظ میں) دانش افرنگ کے جلوے ان کی نگاہوں کو خیرہ نہیں کر سکے ہیں کیونکہ یثرب کی خاک ان کی آنکھوں کا سرمہ ہے، اسلام کی حقانیت ان کے دل میں جاگزیں ہے، اسی لیے وہ ان آزادیوں کو پائے حقارت سے ٹھکراتی ہیں جو انہیں خیر البشر ﷺ کی غلامی میں رہنے کے قابل نہ چھوڑیں۔ مذکورہ بالا کتاب اسلام پسند خواتین کی عظیم اکثریت کے دل کی سچی آواز اور ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔ یہ کتاب مٹھی بھر مغرب زدہ عورتوں کی فکری گمراہی کو بھی واشگاف کرتی ہے کہ جنہیں ہم ان کے حیاتیاتی وجود کے حوالے سے تو ”عورت“ کہنے پر مجبور ہیں لیکن امر واقعہ کا اعتبار کرتے ہوئے علامہ اقبال کے الفاظ میں ان کو ”نازن“ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے الفاظ میں ان کو ”مکشوفات“ کا نام دیتے ہیں۔

”جدید تحریک نسواں اور اسلام“ میں شامل موضوعات کو مصنفہ نے حسن ترتیب کے ساتھ 24 ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں چند ابواب کا ذکر موضوعات کے تنوع اور توسع کو سمجھنے میں مدد دے گا:

باب نمبر 1: مغرب کا نظریہ مساوات، مرد و زن

باب نمبر 3: مساوات مرد و زن کا اسلامی تصور

باب نمبر 4: گھریلو نظم میں مرد کی سربراہی

باب نمبر 8: عورت اور معاشی مسائل

باب نمبر 9: ولایت نکاح کا مسئلہ

باب نمبر 11: تعدد ازواج

باب نمبر 15: اسلام میں عورت کی وراثت

باب نمبر 17: اسلام میں عورت کی سربراہی

باب نمبر 19: صرف اسلام ہی طبقہ نسواں کا محسن ہے

باب نمبر 21: موجودہ مسلمان عورت کی زبوں حالی اور اصلاح احوال

باب نمبر 23: مغربی نو مسلم خواتین کے اسلام کے بارے میں تاثرات

باب نمبر 24: مضبوط اور با اختیار عورت کون؟

مساواتِ مرد و زن، مرد کی سربراہی، ولایت نکاح، تعدد ازواج اور عورت کی نصف وراثت و شہادت جیسے حساس موضوعات کے متعلق محترمہ ثریا بتول نے جیسے کھلے دل کے ساتھ اپنے نظریات کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے ہم آہنگ کیا ہے، اس سے بعض اوقات یہ گماں گزرتا ہے کہ یہ سطور کسی مسلم مرد مصنف کے اعجازِ قلم کا ثمر ہیں اور یہی اُن کی عظمتِ فکر کا وہ مؤثر ہتھیار ہے کہ جس سے مسلح ہو کر انہوں نے ”آزادی نسواں“ کے گمراہ کن فتنے کا تیاپانچ کر کے رکھ دیا ہے۔ کتاب مذکور کے درج ذیل اقتباسات ہماری رائے کی تائید میں پیش کیے جاتے ہیں:

(1) مساواتِ مرد و زن کا اسلامی تصور بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

”اسلام تو مرد اور عورت دونوں کی فکری اور جسمانی صلاحیتوں کے لحاظ سے معاشرے میں ان کو الگ الگ ایسا دائرہ کار مہیا کرتا ہے، جس میں کام کر کے وہ بہترین طریقے پر معاشرے کو فائدہ پہنچا سکیں اور تعمیرِ تمدن میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اس کے برعکس مرد و عورت دونوں کو مغربی نظریہ مساوات یکساں صلاحیتوں والا قرار دے کر دونوں کو ایک ہی حیثیت سے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عورت اپنی فطری صلاحیتوں کے برعکس دوسرے مقام پر استعمال کی جاتی ہے تو اس کا اپنا تشخص اور صحت بھی برباد ہو جاتی ہے اور معاشرہ بھی اس کے خراب نتائج

سے نہیں بچ سکتا۔ اسلام اس نظریہ مساوات کا بہت سخت مخالف ہے جہاں دونوں اصناف کا ایک ہی میدانِ کار ہو۔ اسلام کو تو یہ بھی گوارا نہیں کہ عورتیں مردوں کا سالباس پہنیں یا رفتار و گفتار میں ان جیسا بننے کی کوشش کریں۔ اللہ نے جس کو جو کچھ بنا دیا ہے، وہ اس پر مطمئن اور قانع رہے۔“

”اسلام دین فطرت ہے اس نے دونوں صنفوں کو ان کی فطرت، افتادِ طبع اور مزاج کے مطابق ذمہ داریاں دی ہیں۔ اس تقسیم سے کوئی نہ تو اوّل درجہ کا شہری بنتا ہے اور نہ کوئی دوم درجہ کا۔ آخر مکمل مساوات کے حقیقی تقاضوں پر بھی غور کرنا چاہیے! کیا عورت پر ہر ماہ، ہر سال یا دو سال بعد ایسے طویل دور نہیں آتے جن کے دوران وہ غیر معمولی جسمانی اور ذہنی محنت، مشقت کا کوئی کام نہیں کر سکتی، پھر بھی نسل انسانی کے حمل، رضاعت، پرورش اور تربیت کے ساتھ ساتھ فکر معاش کا بوجھ اس کے نازک کندھوں پر لا دینا کیا عورت کے ساتھ ہمدردی ہوگی؟“ (صفحات 187، 193، 194)

(2) کیا عورت گھر کی سربراہ ہو سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب مصنفہ یوں دیتی ہیں:

”گھر کا سربراہ بننے کے لیے مرد ہی موزوں ہے۔ عورت عقلی، علمی اور جسمانی ہر لحاظ سے مرد سے کمتر ہے، علاوہ ازیں ایک اہم وجہ مرد کا مالی بوجھ اٹھانا بھی ہے۔ یہاں اعتراض اٹھایا جاسکتا ہے کہ اب تو خواتین معاشی لحاظ سے خود کفیل ہو رہی ہیں، اس لیے وہ کیوں مرد کو اپنے سے برتر اور سربراہ مانیں؟ تو جواب یہ ہے کہ صرف معاش ہی زندگی میں فیصلہ کن امر نہیں ہے۔ عورت جذباتی لحاظ سے سہارے کی محتاج ہے۔ اصل حقیقت یہی ہے کہ عورت کو اپنی فطری کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ، رسول کے فرمان کے مطابق شوہر کا شکر گزار ہونا چاہیے، اس کی سربراہی کو دل سے تسلیم کر کے اس کی خدمت اور اطاعت کرنی چاہیے۔ جب وہ ذاتی زندگی میں کسی لمحہ بھی (بیٹی ہو یا بیوی) مرد سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، تو حقیقت کا اقرار کرنے میں عار کیسی؟ مرد اپنی برتری کے باوجود یہ نہیں کہتا کہ وہ عورت سے بے نیاز ہے تو پھر عورتوں کو ایسی کون سی افتاد آن پڑی ہے کہ وہ مساوات کے چکر میں خوار ہو رہی ہیں۔“ (صفحہ 209-210)

(3) مغرب نے اسلام کو تعدّدِ آواز و اج کی اجازت دینے پر خاصا تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ پروفیسر

ثریا بتول علوی نے اس معاملے کے تمام پہلوؤں کا ناقداً تجزیہ کرنے کے بعد اسلام کی تعلیمات کو پُر از حکمت ثابت کیا ہے۔ مرد کی جبلی ضرورت کو تَعَدُّ دَآزواج کے جواز کے طور پر بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

”مرد اور عورت دونوں کی فطرت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ابتداء ہی سے مرد کا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی طرف رجحان رہا ہے۔ اگر وہ ایک شادی پر اکتفا کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فی الواقع دوسری بیوی کی خواہش یا ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اب جن لوگوں کے اندر جنسی خواہش زیادہ شدید ہوتی ہے اور ایک بیوی سے ان کا گزارہ نہیں ہوتا، ان کو دوسری شادی کی اجازت نہ ہو تو وہ ضرور حرام کاری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ سوچنا چاہیے کہ کیا حرام کاری کی خرابیاں زیادہ ہیں یا دوسری شادی کرنے کی۔“ (صفحہ 383)

”پھر ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت دینا مسلمانوں پر فرض نہیں کہ تم ضرور چار شادیاں کرو جیسا کہ مخالفین کا پراپیگنڈہ ہے بلکہ یہ تو ہنگامی حالات کے لیے بوقت مجبوری ایک اجازت ہے اور اجازت بھی کئی پابندیوں کے ساتھ مقید ہے۔“ (صفحہ 383)

”مرد کا گناہ میں ملوث ہونا زیادہ بڑا گناہ ہے یا عورت کو سوکن برداشت کرنے پر آمادہ کرنا۔ لہذا شریعت نے گناہ کو تو حرام قرار دیا ہے، دوسری طرف عورت کے حقوق کا اس طرح دفاع کیا کہ مرد کو سب بیویوں کے درمیان عدل و مساوات کا پابند کر دیا۔“ (صفحہ 391)

”حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے زیادہ معقول، منصفانہ اور انسان کی فلاح کا ضامن کوئی دین نہیں ہے۔“

(4) اسلام کے قانون شہادت میں عورت کے مقام و مرتبہ پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان کے غالب طبقہ نسواں کو اللہ کی طرف سے دیئے گئے حقوق پر کوئی گلہ شکوہ نہیں، کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اسی کو اپنے لیے محفوظ جائے عافیت سمجھتی ہیں۔ البتہ ہمارے ملک میں ایک افرنگ زدہ طبقہ ایسا موجود ہے، جو اسلام کے ہر حکم پر اعتراض کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔“ (صفحہ 471)

اہل مغرب کی اسلام پر تنقید دیکھ کر کسی قسم کے معذرت خواہانہ رویہ کی بجائے پوری ایمانی قوت کے ساتھ اسلام کی حقانیت کو صدق دل سے قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

”اگر ہم اس طرح اہل مغرب کے سامنے پسپا ہونے لگیں تو پھر اسلام کے کس کس قانون پر نشتر چلائیں گے، کہاں کہاں سے بدنامی کا داغ دھوئیں گے۔ پھر تو ہمارے دین و ایمان کا پورا سرمایہ جدید زمانے کی مصلحتوں پر قربان ہوتے ہوتے دریا برد ہو جائے گا۔ اپنے دین و ایمان کو بچانے کی ایک ہی سبیل ہے کہ پوری ایمانی قوت و مومنانہ جرأت سے کام لے کر دلائل کی قوت سے یہ ثابت کیا جائے کہ جس چیز کو دشمن اسلامی بدنامی کہہ رہے ہیں، دراصل وہی نیک نامی کا طرہ امتیاز ہے۔ پس عورت کی نصف شہادت کے سلسلے میں بھی ہمیں یہی راہ اپنانی ہوگی کیونکہ یہ مسئلہ نص قرآنی، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تعامل صحابہ اور اجماع امت کی روشنی میں ایک مسلمہ مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔“ (صفحہ 476)

(5) عورت کی وراثت کے بارے میں اسلامی قانون کی تعریف ان الفاظ میں ملتی ہے:

”یہ حقیقت ہے کہ حقوق اور ذمہ داریوں کے تعین کے حوالہ سے وراثت کی یہ تقسیم فطری اور منصفانہ ہے، عدل و توازن پر مبنی ہے۔ اس سے بہتر تقسیم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“ (صفحہ 483)

(6) الرجال قوامون علی النساء کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

”عربی زبان میں قوام منظم اور نگران کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ قوامیت کا منصب مرد کو عطا کیا ہے۔ اگرچہ اس آیت کا تعلق خانگی معاملات سے ہے مگر اسے صرف خانگی امور تک محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر گھر کی چھوٹی سی ریاست کی سربراہی بھی عورت کو نہیں دی گئی، تو گھروں کے مجموعے کے وسیع دائرے، یعنی پوری اسلامی ریاست کی سربراہی کا منصب اسے کیسے دیا جاسکتا ہے۔ عورت کو سربراہ نہ بنانا اس کی کوئی حق تلفی یا تحقیر نہیں ہے، بلکہ یہ تفاوت صلاحیتوں اور تقسیم کی بنیاد پر ہے۔“ (صفحہ 510)

(7) پروفیسر ثریا بتول صاحبہ کو اسلام اور علوم القرآن میں گہری دلچسپی ورشہ میں ملی ہے۔ قرآن و

حدیث، تاریخ، آثار صحابہ اور مسلمہ فقہاء کی آراء پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ ان کی تصنیف نقلی و عقلی دلائل کا خوبصورت مرقع ہے۔ انہوں نے موضوع کو قرآن و سنت کے نقلی دلائل سے ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ عقلی دلائل کو بھی قرآن و سنت کی روشنی میں مستحکم کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جدید تحریک نسواں کی خرابیوں کو بیان کرنے کے لیے انصاف پسند مغربی مصنفین کی تحریروں سے بکثرت اقتباسات نقل کیے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی تحریر میں نہ صرف توازن پیدا ہوا ہے بلکہ اس کا علمی درجہ بھی نہایت بلند ہو گیا ہے۔ اقوام متحدہ کے تحت منعقد ہونے والی خواتین کی بیجنگ کانفرنس کے بارے میں محترمہ ثریا بتول کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

”یہ کانفرنس درحقیقت تذلیل نسوانیت کانفرنس تھی۔ جس کا مقصد وحید عورتوں کو مادر پدر آزادی دلانا تھا تا کہ وہ بچوں کو جنم دینے کے فریضہ بلکہ جھنجٹ سے آزاد ہو سکیں۔ اگر ہو جائے تو اپنی مرضی سے اسقاط حمل کروا سکیں، ہم جنس پرستی اور آزادانہ شہوت رانی میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو سکے۔ یہ ہے یو، این، او کی حقوق نسواں اور شرف نسواں کے سلسلے میں کوششوں کی معراج۔ وہ عورت کو مساوات، حقوق اور ترقی دینے چلے ہیں مگر!

مردوں کے اگر شانہ بشانہ رہے عورت

کچھ اور ہی بن جاتی ہے عورت نہیں رہتی (صفحہ 599)

محترمہ ثریا بتول علوی کی مذکورہ کتاب کے مطالعہ کا فوری اثر ایک قاری یا قاریہ پر یہ پڑتا ہے کہ قرآن و سنت کی آفاقی، ابدی اور انسانیت کی فلاح پر مبنی تعلیمات پر اعتماد مزید بڑھ جاتا ہے اور تہذیب مغرب کا کھوکھلا پن، سفلگی، عاصیانہ پن اور حیوانیت اس کی آنکھوں کے سامنے نکلی ہو کر آ جاتی ہے۔ قاری کا ذہن اسلام سے وابستگی کے ایک عجیب نشے سے جھومنے لگتا ہے جو حق کی معرفت اور وجدانی کیفیات کے زیر اثر جنم لیتا ہے۔ مذکورہ کتاب کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

”اس کے برعکس اسلام نے عورت کو تحفظ مہیا کیا ہے، اسے عزت و احترام دیا ہے۔ اسے وقار عطا کیا ہے، سچی بات ہے کہ عورت نے جتنا اعلیٰ و ارفع مقام اسلام کے جوار رحمت میں پایا ہے۔ اس کی نظیر تمام مذاہب عالم میں تو کجا، خود موجودہ دور کی نام نہاد مہذب مغربی

تہذیب میں بھی پایا جانا بلکہ اس کا صرف عشرِ شیر بھی پایا جانا ناممکن ہے۔ قرآن و سنت میں اس صنفِ نازک کے حقوق کی پاسداری، تمام معاملات میں اس کی خصوصی نگہداشت اور فطری کمزوری کے باعث اس کی رعایت پر نظر ڈالی جائے تو بے اختیار یہ بات زبان سے نکلتی ہے کہ یہ واقعی خالق کائنات کی حکمت بھری تعلیم ہے۔“ (صفحہ 600)

محترمہ ثریا بتول علوی نے جس طرح جذبہ ایمانی سے سرشار ہو کر یہ کتاب تصنیف کی ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیگر تعلیم یافتہ اسلام پسند خواتین بھی جدید تحریک نسواں کے طوفان کی الحادی موجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کا نذرانہ پیش کریں۔ زیر نظر کتاب نے اسلامی تحریک مزاحمت کے لیے وسیع لٹریچر فراہم کر دیا ہے۔ محترمہ کے لیے بالخصوص اور دیگر اہل علم کے لیے بالعموم اس کام کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

درج ذیل موضوعات قلمی جدوجہد اور جولانی فکر کے منتظر ہیں:

- 1- 1800ء سے لے کر اب تک مغرب میں تحریک آزادی نسواں جن ارتقائی مراحل سے گزری ہے، ان کا تفصیلی جائزہ
- 2- آزادی نسواں کی تحریک کے محرکات اور اس کو مقبول بنانے والے سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور دیگر عوامل کا ناقدانہ جائزہ
- 3- جنگِ عظیم دوم کے بعد جدید تحریک نسواں کی نئی جہات اور فکری آوارگی کا عملی محاکمہ
- 4- 1980ء کے بعد خواتین کے حقوق کے نام پر صیہونی لابی کی زیر سرپرستی این جی اوز کا سیلابِ بلاخیز۔ ترقی کے نام پر الحاد کی تبلیغ کا ایجنڈہ
- 5- مغرب میں خاندانی نظام کی تباہی میں تحریک نسواں کا حصہ اور اس کے مضمرات کا تفصیلی جائزہ
- 6- عالمی سطح پر ہیومن رائٹس کے نام پر ”وومن رائٹس“ کے ایجنڈے کی تبلیغ اور دنیا بھر سے ان کو منوانے کے لیے مغربی دباؤ۔ مغرب میں 1990ء کے عشرے میں مساوی حقوق

- کے فتنہ کی بلا خیزی اور اس کے متعلق شائع ہونے والے وسیع لٹریچر کا محققانہ تجزیہ
- 7۔ پاکستان میں تحریک نسواں کی ابتداء، اپوائی بیگمات کا کردار، عائلی قوانین کا تفصیلی پس منظر، اور اس کا ناقدانہ جائزہ
- 8۔ حقوق نسواں کمیٹی 1976ء کی رپورٹ کے حصہ اول اور حصہ دوم کا ناقدانہ جائزہ/ اس کی اسلام سے متصادم سفارشات کی نشاندہی
- 9۔ جسٹس اسلم ناصر زاہد کی سربراہی میں قائم شدہ خواتین انکوائری کمیشن کی سفارشات کا تفصیلی محاکمہ اور تعاقب
- 10۔ پاکستان میں خواتین کے حقوق کے نام پر کام کرنے والی ملک و دین دشمن این۔ جی۔ اوز کے ”نیٹ ورک“ کی نشاندہی بالخصوص انسانی حقوق کمیشن، عورت فاؤنڈیشن، شرکت گاہ اور (Simorgh) وغیرہ۔ ان تنظیموں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کو جائزہ۔ حالیہ برسوں میں ان کی طرف سے شائع کردہ سینکڑوں کتابوں کے مواد کی چھان بین اور اس کے قابل اعتراض حصوں کی نشاندہی۔ وسائل و ذرائع آمدن اور ملک دشمن رابطوں کو ضبط تحریر میں لانا۔
- 11۔ مسلمان ملکوں میں اسلامی خواتین کی طرف سے قائم کردہ ایسی تنظیموں کے بارے میں مفصل رپورٹ جو تہذیب مغرب کی یلغار کے سامنے بند باندھنے میں مصروف ہیں۔
- محترمہ ثریا بتول علوی نے اگرچہ مندرجہ بالا موضوعات میں سے اکثر کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرورت تحریر کیا ہے، لیکن ان کے متعلق مزید تفصیلات کی ضرورت بدستور قائم ہے۔ امید رکھی جانی چاہیے کہ ان کی طرف سے کھڑی کی جانے والی اس فکری عمارت کے نامکمل حصوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اجتماعی اور انفرادی سطح پر کاوش بروئے کار لائی جائے گی۔

1

مغرب کا نظریہ مساواتِ مرد و زن

- ✿ پس منظر
- ✿ ارتقاء
- ✿ قاہرہ کی بہبود آبادی کانفرنس
- ✿ بیجنگ کانفرنس
- ✿ نظریہ مساوات مرد و زن کے نتائج
- (i) اہل مغرب کا اعتراف
- (ii) خاندانی نظام کی تباہی
- (iii) جنسی بے راہ روی
- (iv) ناجائز بچوں کی کثرت
- (v) طلاق کی کثرت
- (vi) بچوں میں خودکشی کا رجحان
- (vii) معذور بچے
- (viii) ہم جنس پرستی
- (ix) عصمت فروشی
- (x) بچوں کا جنسی استحصال
- ✿ ہمہ گیر معاشرتی بگاڑ
- ✿ عورتوں کا مردانہ تشدد سے بچنے کا طریقہ
- ✿ روس و چین کا حال
- ✿ خواتین کی حالت زار
- ✿ عورت عملی زندگی میں کہاں تک مساوات حاصل کر سکی ہے؟
- ✿ مغربی دانشوروں کا احتجاج
- ✿ رد عمل

مغرب کا نظریہ مساوات مرد و زن

زمانہ جدید کے تمدنی مسائل میں سے ایک اہم متنازعہ مسئلہ عورت اور مرد کی مساوات کا مسئلہ ہے۔ فی زمانہ یہ نعرہ گونج رہا ہے کہ عورت کو ہر حیثیت سے مرد کے برابر ہونا چاہیے۔ قانونی لحاظ سے بھی اسے ہر وہ کام کرنے کی آزادی ہونی چاہیے جو مرد سرانجام دیتا ہے۔ اسے بھی وہ حق ملنے چاہئیں جو معاشرے میں مرد کو حاصل ہیں۔ غرضیکہ مرد اور عورت دونوں معاشرے میں مساوی حیثیت سے دوست بن کر رہیں۔ اب مرد کی حاکمیت اور عورت کی محکومیت کا دور ختم ہو جانا چاہیے۔

پس منظر:

اس نظریہ کا تحقیقی جائزہ لینے سے پہلے اس کے پس منظر پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا آغاز چونکہ مغرب سے ہوا، لہذا عورت کے اس دور کے مسائل، معاشرے میں اس کی حیثیت اور مقام و مرتبہ کا مختصر جائزہ لیا جانا ناگزیر ہے کہ وہ ابتدا ہی سے محروم اور بد بخت چلی آرہی ہے۔ زمانہ قدیم میں یونان کے نامور دانشور ارسطو نے عورت کو ہر اعتبار سے مرد سے کمتر قرار دیا تھا کیونکہ اس میں فہم و استدلال کی قوت نہیں ہے، بیشتر قدیم مفکرین نے اسے جذباتی، کمزور، عقل و فہم سے محروم ہونے کی بناء پر گھٹیا اور پست قرار دیا۔ قرون وسطیٰ میں عورت ہی کو یورپ کی کمزوری و ذلت کا باعث قرار دیا جاتا رہا۔ ان کے نزدیک عورت ”گناہ کی جڑ“، ”برائی کا سرچشمہ“ اور ”جہنم کا دروازہ“ سمجھی جاتی تھی، عیسائیت میں عورت سے تعلق رکھنا مکروہ خیال کیا جاتا تھا اور اسی کراہت کے تصور نے ان کے ہاں رہبانیت کو فروغ دیا تھا۔ سولہویں، سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں بھی عورت کو کوئی باوقار مقام حاصل نہ تھا۔ ان کے چوٹی کے فلسفی حتیٰ کہ نطشے تک یہ مشورہ دیتے کہ ”عورت کے پاس جاؤ تو اپنا کوڑا ساتھ لے جانا نہ بھولو“ اسی طرح ہیگل نے بھی عورت کو نامکمل اور کمزور فرد قرار دیا۔ انیسویں صدی میں جب

انگلستان کا سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا، عورت اس دور میں بھی انتہائی مظلوم تھی۔ مرد چند ٹکوں کے عوض اس کو بازار میں بیچ سکتا تھا۔ وہ جب چاہتا اس کے گلے میں رسی ڈال کر بازار لے جاتا، بھیڑ بکریوں اور جانوروں کی طرح گھسیٹا ہوا اسے جا کر بازار میں درخت سے باندھ دیتا۔ 30 جنوری 1817ء کو ایک جنٹلمین نے اپنی بیوی صرف ایک شلنگ 6 پنس میں فروخت کی تھی۔^[۱] فرانس اور جرمنی کی عورت کا بھی یہی حال تھا، مردانہ تشدد عورتوں پر بے پناہ تھا۔ جب وہ درد سے چیختی تو ان کی چیخ و پکار پر مرد قہقہے لگاتے۔ عورت کی تعلیم کا سرے سے کوئی تصور نہ تھا۔ وہ وراثت کے حق سے بھی محروم تھی، بلکہ وہ کسی بھی چیز کی ملکیت کے حق سے محروم تھی۔ وہ اپنے نام سے یا اپنی ذات کے لیے کوئی چیز نہ خرید سکتی تھی۔ طلاق لینا بھی عیسائیت میں ناممکن تھا، غرض عورت اس دور میں ذلت و بے بسی کا دوسرا نام تھا، اگر مرد اپنی بیوی کو قتل بھی کر ڈالتا تو کوئی پوچھنے والا نہ تھا اس طرح بہت سی عورتیں اپنے ہی شوہروں کے ہاتھوں دار فانی سے کوچ کر جاتیں۔

یورپ میں ستر لاکھ عورتوں کو جادوگریاں کہہ کر زندہ جلا دیا گیا تھا، اسی طرح جان آف آرک کو بھی جادوگرانی قرار دے کر پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان اور پادریوں نے مل کر زندہ جلا ڈالا۔ بعد میں یورپ نے اس کو ولی قرار دے کر سینٹ کا درجہ عطا کر دیا۔^[۲]

مگر جب اٹھارھویں صدی میں یورپ میں موجودہ جمہوری اور صنعتی دور شروع ہوا، جدید یورپ کے معماروں نے پرانے نظام تہذیب و تمدن کے خلاف آواز بلند کی، جس کی بنیاد جاگیرداری اور پاپائیت تھی، تو اس کے نتیجے میں 1789ء میں انقلاب فرانس رونما ہوا، حریت فکر و عمل کا دور دورہ شروع ہوا، علوم و فنون نے ترقی کی، صنعتیں اور کارخانے قائم ہوئے۔ لوگ دیہاتوں سے اٹھ کر کاروبار کی خاطر شہروں کی طرف منتقل ہونے لگے، دیہاتوں کی آبادی کم ہونے لگی، جبکہ شہروں پر آبادی کا بوجھ بڑھنے لگا۔ بڑے بڑے شہر آباد ہوئے، خوشحالی کا دور دورہ شروع ہوا، معیار زندگی بلند ہونے لگا۔

[۱] از: ڈاکٹر ارم بلوچ، صفحہ: 64 Sexual Life in England

[۲] سٹوری آف ویمن، صفحہ: 199، از: ڈبلیو جارج

مگر اس صنعتی انقلاب کے نتیجے میں بہت سے مسائل بھی پیدا ہوئے مثلاً معیار زندگی بلند ہونے سے اشیاء کی قیمتیں بڑھیں۔ کم آمدنی والے لوگوں کو گزارا کرنا مشکل ہو گیا۔ اس عالم میں عورت آگے بڑھی، کسب معاش میں مرد کا ہاتھ بٹانے لگی۔ پھر جب عورت کسب معاش میں سرگرم عمل ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ اسے پہلی مرتبہ چند ایسے حقوق مل رہے ہیں جن سے وہ سدا سے محروم چلی آتی تھی۔ پہلے وہ ذلیل اور حقیر تھی، اب اس کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ پہلے وہ تعلیم کے حق سے بالکل محروم تھی، اب اس کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے مواقع بھی ملنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کی تمام خفیہ صلاحیتیں جو غلط تصورات کے تحت دب چکی تھیں، اب ابھرنے لگیں۔ اب عورت نے جہاں گھر کو معاشی سہارا دیا وہاں دوسرے معاشرتی کاموں میں بھی حصہ لینے لگی۔ ہسپتالوں میں بیماروں کی تیمارداری کی۔ رفاہ عامہ کے کاموں میں آگے بڑھی۔ اس طرح نئی نسل کو بہتر ماحول فراہم کیا اور ان کی اچھی طرح تربیت کی۔

ارتقاء:

مگر معاشی میدان میں مصروف رہنے کے بعد عورت نے محسوس کیا کہ اس کے لیے سارا دن دفتر اور کارخانے میں کام کرنا، پھر اس کے بعد گھر آ کر گھریلو امور بھی انجام دینا اور بچوں کی پرورش کرنا دوہری مشقت ہے، تو اس نے بعض ایسی ذمہ داریوں سے فرار اختیار کرنا شروع کیا جو فطرت نے اس پر عائد کی ہیں۔ دوران حمل اسے اپنے کام سے تو چھٹی لینا پڑتی تھی، پھر وضع حمل کے بعد بچے کو دودھ پلانا بھی اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ بچے کو دوران ملازمت ساتھ بھی نہ لے کر جاسکتی تھی، اور گھر میں اس کے لیے ملازمہ رکھے تو معاشی طور پر بھی وہ اتنا بندوبست نہ کر پاتی تھی۔ نہ ہی بچے کی پرورش کی خاطر لمبے عرصے تک چھٹی لے سکتی تھی۔

اس مشکل کا حل یہ سوچا گیا کہ بچوں کی نگہداشت کے خصوصی مراکز (Child Care Centers) بنادیئے گئے جن کے اخراجات کی ذمہ داری بھی ماں باپ پر تھی، لیکن اس کے باوجود مشکل برقرار رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عورت مادرانہ فرائض انجام دینے سے گریز کی راہ اختیار کرنے لگی۔

عورت نے کسب معاش کی راہ پر چلنے سے دو قسم کے نتائج محسوس کیے:

(1) اب وہ مردوں کی بالادستی سے کچھ حد تک آزاد ہو رہی تھی۔

(2) مرد اور عورت کی اجرتوں اور معاوضوں میں بڑا فرق تھا۔ وہی کام جب مرد کریں تو ان کی تنخواہ زیادہ اور عورتیں کریں تو ان کی اجرت کم، لہذا پہلے نمبر پر اس نے اجرت میں مساوات کا مطالبہ کیا مگر جب اسے یہ مساوات نہ مل سکی تو اس نے اپنے حقوق حاصل کرنے اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے ووٹ دینے کا حق طلب کیا۔ مگر قانون مرد کے ہاتھ میں تھا، وہ عورت کو مساوی اجرتیں دینے پر رضامند نہ تھا، بلکہ عورت نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایک جرم اگر مرد کرے تو اس کی سزا ہلکی مگر وہی جرم عورت سے سرزد ہو تو سزا زیادہ سنگین..... مجبور ہو کر عورت نے پارلیمنٹ میں اپنے لیے نمائندگی کا حق مانگا اور مساوات مرد و زن کا نظریہ پیش کیا۔ مساوات کے لیے پہلی آواز میری وولسٹن کرافٹ (Mary Wollstone Craft) نے اپنی کتاب ”حقوق نسواں“ (Vindication of the Rights of Women) کے ذریعہ سے بلند کی۔ یہ مصنفہ برطانیہ کے ایک دہریہ فلسفی ناول نگار کی بیوی تھی۔ اس نے 1792ء میں اس کتاب میں یہ مطالبہ پیش کیا:

”تعلیم، روزگار اور سیاست کے میدانوں میں عورتوں کی وہی حیثیت تسلیم کی جائے جو مردوں کو حاصل ہے۔ مزید دونوں صنفوں کے لیے اخلاقی معیار بھی یکساں ہونا چاہیے۔“

یہ آواز پہلے برطانیہ میں اٹھی پھر یورپ اور امریکہ میں بھی پھیل گئی۔ بعد ازاں یہ نظریہ آہستہ آہستہ پھیلنے لگا، اس کے حق میں دلائل بھی فراہم ہونے لگے۔ جلد ہی یہ تحریک یورپ اور امریکہ میں پھلنے پھولنے لگی، پھر زندگی کے ہر شعبے میں مساوات حاصل کرنے کا نظریہ ترقی پسندانہ نعرے کی حیثیت اختیار کر گیا اور اس کے خلاف کوئی بات کرنا پسماندگی کی علامت قرار دیا جانے لگا۔ ساتھ ساتھ فیملی پلاننگ کی تحریک بھی بڑھنے پھولنے لگی۔

امریکہ میں خواتین نے انیسویں صدی کے شروع میں دفتروں اور کارخانوں وغیرہ میں کام کرنا شروع کیا۔ اس سے قبل وہ صرف گھریلو امور انجام دیتی تھیں۔ امریکی خواتین کی تحریک میں اس

وقت جوش و خروش پیدا ہوا جب 1848ء میں نیو یارک کے قریب سینکا فالز (Seneca Falls) کے مقام پر حقوق نسواں کے لیے ایک ملک گیر کنونشن منعقد ہوا۔ اس کنونشن میں شریک خواتین نے ایک مشہور و معروف ”جذبات کا منشور“ (Declaration of Sentiments) پیش کیا۔ یہی منشور بعد میں خواتین کی تمام سماجی سرگرمیوں کی بنیاد بنا۔ اس منشور کا خلاصہ یہ تھا:

”تاریخ انسانی گواہ ہے کہ عورت ہمیشہ مرد کے ظلم و ستم کا شکار رہی ہے۔ آج بھی عورت کی یہ حالت ہے کہ موجودہ جمہوری نظام سیاست میں اس کی کوئی آواز اور شنوائی نہیں۔ اسے عوامی نمائندگی کا حق حاصل نہیں۔ مرد اپنی مرضی سے حکومت کے اختیارات پر قبضہ کر کے عورتوں کے خلاف قانون سازی کرتا ہے اور عورتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ مردوں کے بنائے ہوئے ایک طرفہ اور من مانے قوانین کی پابندی کریں۔ ملک کے جاہل اور گنوار مردوں کو وہ حقوق حاصل ہیں جن سے تعلیم یافتہ عورتیں بھی بالکل محروم ہیں۔ معاشرے میں شادی شدہ عورت زندہ درگور ہے۔ اسے ملکیت کا حق حاصل نہیں یہاں تک کہ جو کچھ وہ خود کماتی ہے، وہ بھی اس کا اپنا نہیں ہے۔ اس کی کمائی کا مالک بھی اس کا شوہر ہوتا ہے۔ بوقت شادی عورت سے یہ عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ہر جائز و ناجائز حکم کو مانے گی۔ تمام اچھی ملازمتوں پر مردوں کی اجارہ داری ہے، عورتوں کو مردوں سے کم تنخواہ دی جاتی ہے۔ آج ایک عورت بھی مذہبی معلم، ڈاکٹر یا قانون دان نہیں ہے۔ اسے کالجوں میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ وہ کسی بھی تعلیمی ادارے میں جا کر تعلیم حاصل نہیں کر سکتی۔ مذہب کا میدان ہو یا سیاست کا، عورت صرف ماتحت اور محکوم ہے۔ اس ملک میں ہم محسوس کرتی ہیں کہ ہمیں مذہبی و معاشرتی طور پر ذلیل و خوار کیا گیا ہے۔ ہم مظلوم ہیں۔ ہمارا استحصال ہوا ہے۔ ہمیں ہمارے جائز حقوق نہیں دیئے گئے، اب ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہمیں امریکہ کے مرد شہریوں کے برابر اور مساوی حیثیت دی جائے۔“

”ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں اپنے مقصد کے حصول میں بہت سی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا مگر ہم ہمت نہیں ہاریں گی۔ جائز ذرائع اور پرامن طریقے سے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گی۔ ہم جگہ جگہ کنونشن منعقد کر کے رائے عامہ کو ہموار کریں گی تاکہ حکومت سے اپنے جائز

مطالبات منوائیں۔“ [۱]

پھر اسی ”منشور جذبات“ میں طے کردہ ایجنڈے کے مطابق انہوں نے اپنی جدوجہد قراردادوں اور مظاہروں کی شکل میں جاری رکھی جس کے نتیجے میں اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی دوران پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا عظیم سانحہ پیش آیا۔ ان میں بہت سے مرد ہلاک ہو گئے۔ مردوں کی تعداد میں خاصی کمی واقع ہونے سے عورتوں کو گھروں سے نکل کر باہر کام کرنے کے بہت زیادہ مواقع مل گئے، ان میں مزید خود اعتمادی پیدا ہوئی اور اسی دور سے ان کو وقتاً فوقتاً کچھ حقوق ملنے لگے اور اس تحریک میں بھی بہت تیزی پیدا ہوئی۔ بالآخر عورتوں کو ووٹ دینے کا حق مل گیا۔ امریکہ میں یہ حق 1920ء میں، برطانیہ میں 1918ء میں، سویٹزرلینڈ میں 1917ء میں اور فرانس میں 1946ء میں مل گیا۔ جبکہ یو۔ این۔ او کی طرف سے یہ حق خواتین کو 1952ء میں ملا۔

انہیں ذاتی ملکیت رکھنے کا حق بھی مل گیا۔ جنس کی بنا پر مرد و عورت کا امتیازی سلوک ممنوع قرار پایا۔ عورتوں کے لیے مردوں کے مساوی قوانین بنے اور یکساں حقوق بھی تسلیم کیے گئے۔ عورت کو طلاق دینے کا حق بھی مل گیا۔

اب عورت آزاد فضا میں آزادی اور خود اعتمادی محسوس کرنے لگی۔ وہ شانہ بشانہ مرد کے ساتھ ہر جگہ کام کرنے لگی۔ حتیٰ کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں یہ شق رکھوانے میں بھی کامیاب ہو گئی کہ عورت اور مرد کے تمام حقوق یکساں اور برابر ہیں۔ پھر اس نے اسقاط حمل کا حق بھی مانگا جو 1970ء میں اسے مل گیا۔

یو۔ این۔ او نے مرد و عورت کے حقوق یکساں بنانے کے لیے ابتدا ہی میں ایک باقاعدہ کمیشن تشکیل دیا تھا، یہ کمیشن خواتین کی حیثیت کا جائزہ لینے اور ان کے حقوق کو تقویت دینے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

اس کمیشن نے 30 سال کام کرنے کے بعد ایک دستاویز تیار کی جس کا نام

[۱] اسلام اور نظریہ مساوات مرد و زن، صفحہ: 18-19-20، از: محمد رفیق چوہدری

CEDAW Document (Convention of U.N.O on the Elimination of all kind of Discrimination Against Women)

یعنی ”خواتین سے ہر قسم کے امتیاز کے خلاف یو۔این۔او کا کنونشن۔“ اس ”سی ڈا“ کی دستاویز کو 18 دسمبر 1979ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تسلیم کیا۔ 1981ء میں یو۔این۔او کے بیس ممالک نے اس دستاویز پر رضامندی اختیار کی، جبکہ اس کنونشن کی دسویں سالگرہ کے موقع پر یو۔این۔او کے ایک سو ممالک اس پر دستخط کر چکے تھے، جن میں دس مسلمان ممالک بھی شامل تھے۔ کمیشن نے خواتین سے ہر قسم کے امتیاز کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہر پہلو سے مرد و عورت کے درمیان مساوات قائم کرنے کے لیے تجاویز اور سفارشات پیش کیں۔ کنونشن اپنے تمام ممبر ممالک پر زور دیتا ہے کہ وہ قانون سازی کے ذریعے سے مردوں و عورتوں کا ہر قسم کا امتیاز ختم کریں۔ تعلیم، سیاست، ملازمت، معاشی و اخلاقی اور معاشرتی غرض ہر میدان میں عورت برابر کے حقوق کی مستحق ہے۔ اس دستاویز کی کل 30 دفعات میں پہلی سولہ تو اپنے اپنے ممالک میں دونوں کے حقوق کو مساوی کرنے کے وعدوں پر مشتمل ہیں۔ جبکہ باقی 14 نکات عمل کرنے والی کمیٹی تشکیل دینے کے بارے میں ہیں، جو کنونشن پر عمل کی رفتار کا جائزہ لیتی ہے۔ ستمبر 1994ء میں قاہرہ میں یو۔این۔او کی طرف سے ”بہبود آبادی کانفرنس“ کے نام سے ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں ممبر ممالک (خصوصی نشانہ مسلم ممالک تھے) میں جنسی بے راہروی اور کنڈوم کلچر رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔ بعد ازاں ستمبر 1995ء میں بیجنگ میں خواتین کی ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد ہوئی جو یو۔این۔او کی طرف سے خواتین کی چوتھی بڑی عالمی کانفرنس تھی۔ مندرجہ بالا ”سی ڈا“ کی دستاویز کی روشنی میں اس کانفرنس کا ایجنڈا تیار ہوا تھا، جس میں

□ ”سی ڈا“ ڈرافٹ کے چیدہ چیدہ نکات: تعلیم، ملازمت، معاشی و سماجی معاملات و کارکردگی میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دیئے جائیں۔ شادی کے لیے ساتھی کے چناؤ میں، والدین بننے کا حق، جائیداد کے حقوق وغیرہ میں بھی مرد و عورت یکساں ہونے چاہئیں۔ بچے کی پیدائش کا انحصار عورت کی مرضی پر ہو مگر پرورش کے ذمہ دار مرد و عورت دونوں برابر کے ہوں۔ عورت کی قومیت کا شوہر کی قومیت سے بالکل کوئی تعلق نہ ہو وغیرہ۔ کچھ مزید بے باکانہ مطالبات بھی تھے جو ”بیجنگ ڈرافٹ“ میں بیان کیے گئے ہیں۔

تقریباً دنیا کے دو سو ملکوں کے پچاس ہزار نمائندے شامل ہوئے، تیس ہزار کے قریب سرکاری جبکہ بیس ہزار کے قریب این۔ جی۔ او (یعنی غیر سرکاری تنظیمیں)۔ اس کانفرنس کے ایجنڈے کا نام ”بیجنگ ڈرافٹ“ تھا۔ 121 صفحات پر مشتمل اس بیجنگ ڈرافٹ کی چیدہ چیدہ دفعات درج ذیل ہیں:

- (1) مرد و عورت میں کوئی فطری فرق موجود نہیں ہے۔
- (2) عورت کے روایتی کردار (یعنی بحیثیت ماں، بیٹی، بیوی وغیرہ) کو اس ڈرافٹ میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔
- (3) اسمبلیوں اور دیگر منتخب اداروں میں خواتین کو 50% ہونا چاہیے۔
- (4) معاشرے کے ڈھانچے کو اس طرح تبدیل کیا جائے کہ مرد و عورت میں برابری وجود میں آ سکے۔
- (5) ملازمتوں میں 50% کوٹہ عورتوں کے لیے مخصوص کیا جائے۔
- (6) بچے پیدا کرنے کا حق عورت کو ملنا چاہیے۔ یعنی اس پر خاوند یا کسی اور کا دباؤ نہ ہو۔ اپنی مرضی و اختیار ہو، چاہے تو بچے کو جنم دے اور چاہے تو نہ دے۔
- (7) اسقاط حمل کو جائز قرار دیا جائے اور اس کا حق عورت کے پاس ہونا چاہیے۔
- (8) عورتوں کو بھی ہم جنس پرستی کی قانونی اجازت دی جائے۔ اسی طرح جسم فروشی کی بھی قانونی اجازت ہونی چاہیے۔
- (9) اس ڈرافٹ میں شادی نکاح وغیرہ کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔
- (10) اس میں بنیاد پرستی پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ اسی طرح خود مذہب پر بھی تنقید کی گئی ہے کہ یہ عورت کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

یہ یو۔ این۔ اے کے پلیٹ فارم سے منعقد ہونے والا سب سے بڑا خواتین کا اجتماع تھا۔ گویا مردوں کی مخالفت کرتے کرتے عورتیں اس انتہا کو پہنچ گئی ہیں جس کو تذلیل انسانیت کہنا زیادہ موزوں ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ یہ نکات پیش کرنے والی خواتین زیادہ تر وہ ہیں جو

گھریلو سکون سے محروم ہیں۔ خود کیتھولک عیسائیوں نے، پاپائے روم نے بلکہ مغرب کی بیشتر خواتین نے بھی بیجنگ کانفرنس کے بیشتر مطالبات کو غیر معقول قرار دیا۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک امر یہ ہے کہ مسلم ممالک کی خواتین بھی اس میں شامل ہوئیں۔ البتہ سوڈان اور ایران کی خواتین نے اس حیا باختہ ایجنڈے کی مخالفت کی۔ سعودی عرب نے اس میں شرکت ہی نہ کی۔ مگر پاکستان کی وزیراعظم اس کی چیئر پرسن بنیں اور پاکستان کی طرف سے اس ننگ نسواں ایجنڈے پر دستخط کر دیئے۔ غور کیا جائے تو اس کانفرنس کے اثرات بہت زیادہ دور رس اور تباہ کن ہیں۔

گویا مختصر اس کانفرنس کے دو نکات تھے: (۱) عورت کو ماں بننے پر مجبور نہ کیا جائے اور (۲) اگر بے راہ روی کے دوران میں وہ حاملہ ہو جائے تو حمل ضائع کرانا اس کا قانونی حق ہو، اسے جرم نہ سمجھا جائے۔

نظریہ مساوات مرد و زن کے نتائج:

حقیقت یہ ہے کہ مساوات مرد و زن کا نظریہ ایک دھوکہ ہے اور ایک فریب ہے، جس کی عملی زندگی میں کوئی حقیقت نہیں، فطری روش چھوڑ کر مصنوعی طریقے اپنانے سے انسان بے شمار دنیوی و اخروی نقصانات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خَیْرَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَةِ [۱] کا مصداق بن جاتا ہے۔ مغرب میں عورت کی موجودہ حالت زار بھی اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔

(i) خاندانی نظام کی تباہی:

عورت اور مرد دوش بدوش کام کر رہے ہیں۔ مگر گھراب خالی ہو گئے ہیں، بچے ماؤں سے، شوہر بیویوں سے اور گھر گھر والیوں سے محروم ہوئے ہیں۔ بیمار اور بوڑھے کسی ہمدرد اور غمخوار کو ترس گئے ہیں، خاندانی نظام مکمل طور پر تلیٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ افراد خانہ کے اندر محبت و الفت کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور انسان اس سکون سے محروم ہو گیا جو صرف خاندان ہی فراہم کر سکتا ہے۔ خاندان کا ٹوٹنا دراصل پورے معاشرے کا درہم برہم ہونا ہے، یہ اتنا بڑا خسارہ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ اسے زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔

[۱] قرآنی آیت جس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی دنیا بھی خراب کی اور آخرت بھی۔ (سورۃ الحج: آیت نمبر ۱۱)

(ii) جنسی بے راہ روی:

گھر کے سکون کو لات مار کر عورت گھر سے جو نکلی تو گھر سے باہر ہزاروں ہوسناک نگاہوں کا شکار ہوئی، مرد و عورت کے آزادانہ اور بے باکانہ اختلاط کی وجہ سے جنسی آزادی کا رجحان عام ہو گیا، بدکاری عام ہو گئی پھر ایسی سنگی اور بے حیا تہذیب نے جنم لیا کہ شرم و حیا اور شرافت کا دم گھٹ کر رہ گیا۔ تعلیمی اداروں میں بھی یہ بے راہ روی حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ امریکہ کے جج ”لنڈسے“ نے ایک جائزہ کے بعد رپورٹ دی کہ ”ہائی سکول کی کم عمر والی چار سو پچانوے لڑکیوں نے خود مجھ سے اقرار کیا کہ ان کو لڑکوں سے جنسی تعلقات کا تجربہ ہو چکا ہے اور کم از کم سکول کی 45% طالبات ان تجربات سے گزر چکی ہوتی ہیں۔^[1]

اپنی فطری کمزوریوں کے باعث عورت دفاتروں اور کارخانوں میں مردوں جتنا کام کر سکی نہ ان کے برابر معاوضہ پاسکی، مگر اپنے ہر پاس کی جنسی تسکین کے لیے کھلونا ضرور بنی۔ مانع حمل ادویات کے استعمال کرنے کے باوجود اپنی فطری ذمہ داریوں سے چھٹکارا نہ پاسکی۔ ناجائز بچوں کی کثرت ہونے لگی۔ پھر ان ناجائز بچوں کو پالنا بھی تنہا عورت کی ذمہ داری قرار پائی۔ لہذا عورتوں نے اسقاط حمل کا راستہ اختیار کیا۔ بارہ برس سے بھی کم عمر بچیاں خود اپنے گھروں میں اپنے باپ دادا، بھائی کی ہوسناکی کا شکار ہو رہی ہیں، کنواری ماؤں کا مسئلہ بڑا گھمبیر ہو گیا ہے۔ عصمت و عفت کے آگینے اس طرح چور چور ہو رہے ہیں کہ 14 یا 15 برس کی عمر تک شاید ہی کوئی لڑکی کنواری رہ جاتی ہو۔ لہذا اسقاط حمل قانوناً جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ مغرب میں زنا بالجبر کے واقعات اتنے زیادہ رونما ہو رہے ہیں کہ لڑکا پہلی ملاقات میں لڑکی کو Date دے دیتا ہے۔ پھر مقررہ تاریخ کو جب دونوں ملتے ہیں تو عمومی نتیجہ زنا بالرضا و اگر نہ زنا بالجبر ہوتا ہے اور زنا کے 75% واقعات زنا بالجبر ہی ہوتے ہیں۔ یہ جنسی تشدد اور بدکاری مرد و عورت کے ہر جگہ مساوی اور پہلو بہ پہلو بیٹھنے کا نتیجہ ہی تو ہے۔ زنا بالجبر کے خلاف لڑکی عدالت میں چلی بھی جائے تو مرد جج عموماً مردوں ہی کی حمایت کرتے ہیں۔

[1] پردہ، از: مولانا مودودی، صفحہ 104۔ یہ رپورٹ 1936ء کے لگ بھگ کی ہے۔ اب معاملہ تقریباً سو فیصد تک جا چکا ہے۔

لہذا عملاً سزا مل سکنے کی وجہ سے عورتوں کو مجبوراً اسی صورتحال سے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔

(iii) ناجائز بچوں کی کثرت:

وہاں اسقاط حمل جائز قرار پانے کے باوجود ناجائز اور غیر قانونی بچوں کی کثرت ہو رہی ہے، مغربی بچوں کی کم از کم 50% تعداد غیر قانونی بچوں کی ہے اور یہ بچے تنہا عورت یعنی کنواری ماں کا درد سر ہیں، یہی صورت حال فرانس میں ہے کہ اس کا ہر دوسرا بچہ ناجائز ہے جبکہ برطانیہ میں ہر چوتھا بچہ غیر قانونی ہے۔ اب ناجائز اور جائز بچوں میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ ایسے قوانین بنا دیئے گئے ہیں کہ کنواری ماؤں کو پورا تحفظ حاصل ہو۔

(iv) طلاق کی کثرت:

مساوات مرد و زن کے نتیجے میں وہاں طلاق کی شرح بہت بڑھ گئی ہے، عورت نے بھی طلاق دینے کا حق حاصل کر لیا ہے۔ اب وہاں معمولی معمولی باتوں پر دونوں میں جدائی ہو جاتی ہے، ازدواجی زندگی ویسے ہی محبت، خلوص اور باہمی اعتماد سے عاری ہے، لہذا ہر تیسری شادی کا انجام طلاق کی صورت میں نمودار ہو رہا ہے۔ پھر طلاق کے نتیجے میں بھی عورت کو اپنا اور بچے، دونوں کا خرچہ خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اگرچہ قانوناً مرد کو طلاق کے بعد عورت کو نان نفقہ دینا چاہیے مگر وہ معاشرہ جو عام حالات میں عام عورت کو خود کمانے پر مجبور کرتا ہے، تو طلاق کی صورت میں وہاں اس کی دادرسی کیسے کر سکے گا؟

(v) بچوں میں خودکشی کا رجحان:

اس جرائم زدہ سوسائٹی میں بچوں میں ڈپریشن اور اس کے نتیجے میں خودکشی کی شرح بہت بڑھ گئی ہے۔ منشیات کو بھی اسی وجہ سے مغربی معاشرہ میں بڑا فروغ مل رہا ہے، عموماً بچے تنہائی کے کرب اور بے سہارگی کے صدمے سے دوچار ہو کر خودکشی کرنے لگتے ہیں۔ جو بچے بچ جاتے ہیں وہ بھی انتہائی بدسلوکی کا شکار ہوتے ہیں۔ مغربی معاشرہ انسانوں سے زیادہ حیوانوں سے پیار کرتا ہے، پھر عورتوں کی ملازمت اور عیش کوشی، علاوہ ازیں کثرت طلاق اور کثرت زنا کی بنا پر بھی

بچے ماں باپ کی شفقت و محبت سے محروم بالکل آوارہ چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح بچے Child Care Centers میں پرورش پاتے ہیں تو بہت سی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو کر خودکشی میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ برطانیہ کے روزنامہ ”گارڈین“ نے مورخہ 13 اکتوبر 1983ء کی اشاعت میں ایک مضمون لکھا:

”بچوں پر توجہ کون دیتا ہے؟“

اور اس میں دلخراش حقائق بیان کیے گئے۔ مثلاً ایک لاکھ بچے اداروں میں پل رہے ہیں، اٹھارہ ہزار بچے ماں باپ کی طرف سے بدسلوکی کا شکار ہیں۔ بچوں کی شرح اموات بہت زیادہ ہے۔ یہ کیا مذاق ہے کہ اہل برطانیہ اپنے بچوں سے زیادہ جانوروں سے محبت کرتے ہیں۔ جانوروں کے لیے تو ”شاہی سوسائٹی“ کی طرف سے تحفظ حاصل ہے جبکہ بچوں کے لیے صرف قومی ادارہ ہے؟^[1]

یہی وجہ ہے کہ تعلیم گاہوں میں شراب، منشیات، اسلحہ، مار دھاڑ اور جرائم کی کثرت ہو چکی ہے۔

(vi) معذور بوڑھے:

معمر افراد مغربی معاشرہ میں بہت پریشان حال ہیں اور حکومت کے سرکاری ضعیف خانوں (Old Age Homes) میں پل رہے ہیں، حکومت ہی ان کی معذوری اور بڑھاپے کا واحد سہارا ہے، کیونکہ ضعیف والدین کی خدمت کرنا ویسے ہی مغربی معاشرتی روایات کے خلاف ہو چکا ہے۔

[1] برطانیہ کی بیشتر ماؤں نے بچوں کو فیڈر دینے کی ذمہ داری بھی بندروں کے سپرد کر دی۔ اپنا دودھ پلانا تو انہوں نے مدت سے ترک کر دیا تھا۔ بعض برطانوی مائیں بندروں کو عیسیٰ تبدیل کرنے کی تربیت بھی دے رہی ہیں۔ (روزنامہ ”خبریں“ لاہور 96-10-31)

(vii) عورت پر مردانہ تشدد:

عورت اور مرد کے درمیان حقوق کی جنگ نے عورت کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مرد کی طرف سے عورت کے ساتھ کسی بھی موقع پر ہمدردی کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ چاہتے ہیں کہ عورت ان کا حکم مانے مگر عورت کماتی بھی ہے اور خانہ داری بھی انجام دیتی ہے۔ وہ ان کی حاکمیت تسلیم نہیں کرتی نتیجہ میں مرد عورتوں پر بہت زیادہ جسمانی تشدد کرتے ہیں اور اگر عورت آگے سے بھاگے تو سنگین ضربیں، زخم بلکہ اموات تک واقع ہونے لگتی ہیں۔ یہ مردانہ تشدد سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔

(viii) ہم جنس پرستی:

جنسی جرائم اتنے بڑھے کہ آہستہ آہستہ ایک طرف عورت نے شادی سے گریز کا راستہ اختیار کیا چنانچہ شادی کے بغیر لاکھوں نوجوان جوڑے اکٹھے رہ رہے ہیں دوسری طرف ہم جنس پرستی بھی وبا کی طرح پھوٹ نکلی۔ اسی ہم جنس پرستی نے مغربی دنیا کو ایڈز کا تحفہ دیا۔ اب خود مغرب کے دانشور خوب چیخ چیخ کر لوگوں کو ایڈز سے بچانے کے لیے ہم جنس پرستی سے بچنے کی تلقین کر رہے ہیں، مگر وہاں قانوناً ہم جنس پرستی جائز قرار دی جا چکی ہے۔ اب امریکہ میں ایڈز کے متعلق زوردار مہم چلائی جا رہی ہے کہ ”ایٹم بم سے مرنا اتنا مہلک نہیں ہے جتنا ایڈز سے مرنا“ اس لیے ایڈز سے محتاط رہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آتشک، سوزاک وغیرہ جنسی بیماریاں بھی مغرب میں بے شمار ہیں مگر جو تباہی ایڈز نے مچائی ہے اس کے پیش نظر مغربی ذرائع ابلاغ اس کو اپنے لیے خطرہ نمبر 1 قرار دے رہے ہیں۔

(ix) عصمت فروشی:

امریکہ میں عصمت فروشی ایک کاروبار ہے، جس کے منظم اڈے قائم ہیں۔ جس میں یورپ، ایشیا اور امریکہ کی بڑی بڑی نامی گرامی شخصیات کے نام بھی ہیں، نیویارک پولیس کے ایک لیفٹیننٹ ولیم بارک کا کہنا ہے کہ یہاں تقریباً 30 منظم اڈے [1] ہیں جہاں تیس سے ساٹھ تک

[1] یہ 1990 کے اعداد و شمار ہیں، آج اس میں کتنے گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

نوجوان لڑکیاں ملازم ہیں۔ یہ لوگ آزادانہ طور پر اخبارات میں اپنی تشہیر کرتے ہیں۔ مسز بیروز کا کاروبار جسم فروشی ہے، اس کے پاس 30 لڑکیاں ملازم ہیں۔ فی گاہک ایک گھنٹہ کے لیے وہ تقریباً پانچ ہزار روپیہ وصول کرتی ہے۔ اس کی زیادہ تر لڑکیاں کسی کالج یا یونیورسٹی کی زیر تعلیم ہیں، کچھ ماڈل گرل یا اداکارہ ہیں۔ وہ انہیں کاروبار کرنے سے پہلے باقاعدہ طور پر اس پیشے کے آداب کی تربیت دیتی ہے۔ وہ خود بھی گریجویٹ ہے، انہیں غیر ملکی زبانیں بھی سکھاتی ہے۔ ابتداء میں صرف دو گھنٹے انہیں جسم فروشی کرنا ہوتی ہے۔ مسز بیروز کا کہنا ہے کہ اس کے زیادہ تر گاہک کروڑ پتی سرمایہ دار اور تاجر ہیں جن میں عرب کے بعض شیوخ بھی شامل ہیں۔^[۱]

امریکہ میں 82% مرد شادی سے پہلے جنسی تجربہ حاصل کر چکے ہوتے ہیں جبکہ 50% عورتیں۔ پھر عورتوں کو کام کے دوران میں بھی جنسی طور پر بہت ہراساں کیا جاتا ہے۔^[۲]

پھر زنا بالجبر کے کیس عدالتوں میں جاتے ہیں، جج بھی عموماً مردوں ہی کے حق میں ہمدرد ہوتے ہیں۔ فرانس میں عدالت میں آنے والے ایسے کیسوں کی تعداد 805 تھی، مگر عدالتیں عموماً مردوں کو بری کر دیتی ہیں۔ محرمات سے بدکاری عام ہے۔ 1920ء میں امریکہ میں 6 فلمیں محرمات سے نکاح پر مبنی دکھائی گئی تھیں۔ مگر 1960ء میں 79 فلمیں محرمات سے نکاح کے بارے میں تیار ہوئیں۔^[۳]

ان جنسی تجربوں سے اسقاط حمل کے باوجود بے شمار حمل قرار پائے ہیں، پھر اس کا نتیجہ مجبوراً شادی یا غیر قانونی بچہ ہوتا ہے۔ بے شمار مانع حمل ادویات کے باوجود یہ امر حیران کن ہے کہ پھر بھی حمل کی شرح میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

(X) بچوں کا جنسی استحصال:

ہفت روزہ ”ایشیا“ کی اشاعت 26 ستمبر 96ء نے اس استحصال کی رپورٹ یوں بیان

[۱] روزنامہ امن کراچی (بحوالہ نیویارک امن نیوز) 15 نومبر 1984ء۔

[۲] مین اینڈ وومن صفحہ 129

[۳] مجلہ منہاج ”حیثیت نسواں نمبر“ حصہ سوم، صفحہ 83

کی ہے۔

”اس استحصال کی فبیج ترین شکل غریب بچوں کا جنسی استحصال ہے۔ مغرب میں معصوم بچوں سے جنسی بدسلوکی کی وبا بڑی عام ہے۔ اگست 96ء میں سویڈن میں پہلی مرتبہ بچوں کے جنسی استحصال کے حوالے سے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں اس ضمن کے اعداد و شمار کی خوفناک صورت حال نے سنجیدہ لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ شائع شدہ رپورٹ کے مطابق تجارتی پیمانے پر بچوں کے جنسی استحصال کے لیے پہلے سے موجود بچوں کی تعداد میں ہر سال 10 لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے، جن میں سے 90% لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان بچوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے والوں کی ہفتہ وار تعداد ایک کروڑ سے لے کر ایک کروڑ بیس لاکھ تک ہے۔ ہولناک بات یہ ہے کہ ان تہذیب یافتہ انسانوں کی ہوس کی تکمیل کے دوران میں فاحشہ گری کے شکار کل بچوں کی تعداد کا ایک تہائی، ایڈز کے جرثومہ HIV پازیٹو سے متاثر ہوتی ہے۔ اسی طرح غریب ممالک میں امیر ممالک سے آئے ہوئے سیاح بھی بچوں سے جنسی بدسلوکی کرتے ہیں۔

اس کے فبیج نتائج میں بے حیائی و باکی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ خود گھربچوں کے لیے خطرناک شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں باپ بیٹی کے تعلقات کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اب یہ وبائی شکل اختیار کر گئے ہیں۔^[۱]

محرمات میں زنا کثرت سے پھیل رہا ہے۔ پھر ان محرمات میں سے بھی بچے زیادہ تر شکار بن رہے ہیں۔ رابن لنڈ سے جوڈ نور کی عدالت میں ”جرائم اطفال“ کا صدر تھا، امریکی نوجوانوں کے اخلاق سے بہت واقف تھا، اپنی رپورٹ میں بیان کرتا ہے کہ 312 لڑکیوں کے حالات کی تحقیق کی گئی تو ان میں سے 255 ایسی تھیں جو گیارہ اور تیرہ برس کے درمیان عمر میں بالغ ہو چکی تھیں اور ان میں ایسی جنسی خواہشات پیدا ہو چکی تھیں جو اٹھارہ سال یا اس سے زیادہ عمر کی لڑکی میں ہونی چاہئیں۔^[۲]

[۱] از: ڈیوڈ فلینکلر صفحہ 88 Sexually Victimized Children

[۲] پردہ، از سید مودودی، جون 2012ء کی اشاعت کے مطابق صفحہ نمبر 84

پھر مدارس میں صحبت، ہم جنس پرستی اور خود کاری کی وبا پھیل رہی ہے۔ چنانچہ تعلیم گاہوں، کالجوں، نرسنگ کے ٹریننگ سکولوں اور مذہبی مدرسوں میں اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ ایک ہی صنف کے دو افراد آپس میں جنسی تعلق رکھتے ہیں اور صنف مخالف سے ان کی دلچسپی فنا ہو چکی ہے۔ چنانچہ ایسے بکثرت واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکیاں لڑکیوں کے ساتھ اور لڑکے لڑکوں کے ساتھ ملوث ہوئے اور دردناک انجام سے دوچار ہوئے۔ [۱] سکولوں، کالجوں، فیکلٹیوں، کارخانوں غرض کسی جگہ عورت کی عزت محفوظ نہیں، پھر ان کام کرنے والی خواتین کی نوخیز بچیاں بھی اسی طرح جنسی مظالم کا شکار ہونے لگتی ہیں۔

ہمہ گیر معاشرتی بگاڑ:

عورت کو خاندان کے نظام سے الگ کر کے معاشی میدانوں میں مصروف کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ بیک وقت خاندان، معاشرہ اور ریاست تینوں کی تباہی کے اثرات رونما ہو رہے ہیں۔ اس پر مرزا محمد حسین اپنی کتاب "Islam and Socialism" میں مغربی عورت کی حالت زار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اہل مغرب جو ساری دنیا پر اپنی بالاتری قائم رکھنے کے خواہاں ہیں، گھریلو سکون اور عائلی مسرت سے بالکل نا آشنا ہیں۔ ان کے گھر ٹوٹے پھوٹے اور ہر وقت خانگی کشمکش کا شکار ہیں، ہزاروں گھرانوں کی یہ مصیبت زدہ کیفیت دیکھ کر ایک جج یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر تمام متاثرہ شوہر اپنے گھروں سے بھاگ نکلیں تو تقریباً 75% آدمیوں کو پبلک بندوبست کی ضرورت آن پڑے گی۔“

مغربی معاشرے میں خواتین کی اجتماعی حیثیت کے متعلق بیگم ثار فاطمہ مرحومہ نے کچھ دلچسپ اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

انگلستان:

پانچ ہزار پاؤنڈ تنخواہ پانے والے پچاس مردوں کے مقابلہ میں صرف ایک عورت اتنی تنخواہ

پاتی ہے۔

امریکہ:

امریکہ میں عورت نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں آئین میں ترامیم کروانے کی کوشش کی۔ چنانچہ 1920ء میں عورت کو ووٹ کا حق حاصل ہوا۔ یہاں عورتیں %51 ہیں مگر %37 عورتیں اپنی روزی کمانے کے لیے کام کرتی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر عورتوں کی تنخواہیں اور اجرتیں مردوں سے %22 کم ہیں۔ عملاً ملک کے تمام ادارے، صنعتیں، پیشے، یونیورسٹیاں، سپریم کورٹ، صدارتی کابینہ مردوں کے ہاتھ میں ہیں۔

قانونی طور پر عورتوں کی حیثیت مردوں کے برابر ہونے کی ترمیم 1970ء میں پاس ہوئی۔

فرانس:

1946ء میں عورت کو ووٹ دینے کا حق ملا۔ 1965ء میں اپنے نام سے بینک میں اکاؤنٹ رکھنے کا حق حاصل ہوا۔ وہاں قانونی طور پر عورت کو یہ حق 1977ء میں حاصل ہوا کہ عورت شوہر کی دخل اندازی کے بغیر اپنی ڈاک خود وصول کرے۔

جرمنی:

یہاں چند سال قبل عورتوں کی رائے معلوم کی گئی تو %68 عورتوں نے رائے دی کہ غیر شادی شدہ لڑکی کا کسی قسم کی ملازمت کرنا خلاف معمول بات ہے۔ %82 عورتوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ شوہر اور بچوں کی نگہداشت ان کا اصل کام ہے جسے وہ اپنی زندگی کا اولین مقصد سمجھتی ہیں۔ اس کے باوجود وہاں ایک تہائی عورتیں اپنی روزی کمانے کے لیے کام کرتی ہیں۔ لیکن اونچے درجے کے منصب پر صرف %3 عورتیں فائز ہیں۔^[1]

[1] محترمہ ثار فاطمہ کا اختلاfi نوٹ، خواتین کمیشن رپورٹ 1984ء

عورتوں کا مردانہ تشدد سے بچنے کا طریقہ:

عورتوں کو گھروں میں شوہروں سے پٹائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے 2000 سے 4000 عورتیں موت کے گھاٹ اتر جاتی ہیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا، اپنے شوہروں کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے عورتوں نے مخصوص اداروں یا پناہ گاہوں میں پناہ لینا شروع کر دی ہے۔ ایسی عورتوں کے لیے سب سے پہلے کیلی فورنیا میں ایک شیلٹر (Shelter) وجود میں آیا، اب ملک بھر میں ایسے 1800 ادارے کام کر رہے ہیں، ان اداروں میں پناہ لینے والی عورتوں کی بھرمار ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ خواتین کو ویٹنگ لسٹ میں اپنا نام درج کرانا پڑتا ہے، امریکہ کی ایک تنظیم وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے (Y.W.C.A) کے 210 شیلٹر کام کر رہے ہیں۔ اس ادارے نے 1978 سے 1980ء تک 46100 عورتوں کو پناہ دی اور 50000 عورتوں کو مشاورت کی سہولت بہم پہنچائی، تب بھی اس کا دعویٰ تھا کہ وہ 80% عورتوں کو انکار کرنے پر مجبور ہے۔^[۱]

عجیب طرفہ تماشہ ہے کہ جدید مغرب ”مہذب“ بھی کہلاتا ہے، جی بھر کر عورتوں کا ذہنی اور جسمانی استحصال بھی کرتا ہے، ان سے شہوانی لذات بھی حاصل کرتا ہے اور پھر عورتوں کے حقوق کا علمبردار بھی بنتا ہے۔ دوسری طرف مغرب کی حکومتیں جمہوری بھی کہلاتی ہیں مگر اکثریتی آبادی یعنی عورتوں کے طبقہ کے استحصال کی بھی کھلی چھٹی دیتی ہیں۔

عورتوں کے اوپر بے شمار جنسی تشدد ہو رہا ہے، طلاقیں بکثرت ہو رہی ہیں، 83% طلاقیں اس لیے ہوتی ہیں کہ ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ تعلیم اس کا کوئی علاج نہیں ہے، کیونکہ کالجوں سے فارغ ہونے والی 45% اور سکولوں سے نکلی ہوئی 21% عورتیں بچے پیدا کرنے کے ناقابل ثابت ہو رہی ہیں۔^[۲]

96ء میں امریکی دفاع کے ادارے پیٹھا گون نے ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی خطیر رقم سے ایک

[۱] مجلہ منہاج، ”حیثیت نسواں نمبر“ حصہ سوم صفحہ 235

[۲] ”پاکستانی عورت دور ہے پر“ از مولانا امین احسن اصلاحی صفحہ 170

فلم بنائی جس کا مقصد ریکروٹ خواتین کو دوران ڈیوٹی جنسی تشدد سے بچاؤ کے طریقے سکھانا تھا۔ کیونکہ خواتین ریکروٹس کے ساتھ ظلم کے 90% واقعات دوران ڈیوٹی میں رونما ہوئے۔ خفیہ طور پر شکایات کا ایک سیل کھولا گیا تو صرف ایک ہفتے میں مظلوم خواتین کی 4000 کالیں وصول ہوئیں۔^[۱]

روسی عورت:

سوشلزم جو دنیا میں مظلوم طبقات کا نمائندہ بننے کا دعویدار تھا اس کے اپنے زیر سایہ خواتین کی کیا حالت تھی۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

”دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم سوویت عورت ہے۔“ اگر سوویت معاشرہ میں کسی کا استحصال ہوا ہے تو وہ دراصل عورت ہی کا ہوا ہے، عورتوں کو کم تنخواہوں پر کمزور کام کرنا پڑتے ہیں، گندے اور محنت والے کام ان کے سپرد کیے جاتے ہیں جو ان کو ہاتھوں سے کرنا پڑتے ہیں۔ روسی مرد صرف حکم چلانا جانتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور عورتوں کی پٹائی کرتے ہیں، وہ ان کو بہت پست سمجھتے ہیں۔ دعویٰ بے شک مساوات مرد و زن کا ہو مگر کبھی مردوں نے عورتوں کی حیثیت کو مساوی نہیں سمجھا بلکہ روس میں اس طرح کے محاورے مشہور ہیں: ”بیوی جگ نہیں ہے، اس کی پٹائی کر دو تو وہ ٹوٹ نہیں جائے گی۔“ ”کتا عورت سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے مالک پر بھونکتا نہیں ہے۔“ شراب نوشی اور بیویوں پر تشدد روسی معاشرے میں مردوں کا معمول ہے۔ پھر مغربی عورت کے برعکس یہ عورتیں اپنے حقوق کے لیے آواز بھی بلند نہیں کر سکتیں۔ دوہرا بوجھ اٹھانے یعنی فل ٹائم ملازمت کے دوران میں سخت محنت کے کمزور کام، پھر گھر کا سارا کام انجام دینا، اوپر سے مردوں کا تشدد لے دے کر روس کی خواتین کی واحد جماعت ”سوویت ویمن کمیشن“ ہے۔ یہ دکھاوے کی سرکاری خواتین تنظیم ہے جو بیکار رہی باتوں میں مشغول رہتی ہے۔ یہ عورتوں کے حقوق کی علمبردار ہرگز نہیں ہے۔

آئندہ بھی عملی طور پر لمبے عرصے تک روسی عورت کے حالات بدلنے کی کوئی امید نہیں

ہے، یہ الگ بات ہے کہ تحریروں میں تو مدتوں سے اس کو برابری کا درجہ حاصل ہے۔ مرد کثرت سے مے نوشی میں مبتلا ہو کر عورتوں کی پٹائی کر دیتے ہیں، لہذا وہاں طلاق عام ہے، عورتوں کو اپنا ساتھی تلاش کرنے میں بہت مشکل پیش آرہی ہے۔ بعض اوقات وہ مجبور ہو کر ساتھی کی تلاش ترک کر دیتی ہیں۔ اب روس میں ایک باہمت ملازمت پیشہ خواتین کا طبقہ پیدا ہو رہا ہے کہ اگر ہمیں مناسب شوہر نہیں ملتے تو نہ سہی اب ہم کنواری مائیں ضرور بن کر رہیں گی۔

روس میں بچوں کی کفالت ماں باپ دونوں پر فرض ہے۔ طلاق کی شکل میں دونوں کی تنخواہوں میں سے $\frac{1}{4}$ حصہ کاٹ لیا جاتا ہے، دو بچے ہوں تو دونوں کی تنخواہوں کا $\frac{1}{3}$ حصہ اور اگر اس سے زیادہ ہوں تو دونوں کی تنخواہوں کا نصف کٹ جائے گا۔^[۱]

چنانچہ عورتیں بیوہ ہوں یا مطلقہ انہیں اپنی کفالت کے ساتھ ساتھ بچوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے، یوں مساوات کے خوبصورت نعرہ تلے عورتوں کے ساتھ شدید قسم کا ظلم ہو رہا ہے۔ جیکب پنگ ”نیوز ویک“ (مورخہ 84-4-16 از نیویارک) میں لکھتا ہے کہ اس وقت روسی خواتین کا سب سے بڑا مسئلہ دوہرے بوجھ کا ہے۔ مکمل وقت ملازمت میں صرف کرنا اور ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریوں کو نبھانا..... بیوی ہفتے میں 34 گھنٹے گھر میں کام کرتی ہے جبکہ خاوند صرف چھ گھنٹے۔

مغربی دانشوروں کا احتجاج:

مشہور عبرانی فلسفی ژول سلیمان جس کی عزت فراموشی قوم میں خصوصاً اور تمام یورپ میں عموماً اظہر من الشمس ہے، ”ریویو آف ریویوز“ ج 18 میں لکھتا ہے:

”1848ء میں لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ عورتوں کی تہذیب و تربیت پر ذرا بھی توجہ نہیں دی جاتی۔ مگر آج وہ یہ شبہ کر رہے ہیں کہ عورتوں کی تہذیب اعتدال سے گزر کر افراط کو پہنچ گئی..... اس اسلوب تعلیم کی خرابی یہ ہے کہ اس نے عورت کو بالکل مرد بنا دیا ہے..... یہ واجب ہے کہ عورت کی تعلیم ایسی ہو کہ عورت عورت ہی رہے۔“

[۱] ”پاکستانی عورت دور ہے پر“ از مولانا امین احسن اصلاحی صفحہ 71

اسی طرح برطانیہ کا مشہور فلسفی سمویل سائلز اپنی مشہور زمانہ کتاب ”کتاب الاخلاق“ میں تحریر کرتا ہے:

”عورت کی موجودہ تعلیم جس کی رو سے عورت اور مرد ہر لحاظ سے مساوی قرار پائیں اور بجز جنسی فرق کے، ان میں کچھ فرق باقی نہ رہ جائے، معاشرے کے لیے مہلک ہے۔“

پھر امریکی سکالر ”لوسن“ فرانس کے اسی رسالہ ”ریویو آف ریویوز“ ج 25 میں تعلیم نسواں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے: ”عورتیں اور لڑکیاں بڑی محنت سے علوم کیسیا، ریاضیات اور طبیعیات میں تعلیم پاتی ہیں۔ مگر وہ جوان بچی جو ان علوم میں اول نمبر پر پاس ہوتی ہے اور جس نے پروگرام کی تمام دفعات پر خوب عبور پالیا ہوتا ہے، نظامات خانہ داری کے معمولی سے معمولی اور سادہ سے سادہ امور سے بھی سخت ناواقف ہوتی ہے۔“ [۱]

یہ صاحب خانہ کے اقوال ہیں۔ وہ اپنے گھر کی خانہ بربادی سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ ان کی ہر ادا پر مرے جا رہے ہیں اور اپنے ہیرے موتیوں کو واجب ترک قرار دے رہے ہیں۔ ان کے ایک اور مفکر پروڈن کا رد عمل تو بہت شدید تھا۔ وہ لکھتا ہے: ”جس کا نام آجکل لوگوں نے عورت کی آزادی رکھ چھوڑا ہے۔ میں ان باتوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ میری خواہش یہ ہے کہ اگر ضروری اور حالات کا تقاضا ہو تو زمانہ سابقہ کی طرح میں عورت کو قید کرنے کا مشورہ دے دوں۔“ [۲]

خواتین کی حالت زار:

افسوس مغربی عورت آنکھیں بند کر کے مردوں کے مشاغل میں شریک تو ہو گئی مگر اپنی نسوانیت کو کھو کر۔ مادرانہ وظائف کو قربان کر کے انہوں نے اپنے کیرئیر بنانے کی فکر میں گھر، شوہر

[۱] ”مسلمان عورت“ از فرید وجدی آفندی، صفحہ 170، 171

[۲] ”مسلمان عورت“ از ابوالکلام آزاد، صفحہ 78

اور بچوں کی فطری ضرورت سے انکار کر دیا۔ بعض نے قبول کیا بھی مگر اس طرح کہ نہ گھر کی رہیں نہ گھاٹ کی، انہوں نے باہر کی ذمہ داریاں تو اٹھائیں مگر گھر کے کام کاج اور بچوں کی تربیت کا بوجھ بدستوران کے کندھوں پر رہا، اس طرح وہ دوہری مظلومیت کا شکار ہوئیں۔ اب وہ لاکھ واویلا کرتی رہیں کہ گھریلو ذمہ داریاں اٹھانے میں مردوں کو ان کا ساتھ دینا چاہیے مگر مرد گھریلو کام کاج سے آج بھی ہمیشہ کی طرح دور ہیں۔ اب تحریک نسواں کی پرزور حامی خواتین مثلاً بے ٹی فریڈن اور جرمن گریٹر وغیرہ خود آزادی نسواں کے خوفناک نتائج (جس کا سارا بار تنہا عورت کے اوپر آن پڑا ہے جبکہ مرد کو پہلے سے زیادہ عیش پرستی کے مواقع بھی حاصل ہیں اور معاشی بار بھی اس کا بہت کم ہو گیا ہے) دیکھ کر چیخ اٹھی ہیں۔ اب بے ٹی فریڈن اپنی کتاب "The Second Stage" میں لمبی چوڑی بحث کے بعد لکھتی ہے:

”کیا عورتیں اپنے جنسی وجود کا انکار کر سکتی ہیں؟ کیا وہ مرد سے مکمل طور پر الگ ہو سکتی ہیں؟ کیا اولاد سے نجات حاصل کر کے یا خاندان کے ادارے سے باہر نکل کر وہ حقیقی معنوں میں نجات پاسکتی ہیں؟“ اسی طرح کے خیالات کا اظہار جرمن گریٹر وغیرہ نے بھی کیا ہے کہ ہمارے اندازے سب غلط ثابت ہوئے ہیں۔ ہمیں ملازمت سے زیادہ گھر کی ضرورت ہے۔

عورت عملی زندگی میں مساوات کہاں تک حاصل کر سکی؟

مغربی ممالک نے عورت کو آزاد کر کے جو عظیم ترین اور فاش غلطی کی ہے، اس سے انہیں بے شمار سیاسی، تمدنی اور اخلاقی نقصان ہوئے ہیں۔ خود عورتوں کی صنف لطیف پر جو کاری ضرب لگی ہے، صدیوں تک آئندہ نسلیں بھی اس کی کک محسوس کرتی رہیں گی۔

مگر سوال یہ ہے کہ اتنے بے شمار تمدنی و معاشرتی نقصان اٹھانے اور اپنی عفت و آبرو کے آگینے چور چور کروانے کے بعد کیا عورت نے واقعتاً مساوات حاصل کر لی ہے؟ عملی زندگی میں وہ مرد کے برابر آگئی ہے؟ افسوس کہ اس کا جواب مکمل نفی میں ہے۔

ابھی تک مغرب کے خاندانی نظام میں مرد ہی حاکم ہے اور عورت تین گنا فرائض ادا کرنے کے باوجود مرد کے سامنے مجبور محض ہے۔

اقوام متحدہ کے منشور میں ”عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہیں“ کے سنہری الفاظ لکھ دینے سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔ مرد و عورت کی ذہنی، جسمانی، نفسیاتی اور جذباتی اختلافات نے ہر جگہ اس مساوات کو عملی طور پر ناکام ثابت کر دیا ہے۔

برطانیہ میں 1975ء میں جنسی امتیاز کا قانون (Sex Discrimination Act)

پاس ہوا جس میں عورت کو ملازمت، تعلیم، رہائش اور دیگر شہری مراعات میں مردوں کے مساوی حقوق ملے پھر بھی اس میں 20 امتیازی نکات رکھے گئے۔ مثلاً عورت (مرد کے برعکس) رات دس بجے سے لے کر صبح پانچ بجے تک فیکٹری میں کام نہیں کر سکتی یا فوج میں بھرتی کرنے کے لیے مرد اور عورت کے مساوی حقوق تسلیم نہیں کیے جاسکتے۔^[۱]

بہت سے مہذب ممالک میں اس بات کو نفرت سے دیکھا جاتا ہے کہ عملی طور پر عورتیں بھی جنگ میں شریک ہوں، البتہ فرانسیسی فوج میں کچھ عرصہ تک عورتوں کو فوج میں بھرتی کرنے کا رجحان رہا، مگر وہاں کے ایک اعلیٰ فوجی افسر کو بالآخر کہنا پڑا: ”ہمیں بڑا تلخ تجربہ ہوا ہے کہ عورتیں نظم و ضبط کی پابندی نہیں کرتیں۔ اور وہ بزدل ثابت ہوئی ہیں“ اور ”فوجی عورتیں فائر نہیں کر سکیں گی۔“^[۲]

اس طرح تمام اعلیٰ ملازمتوں پر آج بھی مردوں کا ہی کنٹرول ہے۔ عورتوں کو دوسرے درجے کی ملازمتیں ملتی ہیں، پھر مردوں سے معاوضے بھی کم ہیں کیونکہ ان کو زچگی کی خاطر چھٹی لینا پڑتی ہے اور پھر بچوں کو پالنا بھی پڑتا ہے۔

[۱] ”اسلام اور نظریہ مساوات مرد و زن“ از محمد رفیق چودھری، صفحہ 86

[۲] ڈیلی ٹیلی گراف، نومبر 1987ء

تنخواہوں میں تفاوت کا یہ عالم ہے کہ 1970ء میں امریکی عورتوں کی تنخواہیں مردوں کی تنخواہ کا 59% تھیں۔ مثلاً ہائی سکول پاس عورت کی تنخواہ 2421 ڈالر، ہائی سکول پاس مرد کی تنخواہ 6736 ڈالر تھی۔ عورت کلرک کو 4789 ڈالر مگر مرد کلرک کو 7351 ڈالر ملتے تھے۔ عورت مینیجر کو 6691 ڈالر جبکہ مرد مینیجر کو 10034 ڈالر ملتے تھے۔^[۱]

رچرڈ برگر جرمنی کے بارے میں لکھتا ہے: ”جون 1936ء میں عورتیں جج اور سرکاری وکیل کے طور پر کام کرنے سے روک دی گئیں۔ آہستہ آہستہ نائب جج اور نائب ٹیچروں کے مقام سے بھی رخصت کر دی گئیں اور اعلان کیا گیا کہ عورتیں بطور جیوری کے کام نہیں کر سکتیں۔ وہ مدلل بحث نہیں کر سکتیں، ان پر جذبات غالب رہتے ہیں۔“

امریکہ میں ”پرنسپل کون ہوگا، مرد یا عورت؟“ پر بحث چلتی رہی۔ 1928ء میں ابتدائی سکولوں کی سربراہ 55% عورتیں تھیں، 1948ء میں صرف 41% رہ گئیں۔ 1958ء میں تعداد اور کم ہو کر 38% رہ گئی۔ جب کہ 1968ء میں خاتون پرنسپل کی تعداد اور بھی گھٹ کر صرف 22% رہ گئی۔ 1970ء میں عورتوں کو جیوری کا ممبر بھی نہیں بنایا جاتا تھا۔^[۲]

”پس یہ ثابت شدہ امر ہے کہ مساوات مرد و زن کا مغربی تصور یہ ہے کہ عورتوں سے تمام پر مشقت کام لیے جائیں اور محروم ہی رکھا جائے۔“^[۳]

پھر امریکہ میں ہر دو میں سے ایک شادی کا انجام طلاق ہے، اس کے بعد بچے کی پرورش تنہا عورت کی ذمہ داری رہ جاتی ہے۔ قانوناً مرد کو تو بچے کا نفقہ دینا پڑتا ہے مگر اس پر عمل کون کرتا ہے! عملی طور پر سارا بوجھ ماں کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔

آج تک عورت اپنی انفرادیت یا اپنا الگ تشخص حاصل نہیں کر سکی۔ اگر وہ شادی سے

[۱] مجلہ منہاج، ”حیثیت نسواں نمبر“ حصہ سوم صفحہ 85

[۲] "The Silenced Majority" by Kristen صفحہ 38

[۳] از سید اسعد گیلانی، ماہنامہ بتول، اکتوبر 1982ء

پہلے مس فلاں اور شادی کے بعد شوہر کے نام پر مسز فلاں تھی، کہیں وہ اپنا نام استعمال نہیں کر سکتی تھی تو آج بھی عورت اس طرح اپنے تشخص سے محروم ہے۔ آج بھی وہ اپنے آپ کو مس تھامسن یا مسز کینیڈی وغیرہ کہنے پر مجبور ہے۔ حتیٰ کہ برطانیہ کی وزیراعظم بننے والی خاتون مسز تھیچر کے نام سے ہی دنیا میں مشہور و معروف ہوئی تھی۔ اس کا اپنا نام مارگریٹ تو بہت کم معروف تھا۔

اس طرح عورت اگر تحریک مساوات مرد و زن سے پہلے مظلومی کی ایک انتہا پر تھی تو آج وہ مظلومی کی دوسری انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ وہ آج بھی ظلم و ستم کی منہ بولتی تصویر ہے۔ صنف نازک ہونے کے باوجود اس کو مرد کے مقابلے میں آج بھی تین گنا زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اسے خود اپنے لیے بھی کمانا پڑتا ہے بلکہ اپنے بچوں کے لیے بھی۔ باپ، شوہر حتیٰ کہ بیٹا تک اس کو اپنے ہاں پناہ دینے کو تیار نہیں۔ چھوٹی عمر میں اس کو بوائے فرینڈ تلاش کرنا پڑتے ہیں۔ جوانی عیش و عشرت میں اور بڑھاپا دارالضعفاء (Old Age Homes) میں۔ اسے گھرداری کا کام کرنا پڑتا ہے۔ آج بھی مرد گھریلو کام سے اتنا ہی دور ہے جتنا دو صدیاں پہلے تھا۔ وہ ہر جگہ مرد کو بہلاتی بھی ہے۔ (آج مردوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے جتنی محنت امریکی عورتوں کو کرنا پڑتی ہے، دنیا کے کسی اور ملک کی عورت کو نہیں کرنا پڑتی۔ طرح طرح کی پرفیوم، کاسمیٹکس اور میک اپ وہ استعمال کرتی ہیں۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ مردوں کے تشدد (جسمانی بھی اور جنسی بھی) کا شکار ہے۔

ردِ عمل:

اب خود ان معاشروں میں زبردست احساس پایا جاتا ہے کہ عورت گھر کا کام اور مادرانہ ذمہ داریاں سنبھالے۔ بلکہ بعض ممالک میں تو عورتوں کی شادی کے بعد ملازمت پر پابندی لگانے کے بارے میں بھی سوچا جا رہا ہے۔ خود عورتوں میں یہ زبردست خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ

وہ اپنے گھروں میں واپس آئیں۔ جہاں ان کے چاہنے والے شوہر ہوں، ان کے اپنے پیارے ننھے منے بچے ہوں۔ مگر اب وہ بے حجابی، بے حیائی اور جنسی بے راہ روی میں اتنا آگے بڑھ چکی ہیں کہ واپس لوٹنا ناممکن محسوس ہو رہا ہے۔ اب تو سائنسی حقائق نے بھی اس امر کو بے نقاب کر دیا ہے کہ عورت کی نفسیات، مزاج اور دائرہ کار بالکل مختلف ہے۔ لہذا وہ مرد کے برابر نہیں ہو سکتی۔

بے ساختہ یہ بات زبان پر آتی ہے:

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ

”اے عقل و دانش والو! عبرت حاصل کرو۔“

2

موجودہ مسلم معاشرے اور
نظریہ مساوات مرد و زن

- ترکی
- پاکستان
- اپوائی بیجیات کی تعداد
- عالمی قوانین
- قاہرہ کانفرنس اور بیجنگ کانفرنس
- یہ بے چینی کیوں؟
- دجاول اور وجود دم
- تحریک آزادی نسواں کا تجزیہ
- پاکستانی خواتین کی حالت ذرا یا ترقی
- پاکستان کے ”اعزازات“
- الہی احکام کی پامالی
- پاکستان میں برائے سادہ کا بیجڈے کے تحت خواتین کی پیش رفت
- بیجنگ کانفرنس 1995ء
- خواتین اکوئری کییشن 1994ء تا 1997ء
- تحریک ضبط ولادت کو فروغ
- عالمی بھیرو آبادی کانفرنس 2005ء
- سوشل کمیٹی برائے جائزہ حدود و قوانین
- این جی اوز اور اسلامی نظریاتی کونسل
- این۔ جی۔ اوز کا نفعی کردار
- بیجنگ پلس فائیکانفرنس 2000ء
- پاکستان بھر میں کانفرنس کی تیاریاں
- اسلامی نظریاتی کونسل میں لبرل ارکان بھرتی کیے گئے
- سرکاری وفد
- ملینیم ڈیڈ لائن گول
- خواتین کا عالمی عشرہ
- نائن الیون کا المیہ
- الیکٹرانک میڈیا کا خاندان کا ادارہ برباد کرنے میں اہم کردار
- طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح
- وطن کی قابل ترین اور عفت تاب بیٹی کو دشمن کے ہاتھ بچ دیا گیا
- بیجنگ پلس ٹین (چھٹی عالمی کانفرنس)
- جنرل مشرف اور خواتین
- تعلیمی شعبہ ادبی۔ ڈاکا بیجڈا
- عورت کو با اختیار بنانا
- حدود و قوانین کے خلاف پروپیگنڈا
- حدود و قوانین کے بجائے ”تحفظ نسواں ایکٹ“
- سماج سنٹرز اور قحبہ خانے
- لیڈی پولیس سکیڈل
- عالمی سطح پر حجاب موضوع گفتگو بن گیا
- فرانس میں برقع پہننے والی خاتون کو 750 یورو جرمانہ
- مشرف کی روشن خیالی سے پی۔ پی کی روشن خیالی بازی لے گئی
- نیکیس ورکرز کانفرنس
- پاکستان میں بیجنگ +10 کانفرنس کے بعد پیش آنے والے ایسے
- ہم جنس پرستوں کے لیے پاکستان میں امریکی مہم
- پاکستان میں ایڈز کے مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد
- خواتین کا ہیوی بائیکس پر سوار لیڈی وارڈن بننا
- جنسی تعلیم کے نتائج اور جنسی درندگی کے بڑھتے ہوئے المناک واقعات
- بیجنگ پلس 20
- یو این عالمی کانفرنسوں کا جائزہ
- مغربی یلفار کی مزاحمت
- مزاحمت کی مثالیں
- اسلامی نظریاتی کونسل نے حقوق نسواں ایکٹ مسترد کر دیا
- خواتین پر تشدد کے خلاف دوروزہ کانفرنس 2005ء
- پنجاب اسمبلی میں این جی اوز کے خلاف بجکتی
- نوائے وقت کا ادارہ: منصف نازک پر تشدد (جنرل مشرف کا خطاب)
- غیر تربیت یافتہ خواتین کے اسمبلی ممبر بننے کے خلاف دہائی
- مغربی ایجنڈے کے خلاف اہل درد کی مزاحمت
- سوئٹزرلینڈ نے اسلام کی تبلیغ پر پابندی ختم کر دی
- مغربی مقابلہ حسن کے مقابلے میں منعقد ہونے والا باپردہ مقابلہ حسن
- حجاب کانفرنس
- پاکستان میں ایک اسلامی این۔ جی۔ اوز کی بھرپور مزاحمت
- وطن عزیز میں دیگر دینی جماعتوں کی مزاحمت
- مسلم خواتین کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس
- مسلم خواتین کی تیسری عالمی کانفرنس 2007ء
- IMWU کے بارے میں کچھ مزید تفصیلات
- عملی صورت حال کیا ہے؟
- صورت حال کا تجزیہ
- مغرب ہمیں گمراہ کر رہا ہے

موجودہ مسلم معاشرے اور نظریہ مساوات مرد و زن ترکی:

مساوات مرد و زن کا نعرہ اگرچہ خالصتاً اہل مغرب کا تحفہ تھا مگر ایشیا اور اسلامی ممالک بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، مسلمانوں میں اس کا پہلا حامی ترکی کا مصطفیٰ کمال پاشا تھا، جس نے ادارہ خلافت توڑنے کے بعد اپنے ملک میں مخلوط معاشرے کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس کو اندازہ تھا کہ دینی و مذہبی حلقے مخالفت کریں گے لہذا اس نے بے دریغ علماء کو تختہ دار پر لٹکایا، دینی تعلیم کو ملک سے ختم کر دیا، قرآن پڑھنے اور اذان و نماز پر پابندی عائد کر دی، ملک کا دستور سیکولر بنادیا، نئی اور جدید عصری تعلیم کے ذریعے سے لوگوں کا رابطہ اپنے شاندار اور درخشاں ماضی کی روایات سے کاٹ دیا۔ اس وقت سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے ذریعہ دین اور دینی روایات سے بغاوت کا سلسلہ چل رہا ہے۔ نئی نسل کے سامنے مصطفیٰ کمال کو جدید مسلم دنیا کا ہیرو اور ”اتا ترک“ یعنی ترکوں کا باپ قرار دیا گیا، اس وقت سے ترکی میں حکمران طبقہ اور جدید تعلیم یافتہ لوگ سیکولر ازم کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ چند سال پہلے ترکی کی چند طالبات نے اپنے تعلیمی اداروں میں سر ڈھانپنے کی اجازت مانگی۔ معاملہ بڑھتے بڑھتے عدالت تک پہنچا، وزیراعظم نے کہہ دیا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ ڈھانپنا چاہتی ہیں تو ڈھانپ لیں مگر صدر نے کہا کہ ہمارا سیکولر دستور اس بات کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ ایک مذہبی علامت ہے، لادینی ریاست کے دعوے داروں کی لادینی حس اتنی تیز ہوتی ہے کہ سر ڈھانپنا ایک مذہبی علامت قرار دیتے ہیں، لہذا وہ ان کے نزدیک ان کے سیکولر نظریات کے مخالف پڑ جاتی ہے لہذا اور وہ دہائی دینا شروع کر دیتے ہیں۔ صرف ترکی کیا ہر جگہ آج کی غالب مغربی تہذیب نے زوال پذیر

□ اب آج کل ترکی کے حالات بدل رہے ہیں۔ لوگ دین کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ اور دستور میں بھی کچھ تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔

مسلمانوں کو اپنی تقلید پر مجبور کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام عالم اسلام میں آزادی نسواں کی تحریکیں پھل پھول رہی ہیں۔ ان تحریکوں کا ہدف اول اسلامی معاشرہ سے ستر و حجاب کے شرعی آداب کو ختم کرنا ہے۔

مصر میں خصوصی طور پر تحریک نسواں نے خدیو اسماعیل کے زمانے میں زور پکڑا اور عورتوں کے لیے جدید طرز کے سکول کھلنے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ تحریک بہت زور پکڑنے لگی، قاسم امین نے ”تحریر المرأة“ اور ”المرأة الجديدة“ نامی کتب لکھ کر مغربی تہذیب و معاشرت کو اختیار کرنے کی زبردست ترغیب دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ زنانہ اختلاط عام ہونے لگے، بے حجابی بکثرت ہو گئی۔ آزادانہ کلچرل پروگرام، تفریحی مشاغل، مخلوط تعلیم کا عام رواج ہوا۔ مصری طالبات برائے حصول تعلیم یورپ و امریکہ کا سفر کرنے لگیں۔ اس کے نتیجے میں ترکی اور ایران نے بھی مکمل طور پر مغربی معاشرت اختیار کر لی۔ بعد ازاں شام اور عراق بھی اس رو میں بہہ گئے۔ اب ہر جگہ دین اور شریعت کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ جوں ہی موقع ملا، فوراً مغربی معاشرے پر مبنی قوانین بنائے، تعدد ازواج کی آزادی کو محدود کر دیا۔ شوہر کے حق طلاق پر پابندیاں عاید کر دیں، تمام ملازمتوں کے دروازے عورتوں پر کھول دیئے، عورتوں کو قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننے کا حق دیا۔ اب پردہ رخصت ہو رہا ہے، باہر نکلنے والی عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ سیاسی محفلوں میں بھی ہر جگہ وہ مردوں کے دوش بدوش نظر آنے لگیں۔ پھر افغان قوم بھی تجدید پسندی کی راہ پر چل پڑی۔ الجزائر، انڈونیشیا اور برصغیر پاک و ہند میں اسی طرح یہ اثرات نظر آنے لگے۔

ترکی اور مصر میں تجدید پسندی اور سیکولرازم کی لہر زوروں پر رہی ہے۔ رفاہ پارٹی نے برسر اقتدار آنے کے بعد ترکی میں سیکولرازم کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کی تو اس پارٹی کی بساط لپیٹ دی گئی۔ اب نماز روزہ کے عادی لوگوں پر سخت پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں اور دین اسلام کے ایک ایک نشان کو از سر نو چن چن کر ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دینی مدارس اور علماء پر سخت پابندی عاید کی جا رہی ہے۔ اسی طرح مصر میں بھی علماء اور دیندار حضرات کو سخت تعذیب کا

نشانہ بنایا جا رہا ہے..... خصوصاً عورتوں کا حجاب اور ستر شدید پابندیوں کی زد میں ہے۔ تعلیمی اداروں میں چادر، دوپٹہ یا سکارف اوڑھنے والی طالبات کو داخلہ ہی نہیں دیا جاتا۔ ہر جگہ عورتوں کو گھروں سے باہر نکل کر مردوں کی طرح کمانے کی ترغیب دی جاتی ہے، مخلوط تعلیم عام ہے، ساتھ ساتھ خاندانی منصوبہ بندی کے مختلف منصوبے اور پروگرام عورت کو بے راہرو اور بے حیا بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

اسی طرح تقریباً تمام مسلمان ممالک کم و بیش اس نظریہ مساوات کی لپیٹ میں آتے گئے۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بے پردگی اور اختلاط مرد و زن بہت بڑھا (البتہ سعودی عرب اس سے اس وقت تو متاثر نہ ہوا۔ لیکن خلیج کی جنگ کے بعد وہاں بھی معاشرتی حالات بدلنے لگے)۔ ایران میں بھی تیزی سے بے پردگی اور فحاشی پھیلنے لگی، امام خمینی کے انقلاب کے بعد وہاں کے حالات نے مثبت رخ اختیار کیا۔

پاکستان:

پاکستان میں اس مسئلہ نے وطن عزیز کے قیام کے ساتھ ہی شدت سے سراٹھایا۔ اپوا (آل پاکستان و ویمن ایسوسی ایشن All Pakistan Women Association) کی بیگمات نے یہاں بھی مخلوط معاشرہ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، بیگم رعنا لیاقت علی خاں اس کی روح رواں تھیں، اس نے 28 جنوری 1949ء کو جہلم میں جموں و کشمیر کے پناہ گزینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”اب وہ وقت نہیں رہا کہ مسلمان عورتیں گھروں کی چاردیواری میں بند بیٹھی رہیں۔ اب انہیں خواب غفلت سے بیدار ہونا ہوگا اور گھروں سے نکل کر مردوں کے شانہ بشانہ قوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں حصہ لینا ہوگا..... اور مردوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی عورتوں کی راہ میں حائل نہ ہوں، وہ انہیں اس بات کا موقع دیں کہ وہ ان فنون کو سیکھ سکیں جن کی اہلیت ان کے اندر پائی جاتی ہو۔“ [1]

مس فاطمہ جناح، بیگم خواجہ ناظم الدین، سلمیٰ تصدق حسین، بیگم جی۔ اے خان اور سرکاری حکام کی بیگمات اس تنظیم میں شامل تھیں، حکومت پاکستان نے اس انجمن کو باضابطہ طور پر تسلیم کر کے اعلان کر دیا کہ جن معاملات کا تعلق عورتوں سے ہوگا ان معاملات میں حکومت ان عورتوں سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہ اٹھائے گی۔ چنانچہ اپوا کے لیے حکومت کی سرپرستی آج تک برقرار ہے۔ اس کی کانفرنسیں عموماً گورنمنٹ ہاؤس میں منعقد ہوا کرتی ہیں۔ اس انجمن کو شروع سے یہاں خواتین میں بے پردگی عام کرنے رقص و سرود کی محفلیں برپا کرنے اور مخلوط معاشرہ تشکیل دینے کی فکر تھی۔ [۱] چنانچہ باقاعدہ 1۔ آرٹ اکیڈمی، 2۔ زنانہ نیشنل گارڈز، 3۔ گرل گائیڈز، 4۔ بلیو برڈز (Blue Birds)، زنانہ رضا کار کور اور اینجلز آف مری (Angles of Mercy) یعنی زنانہ نرسوں کی تنظیم وغیرہ قائم کی گئی۔ خصوصاً مخلوط تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی۔ بیرونی سربراہوں، ارباب اقتدار، سول اور فوجی حکام کے سامنے بچوں اور خواتین کے دستوں کی پریڈیں، سلامیاں اور کھیلیں بہت پسند کی گئیں۔ موسیقی، رنگ، رقص اور زریں ملبوسات کے جلو میں مینا بازار اور ڈریس شوز منعقد ہونے لگے۔ یہ ڈرامے، مینا بازار اور ڈریس شو پاکستان کے قومی و ملی مقاصد کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کا کامیاب ذریعہ قرار دیئے گئے۔ بیشتر کالجوں میں مخلوط تعلیم دی جانے لگی اور یونیورسٹی میں آج تک شدید احتجاج کے باوجود مخلوط تعلیم ہی جاری ہے۔ بیرونی ملکوں میں خواتین کے ثقافتی طائفے جانے لگے (1954ء میں خود بیگم رعنا لیاقت علی خاں پہلی مسلم خاتون سفیر کے طور پر ہالینڈ میں پاکستانی سفیر مقرر ہوئیں)۔ ان بیگمات کی بھرپور مدد پریس اور ترقی پسند دانشوروں کی زہر آلود تحریروں نے کی، پھر تو یہ صورت حال پیش آئی کہ ہر جگہ اشتہار میں عورتوں کی نیم برہنہ تصاویر، ٹی۔ وی، وی۔ سی۔ آر میں ہر جگہ ناچتی تھرکتی عورت، میڈیا اور لٹریچر میں ہر جگہ عورت نمودار ہونے لگی۔ 1964ء کے لگ بھگ ٹی۔ وی پاکستان میں متعارف ہوا۔ یہ اس گندگی کو پھیلانے کا اہم سبب بن گیا۔ خواتین کی ہر

[۱] وہ اپنے یہاں ہالی وڈ کی تہذیب کو دور صحابہؓ کے تاریخی حوالوں کے ساتھ رائج کرنا چاہتے تھے، چنانچہ فضول گیتوں پر مبنی ایک ادبی کتاب ”اللاغانی“ سے ڈھونڈ کر اپنے مطلب کے بے محل اقتباسات پیش کیے گئے۔

قسم کے کھیل کی ٹیمیں بن رہی ہیں، ہاکی ٹیم، فٹ بال ٹیم اور کرکٹ ٹیم وغیرہ۔ مقابلوں اور دوڑوں کا مدت سے رواج ہے، پہلے صرف خواتین کے میچ تھے پھر مردانہ و زنانہ میچ، ملکوں ملکوں کے دورے، اب اولمپک گیمز میں بھی شرکت کی جا رہی ہے جس میں تمغے جیتے جاتے ہیں۔ پھر پاکستانی خواتین آگے بڑھ کر مقابلہ ہائے حسن میں شرکت کر رہی ہیں۔ جسم کے انگ انگ کی فیتوں سے بے شرمی کے ساتھ پیمائش کر دیا رہی ہیں تاکہ ”مس یونیورس“ کا خطاب حاصل کر سکیں۔

دوسری طرف معزز با پردہ گھرانوں کی خواتین بڑی تیزی کے ساتھ پہلے پردہ پھر چادر اور پھر دوپٹہ کی قید سے آزاد ہو رہی ہیں، تیسری طرف اب ”ماڈلنگ“ یعنی جسم کی نمائش کر کے کمانا، گلوکاری، فنکاری جیسی مسموم عادات معاشرے میں بڑا ”وقار“ حاصل کر رہی ہیں۔ جو پہلے خوب تھا وہ اب نا خوب ہے اور جو پہلے بے حیائی کی باتیں سمجھی جاتی تھیں اب تقاضائے ترقی سمجھی جاتی ہیں۔ اس محاذ پر ”ادیبوں اور دانشوروں“ نے مخلوط ثقافت قائم کرنے کے لیے خوب تحریریں تیار کیں۔ آرٹسٹوں نے الگ کلچرل محاذ کھول رکھا ہے، موسیٰز کے ذریعے سے اور ٹی۔وی، وی۔سی۔آر، ڈش انٹینا اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے یہ طوفان بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس بگاڑ کے طوفان میں انگلش میڈیم سکولوں نے بھی پورا کردار ادا کیا ہے، کھلے بازو، کھلے سینے کے ساتھ سکرٹ پہننے کی عادی لڑکیاں ایسی ہی فحش تہذیب پھیلانے کی ضامن ہیں۔ پھر بیوٹی پارلرز کی وبا، موبائیل کیمرے اور موسیٰز وغیرہ نے شرم و حیا کا جنازہ نکال دیا ہے۔

اپوائی بیگمات کی تعداد:

افسوس ہے کہ فیشن پرست، اسلام بیزار اور مغرب زدہ خواتین کی ملک میں صرف 1% اقلیت ہے۔ مگر سرمایہ، حکومتی سرپرستی اور اپنی جارحانہ پیش قدمی کی بنا پر فحاشی کی راہ پر ملک کو آگے بڑھاتی جا رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف ایمان، پردہ اور اخلاقی اقدار سے محبت کرنے والی خواتین کی اکثریت اپنی کوئی موثر آواز نہیں رکھتی اور اگر وہ احتجاج کرتی بھی ہیں تو ملکی وغیر ملکی پریس اس کو کورتج دینے کو تیار نہیں ہوتا۔

عالمی قوانین:

اپوائی انجمن نے 1962ء میں صدر ایوب سے عالمی قوانین منظور کروائے۔ جن میں سے بیشتر قرآن و سنت سے متصادم ہیں، پھر انہوں نے قرآن و سنت کی مضحکہ خیز تاویلوں اور تاریخ کی کمیاب مثالوں کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مغربی معاشرتی نظام ہی قرآن و سنت کے منشا کو صحیح پورا کرتا ہے۔ پھر جب صدر ضیاء الحق کے دور میں اس نے اسلامی نظام کی طرف کچھ پیش قدمی کرنا چاہی اور حدود آرڈیننس جاری کرنے کی کوشش کی، چادر اور چادر یواری کے تحفظ کی کوشش کی تب بھی ان خواتین نے اپنے محاذ پر بڑی تیزی دکھائی۔ اخباری پروپیگنڈے، مذاکروں، قراردادوں کے ذریعے سے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ خواتین کا دیت اور شہادت والا قانون تبدیل کرے۔ بے نظیر بھٹو جو آکسفورڈ کی تعلیم یافتہ تھیں، نے بھی حدود آرڈیننس کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔

بعض نے کہا کہ ہمیں وہ قرآن نہیں چاہیے جو عورت کو آدھی شہادت کا مقام دیتا ہے۔ ہمیں وہ قرآن چاہیے جو ہمیں مساوات دے، ہمیں بہر حال مساوی حقوق چاہئیں۔ وگرنہ ہمیں ایسے قرآن و حدیث کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر ان خواتین نے خود مجتہد بن کر عورتوں کے لیے قرآن و حدیث سے مضحکہ خیز مثالوں کے ذریعے سے مساوی حقوق ”برآمد“ کیے۔ حالانکہ بیشتر بال کٹی فیشن ایبل بیگمات قرآن ناظرہ بھی پڑھنا نہیں جانتیں۔ ایڈووکیٹ عاصمہ جہانگیر جیسی بعض خواتین نے آگے بڑھ کر یہ کہنے کی ناپاک جسارت بھی کی: ”اگر ہماری دیت آدھی ہے، ہماری شہادت آدھی ہے تو پھر ہم نماز بھی آدھی پڑھیں گی، روزے بھی آدھے رکھیں گی اور حج بھی آدھا کریں گی۔“ اس طرح تمام اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا گیا۔ داڑھی پر پھبتیاں کتے ہوئے اسے جنگل کہا گیا۔ جنگل کہنے والے حضرات خود حافظ قرآن تھے۔ 8 مارچ 83ء کو کراچی پریس کلب میں ہونے والے ایک جلسے میں ایک خاتون سعیدہ گزدر نے ایک آزاد نظم پڑھی جس میں زنا کی مرتکب عورت کو مظلوم قرار دیا۔ جناب خالد اسحاق ایڈووکیٹ نے اس پر اعتراض کیا تو کہنے لگی کہ میری نظم زنا کے حق میں نہیں بلکہ شادی جیسے گھناؤنے فعل کے خلاف تھی۔ نعوذ باللہ!

اسلام کے معاشرتی نظام پر اعتراض اٹھانے والے وہ مغرب زدہ مسلمان ہیں، جو مغرب کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اسلام یا اسلامی تعلیم سے انہیں کوئی مس ہی نہیں۔ اپنے مغربی آقاؤں کی تقلید میں اسی دوش بدوش فلسفہ کو یہاں بھی من و عن رائج کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسلام کی برتری کو ختم کیا جاسکے، مرد کی قوامیت ختم ہو، ملکی امور میں عورت کو ”بھرپور“ شرکت ملے، مرد کی طرح عورت بھی خود مختار ہو، عورت بھی جب چاہے طلاق دے کر مرد کو فارغ کر سکے اور اگر مرد طلاق دے تو عمر بھر عورت کا خرچہ برداشت کرے، ایک بیوی کی موجودگی میں مرد دوسری شادی نہ کر سکے۔ [۱]

عاصمہ جہانگیر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: کہ اگر مرد چار شادیاں کر سکتے ہیں تو عورت چار شوہر کیوں نہیں کر سکتی؟

پھر غلام احمد پرویز صاحب نے یہ تک ارشاد فرمادیا: ”جن کو تم اسلامی قوانین کہتے ہو یہ قوانین تو ہمارے دور ملوکیت میں اس زمانے میں وضع ہوئے تھے جب عورتیں مویشیوں کی طرح منڈی میں نیلام ہوا کرتی تھیں۔“

”ہمارے قوانین شریعت ”مردوں“ کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان میں مردوں کو ہر حال میں بالادست رکھا گیا ہے اور عورت بیچاری کو کچل دیا گیا ہے۔“ [۲]

یہ طبقہ مغرب کے آقاؤں سے اتنا مرعوب ہے کہ ہر بار بڑی معصومیت اور سادگی سے ان اعتراضات کو دہرا دیتا ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ جب تک ہم اسلام کے ان فرسودہ اور دقیا نوسی اصولوں کو نہیں چھوڑیں گے ہم اوج ترقی تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک خواتین کو مردوں کے برابر حقوق، نشستیں اور ملازمتیں نہیں ملیں گی پاکستان ترقی نہیں کر سکتا۔ ستر و حجاب کی بندشیں اور چادرو چاردیواری کے اصول تو ہمیں چودہ سو سال پیچھے لے جائیں گے۔

ہوئے کس درجہ فقہانِ حرم بے توفیق

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

[۱] ماہنامہ ”طلوع اسلام“ مارچ ۱۹۸۳ء

[۲] طاہرہ کے نام پرویز کے خطوط، صفحہ ۲۱

کچھ لوگ بات دوسرے رنگ میں کرتے ہیں کہ اسلام تو ایک جدید اور ماڈرن مذہب ہے۔ یہ بڑی بلند وبالا چیز ہے، مغرب نے بھی تو ”اسلامی اصولوں“ پر چل کر ہی ترقی کی ہے۔ بلکہ مارکس اور لینن بھی تو اسلام کے اصول مساوات ہی کی خاطر کام کرتے رہے۔ اسلام نے تو عورت کو مرد کے مساوی حقوق دیئے ہیں مگر یہ ملاحضرات دین کی غلط تعبیر کرتے ہیں اس لیے ہم اس ملا کے دین کو نہیں مانتے، وغیرہ۔

قاہرہ کانفرنس 1994ء اور بیجنگ کانفرنس 1995ء:

یہ دونوں کانفرنسیں عورت کے بگاڑ کے طوفان کو بڑھانے کے لیے مہمیز ثابت ہوئیں۔ جن میں کنڈوم کلچر، عورتوں کے لیے اسقاط حمل، بچوں کے لیے عورت کو اپنے اختیار اور ہم جنسیت کے قانونی جواز، عورتوں کے لیے ہر شعبہ میں مکمل مساوات جیسی قراردادیں منظور کی گئیں اور پاکستانی وزیراعظم بے نظیر نے (غیر مسلم خواتین کی طرح) پاکستانی مسلم خواتین کی نمائندگی کرتے ہوئے بے جھجک اس پر دستخط کر دیئے۔ قطع نظر اس بات سے کہ یہاں کی بیشتر مسلم خواتین اور علماء نے اس کی شدید مخالفت کی تھی، یہ ہے ہمارے حکمرانوں کی اسلامی حس جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔

یہ بے چینی کیوں؟

اسلام کے عورت پر احسانات بے شمار ہیں، واقعی اسلام نے طبقہ اناث کو بہت سے حقوق سے نوازا ہے اور آج سے چودہ سو سال پہلے دیئے ہیں۔ (بعض حقوق تو اسلام کے ایسے ہیں کہ ابھی تک مغربی خواتین ہزاروں ہڑتالوں، احتجاجوں اور مظاہروں کے باوجود ان تک نہیں پہنچ سکیں) ان حقوق میں ترمیم نہ کل ہو سکتی تھی نہ آج ہو سکتی ہے اور نہ قیامت تک ہو سکے گی۔ بہر حال سوال یہ ہے کہ یہ صورت حال کیوں پیش آرہی ہے؟ اہل مغرب تو اسلام پر اعتراض کر رہے ہیں، خود بہت سے مسلمان کیوں اٹھ کر ان اعتراضات میں اپنے مغربی آقاؤں کے ہمنوا بن جاتے ہیں اور اب یہ پڑھ لکھے نوجوان خود ان اعتراضات کو زور و شور سے اٹھا رہے ہیں؟ پورے غور و فکر کے بعد اس کی دو وجوہ سمجھ میں آتی ہیں:

وجہ اول:

اسلام نے بے شک عورت کو بہت سے حقوق دیئے ہیں اور مدت تک مسلمان عورت ان حقوق سے متمتع بھی ہوتی رہی ہے، مگر دور زوال میں مسلمانوں کا معاشرتی نظام متاثر ہوا، ان میں ہندو اناہ اور مغربی دونوں رنگ جھلکنے لگے، ان کی بنا پر معاشرت میں بگاڑ پیدا ہوا۔ آج بیشتر حالات میں عورت بڑی مظلوم ہے۔ اگرچہ اس فساد زدہ صورت حال نے مسلمان مرد کو بھی متاثر کیا ہے مگر مسلمان عورت نسبتاً زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ مثلاً لڑکی کی پیدائش پر اظہار ناپسندیدگی، تعلیم و تربیت کے معاملے میں لڑکے لڑکی کا فرق، بیٹی اور بہن کو مختلف بہانوں سے وراثت سے محروم کرنا، شادی شدہ بیٹوں کا اپنے بوڑھے والدین خصوصاً والدہ سے برا سلوک، بیوی کو شوہر کی محبت کا نہ ملنا، شوہر کا مجازی خدا بن کر زبردستی عورت سے ہر جائز و ناجائز بات منوانا، سسرال میں بہو کے ساتھ ملازمہ سے بھی بدتر سلوک، مہر کے بارے میں یہ تصور کہ یہ صرف طلاق کی شکل میں دیا جاتا ہے یا پھر مرتے وقت بخشوا لیا جاتا ہے، بصورت طلاق مار پیٹ کر عورت کو خالی ہاتھ گھر سے نکال دینا، شادی کے لیے لمبے چوڑے جہیز کی پابندی، لڑکی والوں کا ساری عمر اپنے داماد اور اس کے ماں باپ کے آگے جھکنے پر مجبور رہنا وغیرہ وغیرہ۔

جب موجودہ معاشرے میں خواتین کو اسلام کے دیئے ہوئے حقوق عملاً کہیں نظر نہیں آتے تو پھر کوئی کیسے یقین کرے کہ اسلام نے عورت کو کوئی حقوق دیئے ہیں۔

وجہ دوم:

اہل مغرب اس بات سے خواب واقف ہیں کہ مرد کو بے راہ رو کرنے اور اسلامی تعلیمات سے برگشتہ کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کہ وہ تو فرد واحد کا مسئلہ ہے۔ عورت جب تک گھر کے اندر موجود ہے اور اپنی آئندہ نسلوں کی اسلام کے مطابق تربیت کر رہی ہے تب تک اسلامی معاشرہ کو بے راہ رو نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تبھی ممکن ہے جب عورت کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکال کر سڑکوں، کلبوں، پارکوں، دفتروں اور کارخانوں میں مرد کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا جائے، جب عورت ستر و حجاب کی بندشوں سے آزاد گھر سے باہر نکل آئی تو گویا ان جدت پسندوں

کی منزل کامیابی سے ہمکنار ہوگئی۔ اس لیے وہ خواتین کو اپنا خصوصی ہدف سمجھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نظریہ مساوات مرد و زن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف گہری سازش ہے، جو عورت سے ہمدردی کے پردے میں تیار کی گئی ہے۔ ہر مسلمان ملک میں سے اغیار کو ایسے ایجنٹ بھی مل جاتے ہیں جو خود آگے بڑھ کر ان کے مذموم عزائم کی تکمیل کا سامان کرنے لگتے ہیں۔ خصوصاً مغرب زدہ خواتین نے اس ضمن میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ مسلمان عورت جو کل تک اسلامی اقدار کی محافظ تھی، وہ اب خود طرح طرح کے مطالبے لے کر شریعت اسلام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ تاکہ دشمنان اسلام اہل مغرب کی تمناؤں کے مطابق یا تو سرے سے غلبہ اسلام کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے یا پھر شریعت کا ایسا حلیہ بگاڑ دیا جائے کہ عورت کی صرف آزادی بلکہ آوارگی ہی باقی رہ جائے۔

تحریک آزادی نسواں کا تجزیہ

حقیقت یہ ہے کہ جس کو اہل مغرب Feminism یا ”تحریک آزادی نسواں“ کہتے ہیں، اس کا صحیح مفہوم ”آزادی نسواں“ نہیں بن سکتا۔ اس تحریک کی بانی خواتین کے افکار کا جائزہ لینے اور اب یکے بعد دیگرے قاہرہ کانفرنس اور بیجنگ کانفرنس اور بعد والی یو۔ این۔ او کی خواتین کانفرنسوں میں لیڈر خواتین کے ایجنڈے اور مطالبات کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ”Feminist Movement“ (تحریک آزادی نسواں) دراصل ”عورت کی آوارگی“، ”ممتا کے قتل“ اور ”بیوی کی گمشدگی“ کی تحریک ہے، جو شادی بھی بطور پیشہ کرنا چاہتی ہے۔ اب سرطان کے یہی جراثیم ہماری اسلامی تہذیب کو بھی ہلاک کرنے کے درپے ہیں۔

پاکستانی خواتین کی حالت زار یا ترقی؟

مسئلہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم اور انگریزی نظام تعلیم نے صورت حال بہت خراب کر دی ہے، تعلیمی ادارے اب ناچ گانے، رقص، موسیقی سکھانے کے مرکز بن چکے ہیں۔ مینا بازار، ڈریس شوز اور ورائٹی شوز سونے پر سہاگہ ہیں

بقول ماہر القادری مرحوم

قوم کی وہ بیٹیاں جن کو بننا تھا بتول
مدرسوں میں سیکھتی ہیں ناچ گانوں کے اصول

اب ان تعلیمی اداروں میں ایسے ایسے جنسی سکیئنڈل اور بے راہروی کے واقعات پیش آرہے ہیں کہ الحفیظ والامان! عام معاشرہ میں ذرائع ابلاغ، اخبارات وغیرہ کی وجہ سے بے حیائی اتنے عروج پر پہنچی ہوئی ہے کہ خود لاہور کے اندر بے شمار عصمت فروشی کے مرکز اور بے حیائی کے اڈے موجود ہیں۔ زنا اور گینگ ریپ کے بے شمار واقعات روزانہ اخبارات میں درج ہوتے ہیں اور اب تو یہ بالکل معمول کی بات محسوس ہونے لگی ہے، مثلاً یہ ملاحظہ فرمائیے:

☆ ”بھائی نے نشہ پورا کرنے کے لیے بہن کی تین مرتبہ ”قیمت“ لگائی۔“

☆ ”دو شیزہ سے سات افراد کی زیادتی۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر پھینک گئے۔“ یہ سرخی ہے۔

نیچے تفصیل اس طرح درج کی گئی ہے کہ گلشن راوی کی نسیم ملیا نوالہ شاپ پر کھڑی تھی کہ 15 افراد

نے اغوا کر کے ہوس کا نشانہ بنایا۔ دل بھر جانے پر اسے مزید دو افراد کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وہ

اسے لاہور لا کر اس سے زیادتی کرتے رہے۔ بعد ازاں وہ بھی اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گلشن

راوی میں ایک فلیٹ کے آگے پھینک گئے۔^[۱]

☆ دوسری طرف غیرت کے نام پر خواتین کو بے دھڑک قتل کر دیا جاتا ہے۔ ”گزشتہ چند

سالوں سے پاکستان میں خواتین کے قتل کی وارداتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی دن

ایسا گزرتا ہو جب اخبارات میں کسی خاتون کے قتل کی خبر موجود نہ ہو۔ حقائق کے مطابق قتل

ہونے والی ہر دوسری عورت پر قاتل یہ الزام لگاتا ہے کہ مقتولہ بدکردار اور بدچلن تھی۔“^[۲]

☆ 11 مارچ 1997ء کو لاہور ہائی کورٹ سے ہونے والا صائمہ، ارشد کیس کا فیصلہ جس کے

مطابق بالغ لڑکی ولی کے بغیر نکاح کر سکتی ہے۔ اس فیصلے نے مسلمانوں کے خاندانی نظام کی

[۱] روزنامہ خبریں، مورخہ 26 اکتوبر 96ء

[۲] ہفت روزہ ندائے ملت، صفحہ 4، مورخہ 11-10-96

چولیس ہلا دی ہیں۔

☆ کھیلوں میں بھی پاکستانی خواتین نے بہت پیش رفت کی ہے۔ پاکستان ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ پہلی انٹرنیشنل مسلم ویمن گیمز کا انعقاد کرواتا۔ چنانچہ 20 اکتوبر 96ء کو یہ 6 روزہ تقریبات لیاقت جمینیم اسلام آباد میں شروع ہوئیں، خود وزیراعظم پاکستان بے نظیر بھٹو نے اس کا افتتاح کیا۔ طے یہ پایا کہ تمام کھیلیں اسلامی حدود و حجاب کے اندر ہوں گی اور کوئی مرد جمینیم کے اندر داخل نہ ہوگا۔ [۱] اس موقع پر بے نظیر صاحبہ نے کھلاڑی خواتین کو یہ پیغام دیا کہ خواتین تمام زنجیریں توڑ کر ہر میدان میں مردوں کے برابر نظر آئیں۔ ان کھیلوں میں بارہ مسلم ممالک کی ٹیمیں شامل تھیں اور چھ پروگرام تھے۔ ان کھیلوں میں شامل ہونے والے مسلم ممالک میں پاکستان نے پہلی، ازبکستان نے دوسری، بنگلہ دیش نے تیسری اور بوسنیا نے چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ پروگرام کے اختتام پر پاکستان ویمن سپورٹس بورڈ کی سربراہ اور وزیراعظم کی مشیر شہناز وزیر علی نے کہا کہ پاکستانی خواتین نے نو گولڈ، دس سلور اور چار براؤنز میڈل جیت کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ اب اس بورڈ کو مستقل شکل دے دی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ ہم مردوں سے الرجک نہیں ہیں۔ مرد ہمارے بھائی ہیں۔ [۲] چنانچہ اب پاکستان کی خواتین ہر کھیل میں ہر جگہ بغیر کسی رکاوٹ کے شرکت کر رہی ہیں۔

پاکستان کے ”اعزازات“:

”یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مسلم دنیا کی پہلی سفیر خاتون بننے کا ”اعزاز“ بھی پاکستانی خاتون بیگم رعنا لیاقت علی خاں کو ملا تھا۔ وہ ستمبر 1954ء سے لیکر 1961ء تک ہالینڈ میں پاکستان کی سفیر کے طور پر کام کرتی رہیں اور اب انٹرنیشنل مسلم ویمن گیمز بھی پاکستان ہی نے سب سے پہلے کروائی ہیں اور مسلم دنیا کی پہلی منتخب خاتون وزیراعظم بھی پاکستان کی بے نظیر بھٹو ہی تھیں۔

[۱] روزنامہ ”نیوز“ اور ”پاکستان“ 20-10-96

[۲] رپورٹ: روزنامہ ”نوائے وقت“، مورخہ 25-10-96، صفحہ کھیل اور کھلاڑی

احکامِ الہی کی پامالی:

اس بظاہر آزادی نسواں مگر باطن آوارگی نسواں کی تحریک نے بے شمار اسلامی شعائر کا تمسخر اڑایا۔ مثلاً حجاب اترا۔ دوپٹہ اترا، بے پردگی، فحاشی، عریانی، ماڈلنگ اور شو بزنز کلچر وجود میں آیا۔ مزامیر کو توڑنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ناچ گانا، رقص، موسیقی عمومی مزاج بن گیا، ذرائع ابلاغ، ٹی۔وی، فحش تصاویر نے اس گندگی کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کو تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ اور جو ماحول وجود میں آیا اس کی ایک جھلک اس خبر میں ملاحظہ فرمائیں:

”پانچ روزہ کل پاکستان موسیقی کانفرنس مورخہ 28 اکتوبر 96ء کو الحمراء میں منعقد ہوئی۔ اس میں ایک صحافی احمد بشیر نے کتھک ڈانس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ (نعوذ باللہ) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی رقص دیکھا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بعض روایات موجود ہیں کہ انہوں نے دف پر ہونے والا رقص دیکھا بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ بابا آدم اور اماں حوا بھی (نعوذ باللہ) ناچتے ہوئے جنت سے نکلے تھے۔۔۔ اسی طرح اس نے یہ بھی کہا کہ مغل شہزادیاں اپنے جسم کے خدو خال نمایاں کرنے کے لیے نیم برہنہ رہا کرتی تھیں تاکہ شہزادوں اور دوسرے لوگوں کی نظر میں خود کو نمایاں کر سکیں، ہندوستان میں ہونے والی تمام ثقافتی ترقی مسلمانوں کی ہے۔ مگر ہندو نے سب کچھ اپنے کھاتے میں ڈال لیا ہے اور ہم خاموشی سے مان لیتے ہیں۔ پھر کل پاکستان موسیقی کانفرنس کے صدر سید واجد علی شاہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ رقص اور موسیقی بند ہو جائے تو ایسا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ رقص اور موسیقی کا تعلق روح اور دل سے ہے، کوئی کتنا بڑا مولانا ہو اور کتنے بڑے فتوے لگائے، خدا نے دل کو ایسا بنایا ہے کہ وہ موسیقی کا ایک حصہ بنتا ہے۔ موسیقی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری حیات احمد خاں نے کہا کہ وہ کتھک ڈانس کی تربیت 12 سے 14 لڑکیوں کو دلواریے ہیں جو جلد ہی فرانس کے ایک ثقافتی شو میں شرکت کریں گی۔“ [1]

پھر ہر سطح پر اختلاط مرد و زن وجود میں آیا، ہر جگہ اور ہر میدان میں عورت مرد کے شانہ بشانہ دوڑتی نظر آئی۔ حتیٰ کہ نوبت حکومت کی سربراہی تک بھی پہنچ گئی۔

بیسویں صدی کے آخری 20 سالوں میں تو مسلم ممالک میں کئی جگہ مسلمان عورتیں باقاعدہ منتخب ہو کر وزرائے اعظم کے منصب تک پہنچیں۔ مثلاً ترکی میں تانسو چلر، بنگلہ دیش میں خالدہ ضیاء اور حسینہ واحد، پاکستان میں بے نظیر بھٹو۔ موخر الذکر تو دو دفعہ منتخب ہو کر ملک کی وزیراعظم بنیں۔ ان ممالک میں اب تو یہ رواج بھی بن گیا ہے کہ جو سیاسی لیڈر فوت ہوتا ہے اس کی بیوہ اٹھ کر سیاست میں آنے اور مرحوم شوہر کے ”مشن کو زندہ رکھنے“ کا عزم لیکر نمودار ہو جاتی ہے۔ مثلاً نصرت بھٹو، غنوی بھٹو، خالدہ ضیاء، حسینہ واحد وغیرہ۔

اسی زمانے میں عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ پاکستان میں یو۔ این۔ او کی طرف سے ”آزادی نسواں“ کی چیمپئن بن کر ابھری۔ انہوں نے عدالت کی سطح سے عورت بگاڑ پروگرام کو کافی آگے بڑھایا۔

پاکستان میں یو۔ این۔ او کے ایجنڈے کے تحت خواتین کی پیش رفت:

مغربی ممالک نے دوسری عالمی جنگ 1939ء تا 1945ء کے بعد اپنی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کے لیے اقوام متحدہ (یو۔ این۔ او) کا ادارہ قائم کیا، یہ ادارہ اپنے آغاز ہی سے مغربی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے اور اسے تمام دنیا میں برتری دلانے کے لیے کوشاں ہے، اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وقتاً فوقتاً بے شمار سیمینارز، ورکشاپیں، کانفرنسیں اور کنونشن منعقد کرتا رہتا ہے۔ پھر ان کے ذریعے تمام ممبر ممالک کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان سفارشات پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں تاکہ تمام ممبر ممالک کا نظام ان کی خواہشات اور ترجیحات کے مطابق چلے اور کوئی انکے حکم سے سرمو سر تاباں نہ کر سکے۔

عورت کے حقوق کے نام پر بھی یو۔ این۔ او، کئی بین الاقوامی خواتین کانفرنسیں منعقد کر چکا ہے۔ مثلاً خواتین کی پہلی عالمی کانفرنس 1975ء میں میکسیکو میں ہوئی اور پھر اس سال کو ”خواتین کا عالمی سال“ کے طور پر منایا گیا (اب 8 مارچ کو ہر سال خواتین کے عالمی دن کے طور

پر منایا جاتا ہے)

پاکستان اپنے قیام کے فوراً بعد یو۔ این۔ او کا ممبر بن گیا تھا، لہذا عورت کے حقوق کے نام پر منعقد ہونے والی تمام کانفرنسوں میں باقاعدہ پاکستانی خواتین کے وفد سرکاری سطح پر شامل ہوتے رہے اور اس کے مطابق پاکستان کو عورت سے متعلق ایجنڈے دیئے جاتے رہے چنانچہ ان ایجنڈوں پر پیش رفت کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

1949ء کی ابتدا ہی سے عورتوں کو ووٹ کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ 1961ء میں عائلی قوانین کے ذریعے مسلمانوں کے عائلی قوانین میں کئی تبدیلیاں یو۔ این۔ او سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے کی گئیں۔ 1973ء میں عورتوں پر تمام سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھل گئے اور عورتوں کے لیے مکمل مساوات کا نظریہ دیا گیا تھا۔ اس دور میں ضبط ولادت کی تحریک کو بھی ملک میں مقبول عوام بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ 1975ء میں میکسیکو کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے بعد پاکستان میں خواتین کی کئی تنظیمیں غیر سرکاری طور پر وجود میں آئیں اور مغربی ایجنڈے کے طور پر پاکستانی خواتین کو بے حجاب اور بے راہ رو کرنے میں مصروف رہیں۔ اپوا کی تنظیم جو قیام پاکستان کے فوراً بعد وجود میں آئی تھی اور سرکاری سرپرستی میں چل رہی تھی اب وہ مزید مضبوط ہو چکی تھی۔

ضیاء دور میں 1979ء میں حدود آؤٹینس نافذ کیا گیا۔ دیت، شہادت کے متعلق اسلام کی روشنی میں قانون سازی ہوئی۔ سرکاری دفاتر میں عورتوں کو ساتر لباس اور چادر کا پابند کیا گیا۔ نیز ان کو برسرِ عام کھیلوں میں حصہ لینے سے روک دیا گیا، تو ان تنظیموں نے ضیاء الحق دور کے ان تمام اقدامات کے خلاف بھرپور احتجاج کیا اور حکومت کے ہر سطح کے اقدامات کی پرزور مخالفت کی۔ یہ خواتین تعداد میں اگرچہ مختصر تھیں، مگر عالمی ذرائع ابلاغ ان کی پشت پر تھے۔ لہذا ان کے اسلام مخالف پروپیگنڈے کو بڑی کورتج دے رہے تھے۔ چنانچہ 1975ء میں پاکستان میں خواتین کا عالمی سال منایا گیا۔ بھٹو دور میں بیگم رعنا لیاقت علی خاں کو سندھ کا گورنر بنایا گیا۔ اور ڈاکٹر کنیز یوسف کو قائد اعظم یونیورسٹی کا وی۔ سی بنایا گیا۔

1988ء میں انتخابات کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو سربراہ حکومت بنی تو ایک مستقل وزارت ”خواتین وزارت“ کے نام سے قائم کی گئی۔ اس دور میں خواتین کے الگ بینک قائم ہوئے، الگ تھانے قائم ہوئے، عدلیہ میں بھی خواتین جج مقرر ہوئیں۔ تمام سرکاری ملازمتوں میں خواتین کا کوئٹہ 5% مقرر ہوا۔ مگر افسوس اس دور میں بھی خواتین کے لیے الگ یونیورسٹی نہ بن سکی۔ موقف یہ تھا کہ اس طرح عورت کے خلاف صنفی امتیاز مستحکم ہوتا ہے ان کو نسوانی قسم کے مضامین پڑھائے جائیں گے۔ جو عورتوں کو سائنسی سوچ اور جدید علوم سے دور رکھنے کا پروگرام ہے، اس طرح ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی بند ہو جائیں گے۔

1985ء اور 1990ء میں پاکستانی وفد دوسری اور تیسری عالمی خواتین کانفرنس میں شریک ہوا۔ نیز 1990ء میں ہی پاکستان نے سی۔ ڈا (عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کے خاتمہ کے لیے عالمی کنونشن) کی دستاویز پر بھی دستخط کیے۔ یہ دستاویز عورت کے موضوع پر یو۔ این۔ او کی تیس سالہ کوشش کا نتیجہ تھی۔ 1994ء میں ”آبادی اور ترقی“ کے موضوع پر ہونے والی عالمی کانفرنس جو قاہرہ میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں بھی پاکستان نے شرکت کی۔ یہ اصل میں مسلم ممالک میں کنڈوم کلچر کو رائج کرنے کا ایک پروگرام تھا۔

بیجنگ کانفرنس 1995ء:

ستمبر 1995ء میں بیجنگ میں خواتین کی چوتھی عالمی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کا ایجنڈا ”سی ڈا“ اور قاہرہ کی بہبود آبادی کانفرنس کے نتیجے میں تیار ہوا تھا۔ اس وقت بے نظیر بھٹو صاحبہ سربراہ حکومت تھیں۔ اُس نے بھرپور تیاری کے ساتھ اس کانفرنس میں شرکت کی وہاں اہم اجلاس کی صدارت کا بھی اعزاز حاصل کیا اور اس کے ننگ انسانیت و تذلیل نسوانیت ایجنڈے پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سربراہ نے برضا و رغبت دستخط کیے۔ بعد ازاں اس ایجنڈے پر عمل درآمد کرنے کے لیے کئی اقدامات بھی اٹھائے گئے۔

خواتین انکوائری کمیشن 1994ء تا 1997ء:

ستمبر 1994ء میں پاکستانی سینٹ کی ایک قرارداد کے ذریعے ایک خواتین انکوائری

کمیشن قائم کیا گیا۔ جس کا مقصد پاکستانی خواتین کے بارے میں کتاب و سنت کی روشنی میں موثر سفارشات تیار کرنا تھا۔ اس کمیشن نے 180 صفحات پر مشتمل رپورٹ 1997ء میں پیش کی۔ اس کی سفارشات کیا تھیں۔ دراصل یہ بیجنگ کانفرنس کے اقوام متحدہ کے دیئے ہوئے ایجنڈے کو بروئے کار لانے کا ہی ایک ذریعہ تھیں۔ افسوس! یہ اسلام دشمنی! یہ اہل مغرب کی چال بازی! یہ اہل اسلام کی بے غیرتی و بے حسی! یہ مخلص مسلمانوں کے بے بسی و بے چارگی! اہل مغرب چاہتے ہیں کہ کسی طرح مسلم معاشروں سے ان کی حیا اور شرم چھین لی جائے۔ ان کے خاندانی استحکام کو برباد کر دیا جائے عورت کو مادر پدر آزاد بنا دیا جائے۔ چنانچہ قاہرہ اور بیجنگ کانفرنسوں میں شیطانی ایجنڈے تیار کر کے مسلم ملکوں کے حوالے کر دیئے جاتے ہیں اور مسلمان ممالک جو پہلے ہی سود کے مکروہ جال کی بنا پر کاسہ گدائی ہاتھ میں لیے آئی۔ ایم۔ ایف اور ورلڈ بینک کی جانب دیکھنے پر مجبور ہیں! ان مکروہ ایجنڈوں پر عمل درآمد کے لیے مجبور کر دیئے جاتے ہیں۔ پاکستان کا یہ حالیہ خواتین انکوائری کمیشن بھی اسی پروگرام کا حصہ ہے۔ جو ڈیوٹی کو نبھانے کے لیے دل و جان سے رضا مند ہیں، وہی اس کمیشن کی شرکاء اور نمائندہ ہیں۔ اس کمیشن کے گیارہ ممبر تھے۔ عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ بھی اس کی ممبر تھیں (اگرچہ چند ایک مقامات پر ایک مولانا نے اپنے الگ سے وضاحتی اور اختلافی نوٹ بھی تحریر کیے ہیں) مگر بحیثیت مجموعی اس کی سفارشات درج ذیل ہیں:

- (1) حدود کے قوانین کو ختم کیا جائے اور وفاقی شرعی عدالت کو بھی ختم کیا جائے۔
- (2) عورت اور مرد کے درمیان ہر قسم کے صنفی امتیاز کا خاتمہ کیا جائے۔
- (3) خاوند کی موت کی شکل میں بہو کو جائیداد میں اتنا حصہ دیا جائے جو کہ اس کا شوہر اگر زندہ ہوتا تو اس کو ملتا۔ عورت کی وراثت مرد کے مساوی کی جائے، اسی طرح پنشن میں بھی عورت کا حصہ مرد کے مساوی کیا جائے۔
- (4) سولہ سال سے کم عمر میں بچی کی شادی کرنے پر اس کے ولی کو تین سے پانچ سال تک قید اور جرمانہ کی سزا دی جائے۔ لیکن اگر لڑکی کی مرضی سے کم سنی میں شادی کی گئی ہے تو پھر قابل مواخذہ نہیں ہے۔

- (5) عورت کو سیاسی اداروں میں 33% نمائندگی دی جائے۔
 - (6) مخلوط تعلیم کی کھلی اجازت ہو۔ تمام افواج، پولیس، ادارے، دفاتر، انڈسٹریز میں عورت کو برابری کی بنیاد پر ملازمت دی جائے۔
 - (7) شناختی کارڈ پر خواتین کی تصویر چسپاں کرنا ضروری قرار دیا جائے۔
 - (8) غیر مسلم مرد سے شادی کرنے پر کسی قسم کا مواخذہ نہ کیا جائے۔
 - (9) دیت کے معاملے میں مرد و عورت میں برابری ہو۔ پھر دیت کی رقم کی تقسیم میں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کا یکساں حصہ ہو۔
 - (10) اسقاط حمل عورت کا قانونی حق قرار دیا جائے کہ 120 دنوں تک عورت جب چاہے، جہاں چاہے وہ حمل ساقط کروا سکے اور اگر یہ حمل زنا کے نتیجے میں ظاہر ہوا ہے تو پھر اس مدت کے بعد بھی اسقاط کی اجازت دی جائے۔
 - (11) اسلام کا قانون شہادت ختم کیا جائے اور عورت کی گواہی مرد کے برابر تسلیم کی جائے۔
 - (12) قحبہ گری کرنے والی خواتین مجرم نہیں بلکہ مظلوم ہیں۔ ان کو سزا نہ دی جائے بلکہ ان کے معاشی اخراجات وہ لوگ برداشت کریں جو ان سے یہ پیشہ کرواتے ہیں۔
 - (13) ضبطِ ولادت کے لیے اسقاطِ حمل کی اور نس بندی کی غیر مشروط اجازت دی جائے۔
 - (14) مرد کی دوسری شادی پر سخت پابندی ہو، ایسا کرنے پر اسے پانچ سال قید با مشقت اور 2 لاکھ روپیہ جرمانہ عائد کیا جائے اور پہلی بیوی کو حق حاصل ہو کہ وہ خود بخود طلاق لے لے۔
 - (15) زنا بالرضا کی سزا 5 سال اور زنا بالجبر کی سزا عمر قید ہو (یہ سزا صرف مرد کے لیے ہو کیونکہ ”عورت تو ہر حال میں مجبور اور کمزور ہے“)
 - (16) مرد و عورت کو حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر وہ زبردستی حقِ زوجیت ادا کرے تو اسے تعزیری جرم قرار دیا جائے اسی طرح کمسن بیوی کے ساتھ جنسی وظیفہ کو ریپ قرار دے کر ان پر سخت سزائیں دینے کی سفارش کی ہے۔
 - (17) نکاح کے وقت عورت کو تفویضِ طلاق کا حق دیا جائے۔
- یہ سفارشات من و عن بیجنگ کانفرنس اور سی۔ ڈا کا عکس ہیں۔ پڑھ کریں محسوس ہوتا ہے

گویا مسلم معاشروں میں مرد و عورت کو ہر وقت آپس میں خم ٹھونک کر لڑتے رہنے والے فریق بنا کر گھریلو امن چین رخصت کرنے کا منظم پروگرام ہے۔ جہاں مکمل جنسی انارکی اور اخلاق باختگی موجود ہو اور اخلاق، دین یا قرآن و سنت نام کی کوئی چیز معاشرہ میں نہ رہنے دی جائے۔ چند مغرب زدہ خواتین کی ان زہریلی سفارشات کو مسلم معاشرے میں نافذ کرنا تو بدترین ظلم اور زیادتی ہے۔ جمہوریت کے برعکس دیندار، دین پسند اکثریت کے اوپر اقلیت کا جبر ٹھونسنے والا معاملہ ہے۔ ان سفارشات میں کوئی بھی خیر کا پہلو موجود نہیں ہے۔

(18) حکومت کے مقرر کردہ ”تحقیقاتی کمیشن“ برائے خواتین نے ابتدا ہی سے قرارداد مقاصد کو آئین کا جز بنانے پر اظہار ناپسندیدگی کیا تھا۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ پاکستان بین الاقوامی معاہدوں کا پابند ہے اور وہ ان سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ اس نے ابتدا ہی میں اعلان کر دیا تھا۔

"We cannot divorce international norms."

(19) انہوں نے (انکوائری کمیشن کی رپورٹ) میں یہ کہا کہ وفاقی شرعی عدالت ختم کر دی جائے بلکہ حدود قوانین کو بھی ظالمانہ کہتے ہوئے ان کو بھی ختم کرنے کی تجویز دی۔ حالانکہ سینیٹ کی قرارداد کے ذریعے ان کو قرآن و سنت کی روشنی میں خواتین کی اصلاح و بہتری کے لیے تجاویز دینے کا پابند کیا گیا تھا۔ مگر افسوس انہوں نے اللہ و رسول کو نظر انداز کر کے بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی کا ہی عزم ظاہر کیا تھا اور سی۔ ڈا کا ایجنڈا ہی سفارشات کے طور پر پیش کر دیا۔ (انکوائری کمیشن رپورٹ کا شق دار جائزہ راقمہ نے اپنی کتاب ”خواتین کمیشن رپورٹ کا جائزہ“ میں لیا ہے۔ یہ 62 صفحات کا کتابچہ 2000ء میں منشورات منصورہ لاہور نے شائع کیا تھا)۔ اس کے بعد بھی یو۔ این۔ او کے تحت ہونے والی خواتین کی تمام کانفرنسوں میں پاکستان شرکت کرتا رہا اور ان کے مطالبات و سفارشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

تحریک ضبط ولادت کو فروغ: [۱]

پاکستان میں صدر ایوب کے دور سے تحریک ضبط ولادت کو رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی ہے۔ ہر حکومت کے دور میں اس کو بہت فروغ دیا گیا۔ انہی مغربی اثرات کے زیر اثر یہ تحریک بھی زوروں پر ہے، حکومت تحریک کو فروغ دینے کے لیے بھرپور اقدامات کر رہی ہے۔ اب نوبت یہ آن پہنچی ہے کہ ”دو بچوں“ کے والدین کو قومی ایوارڈز دیئے جا رہے ہیں، چنانچہ پاکستان کی پچاس سالہ گولڈن جوبلی تقریبات کے سلسلے میں الحمراء میں ایک تقریب منعقد کی گئی۔ جس میں وفاقی وزیر منصوبہ بندی بیگم عابدہ حسین نے اس ”آبادی سنبھالو“ تقریب میں ان جوڑوں کو ایوارڈز دیئے جنہوں نے اپنے بچوں کی تعداد دو سے بڑھنے نہیں دی تھی۔ ”نوائے وقت“ کے کالم ”سر رہے“ کے کالم نگار نے اس تقریب کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا: ”اگر آبادی گھٹانے کا جوش اسی طرح جاری رہا تو عین ممکن ہے کہ کچھ مدت کے بعد ان جوڑوں کو بھی انعام ملنا شروع ہو جائے۔ جنہوں نے ایک بھی بچہ پیدا نہیں ہونے دیا۔ بقول شاعر

”جو لوگ کچھ نہیں کرتے، کمال کرتے ہیں“

محترمہ اخلاص فاطمہ اپنے مضمون ”پاکستان میں عالمی بہبود آبادی کانفرنس 2005ء“ میں لکھتی ہیں۔ اسی آزادی کے نتائج پر تحقیق کی روشنی میں ایک مصنفہ میلنی فلیس اپنی کتاب ”نسوانیت زدہ برطانیہ اور مردانگی سے محروم مرد“ میں لکھتی ہیں: ”نوجوان لڑکے اور مرد اپنے فطری رجحان کی تکمیل میں ہر طرف سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اسکول سے نکلتے ہی گھر جانے کے بجائے شراب، منشیات اور دوسرے جرائم کی تکمیل کی فکر ہوتی ہے۔ ”گرل فرینڈز“ کو قطار اندر قطار اولاد کی نعمت سے نوازا نا ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ مغرب اپنی نوجوان نسل کے غیر ذمہ دارانہ رویوں سے شدید پریشان ہے۔ وزیر داخلہ جیک سٹرانے موجودہ دور میں اہم ترین سنجیدہ مسئلہ ”نوجوانوں کا تعلیم اور ہنرمندی سے عاری ہونا“ قرار دیا ہے۔ مغربی معاشرے میں جنسی آزادی نے انیڈی برن جیسے نوجوان کو پیدا کیا ہے جس نے 15 سال کی عمر میں نو کم سن لڑکیوں سے نو بچے پیدا کیے ہیں۔ ان بچوں

[۱] اس موضوع پر مزید معلومات راقمہ کی کتاب ”اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ“ باب 8 میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

کی پرورش کی ذمہ داری انیڈی برن پر نہیں ہے کیونکہ مغربی معاشروں نے بچوں کی پرورش کی ذمہ داری ریاست کے ذمہ ڈالی ہے۔ نوجوانوں کا کام صرف جنسی لطف اندوزی اور پیدائش نوع انسان ہے۔ باقی کام ریاست کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیڈی برن اپنے فعل کو سماجی خدمت قرار دیتا ہے۔ اسے یہ کہنے میں عار نہیں کہ ملک و قوم کے لیے بچوں کی پیدائش کے علاوہ اور کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتا میری ان خدمات کے نتیجے میں بچوں کی ماؤں کو حکومت سرکاری رہائش کی سہولت فراہم کرتی ہے۔ میلینی فلپس کے مطابق نوجوان نشے کی حالت میں ڈرائیونگ، توڑ پھوڑ، گینگ وار، پولیس اور قانون نافذ کرنے والوں سے لڑائیوں، ڈکیتیوں اور خواتین پر تشدد جیسے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ نسل پیدائشی طور پر تشدد ہوتی ہے۔ ان بچوں کو دیکھ کر بجا طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس دنیا کی مخلوق نہیں ہیں بلکہ کسی اور دنیا کے مصنوعی انسان ہیں۔“ [۱]

عالمی بہبود آبادی کا نفرنس 2005ء:

اسلام آباد میں 4 تا 6 مئی 2005ء میں عالمی بہبود کا نفرنس 2005ء منعقد ہوئی۔ جو دراصل ”نام نہاد“ علماء و مشائخ کو باضابطہ سرکاری ملازم بنا کر ان کو ضبط ولادت کے پروگرام میں معاون بنانا مقصود تھا۔ تاکہ وہ منبر و محراب کی قوت سے، تبلیغ اور وعظ و خطبے کے ذریعے لوگوں کو اپنی آبادی کم کرنے کی طرف مائل کر سکیں اور انہیں سمجھائیں کہ اولاد کم یا زیادہ کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ وہ جتنی چاہے اولاد لے۔ زیادہ افراد کو بڑھا کر ان کی خوراک اور تعلیم و تربیت اور بہتر مستقبل بنانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا صرف بچے ”دو ہی اچھے“ ہونے چاہئیں۔

اس طرح پاکستان کو عالم اسلام میں بہبود آبادی پروگرام کو مسلم ممالک میں کنٹرول کرنے کی مرکزی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ جبکہ اس کا نفرنس سے قبل ایسی کانفرنسیں ترکی، مراکش اور قاہرہ میں ہو چکی تھیں۔ یہ پاکستان میں اس سلسلے کی پانچویں کانفرنس تھی۔ بعد ازاں وزیر بہبود آبادی چودھری شہباز حسین نے اسلام آباد میں ایک نیوز بریفنگ میں کہا کہ مسلم ممالک میں آبادی کی شرح اضافہ کو روکنے کے لیے مانع حمل اقدامات کے بارے میں جامع منصوبہ بندی کے پلان کے بارے میں آگاہ کیا گیا۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ حکومت نے پینتیس سو

(3500) ماسٹرٹریز تیار کیے ہیں۔ جو ہر ضلع میں مقامی علماء کو تربیت دیں گے۔ ان مانع حمل ادویہ کی ترغیب دینے والے پیش اماموں اور علماء کو حکومت ماہانہ اعزاز یہ بھی دے گی۔“ [۱]

2 اگست 2009ء کے روزنامہ ”خبریں“ کی ایک خبر ملاحظہ فرمائیں:

وفاقی وزیر برائے بہبود آبادی فردوس عاشق اعوان نے قومی اسمبلی میں کہا کہ ”بڑھتی ہوئی آبادی کا عنصر دہشت گردی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ پارلیمنٹ زیادہ بچے پیدا کرنے پر ٹیکس عائد کرنے کے حوالے سے پالیسی بنائے۔ حکومت اسے نافذ کرنے پر تیار ہے۔“ [۲]

گویا حکومت نے آبادی کنٹرول کرنے پر ناکامی کا اعتراف کر لیا اور زیادہ بچوں پر ٹیکس کی تجویز اسمبلی کے سامنے رکھ دی جس کو علماء اور دانشوروں نے غیر شرعی قرار دیتے ہوئے کہا کہ آبادی کنٹرول کرنے کے لیے اسقاطِ حمل اور آپریشن وغیرہ کے طریقے غیر شرعی ہیں۔ جس کو بچے کم پیدا کرنے کا شوق ہے وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور نفلی روزہ کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کر لے۔

سپیشل کمیٹی برائے جائزہ حدود قوانین:

گیارہ اگست 2000ء کو ڈاکٹر شاہین سردار علی کو خواتین کمیشن پاکستان کا سربراہ بنایا گیا۔ اس کمیشن نے ایک ”سپیشل کمیٹی“ بنائی جس کا نام ”سپیشل کمیٹی برائے جائزہ حدود قوانین“ تھا۔ اس کمیٹی کے کل اٹھارہ ممبران تھے، جو قانون دان حضرات اور چند این۔ جی۔ اوز کی نمائندہ خواتین پر مشتمل تھے۔ ”ریٹائرڈ جسٹس ماجدہ رضوی“ اس کی چیئر پرسن تھیں۔ ان ممبران نے 3 سال کے غور و خوض کے بعد کمیشن کو اپنی جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق بارہ ارکان نے حدود قوانین کو بالکل منسوخ کر دینے کی سفارش کی۔ جبکہ دو ارکان ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ زمان اور ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی نے ان حدود قوانین کے نفاذ میں موجود خامیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصلاح کی سفارش کی تھی۔ (واضح رہے کہ آخر میں ارکان 18 کے بجائے صرف 14 رہ گئے تھے، جنہوں نے رپورٹ دی تھی)

[۱] روزنامہ نوائے وقت مورخہ 2 جون 2006ء

[۲] روزنامہ ”خبریں“ 2 اگست 2009ء

این۔ جی۔ اوز اور اسلامی نظریاتی کونسل:

پاکستانی این۔ جی۔ اوز کو وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل سے بڑی نفرت رہی ہے۔ وہ ہمیشہ ہی اس کا کردار محدود کرنے کی سفارش کرتی رہتی تھیں۔ مثلاً دسمبر 94ء میں شریعت اپیلیٹ بینچ سپریم کورٹ آف پاکستان نے ایک زیر التوا سود کے مقدمے کا فیصلہ سنایا اور مارچ 2001ء تک حکومت کو پابند کر دیا کہ وہ ملکی معیشت میں سے ہر قسم کے سود کو ختم کرے کیونکہ سود اسلام کے احکامات کے خلاف ہے۔

یہ فیصلہ ان پاکستانی این۔ جی۔ اوز کے لیے بڑی پریشانی کا باعث بن چکا تھا۔ ان کے لیے مزید ایک فیصلہ بھی بڑی پریشانی کا تھا، جو 5 جنوری 2000ء کو سنایا گیا۔ اس میں وفاقی شرعی عدالت نے مذہبی طبقے کی طرف سے دائر کی گئی بہت سی پیشینوں کا فیصلہ سنایا۔ جو کہ عائلی قوانین 1961ء کے خلاف دائر کی گئی تھیں، فیصلے کے ذریعے اس کی بہت سی دفعات کو کالعدم قرار دیا گیا، اور اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے حکومت کو مارچ 2000ء تک کی مہلت دی گئی۔ یہ فیصلہ خواتین کے حقوق کے لیے لڑنے والی این۔ جی۔ اوز کے خلاف مذہبی عناصر کی فتح تھی۔ اب ان کو فکر لگی ہوئی تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ اتنی محنت سے ہم نے خواتین کے جو کچھ حقوق قانونی طور پر حاصل کیے ہیں۔ کہیں دین پسند لوگ ان کو بھی نہ چیلنج کر دیں اور کہہ دیں کہ یہ اسلام کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان این۔ جی۔ اوز نے صرف اور صرف یو۔ این۔ او کے الحادی ایجنڈے اور انہی کی ثقافتی یلغار کو پاکستان میں پروان چڑھانے کی ہمیشہ کوشش کی۔ پاکستانی آئین میں سے اسلامی شقوق کو نکلوانے پر پورا زور صرف کیا، قرارداد مقاصد کو کئی بار چیلنج کیا۔ بلکہ خود مملکت خداداد پاکستان کے نام ”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ سے لفظ ”اسلامی“ کو ختم کروانے کی کئی بار کوشش کی۔ دیگر لبرل لوگ بھی ان کے ہمنوا بن گئے۔

این۔ جی۔ اوز کا منفی کردار:

اس دور میں بہت سی نئی این۔ جی۔ اوز بھی میدان میں آ گئیں۔ اب ان کو سول سوسائٹی

کے نام سے پکارا جانے لگا۔ جبکہ پہلے بھی پاکستان میں چند این۔ جی۔ اوز موجود تھیں۔
پاکستان کے ساتھ ہی وجود میں آنے والی این۔ جی۔ اوز یعنی

- 1- اپوا
- 2- فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن آف پاکستان 1953ء
- 3- شرکت گاہ 1975ء
- 4- ساہی 1982ء
- 5- خواتین کے لیے لیگل ایڈسل 1986ء (A.G.H.S)
- 6- عورت فاؤنڈیشن 1986ء
- 7- ہیومن رائٹس کمیشن پاکستان 1986ء (H.R.C.P)
- 8- WAR 1986ء (War Against Rape)
- 9- بنیاد 1993ء

10- وومن ڈویلپمنٹ کنسرن 1997ء (اس کا مختصر نام ”تحفظ“ ہے)
یہ سب تنظیمیں Cedaw کے ایجنڈے کو ہی پاکستان میں آگے بڑھا کر پاکستانی معاشرہ کو زیادہ سے زیادہ لبرل بنانے سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ زیادہ تر ان میں سے غیر ملکی ایجنٹ ہیں۔ اپنی نوکری پکی کرنے کے لیے کوئی نادر موقع ڈھونڈ کر پاکستان کے خلاف دہائی دینے لگتی ہیں۔ مختار امانی کا واقعہ ہو یا سمیعہ عمران کا، صائمہ وحید کا مسئلہ ہو یا شازیہ خالد کا، ان کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے کہ پاکستان کو خواتین کے حوالے سے بدنام کریں۔ جہاں فی الواقع خواتین کا کوئی مسئلہ ہو۔ وہ کبھی نہیں پہنچیں، مگر جہاں پاکستان کو بدنام کرنے کا مسئلہ ہو، فوراً پہنچ جاتی ہیں۔

اے۔ جی۔ ایچ۔ ایس (A.G.H.S) نامی این۔ جی۔ اوز خواتین کے لیے لیگل ایڈسل ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ اس تنظیم کے تحت قانونی امداد فراہم کرنے والی اہم خواتین میں عاصمہ جہانگیر، حنا جیلانی، روبینہ شاہین اور انیلا جعفری جیسی خواتین شامل رہی ہیں۔ یہ ”مسلم عائلی قوانین 1961ء کا دفاع کرنے والی تنظیم ہے۔ اس کا خصوصی ادارہ ”دستک“ ہے جو دراصل

متاثرہ خواتین کے لیے پناہ گاہ ہے۔ ایڈووکیٹ عاصمہ جہانگیر اس تنظیم کی بانی رہی۔ جو تین دہائیوں تک بہت متحرک رہی اور خواتین کے ہر معاملے کو اس نے خاص طور پر بگاڑا۔ ”جہد حق“ ان کا ماہنامہ مجلہ ہے۔ اس تنظیم H.R.C.P کا بنیادی نعرہ ہے۔

”اب راج کرے گی خلق خدا، جو عورت بھی ہے مرد بھی ہے۔“

اس کا دوسرا بنیادی نعرہ ہے: ”حقوق انسانی ہی حقوق نسواں بھی ہیں۔“

اس نے اپنے ادارے ”دستک“ میں گھر سے فرار ہونے والی کئی لڑکیوں کو پناہ دی اور پھر ان کو اسلام سے برگشتہ کر دیا تھا۔ عاصمہ جہانگیر نے اپنے دفتر میں ایک خاتون متاثرہ عالم کا نکاح بھی قاسم شفیع سے پڑھایا۔ 13 اپریل 1999ء کو ایک نماز جنازہ کا بھی اہتمام کیا اس پر لوگوں نے اس کو طنزاً ”مولانا عاصمہ جہانگیر“ کہنا شروع کر دیا تھا۔ لوگوں نے پوچھا تم نے عورت ہو کر نکاح کیوں پڑھایا؟ تو بولی، انہوں نے درخواست کی تھی تو میں نے پڑھا دیا۔^[۱]

علماء نے عاصمہ جہانگیر کے کئی اس طرح کے ”کارناموں“ کی بنا پر اس کی مخالفت کی تو ”ایمنسٹی انٹرنیشنل“ نے پاکستانی حکومت کو کہا کہ عاصمہ جہانگیر اور (اس کی معاون حنا جیلانی) کو تحفظ فراہم کیا جائے^[۲] حالانکہ 17 اپریل کو حکومت پاکستان نے اس عالمی ادارے کو عاصمہ کے تحفظ کی پہلے ہی یقین دہانی کروادی تھی۔^[۳] اس موقع پر روزنامہ نوائے وقت میں سربراہ والے کالم میں بتایا گیا کہ ”گزشتہ روز لاہور ہائیکورٹ کے باہر انسانی حقوق کی تنظیموں کے زیر اہتمام عاصمہ جہانگیر کے دفتر میں قتل ہونے والی خاتون سمیعہ عمران کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی جس کی امامت ”مولانا“ حیدر فاروق مودودی نے کی۔ اس نماز جنازہ میں تین قطاریں مردوں کی اور چار عورتوں کی بنائی گئیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر مبشر حسن اور دیگر رہنماؤں نے قتل کے واقعہ کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ عورت کے حقوق کی بات کرتے ہیں، انہیں

[۱] نوائے وقت، مورخہ 5-6 اپریل 1999ء

[۲] نوائے وقت، مورخہ 21 اپریل 1999ء

[۳] روزنامہ نوائے وقت، مورخہ 21 اپریل 1999ء

دھمکیاں مل رہی ہیں۔“ [۱] چونکہ مغربی قوتیں عاصمہ جہانگیر کی سرپرستی کر رہی تھیں۔ وہ این۔ جی۔ اوز کی باقاعدہ حمایت کرتی تھیں لہذا یہ جارحانہ کارروائیوں میں آگے بڑھتی رہیں۔ اس وقت ملک میں 50 ہزار سے زائد این۔ جی۔ اوز کام کر رہی تھیں۔ جبکہ غیر ملکی این۔ جی۔ اوز کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ بعض کا کام تو صرف کاغذ کی بنیاد پر ہی ہے لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جو بلاشبہ کچھ خدمات واقعی انجام دے رہی ہیں۔ وہ صحت، صفائی، تعلیم اور ماحولیات کے حوالے سے کاموں کا بیڑا اٹھاتی ہیں۔ مگر خواتین کے حوالے سے ان کی جارحانہ یلغار نے مسائل کھڑے کیے ہیں۔ غیرت کے نام پر قتل، کار و کاری، گھریلو تشدد، جہیز ایک لعنت، اجتماعی زیادتی جیسے عنوانات کو موضوع بحث بناتے ہوئے عورت کو زیادہ سے زیادہ باختیار بنانے کے لیے قانون سازی کروانے پر کام کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ حدود قوانین کو انہوں نے تحفظ نسواں بل میں تبدیل کر کے ہی سکھ کا سانس لیا۔

اسلامی نظریاتی کونسل میں لبرل ارکان بھرتی کیے گئے:

صدر مشرف نے ان لبرل مغربی مرعوب یافتہ خواتین کے اصرار پر نظریاتی کونسل میں لبرل ارکان بھرتی کرنے شروع کر دیئے۔ جنہوں نے نکاح طلاق اور خلع وغیرہ کے بارے میں عجیب و غریب تجویزیں اور مشورے دینے شروع کر دیئے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے 71 ویں اجلاس کی سفارشات مسلمانانِ پاکستان کے لیے بڑی پریشانی و اضطراب کا باعث بن گئی تھیں۔ کہ قانون بنادیا جائے کہ بیوی اگر تحریری طور پر طلاق کا مطالبہ کرے تو شوہر نوے دن کے اندر اس کو طلاق دینے کا پابند ہوگا اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو یہ مدت گزر جانے کے بعد طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی (سوائے اس کے کہ بیوی اپنا مطالبہ واپس لے لے) اور مرد کو اس کے بعد رجوع کا حق بھی نہیں ہوگا اور بیوی اگر طلاق لینا چاہتی ہے تو پابند ہوگی کہ مہر اور نان نفقہ کے علاوہ جو اموال یا املاک شوہر نے اسے دے رکھے ہیں اور وہ اب واپس لینا چاہتا ہے تو وہ واپس کر دے یا عدالت سے رجوع کرے۔ پھر کونسل نے ایک طلاق نامہ بھی تجویز کیا۔ سوال یہ ہے

[۱] مورخہ 11 اپریل 1999ء، سیرا ہے نوائے وقت لاہور

کہ وہ طلاق اور خلع کو گڈ مڈ کیوں کر رہی ہے۔ کیوں ہر نکاح نامے کے ساتھ وہ ایک طلاق نامہ بھی لکھوانا چاہتی ہے۔“ [۱]

بیجنگ پلس فائیکانفرنس 2000ء:

2000ء میں نیویارک میں ہونے والی پانچویں عالمی خواتین کانفرنس میں پاکستانی نمائندے سرکاری طور پر شامل ہوئے۔ اس کانفرنس کا خصوصی ایجنڈا تو بیجنگ کانفرنس کے تحت طے ہونے والے نکات کا جائزہ لینا تھا۔ مثلاً: (۱) خاتون خانہ کی گھریلو ذمہ داریوں پر اور پھر اس کی تولیدی خدمات پر اس کو باقاعدہ معاوضہ دیا جائے۔ (۲) ازدواجی عصمت دری (یعنی شوہر کا اپنی بیوی سے اس کی مرضی کے برعکس جنسی وظیفہ ادا کرنا) پر قانون سازی اور فیملی کورٹس کے ذریعے مرد کو سزا دلوانا۔ (۳) طوائف کو جنسی کارکن قرار دینا۔ (۴) ممبر ممالک میں کنڈوم اور مانع حمل ادویات کی تربیت دینا۔ (۵) استقاٹ حمل کو عورت کا حق قرار دینا۔ (۶) جنسی تعلیم پر زور۔ (۷) ہم جنس پرستی کا فروغ وغیرہ۔ چنانچہ انہی تجویزوں کو رسمی طور پر دس پندرہ منٹ کی نمائشی تقریروں کے بعد منظور کر لینے کا پروگرام تھا۔

پاکستان بھر میں کانفرنس کی تیاریاں:

اس کانفرنس کی تیاری بڑی دھوم دھام سے ہوتی رہی۔ 1994ء میں قاہرہ میں ہونے والی بہبود آبادی کانفرنس کے نتیجے میں وطن عزیز میں بے شمار این۔جی۔ اوز وجود میں آچکی تھیں۔ بیجنگ کانفرنس کے بعد ان میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ملک میں فیملی پلاننگ کو بہت اہمیت دی گئی۔ جگہ جگہ خاندانی منصوبہ بندی کے سنٹر کھلے، ستارہ اور چابی والی گولیاں (مانع حمل ادویات) ملک میں عام ہوئیں۔ ایڈز سے بچاؤ کے بہانے ملک میں ہم جنس پرستی کے بارے میں وسیع پروپیگنڈہ ہوا۔ وطن عزیز میں بے حیائی و فحاشی کو بہت فروغ حاصل ہوا: ذرائع ابلاغ، ڈش انٹرنیٹ کیبل، فحش لٹریچر، ماڈلنگ، وڈیو گیمز وغیرہ کے ذریعے فحاشی کے مظاہر بہت زیادہ بڑھ گئے۔ اغوا،

[۱] اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اجتہاد یا الحاد؟ از حکیم سید محمود احمد سرسہارن پوری نوائے وقت میگزین

عصمت دری، گھروں سے لڑکیوں کے فرار، پسند کی شادی وغیرہ کے واقعات روز افزوں ہونے لگے۔ اسی پس منظر میں ”صائمہ ارشد کیس“ بھی منظر عام پر آیا۔ اسی دور میں خواتین کے بینک اور خواتین کے پولیس سٹیشن بھی قائم ہوئے۔ اکتوبر 1998ء کو بشری عبدالغنی کو پولیس سٹیشن میں پہلی S.H.O مقرر کیا گیا یعنی سٹیشن ہاؤس آفیسر۔

اسی دور میں منیزہ ہاشمی کو پی۔ ٹی۔ وی کا جنرل ڈائریکٹر بنایا گیا۔ انجم بھٹی کو سندھ میں ریڈیو کی پہلی خاتون ڈائریکٹر بنایا گیا۔ گویا یہ ”عورتوں کی صلاحیتوں کا بہت بڑا اعتراف تھا۔ ان دنوں فلمی اداکار اپنے ڈراموں میں لومیرج (Love Marriage) پر بڑا زور دینے لگے۔

پھر انہی این۔ جی۔ اوز نے عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ (جو اس وقت یو۔ این۔ او کی طرف سے پاکستان میں انسانی حقوق کمیشن کی چیئر پرسن تھی اور ان سے باضابطہ تنخواہ وصول کرتی تھی) کی سربراہی میں قتل غیرت پر اس شدت سے دہائی دی کہ اس وقت حکومت نے 20 اپریل 2000ء کو ہونے والی ”انسانی حقوق کانفرنس“ میں ایسے قتل غیرت کو ”قتل عمد“ ٹھہرایا اور اس کی سزا موت قرار دے دی۔ بعد ازاں پاکستان کی فوجی حکومت اور اس کی این۔ جی۔ اوز پر مشتمل کابینہ نے بلدیاتی انتخابات میں عورتوں کو 50% نشستیں دینے کا اعلان کر کے اسی مغربی ایجنڈے پر عمل درآمد کا اعلان کیا۔

اس ساری پیش رفت کے باوجود پاکستانی این۔ جی۔ اوز نے بیجنگ ڈرافٹ پر عمل درآمد کے سلسلے میں مغربی آقاؤں کو باقاعدہ شکایت بھیجی کہ یہاں بے نظیر بھٹو کے دور میں تو اس ایجنڈے پر تیز رفتاری سے عمل ہوتا رہا تھا، مگر نواز شریف کے دور میں یہ پیش رفت ختم ہو کر رہ گئی ہے۔

سرکاری وفد:

سرکاری سطح پر بیجنگ پلس فائیو کانفرنس 2000ء میں جو وفد شرکت کے لیے نیویارک گیا۔ اس میں ”محکمہ بہبود اور خواتین“ کی وزیر شاہین عتیق الرحمان، ڈاکٹر یاسمین راشد، زریں خالد شمیمہ پیرزادہ اور ڈاکٹر رخسانہ شامل تھیں۔ وفاقی وزیر تعلیم زبیدہ جلال اس وفد کی سربراہ

تھیں۔ علاوہ ازیں بہت سی لبرل خواتین مبصر کے طور پر بھی وہاں موجود تھیں۔ کئی این۔ جی۔ اوز بھی وہاں عاصمہ جہانگیر کے ہمراہ موجود تھیں۔ بہر حال کانفرنس کے موقع پر بہت سے علماء اور بھی خواہوں نے حکومت کو پابند کیا تھا کہ وہ کانفرنس کی غیر شرعی اور ناقابل عمل تجاویز کو قبول نہ کریں۔ چنانچہ عملی طور پر یہ کانفرنس اپنے مطالبات نہ منواسکی، بلکہ یوں کہیں کہ (ناقابل عمل ہونے کی بنا پر) ایسا نہ ہو سکا۔ جمہوریہ چین نے بھی ان نکات کی مخالفت کی تھی۔ پھر کیتھولک چرچ بھی ان میں سے کئی نکات پر تحفظات رکھتا تھا۔ خود مسلم ممالک بھی بیشتر نکات پر پس و پیش کا شکار تھے۔ لہذا بحث و مباحثہ طول پکڑ گیا۔

آخر میں یو۔ این۔ او کے نمائندوں نے بیجنگ پلیٹ فارم فار ایکشن کے بارہ نکات کا جائزہ لینے کے بعد افسوس کا اظہار کیا ”افسوس لوگوں پر ابھی تک روایتی جنسی شناخت طاری ہے اور عورت کے خلاف جنس کی بنا پر امتیازی سلوک، مرد و زن کی مساوات قائم کرنے میں بڑی رکاوٹ ہے۔ پھر حکومتوں نے بھی ایسے اقدامات پر توجہ نہیں دی، نہ عورتوں کے تولیدی حقوق کے متعلق حقوق پر عمل درآمد کروانے کی عوام کو آگاہی دی۔ لہذا اب خود یو۔ این۔ او بین الاقوامی تنظیموں، مہذب معاشروں، سیاسی جماعتوں، ذرائع ابلاغ اور نجی شعبہ سب کی ذمہ داری قرار دیتی ہے کہ وہ ایسی عوامی بحث کا آغاز کریں اور باقاعدہ مہم چلائیں، جس سے جنس سے متعلقہ امور پر کھلے عام بات چیت ہو۔ عمومی رویے زیر بحث آئیں نئے تصورات جنم لیں اور جائزہ لیا جائے کہ مرد و عورت کی مساوات پر کس حد تک عمل ہو سکتا ہے۔ پھر شعبہ تعلیم میں کام کرنے والوں کو رسمی و غیر رسمی ذرائع اختیار کر کے یہ بیداری پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی طرح بین الاقوامی تنظیموں آئی۔ ایم۔ ایف، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن، گروپ آف سیون (G-7) اور دیگر بین الاقوامی اداروں کو جنس کی مساوات کو فیصلہ سازی کا اہم حصہ بنانا چاہیے۔ (یہ تمام تفصیلات انٹرنیٹ سے باسانی دستیاب ہو سکتی ہیں)

ملینیم ڈویلپمنٹ گول

اس کانفرنس 2000ء سے شروع ہونے والی اس ساری پیش رفت کا نام MDG رکھا گیا۔ یعنی ”ملینیم ڈویلپمنٹ گول“۔ مراد یہ ہے کہ نئی ہزاری میں عورت کے موضوع پر کتنی پیش رفت ہوتی ہے۔ کبھی اس کا نام G.R.A.P یعنی ”جینڈر ریفارم ایکشن پلان“ رکھا گیا۔ چنانچہ اسی کے تحت پاکستان میں ”خواتین کمیشن پاکستان“ N.C.S.W یعنی نیشنل کمیشن فار سٹیٹس آف وومن تشکیل دیا گیا۔ اس N.C.S.W (نیشنل کمیشن فار سٹیٹس آف وومن) کے قیام کے مقاصد درج ذیل قرار دیئے گئے:

1- قومی پالیسی برائے ترقی خواتین کی تیاری

2- I.L.O کنونشن کے تحت کارکن عورتوں کے لیے مردوں کے برابر معاوضہ تسلیم کرانا

3- مقامی حکومتوں میں عورتوں کا 33% تناسب اور قومی و صوبائی اسمبلیوں میں 22% اور

سینٹ میں 17% تناسب مختص کرنا

اس جینڈر ریفارم ایکشن پلان کی بنیاد بھی یہی مفروضہ ہے کہ عورت مظلوم ہے، غریب ہے، امتیازی قوانین کا شکار ہے، مرد اور معاشرہ غاصب ہیں۔ اس کو حقوق ادا نہیں کر رہے اس کے حقوق کا راستہ یہی ہے کہ وہ ہر میدان میں مردوں کے برابر تعداد میں کھڑی نظر آئے۔ اس ہدف کو تیزی سے حاصل کرنے کے لیے زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کے لیے کوٹہ بھی مختص کیا جائے اور اوپن میرٹ کو بھی باقی رکھا جائے۔ اس کے خلاف تمام امتیازی قوانین ختم کیے جائیں اسے اپنے قول و فعل کی آزادی ہو۔ اگر معاشرہ ان اقدامات کو تسلیم نہ کرے تو اسے سزا والے اقدامات کا سامنا کرنا پڑے گا اس طرح عورت کی عزت و تکریم بھی بحال ہوگی۔ اور وہ طاقتور و مضبوط بھی ہوگی۔^[1]

[1] تلخیص از جینڈر ریفارم ایکشن پلان۔ محکمہ سماجی بہبود ترقی خواتین و بیت المال پنجاب اور ”مجلہ روشنی“

وومن اینڈ فیملی کمیشن شمارہ نمبر 1 ص: 8

خواتین کا عالمی عشرہ:

یو۔ این کا عالمی ادارہ برائے خواتین یونی فیم (Unifeme) کے زیر اثر جنوب ایشیائی ممالک میں عورتوں پر تشدد کے خلاف اور خواتین کے حقوق کا شعور دینے کے لیے 1998ء میں خواتین کا عالمی عشرہ منایا گیا۔ مگر پاکستان میں تو یہ مہم پندرہ روزہ تھی (بجائے دس روز کے) یعنی 25 نومبر سے لے کر دس دسمبر 1998ء تک یہ مہم منائی گئی تھی۔ ان میں سب پروگرام نمائشی تھے۔ کشمیر اور فلسطین کی خواتین کے لیے کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔

خواتین کے حقوق کے لیے لمبے چوڑے پروگرام کرنے والے خود مسلم ممالک کی خواتین کی عصمت درمی کو باقاعدہ جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت نہ خواتین پر کسی ظلم و جبر اور تشدد کی فکر ہوتی ہے، نہ احساس، وہ تو مسلم مجبور خواتین کو کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ انہیں صرف اور صرف مسلم معاشرہ کو آبرو باختہ اور بے حیا بنانے کی فکر ہوتی ہے۔ ان کی کوششوں سے معاشرے میں بے حیائی اور فحاشی بڑھتی چلی گئی۔ چنانچہ پاکستان ٹیلی ویژن کے چیئرمین پرویز رشید نے دعویٰ کیا ”ہم نے بھارت کو ثقافتی طور پر فتح کر لیا ہے۔ نصرت فتح علی خاں، مہدی حسن، غلام علی ہندوستان سمیت دنیا میں وہاں وہاں سنے جاتے ہیں۔ جہاں پہلے بھارتی گلوکار سنے جاتے تھے۔ اب ہمارے نوجوان گلوکاروں کے گروپ سارے بھارت میں پسند کیے جاتے ہیں، ہمارائی وی اب دنیا بھر میں دیکھا جاتا ہے، اب ہماری ثقافتی یلغار نے بھارت کو خوفزدہ کر رکھا ہے۔ اردو میں گانے اور فلموں کی لندن میں چھ گھنٹوں کی نشریات دیکھی جاتی ہیں۔ جو اشتہارات پہلے زی۔ٹی۔وی کو ملتے تھے اب وہ پی۔ٹی۔وی کو ملتے ہیں۔“ [۱] اندازہ کریں ہمارے حکمرانوں کے سامنے ترقی اور بہتر مستقبل کے یہ کیسے خواب تھے جس کے مطابق وہ پاکستان کو روشن خیال اور خوشحال بنانا چاہتے تھے۔

[۱] نوائے وقت میگزین مورخہ 11 اپریل 1999ء

نائن الیون کا المیہ

مغربی دنیا نے تیسری ہزاری (اکیسویں صدی) میں داخل ہونے کا بڑا اہتمام کیا تو ان کی پیروی میں مسلم حکمرانوں نے بھی اسی انداز سے اکیسویں صدی کا استقبال کیا۔ لیکن اکیسویں صدی کا آغاز ہی مسلمانوں کے لیے بڑا خون آشام اور جان لیوا ثابت ہوا۔ امریکہ میں دنیا کی سب سے بڑی عمارت اور سب سے بڑے تجارتی مرکز ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے کچھ ہوائی جہاز ٹکرائے اور پوری عمارت زمین بوس ہو گئی۔ اس تخریب کاری کا پورا ملبہ مغربی میڈیا نے مسلمانوں پر اور خصوصاً اسامہ بن لادن پر ڈال کر افغانستان پر چڑھائی کر دی۔ تمام مسلم ممالک پر یکے بعد دیگرے دہشت گرد ہونے کا الزام لگایا اور پھر ان پر سیاسی اور ثقافتی یلغار شروع کر دی۔ جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ پاکستان نے امریکہ کی دہشت گردی کی جنگ میں اپنا غیر مشروط تعاون پیش کیا۔ ایگزیکٹو جنرل صدر پرویز مشرف نے امریکی غلامی کو برضا و رغبت قبول کرتے ہوئے ان کی ہر بات مانتے چلے جانے کا عندیہ دیا۔ حقوق نسواں کے بارے میں مغربی ایجنڈے کو قبول کرتے ہوئے اپنے ہاں کے بلدیاتی انتخابات میں خواتین کو 50% نشستیں دینے کا ارادہ کیا۔ دانشوروں اور بھی خواہوں کے سمجھانے بجھانے پر یہ تناسب کم کر کے 33% کر دیا گیا۔ چنانچہ خواتین کی 33% نمائندگی کے باعث 40 ہزار خواتین کونسلرز بن کر کام کرنے لگیں۔ قومی اسمبلی میں خواتین کی نمائندگی 22% کی گئی اور سینیٹ میں 17% خواتین نمائندہ بنائی گئیں۔ اس طرح پاکستانی حکومت نے اپنی اس کارکردگی کو بڑے فخر کے ساتھ آقاؤں کے سامنے رکھا۔ مگر عملاً خواتین کی اتنی کثیر تعداد میں نمائندگی کوئی مناسب فائدہ نہ پہنچا سکی۔ اگر اس کے بجائے خواتین کی جہالت کو دور کیا جاتا اور ان کی شرح خواندگی کو بڑھایا جاتا

تو زیادہ مفید ہوتا۔ اس دور میں روزنامہ ”جنگ“ مئی 2006ء کے مطابق پاک فوج میں پہلی بار خواتین کو پاک آرمی کے اہم شعبوں میں بطور کمیشنڈ افسر بھرتی کیا جانے لگا۔ اس سے قبل فوج میں خواتین کی شمولیت صرف میڈیکل کے شعبے تک محدود تھی۔ اس کے بعد پاکستان میں فوج کے لڑاکا شعبوں میں بھی خواتین کی بھرتی ہونے لگی۔ پھر وہ چوکوں میں بھی ڈیوٹی دیتی نظر آنے لگی۔ اب وہ ٹریفک وارڈن کی حیثیت سے آٹھ آٹھ گھنٹے کی مسلسل ڈیوٹی دے رہی ہیں۔ اس طرح ہر سطح پر معاشرے میں مرد و زن کا اختلاط بڑھ گیا۔ دوسری طرف بسنت ویلنٹائن ڈے، نیکریں پہن کر مرد و زن کی مخلوط میراتھن ریس وغیرہ۔ اس طرح کے دیگر مغربی اور ہندوانہ تہوار جوش و خروش سے منائے جانے لگے۔

الیکٹرانک میڈیا نے خاندان کا ادارہ برباد کرنے میں اہم کردار ادا کیا: پرائیویٹ ٹی۔وی چینل کثرت سے قائم ہونے لگے۔ ڈش، کیبل اور وڈیو گیمز، جوں جوں معاشرے میں گھستے چلے گئے، اسی تناسب سے اس کے فحش ڈرامے، بیہودہ ڈائلاگ، ٹاک شو، نوجوان جوڑوں کی بے ہنگم اچھل کود، ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بے ہودہ اشتہارات (بلکہ جنس پرستی پر مبنی فلمیں پیش کی جانے لگیں) وہ افراد کی اعلیٰ اخلاقی اقدار اور شرم و حیا کو ختم کرتے چلے گئے۔

اسلحہ اور اس کی بے دریغ نمائش نے بچوں کے اندر تشدد، ماردھاڑ، قتل و غارت کو جنم دیا۔ شراب اور جوئے کا بکثرت چلن ہو گیا۔ مخلوط اور آزاد زندگی کے دلفریب مناظر نے نوجوان نسل کے قلوب و اذہان کو بہت متاثر کیا۔ لڑکیاں ’لومیرج‘ کی خاطر گھروں سے بھاگنے لگیں۔ گھریلو لڑائی جھگڑوں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ جس سے خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ رہی سہی کسر موبائل نے نکال دی۔ جس سے طلاق کی شرح بہت بڑھ گئی۔ خاندان ٹوٹنے لگے۔ روزنامہ نوائے وقت مورخہ 17 اکتوبر 2000ء کے مطابق ملک میں میاں بیوی کے جھگڑوں اور بچوں کی

تحویل کے بارے میں مقدمات کی تعداد ایک لاکھ تک جا پہنچی۔ مشترکہ خاندانی روایات، اسلامی تعلیمات سے دوری اور بے جوڑ شادیوں کے باعث عائلی جھگڑوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پنجاب میں 49 ہزار، سرحد میں 4500، سندھ میں 23 ہزار اور بلوچستان میں 8200 مقدمات زیر سماعت ہیں۔^[۱]

طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح:

”لومیرج“ نے معاشرے کو تباہ کر دیا ہے۔ اس کا اکثر و بیشتر انجام صرف طلاق ہی ہوتا ہے۔ صرف مغرب کی تقلید نے معاشرے میں عجیب قسم کی کھچڑی پکادی ہے۔

نوائے وقت میں 6 اپریل 2014ء کو ایک رپورٹ شائع ہوئی کہ ”فیملی کورٹس میں طلاق کے مقدمات کی بھرمار، 2014ء کے صرف پہلے 3 ماہ میں 387 کیس دائر۔ زیادہ تعداد پسند کی شادی کرنے والوں کی ہے۔ جو شادی کی پہلی سالگرہ منانے سے پہلے ہی شوہروں سے تنگ آ کر فیملی کورٹ پہنچ گئی ہیں۔ 219 لڑکیوں کو جسم فروشی کا دھندہ کرنے والوں کو فروخت کر دیا گیا، جبکہ 187 لڑکیوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی ان میں سے زیادہ تر نے انٹرنیٹ اور موبائل فون پر دوستی کر کے اپنی زندگی برباد کی۔ (روزنامہ نوائے وقت 10 جنوری 2014ء)

طلاق کی شرح میں اضافے کی ایک بڑی وجہ غیر اسلامی تربیت ہے۔ لاہور کی لیڈی رپورٹر ”پنجاب کمیشن آف دی اسٹیٹس آف ویمن“ کی چیئر پرسن فوزیہ وقار نے کہا کہ خواتین کو باختیار بنانے کے لیے معاشی طور پر مستحکم بنانا ہوگا اگر آپ اپنی بیٹی کو سسرال میں ظلم و ستم صبر سے سہنے کی تلقین کریں گے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ امتیاز پر مبنی تشدد کی تعلیم اپنے گھر سے ہی دے رہے ہیں۔“^[۲]

[۱] روزنامہ نوائے وقت لاہور 17 اکتوبر 2000ء

[۲] روزنامہ نوائے وقت 2 مئی 2014

وطن عزیز کی قابل ترین عفت مآب بیٹی کو دشمن کے ہاتھ بیچ دیا گیا:

دوسری طرف وطن عزیز کی انتہائی قابل، نیک، پاکباز اعلیٰ مغربی تعلیم یافتہ خاتون یعنی عافیہ صدیقی کو حکومت پاکستان نے (ایف۔ بی۔ آئی) امریکی ایجنسی کو بیچ دیا۔ اسے پہلے افغانستان میں گرام کے جیل خانے میں بہت زیادہ اذیتیں دی گئیں۔ پھر اس پر جھوٹے مقدمات بنا کر اسے امریکہ منتقل کر دیا گیا۔ وہ ابھی تک امریکی جیل خانے میں بے انتہا اذیت، تشدد اور نفسیاتی عوارض کا شکار ہے۔ (اس کے تین بچے بھی ہمراہ تھے۔ بڑے بچے تو بہت کوششوں سے مل گئے مگر ایک بچے کا کوئی علم نہیں) اس پر امریکہ میں مقدمہ چلتا رہا۔ بالآخر 4 فروری 2011ء کو اسے مجرم قرار دے کر 86 سال کی قید کی سزا سنائی گئی اس طرح امریکی محکمہ انصاف نے اپنے منہ پر خود ہی طمانچہ رسید کر دیا۔ افسوس کہ حکومت پاکستان نے وطن عزیز کے پندرہ سو انتہائی قابل اور محب وطن افراد پکڑ کر امریکہ کو فروخت کر دیئے تھے۔ جن میں سے بیشتر ابھی تک گوانتانامو بے کے عقوبت خانے میں سخت تشدد اور تذلیل کا شکار ہوئے۔ ان میں چند لوگ اب بھی وہاں قید ہیں۔

بیجنگ +10 کانفرنس (چھٹی عالمی کانفرنس):

پروگرام کے تحت خواتین کی چھٹی عالمی کانفرنس نیویارک میں (28 فروری تا 11 مارچ 2005ء) ہوئی۔ اس کانفرنس کو بیجنگ +10 کا نام دیا گیا تا کہ سابقہ فیصلوں پر عملدرآمد کا جائزہ لے کر نئے اہداف مقرر کیے جاسکیں۔ چنانچہ دنیا بھر کی حکومتوں کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ بیجنگ کانفرنس میں پیش کی گئی سفارشات پر اپنے ہاں مزید پیش رفت کی رپورٹ پیش کریں۔ عورتوں اور مردوں کی مساوات پر کام کرنے والی ساری این۔ جی۔ اوز بھی اس میں شریک ہوئی تھیں۔ جائزہ اجلاسوں کی تیاری کے لیے 2004ء میں دنیا بھر میں مقامی طور پر کئی میٹنگز رکھی گئیں۔ ایشیا میں بڑے بڑے جائزہ اجلاس ہوئے۔ یعنی ایشیا اور مشرق بعید کی غیر سرکاری تنظیموں کے مشترکہ پلیٹ فارم کے زیر اہتمام نیپال اور بنکاک میں یہ جائزہ اجلاس ہوئے۔

کچھ مسلم تنظیمیں بھی نیویارک میں بھرپور تیاری کے ساتھ شامل ہوئی تھیں۔ کانفرنس کے دوران ہم جنس پرست مردوں اور عورتوں کو اپنی مشکلات پیش کرنے کا باقاعدہ موقع دیا گیا اور کانفرنس میں مطالبہ کیا گیا کہ ان ممالک کو سزا دی جائے جو ہم جنس پرستی کے ایجنڈے کی مخالفت کریں یا نفاذ میں روڑے اٹکائیں۔ مسلم ممالک کی حکومتوں کو بھی من و عن کانفرنس کے فیصلوں کو اپنے ہاں نافذ کرنا ہوگا۔ جس کے مطابق بچوں کو جنسی تعلیم لازمی دی جائے۔ حمل اور اسقاطِ حمل کا ان کو اختیار ہو۔ ان کو کلاسوں میں مانع حمل ادویات فراہم کی جائے۔ ولد الزنا کی پرورش کا فریضہ خود مقامی حکومت انجام دے گی۔ لہذا ہم جنس پرست مرد و عورت کو اس مذموم عمل کی کھلی اجازت دی جائے۔

مسلم ممالک کے سرکاری نمائندے تو وہاں خاموش رہے مگر مسلم تنظیموں نے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کے لیے وقت مانگا۔ مگر افسوس ان کی ایک نہ سنی گئی۔ جس پر انہوں نے اپنا موقف ایک بیان کی صورت میں تمام مندوبین میں تقسیم کر دیا۔ انہوں نے اپنا یہ پیغام پہنچا دیا کہ ”دنیا میں امن جنسی اباحت کے ذریعے نہیں قائم ہو سکتا۔ اس کے لیے تو ضروری ہے کہ آپ ہر ملک کے دین، ثقافت اور رسم و رواج کا احترام کریں۔ مرد و زن کی مطلق مساوات تو جھگڑے اور نزاع کا باعث ہے۔ جبکہ مرد و عورت اپنے اپنے فرائض اپنے دائرہ کار کے مطابق انجام دیں تو اسی سے دونوں کو سکون حاصل ہوگا۔“

کانفرنس کے کل دس سیشن ہوئے۔ جن میں سے اکثر کا موضوع ”جنس اور مسلمان عورتوں پر ڈھایا جانے والا نام نہاد ”ظلم“ تھا۔ مسلم حکومتوں پر دباؤ تھا کہ اپنے ہاں کے عائلی قوانین میں ترمیم کر کے ان کو ہمارے ایجنڈے کے مطابق بناؤ۔ تمہارے رسوم و رواج اور دینی عقائد خواہ کچھ بھی ہوں۔ اس معاہدے میں شامل ملکوں پر ہمارے ایجنڈے کی تحفیذ لازمی ہے۔ جس کی خاطر میڈیا اور تعلیم کے ذریعے بچوں کو جنسی معلومات دی جائیں۔ اسقاطِ حمل قانوناً جائز قرار دیا جائے اور ہر ہسپتال اور ڈسپنسری میں اس کی قانونی سہولت موجود ہو۔

بہر حال کانفرنس کے آخری اجلاس میں امریکہ اور ویٹی کن سٹیٹ کے علاوہ تمام شریک ممالک نے بیجنگ +10 کے فیصلوں کی توثیق کی۔ جبکہ ان دونوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ ایجنڈا حقوق انسانی کے چارٹر میں کسی اضافے کا موجب نہیں ہوگا۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ قانونی طور پر اس کا اطلاق لازمی نہیں ہوگا۔^[i]

واضح رہے کہ خواتین کی عالمی چھٹی کانفرنس (بیجنگ +10) یا جنرل اسمبلی کے اس خصوصی اجلاس کا عنوان تھا۔

Celebrating women's gains: Confronting emerging gender issues

”یعنی خواتین کی کامیابیوں کا جشن اور آئندہ پیدا ہونے والے صنفی مسائل سے نمٹنے کا عزم۔“ گویا ماحول، سیاست، معیشت اور ٹیکنالوجی کے میدان میں عورتوں کی پیش رفت کا جائزہ لے کر معاشرہ میں ان کو پیش آنے والے مسائل اور سوالات کا حل تلاش کرنا ہی کانفرنس کا مقصد ٹھہرا تھا۔ تو پھر مسلم حکومتوں کو کیوں نہ دھمکیاں دی جاتیں۔ یہ کانفرنس در پردہ مسلمانوں کے خاندانی نظام کی توڑ پھوڑ اور بربادی کا منظم پروگرام تھا۔ خود امریکہ اور کیتھولک عیسائیوں نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ مگر یو۔ این۔ او تو انہی ممالک کی لونڈی ہے۔ ان کو کیا سزا دے سکتی ہے؟ یہ سارا المیہ تو مسلم ممالک پر ہی ہے، انہی کے خلاف پروپیگنڈا ہوتا ہے۔ انہی کے خلاف پابندیاں لگتی ہیں۔ انہی کے خلاف میڈیا وار شروع کر دی جاتی ہے جبکہ امریکہ، اسرائیل اور ویٹی کن سٹی کو ایسے ”فضول ایجنڈوں“ پر عمل کرنے کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔

[i] تلخیص: بیجنگ +10 کے مضمرات از حافظ محمد عبداللہ ماہنامہ ترجمان القرآن مئی 2005ء، ص: 65-68

جنرل مشرف اور خواتین

جنرل مشرف نے غیر ملکی آقاؤں کے سامنے پاکستان کا خوشگوار تاثر Soft Image قائم کرنے کے لیے بے شمار اقدامات کیے۔ وہ ہمیشہ ”روشن خیال اعتدال پسندی“ ہی کا درس دیتا رہا۔ اس کا ایک درس سنیے اور اپنی بربادی کا ماتم کیجیے ”فرسودہ خیالات اور دقیانوسی روایات کی دورِ جدید میں کوئی گنجائش نہیں۔ عرصہ دراز سے زمانہ ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے اب اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ ماضی سے اس کا رشتہ کٹ چکا ہے۔ سائنس ٹیکنالوجی اور معاشی ترقی کی تیز رفتار دوڑ میں مذہب زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ چادر، چار دیواری، حجاب، سکارف اور داڑھی ملا کا دین اور پسماندگی کی علامت ہے۔ تلوار اور آتشیں اسلحے سے جنگ اور جہاد کا دور اب ختم ہو چکا۔ اب اس کے بجائے ڈپلومیسی سے کام لیا جاتا ہے۔ بدکاری، ڈکیتی وغیرہ کے خلاف اسلامی حدود کا از سر نو جائزہ لے کر نئے اجتہاد کے دروازے کھولنا پڑیں گے۔ چوروں کے ہاتھ کاٹ کر قوم کو ٹنڈا نہیں کیا جاسکتا۔“

غور سے پڑھیے یہ الفاظ صدرِ اسلامی جمہوریہ پاکستان صدر مشرف کے ہیں۔ وہ نیکر پوش خواتین کو مخلوط میرا تھن کروانا ہی اپنی ترقی پسندی کی علامت سمجھتا ہے اور پاکستانی معاشرے کو اسی نہج پر چلانے کی تگ و دو کر رہا ہے۔ (اقتباس از ادارہ ماہنامہ محدث ممی 2005ء، ص: 2)

تعلیمی شعبہ اوری۔ ڈاکا ایجنڈا:

وطنِ عزیز کی طالبات مدتوں سے مطالبہ کر رہی تھیں کہ ان کے لیے الگ سے خواتین یونیورسٹی قائم کی جائے۔ آخر ان کی فریاد سنی گئی اور قیام پاکستان کے پورے 51 سال بعد ”وومن یونیورسٹی“ قائم ہوئی۔ مگر ”بسا آرزو کہ خاک شد“ کے مصداق طالبات کا تودینی تقاضوں کے پیش نظر الگ یونیورسٹی کا مطالبہ تھا۔ مگر یہاں وہی مغربی انداز، مغربی نصاب، مزید یہ کہ ہر شعبہ اور ہر

مضمون کی طالبہ کے لیے ایک پرچہ لازمی تھا اور اسی پرچہ میں بیجنگ کانفرنس والا پورا ایجنڈا ڈال دیا گیا تھا۔ اسی طرح 2001ء میں پنجاب یونیورسٹی میں ایک نیا شعبہ قائم ہوا۔ جس کا نام ”ویمن سٹڈیز“ تھا۔ اس شعبے میں بھی وہی عورت کے بارے میں مغربی پروگرام بلکہ بیجنگ کانفرنس میں دیئے گئے خاتون کے موضوع پر 12 نکات ہی اس شعبے کے اہم پرچے تھے۔ اور صرف ایک پرچہ اسلامی نقطہ نظر پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد مختلف یونیورسٹیوں میں ایم۔ اے وومن سٹڈیز کے شعبے کھلتے چلے گئے۔ کئی پرائیویٹ خواتین یونیورسٹیاں بھی بنیں۔ سب کے نصاب کا بیشتر حصہ اس طرح کے ملحدانہ افکار پر مبنی تھا۔ اسی طرح آغا خان بورڈ کا نصاب بھی اسی قسم کا تھا۔ غیر ملکی این۔ جی۔ اوز کو سرکاری کالجوں میں جانے کی کھلی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ دھڑلے سے مختلف کالجوں میں جا کر اپنے پروگرام کرواتی ہیں۔ اپنا ایجنڈا آگے بڑھاتی ہیں۔ مثلاً کسی کالج میں ”صحت“ کے متعلق پروگرام کروانا اور وہاں فیملی پلاننگ کو خصوصاً موضوع بنانا۔ پھر وہاں ”میرج کونسلنگ“ کے نام سے پروگرام کروانا۔ وہاں بھی فیملی پلاننگ کے پروگرام پر خصوصی روشنی ڈالنا۔ یا انہوں نے اپنے پاس نکاح فارم رکھے ہوتے ہیں۔ وہ دکھا کر بلکہ طالبات میں تقسیم کر کے ان کو ترغیب دینا کہ آپ تفویض طلاق والا خانہ ضرور پُر کریں اور وہاں Yes ”ہاں“ میں نشان لگائیں۔

ایک پاکستانی این۔ جی۔ او (وومن اینڈ فیملی کمیشن) کی نگران محترمہ عافیہ سرور نے بتایا۔ (انہوں نے خاندان کے استحکام کے لیے رشتے ٹاٹے کروانے کا ایک شعبہ بھی اپنے کمیشن میں قائم کر رکھا ہے) کہ دو کیس ہمارے پاس آئے۔ وہ دونوں خواتین طلاق یافتہ ہونے کا دعویٰ کرتی تھیں۔ ہم نے جب ان کے کیس کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ انہوں نے نکاح کے موقع پر ”تفویض طلاق“ والا خانہ پُر کیا تھا اور پھر انہوں نے اپنے خاوندوں کو خود طلاق دے دی ہے بجائے اس کے کہ وہ ان کو طلاق دیتے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے خاوند کو کہہ دیا کہ ہم طلاق چاہتے ہیں اور پھر خود ہی اپنے آپ کو طلاق یافتہ شمار کرنا شروع کر دیا۔

واضح رہے کہ اس وقت 1164 سکول این۔ جی۔ اوز کے پاس ہیں جن میں سے 300 تو

صرف لاہور میں ہیں۔ افسوس یہ ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران بے ضمیر ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے کان اور آنکھیں بند کر کے غیر ملکی ایجنڈے پر عمل کرنا اپنے اقتدار کی طوالت کے لیے ضروری خیال کر لیا ہے۔ لہذا ملک میں آوارگی کو خوب چھوٹ مل گئی۔ پھر غیر ملکی دوروں پر صدر اور وزیراعظم دونوں بڑے بڑے ثقافتی طائفے لے کر جانے لگے تاکہ دنیا ہمیں لبرل اور روشن خیال سمجھے۔

مختلف مواقع پر فحش ترین فلمیں بننے لگیں۔ فحش عید کارڈ چھپنے لگے۔ چوکوں اور چوراہوں میں گندے مناظر بڑے بڑے بورڈوں پر آویزاں نظر آنے لگے۔ عورتوں کی تقریباً برہنہ تصویریں ہر اشتہار کی زینت بننے لگیں۔ ٹی۔وی کی سکرین ہو یا پرنٹ میڈیا، کوئی رسالہ، کتاب ہو یا اخبار ہر جگہ ماڈل خواتین کی مختلف پوز میں برہنہ تصویریں لوگوں کی ہوس اور شہوت کو بڑھانے لگیں۔ جبکہ دیندار اور خدا پرست مرد و خواتین کے لیے فحش گانوں اور فحش مناظر سے اپنے ایمان کو بچانا اپنے کانوں اور آنکھوں کی حفاظت کرنا مشکل ترین بنا دیا گیا۔ اس کثافت زدہ ماحول میں حیا دار مرد و زن اپنے آپ کو کیسے پاکباز اور پاکدامن بنا کر رکھیں؟ بندہ کس سے فریاد کرے؟

این۔جی۔ اوز عام طور پر اپنے لیکچر کے بعد طالبات کو سوالنامہ پُر کرنے کے لیے دیتی ہیں اور اسی وقت اس کو واپس بھی لے لیتی ہیں۔

ایک سوالنامہ میرے سامنے پڑا ہے اس کے سوال ملاحظہ فرمائیے گا۔

نام..... رول نمبر..... کلاس..... کالج / ادارہ.....

- 1- اسلام کے پانچ ارکان کون سے ہیں؟
- 2- اسلام نے عورت کو کیا حقوق دیئے ہیں کوئی سے تین حقوق لکھیں۔
- 3- سماجی معاشی لحاظ سے اسلام میں عورت کا کیا مقام ہے؟
- 4- پاکستان کی موجودہ آبادی کتنی ہے؟
- 5- بڑے کنبے کی وجہ سے ماں اور بچے کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟
- 6- کیا اسلام میں لڑکے اور لڑکی کی تعلیم میں کوئی فرق ہے؟
- 7- کیا اسلام خاندانی منصوبہ بندی کی اجازت دیتا ہے؟

ملاحظہ فرمائیں کیا یہ مرد و زن میں اختلاط بڑھانے اور بے حیائی و آوارگی پھیلانے والا وہی اہل مغرب کا ایجنڈا نہیں ہے؟ انٹرنیٹ اور ڈش نے ہمیں کہاں تک پہنچا دیا ہے۔ مثلاً ایک رپورٹ میرے سامنے پڑی ہے ”انٹرنیٹ پر فحش مواد تلاش کرنے والوں میں پاکستانی دوسرے نمبر پر ہیں“ [۱] واشنگٹن (آئی این پی) امریکی جریدے ”مدر جونز اور امریکی اخبار ”ہفنگلٹن پوسٹ“ نے کہا ہے کہ پاکستان جیسے ملک جہاں مذہب کی طرف لوگوں کا جھکاؤ زیادہ ہے، جہاں ہم جنس پرستی یا فحش گفتگو معیوب فعل مانا جاتا ہے، حیران کن امر یہ سامنے آیا ہے کہ ہم جنس پرستی کے متعلق فحش ویڈیو، تصاویر اور مواد دیکھنے میں پاکستانی دنیا میں دوسرے نمبر پر ہیں۔ ہفتہ کو امریکی جریدے ”مدر جونز“ اور امریکی اخبار ”ہفنگلٹن پوسٹ“ نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ گوگل ٹرینڈز پر ہم جنس پرستی کے متعلق مواد اور ویڈیو کی تلاش میں سرفہرست کینیا ہے۔ گوگل سرچ انجن میں شی میل پرستی سے متعلق مواد تلاش کرنے میں سب سے زیادہ سرچ پاکستان کے شہر پشاور سے ہوئیں۔“ [۲]

6 دسمبر 2006ء کو نوائے وقت کے سربراہ کے کالم نگار نے لکھا:

خبر ہے کہ پاکستان دنیا کی بہترین شراب تیار کرے گا اور نیا براؤنڈ دنیا کی بہترین شراب بنانے والے ملک سکاٹ لینڈ کو بھی مات دے دے گا۔

جبکہ ایک آسٹریلوی ماڈل التماس (ایک مسلمان خاتون ہے) نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے سیٹیج پر شراب پینے کا مظاہرہ کیا۔

ظاہر ہے جب پاکستان دنیا کی بہترین شراب تیار کرے گا تو بہترین شراب پینے والے بھی متعارف کرائے گا۔ جس کے لیے آسٹریلیا کی مسلمان خاتون التماس بیگ علی رول ماڈل بنے گی۔

پھر 14 اکتوبر 2007ء کو سربراہ کے کالم نگار نے مزید لکھا:

سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے کہا ہے، زرعی فارمز پر جو فارم ہاؤس بنے ہیں، ان میں ہفتہ اور اتوار کے روز جو پروگرام ہوتے ہیں ان کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے۔

[۱] امریکی جریدہ

[۲] رپورٹ نوائے وقت 16 جون 2013ء

چیف جسٹس کی چشم رسا کی رسائیاں کہاں کہاں تک ہیں، یہ بڑا انکشاف ہے کہ جو زمینیں اللہ نے فصلیں اُگانے کے لیے عطا کی تھیں ان پر بے نام و نسب بچے اگائے جا رہے ہیں، اسی لیے تو چیف جسٹس ایسے مناظر کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ پچھلے دنوں ایک رپورٹ منظر عام پر آئی تھی کہ لاہور میں ایک فارم ہاؤس ایسا ہے جہاں ہلکی روشنی میں کھلے آسمان کے نیچے وسیع و عریض پارک میں موسیقی کی لے پر گناہ رقص کرتے ہیں، اس پنڈال میں جواں سال چندال عام ہوتی ہیں اور نو جوانوں کی کمی نہیں ہوتی۔ کوئی بھی کسی کو بھی ہم رقص بنا کر کسی کو نے میں انجام کو جا پہنچتا ہے۔ اس فارم ہاؤس کا مقصد نئی پود کو مادر پدر آزاد بنانا ہے۔ یہ وہی زمینیں ہیں، جو اس ملک کو تباہ کرنے والوں کو الاٹ کی گئی ہیں اور وہ ان پر اپنے مطلب کی کھیتی اگا رہے ہیں۔^[۱]

عورت کو با اختیار بنانا:

پھر مغرب کی طرف سے ایک اور ایجنڈا پیش کیا گیا اور وہ تھا کہ معیشت اور سیاست کے میدان میں عورت کو با اختیار بنایا جائے چنانچہ Women empowerment اور Gender Equality جیسی نئی نئی اصطلاحات پیش کی جانے لگیں اور مقصد سب کا ایک ہے کہ تمام قومی پالیسیوں میں مرد و زن میں مساوات قائم رکھی جائے۔ پھر صحت میں سے تمام تر توجہ خاندانی منصوبہ بندی اور ایڈز وغیرہ پردی جا رہی ہے۔ گویا دنیا میں صرف یہی ایک بیماری رہ گئی ہے۔ باقی سب ختم ہو گئی ہیں۔

اس طرح مسلمانوں کی حیا، ستر، حجاب اور خاندانی نظام کی بنیادوں کو مسمار کرنے اور ان کی روایات کو تباہ کرنے کا پروگرام اپنے حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی کی بنا پر برابر آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ مخلوط میراث تھن ریس، بسنت، ویلنٹائن ڈے جیسی خرافات کو زور و شور سے فروغ دیا جا رہا ہے۔

حدود قوانین کے خلاف پروپیگنڈا:

مغربی آقاؤں کی طرف سے شدید اصرار تھا کہ پاکستان کے حدود قوانین عورت کے

[۱] روزنامہ نوائے وقت لاہور کا کالم سر راہے مورخہ 14 اکتوبر 2007ء

خلاف امتیازی ہیں، لہذا ان کو فی الفور ختم کیا جائے۔ چنانچہ عاصمہ جہانگیر نے ”حقوق انسانی کمیشن“ کی چیئر پرسن بنتے ہی ان قوانین کے خلاف زوردار مہم چلائی۔ سیکولر بیگمات نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ چنانچہ مشرف دور میں ان قوانین کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا گیا۔ اخبارات میں ریڈیو، ٹی۔وی پر اس کے خلاف زہرا گلا گیا۔ بالآخر 15 نومبر 2006ء کو جنرل مشرف نے دھوکے اور چال بازی سے قومی اسمبلی کے فلور سے اس میں چند ترمیمات کو منظور کروا لیا۔ اب اس کا نام ”تحفظ نسواں بل“ رکھا گیا۔

یہ ترمیمات کیا تھیں۔ دراصل زنا، قذف اور شہادت جیسے اسلامی قوانین اور ان کی اسلامی سزاؤں کے ساتھ ساتھ برطانوی قانون بھی رکھ دیا گیا۔ ایف۔آئی۔ آر کٹوانے کا طریقہ اتنا مشکل بنا دیا گیا۔ عملاً زنا اور قذف کی شرعی سزائیں ختم ہو کر رہ گئیں۔ پھر اس کے بعد جگہ جگہ مساجد سنٹر کھلے، بے حیائی بہت زیادہ بڑھی۔ اب پولیس بھی مشکوک اور حیا باختہ سرگرمیوں پر نہیں پکڑ سکتی تھی۔ لہذا بربادی نسواں کی مہم شدت سے فروغ پاتی رہی۔ اب معاملہ بہت زیادہ آگے بڑھ چکا ہے۔ کسی گانے بجانے کی محفل میں کم لباسی کے موقع پر مفاد پرست عناصر خواتین کی موویاں بنا لیتے ہیں۔ پھر ان کو کسی دوسرے مقام پر جا کر فروخت کر دیتے ہیں مثلاً لاہور سے بنائی ہوئی ایسی موویز کراچی میں ریلیز ہوں گی پھر دوہی پہنچ جائیں گی۔ زیادہ تر ایسی موویز بیوٹی پارلرز میں، شادی بیاہ کی محفلوں میں بنالی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ مسلمان لڑکیوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے بلیک میل کرتے ہیں۔

اس طرح جدید تحریک نسواں اپنے ایجنڈے کے مطابق بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ خواتین کو بلدیاتی انتخابات میں 33% نمائندگی ملی، قومی اسمبلی میں 22% سینیٹ میں 17% مگر ان کی کارکردگی کیا رہی؟ سوائے دیندار اور سنجیدہ گھرانوں کی خواتین کے۔ وہ خواتین اسمبلی میں کپڑے اور زیور ہی کی باتوں میں مصروف رہیں۔

حدود قوانین کے بجائے ”تحفظ نسواں ایکٹ“

مشرف حکومت نے قومی اسمبلی میں ووٹنگ کے ذریعے حدود قوانین کا 15 نومبر 2006ء کو

اصل مغز اور خلاصہ نکال دیا اور اس میں وہ ترمیمات اسمبلی سے منظور کروالیں، جو این۔ جی۔ اوز چاہتی تھیں اس طرح اس کو سیکولر بنایا گیا۔ زنا کا مقدمہ درج کروانا عملاً بہت مشکل بنا دیا گیا۔ علاوہ ازیں یہ جرم قابل دست اندازی پولیس نہ رہا اور اس نئے قانون کو ”تحفظ نسواں ایکٹ“ کا نام دیا گیا۔

مساج سنٹرز اور قحبہ خانے:

اس سے بے حیائی بری طرح فروغ پذیر ہوئی۔ متعدد مقامات پر قحبہ خانے کھل گئے۔ جگہ جگہ مساج سنٹر قائم ہوئے۔ ان پر اعتراض کرنے والے کو بنادئیے گئے۔ اسی پس منظر میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ والا المناک واقعہ وجود میں آیا۔ جس طرح ان معصوم قرآن و حدیث کی طالبات کو فاسفوس بھٹی میں پگھلایا گیا وہ تاریخ اسلامی کا انتہائی سیاہ باب ہے۔ مسلم حکمرانوں کے ذریعے پاکستان کی نظریاتی اسلامی ریاست میں مسجد، مدرسہ اور مسلمان خواتین کا تقدس اور وقار اس طرح پامال ہونا بہت زیادہ المناک ہے جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

اس کے مقابلے میں فلم انڈسٹری میں کام کرنے والی شوبز شعبے کی خواتین کی بہت پذیرائی ہونے لگی۔ اس دوران غیر ملکی وغیر شرعی تہواروں کے فروغ کے ذریعے پاکستان سے شرم و حیا کو دلیس نکالا دے دیا گیا۔ ہر طلوع ہونے والا سورج پاکستان کے دامن پر بے حیائی کے نئے سے نئے مناظر دیکھتا رہا۔ ملک میں این۔ جی۔ اوز نے منہ زور اور بے باک حیثیت اختیار کر لی۔ دھڑلے سے اعلان کیا ”ہم اسلام کو چھوڑ سکتے ہیں مگر We cannot divorce international norms یعنی ہم عالمی معاہدوں کے پابند ہیں اور ان کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ جدید تحریک نسواں کا پورا ایجنڈا ہمیں اس ملک میں نافذ کرنا ہے اور پھر یو۔ این۔ او کی کانفرنسوں میں اس کی رپورٹ دینی ہے۔“ پھر میڈیا کے زیر اثر سٹار پلس اور دیگر سرکاری وغیر سرکاری چینل اور ڈش کیبل کے ذریعے زبردست ثقافتی یلغار مسلمانوں پر کی گئی۔ جگہ جگہ بیوٹی پارلر کھل گئے صرف بیوٹی ٹپس اور خورد و نوش ہی اصل موضوع قرار پایا۔ بے شمار وقت، پیسہ اور ذہانت صرف جسم کی نمائش پر صرف ہو رہی ہے یا پھر جگہ جگہ مغربی کھانوں کے مرکز کھل گئے ہیں۔

صورت حال یہ رُخ اختیار کر چکی ہے کہ دیندار عناصر بے بس اور مجبور بنادئیے گئے ہیں۔

جبکہ سیکولر اور بے دین لوگ بہت زیادہ بے باک ہو چکے ہیں، بلکہ وہ دینداروں کو نکو بناتے ہیں۔ ان کا مذاق اڑاتے اور ان کا قافیہ تنگ کر دیتے ہیں۔ بسوں، ویگنوں اور کوچوں میں لچر بیہودہ گانے، وی۔سی۔آر پر فحش اور اخلاق سوز فلمیں دھڑلے سے پیش کیے جاتے ہیں۔ احتجاج کرنے والے کو سبھی خاموش کر دیتے ہیں کہ خاموش ہو کر بیٹھو یا پھر گاڑی سے اتر جاؤ گویا تمہیں احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں۔

جوتے اور کپڑے فروخت کرنے والی دکانوں میں باقاعدہ قد آدم مجتسے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ان کو لباس اور جوتے وغیرہ پہنا کر اپنی دکان کا اشتہار دیا جاتا ہے۔ ان بتوں کو اور ڈمیوں کو ہٹانے کی آپ بات کریں اور سمجھائیں کہ یہ بت اور مجتسے تو اسلام میں حرام ہیں تو جواب ملے گا ”یہ کاروبار ہے اس میں آپ مداخلت مت کریں، اگر آپ کو پسند نہیں تو کسی اور دکان پر چلے جائیں۔“ بس سٹاپوں اور چوکوں میں کھڑے لڑکے جس انداز سے شریف لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے اور آنے جانے والوں کو پریشان کرتے ہیں تو کوئی ان کو اس بد اخلاقی پر روکے یا کیبل اور ڈش کے ذریعے جو بے حیائی اور فحاشی پھیلائی جا رہی ہے، اس پر کوئی احتجاج کرے تو یہ آزادی صحافت پر حملہ قرار دیا جاتا ہے۔ گندے اشتہارات، فحش گفتگو، ننگے ڈائلاگ اور گھٹیا ٹاک شو..... کیا اسی کا نام صحافت کی آزادی ہے؟ گویا آپ کو بے حیائی پھیلانے کا کھلا لائسنس مل گیا ہے نئے نئے ٹی۔وی چینلز نے دین بے زاری، سیکولرزم اور موج میلہ ثقافت پھیلا کر قوم سے سنجیدگی، محنت، شرافت کو ختم کر کے اباحت، انتشار اور انارکی کو جنم دیا ہے۔^[۱]

اب اسی قسم کی دوا ہم خبریں ملاحظہ فرمائیں:

لیڈی پولیس سکینڈل:

انسپکٹر شافعہ سمیت پانچوں اہلکاروں کو شوکانوٹس جاری، چیف جسٹس ہائیکورٹ نے از خود نوٹس لے لیا۔ خواتین اہلکاروں نے بیانات جمع کرادیئے کانسٹیبل (ز) نے انسپکٹر شافعہ، محرر ستارہ،

[۱] تلخیص: مضمون ”غیرت کو کیا ہوا“ از سلیم منصور خالد صاحب ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ ستمبر 2009ء،

ایل ڈی اے اہلکار رانا شوکت عرف فاروق کے خلاف مقدمہ کی درخواست دے دی، ڈی جی ایل ڈی اے نے سیل شدہ کوٹھی کو عیاشی کے اڈے کے طور پر استعمال کرنے والے اہلکاروں رانا شوکت، بشارت وغیرہ کے خلاف کارروائی کا حکم دے دیا، ہائیکورٹ میں ایس ایس پی کی 18 مئی کو طلبی۔“

شہر میں قحبہ خانوں کی تعداد میں اضافہ، پولیس خاموش تماشائی بن گئی۔ پوش علاقوں میں قحبہ خانوں کے علاوہ مساج سنٹرز اور گیٹ ہاؤسز کی آڑ میں فحاشی کے اڈے کھل چکے ہیں۔

لاہور (احسان شوکت سے) صوبائی دارالحکومت کے مختلف علاقوں میں قحبہ خانوں اور فحاشی کے اڈوں کی تعداد میں تشویشناک اضافہ ہو رہا ہے، شہر کے پوش اور متوسط علاقوں میں قحبہ خانوں کے علاوہ مساج سنٹر اور گیٹ ہاؤسز کی آڑ میں فحاشی کے اڈے کھل چکے ہیں۔ [۱]

انسپکٹر شافعہ کا واقعہ بڑا دردناک ہے 15 مئی 2009ء کی نوائے وقت کی اس رپورٹ کی مکمل تفصیل آپ اسی روز کے سرراہے والے کالم میں ملاحظہ فرمائیں۔

انکشاف ہوا ہے کہ اعلیٰ افسروں کی سرپرستی میں لیڈیز پولیس اہلکاروں کی جسم فروشی ہو رہی ہے۔ انسپکٹر شافعہ سمیت چار خواتین معطل کر دی گئی ہیں۔ یہ انکشاف لیڈی محرر ستارہ کی طرف سے دو کانسیبلان (ن) اور (س) کو سبزہ زار میں ایل ڈی اے انسپکٹر فاروق کی کوٹھی پر ڈیوٹی کے لیے بھجوانے پر ہوا۔ اسلام نے کسی بھی شعبے میں اسی لیے اختلاط مرد و زن کو حرام قرار دیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے خواتین کے مسجد میں جانے پر پابندی لگا دی تھی کہ اس میں فتنے کا احتمال ہے۔ پولیس کی بدعنوانیوں کی یوں تو بہت سی اقسام ہیں مگر یہ کہ وہ اپنی چمڑی پر منہ لگائے گی، اس کی امید نہ تھی۔ یہ ہے وہ پولیس جس کی تنخواہ وزیر اعلیٰ نے حسن کارکردگی پر ڈبل کر دی ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ پولیس نے اپنے محکمے کو بھی کوٹھا بنا دیا اس پر اسے کوئی ”انعام“ تو ملنا چاہیے مگر ڈبل تنخواہوں سے آگے کیا انعام ہوگا۔ وزیر اعلیٰ اگر نوٹس نہیں لیتے تو عدلیہ نوٹس لے اور آئندہ پولیس میں مردوں کے تابع لیڈی پولیس کی بھرتی کو ممنوع قرار دے۔ پولیس نے خواتین کانسیبلان کے لیے کیسی نیل چڑیا ٹائپ وردی تیار کرائی تھی اور افسوس کہ گدھوں نے اس وردی کو بھی نوچ ڈالا۔ یہ وہ پولیس کے اعلیٰ افسران ہیں، جو قوم کی بیٹیوں کی عزت کو محفوظ رکھنے کے

لیے بھرتی کیے گئے ہیں یہ تو اپنے ہی جسم پر حملہ آور ہو گئے۔ بھلا ان سے کسی کی عزت کیسے محفوظ رہ سکتی ہے۔ ابھی تک اس خبر میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ ان اعلیٰ افسران کو ٹکٹ کی پر باندھا گیا ہو، وزیر اعلیٰ اپنے معیار کارکردگی اور اس کی پرکھ کا نوٹس لیں اور ان اعلیٰ افسران کی اس غلاظت آمیز کارروائی کا سخت ترین نوٹس لیں۔ عوامی عدالت تو یہی چاہے گی کہ ایسے پولیس افسران و اہلکاران ہرگز محکمہ پولیس میں نہیں رہنے چاہئیں جو لیڈی پولیس کی عصمت دری کرتے ہیں۔ اس ایل ڈی اے افسر کی کوٹھی پر یہ کام ہونے کے سلسلے میں کوٹھی کے مالک کو بھی دھر لینا چاہیے کیونکہ زانی سے زیادہ بڑا مجرم دلال ہوتا ہے کیونکہ وہ سارا اہتمام کرتا ہے۔^[1]

2- اور اب روزنامہ جناح کی 9 نومبر 2009ء کی ایک اور خبر

قحبہ خانے دہشت گردی اور سنگین جرائم کے اڈے بن چکے، جرائم پیشہ کسی شناخت اور اندراج کے بغیر آتے جاتے ہیں: (سی۔سی۔پی۔او)

”لاہور 445 قحبہ خانے ہوٹلز اور کوٹھیاں جرائم کے اڈے، فون کالیں ٹریس، کریک ڈاؤن کا حکم“ ماڈل ٹاؤن ڈویژن میں 128، صدر 96، سٹی 75، اقبال ٹاؤن 52، سول لائن 52 اور کینٹ ڈویژن میں 42 قحبہ خانوں میں جرائم پیشہ افراد کی آمد چور، ڈکیت، اغواء برائے تاوان اور دہشت گردی میں ملوث افراد لوٹی ہوئی رقم کو حرام کاری، جوئے، منشیات اور عورتوں کی تجارت میں اڑا دیتے ہیں گلبرگ میں غالب مارکیٹ، ایم ایم عالم روڈ کے گرد و نواح میں کئی کوٹھیاں، ہوٹل اور گیٹ ہاؤس جرائم پیشہ افراد کو تفریح فراہم کرنے پر لگ گئے، 170 این مین سمن آباد لاہور میں ریسٹورنٹ کا مالک شیخ جمشید بیسمنٹ میں بوس و کنار کرانے اور غلط حرکات کے لیے جگہ مہیا کرتا ہے۔ کرموں، کوہ نور ہوٹل لکشمی چوک، ثنائی، یونائیٹڈ ہوٹل ایکب روڈ، تاج محل، لاہور ہوٹل، فٹاسٹک کلرمیوزیکل گروپ میں شراب اور جسم فروشی کا دھندہ۔

طارق، عامر، ناصر، ارشد اور شہباز قلعہ گجر سنگھ کے تمام ہوٹلوں میں قحبہ خانہ چلانے کا کام کرتے ہیں۔ کیپٹل سینما کے ساتھ قحبہ خانہ کھلا ہے، ایور گرین، المر تفضی، مہران، پولینڈ، بختاور، رائل اور دیگر ہوٹلوں میں بھی قحبہ خانے کھلے ہیں۔ کئی افراد فحاشی کے لیے مددگار بن گئے۔ ڈیفنس

[1] کالم سررا ہے نوائے وقت لاہور مورخہ 15 مئی 2009

اے میں کافی لوگ منشیات فروش اور جسم فروش ہیں، وہاں تک کانٹیل کا پہننا بہت مشکل ہے۔
لاہور پولیس نے اڈوں کے نام بھی جاری کر دیئے۔^[۱]

عالمی سطح پر حجاب موضوع گفتگو بن گیا:

آج کل عالمی سطح پر نقاب اور حجاب کے خلاف بہت شدید پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ فرانس، جرمنی، برطانیہ سب نے باری باری نقاب اور سکارف پر پابندی لگانے کے لیے قانون سازی کرنے کی دھمکیاں دی ہیں۔ مغرب میں باحجاب خواتین کو تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں بڑے مصائب کا سامنا ہے۔ جرمنی کی ایک عدالت میں مصر کی مردہ شریبنی کو جرمنی کے ایک اوباش نوجوان نے یکم جولائی 2009ء کو پہلے صرف حجاب پہننے کی بنا پر دہشت گرد اور اسلامی طوائف (Whore) کہا تھا۔ پھر ججوں کے سامنے اس کے حجاب کی بنا پر پے در پے وار کر کے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کا شوہر اس کو بچانے کے لیے آگے بڑھا تو ایک پولیس مین نے اس پر فائر کھول دیا۔ اس طرح وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ بعد ازاں جرمنی کے اخباروں میں بحث چھڑ گئی کہ جرمنی میں سیکورٹی کا نظام اتنا ناقص کیوں ہے؟ مگر اس ظالمانہ قتل پر کسی کو کوئی افسوس نہ تھا۔ انہوں نے اس کے قتل کو جائز قرار دے دیا تھا۔^[۲]

فرانس میں برقع پہننے والی خاتون کو 750 یورو جرمانہ:

عورتوں کو نقاب پہنانے والے مردوں کو بھی جرمانہ ہوگا، نیا مسودہ قانون۔

”پیرس (اے ایف پی) فرانس میں برقع پہننے والی مسلمان خاتون کو 750 یورو (ایک ہزار ڈالر) جرمانہ کی سزا دی جاسکے گی، اس حوالے سے پارلیمانی اکثریتی پارٹی کے رہنما نے ایک مسودہ قانون پیش کیا ہے۔ جین فرانکس کوپ نے لی فگارو کو بتایا کہ عورتوں کو حجاب (برقع) پہنانے والے مردوں کو بھی جرمانہ کیا جائے گا اس قانون کے تحت عورتوں پر چہرے کا حجاب اوڑھنے پر پابندی عائد کر دی جائے گی۔“

[۱] روزنامہ جناح 9 نومبر 2009ء

[۲] روزنامہ نوائے وقت مورخہ 8 جنوری 2010ء

اسی طرح ڈنمارک میں بھی حجاب پر 20 ستمبر 2009ء کو پوری پابندی لگادی گئی تھی۔^[۱] جمہوریہ ترکی نے پوری پون صدی سے جدید ترقی یافتہ ملک بننے کے چکر میں کب سے پردہ کے خلاف سرکاری مہم چلا رکھی تھی۔ مگر اب موجودہ ترکی صدر طیب اردگان کے دور میں ترکی کے حالات پہلے سے کافی تبدیل ہو چکے ہیں۔ وہ دین کی طرف مراجعت کر رہے ہیں۔ اب مصر کی فضا بھی ایسی ہی بنائی جا رہی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ عالم اسلام کی قدیم ترین مستند یونیورسٹی ”جامعہ ازہر“ کے رئیس شیخ علی طنطاوی نے ایک نوجوان لڑکی، جو چہرہ ڈھانپ کر پڑھنے آئی تھی، سے زبردستی نقاب ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ جب اس نے ہٹا دیا تو شیخ نے کہا ”آئندہ نقاب مت پہننا۔ نقاب کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں یہ محض عادت ہے، عبادت نہیں ہے۔ میں دین کو تم سب لوگوں سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ اس موقع پر شیخ نے یہ اعلان بھی کیا کہ وہ جامعہ ازہر کی تمام فیکلٹیوں اور کالجوں میں نقاب پر پابندی کا باقاعدہ فرمان جاری کریں گے۔

مصر کے اخبار روزنامہ ”المصری“ کی اشاعت 15 اکتوبر 2009ء میں یہ واقعہ تفصیل سے دیا گیا ہے۔ ماہنامہ ”اللہ کی پکار“ میں، بھارت کے مولوی ندیم الواجدی نے اس واقعہ پر تبصرہ لکھا ہے:

”وہ دن انتہائی رنج و غم کا دن تھا۔ جب آپ کو (جامعہ الازہر کے رئیس) کے منصب پر فائز کیا گیا۔ آپ کو معلوم نہیں کہ مسلمان آپ پر لعنتیں بھیجتے ہیں۔ آپ کے لیے یہ منصب دنیا میں اعزاز کا باعث ہو تو ہو، دین کے لیے تو رسوائی اور تباہی کا باعث ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ آخرت میں آپ کا انجام کیا ہوگا۔ کہنے والے نے بالکل صحیح کہا ہے کہ دین کو صرف بادشاہ اور علماء سوء ہی خراب کرتے ہیں..... یقیناً شیخ طنطاوی کی اس رائے سے مغرب نوازوں کو بڑی تقویت حاصل ہوگی اور حجاب کے خلاف وہ اس رائے کو بطور ہتھیار استعمال کریں گے۔“^[۲]

”مشرف کی روشن خیالی سے پی۔ پی کی روشن خیالی بازی لے گئی۔“
جناب محسن فارانی لکھتے ہیں:

[۱] روزنامہ نوائے وقت 20 ستمبر 2009ء

[۲] ماہنامہ چشم بیدار لاہور دسمبر 2009ء، ص: 10-11-12

”انگریزی اخبار ”دی نیشن“ میں ایک تصویر چھپی ہے جس نے محب اسلام پاکستانیوں کو آب آب کر دیا ہے۔ تصویر میں گیلانی کابینہ کی وزیر مملکت برائے مذہبی امور شگفتہ جمالی اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں مصری سفارتخانے کی تقریب یوم آزادی میں کسی غیر ملکی سفیر سے مصافحہ کر رہی ہے جبکہ دونوں کے چہرے باہم مس کر رہے ہیں حتیٰ کہ لب و رخسار کا فاصلہ مٹنے کو ہے۔ شگفتہ جمالی پی پی پی لیڈیز ونگ کی جنرل سیکرٹری بھی ہیں، ان کے سرخی و غارہ سے مزین چہرے کی شگفتگی اور مسکراہٹ اس روشن خیالی کی مکمل عکاسی کر رہی ہے جسے یہاں مغرب کے یہود و نصاریٰ ہمارے انگلش میڈیم حکمرانوں کے ذریعے شب و روز فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ مزید اسیہ یہ ہے کہ مرکزی وزیر مذہبی امور مولانا حامد سعید کاظمی پیچھے کھڑے اس ہوشربا منظر کو دیکھ رہے ہیں اور ان کی مذہبی رگ حمیت پھڑکنے سے انکاری ہے اور ساتھ کھڑا غالباً وزارت مذہبی امور کا گرگا بیورو کریٹ بتیسی نکال کر ہنس رہا ہے۔ شرم ان کو مگر نہیں آتی!

مسلمانانِ پاکستان کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ پاکستان بنانے والوں نے تو یہ عہد کیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے لیے ایک ایسا خطہ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں جہاں وہ احکامِ اسلام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں گے لیکن ہمارے حکمرانوں نے اس عہد کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ہر وہ کام کرنے کی ٹھان رکھی ہے جو یہود و ہنود اور نصارا اے مغرب چاہتے ہیں۔ جنرل ایوب خاں نے خلافِ اسلام عائلی قوانین فوجی جبر کے ساتھ نافذ کیے جنہیں بعد میں آنے والے حکمرانوں نے آئینی تحفظ دیا۔ ملک کو ”روشن خیالی“ کی پٹری پر ڈالنے والے جنرل مشرف نے اپنی کٹھ پتلی گریجویٹ پارلیمنٹ سے ”تحفظ نسواں آرڈیننس“ کے نام پر شرعی حدود میں ترمیم کرنے کی جسارت کر ڈالی۔ نیز اس دور میں حکمران مرد و زن کے غیر محرموں سے علانیہ مصافحے کو رواج دیا گیا اور اب زرداری کے راج میں پرویزی روشن خیالی عروج کو پہنچ رہی ہے اور اسلامی اقدار کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں۔

پاکستانی مسلمانو! آپ کی دینی حمیت کہاں گئی؟ کیا اسلامی شعائر و اقدار کے دشمن اور یہود و نصاریٰ کے در یوزہ گر، یہ لوگ آپ کے دوٹوں اور سیاسی حمایت کے مستحق ہیں؟ ہر گز نہیں! سوچے سمجھئے اور اس بے راہ رو گروہ کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیجئے ورنہ اللہ کے ہاں آپ گناہ گار اور

مستوجب سزا ٹھہریں گے! [۱]
 ”سیکس ورکرز کا نفرنس“

ایک نئی خبر سن کر تشویش میں اضافہ ہوا۔ جی۔بی۔سی اردو ڈاٹ کام (مورخہ 22 جولائی 2009ء) کی ہے روزنامہ ”ایکسپریس نیوز“ اور دیگر اخبارات میں شائع ہوئی ہے کہ کراچی میں جولائی 2009ء کے دوسرے عشرے میں اقوام متحدہ کے تعاون سے وہاں کی ایک مقامی این۔جی۔اے نے ایک تین روزہ ورکشاپ کروائی جس میں ”خواتین سیکس ورکرز“ (جن کو ہم اپنی زبان میں ”طوائف“ کہتے ہیں) کو ”محفوظ جنسی طریقوں“ سے آگاہی دی گئی ہے۔ ان کو میل (Male) اور فیمیل (Female) کنڈوم کے استعمال کا طریقہ سکھایا گیا۔ ساتھ ترغیب کے طور پر ان کو ایک ہزار روپیہ یومیہ دیا گیا اس ورکشاپ میں سو خواتین نے شرکت کی۔ جس کو منتظمین نے اپنی ورکشاپ کی کامیابی قرار دیا۔ انہوں نے ایسا ہی پروگرام لاہور اور دیگر مقامات میں کروانے کا عندیہ دیا۔ تاکہ ان سیکس ورکرز (طوائفوں) کو میل، فیمیل کنڈوم کے استعمال سے آگاہی دی جاسکے۔

واضح رہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں جسم فروشی پر پابندی عائد ہے۔ لہذا یہ کام پہلے چھپ چھپا کر ہوتا رہا۔ لیکن اب اس کو باقاعدہ کاروبار (یعنی سیکس ورکر) کا نام دے کر جائز اور قانونی قرار دلانے کی مکر وہ سازش کی جا رہی ہے۔ جس طرح ”حقوق نسواں بل“ کے نام پر حدود قوانین کو منسوخ کروایا گیا اسی انداز میں برسرعام زنانہ فحاشی اور قبحہ گری کے طریقے سکھایا کر اسے قانونی قرار دیا جائے گا۔ ہماری یہ مغرب نوازی ہمیں کہاں تک پہنچا کر چھوڑے گی؟ اور ذلت کے کس کس گڑھے میں گرا کر اللہ کے عذاب کو علانیہ دعوت دی جائے گی؟ (استغفر اللہ)

جی۔بی۔سی کے نمائندے نے 22 جولائی 2009ء کی اس رپورٹ میں انکشاف کیا ہے: ”کنونشن میں شریک پیشہ وروں میں سے بہت سی ایسی تھیں جنہوں نے کیمرے کی تصویر بنانے سے روک دیا اور کہا“ ہمیں خوف ہے کہ ہم اپنے اہل خاندان کے سامنے بے نقاب

ہو جائیں گے۔ بہت سی خواتین کہہ رہی تھیں۔ ہمارے خاوند اور اہل خانہ نہیں جانتے کہ ہم اس کاروبار سے منسلک ہیں۔ وہ یہی جانتے ہیں کہ ہم نجی کمپنیوں میں ملازم ہیں۔ ایک مقامی این۔ جی۔ او کے سروے کے مطابق کراچی میں ایسی فاحشہ عورتوں کی تعداد ایک لاکھ ہے۔ لاہور میں 75 ہزار اور فوجیوں کے شہر راولپنڈی میں 25 ہزار ہے۔ ایک اور مقامی این۔ جی۔ او ”عمل ہیومن ڈویلپمنٹ“ نیٹ ورک نے کہا ہم نے 2006ء میں 1918 ایسی شرکاء کی ملک بھر میں تربیت کی تھی۔ اس تربیتی پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے کیا تھا۔^[۱]

اس موقع پر یونائیٹڈ نیشنز پاپولیشن فنڈ کے پراجیکٹ افسر ڈاکٹر صفدر پاشا نے بتایا تھا کہ ایک سروے کے مطابق کراچی میں ایک لاکھ سے زیادہ اور لاہور میں 75000 خواتین سیکس ورکرز کا کام کر رہی ہیں۔ اس طرح اس شعبے کو مضبوط بنادیا گیا ہے۔^[۲]

پاکستان میں بیجنگ +10 کانفرنس کے بعد پیش آنے والے المیے:

اس کانفرنس میں جنرل اسمبلی میں مسلم ممالک کو یہ سزا سنائی گئی تھی کہ تمہارے علاقوں میں ہم خود دھونس دھاندلی سے عورت سے متعلق اپنا ایجنڈا پورا کریں گے ورنہ آپ پر ہر قسم کی پابندیاں لگیں گی۔ اس فیصلے کے مطابق اس کا سب سے بڑا نشانہ ”پاکستان“ کو بنایا گیا۔ یہ پرویز مشرف کا دور تھا۔ این۔ جی۔ او کو بہت زیادہ رسوخ حاصل تھا۔ لہذا بہت سے گھناؤنے المیے پیش آئے۔ میں تفصیل سے بچتے ہوئے ان المیوں کی طرف مختصر اشارے کرتی چلوں گی۔

1- حدود قوانین کے بارے میں 2005ء میں بہت زیادہ پروپیگنڈا شروع کر دیا گیا۔ پرائیویٹ چینلز کا سب سے بڑا موضوع یہی حدود قوانین پر تنقید ہوا کرتا تھا۔ وہ موضوع جو خالص علمی تھا علماء فقہاء سے متعلق تھا، جاہل اور ان پڑھ لوگوں کی نذر کر دیا گیا۔ اور اسی شورشوری میں مشرف حکومت نے 15 اکتوبر 2006ء میں شب خون مار کر اسمبلی سے یہ بل پاس کر دیا۔ یعنی اصل حدود قوانین میں چند ترمیمیں کروالیں۔ پھر اس کے نفاذ میں بھی چند ترمیم کر دی گئیں۔ جس

[۱] ”غیرت کو کیا ہوا؟“ از سلیم منصور خالد ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور ستمبر 2009ء

[۲] ثقافتی دہشت گردی، از عاصم حفیظ، ہفت روزہ المحدث 5 اگست 2011ء

سے ان قوانین کا اصل جو ہر نکال دیا گیا۔ حدود کا نفاذ عملاً غیر ممکن ہو گیا۔ اسمبلی نے اس ترمیم شدہ قانون کو ”تحفظ نسواں ایکٹ“ کا نام دیا۔

2- اس ”تحفظ نسواں ایکٹ“ کی منظوری کے بعد بے حیائی کو بہت زیادہ فروغ ملا اور اصل یہ ”تحفظ عصیاں ایکٹ“ تھا۔ گھروں کی بربادی کا سامان تھا۔ زنا کو فروغ ملا مگر اس کی شکایت کسی عدالت تک عملاً پہنچانا محال ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کے فوراً بعد لال مسجد اور جامعہ حفصہ کا دلخراش واقعہ پیش آیا۔ اس کی ابتدائی وجوہات کا جائزہ لیں تو صاف نظر آتا ہے کہ حکومت کی آنکھ کے نیچے چینی مساجد سنٹر غلط قسم کی حرکات کا مرکز ہو رہا تھا۔ وہ بے حیائی کا اڈہ بنا ہوا تھا اور جامعہ حفصہ کی طالبات اس اڈے کی مالک ”آنٹی شیم“ کو اپنی حرکات کو چھوڑنے کی تلقین کر رہی تھیں یہی ان کا جرم تھا جو چار ہزار طالبات کی تباہی بربادی کا سبب بن گیا۔

3- اگر ایک طرف ان پرائیویٹ ٹی۔وی۔ چینلز پر دین کا نیا ایڈیشن پیش کرنے والے ”علائے“ بٹھا دیئے گئے تھے، جو عام مسلمانوں میں دین کی مغربی تعبیر پیش کر رہے تھے، تو دوسری طرف این۔جی۔ اوز ملک کے بھاری فنڈ ڈکار رہی تھیں۔ ساتھ قوم میں مذہب سے بیزاری اور مغربی تقلید کو رواج دینے کی کوششوں میں مصروف تھیں۔ ”روشن خیالی اور اعتدال پسندی“ کے نام پر ملک کی نظریاتی شناخت اور اسلامی اقدار کی جگہ مغربی اور بھارتی مرعوبیت دلوں میں بٹھا رہی تھیں۔ بچوں میں امریکی اور بھارتی تہوار فروغ پا رہے تھے تو N.R.O کے ذریعے سیاستدانوں کو کرپشن کی نذر کر دیا گیا۔ خواتین کو بے حیائی کا ماڈل بنانے کے لیے ”سیکس ورکرز“ کا نام دیا گیا تا کہ گھروں کا محاذ مکمل طور پر بگڑ جائے۔ نو خیز لڑکے لڑکیاں انٹرنیٹ پر چیٹنگ کرتے کرتے لومیرج کے ذریعے برباد ہونے لگے۔ اوپر سے مصنوعی مہنگائی کا بھوت سر پر سوار تھا یعنی سود اور کرپشن نے ملک کو تباہ کر دیا۔ بچوں کے ہاتھ میں موبائل، انٹرنیٹ، ڈش، کیبل تھے تو دوسری طرف فوج اور قبائلی علاقوں کی باہمی جنگ سے ان دونوں کی بہادری ختم کرنا مقصود تھا تا کہ پاکستان میں امریکی آہن و بارود کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ رہے غرض اس طرح زندگی کا ہر شعبہ تباہی کی نذر ہو رہا تھا۔ اسی ہنگامہ خیز اور پُر فتن زندگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے

این۔ جی۔ اوز نے اپنا قدم اور آگے بڑھایا۔

4۔ کراچی میں ”سیکس ورکرز“ کی تین روزہ ورکشاپ کروا ڈالی جس کا تفصیلی ذکر پہلے آچکا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریڈ لائٹ ایریا کی طوائفیں ملک میں جگہ جگہ پھیل گئیں۔ وہ اپنے جسم فروشی کے دھندے کا ذکر بڑے فخر سے کرنے لگیں۔ اُن کی نگاہ میں اُن کی آمدنی اب بالکل جائز بن گئی تھی۔ دوسری طرف شوہر والوں نے ماڈلنگ کے شعبہ کو بڑی ”ترقی“ دی۔ ہر اخبار، ہر رسالہ، ہر ٹی۔وی چینل صرف کھیل اور کھلاڑیوں کو، فلم اور اداکاروں کو کوریج دے رہا تھا کہ ان کی زندگی کے حالات قدم بقدم اور حرف بحرف ہر ایک کو یاد ہونے چاہئیں۔ ہر اہم شخصیت سے انٹرویو کا اہم ترین سوال یہ قرار پایا کہ آپ کی پسندیدہ اداکارہ کون سی ہے؟

لو میرج اور آن لائن شادیوں سے ہزاروں لڑکیاں لٹ گئیں اور ہزاروں خاندان برباد ہونے لگے۔

5۔ غیرت کے نام پر قتل کے خلاف این۔ جی۔ اوز نے دہائی دی اور دباؤ بڑھا کہ بہر حال غیرت کے قتل کو ”قتلِ عمد“ قرار دیا جائے اور بالآخر حکومت نے 2016ء میں یہ کارنامہ بھی کر ڈالا۔

6۔ عورت کو بااختیار بنانے کے لیے قانون سازی کرنے پر زور دیا گیا کہ ہر جگہ پر اس کا ملازمتوں کا کوٹہ بڑھایا جائے۔ اس کی شرائط ملازمت آسان کی جائیں اور جائے ملازمت پر تشدد سے تحفظ مہیا کیا جائے۔

7۔ اس کے بعد این۔ جی۔ اوز نے امریکہ کے تعاون سے اپنی بے حیائی کی مکروہ مہم مزید تیز کر دی اور باقاعدہ طور پر پاکستان میں ہم جنس پرستی کو فروغ دینا شروع کر دیا۔

ہم جنس پرستوں کے لیے پاکستان میں امریکی مہم:

اس کے بعد پاکستان کو خصوصی نشانہ بنایا گیا۔ 11 نومبر 2009ء کو روزنامہ ”خبریں“ میں ایک خبر شائع ہوئی۔

کراچی (بی۔ بی۔ سی) پاکستان میں ہم جنس پرست زیر زمین منظم ہو رہے ہیں اور ان کے باقاعدگی سے اجتماعات بھی منعقد ہوتے ہیں۔ ہم جنس پرستوں کے بیرون ملک تنظیموں سے

بھی روابط ہیں 0۔ جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک میں ہم جنس پرستوں کی تحریک خاموشی سے مگر منظم طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ پڑوسی ملک بھارت میں ہم جنس پرستوں کے تعلقات کو قانونی حیثیت ملنے کے بعد پاکستان کے ہم جنس پرستوں کو بھی حوصلہ ملا ہے۔ اس کی مثال گزشتہ دنوں کراچی میں ہم جنس پرستوں کی مصروف ترین شاہراہ فیصل پر پریڈ تھی۔ وہ ہم جنس پرستی کی خصوصی نشانی آٹھ رنگوں والی شرٹس پہنے ہوئے تھے ان نوجوانوں کی عام لوگ تو شناخت نہیں کر سکتے مگر وہ لوگ جو انہیں سمجھتے ہیں، یا ان کے قریب رہتے ہیں انہیں دیکھ کر فتح کا نشان بناتے رہے۔ پریڈ میں شریک نوجوان ڈیوڈ کا کہنا ہے کہ پاکستانی حکومت نے تردید کی تھی کہ ملک میں ہم جنس پرست نام کی کوئی چیز نہیں ہے اس پریڈ کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ حکومت کو بتایا جائے کہ ہم موجود ہیں اور ہمیں تسلیم کیا جائے۔

انٹرنیٹ جہاں کئی انقلاب لایا وہاں ہم جنس پرستوں کی زندگی میں خوشی کی نوید بن کر آیا اور ان کی یکجہتی میں اضافہ ہوا۔ پاکستان کے ہم جنس پرستوں نے بھی سوشل نیٹ ورکنگ کی ویب سائٹس پر اپنے گروپس بنائے ہیں، جن کے کئی سوبھران ہیں۔ کراچی میں ہم جنس پرستوں کے مخصوص مقامات ہیں، جہاں ان کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ شہر سے باہر، ساحل سمندر اور فارم ہاؤس ان کی بڑی پارٹیوں کا مرکز ہیں۔ جس کے لیے سینچر (ہفتہ) کی شام مختص ہوتی ہے۔ ان کی پارٹیاں مقامی بھی ہوتی ہیں اور ملکی سطح پر بھی منظم ہیں جن میں کئی سولوگ شریک ہوتے ہیں۔ پاکستان کے ہم جنس پرستوں کا ”انٹرنیشنل لیزبیمین اینڈ گے ایسوسی ایشن“ سمیت برطانیہ، امریکہ اور آسٹریلیا کی ہم جنس پرستوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں سے رابطہ ہے۔ واضح رہے کہ ہم جنس پرستی پاکستان کے قوانین اور مذہبی حوالے سے ناقابل قبول ہے اور ملکی قانون کے مطابق ہم جنس پرستی کی سزا دس سال قید یا کوڑے ہیں۔^[۱]

حالانکہ جب خود امریکہ کی چھٹی ریاست نیویارک میں ہم جنس پرستوں کو قانونی طور پر شادی کی اجازت دے دی گئی اور ایوانِ بالا میں اس قرارداد کو 29 کے مقابلے میں 33 ووٹوں

سے منظور کیا گیا تو امریکی سینیٹ کی جوڈیشیری کمیٹی نے ہم جنس پرستوں کی شادی کا قانون ختم کرنے کی حمایت کر دی۔ آٹھ کے مقابلے میں اس قانون کو ختم کرنے کے لیے دس ووٹ آئے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ متنازعہ قانون کب ختم ہوگا۔ پانچ سال قبل یہ قانون بنا تھا۔ مگر ان کو وفاقی سطح پر سہولتیں اور فوائد دینے سے انکار کر دیا گیا۔ جب کہ کولمبیا ضلع کی چھ ریاستوں میں یہ لوگ قانوناً شادی کر سکتے ہیں۔ ری پبلکن ٹام کیوبورن نے کہا ہے کہ ”ہم جنس پرستوں کی شادیاں ہماری ترجیح نہیں ہیں۔“ مراد یہ ہے کہ امریکہ کو اپنے ہاں ہم جنس پرستی کا قانون بنانے میں کوئی دلچسپی نہیں مگر ان کو ساری فکر پاکستان ہی کی پڑی رہتی ہے۔

8- پہلے ساری سرگرمیاں زیر زمین تھیں۔ اب امریکہ علانیہ پاکستان پر حملہ آور ہوا۔ اسلام آباد کے امریکی سفارت خانہ میں ہم جنس پرستوں کا باقاعدہ اجتماع منعقد کیا گیا۔ امریکی سفارت خانہ کی ویب سائٹ کے مطابق 26 جون 2011ء کو امریکی سفیر نے ہم جنس پرستوں کو سفارت خانے میں مدعو کیا تھا اور ان کو ان کے حقوق کی یقین دہانی کروائی تھی۔ باقاعدہ جشن کی تقریب منائی گئی اور ورکشاپ کروائی گئی۔ امریکی محکمہ خارجہ کی ترجمان ”وکتوریہ نولینڈ“ نے کہا ہم جنس پرستوں کے حقوق ہیں اور پاکستان سمیت دنیا بھر میں ان کا تحفظ کیا جائے گا۔ سفارت خانہ کے بیان کے مطابق اس اجتماع میں تقریباً 75 افراد نے شرکت کی۔ جن میں سفارت خانہ کا عملہ، امریکی فوجی، غیر ملکی سفارت کار، پاکستان کی ایڈووکیسی تنظیموں اور پاکستان کے ہم جنس پرستوں کے نمائندے شامل تھے۔ انہیں پیغام دیا گیا کہ اگر پاکستان میں تمہارے لیے فضا ہموار نہیں ہے تو آپ لوگ امریکہ آجائیں وہاں آپ کو تحفظ دیا جائے گا۔ (تمام ملکی اخبارات نے یہ خبر شائع کی تھی اور انٹرنیٹ پر تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں)۔

واضح رہے کہ اسلام آباد کی مذکورہ بالا ورکشاپ ”ہائٹس فار آل“ نامی ایک این۔ جی۔ او نے کروائی تھی۔

روزنامہ نوائے وقت میں سرراہے کے کالم نگار نے لکھا:

”ہم جنس پرستی کا جو جشن پچھلے دنوں امریکی سفارت خانہ میں منایا گیا اور اس میں مقامی ہم جنس پرستوں نے بھی شرکت کی۔ وہ دراصل پاکستان میں اس شیطانی فتنے کو شروع کرنے کی

شروعات ہے۔ صیہونیوں نے جس طرح امریکہ میں فیملی یونٹ کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ اسے ہمارے ہاں بھی رائج کرنے کے درپے ہیں..... اگر مرد مرد کے ساتھ اور عورت عورت کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرے گی تو اس کا انجام یہ ہوگا کہ دنیا سے مرد اور عورت کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اور یہی شیطان چاہتا ہے کہ دنیا ایک بدترین انجام کو پہنچ کر فلاپ ہو جائے۔ ہم جنس پرستی تو جنگل کے جانوروں میں بھی نہیں ہوتی۔ آخر صیہونی امریکہ دنیا کو کس بھیانک جنگل میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ یہ تو سید المرسلؐ کی دعا کے سبب عذاب نہیں آرہا، وگرنہ قوم لوط پر پتھروں کی بارش سے ہم جنس پرستی پر پتھر تو پڑ جاتے ہیں۔^[۱]

اس موقع پر اسلامی جمعیت طلبہ نے زبردست مظاہرہ کر کے اسلام آباد کے امریکی سفارت خانہ کا رخ کیا۔ مگر پولیس نے ان پر ڈنڈے برسا دیئے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ جمعیت نے پاکستان کے عوام کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ وگرنہ حکومت تو بالکل ہی بے غیرت اور بے حمیت ثابت ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ امریکی مردوں کے سامنے ہجرت ثابت ہوئی تھی۔

”جب اسلامی جمعیت طلبہ نے اسلام آباد میں ہم جنس پرستوں کی تقریب کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور امریکی سفارت خانہ کی جانب جانے کی کوشش کی تو پولیس نے ان پر لاٹھی چارج کیا، جس سے کئی مظاہرین زخمی ہو گئے۔ اب اس فتنے کا خاتمہ کرنے کے لیے صرف جمعیت ہی نہیں بلکہ ملت پاکستانیہ کے تمام نوجوان اٹھ کھڑے ہوں اور ہم جنس پرستی کو اپنی پاک سرزمین پر قدم نہ جمانے دیں۔“^[۲]

ابھی امریکہ کو کون سا قرار نصیب ہوا ہے وہ تو اپنے قدم پاکستان دشمنی میں آگے سے آگے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ نوائے وقت کی تازہ ترین خبر ملاحظہ کی جائے۔ یہ 4 مئی 2014ء کی خبر ہے جس میں وہ پاکستان میں ایڈز کے مریضوں کے اعداد و شمار بیان کر رہا ہے۔

[۱] روزنامہ نوائے وقت 24 جولائی 2011ء کالم نگار سرراہے

[۲] روزنامہ نوائے وقت ”کالم سرراہے“ 10 جولائی 2011ء

پاکستان میں ایڈز کے مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد:

برلن/اسلام آباد/لاہور (ثناء نیوز) پاکستان میں ایڈز کا مرض تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ایڈز ایک ایسی بیماری ہے جس میں انسان کے اندر موجود مدافعتی نظام مکمل طور پر تباہ ہو جاتا ہے اور قوتِ مدافعت کی کمی کے باعث انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایڈز کی روک تھام کے لیے سرگرم ایک سرکاری ادارے میں کام کرنے والے سینٹر ڈاکٹر راج ولی کا کہنا ہے کہ دسمبر 2013ء تک پاکستان میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایڈز میں مبتلا افراد کی تعداد 83468 تھی جس میں 7568 وہ لوگ ہیں جو پورے پاکستان میں مختلف علاقوں میں واقع اٹھارہ سرکاری مراکز میں اندراج شدہ ہیں جس میں سترے بچے بھی شامل ہیں لیکن دوسری طرف اس شعبے میں کام کرنے والے غیر سرکاری اداروں کے مطابق پاکستان میں HIV میں مبتلا افراد کی تعداد 98 ہزار سے تجاوز کر چکی ہے، جن میں بچوں کی تعداد بھی کافی بتائی جاتی ہے جن کی عمریں اٹھارہ سال سے کم ہیں۔ ان میں زیادہ تر تعداد اسٹریٹ چلڈرن کی ہے۔ خیبر ٹیچنگ ہسپتال کے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بچوں کا اس بیماری میں مبتلا ہونا یقیناً تشویشناک ہے ابھی تک ان کے درست اعداد کا شمار مشکل ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔^[i]

اعداد و شمار کی شعبہ گری سے، ڈالر کی چمک سے، این۔ جی۔ اوز کے تعاون سے وہ پاکستان کے اندر ہر اس خباثت کو پیدا کر رہا ہے جس کی دھمکی بیجنگ +10 کی عالمی کانفرنس میں مسلم ممالک کو دی گئی تھی کہ یہ یو۔ این۔ او کا خواتین سے متعلق ایجنڈا ہر صورت میں آپ لوگوں نے پورا کرنا ہے۔ ورنہ ہم خود آگے بڑھ کر کارپوریٹ کلچر پیدا کرنے کے لیے ساری کارروائی کر لیں گے۔ اسی پس منظر میں لاہور کے تھانوں میں خواتین کو ایس۔ ایچ۔ او بھی بھرتی کیا گیا۔

خواتین کا ہیوی بائیکس پر سوار لیڈی وارڈ نر بننا:

خواتین کو باختیار بنانے کے نام پر خواتین کو زبردستی گھروں سے باہر نکالنا اور اس کے

لیے یو۔ این۔ او کے دباؤ کو قبول کرنا صرف پاکستان کی مجبوری نہیں بلکہ خود سعودی عرب جہاں ماضی قریب تک مکمل اسلامی قانون کی پابندی پر زور دیا جاتا رہا وہاں بھی بڑی تبدیلیاں دیکھنے میں آرہی ہیں۔ وہاں اب عورتوں کو بھی گاڑی چلانے کا لائسنس دینے کا قانون منظور ہو چکا ہے۔ اب وہاں ”سعودی گزٹ“ ”انگریزی میں شائع ہونے والے ایک اخبار“ کی مدیر اعلیٰ پہلی بار ایک خاتون سمیعہ جبارتی کو تعینات کیا گیا ہے۔ [۱] اب سعودی خواتین کی ٹیمیں جگہ جگہ دنیا میں کھیلنے کے لیے جانے لگی ہیں۔

اسی طرح ایک سعودی صحافی مہا عقیل او۔ آئی۔ سی شعبہ اطلاعات کی پہلی خاتون سربراہ مقرر کی گئی ہیں۔ [۲] اب سعودی ولی عہد محمد بن سلیمان اپنی خواتین کو امریکی ایجنڈے کے مطابق مردوں کے شانہ بشانہ چلانے میں بڑی پھرتی دکھا رہے ہیں۔ وہاں اب بکثرت سینما بھی کھل گئے ہیں اور سب بے حیائی کے مناظر نظر آنے لگے ہیں۔ شرعی سزائیں اب ختم کرنے کا سفر شروع ہو چکا ہے۔

پاکستان کو یو۔ این۔ او میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے بڑی صفائیاں دینی پڑتی ہیں مثلاً:

- 1- کم عمری کی شادی پر ”دختر“ کے نام سے دستاویزی فلم بنا کر وہاں پیش کی گئی
- 2- اسی طرح شرمین عبید چنائے نے پاکستان میں خواتین کے چہروں کو تیزاب سے جلانے جانے سے متعلق ”سیونگ فیس“ نام کی دستاویزی فلم بنا کر آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔
- 3- پھر اس نے پسند کی شادی کو پاکستان میں عام کروانے کے لیے ”اے گرل ان دا ریور“ A girl in the river بنا کر دوبارہ آسکر ایوارڈ حاصل کیا۔ مگر اس سے دنیا میں کیا پیغام گیا؟ پاکستان کو اس نے کتنا ذلیل کر دیا۔

[۱] ماہنامہ ”پکار ملت“ اپریل 2014ء، ص: 59 بحوالہ نوائے وقت

[۲] روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ 2 مئی 2014

یو۔ این۔ او کے تحت تمام ممبر ممالک میں ہر سال عالمی یومِ خواتین 8 مارچ کو منایا جاتا ہے اور اس میں این۔ جی۔ اوز، سول سوسائٹی اور سیکولر لبرل لابی کے اشتراک سے بیہودہ نعرے دیکھنے، سننے میں آتے ہیں۔ مگر گزشتہ سال یعنی 8 مارچ 2019ء کو تو عالمی یومِ خواتین کی حد ہو گئی۔ اس قسم کے فضول اور ناقابلِ بیان نعرے لگائے گئے۔

”میرا جسم، میری مرضی“، ”شادی نہیں آزادی“، ”میں طلاق یافتہ ہوں مگر خوش ہوں“ وغیرہ۔ یہ نعرے لگانے والی خواتین کون تھیں؟ کہاں سے آئی تھیں نہ کسی نے معلوم کرنے کا تردد کیا، نہ کسی کو سزا ملی۔ ظاہر ہے جب حدود و قوانین ہی بے اثر بنادیئے گئے تو انہیں کون پکڑتا اور کون ان سے سوال جواب کرتا۔

حالانکہ بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ میرا جسم میری ملکیت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کا مالک ہے۔ جو زندگی اور موت دونوں کا مالک ہے اور ہم اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہیں گزارتے، بلکہ اللہ و رسولؐ کی ہدایات کے مطابق ہمیں زندگی گزارنی چاہیے۔ اس زندگی میں ہمیں اپنی مرضی برتنے کا اختیار نہیں ہے۔

جنسی تعلیم کے نتائج اور جنسی درندگی کے بڑھتے ہوئے المناک واقعات: نہایت دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں کلچرل تقریبات کا جو ہفتہ بھر کا پروگرام منایا جاتا ہے، اس کو کھلم کھلا بے حیائی کی تربیت کے علاوہ کیا نام دیا جاسکتا ہے اور اب تو انگریزی زبان ابتدا سے لازمی کرنے کے ساتھ ساتھ جنسی تعلیم دینے کے احکام بھی آچکے ہیں۔ انگریزی زبان کی تہذیبی نحوست کیا کم تھی کہ اب کم عمر بچوں کے ہاتھ میں موبائل، کمپیوٹر، ڈش کے ساتھ ساتھ اب ان کو باقاعدہ میوزک اور جنس کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ہر جگہ ابتدا این۔ جی۔ اوز ہی کرتی ہیں۔ چنانچہ کراچی اور پنجاب کے علاقوں میں نو خیز بچوں کو جنسی تعلیم دینے کے سراغ بھی مل رہے ہیں۔ مثلاً ایک خبر کے مطابق کراچی کے بے شمار سکولوں میں جنسی تعلیم رائج ہو چکی ہے۔ شتر بے مہارٹی وی چینلز اور میڈیا نے آگ لگا رکھی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل لڑکیوں کے اغوا اور معصوم بچیوں کے ساتھ درندگی روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں۔ ہر روز اخبارات میں اس قسم

کی چار پانچ خبریں تو ضرور ہوتی ہیں۔ ہماری اخلاقی حالت اس طرح تباہ ہو چکی ہے کہ معاشرے میں عورت کو صرف کھلونا سمجھا جا رہا ہے۔ 3 سال، 4 سال اور 5 سال کی بچیاں ہر روز بے آبرو کی جا رہی ہیں۔ درندہ صفت لوگ ان کی عزت لوٹنے کے ساتھ ساتھ ویسے بھی ان کی زندگی ختم کر ڈالتے ہیں۔ کہیں قبرستانوں میں تازہ دفن کی جانے والی نسوانی لاشوں کی بے حرمتی کی جا رہی ہے مردوں کو بھی نہیں بخشا جا رہا۔ حتیٰ کہ ہیجڑے بھی جنسی درندگی کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں۔ ایسی ہر خبر بے حد المناک اور دلخراش ہے۔ حکمرانوں نے اسلام کی سزائیں کیا نافذ کرنا تھیں وہ تو خود فحاشی والے پروگراموں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ شراب و کباب کے جشن مناتے ہیں۔ ان کی سرپرستی کی وجہ سے یہ جنسی درندگی بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ کاش کسی ایک دو کیسوں میں ہی اسلام کی حدود نافذ ہو جاتیں تو یہ درندگی وہیں رُک جاتی مگر حکمرانوں نے تو اپنے کالے کرتوتوں کو جاری رکھنے کے لیے 2006ء کا ”تحفظ عصیاں ایکٹ“ منظور کروایا تھا۔ وگرنہ حقیقت یہی ہے کہ شریعت اسلامی کی سزا فوری طور پر علی الاعلان چوک میں سب کے سامنے سزا دینا یعنی رجم کر دینا ہی ان برائیوں کے آگے بند باندھ سکتا ہے۔ جنوبی پنجاب کا علاقہ تو ایسے واقعات کے لیے خصوصی طور پر بدنام ہے۔ دنیا میں ہر جگہ بے حیائی، عریانی و فحاشی پھیلا نا دراصل یہودیوں کے نئے ورلڈ آرڈر کا ایجنڈا ہے۔ جس کو بیجنگ جیسی عالمی کانفرنسوں کے ذریعے پورا کروایا جا رہا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ دینی و سیاسی پارٹیوں کے سربراہ جو دارِ ثنائی منبر و محراب ہیں، اپنے سیکولر لیڈروں کو عذابِ الیم کی وعید کیوں نہیں سناتے؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ پوری پاکستانی قوم اہلِ سدوم کی طرح کے عذاب میں گرفتار ہو جائے؟ آخر یہ روزانہ کے الیے، برق رفتار عذاب، سیلاب، زلزلے، بجلی و گیس کے بحران، پانی کی کمیابی، دشمنوں کے خوف غرض ہم کس کس عذاب میں گرفتار نہیں ہیں؟ لوٹ کھسوٹ، کرپشن، روز افزوں مہنگائی، قحط سالی، چوری، ڈاکے، دہشت گردی، بم دھماکے، ڈرون حملے، کیا یہ سب عذابِ الہی کی شکلیں نہیں ہیں؟ کیا امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور فرانس جیسے ممالک کی تقلید ہم نے بے حیائی اور جنسی درندگی میں ہی کرنا تھی؟ اکتوبر 2006ء میں حدود قوانین کو اسی غرض سے بدل کر اسے تحفظِ نسواں بل یا تحفظِ عصیاں بل میں تبدیل کیا تھا؟

اب تو گینگ ریپ، اجتماعی درندگی کے واقعات اس تو اتر سے ہو رہے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیوں کو باندھ کر درندگی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس جنسی درندگی کے صرف چند واقعات ہی رپورٹ ہو پاتے ہیں۔ بہت سے واقعات کی لوگ اپنی بے عزتی اور تذلیل کے خیال سے رپورٹ ہی نہیں کراتے۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ درندے اسفل السافلین کی سطح تک پہنچ رہے ہیں۔ کیا وہ اہل سدوم کے انجام سے دو چار ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ نستغفر اللہ ثم نستغفر اللہ محترمہ طیبہ ضیا اپنے مکتوب امریکہ میں لکھتی ہیں:

”پاکستان میں اوسطاً روزانہ تقریباً سات بچے جنسی ہراسگی کا نشانہ بنتے ہیں۔ بعض اوقات ایسے بچے بچیوں کو قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔

”اگر میں اپنے بچے کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے اور اسے قتل کرنے والے مجرم کو جلا کر اس کا جسم خاک بھی بنا ڈالوں، تو بھی میری روح کو سکون نہیں ملے گا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کر پاؤں گی،“ یہ کہنا تھا گزشتہ برس قصور میں ایک آٹھ سالہ بچے کی والدہ کا۔ اس خاتون کے بیٹے کے ساتھ پہلے زیادتی کے جرم کا ارتکاب کیا گیا پھر اسے قتل بھی کر دیا گیا۔ کسی بچے کی موت اس کے والدین کے لیے یقینی طور پر بہت بڑا المیہ ہوتا ہے لیکن ان والدین کو کیسے سکون آئے جن کے معصوم سے بیٹے بیٹیوں کے ساتھ مجرم پہلے جنسی زیادتیاں کرتے ہیں اور پھر انہیں قتل بھی کر دیتے ہیں۔

دو برس قبل شہر قصور کی کم عمر زینب کی تصویر نے سب کے دل دہلا دیئے تھے۔ اس بچی کے ساتھ زیادتی اور قتل کرنے والے مجرم کو سزائے موت بھی دے دی گئی لیکن پاکستانی معاشرے میں ایسے جرائم کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ زینب کے قتل کے بعد بھی قصور میں اس نوعیت کے مزید جرائم پیش آچکے ہیں۔

اب حال ہی میں پاکستان کے شہر مردان میں بھی ایک بچی کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا گیا اور اب چند روز قبل کراچی میں پانچ سالہ بچی کی تشدد زدہ لاش ملی تھی، جسے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا اور زیادتی کے بعد وزنی چیز سر پر مار کر قتل کیا گیا۔ بچوں کو زیادتی کا نشانہ بنانے کے شرمناک واقعات کے علاوہ خواتین کے ساتھ درندگی کے واقعات بھی المیہ بنتے

جار ہے ہیں۔ آج حوا کی ایک اور بیٹی درندوں کے بھینٹ چڑھ گئی۔ لاہور موٹر وے پر کھلے آسمان تلے ایک ماں کو بچوں کے سامنے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس سے بڑی قیامت اور کیا ہوگی؟

لاہور کے تھانہ گجر پورہ میں درج کروائی گئی ایف آئی آر کے مطابق گوجرانوالہ کے رہائشی درخواست دہندہ کی رشتے دار خاتون کی گاڑی کا کرول جنگل کے قریب پیٹرول ختم ہو گیا تھا اور وہ مدد کے لیے انتظار میں کھڑی تھیں۔

ایف آئی آر کے مطابق درخواست دہندہ کی عزیزہ نے بتایا کہ جب وہ پیٹرول کے انتظار میں کھڑی تھیں تو 30 سے 35 سال کی عمر کے دو مسلح اشخاص آئے، انہیں اور ان کے بچوں کو گاڑی سے نکال کر انہیں جنسی کا زیادتی کا نشانہ بنایا۔ ان سے نقدی اور زیور چھین کر فرار ہو گئے۔“ [۱]

افسوس پاکستان کی اسلامی ریاست اور موجودہ ریاستِ مدینہ میں ایسے ہولناک واقعات! نستغفر اللہ۔

روزنامہ نوائے وقت 17 مارچ 2014ء کی رپورٹ کے مطابق لاہور میں 138 ہوٹل اور گیٹ ہاؤس جسم فروشی اور دیگر جرائم کی آماجگاہ ہیں۔ 138 ہوٹلوں اور گیٹ ہاؤسز کی فہرست حساس اداروں کی تیار کردہ ہے۔ [۲]

دراصل نائن الیون کے بعد کے ان بیس (۲۰) سالوں کے اندر جو برق رفتار تبدیلیاں پوری دنیا میں آئی ہیں ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اگر بچے گھر سے باہر ہیں تو کئی طرح کے فکر، اندیشے اور دوسو سے دل کو گھیرے رکھتے ہیں۔ کہیں وہ خدا نخواستہ کسی ایکسیڈنٹ کا شکار نہ ہو گئے ہوں۔ کسی دہشت گرد کے ہتھے نہ چڑھ

[۱] روزنامہ نوائے وقت، 11 ستمبر 2020ء، ”ہے کوئی جو اس ظلم کو روکے.....“ مکتوب امریکہ از طیب ضیا

[۲] ماہنامہ ضیائے آفاق لاہور اپریل 2014ء، ص: 39

گئے ہوں۔ گھر واپس بھی آسکیں گے یا نہیں؟ کہیں وہ جنسی درندگی کا شکار تو نہیں ہو گئے؟ اور اگر وہ گھر کے اندر ہوں تو کیا وہ محفوظ ہیں؟ انٹرنیٹ نے حالات کیسے بدل ڈالے ہیں۔ ایک بڑے کمرے میں مثال کے طور پر بہن بھائی اور ماں باپ بیٹھے ہوں تو بچے ریسرچ کا بہانہ کر کے انٹرنیٹ پر کیا کچھ سرچ کر رہے ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو غیر ملکی کہانیاں اور کارٹون کیا سکھاتے ہیں؟ تشدد، لڑائی، مار کٹائی کے ماحول میں برداشت اور تحمل ختم ہو گیا ہے۔ ذہن اور دل بدل گئے۔ اعمال اور کردار بدل گئے۔ اب وہ بچے ہمارے نہیں رہے۔ اب وہ ہر لحاظ سے دشمنوں کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔ رہی سہی کسر ابتدا ہی سے انگلش میڈیم پڑھائی نے نکال دی۔ اب گانا بجانا، میوزک، ڈانس وغیرہ ان کے کورس میں شامل ہیں۔ جگہ جگہ آرٹس پر فارمنگ اکیڈمیاں موجود ہیں۔ ہماری تعلیم ہی غلط ہے۔ خود ہمارے خلاف ہی مورچہ بن رہا ہے۔ خصوصاً خواتین یونیورسٹیاں قائم ہونے کے بعد عورت کو مرد نما ہیجوا بنانے کی پوری تیاری ہو رہی ہے۔ ایک طرف عورت نازن بن رہی ہے تو مرد یا تو کرپشن اور کام چوری میں ملوث ہیں یا پھر منشیات کے دلدادہ فارغ وقت گزار رہے ہیں۔ اوپر سے وہ گھر کے ہر فرد پر تشدد کرتے ہیں۔ یہ ایک صلیبی جنگ ہے عالم کفر ہمارے بچے، نوجوان نسل اور خواتین کو ٹارگٹ بنا کر ہمارا پورا نظام برباد کر دینا چاہتا ہے۔ اسلحہ میں کمزور ہونے اور ٹیکنالوجی میں کم تر ہونے کے باوجود ہمارا مضبوط خاندانی نظام ہمیں ان سے بہتر پوزیشن میں رکھے ہوئے تھا۔ اب اسی میں وہ ہمیں ہدف پر رکھے ہوئے ہیں۔ کمیشن دے دے کر اور سودی قرضے دے دے کر ہمارے حکمرانوں کو اس طرح ناکارہ کر دیا گیا ہے کہ امریکہ کے ہر مطالبے پر وہ عوام کے خلاف، یس سر (yes sir) کہنے اور ڈومور (do more) کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اوپر سے یو۔ این۔ او کے ایوانوں میں این۔ جی۔ اوز نے ہمارے سماجی اور معاشی نظام کی غلط اور مبالغہ آمیز رپورٹیں پیش کر کے ہمیں ٹکو بنا کر رکھ دیا ہے۔ انتہائی دکھ ہوتا ہے جب علماء کو کھڈے لائن لگا کر اسمبلی میں امریکی اُمنگوں کے مطابق، اللہ رسول کے خلاف بل منظور کرا لیے جاتے ہیں۔ اس طرح دین اسلام کو باقاعدہ کھیل تماشا بنا دیا گیا ہے۔ جبکہ کھیل تماشا کو اپنا دین اور مسلک بنا لیا گیا ہے۔

بیجنگ پلس 20

یہ کمیشن آن سٹیٹس آف ویمن (CSW) کانویارک میں 14 سے 24 مارچ 2016ء تک جاری رہنے والا یو۔ این کا 60 واں اجلاس تھا۔ جس کے بیشتر پروگرام عورتوں پر تشدد سے متعلق تھے۔ اس میں عورتوں کی خرید و فروخت، زنا بالجبر، دھمکی، دباؤ، مار پیٹ اور جنگ کے دوران عورتوں سے جنسی بدسلوکی وغیرہ جیسے موضوعات پر بحث کی گئی تھی۔ وہاں پاکستانی مشن کے ایک پروگرام میں تقریباً ساڑھے 4 سو افراد موجود تھے۔ اس میں پاکستانی نژاد شرمین عبید چنائے کی ایک دستاویزی فلم ”لڑکی دریا میں“ دکھائی گئی اور اس فلم پر بھی وہ آسکرا ایوارڈ کی مستحق قرار دی گئی۔ اس فلم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ لڑکی والدین کی رضا اور اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے شادی کر سکتی ہے۔ شرمین عبید چنائے جیسے مغرب زدہ پاکستانی یہ بات ثابت کرنے پر مصر ہیں کہ پاکستان کا ریکارڈ عورت کے معاملے میں اچھا نہیں ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں بتاتے کہ یہ اسلام نہیں بلکہ وہاں کی مقامی روایات ہیں جس کے مطابق لڑکیوں کو اپنی پسند کی شادی کرنے پر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

وہاں رپورٹ یہ پیش کی گئی کہ پنجاب اسمبلی نے عورتوں پر تشدد کے خاتمے کا قانون منظور کر لیا ہے۔ اس طرح پاکستانی حکومت عورت پر تشدد کے خاتمے کے لیے پُر عزم ہے۔ مگر اس قانون میں ایک سقم موجود ہے کہ یہ جرم قابلِ راضی نامہ ہے۔ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ یہ والدین اور رشتہ داروں کو لڑکیوں پر دست درازی کرنے سے روک سکے۔ اجلاس کے مرکزی موضوعات عورت پر تشدد ہی سے متعلق تھے۔ جو یو۔ این باڈیز اور این۔ جی۔ او گروپس کی طرف سے ترتیب دیئے گئے تھے۔

اقوام متحدہ خواتین کمیشن کے اس 60 ویں سیشن میں دو موضوع پر خصوصی بحث ہوئی۔ ”عورت کی ترقی اور دنیا میں تسلسل سے ہونے والی ترقی کے اہداف“ اور ”عورت پر ہر قسم کے جنسی تشدد کا خاتمہ اور بچاؤ۔“

بیجنگ پلس 20 کے موقع پر ایک بار پھری۔ ڈاکے ایجنڈے کی تائید و توثیق کی گئی۔ بیجنگ پلیٹ فارم فار ایکشن (BPFA) کے 13 نکات میں سے جن آٹھ نکات کو اہم قرار دے دیا گیا تھا، اب ان آٹھ نکات کی بھی دوبارہ تائید کی گئی۔ اسقاطِ حمل پر بھی خصوصی بحث ہوئی۔ مگر اس بار اسقاطِ حمل کے موضوع پر بحث ایک مختلف انداز میں ہوئی۔ ایک عیسائی سکالر کا چار ورقہ مقالہ تقسیم کیا گیا۔ جس کا موضوع تھا ”اسقاطِ حمل کو قانوناً جائز نہیں قرار دینا چاہیے“ یہ مقالہ ڈاکٹروں اور نفسیاتی ماہرین کے تحقیقی مقالات سے مرتب کیا گیا تھا کہ اسقاطِ حمل عورت کی صحت کے لیے مضر ہے۔ کیونکہ جہاں قانونی یا رواجی طور پر اس کی اجازت ہے وہاں عورت کی صحت کا معیار بڑھا نہیں بلکہ کم ہوا ہے، پھر اسقاطِ حمل کا عورت کی نفسیات پر برا اثر پڑتا ہے اور تیسرا پہلو کہ یہ آنے والے بچے کے ساتھ بھی نا انصافی ہے۔ پھر تمام ممالک سے کمیشن آن سٹیٹس آف وومن (CSW59) والے نکات پر رپورٹ لی گئی۔ نکتہ یہ تھا کہ مقام ملازمت پر خواتین کو تشدد سے بچانے کے لیے کیا قانون سازی کی گئی ہے اور اب اس پر عمل درآمد کی کیا صورت حال ہے۔ اس موقع پر پاکستانی وفد نے پنجاب اسمبلی سے پاس ہونے والے تشدد بل کو اپنی کارکردگی کے طور پر پیش کیا۔

جبکہ مسلم ممالک سے آنے والی باحجاب نمائندہ خواتین بھی وہاں موجود تھیں، جو عورت سے متعلق تمام مسائل پر اسلام کا نقطہ نظر بھی پیش کر رہی تھیں اور عالمی مسلم خواتین یونین کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کر رہی تھیں۔^[1]

یو این عالمی کانفرنسوں کا جائزہ:

جب یہ عالمی کانفرنسیں شروع ہوئیں تو اس میں پہلے تو عورتوں کی حاضری زیادہ ہوتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ ان کانفرنسوں میں مردوں کی حاضری زیادہ ہونے لگی اور عام عورتوں کی دلچسپی اس میں کم ہوتی گئی۔ کیونکہ یہ بات واضح ہونے لگی کہ ان کانفرنسوں کے دیئے گئے ایجنڈے عمومی طور پر ناقابلِ عمل ہیں۔ پھر مسلم ممالک نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان کانفرنسوں کے اصل مخاطب صرف مسلم ممالک ہیں۔ امریکہ دنیا بھر میں کارپوریٹ کلچر پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس

[1] تلخیص ”اقوام متحدہ خواتین کمیشن اور پاکستانی خواتین از ڈاکٹر کوثر فردوس (چیئر پرسن انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین، سابق رکن سینیٹ آف پاکستان بحوالہ ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن لاہور، مئی 2016، ص: 51)

نے مسلمانوں کے مضبوط فیملی یونٹ اور شرم و حیا والے کلچر کو نیست و نابود کرنے کے لیے یہ سارے ڈرامے رچائے ہیں۔ بھارت دنیا بھر میں عورتوں کے معاملے میں تشدد بھری روایات رکھنے کے بارے میں بدنام ہے۔ خود مغربی ممالک میں مساوات کے دعوے کے باوجود عورتوں کے ساتھ جو ظلم و زیادتی ہو رہی ہے ہر شعبے میں اسے گھسیٹ کر اس کا جو مالی اور جسمانی استحصال ہو رہا ہے۔ دنیا اس سے تو ایسے صرف نظر کرتی ہے جیسے وہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بس وہ ہاتھ دھو کر پاکستان اور سعودیہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان سے جو ”سیونگ فیس“، ”اے گرل ان دی ریور“، اور ”دختر“ جیسی دستاویزی فلمیں اپنے ہنٹھوؤں سے بنوا بنوا کر پاکستان کو ایک ہولناک اور بھیانک ملک ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ خود پاکستانی عورتیں چیخ چیخ کر دہائی دے رہی ہیں کہ پردہ حجاب ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔ یہ ہماری حفاظت کا محفوظ قلعہ ہے۔ اللہ نے ہمیں حجاب کا خوبصورت تحفہ دے کر ہمارا تحفظ کیا ہے مگر وہ خود مسلمان خواتین یا خود مسلمان حکمرانوں کی ایک بھی بات سننے کو تیار نہیں۔ خود کیتھولک عیسائی فرقے کا فیملی فورم اسقاطِ حمل کے خلاف بول سکتا ہے۔ عیسائی سکالر یہ کہہ سکتا ہے کہ اسقاطِ حمل سے عورتوں کی صحت اچھی نہیں ہوتی بلکہ اس کی صحت کا معیار مزید گرا ہے کہ اس سے چھاتی کا کینسر ہو جاتا ہے۔ اس سے عورتوں کی نفسیات پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس سے آنے والے بچوں کے حقوق بھی متاثر ہوتے ہیں مگر وہ ان کو دقیا نوی قرار نہیں دیتے۔ یہ فتوے صرف مسلمان ممالک پر لگائے جاتے ہیں، تعصب کی ماری عیسائی دنیا امریکہ میں اپنی قابل اور اہل خاتون ہیلری کلنٹن کو امریکہ کا صدر ماننے کو تیار نہیں، جبکہ مسلم ممالک میں آٹھ دس مسلم خواتین اپنے اپنے ملک کی چیف ایگزیکٹو رہ چکی ہیں۔ مگر پھر بھی مغربی ممالک اور بھارت روشن خیال ہیں اور مسلم ممالک رجعت پسند ہیں، خواتین کے لیے پُر تشدد رویوں کے حامل ہیں۔ اصل بات ایک ہی ہے کہ اس وقت قوت، طاقت، میڈیا، عسکری اور ٹیکنالوجی کی قوتیں ان کے ہاتھ میں ہیں۔ لہذا اپنے ہاں کے کالے کو بھی روشن اور ہماری روشن و بے داغ شریعت کو کالا قرار دینے پر مصر ہیں۔ ان کے سامنے لاکھ دلائل پیش کیے جائیں۔ مگر ہر بار معصومیت سے اپنے پرانے گھسے پٹے دلائل دہرا دیتے ہیں۔ ہمارا کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ سودی قرضوں میں جکڑے ہوئے مسلمانوں کی بات آخر کون سنتا ہے؟

مغربی یلغار کی مزاحمت

یہ دلخراش داستان تو بڑی طویل ہے جو کہیں رکنے کا نام نہیں لیتی۔ نت نئے انداز اور پروگرام ہیں اور ان مغرب زدہ خواتین کی بیشک ایک طویل اور ان تھک جدوجہد ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ عملاً پاکستانی خواتین کی نمائندہ نہیں ہیں۔ ان کی تعداد پورے پاکستان میں پانچ سو تک بھی نہیں پہنچتی بلکہ اس سے بھی بہت کم ہے۔ چونکہ حکومتیں اور میڈیا ان کی پشت پر ہیں، لہذا محسوس یہی ہوتا ہے کہ وہ پوری پاکستانی خواتین کی بات کر رہی ہیں، اصل بات یہ ہے کہ وہ وطن عزیز پاکستان میں صرف مغربی خواتین کی وکالت کر رہی ہیں۔۔۔ اور بس یہی وجہ ہے کہ اس مغربی تحریک آوارگی نسواں کا تدارک کئی محاذوں پر امت مسلمہ میں کیا گیا۔۔۔ اسلام ایک جاندار تحریک ہے جو بقول ظفر علی خاں مرحوم

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے

اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

چنانچہ علماء حق نے بروقت اپنی ذمہ داری ادا کی اور مسلمان خواتین کو ان نئے نئے فتنوں سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ وعظ و تلقین کے ذریعے سے اور تحقیقی لٹریچر کے ذریعے سے بھی یہ کوشش کی گئی۔ چنانچہ مولانا مودودی مرحوم کی کتاب ”پردہ“ اس سلسلے میں سنگ میل ثابت ہوئی۔ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی کتاب ”پاکستانی عورت دور ہے پر“ نے بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ عالم عرب میں بھی اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا۔ مثلاً سید قطب شہید کی کتاب ”شہادت حول الاسلام“ علامہ فرید وجدی آفندی کی کتاب ”المرأة المسلمة“ وغیرہ۔

علامہ اقبال نے بھی شاعری کے ذریعے مسلمان عورت کو ”بتولے باش و پنہاں شوازیں عصر“ کا پیغام دیا۔ عالم اسلام میں برپا ہونے والی اسلامی تحریکوں نے بھی اس فتنہ سے خواتین کو بچانے کی جدوجہد جاری رکھی۔ مصر کی اخوان المسلمین نے اور برصغیر میں جماعت اسلامی نے

خواتین کو صحابیات رضی اللہ عنہن کے نقش قدم پر چلنے اور نیک و صالح، باپردہ خواتین بنانے کے لیے ہمہ جہت تحریک چلائی۔

دردمند مسلمان خواتین نے خود بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور احیاء اسلام کے جہاد میں مصروف ہو گئیں۔ مثلاً اپنے بچوں کی اسلامی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ، اپنے گھروں کے ماحول کو لادینی اثرات سے بچانا، اپنے محلے کے بچے بچیوں کو قرآن پاک ناظرہ و با ترجمہ پڑھانا، جگہ جگہ ترجمہ قرآن کی کلاسیں شروع کرنا، ان میں قرآن و سنت کی تعلیم کو عام کرنا، منظم ہو کر جہالت کے خلاف کام کرنا، لوگوں کو اسلامی احکام کے فوائد سے آگاہ کرنا، مغربی تہذیب کے نقائص اور خرابیوں سے آگاہ کرنا، وغیرہ۔

مزاحمت کی مثالیں:

- 1- اسلامی نظریاتی کونسل نے طلاق، خلع وغیرہ کے بارے میں اپنی غیر شرعی تجاویز دیں تو فوراً بہت سے علماء نے اس پر زوردار تبصرے لکھے اور تجزیے کر کے ان کو خلاف شریعت قرار دیا۔
- 2- محکمہ بہبود آبادی کی وزیر ڈاکٹر فردوس عاشق نے بر ملا پارلیمنٹ سے آبادی کو محدود نہ کر سکنے کا اعتراف کیا ساتھ ہی تجویز پیش کی کہ زیادہ بچوں پر ٹیکس عائد کر دیا جائے۔ تو مختلف تنظیموں نے اس کی تردید میں بیان دیئے، مضامین لکھے۔ خطبوں میں احتجاج کیا گیا مثلاً جامعہ بنوریہ کے ممتاز عالم مفتی نعیم نے کہا: ”زیادہ بچوں پر ٹیکس شریعت کے خلاف ہے۔ بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔“ انہوں نے کہا: ”دہشت گردی، بد امنی اور معاشی بد حالی جیسے مسائل کثرتِ آبادی سے نہیں، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا نتیجہ ہیں۔ وزراء خفت مٹانے کے لیے جو منہ میں آئے، کہہ دیتے ہیں۔ پڑھے لکھے جاہل وزراء کو قرآن و حدیث کا کچھ پتہ نہیں جب عورت کی زندگی خطرے میں ہو تو امتناع حمل کی تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ حکمرانوں کو عوامی مسائل حل کرنے میں دلچسپی نہیں، اپنی شاہانہ زندگی اور فضول خرچی برقرار رکھنے کے لیے نئے ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔“^[۱]

3- جنرل مشرف نے 2005ء میں مخلوط میرا تھن ریس کروانے کا لمبا چوڑا پروگرام بنایا تھا۔ مگر متحدہ مجلس عمل کے لیڈروں اور عوام نے مل کر اس ریس کو مکمل ناکامی سے دو چار کر دیا۔ اور پھر اگلے سال کوئی اس ریس کا نام بھی نہ لے سکا۔ اب بھی انگلش میڈیم ادارے یہ ریس کروانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہو پاتی۔

4- اسلامی نظریاتی کونسل نے حقوق نسواں ایکٹ مسترد کر دیا:

روزنامہ جنگ 26 فروری 2014ء کی رپورٹ کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل اب تک قرآن و سنت سے متصادم 700 قوانین کی نشاندہی کر چکی ہے۔ مگر پارلیمنٹ ان پر غور کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔

نظریاتی کونسل نے حقوق نسواں ایکٹ 2006ء بھی مسترد کر دیا کیونکہ اس کی بعض دفعات قرآن و سنت سے متصادم تھیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا اجلاس مولانا محمد خاں شیرانی کی زیر صدارت ہوا۔ کونسل کے ارکان کا موقف یہ تھا کہ اس کی اکثر دفعات قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہیں۔

اس ایکٹ کی منظوری کے بعد زیادتی کے واقعات میں اضافہ دیکھنے میں آیا۔ یہ ایکٹ خواتین کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہا، کیونکہ اس کے تحت زنا کو قابل ضمانت جرم اور ناقابل دست اندازی پولیس قرار دیا گیا تھا۔^[۱]

10 مارچ کو نظریاتی کونسل نے کہا کہ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت کی ضرورت نہیں، مگر شوہر بیویوں میں عدل کا پابند ہے۔ 11 مارچ کو کونسل نے کہا کہ نابالغ بچوں کے نکاح کا سرپرست کو اختیار ہے مگر رخصتی بلوغت سے قبل نہیں ہونی چاہیے۔ ایسے فتوؤں پر صیہونی میڈیا اور این۔ جی۔ اوز نظریاتی کونسل کے خلاف بھرپور تحریک چلائے ہوئے ہیں۔^[۲]

تحفظ نسواں ایکٹ کے خلاف جماعت الدعوة نے بھی فوراً دستخطوں کی مہم چلائی تھی۔

[۱] نوائے وقت 20 ستمبر 2013

[۲] ماہنامہ ضیائے آفاق اپریل 2014ء ص: 38

چنانچہ 30 لاکھ خواتین نے اس کے خلاف دستخط کیے تھے۔ روشن خیال لاہور میں 8 لاکھ خواتین نے اور گوجرانوالہ میں 4 لاکھ 20 ہزار خواتین نے دستخط کیے تھے یہ مہم عالمی یومِ خواتین 2007 کے موقع پر چلائی گئی تھی۔ اس طرح تحفظ نسواں ایکٹ کے خاتمے کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا۔ [۱] مسئلہ یہی تھا کہ عوام اس حدود آرڈیننس کو (اللہ کی قائم کردہ حدود کو) برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ مگر حکومت اور این۔ جی۔ اوز تمام خدائی احکام پامال کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

5۔ پنجاب اسمبلی میں این۔ جی۔ اوز کے خلاف یکجہتی:

زرداری دور میں ڈاکٹر محمد اجمل نیازی نے اپنے کالم ”بے نیازیاں“ میں تحریر کیا تھا۔ (خیال رہے کہ یہ زرداری کا دورِ حکومت تھا)

”پنجاب اسمبلی میں یہ دن ایک ہزار دنوں کا دن تھا۔ اہم بھی اور دلچسپ بھی۔ خاتون ممبر پنجاب اسمبلی عارفہ خالد نے سوال اٹھایا بلکہ آواز بلند کی کہ این۔ جی۔ اوز کو سرکاری سکول تھوک کے حساب سے دینے کی پالیسی پر نظر ثانی کی جائے اور اس معاملے میں سنجیدگی سے کارروائی کی جائے۔ سیاستدان عارفہ خالد نے ایک ماہر تعلیم سکالر کی طرح اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کیا کہ سارا ایوان اس بات پر متحد ہو گیا۔ کئی ممبران نے یہ سکول این۔ جی۔ اوز سے واپس لینے کا بھی مطالبہ کیا۔ ایسی یکجہتی کا مظاہرہ پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ این۔ جی۔ اوز کو سکول چلانے کی اجازت دینے کا فیصلہ ضلعی حکومتوں کی طرف سے نیک نیتی سے ہوا ہوگا۔ مگر این۔ جی۔ اوز والیاں قطعی طور پر بدنیت ہیں۔ جنرل (ر) پرویز مشرف کی پوری کابینہ بھی تقریباً این۔ جی۔ اوز پر مشتمل تھی۔ اس نے تو پورا پاکستان ہی ان این۔ جی۔ اوز کے حوالے کرنے کا سوچا ہوا تھا۔“

ایوان میں سارے ممبران نے خاموشی سے سنا کہ این۔ جی۔ اوز والیاں صرف انگریزی بول سکتی ہیں اور ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے کہ جو غلط سلف انگریزی بول لیتا ہے وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہماری بیوروکریسی کے افسران نے ہی ان این۔ جی۔ اوز کی سرپرستی کی ہے۔ سات شناختی

کارڈ لے کر کوئی عورت ان کے پاس چلی جائے اور این۔ جی۔ اوکھول لے پھر وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سکول لے سکتی ہے۔ پھر اس پر سرکاری فنڈ اور بیرونی فنڈز کی بارش ہونے لگتی ہے وہ راتوں رات امیر کبیر بن جاتی ہے۔ اتنی آسانی سے تو وزیر بھی امیر کبیر نہیں بنتے۔ کوئی چیک نہیں، کوئی آڈٹ نہیں وہ سرکار دربار میں ہر طرح کی مداخلت کو اپنا حق سمجھتی ہیں۔ فارن فنڈز ہونے کی وجہ سے بیرونی دنیا کے ساتھ ان کے رابطے ہو جاتے ہیں۔ وہ قومی معاملات کو مسلسل نظر انداز کرتی چلی جاتی ہیں۔ اور عالمی ایجنڈے پر عمل کرتی ہیں۔ عالمی ایجنڈا ہمیشہ پاکستان کے خلاف ہوتا ہے۔ جتنے سکول این۔ جی۔ اوز نے لیے ہیں ان سے ایک سکول بھی ایسا نہیں جس نے کوئی قابل ذکر کارکردگی دکھائی ہو۔

اپوزیشن اور حکومت دونوں مبارکباد کی مستحق ہیں۔ وہ معاملات جو سانچے ہوں اور سب کے لیے فائدے کے ہوں، ان کے حوالے سے ممبران اسمبلی کو ایسی ہی رواداری اور وضع داری کا ثبوت دینا چاہیے۔“ [۱]

6- خواتین پر تشدد کے خلاف دوروزہ کانفرنس 2005ء

ستمبر 2005ء میں این۔ جی۔ اوز نے خواتین پر تشدد کے خلاف دوروزہ کانفرنس کروائی جس میں وزیراعظم پاکستان کی امور خواتین کی مشیر نیلوفر بختیار نے بھی شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر انہوں نے پریس کانفرنس میں مشترکہ اعلامیہ جاری کیا کہ خواتین پر تشدد کے خلاف ہر ممکن اقدامات کیے جائیں گے۔ قوانین اور پالیسیوں پر نظر ثانی کر کے انہیں مزید موثر بنایا جائے گا۔ اس موقع پر صدر جنرل مشرف نے بھی خطاب کیا اس کے خطاب کے بارے میں روزنامہ نوائے وقت مورخہ 9 ستمبر 2005ء نے اپنے ادارے میں لکھا۔ اس ادارے کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود حکومت این۔ جی۔ اوز کے مکروہ اور گھناؤنے پروپیگنڈے سے کتنی تنگ آ چکی تھی۔

[۱] ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کا کالم ”بے نیازیاں“ روزنامہ نوائے وقت مورخہ 29 جنوری 2009ء

نوائے وقت کا اداریہ: صنفِ نازک پر تشدد (جنرل مشرف کا خطاب)

صدر جنرل پرویز مشرف نے عورتوں پر تشدد کے بارے میں دو روزہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”این۔جی۔اوز پاکستان کو بدنام نہ کریں۔خواتین پر تشدد عالمی مسئلہ ہے البتہ لیڈیز کونسلروں کو تشدد رکوانے کے لیے خصوصی اختیارات دیئے جائیں گے۔“

صدر مشرف کا یہ بیان ایک ایسے پس منظر میں آیا ہے جب این۔جی۔اوز ڈاکٹر شازیہ، مختاراں مائی اور سونیا ناز جیسی خواتین کو بین الاقوامی ایشو بنا کر پیسے بٹورنے کی کوشش کر رہی ہیں اور اس سلسلے میں ملکی عزت و وقار کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے، جس سے پاکستان کی بدنامی ہوئی ہے۔ امریکہ کی طوفان زدہ ریاست اور لینز میں خواتین کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹی وی پر ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ کینیڈا میں 29 فیصد خواتین سولہ سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے جنسی تشدد کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ فرانس میں خواتین کے ساتھ زیادتیوں کے ہر سال پچیس ہزار واقعات ہوتے ہیں۔ بھارت میں ایسے واقعات ہر ماہ ہزاروں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود نام نہاد این۔جی۔اوز اور مفاد پرست عناصر خواتین پر تشدد کے متعلق پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے ان واقعات کو دنیا میں ”پوسٹر کیس“ بنا رہے ہیں۔ یہ مفاد پرست عناصر سیاسی و معاشی ایجنڈے کے لیے پاکستان کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ ان کا انحصار غیر ملکی امداد پر ہوتا ہے اس لیے جانے انجانے طور پر وہ غیر ملکی اغراض کے لیے کام کرتے ہیں جس سے ان کی اپنی جیبیں تو بھر جاتی ہیں لیکن ملک کو بہت زیادہ بدنامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ملک دشمن عناصر پہلے ہی ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور دولت کی خواہش میں این۔جی۔اوز بھی ان کے لیے آلہ کار بنتی ہیں جو معمولی واقعات میں عالمی رائے عامہ کو ملک کے خلاف کرتی ہیں۔ عورتوں سے زیادتی ایک عالمی مسئلہ ہے اس کے لیے بین الاقوامی طور پر مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے انسانی شعور کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ صنفِ نازک کی عزت و تکریم کریں۔ ہم انہیں معاشرے میں ان کا جائز مقام دلادیں تو ہمارے لیے معاشی، سماجی ترقی کی نہ صرف نئی راہیں کھلیں گی بلکہ انسانیت کی عظمت و ترقی کے نئے باب رقم

ہوں گے۔ اہل دانش کو اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔“ [۱]

7- چنانچہ جوں ہی مغربی تہذیب یا اس کے ایجنٹ کوئی نیا شوشہ چھوڑتے ہیں، فوراً مخلص، درد مند اور حساس مسلمان مرد و خواتین اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے یکسو ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے بیشتر مذموم عزائم کی راہ میں سدِ سکندری بن جاتے ہیں۔ مثلاً قاہرہ کانفرنس اور بیجنگ کانفرنس کے موقع پر علماء نے اور حساس صحافیوں نے امت کو بروقت فتنوں سے آگاہ کیا، صائمہ ارشد کیس کے حوالے سے ملک میں ردِ عمل اتنا شدید تھا کہ خود فیصلہ دینے والا جج بھی حیران و پریشان ہو گیا۔

☆ جمخانہ کلب لاہور نے 12 نومبر 1997ء کو خواتین میں ”مقابلہ حسن“ کروانے کا اعلان کیا۔ جس میں کلب کی رکن خواتین کے علاوہ مرد ارکان کی بیویاں اور بیٹیاں بھی حصہ لینے کی اہل قرار پائیں اور اعلان ہوا کہ کلب کے مرد ارکان بھی یہ مقابلہ دیکھ سکیں گے۔ مگر جماعت اسلامی کے چند ذمہ دار افراد نے جمخانہ کلب والوں سے رابطہ کر کے ان کو اس اقدام سے رک جانے کی تلقین کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 16 نومبر کو جمخانہ کلب والوں کو یہ مقابلہ منسوخ کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ [۲]

☆ 1969ء میں اسلامی جمعیت طالبات کا آغاز ایک مبارک جہت ثابت ہوا، انہوں نے خواتین کے تعلیمی اداروں میں الحاد اور بے دینی کو ختم کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا۔ اسی طرح مصر، ترکی، ایران، ملائیشیا وغیرہ میں بھی درد مند مسلم خواتین اپنے اپنے طور پر اسلامی تہذیب کے احیاء اور مغرب زدہ خواتین کے مقابلے کے لیے برسرِ پیکار رہیں۔

[۱] روزنامہ نوائے وقت، 9 ستمبر 2005ء

[۲] نوائے وقت، 16 نومبر 97ء

غیر تربیت یافتہ خواتین کے اسمبلی ممبر بننے کے خلاف دہائی

8۔ بیگم خواجہ نے ”روزنامہ نوائے وقت“ میں ایڈیٹر کی ڈاک میں دہائی دی:

ایک ٹاک شو میں وفاقی وزیر ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان اور ایم۔ این۔ اے کشمالہ طارق کے درمیان ہونے والی فحش گفتگو پورے ملک نے سنی اور مومنہ و پاکباز خواتین نے شرمندگی سے منہ چھپا لیا۔ کیا ہماری نمائندہ قائد خواتین ایسی بازاری زبان استعمال کر کے اراکین اسمبلی کو رسوا کرنے میں آزاد رہیں گی؟ کشمالہ طارق کے طعنے ”پارٹی تبدیل کرنے والی لوٹی“ کے جواب میں وفاقی وزیر ڈاکٹر فردوس اعوان نے جواب دیا ”ہیرا منڈی سے تعلق رکھنے والی سیاستدان اسمبلی میں آگئی ہیں۔ بعض عورتیں تو بیڈروم سے ہو کر اسمبلی پہنچتی ہیں۔“ [۱]

ڈاکٹر اجمل نیازی نے اپنے کالم ”بے نیازیاں“ میں لکھا۔ عنوان تھا ”عورتوں کے لیے مخصوص نشستیں ختم کی جائیں۔“ اس میں انہوں نے کہا کہ یہ بات خود خواتین کے بھی حق میں ہے۔ کتنی شرمناک بات ہے کہ اب اور تو کسی محکمے یا شعبے میں اس طرح عورتوں کا کوئی نہیں ہے۔ دنیا میں کئی ممالک اور کئی تنظیمیں عورتوں کے عالمی مقابلہ حسن اور لباس کے حوالے سے مختلف پروگراموں کی مخالفت کرتی ہیں۔ یوں تو عورتیں مردوں کے برابر حقوق کے لیے آواز اٹھاتی ہیں۔ حقوق انسان سے زیادہ حقوق نسواں کی بات کی جاتی ہے۔ مگر عورت اپنی تذلیل میں صرف عورت ہونے کے حوالے سے خود شریک ہوتی ہے۔ اسمبلیوں میں مرد ممبران عورتوں کی لڑائیوں کو انجوائے کرتے ہیں۔ ٹی۔ وی۔ چینلز پر اینکر پرسن بھی یہ تماشا لگا کے اندر ہی اندر خوش ہوتے ہیں۔ [۲]

[۱] بیگم خواجہ: کالم ایڈیٹر کی ڈاک نوائے وقت 20 ستمبر 2009ء

[۲] روزنامہ نوائے وقت مورخہ 18 ستمبر 2009ء ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کا کالم ”بے نیازیاں“

انہوں نے اپنے اسی کالم میں مزید لکھا ہے: ”اس گفتگو میں ڈاکٹر شیریں مزاری بھی تھیں۔ انہوں نے بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ کیا یہ اندازِ گفتگو پارلیمنٹیرین کا ہے؟ تو کیا پارلیمنٹ میں اس طرح ٹریننگ دی جاتی ہے اور ہماری سیاسی پارٹیاں ایسی عورتوں کو پارلیمنٹ میں بھیجتی ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر شیریں مزاری جیسی عورتیں پارلیمنٹ میں ہوں تو پارلیمنٹ کے وقار میں اضافہ ہو۔ پچھلے دور میں صدر مشرف نے عورتوں کی مخصوص نشستوں میں غیر ضروری اضافے کر کے پوری قوم کی تذلیل کی۔“

9- مولانا سید الحق کا کہنا ہے کہ ”زیادہ سے زیادہ دینی مدارس طلبہ اور طالبات دونوں کے قائم کیے جائیں۔ اہل مغرب کی ثقافتی یلغار کا یہی مؤثر جواب ہے۔“

اگرچہ اس وقت بے شمار دینی تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور وہ سب اپنے اپنے انداز میں خواتین کے مسائل پر گفتگو بھی کرتے ہیں، سب جماعتوں کے خواتین ونگ بھی موجود ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ مغرب کی ثقافتی یلغار اور ہندو کی مکارانہ پالیسی اتنی زبردست اور جارحانہ ہے کہ محدود وسائل رکھنے والے عوام اوّل تو ان کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ اگر ادراک کر بھی لیں تو ہمارا سارا حکومتی طبقہ، ہندو اور مغرب کی یلغار میں ان کا 100% ہمنوا بنا ہوا ہے اور اپنے ملک میں ان کی حیا باختہ تہذیب کو پھیلانے کے لیے شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار ہے۔ وہ خود ہی دیندار عناصر کی ہر وقت سرکوبی کرتا رہتا ہے اور ان کا ناطقہ بند کیے رکھتا ہے۔ اس لیے ان این۔ جی۔ اوز کی اور مغرب زدہ خواتین کی مزاحمت بہت ہی مشکل ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر ”سوات میں نوجوان خاتون کو کوڑے مارنے کی من گھڑت مگر اشتعال انگیز فلم“ کو امریکہ نے میڈیا کے ذریعے دنیا میں جگہ جگہ پہنچا کر مسلمانوں کو دہشت گرد مشہور کر دیا اور اس کی آڑ میں قبائلی علاقوں پر بھرپور حملہ کر دیا۔ جبکہ ہمارے دانشور، کالم نگار اس کے تجزیے ہی کرتے رہ گئے کہ یہ سارا من گھڑت واقعہ ہے۔ اپنے ہاں ایسا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں، مگر دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور ہمارے تبصرے اور تجزیے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بلکہ عدالتوں نے بھی فیصلہ دے دیا کہ ایسا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں۔ مگر اس واقعے کی تردید

ہمارے میڈیا نے نہیں کی گویا وہی سچے ہیں اور ہم پر ان کا دہشت گردی کا الزام بالکل بجا ہے۔ پھر شارپس اور دیگر ہندوستانی چینلز کے ذریعے جو ثقافتی حملے مسلمانوں پر کیے جا رہے ہیں، اس کا نتیجہ تو لادینی، عریانی اور بڑھتی ہوئی بے حیائی کی شکل میں نکلتا ہے۔ جو خواتین ارکان قومی اسمبلی کی ممبر بنی ہیں وہ بغیر کسی تربیت اور تعلیم کے اسمبلی پہنچ گئی ہیں۔ انہوں نے وہاں جا کر خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کیا قانون سازی کرنا تھی اسمبلی میں دلہن کی طرح سج بن کر جاتی ہیں اور وہاں بھی ساس بہو کی روایتی لڑائی جاری رہتی ہے۔ زیادہ پرانی بات نہیں ایم این اے کشمالہ طارق اور ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کا روایتی جھگڑا (ساس بہو کی طرح کا) اخبارات کی زینت بنا اور ٹی۔وی کی رونق بنا۔^[۱]

[۱] روزنامہ نوائے وقت، مورخہ 18 ستمبر 2009ء، ڈاکٹر اجمل نیازی کا کالم ”بے نیازیاں“

10۔ مغربی ایجنڈے کے خلاف اہل درود کی مزاحمت

صدر مشرف کے عہد نامہ مسعود میں خود حکومت نے لبرل این۔ جی۔ اوز کے پورے پروگرام کو وطن عزیز میں من و عن نافذ کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا کیونکہ اس کی اپنی کابینہ این۔ جی۔ اوز مارکہ ہی تھی۔ لہذا بہت جلد معاشرہ کی تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی قدریں بدلنے لگیں۔ ہمارے صدیوں کے جمے جمائے عقائد اور نظریات کو خلط ملط کیا جانے لگا۔ ہر جگہ گلوبلائزیشن کا نعرہ بلند ہونے لگا کہ Global unity ہونی چاہیے۔ ہمیں عالمی دنیا سے مل کر رہنا ہے اس کا ساتھ نہ دیا تو پتھر کے دور میں لڑھکا دیئے جائیں گے۔ لہذا ہمارے ہیروز گلوبل ہونے چاہئیں۔ ہمارے تہوار بھی global ہونے چاہئیں۔ U.N.O ہم سب کا ہیڈ کوارٹر ہے اس کو ہر سال اپنی پوری کارکردگی کی رپورٹ پیش کرنا ہوتی ہے۔ لہذا ہمیں ان کے دیئے ہوئے ایجنڈے پر چلنا پڑے گا۔

1۔ اس طرح جب حکومتی سطح پر لادینی، فحاشی اور بے حیائی کے پروگرام کو مسلم معاشروں میں زبردستی مسلط کیا جانے لگا تو اہل شعور نے بھی اپنے انداز میں اس کا تدارک کرنے کی بھرپور کوشش کی مثلاً تعلیمی میدان میں، رفاہی شعبہ میں، منبر و محراب کے ذریعے، تدریس اور تبلیغ کے ذریعے، اگرچہ کئی تنظیمیں کام کر رہی ہیں، کئی لوگ انفرادی طور پر کام کر رہے ہیں، مگر مقصد سب کا ایک ہے جدید کفر و الحاد اور سیکولرزم کے آگے بند باندھنا، اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کرنا اور اپنے خاندانی نظام کو بچا کر مضبوط و مستحکم رکھنا وغیرہ۔ نوجوان نسل اور طلبہ و طالبات کو اسلام کی طرف مائل کرنا، عورت کو اس کی بنیادی ذمہ داریوں کا شعور دینا، اس طرح اپنی دینی، اخلاقی اور معاشرتی قدروں کو محفوظ کرنا۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر اس وقت کئی تعلیمی ادارے دینی اور عصری تعلیم کو ہمراہ لے کر چل رہے ہیں مثلاً دارالرقم، اقرا پروجیکٹ، حراسکول نیٹ ورک، اسلامک انسٹیٹیوٹ، شان اسلام سکول اور دعوتہ ماڈل سکول وغیرہ۔

2- اسی طرح بے شمار خواتین تنظیمیں خواتین کے مسائل کو سمجھتے ہوئے انہیں دینی شعور دینے کے ساتھ ساتھ رفاہی ادارے بھی قائم کر رہی ہیں۔ مثلاً اسلامک ویلفیئر ٹرسٹ کا خواتین ونگ 1989ء سے کام کر رہا ہے۔ ان کا مانو ہے ”عورت کی بیماری، ناداری اور جہالت کے خلاف جہاد، تعلیم اور خدمتِ خلق کے ذریعے“ زنانہ مدارس تیزی سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ قرآن کے ترجمہ و تفسیر اور قرآن فہمی کی کلاسیں روز افزوں ہیں۔ تحریری صلاحیت رکھنے والے لوگ تحریری میدان میں ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ ان کے بیہودہ اعتراضات کا جواب دیتے ہیں اسلامی نکتہ نظر پیش کیا جاتا ہے۔ بہت سے کالم نگار، دانشور، علماء حضرات، محب وطن افراد، اخبارات اور کئی دینی این۔ جی۔ اوز ایسے ایجنڈے کی مزاحمت میں پیش پیش رہتے ہیں۔

بہر حال عورت کو مادر پدر آزادی دینے کا معاملہ ہو یا عورت کو نماز جمعہ میں امام بنانے کا مسئلہ۔ بے حیائی اور عریانی کی بات ہو یا بے لباسی اور تنگ لباسی کا معاملہ، آبادی کو کنٹرول و محدود کرنے والا بہبود آبادی کا پروگرام ہو یا میرا تھن ریس، بسنت اور ویلنٹائن ڈے کا معاملہ، اسلامی نظریاتی کونسل کی خلافِ اسلام سفارشات ہوں یا اسمبلی کے اندر خلافِ شریعت ہونے والی قانون سازی۔ ہر جگہ ان لبرل عناصر کی قوم نے گرفت کی۔ عورت کے خلاف تشدد، گینگ ریپ، وٹے سٹے کی شادی، وٹی، سورا، قرآن سے شادی، عورتوں کے ساتھ دیگر مظالم، عورت کو وراثت نہ دینے کا مسئلہ ہو یا تعلیم نسواں کا معاملہ۔ ہر جگہ قوم کے بھی خواہوں اور نظریہ پاکستان کے حامیوں نے بے دینوں اور روشن خیال اعتدال پسندوں کا راستہ روکنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

مگر بے بسی اور مجبوری اس وقت سامنے آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دشمن کے پاس وسائل بھی زیادہ ہیں۔ عسکری قوت بھی ہے ٹیکنالوجی اور میڈیا کی قوت بھی اس کے پاس ہے۔ وہ ہمارے حکمرانوں کے ذریعے ہماری تعلیم کو بھی کنٹرول کر رہا ہے اور ہمارے میڈیا کو بھی۔ لالچ اور دھمکی، ”سٹک اینڈ کیرٹ“ کی پالیسی کے ذریعے وہ ہمارے دیندار اور شریعت کا مقابلہ کرنے والے مجاہدین کا ناطقہ بند کر رہا ہے۔ تمام مسلم ممالک کو یکے بعد دیگرے نشانہ بنانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ ہم پر ڈرون حملے کرتا ہے۔ کیری لوگر بل ہم پر مسلط کرتا ہے۔ قرضوں کے جال میں

ہمیں جکڑتا ہے۔ تاکہ ہم خاموش ہو جائیں۔ اب تو حد ہو گئی۔ این۔ جی۔ اوز جو ہمارے خزانے سے باقاعدہ حصہ وصول کرتی ہیں اور ہمارے لوگوں کو اقوام متحدہ کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اپنا جسم فروخت کرنے والوں کو ”سیکس ورکر“ قرار دیتی ہیں۔ ہمارے ملک میں ان سیکس ورکرز کو محفوظ حرام کاری کی باقاعدہ تربیت دیتی ہیں۔

11- مغرب میں بھی اسلام کے خلاف پابندیاں زیادہ سے زیادہ لگائی جا رہی ہیں مگر اللہ کے فضل سے وہاں لوگوں کے اسلام قبول کرنے کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ نیز ترکی میں بھی ”رجوع الی الدین“ کی رفتار الحمد للہ پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اب ترکی کے مذہبی اداروں میں پڑھنے والی طالبات کے لیے سکارف پر پابندی ختم کر دی گئی ہے۔ [۱] انہوں نے 2020ء میں اپنے ”آیا صوفیہ“ نامی میوزیم کو باقاعدہ مسجد بنالیا ہے۔

چھوٹے سے مسلم ملک برونائی میں نئے شرعی قانون نافذ ہوئے ہیں: ”ہم جنس پرستوں اور زانیوں کو سنگسار کیا جائے گا۔ برونائی کی چھوٹی سی اسلامی ریاست میں..... چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ قوانین مسلم اور غیر مسلموں پر یکساں لاگو ہوں گے۔ بی۔ بی۔ سی کی رپورٹ کے مطابق ہم جنس پرستی اور زنا کے مرتکب افراد کے لیے سنگساری کی سزا دی جائے گی اور چوری کرنے والوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے اور یہ قانون غیر مسلم پر بھی مسلمانوں کی طرح ہی لاگو ہوگا۔“ [۲]

لیبیا کے صدر قذافی نے دو سوا طالوی حسیناؤں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، ان خواتین کا انتخاب اشتہار دے کر کیا گیا۔

کرنل معمر قذافی نے اٹلی کے دو سو سے زائد خواتین کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے عجیب طریقہ نکالا، طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ معمر قذافی اقوام متحدہ کی فوڈ کانفرنس میں شرکت کے لیے اٹلی آئے تھے اس دوران مذکورہ خواتین کا انتخاب باقاعدہ اشتہار کے ذریعے کیا گیا، جس میں پُرکشش ہونے کے ساتھ عمر 16 سے 35 سال تک اور قد پانچ فٹ سات انچ کی شرائط رکھی گئی

[۱] روزنامہ جنگ مورخہ 29 نومبر 2012ء

[۲] روزنامہ نوائے وقت یکم مئی 2014ء

تھیں، خواتین کے لیے منی سکرٹ اور کھلے گلے کی شرٹ پہننے کی ممانعت تھی۔ خواتین کو سخت سکیورٹی میں سفارت خانے پہنچایا گیا، جہاں آخری وقت تک وہ اپنے میزبان کے بارے میں بے خبر تھیں۔ پھر معمر قذافی نے خواتین کو اسلام اور اسلام میں خواتین کے مقام کے بارے میں طویل لیکچر دے کر حیران کر دیا۔ یہ سب دیکھ کر خواتین حیران رہ گئیں، تقریب کے اختتام پر ہر خاتون کو پچاس یورو اور قرآن پاک کا نسخہ اور ایک کتاب How to be a Muslim دی گئی۔ بہر حال ہم امید کر سکتے ہیں کہ ان میں سے کچھ نہ کچھ عورتوں نے ضرور اسلام کے بارے میں سوچا ہوگا بلکہ ہو سکتا ہے اسلام قبول بھی کر لیں۔ تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ عالمی سطح پر ایسے فکر انگیز پروگرام ہوتے رہنے چاہئیں، اس سے اسلام پھیلانے والوں کو ثواب اور قبول کرنے والوں کو بھی ثواب۔^[۱]

سوئٹزرلینڈ نے اسلام کی تبلیغ پر پابندی ختم کر دی:

”مساجد تعمیر کرنے کی اجازت دے دی“ نوائے وقت (ٹھانیوز) آبزور آف اسلامک کنٹریز کے ترجمان ”فیض محمد“ نے برسلز میں میڈیا کو بتایا کہ سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے اسلام کی تبلیغ پر پابندی ختم کرنے اور مساجد کی تعمیر کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ بعد میں میناروں کی تعمیر کی بھی اجازت دے دی گئی۔ سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے یہ فیصلہ عالمی مسلم تنظیموں اور مسلم ممالک سے طویل صلاح مشورے کے بعد کیا۔^[۲]

مغرب کے مقابلہ حسن کے جواب میں سعودی عرب میں منعقد ہونے والا باپردہ مقابلہ حسن:

”سعودی عرب میں باپردہ مقابلہ حسن 18 سالہ طالبہ نے جیت لیا۔“ 74 ملکوں نے مقابلہ میں حصہ لیا اور نقاب نہیں اتارے۔ ”والدین، خاندان اور معاشرے کی خدمت“ معیار

[۱] کالم سر راہے نوائے وقت مورخہ 20 نومبر 2009ء

[۲] روزنامہ نوائے وقت مورخہ 5 فروری 2010ء

میں شامل تھے۔ جیتنے والی کو پانچ ہزار ریال، ہیرے کی گھڑی، ہیرے کا نیکلس، ملائیشیا کا ٹکٹ دیا گیا اور ”خوبصورت اخلاق کی ملکہ“ کا خطاب دیا گیا۔ مقابلہ میں ظاہری حسن کے بجائے اندرونی خوبصورتی (سیرت سازی) کو معیار قرار دیا گیا تھا۔^[۱]

یہ خبر دینے کے ساتھ وہ لکھتی ہیں ”اچھا مقابلہ کروایا ہے سعودی عرب نے۔ ہم مشورہ دیتے ہیں اہل وطن کو کہ وہ بھی اس قسم کے مقابلہ حسن سیرت کی داغ بیل ڈالیں۔ جس میں باپردہ ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کا مطالعہ بھی لازمی قرار دیا جائے..... تاکہ کالج، یونیورسٹی کی بگڑی ہوئی طالبات اس مقابلے کے ذریعے سیرت سازی کرنے کو تیار ہو جائیں۔ چلیے فی الحال فکر آخرت نہ سہی، انعام اور خطاب ہی ان کو متحرک کر دے..... کہ اس وقت میڈیا، موبائل اور کمپیوٹر نے صورت حال بڑی مخدوش کر دی ہے۔“^[۲]

حجاب کا نفرنس:

دنیا بھر میں حجاب اور نقاب کے بارے میں بڑھتی ہوئی نفرت کے پیش نظر مسلمان علماء اور دانشوروں کی ایک کانفرنس ممتاز عالم دین علامہ یوسف قرضاوی کی صدارت میں لندن میں جولائی 2004ء کو منعقد ہوئی۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہر سال 4 ستمبر کو ”عالمی یوم حجاب“ کے طور پر منایا جائے گا اور اس دن غیر مسلموں کو حجاب و پردے کے بارے میں آگاہ کیا کریں گے۔ پوسٹرز، بینرز، مضامین وغیرہ سے اس کی حکمتوں کو اجاگر کیا جائے گا اور عالمی سطح پر اس کے خلاف نفرت کو ختم کرانے کی کوشش کی جائے گی..... اور اب یہ ”حجاب ڈے“ ہر سال 4 ستمبر کو اپنے اپنے ممالک میں دینی تحریکیں مناتی ہیں۔

پاکستان میں ایک اسلامی این۔ جی۔ او کی بھرپور مزاحمت:

اگرچہ بے شمار دینی تنظیمیں اس وقت خواتین کے حوالے سے معاشرے میں کام کر رہی ہیں۔ مگر جدید لبرل این۔ جی۔ او کو انہی کے انداز میں، ان کے ہر میدان میں، جس تنظیم نے

[۱] کالم ”چلتے چلتے“ از فرزانہ چیمہ، ماہنامہ بحمن جول، اکتوبر 2009ء، ص: 47

[۲] ایضاً

سب سے پہلے ان کو کما حقہ جواب دینے کی کوشش کی ہے اور پورے نظم و ضبط کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا ہے۔ وہ جماعت اسلامی، حلقہ خواتین کا ایک شعبہ ”وومن اینڈ فیملی کمیشن“ ہے۔ جس نے خواتین کے موضوع پر ان کا جاندار مقابلہ کیا، میڈیا میں، سینیٹ اور اسمبلی میں، تعلیم کے میدان میں، خاندان کے استحکام میں، متاثرہ خواتین کو قانونی امداد دینے میں، طب و صحت کے شعبہ میں، قیدی خواتین کی اصلاح و بہتری میں، غرض ہر شعبہ میں ان این۔ جی۔ اوز کا بھرپور مقابلہ کیا اور ان کے اثر و نفوذ کو ممکن حد تک کم کیا ہے۔

چنانچہ حلقہ خواتین جماعت اسلامی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پاکستان کی پہلی سیاسی اور دینی جماعت ہے۔ جس نے خواتین کے حقوق پر مبنی چارٹر عوام کے سامنے پیش کیا اور جماعت اسلامی کا ویمن کمیشن تشکیل دیا۔ 1998ء میں فیصل مسجد اسلام آباد کے سایے تلے خواتین کانفرنس میں محترم امیر جماعت قاضی حسین احمد نے خواتین کے حقوق کے چارٹر پر کلیدی خطاب کیا۔ مسلمان خواتین کے قانونی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی حقوق پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور معاشرتی رسموں کے طوق سے بھی نجات دلانے کا پروگرام دیا۔ پھر 2000ء میں قرطبہ (راولپنڈی) کی خواتین کانفرنس میں ویمن کمیشن کی کونسل کا باقاعدہ اعلان کیا گیا مگر بعد میں اس کا نام ”وومن اینڈ فیملی کمیشن“ رکھ دیا گیا۔

اس سے قبل 1994ء میں حلقہ خواتین جماعت اسلامی نے اپنی ایک این۔ جی۔ او ”وومن ایڈ ٹرسٹ“ Women Aid Trust کے نام سے قائم کی تھی۔ جس کا ہیڈ آفس کراچی میں تھا۔ مقصد متاثرہ خواتین کو قانونی امداد مہیا کرنا اور جیل میں قیدی خواتین کی فلاح و بہبود تھا اور ایک ریسرچ سیل بھی قائم کیا گیا تھا۔ انہوں نے ایک شعبہ ملازمت پیشہ خواتین کا بھی قائم کیا تاکہ وہ ان خواتین کے حقوق کا تحفظ کر سکیں اور اس کے ساتھ بے شمار الگ شعبے بھی قائم کیے۔

وومن اینڈ فیملی کمیشن کی 2004ء کی ایک خواتین کانفرنس کا موضوع تھا۔ ”ہماری بقا مضبوط خاندان“ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان جیسے نظریاتی معاشرے میں مسلم خاندان کی اہمیت بحال کرنا وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ خاندان کو درپیش خطرات کا صحیح حل دینے سے ہی فلاح معاشرہ کا ہدف حاصل کیا جاسکتا ہے۔ انہی اہداف کے پیش نظر لاہور میں ”فلاح خاندان

سنٹر“ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ 10 جون 2005ء میں اس کی افتتاحی تقریب ہوئی۔ ”انسٹیٹیوٹ آف فیملی سٹڈیز“ کے قیام کا اعلان بھی کیا گیا۔ ویمن سٹڈیز، خاندان اور تربیتِ اولاد اور شعبہ تحقیق خصوصی شعبے قرار دیئے گئے۔^[i]

خواتین کے موضوع پر قرآن و سنت کی روشنی میں وومن اینڈ فیملی کمیشن نے لیکچرز اور سیمینار کا وقتاً فوقتاً اہتمام کروایا۔ اب تک 100 کے قریب ان موضوعات پر کتابچے تیار کروائے۔ وہ مختلف ٹاک شوز میں اور پریس کانفرنس میں شرکت کرتی ہیں۔ ان کی تمام سرگرمیوں کا مقصد یہی ہے کہ وہ عوام کو یہ شعور دے سکیں کہ ”مسلم اور پاکستانی خواتین کی فلاح و بہبود کا راز صرف اسلامی نظامِ حیات کو اختیار کرنے میں پنہاں ہے۔“

اس کمیشن کا پیغام یہ ہے کہ اسلامی تہذیب میں آئیڈیل خواتین کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم ان کا کردار نئی نسل کے سامنے پیش تو کریں۔ گھر ہی عورت کے لیے محفوظ ترین مقام ہے اور آج بھی پاکستانی عورت مغربی عورت کے مقابلے میں بدرجہا اچھے حال میں ہے۔ مثلاً آپ پہلی مسلم خاتون حضرت خدیجہؓ کا ہی رول ماڈل سامنے رکھ لیں۔ ان سے زیادہ محترم اور ان سے زیادہ کامیاب عورت اس دنیا میں اور کون ہو سکتی ہے؟

یہ این۔ جی۔ او مسلم خواتین کی عالمی کانفرنسوں میں بھی شامل ہوتی ہے بلکہ آجکل (یعنی 2015ء سے تاحال) ڈاکٹر سمیجہ راحیل قاضی انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین کی (چیئر پرسن) ہیں اور پاکستان ہی سے ڈاکٹر کوثر فردوس اس کی صدر ہیں۔ اسی طرح یہ خواتین یو۔ این۔ او کی خواتین کانفرنسوں میں بھی باقاعدگی سے شامل ہوتی ہیں۔ ان کے منصوبوں اور پروگراموں پر گہری نظر رکھتی ہیں اور اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کے اسلام مخالف پراپیگنڈے کا جواب دینے کی بھی بھرپور کوشش کرتی ہیں۔

کمیشن کی دیندار خواتین کی جدوجہد ہر میدان میں:

آج ہر شعبے میں اسلام کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد میں

[i] تلخیص ”ڈاکٹر سمیجہ راحیل قاضی کی مرتب کردہ رپورٹ ”ویمن اینڈ فیملی کمیشن جماعتِ اسلامی“

مصرف خواتین کسی بھی شعبہ زندگی کو دشمن کے لیے خالی نہیں چھوڑنا چاہتیں۔ وہ پورے عزم کے ساتھ ہر چیلنج کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ اسمبلیوں میں عورت کی 17% نمائندگی کو غلط سمجھنے کے باوجود انہوں نے یہ میدان بھی خالی نہ چھوڑا۔ 2002ء کے انتخابات میں قومی اور صوبائی اسمبلی میں خواتین کی 60 سیٹیں تھیں۔ ان میں سے 13 نشستیں متحدہ مجلس عمل کی خواتین کے حصے میں آئی تھیں۔ اسی طرح 13 قومی اسمبلی میں اور 20 صوبائی اسمبلیوں میں اور 4 خواتین سینیٹ میں بھی تھیں۔ ان خواتین نے بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ بلکہ قومی اسمبلی کے اندر ان خواتین کے جاندار کردار نے دنیا کو حیران کر دیا۔ انہوں نے ہر مسئلہ پر بحث میں حصہ لیا۔ پنجاب بورڈ کی کتب میں قائد اعظم کے بجائے پرویز مشرف اور پرویز الہی کے پیغامات پر خوب احتجاج کیا۔ ہر اہم ایشو پر اپنی قراردادیں جمع کروائیں۔ تعلیمی کمیٹی ہو یا سوشل ویلفیئر کمیٹی، پاپولیشن ویلفیئر کمیٹی ہو، یا خواتین کے مسائل۔ ہر ایک ایشو پر خوب تیاری کے ساتھ اسمبلی میں بیٹھتیں، اس طرح ان کی سیاسی عمل میں شرکت بڑی جاندار رہی۔ جس کا اعتراف بر ملا کیا گیا۔ مثلاً ”عورت فاؤنڈیشن“ اور ”پتن آرگنائزیشن“ نے خواتین ارکان قومی اسمبلی کی 2002ء تا 2007ء کی پانچ سالہ اسمبلی کارکردگی پر اپنی رپورٹس شائع کیں۔ ان رپورٹس کے مطابق جماعت اسلامی کی 6 میں سے 5 خواتین پہلی 20 خواتین میں منتخب ہوئی تھیں۔ اگرچہ ان دونوں تنظیموں کے اپنے اپنے اعداد و شمار میں زمین آسمان کا تفاوت ہے، جو ان کی ثقافت پر اثر انداز ہو رہا ہے، تاہم ان دونوں نے قانون سازی میں سمجھ را حیل قاضی کو اول نمبر پر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ محترمہ عنایت بیگم، محترمہ عائشہ منور، محترمہ بلقیس سیف اور محترمہ جمیلہ احمد کو پہلی 25 خواتین میں شامل کیا گیا ہے۔ جماعت اسلامی کی ان کارکنان نے اپنی کامیابی کو جماعت اسلامی کی تربیت کا مرہون منت قرار دیا ہے۔^[۱]

وومن اینڈ فیملی کمیشن کا تجزیہ:

1990ء سے پہلے سیاست میں یہ تصور بھی محال تھا کہ کوئی خاتون اسمبلی میں سر ڈھانپ کر

[۱] ویمن اینڈ فیملی کمیشن کا نیوز لیٹر ”روشنی“ شمارہ نمبر 9، ص: 17

بیٹھے۔ مگر جب ایم۔ ایم۔ اے سمیت دیگر باپردہ خواتین کو 33% اور 17% والے فارمولے کے تحت اسمبلی میں بیٹھنا پڑا تو 13 باپردہ خواتین کی بات ایوان میں بڑے وقار سے سنی گئی۔ یہ خواتین بڑے اعتماد سے پوری تیاری کر کے اسمبلی میں جاتی تھیں۔ تعلیم یافتہ اور مسائل کو سمجھنے والی خواتین کی اسمبلی میں خوب شنوائی ہوئی اور احترام ملا۔ تفصیل ملاحظہ کریں۔^[۱]

یہ درست ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے عورتوں کا اسمبلیوں میں جانا غلط ہے۔ عورتوں کی الگ کونسل ہونی چاہیے جو خواتین کے مسائل سے متعلق ذمہ داران کو مشورہ دے سکے۔ مگر جب لازماً 17% سیاسی نمائندگی کا حکمرانوں نے حکم دے دیا تو پھر ایم۔ ایم۔ اے کی خواتین نے چیلنج سمجھ کر اسمبلی میں قدم رکھا اور وہاں جا کر ہر مسئلہ بڑے اعتماد سے دینی پس منظر میں پیش کیا۔ مثلاً محترمہ عائشہ منور صاحبہ اسمبلی والے گروپ کے سیاسی سیل کی انچارج تھیں۔ محترمہ سمیجہ راجیل قاضی ایم۔ این۔ اے جو 1995ء سے (بیجنگ کانفرنس کے انعقاد سے لے کر) اب تک بڑے اعتماد سے وومن ایشوز پر بات کرتی ہیں خواتین کے مسائل کے حوالے سے بہت سی عالمی سطح کی کانفرنسوں میں شرکت کر کے وہاں اسلامی نکتہ نظر کی وکالت کرتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ ”IMWU“ (انٹرنیشنل مسلم وومن یونین) کی سی۔ ٹی ممبر ہیں۔ اس طرح سینیٹر ڈاکٹر کوثر فردوس کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے صوبہ سرحد جماعت اسلامی کی قیہ حلقہ خواتین صوبہ سرحد ہونے کی حیثیت سے ”IMWU“ کی دوسری عالمی کانفرنس 14 اکتوبر 2003ء میں صوبہ سرحد میں کرویائی تھی۔ پھر 2008ء میں حلقہ خواتین کی ایک بہت بڑی کانفرنس کرویائی۔ جس میں بیرون ملک سے پندرہ خواتین شامل ہوئی تھیں۔ اسی طرح ایک اور متحرک خاتون محترمہ عافیہ سرور صاحبہ ہیں، جو پانچ سال تک ”وومن اینڈ فیملی کمیشن“ کی نگران رہی ہیں۔ آجکل (یعنی 2016ء میں) اس کمیشن کی نگران محترمہ ڈاکٹر رخسانہ جبین ہیں۔ یہ تمام خواتین عورت کے لیے مؤثر قانون سازی کے عمل میں سرگرم اور کوشاں ہیں۔ غیر ملکی این۔ جی۔ اوز کی چالوں کا ادراک رکھتی ہیں، ان کا جواب دیتی ہیں، ان کی سرگرمیوں کو بے نقاب کر کے ان کو ناکام بنانے کی سعی و جہد میں مصروف رہتی ہیں۔ ان کا

[۱] 12 متحدہ مجلس عمل، 1 پیپلز پارٹی، 1 ایم کیو ایم، 1 مسلم لیگ ن، کل 15 نقاب والی خواتین

نقطہ نظریہ ہے کہ ہماری حکومتیں تو قرضے کی زنجیروں کی وجہ سے ان کے ظالمانہ ایجنڈے کو اپنے ہاں لاگو کرنے سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتیں تو پھر ہم اپنی بساط کے مطابق، اپنے قلیل وسائل کے ساتھ، جہاں تک ہو سکا اپنی جدوجہد میں مصروف رہیں گے۔ نتائج اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

عورت اور خاندان:

وومن اینڈ فیملی کمیشن کی نگران محترمہ عافیہ سرور صاحبہ نے بتایا کہ اہل مغرب عورت کو خاندان سے تنہا کر کے عورت کی ذاتی حیثیت کو منوانا چاہتے ہیں۔ مگر ہم اسے خاندان سے جوڑ کر اس کے مسائل حل کر دانا چاہتے ہیں۔ کیا عورت بچے کے بغیر، خاوند کے بغیر، خاندان کے بغیر محفوظ اور طاقتور ہو سکتی ہے؟ عورت طاقتور صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب وہ اپنے بچوں سمیت گھر میں بیٹھی ہو۔ باہر کے کام مرد انجام دے رہے ہوں، گھر والوں کے لیے کما رہے ہوں اور عورت گھر بیٹھے اپنے گھر کے تمام امور انجام دے رہی ہو۔ مثلاً شوہر کی خدمت، بیماروں کی خدمت، بچوں کی تربیت، مہمانوں کی خاطر تواضع وغیرہ۔ لہذا ہم نے اپنے کمیشن کا نام ”وومن اینڈ فیملی کمیشن“ رکھا ہے۔ عورت کو خاندان سے الگ رکھ کر اس کو طاقتور بنانے کی بات کرنا تو دنیا کا سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ اگر وہ گھر کا کام بھی سنبھالے۔ اپنے لیے اور بچوں کے لیے کمائے بھی اور ہر وقت اپنے حسن و آرائش پر بھی بے تحاشا پیسہ خرچ کرے۔ پھر تو وہ دنیا کی کمزور ترین اور غیر محفوظ ترین عورت ہوئی۔

پھر کمانے کے جو انداز مغرب سکھا رہا ہے وہ بھی تو ذرا دیکھیں۔ ”سیکس ورکر“ بن کر کمانا، طوائف بن کر جسم فروشی کرنا، اور پھر اس کو قانون کے ذریعے سے کمائی کا جائز ذریعہ منوانا۔ شاید اسی لیے مغرب کی طالبات کو جسم فروشی کر کے اپنی پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے پڑتے ہیں۔

وومن اینڈ فیملی کمیشن کے اہداف:

1- خواتین کو اسلام کے اصل دیئے ہوئے حقوق دلانے کی پوری کوشش کرنا۔

2- غیر اسلامی ہندوانہ رسوم و رواج جن کو جہالت کی بنا پر اسلام سے نتھی کر دیا جاتا ہے ان سے عورت کو نجات دلانا۔

3- CEDAW کے اسلام کے خلاف ایجنڈے کا مقابلہ کرنا۔

4- مسلم ممالک کی خواتین میں اسلامی تعلیم کو اور اسلامی شعور عام کر کے اپنے اسلامی منشور کو غالب کروانا اور ان کی جارحانہ یلغار کا بھرپور مقابلہ کرنا۔

اسی مقصد کے حصول کے لیے دیگر مسلم ممالک کی نمائندہ خواتین کے ساتھ مل کر وومن اینڈ فیملی کمیشن نے ”عالمی مسلم خواتین یونین“ قائم کی تھی۔ ساتھ ساتھ اپنے اپنے ملک میں بھی عالمی یوم خواتین کو پروقار طریقے سے مناتی ہیں اور اپنی مسلمان بہنوں کو استعماری ایجنڈوں سے آگاہ کرتی ہیں اور پھر اس کے مقابلے میں ان کو اپنے اسلاف سے جوڑنے اور اپنی تاریخ کی نامور خواتین کے کارہائے نمایاں کو دنیا کے سامنے لانے کے لیے نئے انداز سے متعارف کرواتی ہیں۔ اسی طرح عالمی یوم حجاب 4 ستمبر کو منانا اور پردے کے بارے میں حیا و حجاب کے شعور کو عام کرنا یا عالمی خواتین دن کے موقع پر باہمی مشاورت سے منصوبہ بندی کرتی ہیں اور باوقار انداز میں ان کے استعماری ایجنڈوں کا جواب بھی دیتی ہیں۔

اور بھی بہت سے کام مثلاً تعلیم، ریسرچ، قانونی امداد، بے سہارا خواتین کی مدد، صالح خاندان کی تعمیر کی غرض سے مناسب رشتے ناطے کروانا۔ قدرتی آفات کے دنوں میں متاثرہ علاقوں مثلاً سوات، فائٹا وغیرہ بلکہ ہر ضرورت کے موقع پر الجذمت کی ٹیم لے کر پہنچ جانا۔ ڈاکٹرز اور نرسوں کا باقاعدہ وہاں کیمپ لگا کر ڈیوٹیاں دینا وغیرہ۔

اس طرح عالمی یوم حجاب کے موقع پر تمام روزناموں اور ماہناموں کو پردے اور حجاب کے حق میں لکھنے کے لیے انہوں نے اپیل کی۔ بے شمار سٹیکرز تیار کروائے۔ پیغام یہ تھا ”کہ عورت کے وقار اور تحفظ کا اہتمام صرف پردہ ہی کے ذریعے ممکن ہے۔“ اس طرح سب موقعوں پر اپنی خدمات سرانجام دیتی ہیں۔

جولائی 2009ء میں جب کراچی میں سیکس ورکرز کی ورکشاپ منعقد ہوئی تو اس کے بارے میں تمام دینی تحریکوں نے اور ویمن کمیشن نے فوراً نوٹس لیا۔ کراچی میں اس کے خلاف مظاہرے ہوئے، ریلیاں ہوئیں۔ اخبارات میں لکھا گیا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب کو اور اخبارات کو خطوط لکھے گئے۔

- ☆ اپنے ملک میں مرکزی اور صوبائی سطح پر انتخابات میں بھی حصہ لے کر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ جس کو دشمنوں نے بھی خوب سراہا۔
- ☆ انہوں نے تقریباً 100 کے قریب ”دومن کمیشن“ کی طرف سے عورت کے موضوع سے متعلق ہر حساس موضوع پر کتابچے شائع کروائے ہیں۔
- ☆ اپنے ملک میں مختلف این۔ جی۔ اوز کے پروگراموں میں شرکت کرتی رہی ہیں۔
- ☆ اپنے 75 نمائندے میڈیا ٹریننگ پروگرام کے ذریعے تیار کیے گئے تاکہ رائج الوقت میڈیا پروگراموں سے نمٹا جاسکے (کیونکہ دوسری این۔ جی۔ اوز کی خواتین، جو عموماً مردوں سے بھی زیادہ بے باک ہوتی ہیں) سے اردو، انگریزی، عربی میں رواں گفتگو کر کے ان سے اپنا نکتہ نظر منوایا جاسکے اور ٹی۔ وی ٹاک شوز میں ان کا مقابلہ کیا جاسکے۔ دوسری طرف سپریم کورٹ میں انہوں نے میڈیا کی بے لگام آزادی کے خلاف ریٹ دائر کی۔ ساتھ ہی کمیشن نے اپنی بھرپور معاونت کی بھی پیشکش کی تھی۔
- اسی طرح ایک اور تنظیم ان مغربی اقدامات کا مقابلہ کر رہی ہے۔ جس کا نام ”الہدیٰ انٹرنیشنل“ ہے۔ الہدیٰ انٹرنیشنل کا آغاز ڈاکٹر فرحت ہاشمی صاحبہ نے 1994ء میں کیا تھا۔ ان کے ادارے کا بنیادی مقصد خواتین کو قرآن کی تعلیم دینا ہے۔ اس میں کم پڑھی لکھی گھریلو خواتین کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کو خصوصی کورسز کے ذریعہ دین سے جوڑا جاتا ہے۔ تعلیم القرآن اور فہم القرآن، تعلیم الحدیث کورس کے ساتھ، مختصر تشریح کے ساتھ سالانہ دورہ قرآن جو رمضان میں کروایا جاتا ہے، معاشرے میں کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ 2010ء سے اسلام آباد میں الہدیٰ انٹرنیشنل سکول کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ تعلیمی خدمات کے علاوہ سماجی خدمات میں تعلیمی وظائف، میرج بیورو اور رمضان میں راشن پیکیج وغیرہ شامل ہیں۔
- الہدیٰ پبلیکیشنز اور الہدیٰ کے یوٹیوب چینلز کے ذریعہ بھی بہت سی طالبات اور خواتین دینی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ اس ادارے نے دین کے فروغ کے لیے اور معاشرے سے

جہالت کو دور کرنے کے لیے خواتین پر خصوصی محنت کی ہے۔ اس غرض کے لیے الہدی انٹرنیشنل جدید ذرائع ابلاغ سے پوری طرح کام لے کر، اپنی دعوت، وطن عزیز اور پھر دنیا بھر میں جگہ جگہ وسیع کرتا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ خواتین کی جہالت کو دور کرنے کے لیے پاکستان میں جگہ جگہ دینی تنظیمیں قرآن و حدیث، تفسیر قرآن پاک، عربی گرامر پڑھانے والے مدارس کھول رہی ہیں تاکہ سب اپنی اپنی جگہ ان مغرب زدہ خواتین کی اسلام دشمن سازشوں سے محفوظ رہ سکیں۔ مثلاً تنظیم اساتذہ (خواتین) پاکستان بھی شعبہ تعلیم کی اصلاح کے لیے اپنی بھرپور کوششوں میں مصروف ہے۔ پھر مدرسہ تدریس القرآن والحدیث للبنات لاہور اور اس طرح کے دیگر بے شمار ادارے اسی کام میں دن رات مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری ان درسگاہوں کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔ بہر حال ان مدارس کو دشمن کی سازشوں کا اصل جواب سمجھا جاسکتا ہے۔ ایک دینی تنظیم انور بھی اسی طرح تبلیغ دین میں مصروف ہے۔

وطن عزیز میں دیگر دینی جماعتوں کی مزاحمت

اس طرح تمام دینی جماعتیں اپنے اپنے وسائل کے ساتھ اپنی اپنی جگہ، مغربی ایجنڈے کے زہریلے اثرات کو زائل کرنے کے لیے کام کر رہی ہیں۔ اخبارات و جرائد میں لکھا جاتا ہے۔ منبر و محراب کی قوت سے علماء و خطباء حضرات، صحافی و دانشور اپنے اپنے انداز میں اسلامی نظام معاشرت کے حق میں رائے عامہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اوّل تو ان کی کوششیں منظم نہیں، صرف اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی ہمت کے مطابق ہے۔ دوم میڈیا کے سرکاری و غیر سرکاری پروگراموں پر لبرل لوگوں کا قبضہ ہے۔ ان پروگراموں کی دلفریبی اور کشش کے آگے تو تمام مسلم جماعتوں اور تنظیموں کو منظم و متحد ہو کر بند باندھنے کی ضرورت ہے۔ الگ الگ کام کوئی مؤثر قوت نہیں بن پاتا تاہم ”ویمین اینڈ فیملی کمیشن“ تمام دینی و اسلامی تنظیموں کو اپنے پلیٹ فارم پر متحد کر کے دین دشمن قوتوں کے خلاف صف آرا ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور کئی بار انہوں نے اہم ملکی مسائل پر اپنے ہاں مختلف دینی جماعتوں کو ایجنڈے پر اکٹھا کرنے کے لیے چند گول میز کانفرنسیں بھی بلائی ہیں۔

مغرب کی ثقافتی یلغاروں کا مؤثر جواب خود اسلام کی روشن و تابندہ تعلیم ہے: مغرب میں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے لوگوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور حیرت ہے کہ جتنا یہ مغرب کا استحصالی طبقہ اور این۔ جی۔ اوز عورت کے موضوع پر اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ خود مغربی خواتین مغربی تہذیب سے بیزار ہیں اور اسلام کے عورت کے بارے میں پیش کیے گئے قرآن و سنت کے موقف کو پسند کرتی ہیں اور وہ بڑی سرعت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہی ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ یہ سب نو مسلم خواتین انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ڈاکٹری، انجینئرنگ، سائنس، معاشیات اور تعلیم کے شعبوں سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اسلام کے مختلف فضائل و برکات کو خود محسوس کیا۔ مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے ان کو اطمینان قلب عطا کیا۔ تو انہوں نے آگے بڑھ کر اسلام کے آبِ حیات کو تھام لیا۔ پھر

انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مکمل اسلام کو قبول کیا۔ حجاب اور ستر کے معاملہ میں بھی اسلامی احکام کی پوری پابندی کی ہے۔ یہ سب خواتین راسخ العقیدہ مسلمان اور باعمل ہیں۔ اللہ کی قدرت اور شان یہ ہے کہ مغربی آبرو باختہ تہذیب سے بیزار خواتین کو اسلام کے معاشرتی نظام، عورت کے مرتبہ و مقام اور خصوصاً ”حجاب“ ہی نے تو ان کو اپنی طرف کشاں کشاں متوجہ کیا ہے۔ انہوں نے دوسری بہنوں کو بھی دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اسی غرض سے کئی تنظیمیں بنائیں اور مل کر، منظم ہو کر اسلام کو فروغ دینے کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ ان میں سے کئی نو مسلم خواتین تو ہزاروں لوگوں کو مسلمان بنا رہی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ہم روایتی مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ قرآن و سنت کے پابند، رسم و رواج سے دور اور راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور جو پوری کوشش سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو بجالا رہی ہیں۔

مغرب کی ان نو مسلم خواتین کا کچھ تذکرہ آپ کو اسی کتاب کے آخر میں ملے گا۔ اب یہی خواتین اور ان کی جملہ مساعی مغرب کی مسلم ممالک پر ثقافتی یلغار کا بہترین جواب ہے۔ اس کی کامیاب مزاحمت ہے۔ ان نو مسلم خواتین کے پاس صالح لٹریچر کی بہت کمی ہے۔ ان کو جلد از جلد صالح لٹریچر پہنچایا جانا چاہیے۔ علاوہ ازیں ان کو قرآن و سنت کی زیادہ سے زیادہ تعلیم دینے کا بندوبست کرنا علماء اور حکمرانوں کے ذمے ہے۔

مغربی ممالک میں مسلمان خواتین کی مزاحمت:

امریکہ میں مسلم خواتین کی ایک تنظیم ”نیشنل ایسوسی ایشن آف مسلم امریکن وومن“ (N.A.M.A.W) ”ناما“ نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے باقاعدہ قانونی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس تنظیم نے امریکی محکمہ انصاف کے پاس جنوری 2007ء میں امریکی عربوں اور مسلمانوں کے خلاف صیہونی لابی کی حرکتوں پر مبنی ایک شکایت درج کرائی تھی کہ کئی امریکی شخصیات اور ادارے کیوں حکومتوں کو مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز اعداد و شمار دے رہے ہیں؟ اس طرح وہ مسلمانوں کو ان کے جائز آئینی و سیاسی حقوق سے دستبردار کروانے کی سازش کر رہے ہیں۔ لہذا ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔^[۱]

[۱] اخبار امت از رضی الدین سید ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن مارچ 2008ء، ص: 80

مسلم خواتین کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس

مسلم خواتین کو عالمی سطح پر منظم کرنے کی اولین کوشش محترمہ ثار فاطمہ نے کی تھی۔ ایم۔ این۔ اے آپا ثار فاطمہ مرحومہ کا نام اس ضمن میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انہیں صدر ضیاء الحق مرحوم کا بھرپور تعاون حاصل تھا، وہ خود ایم۔ این۔ اے بھی تھیں، انہوں نے وطن عزیز پاکستان میں خواتین کی بڑھتی ہوئی فیشن زدگی، شریعت سے دوری، عریانی اور دین بیزاری کو محسوس کرتے ہوئے بھرپور جدوجہد کی تھی۔ حکومت کے تعاون سے دسمبر 1983ء میں لاہور میں مسلمان خواتین کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی، جس میں سوڈان، مصر، ملائیشیا وغیرہ سے نامور دیندار نمائندہ خواتین نے شرکت کی۔

بعد ازاں وہ دنیا بھر کی مسلمان خواتین کے لیے ایک نمائندہ عالمی فورم تشکیل دینے کے لیے بھرپور کوشش کرتی رہیں۔ اس غرض سے سوڈان، مصر اور ملائیشیا کی خواتین سے مسلسل رابطے جاری رکھے۔

31 جولائی تا 3 اگست 1996ء میں سوڈان کے دارالخلافہ خرطوم میں خواتین کی ایک اور عالمی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ (یہ اس سلسلے کی دوسری کانفرنس تھی) خرطوم کی نمائندہ خواتین کا آپا ثار فاطمہ سے بارہ سالوں سے رابطہ تھا، اس دوران آپا ثار فاطمہ تو دارفانی سے کوچ کر گئیں، (انا للہ و انا الیہ راجعون) مگر سوڈانی خواتین انہی خطوط پر چل کر کچھ دیر بعد مسلم خواتین کا عالمی فورم قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔

خواتین کے اس عالمی فورم کا نام: ”اتحاد النساء العالمی للمرأة المسلمہ“ یا ”IMWU“ رکھا

گیا یعنی International Muslim Women Union

70 مسلم ممالک کی خواتین اس میں شامل تھیں۔ سوڈان کی محترمہ سعاد الفاتح اس کی جوائنٹ سیکرٹری تھیں، جبکہ ملائیشیا کی محترمہ شریفہ امینہ صاحبہ اس کی چیئر پرسن منتخب ہوئی تھیں۔

اس کا ہیڈ کوارٹر خرطوم میں ہے، اس فورم کا ہدف خواتین کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بیجنگ کانفرنس میں مسلمان عورت کی کوئی اجتماعی آواز نہیں ہے۔ خواتین کی فلاح و بہبود اور خصوصاً مسلمان عورت کے حقوق کا تحفظ اور شرف و مجد کی قدر صرف دامن اسلام میں پناہ لینے میں ہے۔

IMWU اس وقت دنیا کے ساٹھ ممالک میں تنظیمی طور پر کام کر رہی ہے۔ کام کے لحاظ سے اس کے گیارہ شعبہ جات ہیں۔ 28 ممالک میں بورڈ آف ٹرسٹیز کام کر رہی ہیں۔ بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبر (بی۔ ٹی ممبرز) سوڈان، ملائیشیا، جرمنی، تھائی لینڈ، مصر، انڈونیشیا، ایران اور پاکستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ پاکستان میں محترمہ سمیہ راحیل قاضی ایم۔ این۔ اے اور شمیم شال چیئر پرسن کشمیر وومن فورم بی۔ ٹی ممبر تھیں۔ جبکہ سینئر ڈاکٹر کوثر فردوس ساؤتھ ایشین ریجن کی اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل (اے۔ ایس۔ جی) ہیں۔^[1]

امو کا پہلا عالمی سطح کا پروگرام 1996ء میں سوڈان کے دارالخلافہ خرطوم میں ہوا تھا جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔ اب دوسری اور تیسری عالمی خواتین کانفرنس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین (IMWU) کی ایک روزہ عالمی کانفرنس 2003ء: 14 اکتوبر 2003ء کو نشتر ہال پشاور (پاکستان) میں انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین کی منفرد عالمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس سے قبل یکم اکتوبر سے اس کے مختلف اجلاس اسلام آباد میں ہوتے رہے تھے۔ مگر اصل ایک روزہ عالمی کانفرنس پشاور میں 14 اکتوبر کو ہوئی، جس کی میزبانی صوبہ سرحد کے وزیر بہبودی خواتین حافظ حشمت خاں نے کی جبکہ اس کانفرنس کے خصوصی مہمان صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ اکرم خاں درانی تھے۔

پاکستان کی 56 سالہ تاریخ میں اس نوعیت کی پہلی اور منفرد مسلم خواتین کانفرنس کی صدارت ایرانی پارلیمنٹ کے سپیکر کی اہلیہ فاطمہ کروبی نے کی۔ اس موقع پر 40 اسلامی ممالک کے 60 مندوبین نے شرکت کی۔ دنیا کے ہر کونے سے آنے والی مختلف زبانوں، نسلوں اور رنگوں

[1] ہفت روزہ ”ایشیا“ 22 اکتوبر 2003ء، ص: 27، مضمون: انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین کا ایک تعارف

سے تعلق رکھنے والی مسلم خواتین کے دل آپس میں اسلام کے رشتہ اخوت و الفت کی بنا پر جڑے ہوئے تھے۔ وہ عالم کفر کے طغی اور بے حیا نسوانی ایجنڈے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کا صالح اور روح پرور حقوق نسواں کا محافظ پروگرام پوری دنیا تک پہنچانے کے لیے جمع ہوئی تھیں۔ اس کانفرنس کے انعقاد میں صوبہ سرحد کی حکومت، متحدہ مجلس عمل کی خواتین ارکان پارلیمنٹ، سینیٹر ڈاکٹر کوثر فردوس، ممبران قومی اسمبلی، ممبران صوبائی اسمبلی، جماعت اسلامی حلقہ خواتین اور کارکنان متحدہ مجلس عمل کی شب و روز کی مساعی شامل تھیں۔ کانفرنس کا آغاز 11:45 پر تلاوت کلام پاک اور ترجمے سے ہوا۔ اس کے بعد اموو (IMWU) کی ایشین ریجن کی ڈپٹی سیکرٹری جنرل اور جماعت اسلامی پاکستان حلقہ خواتین کی سیکرٹری جنرل سینیٹر ڈاکٹر کوثر فردوس نے اپنے افتتاحی خطاب میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد بیان کیے نیز خواتین کے مسائل پر مدلل انداز میں گفتگو کی۔ ملائیشیا کی نمائندہ بہن از لین (Azlin) نے تمام شریک بہنوں کو جنت کے راستے کا انتخاب کرنے کے لیے قرآن و سنت سے جڑے رہنے کی ترغیب دی۔ انڈونیشیا کی ڈاکٹر توتی علویہ نے مسلمانوں کے خاندانی نظام کو قرآن و سنت کے ذریعے مستحکم بنانے کی تلقین کی۔ جرمنی کی نمائندہ صوفیہ نے پاکستانی بہنوں کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کی پیروی کی اہمیت بیان کی۔ پاکستان کی میزبان مقررہ ڈاکٹر کوثر فردوس نے اپنے خطاب میں توجہ دلائی کہ باطل کی موجودہ یلغار سے خود کو محفوظ رکھنے کا راستہ یہی ہے کہ اس کا بھرپور مقابلہ کیا جائے۔ گوشہ نشینی سے تو عالم کفر کو مزید شہ ملے گی۔ مسلم حکمرانوں کو بھی اس وقت باطل کی سازش کو سمجھ کر اس کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ ممبر قومی اسمبلی سمیجہ راحیل قاضی صاحبہ نے ماں کے کردار کی اہمیت پر روشنی ڈالی تاکہ وہ صالح نسل تیار کرنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔ وزیر اعلیٰ سرحد نے اس کانفرنس میں شریک مندوبین کو خوش آمدید کہا اور زبردست انداز میں ان کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا۔ آخر میں کانفرنس کی میزبان سینیٹر ڈاکٹر کوثر فردوس نے ”اعلانِ پشاور“ کے تحت کانفرنس کا اعلامیہ پیش کیا کہ

- 1- اسلام امن و آشتی کا دین ہے۔ اس نے خواتین کو وہ احترام دیا جو اپنی مثال آپ ہے۔
- 2- یو۔ این۔ او کی انسانی حقوق کی تمام دستاویزات ہر مذہب اور عقیدے پر عمل کرنے کا حق

دیتی ہیں۔ ہم مسلمان خواتین اپنے عقیدے اور دین پر قائم رہتے ہوئے اپنے حقوق کے تحفظ کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہم مغرب سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ہمارے انسانی حقوق کا احترام کرتے ہوئے اپنے سیکولر نظریات ہم پر مسلط نہ کرے۔

3- ہم اپنے مربوط خاندانی نظام کے تحفظ کے لیے یکسو ہیں۔ ہم عورت پر اپنے گھر اور بچوں کی نگہداشت کی ذمہ داری کو معاشی ذمہ داریوں سے اہم سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی خاندانی اکائی کو مضبوط بنائیں گے، اسی سے ہماری معاشرے مضبوط ہوں گے اور ہماری اس جدوجہد کا ثمر پوری دنیا کو ملے گا۔

4- ہم اسلامی کانفرنس تنظیم اور خصوصاً پاکستان کی مرکزی و صوبائی حکومتوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ خواتین کے لیے اسلام کے اصولوں کی روشنی میں قانون سازی کریں اور قوانین پر عمل درآمد کے لیے مؤثر نظام وضع کریں۔^[۱]

مسلم خواتین کی تیسری عالمی کانفرنس 2007ء:

مئی 2007ء کے دوسرے عشرے میں انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین (I.M.W.U) کی جنرل کانگریس کا اجلاس ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں منعقد ہوا۔ یہ دنیا بھر کی مسلم خواتین کی بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیم کی غالباً تیسری عالمی کانفرنس تھی۔ جس میں شرکت کے لیے پاکستانی وفد ڈاکٹر کوثر فردوس کی قیادت میں روانہ ہوا۔ ان کے ہمراہ جماعت اسلامی اور دیگر ہم خیال خواتین کی نور کنی ٹیم تھی۔ ڈاکٹر کوثر فردوس کا بھانجا محمد شعیب محرم کے طور پر شریک سفر تھا۔ اس تنظیم کی مرکزی نگران سیکرٹری جنرل محترمہ سعاد الفاتح تھیں۔ کانفرنس کا افتتاح ”وزارت ترقی ملائیشیا“ کی وزیر محترمہ ”داتوسری عبد الجلیل“ نے کیا۔ امت مسلمہ کی نمائندہ خواتین کی تقریروں سے پروگرام کا آغاز ہوا۔ جواگلے دو دنوں تک اس تنظیم کی کارکردگی، رپورٹوں اور اس پر بحث پر مشتمل رہا۔ اس دوران نمائندوں کے ذریعے سب مسلم علاقوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا اور آپس میں تفصیلی ملاقاتیں کی گئیں۔ جنرل کانفرنس کے اختتام پر اگلے دن ایک اور کانفرنس کا انعقاد کروایا گیا۔ جس کا

[۱] ہفت روزہ ایشیا 22 اکتوبر 2003ء ص: 29-30، رپورٹ: عنایت بیگم ممبر قومی اسمبلی

عنوان تھا ”غربت کے خاتمے میں مسلمان کا کردار۔“ اس پروگرام کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اسلام کے نظام معیشت کی بنیاد دولت کا پھیلاؤ اور امیر سے غریب کی طرف اس کا بہاؤ ہے۔ پھر اسلام نے رقم ضائع کرنے سے منع کر کے اسے فلاحی و وفاہی کاموں پر خرچ کرنے کی تلقین کی ہے۔ جبکہ سرمایہ دارانہ نظام استحصالی ہوتا ہے جس میں دولت کا بہاؤ غریب سے امیر کی طرف ہوتا ہے۔ ظلم و سود کے نظام سے امیر، امیر تر ہوتا جاتا ہے جبکہ غریب، غریب تر ہوتا جاتا ہے۔ پھر امیر اس بڑھتی ہوئی دولت کو خرچ کرنے کے بجائے اس پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے۔

اس کانفرنس کا اختتامی اجلاس کو الالپور کے خوبصورت ثقافتی میوزیم میں ہوا۔ جس میں جنرل کانگریس کے زیر اہتمام نئی سیکرٹری جنرل، ان کی سیکریٹریٹ اور کونسل آف ٹرسٹیز کے نمائندوں اور ذمہ داران کا انتخاب کیا گیا اور آئندہ سال کے لیے کام کی منصوبہ بندی کی گئی۔ پھر کانفرنس کے اختتام پر کونسل آف ٹرسٹیز کے 30 ممالک کے نئے منتخب شدہ نمائندوں کا صدر ڈاکٹر توتی علویہ کی زیر صدارت چار گھنٹوں پر مشتمل طویل اجلاس ہوا۔ جس میں دنیا کے مختلف کونوں سے آئی ہوئی مسلم بہنوں نے آئندہ سال کے لیے منصوبہ بندی کی اور مفید مشورے دیئے۔ اس کانفرنس میں آئندہ کے لیے سوڈان کی ایک اہم علمی شخصیت ڈاکٹر مظاہر عثمان کو سیکرٹری جنرل بنایا گیا..... اس کانفرنس میں درج ذیل اعلامیہ پیش کیا گیا۔

☆ ہم اپنے دین سے وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے اپنے خاندانی نظام کے استحکام، روایتی اسلامی اقدار کی حفاظت، اپنی نسلوں کی دینی تربیت اور اسلامی تشخص کو اجاگر کرنے کا عہدہ کرتی ہیں۔

☆ ہم عورت کے موضوع پر یو۔ این۔ او۔ اور این۔ جی۔ اوز کے ایجنڈے کی مخالفت کرتے ہیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین کی غلط تشریح کے نتیجے میں مسلم خواتین کے خلاف قوانین کے استحصال کا فی الفور خاتمہ کیا جائے اور خواتین کے احترام و تکریم سے متعلق اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔

☆ مسلح تنازعات اور جاری جنگوں میں متاثرہ عورتوں کا بھرپور خیال رکھا جائے۔ ہم ان

تنازعات کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کرنے کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔

☆ آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے جسے کوئی نہیں چھین سکتا۔ دنیا کے تمام مذاہب، تہذیبی روایات اور بین الاقوامی مسلمہ قوانین کے برعکس امت مسلمہ کے مختلف حصوں پر مسلط کی گئی ناجائز مسلح جارحیت کو بند کیا جائے۔ اس مسلح جارحیت کی ہم شدید مذمت کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس جنگ میں مسلم ممالک کو صرف اس لیے نشانہ بنایا جا رہا ہے تاکہ مسلمانوں کا دینی، تہذیبی اور معاشی تشخص ختم کر کے امت مسلمہ کے تمام وسائل پر قبضہ کیا جاسکے۔

☆ اجلاس میں لندن میں منعقد ہونے والی اسلامی سکالرز کانفرنس کے فیصلوں کی حمایت کی گئی اور 4 ستمبر کو ”عالمی یوم حجاب“ منانے پر اتفاق کیا گیا۔

آخر میں سوڈان کے علاقے دارفور کے بارے میں صحیح معلومات دی گئیں اور بتایا گیا کہ دراصل استعمار، عراق و افغانستان کو تباہ کرنے اور ان کے وسائل لوٹنے کے بعد اب پاکستان، ایران اور سوڈان پر نظریں گاڑے بیٹھا ہے۔ بد قسمتی یہ ہے کہ امت لہو لہو اور زخم زخم ہے جبکہ حکمران بے ضمیر اور بے خبر ہیں۔

کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر سعاد الفاتح نے بہت رقت آمیز دعا کروائی اور آہوں اور سسکیوں کے ساتھ تمام وفود اپنے اپنے ملکوں اور وطنوں کو روانہ ہوئے۔

امو و کے بارے میں کچھ مزید تفصیلات:

اس انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین (IMWU) کی اقوام متحدہ کی معاشی اور سماجی کونسلوں میں رجسٹریشن ہو چکی ہے۔ یہ انٹرنیشنل مسلم ویمن یونین، 60 مسلم ممالک کی دین دار تعلیم یافتہ خواتین پر مشتمل نمائندہ تنظیم ہے جو اسلام میں دیئے گئے حقوق کے حصول کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنے کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا کرتی ہے۔ 2012ء میں عالمی یوم خواتین کے موقع پر ڈاکٹر کوثر فردوس اس تنظیم کی سربراہ کی حیثیت سے یو۔ این کمیشن آن سٹیٹس آف ویمن کے اجلاس منعقدہ 27 فروری تا 9 مارچ 2012ء میں شامل ہوئیں۔ ان کی سیکرٹری ڈاکٹر مظاہر عثمان بھی

سوڈان سے 4 مزید نمائندوں کے ساتھ شامل ہوئی تھیں۔ وہاں ایرانی وفد بھی ایک دستاویزی فلم لے کر پہنچا تھا۔ بہر حال ان خواتین نے ہر موقع پر یو۔ این۔ او کے پرو فیملی Pro-Family گروپ سے رابطہ رکھا۔ ان کی روداد سنی، آپس میں مشاورت کر کے ان کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتی رہیں۔ اس سے قبل اپریل 2010ء میں ایران میں ”بیداری اسلامی کانفرنس“ میں 85 ممالک کی 200 خواتین شامل ہوئی تھیں۔ اس کانفرنس میں بھی ڈاکٹر کوثر فردوس کی سربراہی میں پاکستانی وفد نے شرکت کی تھی۔

نومبر 2012ء میں سوڈان کے دارالخلافہ خرطوم میں آٹھویں اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ (15 تا 17 نومبر) اس میں بھی سابقہ حلقہ خواتین عائشہ منور اور موجودہ ڈاکٹر رخسانہ جبین شامل ہوئی تھیں۔

عجب حسن اتفاق ہے کہ انٹرنیشنل مسلم وومن یونین کی روح رواں اور اس میں فعال کردار ادا کرنے والی خواتین پاکستان کی ”وومن اینڈ فیملی کمیشن“ کی خواتین ہی ہیں۔ ڈاکٹر سمیہ راحیل قاضی ہی اس عالمی مسلم یونین کی چیئر پرسن ہیں۔

☆ ڈاکٹر کوثر فردوس نے ستمبر 2012ء کے اقوام متحدہ کے پروگرام میں انٹرنیشنل ویمن یونین کی طرف سے چیئر پرسن ہونے کی حیثیت سے شرکت کی۔

☆ اگست 2014ء میں بھی اپنے وفد کے ہمراہ یو۔ این۔ او کی عالمی یوم خواتین کانفرنس کے موقع پر بھی شرکت کی گئی۔ یہاں سوڈان، ایران اور پاکستانی سفارتی نمائندوں سے ملاقاتیں اور مشاورت کی گئی۔

☆ مئی 2016ء میں بیجنگ پلس 20 کے پروگرام میں بھی ڈاکٹر کوثر فردوس مسلم انٹرنیشنل ویمن یونین کے نمائندہ کی حیثیت سے شامل ہوئی تھیں اور وہاں کے Pro-Family گروپ سے مسلسل رابطہ رکھا تھا۔

غرض اس وقت ”IMWU“ کے پلیٹ فارم سے کئی انٹرنیشنل کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔

عملی صورت حال کیا ہے؟

یورپ ہو یا امریکہ..... اب ہر جگہ خواتین میں ایک ہی نعرہ مقبول ہو رہا ہے کہ ہم اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتی ہیں۔ ہم ماں کا کردار ادا کرنا چاہتی ہیں۔ فرانس کے مشہور صحافی شارل موورا کا کہنا ہے کہ ”اگر امور خانہ داری کی طرف لوٹنے والی خواتین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں سنجیدہ بنیادوں پر اس نئے رجحان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مسئلہ صرف ہمارا ہی نہیں، بلکہ کچھ عرصہ قبل سوئٹزرلینڈ کے بارے میں بھی یہی رجحان سامنے آیا تھا اور اب یہ پورے یورپی معاشرے کا مسئلہ بن چکا ہے۔ یورپی عورتیں عجیب مشکل میں گھری ہوئی ہیں ان کے لیے ایک ہی وقت میں بیوی اور ملازم پیشہ عورت کا کردار ادا کرنا نہایت مشکل ہو رہا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہر چیز میں اعلیٰ معیار کی کارکردگی ہو یا پھر کچھ بھی نہ ہو۔“ [1]

14 جنوری 2005ء کو نیشنل بیورو آف اکنامک ریسرچ (N.B.E.R) کے تحت ایک قومی کانفرنس میں مسئلہ زیر بحث تھا۔ ”انجینئرنگ اور سائنس کے اعلیٰ اداروں میں اور اعلیٰ مناصب پر عورتوں کی نمائندگی۔“ ہارورڈ یونیورسٹی کے صدر ممتاز ماہر معاشیات پروفیسر لارنس ایچ سمرز نے مسئلے کی نوعیت پر کہا:

”جن اہم موضوعات پر میں خاصے عرصے سے سوچ بچار کر رہا ہوں یہ ان میں سے ایک حساس موضوع ہے۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں ہم صنفی مساوات کی منصفانہ اور موزوں تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہمیں ایک باقاعدہ نظام کے تحت طبی اور نفسیاتی تحقیقات کو بھی بنیاد بنا کر حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کرنی چاہیے۔“ پھر انہوں نے مزید کہا کہ

”اب سے 25 برس پہلے کی بات ہے سائنس اور انجینئرنگ کے شعبہ ہائے تحقیق و تدریس میں ہم نے پُر جوش انداز سے اور دانستہ طور پر عورتوں کی نمائندگی خاصی بڑھائی۔ جن خواتین نے ان شعبہ جات سے وابستگی اختیار کی تھی اب وہ 40، 45 سال کے لگ بھگ ہوں گی۔ مگر اب ان شعبہ جات کو جا کر دیکھیں تو وہ فاضل خواتین، جن سے بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں، ان میں سے

[1] ماہنامہ ”چمن بتول“ جنوری 2010ء، ص: 13 مضمون: استعمار کے ایجنڈے اور مسلمان عورت از افشاں نوید

آدھی سے زیادہ تدریس اور تحقیق کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ یہ ہے حقیقتِ حال اور یہی بات اعلیٰ درجے کے دوسرے متعدد پیشہ ورانہ اداروں میں خواتین کی کم تر نمائندگی کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تاریخی طور پر ہمارے معاشرے میں ایک شادی شدہ مرد اپنے پیشہ ورانہ وابستگی کے تقاضے کہیں زیادہ بہتر انداز میں نبھاتا ہے اور یہ فرق تمدنی اور ثقافتی طور پر ہزاروں سالوں سے ثابت شدہ ہے۔“ [۱]

محترمہ سائرہ بانو اپنے مضمون ”اپنے مرکز سے اگر ذور نکل جاؤ گے“ میں لکھتی ہیں:

”مغرب کے برعکس مسلم عورت جس کے والدین اپنے خرچ پر اس کو پرورش، بہترین تربیت، تعلیم اور کسی واپسی کی امید کے بغیر لاکھوں، کروڑوں کا جہیز بھی دیتے ہیں اور بعض اوقات 2 بار بھی دے دیتے ہیں۔ گھر، مکان، جائیداد میں حصہ بھی دیتے ہیں۔ بے حد مثالی نہ سہی لیکن تحفظ، اعتماد، محبت فراہم کرتے ہیں اور اس کو باہر نکلنے پر مجبور نہیں کرتے۔

(بقول Times) اگر مسلم خواتین کو پردہ کے ”زندان“ میں بند کر دیا جاتا ہے۔ ان کو اکیلے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی۔ یو۔ این۔ او کا دیا ہوا حق تولید، حق فیصلہ نہیں دیا جاتا، معاشی ترقی میں حصہ بنانے کا موقع نہیں ملتا، تو عورت دبی، گھٹی اور محبوس قرار دی جاتی ہے۔ اسلام کو تنگ نظر، متعصب اور پسماندہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اگر لاطینی امریکہ میں خواتین کے ختنے کروا دیئے جاتے ہیں، شمالی امریکہ، فرانس، یورپ یا روس میں ہر بارہ سالہ لڑکی کی عزت تار تار ہو جاتی ہے، جبری ہوس کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو مسیحی حقوق انسانی کی تنظیمیں خاموش رہتی ہیں۔ مشرقی و مسلم ممالک میں ایک خاتون کا شوہر اس کی پٹائی کرتا ہے۔ لیکن اسکو کم کر روٹی، کپڑا اور مکان بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کو پھر اپنی محبت کا اور اپنا ہونے کا احساس دلاتا ہے پھر بھی مغربی ذرائع ابلاغ اس مرد کو جابر اور ظالم کا خطاب دیتے ہیں۔ جبکہ مغرب میں خواتین کی پٹائی بھی ہوتی ہے۔ کمانا بھی خود ہوتا ہے۔ زندگی محبت اور عزت سے خالی بھی ہے۔ ہر رات ایک نیا مرد اس کی پور پور میں زہر بھر کر

[۱] ماہنامہ ”چمن بتول“ جنوری 2010ء، ص: 13 مضمون: استعمار کے ایجنڈے اور مسلمان عورت از افشاں نوید

اجنبیت کے احساس میں ڈبو کر صبح غائب ہو جاتا ہے تو اس عورت کو بس آزادی نسواں کا مرہم رکھ کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔“

مغرب اسلام کے بارے میں جتنا زیادہ پر تشدد پروپیگنڈہ کرتا ہے۔ اسی تناسب سے مغربی لوگ اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں، ایون ریڈلے کے حالات، دوسری طرف عافیہ صدیقی کے ساتھ امریکہ کا سلوک یہ دو مستقل رویے ہیں۔ دو الگ الگ تہذیبیں ہیں۔ جن کا مغرب کا پڑھا لکھا طبقہ بغور مشاہدہ کر رہا ہے۔ قبول اسلام کا ایک عالمی رجحان نائن ایون کے ایسے نے بھی پیدا کیا ہے۔ مغرب کو فکر لگی ہوئی ہے کہ اس کے چرچوں کی تعداد کیوں دن بدن کم ہو رہی ہے؟ مساجد کیوں بڑھ رہی ہیں؟ اگر یہی کیفیت رہتی ہے تو 2050ء تک اسلام ہی مغربی ممالک میں سب سے بڑا مذہب بن جائے گا۔

مگر تعجب اس وقت ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان نو مسلموں میں زیادہ تعداد خواتین کی ہے۔ یہ پڑھی لکھی، سنجیدہ خواتین جب مسلمان ہوتی ہیں تو وہ پورے خلوص سے اسلام پر عمل پیرا ہونا چاہتی ہیں۔ پھر اس اسلام کی تبلیغ کو، ان کے بقول ”سب سے بڑی نعمت“ کو وہ باقی مغربی بہنوں تک پہنچانے میں مصروف عمل ہو جاتی ہیں۔

در اصل اس وقت اسلام مغرب کے ثقافتی حملے کا شکار ہے۔ اسلام کی تاریخ میں باطل کے بے شمار جھکڑ چلے۔ مگر وہ ہر دفعہ کچھ دیر طوفان برپا کرنے کے بعد خود ہی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے رہے اور اسلام قائم و دائم رہا۔ آج کا یہ مغرب کا طوفان بھی ایک ایسا ہی زوردار جھکڑ ہے جس نے بظاہر امت مسلمہ کے کچھ حصہ کے ہوش و حواس گم کر دیئے ہیں۔ مگر انشاء اللہ سابقہ جھکڑوں کی مانند یہ بھی کچھ عرصہ بعد بالکل ختم ہو جائے گا اور اسلام جگمگاتا ہوا آفتاب بن کر دنیا کو منور کرتا رہے گا۔

صورتِ حال کا تجزیہ

یہ درست ہے کہ ہمارے ہاں خواتین کے کچھ مسائل ہیں۔ مثلاً جہالت، غربت، کمزور صحت اور وراثت کا نہ ملنا وغیرہ۔ مگر ان کو اسلام ہی کی روشنی میں حل کرنا چاہیے اور اسلام کے مطابق ہی ان کا حل فطری بھی ہوگا اور سہل الحصول بھی۔ عورت اور مرد دونوں کو دینی تعلیم دی جائے۔ اپنے

حقوق اور فرائض کا شعور دیا جائے تو مرد و عورت کی تکریم کرے گا، اس کو وراثت میں حق دے گا، اس سے حسن سلوک کرے گا، نان و نفقہ بھی دے گا اور جب تک یہ نہیں ہوگا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ عورت اپنے حقوق کے لیے بے شک سڑکوں پر آجائے، جب تک مرد اس کو حق دینے پر آمادہ نہ ہو، تو یہ سڑکیں تو اس کا حق نہیں دلا سکتیں۔ نہ پولیس سٹیشن اس کو اس کا حق دلا سکتے ہیں اور پھر پاکستانی عورت حق کس سے مانگ رہی ہے؟ اپنے باپ سے جو اسے دیکھ کر جیتا ہے؟ اپنے پیارے شوہر سے جو اس کا جیون ساتھی ہے؟ اپنے پیارے بیٹے سے جسے دیکھ کر وہ جیتی ہے؟ اپنے بھائی سے جسے پیار سے ویر کہہ کر پکارتی ہے؟

اصل بات یہی ہے کہ مرد اور عورت دونوں صحیح مسلمان ہوں اپنے حقوق اور فرائض کو پہچانیں تو ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار بن جائیں گے۔ باہمی تعاون سے عورت کے بھی سارے مسائل حل ہوں گے۔ مرد کو بھی خدمت ملے گی۔ بچوں کو بھی پیار ملے گا۔ خاندان بھی مضبوط و مستحکم ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی خاتون صحیح معنوں میں اپنے گھر کی ملکہ ہے۔

مغرب ہمیں گمراہ کر رہا ہے:

مغرب ایک ہی گمراہ کن فکر ہمارے اندر عام کرنا چاہتا ہے کہ عورت بہر حال ”مجبور“ ہے اس لیے بے قصور ہے۔ یہ فکر دے کر وہ عورت کو ایک طرف بے راہ روی کا لائسنس دینا چاہتا ہے دوسری طرف وہ مرد کے ہاتھوں میں عورت کو کھلونا بنانا چاہتا ہے۔ تیسری طرف سستی لیبر کے لیے عورت کا استحصال کرنا چاہتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جس نظام میں مرد مردوں کا تحفظ نہیں کر سکے۔ کرپشن، بے روزگاری، مہنگائی کی چکی میں وہ خود جس طرح پس رہے ہیں ایسے میں وہ عورتوں کے کون سے مسائل حل کر سکیں گے؟ دوسری طرف عورت کی 33% یا 22% نمائندگی بھی اس کے کچھ کام نہیں آ سکتی۔

”عورتوں کو پائلٹ بنا کر فضاؤں میں جہاز اڑانے اور مسلح افواج میں کمیشن دے کر یونٹوں میں خوار کرنے اور رینجرز میں بھرتی کر کے سرحدوں کی چوکیداری کرانے، یا سڑکوں، چوکوں اور شاہراہوں پر دوڑانے کے جاہلانہ فیصلوں کو واپس لیں۔ قوم کی بچیوں کو عزت، تحفظ اور آسودگی کے

ساتھ خدمات انجام دینے کے متبادل مواقع مہیا کیے جاسکتے ہیں لیکن انہیں ”نمائشی گڑیا“ بنا کر مغربی فرعونوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی ”روشن خیالی“ پر مبنی عیاشی کی یہ قوم، یہ ملت، یہ تہذیب اور یہ دین اجازت نہیں دیتے۔“^[i]

ماہر القادری مرحوم لکھتے ہیں:

عورت پہ یہ تہذیب کے ڈالے ہوئے گھیرے
کرگس کے ہیں چُنگل میں مولوں کے بسیرے
اب فلم کے نغموں سے ابھرتی ہیں شعاعیں
ہوتے تھے کسی وقت نمازوں میں سویرے
ان اہل سیاست کے فریبوں میں نہ آنا
ساپنوں کو لیے پھرتے ہیں جیبوں میں سپیرے
اس دور پر آشوب میں باطل کے مقابل
کچھ بھی ہو، مگر ڈال دیئے ہم نے بھی ڈیرے

[i] افواج میں خواتین کی بھرتی از محقق سلیم منصور خالد ”ماہنامہ ترجمان القرآن“ جنوری 2009ء، ص: 88

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِۙ
 وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِمْ دَرَجَةٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾
 ”عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر دیے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق
 ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ زائد حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ غالب
 حکمت والا ہے۔“ (البقرہ: 228)

مساواتِ مرد و زن کا اسلامی تصور

✽ کائنات میں عدل و توازن کا اصول

✽ مرد و عورت یکساں ہیں

✽ بنی نوع انسان کی ذمہ داریاں

✽ عورت و مرد کا دائرہ کار

✽ فطری تقسیم

✽ عورت کا دائرہ کار

✽ فطری تقسیم کو بدلنے کا نتیجہ

✽ اسلام: فطری نظام حیات

✽ طبعی لحاظ سے مرد و عورت کے درمیان کہاں مساوات ہے اور کہاں فرق ہے؟

✽ بنیادی انسانی حقوق میں مرد و عورت کی مساوات

✽ صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے دونوں صنفوں کا فرق

✽ عورت کے بارے میں دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کا رویہ

✽ بچوں کے لیے والدہ کی اہمیت

✽ گھر سے باہر نکلتے وقت عورت کے مسائل ✽ مرد کی نقالی کی ممانعت

✽ مخلوط ثقافت ✽ عورتوں کا اجر

✽ مسلمان عورت سے دین کے تقاضے ✽ عورت کا بدترین استحصال

✽ لمحہ فکریہ ✽ اسلام..... خواتین کے حقوق کا واحد ضامن

✽ مساوات مرد و زن کا مغربی تصور ✽ کیا مرد اپنی ذمہ داریوں پر احتجاج کرتے ہیں؟

✽ مساوات مرد و زن کا اسلامی تصور ✽ تجزیہ

✽ الگ صلاحیتیں، الگ دائرہ کار

✽ عورت کی ذمہ داریوں کا احترام

مساواتِ مرد و زن کا اسلامی تصور

کائنات میں رونق انسان کے دم قدم سے ہے۔ انسان کے بغیر کائنات کا کوئی تصور نہیں ہے، نہ ہی دنیا کے بغیر انسان کا تصور ہو سکتا ہے۔ اس کائنات کی تمام مخلوقات کی تقسیم جوڑے کے اصول کے تحت کی گئی ہے۔ لہذا انسان بھی دو نمونوں پر تقسیم ہے، ایک نمونہ مرد ہے اور ایک عورت۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اصل انسان کی تعریف عورت پر صادق آتی ہے یا مرد پر؟ انسانیت کا شرف کسے حاصل ہے۔ کیا مرد کا درجہ اونچا ہے یا عورت کا؟

کائنات میں عدل و توازن کا اصول:

اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ پوری کائنات عدل و توازن کے اصول پر قائم کی گئی ہے۔ اگر اس توازن میں بال برابر بھی کمی بیشی پیدا کر دی جائے یا خود بخود ہو جائے تو اتنا فساد پیدا ہوتا ہے کہ اس کو درست کرنے میں کئی کئی سال بلکہ بسا اوقات صدیاں بھی لگ سکتی ہیں، ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اپنے بارے میں خود خالق کائنات (جو ہماری فطرتوں کا بھی خالق اور ان سے کما حقہ واقف ہے) کی ہدایت کردہ سکیم کو جوں کا توں قبول کر لیں اور اسی ناپ تول کے ساتھ قبول کر لیں کیونکہ جن تہذیبوں یا قوموں نے اپنے خاص نظریات کے تحت اس توازن میں رد و بدل کیا ہے یا اس سکیم میں کوئی کمی بیشی کی ہے، انہوں نے اپنی اصل فطرت کے برعکس کام کر کے اپنے لیے فتنہ و فساد کے دروازے کھول لیے ہیں۔

مرد و عورت یکساں ہیں:

اللہ تعالیٰ کی اس کائناتی تقسیم میں مرد اپنی جگہ ذمہ دار ہیں اور عورتیں اپنی جگہ کار گزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے ذمے وہی کام کیے ہیں، جو اس نے ان کی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ دنیا کا حاکم انسان ہے اور یہ انسان مرد بھی ہے اور عورت بھی۔ گویا انسانی شرف میں دونوں

یکساں ہیں، ایک ہی مادے سے ان کا خمیر اٹھا ہے، ایک جیسی شکل و صورت اور ناک نقشہ۔ پھر دونوں ہی برابر کے ذمہ دار اور مسئول ہیں۔ اس لیے ادنیٰ اعلیٰ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، نہ کوئی برتر مخلوق ہے اور نہ کوئی کم تر۔

بنی نوع انسان کی ذمہ داریاں:

انسان پر فطرت نے دواہم فریضے عائد کیے ہیں، بقائے زندگی اور بقائے نسل۔ جہاں تک بقائے زندگی کا تعلق ہے، تو انسان کو اپنی زندگی قائم رکھنے کے لیے خوراک کا بندوبست کرنا ہے۔ پھر اس کے ساتھ رہائش کا، پھر ناگہانی مصائب مثلاً بیماری، دکھ اور دشمن سے حفاظت وغیرہ کا بھی اہتمام کرنا ہے۔ ان تینوں فریضوں کو سرانجام دینے کے لیے ایک صنف کو انہی اوصاف کا حامل بنایا۔ پھر بقائے نسل کے لیے ان صفات کے برعکس ایسا یونٹ درکار ہے جو پونے تین سال تک پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ تخلیق و رضاعت کے کام میں مشغول رہے۔ شفقت، صبر اور تحمل کے ساتھ اس کام کو سرانجام دیتا رہے۔ لہذا دوسرے یونٹ کو یہ تمام صفات عطا کر دی گئیں۔ اسے خوراک کے بندوبست، دشمنوں سے حفاظت جیسی سخت ذمہ داریوں سے فارغ رکھا گیا۔ خدمات کی اس تقسیم پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ افزائش نسل کا کام گھٹیا ہے اور اس کو سرانجام دینے والی مخلوق کوئی گھٹیا یا دوسرے درجے کی مخلوق ہے اور اصل انسان تو حفاظت و نگہبانی کرنے والا اور خوراک مہیا کرنے والا مرد ہی ہے۔

عورت و مرد کا دائرہ کار:

اسی سے خود بخود عورت و مرد کے دائرہ کار کی سمجھ آ جاتی ہے۔ یہ باتیں تو ابتدائی دور کے انسان نے خود ہی اپنی فطرت کے تحت سیکھ لی تھیں، اپنے عقلی تجربات کی روشنی میں وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ بچوں اور بچوں کی ماں کے لیے چار دیواری ضروری ہے، پھر اسی چار دیواری کے اندر عورت کی سربراہی قائم ہو گئی۔ پھر اسی فطری اشارے پر خود بخود مردوں کے کندھوں پر بیرونی سربراہی آ گئی کہ تجھے اپنے نوزائیدہ بچوں کو دھوپ، گرمی، سردی اور دشمنوں سے بچاؤ کے لیے کسی آڑ اور کسی چھت کی ضرورت ہے۔ یہ تیرا شریک زندگی اگرچہ تیری طرح ناک،

کان، دل، دماغ اور ہاتھ پاؤں رکھتا ہے مگر حمل، زچگی اور رضاعت کے دوران کمزوری اور ناطاقتی کی بنا پر وہ معاش یا حفاظت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

فطری تقسیم:

گویا یہ فطرت کی تقسیم ہے کہ ایک صنف کو طاقت، قوت اور انفاق کی فضیلت حاصل ہے اور دوسرے صنف کو حمل وزچگی کی فضیلت دی گئی ہے، یہ عورت کی امومت تو اس کے شرف کی دلیل ہے، یہ اس کا مقصد تخلیق ہے، یہ عورت کے لیے ذلت و پستی نہیں بلکہ اس کے حسن اور اس کی فضیلت کی علامت ہے۔ عورت کی ذات کی تکمیل ہی ماں بن کر ہوتی ہے۔ بچے کی خواہش عورت کو مرد سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اسلام کی تو خوبی ہی یہ ہے کہ وہ دین فطرت ہے، انسان کی فطرت کے مطابق ہی اس کی راہنمائی کرتا ہے۔ اس نے فطرت انسانی کو ملحوظ رکھ کر ہی عورتوں کو یہ ہدایت دی ہے: **وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ...** الخ [۱] ”اپنے گھروں میں ٹکی رہو۔ سابق دور جاہلیت کی سبب دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں (اہل بیت نبی ﷺ) گندگی (رجس) سے دور کر دے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔“ [۲]

عورت کا دائرہ کار:

اس آیت میں عورت کا دائرہ کار اس کا گھر بیان کیا گیا ہے۔ جس میں اس حکم کی حکمت و مصلحت، گھر کے ماحول کی اصلاح و درستگی بیان کی گئی ہے اور اس میں مقصد بھی بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس طرح تم سے ”رجس“ دور رکھے گا اور تمہیں پاکیزگیوں کی بلندیوں تک لے جائے گا۔ اس کے برعکس اگر اس حکم کی پروا نہ کی تو پھر عورت آلودگی و ناپاکی میں مبتلا ہو جائے گی جس سے اللہ تعالیٰ اسے بچانا چاہتا ہے۔ گویا کہ جس قوم کی عورتیں ”رجس“ میں مبتلا ہو جائیں اس قوم کی بربادی اور تباہی میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے!

[۱] الاحزاب: 33

[۲] یہ آیت اہل بیت نبی (کی خواتین) کے حوالے سے تمام مسلمان خواتین کو لائحہ عمل عطا کر رہی ہے۔

فطری تقسیم کو بد لئے کا نتیجہ:

اس مضمون کو سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا: ”میں اپنے بعد کوئی فتنہ ایسا نہیں پاتا جو مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر ضرر رساں ہو۔“ [۱]

مزید فرمایا: ”دنیا سے اجتناب کرو اور عورتوں سے بچتے رہو کیونکہ بنی اسرائیل میں بھی پہلا فتنہ عورتوں ہی کی وجہ سے اٹھا تھا۔“ [۲]

اسلام۔۔۔۔۔ فطری نظامِ حیات:

اسلام کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کے خلاف لڑتا ہے نہ اس میں ترمیم و تنسیخ کرتا ہے بلکہ اس کے لیے وہی اصول و قانون وضع کرتا ہے جو اس کی فطرت سے ہم آہنگ ہوں۔ وہ انسانی فطرت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ان کی بہترین انداز سے تربیت اور تہذیب کر کے اسے روحانی ترقی اور پاکیزگی سے بہرہ ور کرتا ہے تاکہ انسان اپنی خواہشاتِ نفس کا بندہ نہ رہے بلکہ نیکی اس کی نگاہوں میں پسندیدہ ہو اور وہ نیکی اور احسان کے اعلیٰ ترین مقام کو بھی پاسکے اور انسانی معاشرہ بھی فلاح و کامرانی سے بہرہ ور ہو سکے۔

طبعی لحاظ سے عورت اور مرد کے درمیان کہاں مساوات ہے اور کہاں نہیں ہے؟

مرد اور عورت کے مسئلہ میں اسلام کا نقطہ نظر بڑا واضح اور صاف ہے اور انسانی فطرت سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ جہاں انسانی فطرت دونوں کے درمیان مساوات چاہتی ہے وہاں تو اسلام دونوں کو یکساں سطح پر لاتا ہے اور جہاں خود فطرت امتیاز چاہتی ہے وہاں احکام و مسائل میں اسلام دونوں صنفوں میں فرق اور امتیاز قائم کرتا ہے۔ چنانچہ شرف انسانی اور ایمانی شرافت میں دونوں کا درجہ یکساں ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ [۳] یعنی ہم نے تمام بنی آدم علیہ السلام کو عزت بخشی جس میں مرد و عورت

[۱] (بخاری، کتاب النکاح)، (مسلم، کتاب الذکر)، (ترمذی، ابواب استیذان)، (ابن ماجہ، کتاب الفتن)

[۲] صحیح مسلم، کتاب الذکر، باب 359

[۳] بنی اسرائیل: 70

دونوں شامل ہیں۔ دونوں ایک باپ حضرت آدم اور ایک ماں حضرت حوا کی اولاد ہیں۔ شرافت ایمانی کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے: لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ [۱] ”میں کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا، عمل کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت۔“ اس طرح نیکی اور تقویٰ میں دونوں کا اجر اور مرتبہ اللہ کے ہاں برابر ہے۔

بلکہ اگر کوئی عورت ایمان اور تقویٰ میں مرد سے آگے بڑھ جائے تو اس کا اللہ کے ہاں اجر اور رتبہ بھی ایمان و تقویٰ میں پیچھے رہ جانے والے مرد سے بڑا ہوگا۔ ملاحظہ ہو ارشاد ربانی: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ”تم میں سے جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے وہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت پانے والا ہے۔“ [۲]

بنیادی انسانی حقوق میں مرد و عورت کی مساوات:

اسی طرح بنیادی انسانی حقوق میں بھی مرد و عورت کے درمیان مساوات اور یک رنگی ہے بلکہ عورت کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس کا مقام و مرتبہ بھی بلند ہوتا جاتا ہے۔ بیٹی، بہن، پھر اس کے بعد بیوی اور آخر میں ماں۔ چاروں حیثیتوں سے اللہ و رسول ﷺ نے عورت کو بڑا مقام دیا ہے اور ماں کا مقام و مرتبہ تو اتنا بلند ہے کہ جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے رکھ دی گئی ہے۔ باپ کے مقابلے میں ماں تین گنا زیادہ حسن سلوک کی مستحق قرار دی گئی ہے۔ [۳]

صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے دونوں صنفوں کا فرق:

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ [۴]

[۱] آل عمران: 195

[۲] الحجرات: 13

[۳] کیا کبھی کسی باپ نے بھی اس پر احتجاج کیا ہے کہ میرا درجہ ماں کے درجے سے تین حصے کیوں کم تر ہے اور جنت میرے قدموں تلے کیوں نہیں۔

[۴] البقرہ: 228

”عورتوں کے بھی اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان کے فرائض ہیں مگر مردوں کو ایک درجہ زائد حاصل ہے۔“

سورہ نساء آیت نمبر 34 میں ارشاد ہوتا ہے:

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ

”مرد نگہبان ہیں عورتوں پر، اس وجہ سے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر زیادہ

صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔“

صنفِ نازک کی جسمانی کمزوری تو سب کو معلوم ہے اور عقلی طور پر عورت کا مرد سے کم

ہونا خود ارشاد رسول ﷺ سے ثابت ہے۔^[۱]

چنانچہ عورت کی صلاحیتوں، اس کے مزاج اور استعداد کار کے لحاظ سے ہی اس کو ذمہ

داریاں دی گئی ہیں۔

عورت کے بارے میں یہودیت، عیسائیت اور ہندومت کے برعکس

اسلام کا عزت و اکرام والا رویہ:

عورت کے شرف و وقار کو صرف اسلام نے بحال کیا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں کا نقطہ نظر تو یہ ہے کہ عورت ہی نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکا یا تھا اور انھیں شجرِ ممنوعہ کو چکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لہذا اس کی اکساہٹ سے حضرت آدم علیہ السلام نے غلطی کی اور پھر اس کی پاداش میں ان دونوں کو جنت سے نکلنا پڑا، یہی وجہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں عورت گناہ کی جڑ اور ناگزیر برائی ہے۔ وہ کسی عزت و احترام کی مستحق نہیں ہے بلکہ اس کا کام ہے وہ ہر وقت مرد کی خادم اور کنیز بن کر رہے اور ہمہ تن اس کی خدمت پر کمر بستہ رہے نیز اس کی درباری کا فریضہ انجام دے۔ اسی طرح ہندومت میں بھی عورت کو پست، ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ خاوند کو پتی اور بیوی کو پتی کہا جاتا ہے۔ یعنی مرد مالک ہے اور بیوی اس کی مملوکہ ہے، اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ

[۱] صحیح بخاری، کتاب الشہادات، ج 1

مرد بیوی سے جو بھی سلوک کرے، عورت مجبور و بے بس ہے۔ اس کی کسی طرح کی دادرسی نہیں کی جاسکتی۔ حتیٰ کہ خاوند فوت ہو جائے تو وفادار بیوی کا یہی کام ہے کہ اس کی لاش کے ساتھ وہ خود بھی چتا میں جل کر سستی کی رسم ادا کرے۔ اس کے برعکس اسلام کا نقطہ نظر بالکل مختلف ہے۔ قرآن پاک میں مختلف مقامات پر حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا گیا ہے، تو وہاں حضرت حوا کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کی غلطی کا بھی اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے۔ اللہ نے جنت کا ممنوعہ پھل کھانے، جنت کے لباس سے محروم ہونے، پھر جنت کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپنے، پھر جنت سے نکلنے کے ہر مرحلے کو تشنہ کے صیغے سے بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

”پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکایا تا کہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے چھپائی گئی تھیں، ان کے سامنے کھول دے تو اس نے ان سے کہا: ”تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں ہمیشہ کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔ پھر اس نے قسم کھا کر ان دونوں سے کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اس طرح دھوکہ دے کر رفتہ رفتہ وہ ان دونوں کو اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب ان دونوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانپنے لگے، تب ان کے رب نے دونوں کو پکارا: ”کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟“ اس پر دونوں بول اٹھے: ”اے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔“ [۱]

اس پورے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں نے غلطی کی، دونوں کو سزا ملی، اور پھر دونوں نے اللہ سے معافی مانگی۔

لہذا اسلام نے اور قرآن نے عورت پر سے یہودیت و عیسائیت کا الزام دور کر کے ہر شخص کو اپنی غلطی کا خود ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اسلام کے نزدیک عورت اپنے شوہر کی معاون، اس

کی وزیر، اس کی مشیر اور اس کی رفیقہ حیات ہے۔ اپنے گھر کی ملکہ ہے، وہ شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی ذمہ دار ہے۔ وہ انبیاء اکرام، صدیقین اور شہداء کو اپنی آغوش میں پروان چڑھانے والی اور ان کی تربیت کرنے والی ہے۔ وہ ”خیر کی بنیاد“ ہے۔ اسی کی تربیت سے نسلِ نو بنتی ہے اور سنورتی ہے، نیک عورت کو اپنے شوہر کے لیے دنیا کی بہترین متاع کہا گیا ہے اور اولاد کے لیے ماں سے حسنِ سلوک کا اتنا زیادہ حکم ہے کہ باپ سے تین درجہ زیادہ اسے حسنِ سلوک کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ جنت ماں کے قدموں تلے رکھ دی گئی ہے۔ غرض اسلام کے نزدیک عورت کا گھر اس کی جنت ہے جہاں وہ اپنے شوہر کی رفیقہ ہے اور شوہر اس کا ہمدرد، سب بچے اور گھر والے اس کے فرمانبردار، مطیع اور خیر میں اس کے ساتھ تعاون کرنے والے سچے اور مخلص ہمدرد ہیں۔ اب ہم مختصر طور پر اس مسئلے پر اسلام کا موقف بیان کرتے ہیں:

- 1- اسلام میں عورت و مرد میں بحیثیت انسان کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا درجہ اور فضیلت یکساں ہے۔ اول اور دوم کی درجہ بندی نہیں پائی جاتی۔
- 2- دینی معاملات میں بھی مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق یا امتیاز نہیں، دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں یکساں ذمہ دار اور یکساں جوابدہ ہیں۔
- 3- البتہ تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کے لیے دونوں کو ان کی فطرت، جسم اور صلاحیت کے مطابق علیحدہ علیحدہ ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔ پھر انہی ذمہ داریوں کے لحاظ سے ان کے دائرہ کار مقرر کیے گئے ہیں، اسی دائرہ کار کے مطابق ان کو احکام دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ بیرون خانہ کے تمام کام مثلاً سیاست، معیشت، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، فوجی دفاع مردوں کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں لہذا وہ ان کے ذمہ دار ہیں۔ جبکہ آئندہ نسل کی تخلیق، پرورش، کفالت اور تربیت، خانہ داری وغیرہ کے جملہ کام عورت کی فطرت سے مطابقت رکھتے ہیں لہذا یہ تمام کام اس کی ذمہ داری قرار دیئے گئے، پھر اسی کے مطابق خواتین کو احکام بھی دیئے گئے۔
- 4- پھر اس فطری اور جسمانی اختلاف کی بنا پر کچھ احتیاطی اقدامات لازم کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

☆ مومن مرد اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ اسی طرح مسلم خواتین بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

☆ گھر کے اندر بھی عورتوں کا پورا جسم ڈھکا ہوا ہو اور اس طرح سر پر دوپٹہ لیں جو سر اور سینہ

ڈھانپ دے۔

☆ گھر کے اندر بھی غیر محرم رشتہ داروں کے سامنے زیب و زینت سے بچا جائے۔

☆ رشتوں میں محرم اور غیر محرم کی تمیز جو اسلام نے قائم کی ہے، اس کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

☆ بلا ضرورت گھر سے باہر جانے سے گریز ضروری ہے۔ اگر باہر جانا پڑے تو بھی سادگی

سے برقع یا چادر کے ساتھ نکلے۔ غیر محرم رشتہ داروں کے ساتھ سفر کرنا منع ہے، چاہے وہ

سفر حج ہی کیوں نہ ہو۔

5۔ اب یہ مسئلہ رہ گیا کہ گھر کے اندر کون بڑا ہو؟ یاد رہے کہ حسن انتظام کے لیے ہر ادارے

میں بھی ایک سربراہ ہونا ضروری ہے۔ لہذا مرد کی طاقت، قوت، کما کر گھر والوں کو کھلانا،

پھر اس کی عقل اور قوت فیصلہ اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ یہ منصب مرد کو دیا جائے، لہذا

گھر کی سربراہی یا صدارت اللہ تعالیٰ نے مرد کو دی ہے۔

6۔ مرد کو اپنی بیوی سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور عورت کو شوہر کی فرمانبرداری و خدمت

اور بچوں کی تربیت کے لیے گھر کا محاذ سنبھالنے کی تاکید کی گئی ہے۔ خواتین ان واضح

ہدایات کی موجودگی میں کیسے مردوں کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم چل سکتی ہیں، بلکہ وہ

اشد مجبوری کے بغیر گھر کے باہر قدم ہی کیسے رکھ سکتی ہیں؟ پھر بچوں کی تعلیم و تربیت کیسے

ہو، ان کو اخلاق و آداب، تہذیب و شرافت کیسے سکھائی جائے؟ لہذا چند اہم شعبے چھوڑ کر

(جہاں خود خواتین ہی کی ضرورتوں کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہے۔ مثلاً خواتین کی

تعلیم یا ان کا علاج معالجہ وغیرہ) عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا نقصان کے بہت سے پہلو

اپنے اندر رکھتا ہے۔ ذیل کے چند اہم نکات پر غور کرنا اس کے لیے کافی ہوگا:

بچوں کے لیے والدہ کی اہمیت:

کسی بھی بچے کو پوچھ کر دیکھا جائے، اس کی پہلی ضرورت اس کی ماں ہے۔ بچے سکول

سے یا باہر سے گھر آئیں تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ امی کہاں ہیں؟ اور اگر امی ہی گھر میں نہ ہو تو بچوں کے موڈ بگڑ جاتے ہیں، خواہ مخواہ ضد کرنے لگتے ہیں، گھر کا ساز و سامان توڑنے لگتے ہیں۔ دراصل وہ ماں کی موجودگی سے ایک غیر معمولی فرحت و انبساط محسوس کرتے ہیں اور بصورت دیگر ان کے دل بجھ کر رہ جاتے ہیں۔

گھر سے باہر نکلتے وقت مسائل:

ماں کام کے لیے دفتر، فیکٹری، کارخانہ وغیرہ جاتی ہے۔ باپ تو پہلے ہی گھر میں نہیں ہے، کیا گھر میں تالا لگا کر جائے، یا بچوں کو اکیلا چھوڑے یا کوئی آیا وغیرہ گھر میں رکھے؟ گھر سے باہر نکلتے وقت سو بار عورتوں کو سوچنا پڑتا ہے۔ اگر تالا لگاتی ہے تو پھر بچے سکول سے آکر کیا کریں گے یا بچے گھر میں موجود ہیں تو ان کو اکیلا چھوڑ کر باہر سے تالا کیسے لگایا جائے؟ کیا کسی ملازمہ کا بندوبست کیا جائے؟ اس ملازمہ کو بھی تو آخر تنخواہ دینی پڑے گی، تو پھر اپنی کمائی سے کیا فائدہ ہوا؟ جمع حاصل کیا بنا؟ مگر ماں کی غیر موجودگی سے بچوں کے دل و دماغ، ان کی نفسیات اور ان کے عادات و اخلاق پر جو اثر پڑا اس کی تلافی کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر وہ ملازمہ جاہل، گالم گلوچ کرے گی، اس طرح بچوں کے اخلاق کے بگاڑ کا باعث بنے گی اور اگر وہ شریف و قابل ہے تو پھر اس کو زیادہ تنخواہ چاہیے۔ اس کو تنخواہ دینے کے بعد آخر گھر سے باہر نکلنے والی عورت کے پلے کیا پڑا؟ بچوں کا مستقبل کتنا برباد ہوا؟ اس پہلو سے جتنا بھی سوچا جائے تو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کے بے شمار نقصانات نظر آتے ہیں۔ انسان حاصل کم کرتا ہے مگر نقصان زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں عورت گھر میں ہی رہے، میاں کی آمدن کو ہی کفایت شعاری سے استعمال کرے، اگر پھر بھی آمدنی کم پڑے تو گھر میں سلائی وغیرہ کر کے کمی پوری کر لے مگر باہر نہ جائے، باہر جانے کی شکل میں اس کے اپنے لعل و جواہر اور اس کے اپنے جگر کے ٹکڑے جو حسن تربیت ملنے سے دین و دنیا میں سرخرو کرنے کے ضامن ہیں، اس کی عدم توجہ سے وہی گالم گلوچ کرنے والے، بد اخلاق، بد تمیز، تعلیم بیزار، تشدد مار دھاڑ کے عادی، چوراچکے بن جائیں، اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دور اور دین بیزار بن جائیں تو پھر عورت کو چند ٹکے حاصل کر کے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا؟ اپنی اصل

دولت (اولاد) تو بگڑ گئی اور دنیا و آخرت میں بے سکونی و رسوائی کا سبب بن گئی۔

فیملی پلاننگ:

اگرچہ بعض افراد نے عورت کی ملازمت یا بیرون خانہ امور کی انجام دہی سے پیش آنے والے مسائل کا حل اس میں ڈھونڈ لیا ہے کہ فیملی پلاننگ پر کاربند ہوا جائے۔ بچے ہی سرے سے نہ ہونے پائیں۔ نہ رہے بانس نہ بچے گی بانسری یا پھر اگر بچے ہوں بھی تو انتہائی مختصر تاکہ مسائل کا دورانیہ زندگی کے معمولات کو زیادہ دیر تک اپ سیٹ نہ کر سکے۔ لیکن یہ حقائق سے نظر چرانے والی بات ہے۔ بچے دو ہوں یا تین۔ مسائل تو بہر صورت پیش آئیں گے اور پھر فیملی پلاننگ کی قباحتیں اس پر مستزاد ہیں۔ جن کی وضاحت باب نمبر 5 ”عورت کا مقصد وجود“ میں کی گئی ہے۔^[۱]

مخلوط ثقافت:

مخلوط ثقافت جو مغرب کے نعرہ ”آزادی نسواں“ اور ”حقوق نسواں“ کی اصل جان ہے، اسلامی نظریہ کے بالکل برعکس ہے۔ جب عورتیں کمانے کی خاطر گھروں سے باہر نکل آتی ہیں تو پھر مردوں کے ساتھ کام کرنے کے لیے آہستہ آہستہ شرم و حیا کو بھی جواب دینا پڑتا ہے۔ برقع، چادر اترتی ہے پھر سر ننگے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ گلے اور آستینیں عریاں ہونے لگتی ہیں پھر کپڑے، زیور، میک اپ، فیشن اور آرائش و زیبائش کی ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے اور عورتیں اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اپنے ہی کپڑے، زیور اور میک اپ وغیرہ پر پھونک ڈالتی ہیں۔ دوسری طرف اس سے معاشرہ میں بے حیائی اور عریانی کا سیلاب شروع ہو جاتا ہے۔ ہوسناک نگاہیں تعاقب کرتی ہیں، چھیڑ خوانی شروع ہوتی ہے۔ پھر عورتیں شکایت کرتی ہیں کہ مرد ہمیں چھیڑتے ہیں، جب آپ خود ہی دعوتِ نظارہ دے رہی ہیں تو الزام مردوں پر کیوں؟ کچھ نگاہ اپنے طرزِ عمل پر بھی تو ڈالنی چاہیے۔ ایسی ہی خواتین کے بارے میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

[۱] اسی موضوع پر راقمہ کی ایک کتاب ”اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ“ (صفحہ 223) کا مطالعہ بھی مفید

ما ترکت من بعدی فتنۃ اضر علی الرجال من النساء [۱]
 ”میں نے اپنے بعد عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ مردوں کے لیے ضرر رساں نہیں
 چھوڑا۔“

آپ ﷺ کا ایک اور فرمان ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے:
 ”عورت پردہ کی چیز ہے۔ جب وہ گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاک
 جھانک کرتا رہتا ہے۔“ [۲]

پھر دفتر، دکان، کارخانہ میں غیر مردوں کے ساتھ کام کرنا، ان کا سیکرٹری بننا، ان کی خدمت
 کرنا، کیا اس کا نام ترقی ہے؟ کیا یہی دور جدید کا تقاضا ہے کہ گھر میں اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے
 کام نہ کرو؟ گھر کی چار دیواری میں رہنا تو قید کے برابر ہے، یہ تو رجعت پسندی اور دقیانوسیت ہے،
 یہ پرانا طریقہ ہے لیکن اگر وہی عورت ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس بن کر چار سو آدمیوں کو کھانا
 کھلائے، ان کے سامنے ٹرے سجا کر لے جائے اور ان چار سو ہوسٹس کا نگاہوں کا نشانہ بنے یا ہوٹل
 میں ویٹرس بن کر ہر ایک کی خدمت کرے، کسی کی سیکرٹری بن جائے، کہیں ٹیلیفون آپریٹر ہو جائے،
 ٹینو گرافر بن جائے، کال گرل بنے، گلوکار، فلمسٹار بن کر سامعین اور حاضرین کے دل لہائے،
 ماڈل گرل بن کر جسم کی نمائش کرے تو یہ سب آزادی اور ترقی ہے مگر گھر میں شوہر، بچوں، والدین
 کے لیے کام کرے تو یہ رجعت پسندی ہے اور دقیانوسیت۔ خوب کہا کسی نے

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
 جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

آج کی مادہ پرستانہ تہذیب نے پیسے کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ تنخواہ اور مساوات کے
 لالچ میں عورت نے جو وقت گھر سے باہر خرچ کیا، اس میں کوئی خیر و برکت نہیں۔ اس میں کوئی
 راحت و تسکین نہیں۔ اس کے مقابلے میں وہ وقت جو ایک مومن عورت اپنے گھر میں اپنے شوہر

[۱] البخاری، کتاب النکاح

[۲] سنن ترمذی

اور بچوں پر خرچ کرتی ہے، وہ اس کی زندگی کا حاصل اور اس کے لیے سچی راحت و خوشی و سکون کا باعث ہے۔ اس کے بعد اصل معاوضہ و اجر اللہ کے ہاں ملے گا (تاہم اگر کوئی عورت کسی واقعی مجبوری کے تحت پردہ و حجاب کی حدود کو ملحوظ رکھ کر کام کرے تو اسلام اس پر کوئی قدغن عائد نہیں کرتا، وہ بھی اللہ کے ہاں اجر کی مستحق ہے)۔

مسلمان عورت سے دین کے تقاضے:

آج تہذیبِ جدید نے کچھ ایسا فریب دے دیا ہے کہ ”گھر کی نصف آبادی بے کار پڑی ہے، اس کو ملک کی خدمت کے لیے باہر نکالو۔“ اور مسلمان عورت اس فریب کا شکار ہو گئی ہے۔ جب اللہ ہم سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ تمہارے ذمے دنیا کے کسی فرد کی خدمت واجب نہیں، نہ تمہارے کندھوں پر کسی ذمہ داری کا بوجھ ہے، تم ہر بوجھ اور ذمہ داری سے آزاد ہو لیکن صرف ایک بات ہے کہ اپنے گھروں میں قرار سے رہو، اپنے شوہر کی اطاعت کرو، اپنے بچوں کی تربیت کرو، یہی تمہارا فریضہ ہے، اس کے ذریعے سے تم قوم کی تعمیر کر رہی ہو، ملکی ترقی، مسلمانوں کی ترقی، مستقبل کی تعمیر میں اپنا پورا حصہ ڈال رہی ہو۔۔۔۔۔ آخرت میں اس کا پورا پورا اجر و وصول کرو گی تو یہ جو عزت کا مقام ہمیں اللہ دے رہا ہے۔۔۔۔۔ دنیا کا سکون اور آخرت کا اجر، کیا یہ بہتر ہے یا وہ ذلت کا مقام جو گھر سے باہر نکل کر عورت کو سہنا پڑتا ہے؟

پھر جب خواتین دوہرے بوجھ اٹھاتی ہیں، اپنے فطری وظائف بھی ادا کرتی ہیں اور کسبِ معاش میں بھی حصہ ڈالتی ہیں تو کیا اس طرح وہ اپنے گھر میں عزت کا مقام پالیتی ہیں؟ میرا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ دو گنا کام کرنے کے باوجود شوہر کبھی عورت کا شکر گزار نہیں ہوتا، اس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ عورت پر غلبہ و کنٹرول رکھے۔ بسا اوقات مرد یہ دیکھ کر کہ اب ان کی بیویاں کما رہی ہیں، خود کسبِ معاش میں ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ سارا دن گھر پڑے اینڈ تے رہتے ہیں اور تھکی ماندی عورت کے اوپر حکم چلاتے رہتے ہیں۔

آخر اکیلی عورت ہی قوم کی تعمیر کی ذمہ دار کیوں؟ کیوں عورت مردوں کے مقابلے پر آنے کے لیے اپنی جان ہلکان کر رہی ہے؟ لاکھ کمائی کرے مگر وہ مرد نہیں بن سکتی ہے، رہے گی تو

عورت ہی البتہ اس کی کمائی کے بل بوتے پر اس کا شوہر کلچر کے ضرور اڑاتا ہے اور ساتھ اسے ذہنی دباؤ میں بھی مبتلا رکھتا ہے۔ مساوات کا نعرہ ہے ہی غیر فطری اور غیر طبعی۔ آخر مساوات مرد و زن کا نعرہ لگا کر عورت کو مرد بننے پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے؟ کبھی کسی مرد نے بھی عورت بننے کی کوشش کی ہے! اگر یہ مساوات فطری ہے تو پھر لازماً مردوں کو بھی عورتوں کے برابر آنے کے لیے مظاہرے اور جلسے جلوس کرنے چاہئیں تھے۔ عورتوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کی نسائیت کو اس نعرے سے کتنا شدید نقصان پہنچا ہے۔ اللہ و رسول ﷺ نے تو عورت کو صنف نازک قرار دے کر اس کی دلجوئی کرنے کا حکم دیا تھا، یہاں عورتیں خود ہی اپنی نزاکت کو لات مار کر مرد بننا چاہتی ہیں۔ اس سے وہ مرد و نہ بن سکیں، لیکن مردوں کی نسبت دوہرے کام پر مجبور ہو گئیں۔

لمحہ فکر یہ:

یہ پاکستان، وطن عزیز، جو نظریہ کی بنا پر وجود میں آیا ہے، اس کی سرحدیں دراصل نظریہ کی لکیریں ہی تو ہیں، اگر ہمارا نظریہ کمزور پڑا تو ہماری سرحدوں کی لکیریں بھی خدائے خواستہ مٹ سکتی ہیں۔ ہم اتنے کوتاہ نظر کیوں ہیں کہ ہمیں ننگے سر، ننگے بازوؤں میں، آزادی کے ساتھ بنی سبھی عورتوں کے باہر گھومنے میں اپنے نظریہ کی ٹوٹ پھوٹ کا پہلو نظر نہیں آتا! لا دینیت (سیکولرازم) کے دعویدار (فرانس اور ترکی و مصر میں) مسلم طالبات کو سر پر سکارف لینے کی اجازت نہیں دے سکتے، کہ اس میں انھیں مذہبی پہلو نظر آنے لگتا ہے اور ہم نظریہ کے وارث ہوتے ہوئے لا دینی کلچر، لا دینی روایات اور لا دینی ثقافت کو اپنے ہاں بھرپور فروغ دے رہے ہیں۔ آرٹ اور کلچر کے نام پر، آزادی نسواں اور مساوات مرد و زن کے نام پر، ہمارے نظریاتی پہلو کو کیوں کمزور کیا جا رہا ہے [۱] اوپر سے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ کام تو اسلام میں جائز ہے۔ یہ تو ہے ہی اسلام کے

[۱] ورلڈ کپ ۹۶ء میں پاکستان کی کرکٹ ٹیم اور خود پاکستانی ٹی۔وی نے جس ثقافت کا مظاہرہ کیا اس پر سونیا گاندھی (ہندوستان کے ایک فوت شدہ ہندو لیڈر راجیو کی بیوہ) نے تبصرہ کیا کہ ”ہم نے دو قومی نظریہ کو پاش پاش کر دیا ہے۔ پاکستانی ریڈیو اور ٹی۔وی ہماری ہی ثقافت پیش کر رہے ہیں اور پاکستانی لڑکے لڑکیاں ہمارا لباس پہننے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔“

مطابق، اسلام تو ترقی پسند دین ہے۔ یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے! آخر ہماری پڑھی لکھی خواتین کیوں اسلام کے احکام کو من پسند بنوانے کی کوششوں میں لگی ہیں! کیا خلاف شریعت کام کرنے سے جو دل میں ٹیس اٹھتی ہے، ضمیر میں خلش محسوس ہوتی ہے ان کا مقصد ہے کہ وہ بھی ختم ہو جائے۔ چنانچہ قانوناً شریعت میں تبدیلی کروالی جائے، ناجائز کو جائز کرالیا جائے تاکہ دل مطمئن رہیں اور خلاف شریعت کام کرنے کی ملامت سے ہم اپنے نفس کو محفوظ کر سکیں۔

سچی بات یہ ہے کہ جس نے بھی اللہ سے بندگی کا عہد کر رکھا ہے، وہ اس مساوات کا قائل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ مساوات جو بالکل مصنوعی ہے اور مذموم مقاصد لیے ہوئے ہے، مسلمانوں میں کھلی عریانی و بے حیائی پھیلانے والی ہے۔ انہیں شریعت کا تمسخر اڑانے اور اس کی حدود کو عمداً پامال کرنے کا درس دیتی ہے۔ ہر سچا مسلمان اس مخلوط ثقافت کا لازماً مخالف ہوگا۔ مسلمان مرد اس لیے کہ اس کے گرد بنی سنوری عورتوں کا جھگٹا اس کے اپنے دین و ایمان کے لیے خطرہ ہے اور پاک دامن مسلمان عورت بھی اس صورت حال کو اپنے شایانِ شان نہیں سمجھ سکتی۔ پھر نسلِ نو کی بربادی و تباہی اور خاندانی نظام کی ابتری کے جو نقصانات ہیں، ان کی تلافی بھی کسی دوسرے طریقے سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔

میں بلبِلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

اسلامی اور مغربی نظریہ کا تقابلی جائزہ

اہل مغرب مرد و زن میں جس مساوات کے قائل ہیں، اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کو یکساں صلاحیتیں اور قوتیں دی ہیں۔ جو کچھ مرد کر سکتا ہے بعینہ وہ سب کچھ عورت بھی کر سکتی ہے۔ لہذا معاشرہ میں دونوں کا دائرہ کار بھی یکساں ہونا چاہیے اور حقوق و فرائض بھی یکساں ہونے چاہئیں۔ اس کے برعکس اسلام کے نزدیک دونوں کی صلاحیتیں الگ الگ ہیں۔ لہذا دونوں کا دائرہ کار بھی الگ الگ ہے۔ ہر جنس کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق تمدنی ذمہ داریاں دی گئی ہیں۔ پھر دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر اللہ کے ہاں یکساں قدر و قیمت اور اجر و ثواب کے مستحق ہیں۔

تجزیہ:

مساوات کے یہ دونوں نظریے اپنی اساس، بنیاد، دائرہ کار اور نتائج میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جس طرح مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے دونوں کو یکجا نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح مساوات کے دونوں نظریات کو جمع کرنا ناممکن ہے۔ اگر کوئی مغربی نظریہ مساوات مرد و زن کا قائل ہے تو وہ اسلام کا نام لینا چھوڑ دے اور اگر کوئی اسلام سے وابستہ رہنا چاہتا ہے تو مغربی نظریہ مساوات کو دل سے نکال دے۔ ان دونوں کا پیوند ایک دوسرے کے ساتھ نہیں لگایا جاسکتا اور اگر مسلمان رہتے ہوئے مغربی نظریہ مساوات کو اختیار کرنے کی کوشش کی گئی تو اس سے ہماری ساری حیات اجتماعی کے بگڑ جانے کا احتمال ہے۔ پورے اجتماعی نظام کو برباد کر کے ہمیں حاصل کچھ نہ ہو سکے گا۔ یہ منافقت ہمیں بالکل کھوکھلا اور بے وزن کر کے رکھ دے گی۔

مغربی نظریہ مساوات اپنی ابتدائی حالت میں بڑا معصوم اور سادہ نظر آتا ہے اور ظاہر بین نگاہوں کو اپیل بھی بہت کرتا ہے۔ مگر ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے اور اس کو بنیاد بنا کر معاشرتی زندگی کی تعمیر شروع کی جائے تو فوراً اس کی خرابیاں آشکارا ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً ذیل میں چند نکات

ملاحظہ کیجئے:

الگ صلاحیتیں، الگ دائرہ کار:

اسلام تو مرد اور عورت دونوں کی فطری اور جسمانی صلاحیتوں کے لحاظ سے معاشرے میں ان کو الگ الگ ایسا دائرہ کار مہیا کرتا ہے، جس میں کام کر کے وہ بہترین طریقے پر معاشرے کو فائدہ پہنچا سکیں اور تعمیر تمدن میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اس کے برعکس مرد و عورت دونوں کو مغربی نظریہ مساوات یکساں صلاحیتوں والا قرار دے کر دونوں کو ایک ہی حیثیت سے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عورت اپنی فطری صلاحیتوں کے برعکس دوسرے مقام پر استعمال کی جاتی ہے تو اس کا اپنا تشخص اور صحت بھی برباد ہوتی ہے اور معاشرہ بھی اس کے خراب نتائج سے نہیں بچ سکتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مرد بار آور تو کر سکتا ہے مگر وہ حمل، زچگی اور رضاعت کی ذمہ داریاں نہیں ادا کر سکتا، نہ ہی وہ بچوں کی پرورش اور خانہ داری کی الجھنوں کو سلجھانے کا کام کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس عورت بار آور تو نہیں کر سکتی مگر وہ ذریعہ تخلیق ضرور ہے۔ پھر وہ گھر سنبھالنے کے لیے تو خداداد قابلیت رکھتی ہے، مردوں کی طرح میدان جنگ کے معرکے سر نہیں کر سکتی اور سڑکیں و پل نہیں بنا سکتی۔ یہ دونوں کے درمیان ان کی صلاحیتوں کی بنا پر فطری و قدرتی تقسیم ہے۔ اگر مرد کو حمل نہ ہو سکتا، گھر کے معاملات کو سلجھانہ سکتا، بچوں کی پرورش نہ کر سکتا، کوئی عیب نہیں ہے تو پھر عورت کے لیے مردانہ کام کیوں اور کس اصول کے تحت ضروری قرار دیئے جائیں؟ اگر عورت فطری حد بندیوں کو توڑ کر مرد کے دائرہ کار میں گھسنے کی کوشش کرے گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی اپنی بقائے نسل اور خاندانی نظام کے تحفظ کی صلاحیتیں تو برباد ہوں گی مگر مردوں کے کام بھی وہ اچھی طرح نہ کر سکے گی اور لازمی نتیجہ پوری معاشرتی زندگی کے بگاڑ کی شکل میں نمودار ہوگا۔

عورت کی ذمہ داریوں کا احترام:

پھر اسلام تو عورت کی ذمہ داریوں کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کی نگاہ میں گھر کے ادارے انسان سازی کے ادارے ہیں جہاں اگلی نسلوں کی تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ کام تمام بیرونی کاموں کے مقابلے میں اہم اور ضروری ہے۔ لہذا عورت بحیثیت ماں اتنی قدر کی مستحق ہے

کہ جنت اسی کے قدموں تلے رکھ دی گئی ہے اور مرد کے مقابلے میں اس کو تین گنا زیادہ مقام دیا گیا ہے۔ بحیثیت بیٹی وہ اللہ کی رحمت ہے، ہر بوڑھی خاتون سب کی ماں ہے اور بیوی کو وہ مقام حاصل ہے کہ دنیا کی بہترین متاع نیک بیوی کو قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس مغربی نظریہ کے مطابق عورت کے لیے ماں یا بیوی بننا باعثِ حقارت ہے۔ اس کی عزت اس میں ہے کہ وہ باہر نکل کر فیکٹریوں، کارخانوں، اداروں وغیرہ میں کام کرے، سڑکیں کوٹے، پل بنائے، کال گرل بنے۔ اب فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ عورت کا وہ استعمال مناسب اور تعمیری ہے جو مغرب میں ہو رہا ہے یا وہ فرائض اور پھر قدر و منزلت اہم ہے جو اسے اسلام دے رہا ہے؟

اسلام اس نظریہ مساوات کا بہت سخت مخالف ہے جہاں دونوں اصناف کا ایک ہی میدان کار ہو۔ ہر دفتر، کارخانہ، کھیت، بازار، تعلیم گاہ، ہسپتال، ہوائی جہاز، پارلیمنٹ ہاؤس ہر جگہ شانہ بشانہ دونوں مصروف عمل ہوں اور ان میں کوئی محرم غیر محرم کا امتیاز نہ ہو۔ ایسی مخلوط سوسائٹی میں تو بے حیائی، فحاشی، عریانی کا وہ خوفناک طوفان اٹھتا ہے جسے اسلام کسی قیمت پر گوارا نہیں کرتا، اسلام کو تو یہ بھی گوارا نہیں کہ عورتیں مردوں کا سالباس پہنیں یا رفتار و گفتار میں ان جیسا بننے کی کوشش کریں۔ اللہ نے جس کو جو کچھ بنادیا ہے وہ اس پر مطمئن اور قانع رہے، اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا رہے تو وہ اس کا پورا پورا اجر و معاوضہ اللہ سے وصول پائے گا۔ ارشادِ باری ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ ط لِّلرَّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ط وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِنْ فَضْلِهِ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ [۱]

”جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے اس کی تمنانہ کرو۔ مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انہوں نے کمایا، اور اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔“

اس آیت سے واضح ہو رہا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنے کے بجائے اپنے اپنے حصہ کی نعمتوں پر اللہ کے شکر گزار رہیں اور ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اللہ نے اپنے فیض سے مرد و عورت دونوں کو یکساں فیضیاب کیا ہے۔ اگر مرد کو مادہ تخلیق دیا ہے تو عورت کو ذریعہ تخلیق بنایا ہے اور تعمیرِ نسل کا فریضہ اس کو دیا ہے۔ اگر مرد حکمرانی و جہان بینی کی صلاحیت رکھتا ہے تو عورت گھر بنانے اور سنوارنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مرد کے اندر اگر سختی، قوت اور عزیمت کے اوصاف ہیں تو عورت کے اندر دلربائی، دلکشی، شیرینی، نرمی اور محبت ہے۔ کچھ علوم و فنون سے لگاؤ مرد کو ہے تو کچھ خاص علوم و فنون سے عورت کو بھی فطری مناسبت ہے۔ غرض یہ کارخانہ قدرت اپنی زیب و زینت کے لیے مرد اور عورت دونوں کے اوصاف کا یکساں محتاج ہے۔ تمدن ان دونوں کی فطری صلاحیتوں کی ہم آہنگی سے ہی ترقی پذیر ہو سکتا ہے۔ اگر ایک بھی صنف تمدن کی تعمیر میں اپنا اصل کردار ادا نہ کرے تو تمدن ٹھٹھرا کر رہ جاتا ہے۔

ایک اہم تقاضا:

مغربی فلسفہ مساوات کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ عورتوں کی کتاب ہدایت الگ ہوتی، انکی پیغمبر یا معلمہ الگ ہوتی اور اس سے براہِ راست اللہ کے احکام حاصل کیے جاتے۔ مگر خالق کائنات نے ایسا نہیں کیا۔ تو کیا اس صورت میں مساوات کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔۔۔؟

مرد کی نقالی کی ممانعت:

نہ تو مرد کے لیے زیبا ہے کہ وہ عورت کی ادائیں اختیار کرے یا اس کی دلربائی و دلکشی کی ریس کر کے مردِ مونث بنے اور نہ یہ عورت کے لیے بات مناسب ہے کہ وہ مردانہ چال ڈھال، رفتار و گفتار اختیار کرے یا مردانہ کام کر کے زنِ مذکر بنے۔ اس قسم کی چھپھوری حرکتیں کرنے والے دراصل اللہ کی تقسیم کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ پر (نعوذ باللہ!) لعن طعن کرتے ہیں اور ”کو اچلا ہنس کی چال، اپنی بھی کھو بیٹھا“ کے مصداق بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ کیجئے:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

أنه لعن المتشبهين من الرجال بالنساء والمتشبهات
من النساء بالرجال [۱]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار
کریں اور ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں، لعنت فرمائی ہے۔“

ایک اور روایت ہے، حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

فقلت لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الرجل من
النساء [۲]

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زنانہ مذکر پر لعنت فرمائی ہے۔“

اس مضمون کی اور بھی کئی روایات ہیں، جن میں یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر صنف کو اپنی اپنی
حدود کے اندر رہ کر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنی چاہئیں اور اپنی ذمہ داریوں پر اللہ سے یکساں اجر
کی امید رکھنی چاہیے۔ عورتوں کے لیے مردوں کی ادائیں اختیار کرنا نقصان دہ ہے۔ دنیاوی لحاظ
سے اور آخرت میں ان کے لیے سزا تیار ہے۔ اس کے برعکس اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا
رضائے الہی کا باعث ہے اور تمدن کی ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

ایک دفعہ ایک خاتون صحابیہؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ نام
اسماء بنت یزید انصاریؓ تھا۔ وہ خواتین کے ایک وفد کی طرف سے آپؐ کے سامنے پیش ہوئیں
اور عرض کیا: ”اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے، چنانچہ
ہم آپؐ پر ایمان لائیں، ہم نے آپؐ کی پیروی کی۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خواتین پردے
میں رہنے والی اور گھروں میں بیٹھنے والی ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ مرد ہم سے اپنی خواہش پوری
کرتے ہیں اور ہم ان کے لیے بچے سنبھالتی ہیں۔ مرد نماز باجماعت اور نماز جمعہ، نماز جنازہ اور
جہاد وغیرہ میں شامل ہو کر ہم سے اجر میں سبقت لے گئے۔ وہ جب جہاد میں جاتے ہیں، ہم ان
کے گھر بار اور ان کے بچے سنبھالتی ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا اجر میں ہم کو بھی حصہ ملے گا؟“ نبی

[۱] سنن ابی داؤد

[۲] ایضاً

پاک صلی اللہ علیہ وسلم اس عورت کی تقریر سننے کے بعد صحابہ کرامؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ”کیا تم نے اس سے عمدہ کسی عورت کی تقریر سنی ہے، جس نے اپنے دین کی بابت سوال کیا ہو؟“۔ صحابہ کرامؓ نے قسم کھا کر اقرار کیا: ”نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم“ پھر نبی پاکؐ حضرت اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

”اے اسماءؓ! میری مدد کرو اور جن خواتین نے تمہیں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے، ان تک میرا یہ جواب پہنچا دو کہ تمہارا اچھی طرح خانہ داری کرنا، اپنے شوہروں کو خوش رکھنا اور ان کے ساتھ موافقت کرنا، مردوں کے ان سارے کاموں کے برابر ہے (ثواب میں) جو تم نے بیان کیے ہیں۔“ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر حضرت اسماءؓ خوش خوش اللہ کا شکر ادا کرتی واپس چلی گئیں۔^[۱]

سید قطب اپنی کتاب ”اسلام اور جدید ذہن کے شبہات“^[۲] میں صفحہ 187 پر لکھتے ہیں: ”میں اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مرد و عورت کے درمیان کامل مساوات پر کھوکھلی تقریریں کرنے سے حقیقت کی دنیا میں اس مساوات کو کیونکر رو بہ عمل لایا جاسکتا ہے؟ انسان ہونے کی حیثیت سے مرد و عورت میں مساوات ایک بالکل فطری اور معقول مطالبہ ہے۔ مرد اور عورت خانوادہ انسانیت کے دو یکساں اہم رکن ہیں اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں۔ لیکن زندگی میں اپنے فرائض اور ان کی بجا آوری کے عملی طریقے میں کیا وہ آپس میں مساوی ہو سکتے ہیں؟ کیا اس قسم کی مساوات کبھی ممکن ہے؟ اگر دنیا بھر کی عورتیں بیک زبان اس کا مطالبہ کریں اور اس کے حق میں بڑے بڑے اجتماعات منعقد کریں اور قراردادیں منظور کریں تب بھی اس مساوات کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ اجتماعات اور ان میں منظور کی ہوئی قراردادیں نہ مردوں کی فطرت بدل سکتی ہیں اور نہ عورتوں کی، نہ اس سے دونوں اصناف کے وظائفِ حیات میں کوئی تغیر و تبدل رونما ہو سکتا ہے کہ عورتیں مردوں کے کام کرنے لگیں اور مرد عورتوں کے بجائے حمل، بچوں کی پیدائش اور رضاعت کی ذمہ داری سنبھال لیں۔ پھر عورت کی مخصوص ذمہ داریوں۔۔۔ حمل اور

^[۱] مسند احمد

^[۲] یہ اردو ترجمہ محمد سلیم کیانی نے کیا ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے اور اس کا نام ہے ”شبہات حول الاسلام“

رضاعت۔۔۔ کے لیے مخصوص قسم کی ذہنی صلاحیتیں ناگزیر ہیں۔ انہی کی مدد سے عورت اپنی ان مشکل ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔“

مغرب میں عورت کا بدترین استحصال:

نظریہ مساوات مرد و زن دراصل عورت کے بدترین استحصال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عورت کا طبعی وظیفہ حیات تو بہر صورت آج بھی عورت کو انجام دینا پڑتا ہے، تخلیقِ انسانی تو آج بھی ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے۔ بچہ کی پرورش بہر صورت ماں ہی کی آغوش میں ہوتی ہے، ان کاموں میں تو کوئی مرد عورت کا ہاتھ نہیں بٹا سکتا۔ البتہ ملازمت اور کسبِ معاش میں عورت مرد کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اس طرح معاشرتی زندگی کا ڈیڑھ گنا بوجھ تو عورت پر پڑ گیا اور صرف آدھا حصہ مرد کے حصہ میں آیا۔ کیا یہی وہ مساوات ہے جس کا ڈھنڈورا مغرب پیٹتا رہتا ہے اور جس کو وہ مسلمانوں میں زبردستی رائج کرنا چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ جس طرح مغرب میں اس نام نہاد مساوات کے نتیجے میں گھر کا آرام اور ذہنی سکون ختم ہو گیا ہے اور معاشرہ کے لیے بے شمار مسائل پیدا ہو گئے ہیں، مسلمانوں کو بھی اسی معاشرتی انتشار اور انارکی کا شکار بنا دیا جائے۔ انجام کار کے لحاظ سے یہ راستہ تباہی و بربادی کا ہی ہے۔ مغرب کے زیر اثر یہ تحریک نہ صرف اس طبقے کے مصائب میں اضافہ کرے گی بلکہ معاشرے کو بھی بے شمار نقصانات سے دوچار کرے گی۔

اسلام۔۔۔ خواتین کے حقوق کا واحد ضامن:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِنِسَاءِهِمْ [۱]

”تم میں سے بہتر وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں بہتر ہوں۔“

نیز آپ کا فرمان ہے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي [۲]

[۱] ابن ماجہ

[۲] ابن ماجہ، ترمذی

”تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہو (مجھے

دیکھو) میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہوں۔“

دیکھ لیا آپ نے بزرگی اور نیکی کا معیار! پبلک زندگی میں تو ہر کوئی خندہ رو اور ہنس مکھ ہوتا ہی ہے، اصل خوش اخلاق وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ نرم اور مشفقانہ برتاؤ رکھتا ہے، صبر و تحمل سے اس کی کمی کو دیکھتا ہی کو برداشت کرتا ہے۔ عورت کوئی کنیز یا باندی نہیں جو ہاتھ باندھ کر آقا کے سامنے کھڑی رہے، جو سسرال میں ہر ایک کی خدمت کرتی رہے، مگر اس کا پرسان حال کوئی نہ ہو۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَعَاشِرُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾^[۱] ”بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرو، وہ جوان ہو یا بوڑھی، خوبصورت ہو یا حسن و جمال سے محروم، امیر کبیر والدین کی بیٹی ہو یا خالی ہاتھ آنے والی، بہر صورت وہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری عزت ہے، وہ ایک حیثیت اور مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کی یہ حیثیت اور اس کا یہ مرتبہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیت ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾^[۲] کے ذریعے سے متعین کیا ہے، کہ جس طرح عورت کے ذمے مرد کے حقوق رکھے گئے ہیں بعینہ عورت کے حقوق بھی اللہ نے مقرر کیے ہیں، جو مرد کو ادا کرنا لازم ہیں۔

کیا مرد اپنی فطری ذمہ داریوں پر احتجاج کرتے ہیں؟

اسلام نے تہذیب و تمدن کی سلامتی، ارتقاء اور استحکام کی خاطر پابندیاں صرف عورت پر ہی تو نہیں لگائیں بلکہ مردوں پر بھی عائد کی ہیں اور مردوں کی پابندیاں عورتوں کے مقابلے میں بدرجہا شدید، صبر آزما اور مشقت طلب ہیں۔ مثلاً ملک کے دفاع اور جہاد کا حکم، پورے خاندان کی کفالت، بیوی کو مہر کی ادائیگی، نان نفقہ کی فراہمی، ناچاقی کی صورت میں بھی ماہانہ خرچہ، عدم ادائیگی کی شکل میں بیوی کو عدالتی چارہ جوئی کا حق وغیرہ۔

مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مردوں نے کبھی ان پابندیوں کے خلاف مظاہرے کیے

[۱] النساء: ۱۹

[۲] النساء: ۲۲۸

ہیں؟ انہوں نے اپنے فرائض کی بجا آوری اور اپنی ماؤں بہنوں کی عصمت و حفاظت کے لیے کل بھی جان کے نذرانے پیش کیے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے تو دونوں صنفوں کو ان کی فطرت، افتادِ طبع اور مزاج کے مطابق ذمہ داریاں دی ہیں۔ اس تقسیم سے کوئی نہ تو اول درجے کا شہری بنتا ہے اور نہ کوئی دوم درجے کا۔ آخر مکمل مساوات کے حقیقی تقاضوں پر بھی غور کرنا چاہیے! کیا عورت پر ہر ماہ، ہر سال یا دو سال بعد ایسے طویل دور نہیں آتے جن کے دوران میں وہ غیر معمولی جسمانی اور ذہنی محنت و مشقت کا کوئی کام نہیں کر سکتی، پھر نسلِ انسانی کے حمل، ولادت، رضاعت، پرورش اور تربیت کے ساتھ ساتھ فکرِ معاش کا بوجھ اس کے نازک کندھوں پر لا دینا کیا عورت کے ساتھ ہمدردی ہوگی؟ ان کی فطرت اور جسمانی اہلیت کو مد نظر رکھ کر شریعت خود ان کو جو نرمی، چھوٹ اور مراعات دے رہی ہے، کیا ان کا چھین لیا جانا ان کے لیے باعثِ رحمت ہوگا یا باعثِ زحمت؟ مغربی عورت نے گھر، جو عورت کی پناہ گاہ تھا، اسے خیر باد کہہ دیا۔ چادر جو اس کے محاسنِ جسم کی محافظ تھی، اسے اتار پھینکا۔ بچہ جو اس کے جگر کا ٹکڑا تھا، اسے بچہ گاہوں اور ڈبے کے دودھ کے حوالے کر دیا۔ خاندان جس کی وہ معمار تھی، اس کا شیرازہ بکھیر دیا۔ حجاب جو اسے غیروں کی ہوسناک نگاہوں سے بچاتا تھا اسے تار تار کر دیا، شرم و حیا کو جو اس کا زیور تھی، دورِ جہالت کا ڈھکوسلا قرار دیا۔ اب آپ خود اندازہ کر لیجئے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد عورت نے کچھ حاصل بھی کیا یا صرف اس کی پریشانیوں میں ہی اضافہ ہوا!!!!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ﴾

”مرد عورتوں پر قوام ہیں۔“ (النساء: 34)

گھریلو نظم میں مرد کی سربراہی

- ❁ تمدن کی بنیاد
- ❁ زوجین کا تعلق الفت و محبت کا ہے
- ❁ لتسكنوا اليها کا مفہوم
- ❁ صالح عورت کی ذمہ داریاں قرآن کریم کی روشنی میں
- ❁ مرد خاندان کا سربراہ کیوں ہے!
- ❁ قوام سے کیا مراد ہے؟
- ❁ خواتین کے حقوق
- ❁ مرد فطری طور پر حاکم ہے
- ❁ مادام بوائز کی تحریک --- اور پھر اس کی تحقیق
- ❁ مرد عقلی طور پر برتر ہے
- ❁ واقعتاً مرد نگران ہے گھر کا
- ❁ مرد مالی بوجھ برداشت کرتا ہے
- ❁ کیا عورت گھر کی سربراہ ہو سکتی ہے؟
- ❁ قوام ہونے کے تقاضے
- ❁ کیا عورت گھر میں دوسرے درجے کی شہری ہے؟
- ❁ مغرب میں بھی مرد ہی گھر کا حاکم ہے

گھریلو نظم میں مرد کی سربراہی

اسلام نظم و ضبط کا بہت قائل ہے۔ جب دو آدمی سفر پر نکلیں تو حکم یہ ہے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں تاکہ سفر کے جملہ انتظامات اور پالیسی اس امیر کے فیصلے کے تابع ہو اور سفر میں کوئی بد نظمی پیدا نہ ہونے پائے۔

جو دین ایک چھوٹے سے سفر میں ایک امیر چن لینے کا حکم دے رہا ہے، وہ زندگی کے لمبے سفر میں زوجین میں سے کسی ایک کو سربراہ کیوں نہ بنائے گا!

تمدن کی بنیاد:

کسی بھی تمدن کی بنیاد گھر ہے۔ یہ معاشرہ کا بنیادی یونٹ ہے، جہاں انسان پیدا ہوتا اور پلتا بڑھتا ہے۔ معاشرہ کے استحکام اور مضبوطی کے لیے لازمی ہے کہ اس کا بنیادی یونٹ بھی مضبوط و مستحکم ہو، وہاں ہر کام نظم و ضبط سے ہوتا ہو، گھر کا ایک سربراہ ہو اور گھر کی پوری پالیسی اس کے فیصلے کے تابع ہو، یہ ایک دودن کی بات نہیں، یہ تو زندگی بھر کا سفر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس زندگی بھر کے سفر میں سربراہ خانہ بننے کا حق دار کون ہے؟ قرآن حکیم اس بارے میں بڑی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ مرد ہی سربراہ خاندان ہے۔ اپنی فطری اور جسمانی صلاحیتوں کی بنا پر مرد ہی اس بات کا مستحق بنتا ہے۔ مرد کی قوامیت یا حاکمیت کو سمجھنے سے پہلے اسلام کے خاندانی نظام کی ترکیب کو سمجھنا ضروری ہے۔

زوجین کا تعلق الفت اور محبت کا تعلق ہے:

دین فطرت نے میاں بیوی کا باہمی تعلق الفت اور محبت کی بنیاد پر استوار کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا

إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ
يَتَفَكَّرُونَ ﴿١﴾

”اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔“

﴿لَتَسْكُنُوا إِلَيْهَا﴾ (الروم: 21) کا مفہوم
(تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو)

اللہ رب العزت نے اس آیت قرآنی میں چند امور واضح فرمادیے ہیں:

- 1۔ عورت مرد کے سکون کے لیے پیدا کی گئی ہے۔
- 2۔ خالق کائنات نے عورت کو مرد کا معاون و مشیر بنایا ہے اور مرد کو اس کا محافظ و وکیل، مرد کو اس سے ایک درجہ بلند رکھا ہے۔ اس فضیلت کے حصول میں مرد کی اپنی کسی خواہش یا کوشش کا کوئی دخل نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی سکیم ہے جس کے تحت اس نے مرد و عورت میں یہ درجہ بندی کی ہے۔
- 3۔ دونوں ہم جنس ہیں، اعمال خیر میں دونوں کا ثواب و اجر ایک جیسا ہے۔ دونوں ایک جیسے جذبات، احساسات اور بشری احتیاجات رکھتے ہیں، مگر خلافت کا فریضہ انجام دینے والا اور تمدن کا اصل کار پرداز مرد ہی ہے اور عورت ہر جگہ اس کی معاون و مشیر ہے۔
- 4۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بدست خود پیدا فرمایا مگر اماں حوا کو ان کی پسلی سے۔
- 5۔ مرد دن بھر کام کاج کرنے کے بعد رات کو گھر آئے، آگے اس کو عورت خندہ پیشانی سے استقبال کرنے والی مل جائے تو اسے یک گونہ سکون ملتا ہے اور اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر عورت گھر میں نہ ہو تو اس کا مزاج بگڑ کر رہ جاتا ہے۔
- 6۔ جس مرد کی تربیت میں جتنا زیادہ عورت کا ہاتھ ہو، وہ اتنا ہی آسودہ فطرت، مطمئن اور

اپنے کام کو زیادہ اچھے طریقے سے انجام دینے والا ہوگا۔ جس مرد کو بچپن میں ماں (یا بہن) کے دستِ لطف و محبت نے نہیں چھوا اس کی تربیت خام اور ناقص رہ جاتی ہے، وہ مسلسل احساسِ محرومی و کمتری کا شکار رہتا ہے، بسا اوقات وہ کرخت مزاج، غصیلا اور ابنِ اربل بن جاتا ہے بلکہ بعض ایسے بچے تو جرائم پیشہ بن کر نکلتے ہیں۔

7۔ دورانِ کام میں اگر مرد کو کوئی الجھن یا دشواری پیش آئے تو وہ گھر آ کر بیوی سے مشورہ کرتا ہے۔ پھر دونوں باہمی مشورہ سے اس کا بہتر حل نکال لیتے ہیں، اس طرح مرد کی دماغی کشمکش سکون و اطمینان میں بدل جاتی ہے۔

8۔ عورت مرد ہی کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے۔ یعنی مرد سے نسبت ہی اس کا تشخص ہے۔ مثلاً بنتِ فلاں اور فلاں کی اہلیہ، اُمّ فلاں وغیرہ۔ وہ بادشاہ کے گھر میں چلی جائے تو ملکہ کہلائے گی، دھوبی کے گھر میں جائے گی تو دھوبن کہلائے گی، اسی طرح کسی چمار کے گھر میں جائے گی تو چمارن ہوگی اگرچہ وہ کسی بادشاہ کی بیٹی تھی، ماں باپ نے اسے شہزادیوں کی طرح پالا تھا مگر وہ اپنے شوہر ہی کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔

9۔ اللہ تعالیٰ نے اعمالِ خیر میں عورت کو ہر جگہ مرد ہی کی طرح مکلف بنایا ہے، ہر جگہ اجر و ثواب ان کے ذاتی اعمال پر ہی منحصر ہے۔ مگر تمدنی معاملات میں عورت مرد کے تابع ہی رکھی گئی ہے اور اسی سے تمدن صحیح چل سکتا ہے۔

10۔ عورت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مرد کی جنسی احتیاج کا جواب عورت ہی کے پاس رکھا ہے۔ ممتا کا جذبہ بھی عورت ہی کے پاس رکھا گیا ہے۔ اسی لیے جا بجا مرد کو عورت سے حسنِ سلوک کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

صالح عورت کی ذمہ داریاں قرآن کریم کی روشنی میں:

﴿فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾^[۱]

”پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں۔ وہ مردوں کے پیچھے

اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔“

پھر اس آیت کی وضاحت کئی احادیث سے ہوتی ہے۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان جس میں آپؐ نے نیک اور صالح بیوی کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

(الَّتِي تَسْرُهُ إِذَا نَظَرَ وَتُطِيعُهُ إِذَا أَمَرَ وَلَا تُخَالِفُهُ قِيَمًا يَكْرَهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِهِ) [۱]

”جب شوہر اسے دیکھے تو اسے خوش کرے، کوئی بات کہے تو اسے مان لے اور اپنے نفس اور شوہر کے مال کے معاملے میں وہ کام نہ کرے جس کو اس کا شوہر نا پسند کرتا ہے۔“

اسی طرح حدیث میں بہترین انسان اس کو کہا گیا ہے جو اپنی بیوی کے حق میں بہترین ہے:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِيهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي [۲]

”تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہے اور میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہوں۔“

مرد و عورت کے باہمی محبت و الفت کی ایک لطیف مثال قرآن پاک میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

(هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ) [۳]

”وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔“

مراد یہ ہے کہ جس طرح جسم اور لباس آپس میں لازم و ملزوم ہیں اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں اپنی شخصیت کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ نہ عورت مرد سے بے نیاز ہو کر زندگی گزار سکتی ہے، نہ مرد عورت سے بے نیاز رہ

[۱] مسند احمد، نسائی

[۲] ترمذی

[۳] البقرة: 187

گھریلو نظم میں مرد کی سربراہی

سکتا ہے۔ دونوں کا گہرا باہمی تعلق ہے اور اسی گہرے باہمی تعلق کی درستی پر مثالی معاشرے کی تعمیر ممکن ہے۔

من تو شدم تو من شدى من جان شدم تو تن شدى
تاكس نگويد بعد ازیں من دیگرم تو دیگرى

مرد خاندان کا سربراہ کیوں؟

باوجود یہ کہ میاں بیوی دونوں کا باہمی تعلق محبت و الفت کا ہے، مگر گھر کے ادارہ کو کامیابی سے تبھی چلایا جاسکتا ہے جب اس کا سربراہ انتظامی قابلیت رکھتا ہو فطری صلاحیت، قوت و طاقت کے لحاظ سے اپنے منصب کو سنبھالنے کا اہل ہو، اہل خانہ کی جملہ مادی و روحانی ضروریات کا کفیل ہو۔ چنانچہ اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر مرد ہی اہل ہے کہ یہ منصب اس کو دیا جائے۔ لہذا اسلام نے بھی گھر کا سربراہ مرد کو ہی بنایا ہے تاکہ گھر کے ادارے ٹھیک ٹھاک طریقے سے چلتے رہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ [۱]

”مرد عورتوں کے محافظ ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مرد اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔“

”قوام“ سے کیا مراد ہے؟

”قوامون“ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد ”قوام“ ہے۔ قوام کا مطلب ہے کسی کی حفاظت

و نگرانی کرنے والا، بند و بست کرنے والا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ﴾ [۲] کہ انصاف کے محافظ بن جاؤ (یعنی انصاف کا بہت خیال کرو) تو پھر مراد یہ ہے کہ مرد عورتوں کے محافظ ہیں، اخلاق اور معاملات کے نگران ہیں، گھر کے سربراہ ہیں۔ لیکن مرد کو گھر کا سربراہ بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ عورت اس کی غلام ہے، وہ حاکم ہے اور عورت محکوم ہے

[۱] النساء: ۳۴

[۲] النساء: ۱۳۵

بلکہ قرآن پاک نے وضاحت فرمادی ہے:

خواتین کے حقوق:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَ
دَرَجَةٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾^[۱]

”عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے
حقوق ان پر ہیں، البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے۔“

مرد کا یہ ایک زائد درجہ انتظامی سربراہ کا درجہ ہی تو ہے۔ یہی مغرب کے نظریہ مساوات
مرد و زن کو رد کر دیتا ہے، جو مرد اور عورت کو ہر معاملے میں برابر قرار دینے کا علمبردار ہے۔
خاندان کا سربراہ ہونا ایک اضافی ذمہ داری ہے جو مرد کے سر پر ڈالی گئی ہے۔

مرد فطری طور پر حاکم ہے:

حاکمیت کا جذبہ مردوں میں فطری طور پر موجود ہے۔ مرد ہر حال میں چاہتے ہیں کہ
عورت اس کی اطاعت گزار ہو خواہ وہ بیوی ہو، بہن ہو بلکہ ماں ہو تب بھی اسے بیٹے کا فرمانبردار
ہی ہونا چاہیے۔ یہ چیز برصغیر پاک و ہند میں تو بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جب تک عورت اپنے
شوہر کی بات مانتی رہے، اس کے کہنے پر رات کو دن کہہ دے اور اس کی اطاعت گزاری میں دن
کو رات کہہ دے، تب تک مرد اس سے راضی ہے اور گھریلو امور بخیر و بخوبی چلتے رہتے ہیں۔ لیکن
اگر عورت کسی معقول بات کا معقول طریقے سے بھی جواب دے دے، عموماً مرد کی مردانہ غیرت
جاگ اٹھتی ہے کہ تو عورت ہو کر مجھے جواب دیتی ہے۔ معاملہ ڈانٹ ڈپٹ بلکہ مار پیٹ تک جا
پہنچتا ہے۔^[۲] عورت چونکہ مرد کے مقابلے میں جسمانی طور پر کمزور واقع ہوئی ہے، لہذا عورتوں

[۱] البقرة: 228

[۲] برصغیر ہند و پاک میں اور مغرب میں ہر جگہ، مردانہ رعب داب کا یہی حال ہے البتہ مسلم علاقوں میں
اسلام کی دی گئی تعلیم اور تربیت کی وجہ سے عورتوں سے عموماً حسن سلوک کیا جاتا ہے، گویا بعض مسلمان
بھی جہالت کی بنا پر اپنی خواتین پر ایسا ہی تشدد کرتے ہیں مگر عموماً مسلمان مرد ممکن حد تک اسلامی
معاشرتی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

پر مردوں کے جسمانی تشدد میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں رہتی۔ یہ امر واقعی ہے کہ آج کے مہذب اور ترقی یافتہ مغرب میں بھی عورتیں اسی طرح پٹتی اور مردوں کا تشدد سہتی ہیں۔ اگر وہ آگے سے مزاحمت کرتی ہیں تو مرد غصے میں انھیں اور زیادہ مارتے ہیں بلکہ مغرب میں تو اکثر سنگین قسم کی مار پیٹ بلکہ موت تک اس وقت واقع ہوتی ہے جب عورت آگے سے مزاحمت کرتی ہے یا بھاگ جانا چاہتی ہے۔ مغرب کے دورِ قدیم میں اتنے وسیع پیمانے پر عورت کو مار پیٹ نہیں ہوتی تھی، نہ ہی یہ کوئی بڑا مسئلہ تھا۔ مگر آج نظر یہ مساوات مرد و زن کے تحت یہ اتنا پیچیدہ معاشرتی مسئلہ بن گیا ہے کہ اس مسئلہ پر مستقل کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مارچ 1987ء کے ”ریڈرز ڈائجسٹ“ نے اس مسئلے پر خوب تحقیق کی اور یہ نتیجہ سامنے آیا: ”کوئی بھی تشدد کرنے والا آپ کو بتا سکتا ہے کہ اس نے عورت کو کیوں مارا؟ اس نے عورت پر غلبہ اور کنٹرول حاصل کرنا چاہا، وہ چاہتا ہے کہ اس کی مرضی چلے۔“

① "He wanted control over her, he wanted his own way"

”دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ عورت بھی کسی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی جو کمزور ہو اور وہ اس کو آسانی سے دبا لے، بلکہ ایسے مرد سے وہ نفرت کرتی ہے۔ وہ آج بھی اسی مرد میں کشش محسوس کرتی ہے جو جسمانی لحاظ سے تندرست و توانا اور مضبوط ہو۔ خود مغربی ممالک میں جہاں عورت اور مرد کو قانوناً مساوی حقوق مل چکے ہیں، وہاں بھی وہ مرد سے مغلوب ہو کر ہی خوش محسوس کرتی ہے۔“ ②

انگریزی رسالہ ”نیوز ویک“ (News Week) کی اشاعت مورخہ 18 مئی 1981ء میں ایک مفصل تحقیقی رپورٹ شائع ہوئی، اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرد عورت کا فرق پیدائشی اور فطری ہے۔ مرد مسائل کو حل کرنے میں زیادہ بہتر ثابت ہوتے ہیں، جبکہ عورتوں کی سوچ میں جذباتیت غالب ہوتی ہے۔ پھر مرد قوت اور بہادری میں عورتوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ مرد میں سختی، قوت اور عزیمت ہے جبکہ عورت میں نزاکت، لطافت اور نرمی ہے۔

① ”ریڈرز ڈائجسٹ“، مارچ 1987ء، صفحہ نمبر 140

② ”اسلام اور جدید ذہن کے شبہات/شبہات حول الاسلام“ سید قطب شہید، صفحہ 198

ریاضی میں بھی مرد عورتوں کے مقابلے میں افضل ہیں۔ وہ کسی بھی مسئلے میں آگے بڑھ کر اقدام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان میں قائدانہ صلاحیتیں عورتوں سے زیادہ ہوتی ہیں۔ دراصل عورت و مرد کے ہارمون ہی جدا جدا ہیں، وہی دونوں صنفوں میں فرق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پھر کچھ محققین نے مزید تحقیق کی غرض سے نر کے ہارمون کو مادہ کے جسم میں داخل کیا تو مادہ کے اندر نر کی خصوصیات محسوس کی جانے لگیں، یعنی کچھ لڑکیوں میں ولادت سے قبل مردانہ ہارمون داخل کیے گئے تو نتیجہ یہ نکلا کہ ان لڑکیوں میں گڑبڑوں سے کھیلنے کا شوق کم ہو گیا اور لڑکوں کی طرح لڑنا بھڑانا ان کے مزاج میں شامل ہو گیا۔^[۱]

پھر یہ فرق نر اور مادہ کے دماغی ہارمونز میں بھی محسوس کیا گیا ہے۔ عموماً مردوں کا دماغ عورتوں کے دماغ سے 100 گرام بڑا ہوتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق عورت کا دل بھی چھوٹا ہے، پھیپھڑے اور جگر بھی مرد سے چھوٹے ہوتے ہیں۔

ان سارے حقائق کی مثالیں ہمیں روزمرہ زندگی میں عام ملتی ہیں۔ مرد معاش کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کر سکتا ہے، صنعت و حرفت، زراعت اور دوسرے میدانوں میں مشکل اور محنت طلب کام کر سکتا ہے، شہدائے کرب کا مقابلہ کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے میں اس کی صلاحیت عورتوں سے بڑھ کر ہے۔ حتیٰ کہ وہ کام جو عورت ساری عمر کرتی رہتی ہے، مثلاً کھانا پکانا، سلائی کڑھائی وغیرہ ان میں بھی مرد زیادہ صلاحیت و قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پھر خوشی و غم کو اگرچہ عورت بہت زیادہ محسوس کرتی ہے، مگر ان کی تصویر کشی مرد عورت کے مقابلے میں بہت اچھی طرح کرتا ہے۔ چنانچہ ادب، آرٹ، شاعری وغیرہ میں مرد کی صلاحیتیں عورتوں سے بڑھی ہوئی ہیں۔

[۱] مائیں یہ بات بڑی اچھی طرح سمجھ سکتی ہیں۔ لڑکیاں ابتدا ہی سے صلح کل ہوتی ہیں، ان کی پرورش لڑکوں کے مقابلے میں بڑی آسان ہوتی ہے جبکہ لڑکے شروع ہی سے مار کٹائی کے عادی ہوتے ہیں، وہ مستقل طور پر بڑی بہنوں کو بھی دبائے رکھتے ہیں۔

مادام بوازر کی تحریک۔۔۔ اور پھر تحقیق

عورت کی فطری خصوصیات اور مستقل رجحانات کے بارے میں سب سے دلچسپ کام ایک فرانسیسی خاتون مادام بوازر نے کیا ہے۔ موصوفہ کا شمار بیسویں صدی کی تحریک آزادی نسواں کی صف اول کی خواتین میں ہوتا ہے۔ ”سیکنڈ سیکس“ کے نام سے اس کی معرکہ آراء تصنیف دنیا بھر میں آزادی پسند خواتین کے نقطہ نظر کی بہترین ترجمان ہے۔

اس کی آئیڈیل عورت کا منتہائے مقصود شادی نہیں۔ شادی تو ثانوی حیثیت رکھتی ہے، وہ اولین اہمیت عورت کی انفرادی آزادی کے تحفظ کو دیتی ہے۔ شادی تو اس کے نزدیک نسوانی آزادی کو رہن رکھنے کے مترادف ہے۔ اس کے نزدیک منکوحہ عورت اور بازاری عورت دونوں میں یہ فرق ہے کہ منکوحہ عورت اپنے جسم کا سودا ایک مرد سے زندگی میں ایک بار کرتی ہے جبکہ بازاری عورت ایسے سودے بار بار مختلف مردوں سے کرتی ہے۔ قدر مشترک البتہ دونوں میں ایک ہی ہے اور وہ ہے جسم کا سودا! زن بازاری کو گھر گھر ہستی پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ صرف اپنے جسم کا سودا کرتی ہے جبکہ خاتون خانہ جسم فروشی کے ساتھ ساتھ روح کا سودا بھی کر لیتی ہے۔ اپنی دولت کا سہارا لیکر مرد اس سے سب کچھ چھین لیتا ہے۔ مادام بوازر کو ایسی عورتوں سے سخت چڑ ہے جو اپنا تشخص مرد سے ڈھونڈتی ہیں، اس کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں اور جن کی اپنی حیثیت اضافی ہے۔ [۱]

مردوں کے بنائے ہوئے قوانین پر اسے ذرا اعتبار نہیں کیونکہ مرد عیار ہے، ہمیشہ اپنے فائدے کی سوچتا ہے۔ اس کے وضع کردہ قوانین خواتین کے بارے میں یک طرفہ ہیں، تعصب، خود غرضی اور جانبداری پر مبنی۔ وہ بظاہر عورت کے بھلے کی بات کرتا ہے مگر باطن اس میں اس کی اپنی ہی بھلائی کا کوئی پہلو پوشیدہ ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سچا سمجھتا ہے، وحشیانہ قوت سے کام

[۱] عورت کی نفسیات، صفحہ 150، از: ایم۔ اے ملک

لیتا ہے۔ وہ عورت سے پاک دامنی کی توقع رکھتا ہے جبکہ اس کا اپنا دامن عصیاں تار تار ہے۔ [۱]
لیکن آگے چل کر یہی مادام بوائریہ لکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے:

”عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ کمزور اور اعصابی قوت میں کمتر ہے، خون کے سرخ ذرات کی مقدار بھی اس میں کم ہے، پھپھڑوں کی قوت بھی زیادہ نہیں۔ وہ بھاگنے میں بھی سست رفتار ہے، وزن بھی کم اٹھا سکتی ہے۔ شاید ہی کسی کھیل میں مرد کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ لڑائی میں تو اس کے سامنے بالکل نہیں ٹھہر سکتی۔ اس میں عزم و استقلال کا فقدان ہے جو عظیم منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے از حد ضروری ہے۔۔۔“

مرد قد و قامت اور جثے میں بھی بڑا اور وزنی ہے، مضبوط اور سبک رفتار ہے، پٹھوں کی قوت عورت سے ایک تہائی زیادہ رکھتا ہے، دماغ کا سائز بھی نسبتاً اس کا بڑا ہے۔ طبعاً آزاد منش اور حرکات و سکنات میں جرات مند اور غصیلا ہے اور کنبے میں اس طرح اتراتا ہے جیسے دودھیالے جانوروں میں نر.....

عورت کے لیے (جوان ہوتے ہی) بن بلائے آلام (یعنی حیض، نفاس، حمل، زچگی وغیرہ) کا نزول اس کثرت سے ہونے لگتا ہے، گویا اس کا جسم اپنا نہیں پرایا ہے، وہ کچھ سہمی سہمی اور گھبرائی گھبرائی سی لگتی ہے۔ اذیت ناک درد سر، متلیاں، چکر، بلیڈنگ نہ جانے کیسے کیسے انجانے روگ اسے گھیرے رہتے ہیں۔“ [۲]

میری بونا پارٹ کو فرائیڈ نے ایک خط میں لکھا:

”تین سال کی تحقیق کے باوجود اس کا جواب مجھے نہیں مل سکا کہ آخر عورت کیا چاہتی ہے۔۔۔؟ وہ کیوں مجموعہ اضداد ہے؟ مثلاً آزادی کی پرستار مگر عدم تحفظ سے خوفزدہ، حاکمانہ اختیار کی خواہاں مگر سکون و قرار بھی اسے مرد ہی کے زیر سایہ ملتا ہے، حفظ ناموس کے لیے جان کی بازی لگائے گی مگر زندگی کے عام حقائق سے سمجھوتہ کر لے گی۔“

[۱] عورت کی نفسیات، صفحہ 151، از: ایم۔ اے ملک

[۲] عورت کی نفسیات، صفحہ 154-155، از: ایم۔ اے ملک

اس کا جواب والٹر شوارز نے دیا ہے: ”وہ صرف ”دماغ“ ہی نہیں ”رحم“ بھی رکھتی ہے، کئی رشتوں میں منقسم ہے۔ وہ کیا کرے؟ وہ ایک ماں بھی تو ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کا رحم ہے۔“

مرد عقلی طور پر برتر ہے:

عورتوں میں انتظامی صلاحیت مردوں کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے۔ پھر وہ حافظہ میں بھی مردوں سے کم ہیں۔ ان کی طبیعت میں اثر پذیری ہے۔ عورت بہت جلد ہر واقعہ کا اچھا یا برا اثر لیتی ہے اور پھر فوراً اس کے مطابق فیصلہ کر ڈالتی ہے بغیر سوچے سمجھے، جبکہ مرد فوراً متاثر نہیں ہوتا، بلکہ سوچ سمجھ کر تحمل کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور اس پر جم جاتا ہے۔ یہ عام تجربہ اور روزمرہ کے مشاہدہ میں آنے والی بات ہے کہ اکثر استعمال میں آنے والی چابیاں بھی بیشتر عورتوں سے گم ہوتی رہتی ہیں، آدھے سے زیادہ وقت انہی کو ڈھونڈنے میں لگ جاتا ہے پھر اپنی جلد بازی کی بنا پر جذبات سے مغلوب ہو کر فوراً کارروائی کرنا اور بعد میں مدت العمر اس پر پچھتانا عورتوں کی فطرت میں شامل ہے۔ ”کاش! میں اپنا غصہ پی جاتی، ساس کو آگے سے جواب نہ دیتی تو کتنا اچھا ہوتا، اب پتہ نہیں انجام کیا ہوگا؟ ہائے! میں نے اپنے سارے زیور فلاں پیر کو کیوں دے دیئے؟ میں کیوں اس کی پارسائی سے دھوکہ کھا کر لٹ گئی؟ کچھ تو سوچ لیا ہوتا، اب زیور کیسے ملے گا؟ نمود و نمائش کی خاطر بیٹی کی شادی پر اتنا قرض تولے لیا، اب ادائیگی کیسے ہوگی؟“ یہ اور اس قسم کے بہت سے امور ثابت کرتے ہیں کہ اگر عورت کو خانگی نظم میں سربراہ کا مقام دیا جائے تو گھر کا ادارہ بگڑ کر رہ جائے۔ لہذا ایک عورت ہونے کی حیثیت سے میرا ایمان ہے کہ اللہ نے مرد کو گھر کا سربراہ بنا کر ہم عورتوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ میرا رب، میرا خالق، میرا ہمدرد، میرے فائدے کو مجھ سے بڑھ کر جاننے والا مہربان مالک مجھ پر کتنا احسان فرما رہا ہے کہ میری کمزوریوں کا لحاظ کر کے وہ مجھے بہت سی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر رہا ہے۔

واقعاً مرد نگران ہے گھر کا:

کیونکہ جب شوہر گھر میں ہوتا ہے تو عورت رات کو بے فکر ہو کر گہری نیند سوتی ہے اور اگر

گھریلو نظم میں مرد کی سربراہی

وہ گھر میں نہ ہو تو ساری رات نیند میں وہ بے فکری پیدا نہیں ہو سکتی۔۔۔ جب باہر جانا ہو تو عورت ضرورت محسوس کرتی ہے کہ کوئی مرد ساتھ ضرور ہو چاہے دو تین سالہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

پھر عورت اکیلی زندگی نہیں گزار سکتی، ہمارے معاشرے میں اسی عورت کو مقام و مرتبہ حاصل ہے جس کا اپنا گھر ہے۔ رہی وہ عورت جو غیر شادی شدہ ہے، بوڑھی ہو جائے تب بھی کبھی بھائی کے گھر اور کبھی بہن کے گھر ماری ماری پھرتی ہے، اس کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ وہ کتنی ہی پڑھی لکھی ہو، ملازمت کر کے خود کمانے اور کھانے والی ہو بلکہ دوسروں کو بھی کھلانے والی ہو تب بھی ریٹائر ہوتے ہی ایسی خواتین بالکل بے آسرا و بے آستانہ رہ جاتی ہیں۔ جب کوئی بات کرے تو یہی کرے گا: ”بیچاری کیا کرے، کہاں رہے؟ اب مارے مارے پھرنا ہی اس کا مقدر بن کر رہ گیا ہے وغیرہ۔“

مرد مالی بوجھ برداشت کرتا ہے:

قرآن پاک نے {وَمِمَّا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ} کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ اسلامی قانون کے تحت مرد پر عورت کا مہر، اس کا مکمل خرچہ، اس کے لیے لباس و رہائش کا بندوبست کرنا، دوا دارو پر خرچ کرنا واجب ہے۔ اللہ کا کتنا احسان ہے کہ عورت معاشی فکروں سے مکمل طور پر آزاد ہے۔ اس کے گھر بیٹھے بٹھائے تمام اخراجات پورے ہوتے رہتے ہیں، لہذا مرد کو گھر کا سربراہ ہونا ہی چاہیے اور عورت کو اس کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مجھے اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان یاد آ رہا ہے۔ آپؐ نے ایک دفعہ عید کے موقع پر خواتین کو الگ خطاب کیا۔ دوران خطاب میں آپؐ نے فرمایا:

يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيْتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ تَكْثُرُنَّ اللَّعْنَ وَتَكْفُرُنَّ الْعَشِيرَ۔۔۔ الخ

”اے گروہ خواتین! تم صدقہ زیادہ دیا کرو۔ کیونکہ مجھے تم دوزخ میں زیادہ دکھائی گئی ہو“ انہوں نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! ایسا کیوں ہے؟“ فرمایا: ”ایک تو تم لعن طعن بہت زیادہ کرتی ہو، اپنے شوہر کی ناقدری کرتی ہو، میں نے تم سے زیادہ کسی کو دین اور عقل میں ناقص نہیں

پایا۔“ کہ ”عقل مند“ آدمی کی عقل کو زائل ہی کر دیتی ہو (یعنی مسلسل تکرار کر کے مردوں کو اپنی غلط بات بھی ماننے پر مجبور کر دیتی ہو) پھر خواتین نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! ہمارے دین اور ہماری عقل کا نقصان کیا ہے؟“ آپؐ نے فرمایا: ”کیا عورت کی شہادت مرد کی آدمی شہادت کے برابر نہیں ہے؟“ عرض کیا: ”جی ہاں“، فرمایا: ”یہ تو اس کی عقل کا نقصان ہو گیا۔ پھر جب اسے ایام آتے ہیں تو نہ نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے، کیا ایسا نہیں ہے؟“ کیوں نہیں ”انہوں نے عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ”بس یہی اس کے دین کا نقصان ہے (کہ ان دنوں میں ثواب سے محروم رہتی ہے)“ [۱]

مساواتِ مرد و زن کے نظریہ کی قائل خواتین تو بے شک اس حدیث پر ناک بھوں چڑھائیں مگر حقیقت وہی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرمان میں بتادی ہے کہ عورتوں کو اپنے شوہر کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے۔ ذرا سی تکلیف پہنچنے پر لعن طعن کرنے لگ جانا اور شوہر سے لڑائی جھگڑا شروع کر دینا مسلمان عورتوں کا شیوہ نہیں ہے۔ رسولؐ کی فرمانبرداری کے بعد عورت کے لیے اپنے شوہر کی فرمانبرداری لازم ہے۔ ہاں! اگر وہ کسی گناہ کا مرتکب ہونے کو کہے جس سے دین نے منع کیا ہے تو اس وقت اس کی فرمانبرداری نہیں کی جائے گی۔

کیا عورت گھر کی سربراہ ہو سکتی ہے؟

مندرجہ ذیل بحث سے واضح ہوتا ہے کہ گھر کا سربراہ بننے کے لیے مرد ہی موزوں ہے، عورت عقلی، علمی اور جسمانی ہر لحاظ سے مرد سے کمتر ہے، علاوہ ازیں ایک اہم وجہ مرد کا مالی بوجھ اٹھانا بھی ہے۔ یہاں اعتراض اٹھایا جاسکتا ہے کہ اب تو خواتین معاشی لحاظ سے خود کفیل ہو رہی ہیں، اس لیے وہ کیوں مرد کو اپنے سے برتر اور اپنا سربراہ مانیں؟ تو جواب یہ ہے کہ صرف معاش ہی زندگی میں فیصلہ کن امر نہیں ہے۔ عورت جذباتی لحاظ سے سہارے کی محتاج ہے۔ پھر بچوں کی معاش، ان کی نگہداشت، تعلیم و تربیت، شادی بیاہ، خاندان کے ساتھ تعلقات اور دیگر مختلف مسائل ہیں جو سربراہِ خاندان کو حل کرنے ہوتے ہیں۔ کمانے والی عورت کیا یہ مسائل بھی حل

کرنے کی اہلیت رکھتی ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کمانے والی عورتوں کا تناسب کتنے فیصد ہے؟ بیشک مسلم معاشرے میں کمانے والی عورتیں بھی رہی ہیں، آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ہوں گی، مگر بات صرف کمانے والی یا معاشی طور پر مضبوط خواتین کی نہیں ہو رہی، بات تو پورے طبقہ اناث کی ہے اور پھر کمانے والی عورتیں بھی قسم کھا کر بتائیں کہ کیا وہ اپنی ضروریات کے لیے شوہر سے بے نیاز ہو سکتی ہیں؟

اصل حقیقت یہی ہے کہ عورت کو اپنی فطری کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ و رسولؐ کے فرمان کے مطابق شوہر کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس کی سربراہی کو دل سے تسلیم کر کے اس کی خدمت اور اطاعت کرنی چاہیے۔ جب وہ ذاتی زندگی میں کسی لمحہ بھی (بیٹی ہو یا بیوی) مرد سے بے نیاز نہیں ہو سکتی، تو حقیقت کا انکار کرنے میں عار کیسی؟ مرد اپنی برتری کے باوجود یہ نہیں کہتا کہ وہ عورت سے بے نیاز ہے، تو پھر عورتوں کو ہی ایسی کوئی افتاد آن پڑی ہے کہ وہ مساوات کے چکر میں خوار ہو رہی ہیں!

”قوام“ ہونے کے تقاضے:

یہاں ضمناً ایک اور بحث ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے خانگی نظم میں مرد کو قوام بنایا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ مرد حاکم ہے اور عورت محکوم، مرد آقا ہے اور عورت کنیز، بلکہ اس کو اپنے گھروالوں سے حسن سلوک کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً فرمانِ نبویؐ ہے:

”تم میں سے کامل ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے اور تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے گھروالوں کے حق میں بہتر ہے۔“

آپؐ کا ایک اور فرمان ہے: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي ”تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے حق میں بہتر ہے اور میں تم سب سے زیادہ اپنے گھروالوں کے حق میں بہتر ہوں۔“ [۱] گویا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کے صالح اور کامل

ایمان والا ہونے کی علامت یہ بتائی ہے کہ بیوی کے ساتھ اس کا سلوک اور رویہ اچھا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ بیشک مرد عورت کے لیے قوام ہے، مگر اس کے ساتھ مرد کا تعلق دوستی جیسا ہے لہذا یہ نرا آقا و کنیز والا تعلق نہیں۔ اس دوستی کے کچھ آداب اور تقاضے ہیں، اس تعلق میں مرد عورتوں کی ناز برداری بھی کرتے ہیں جس کو حاکم ہونے کے خلاف نہیں کہا جاسکتا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارک یہی ہے۔ ایک دفعہ آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو، دونوں حالتوں کا مجھے علم ہو جاتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! آپ کو کس طرح علم ہو جاتا ہے؟“ آپؐ نے فرمایا: ”جب تم مجھ سے راضی ہوتی ہو تو ”رب محمد“ (محمد کے رب کی قسم) کے الفاظ سے قسم کھاتی ہو اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو ”رب ابراہیم“ (ابراہیم علیہ السلام کے رب کی قسم) کے الفاظ سے قسم کھاتی ہو۔ اس وقت تم میرا نام نہیں لیتی بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لیتی ہو۔“ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں صرف آپ کا نام چھوڑتی ہوں، آپ کے نام کے علاوہ اور کچھ نہیں چھوڑتی۔“ اندازہ کیجئے کہ ناراض کون ہو رہا ہے؟ حضرت عائشہؓ جو اتنی کم سن ہیں۔ اور عائشہؓ اس طرح ناز و ادا کے ساتھ کوئی بات فرما دیتی تھیں جس سے آپؐ کو معلوم ہو جاتا کہ وہ کچھ ناراض ہیں مگر آپؐ نے کبھی ان کے اس طرزِ عمل کو اپنی قوامیت کے خلاف نہ سمجھا، بلکہ خوش طبعی کے ساتھ فرمایا کہ مجھے تمہاری ناراضگی کا علم ہو جاتا ہے۔ [۱] اسی طرح ازواجِ مظہراتؓ کے ساتھ آپؐ کے ہنسی مذاق، حسنِ سلوک، دلداری اور دلجوئی کے بے شمار واقعات کُتبِ سیر میں ملتے ہیں، باوجود یہ کہ آپؐ کی ذمہ داری بڑی گراں بہا تھی یعنی پوری مخلوق تک اللہ کا پیغام پہنچانا۔

بعض مردوں کی یہ عادت ہے کہ بیوی کے ساتھ ان کا معاملہ تنگ دلی اور گھٹن والا ہوتا ہے، بیوی کے سلسلے میں ان میں کشادہ دلی نہیں پائی جاتی۔ گھر میں آئیں تو ایسے منہ پر تیوری چڑھائی ہوتی ہے کہ بیوی بچے دیکھ کر سہم جائیں۔ یہ شیوہ اسوہ نبویؐ کے بالکل برعکس ہے۔ عورتوں کے حقوق مرد کو ادا کرنا لازمی ہے۔ وہ اگر ان کو ادا نہیں کرے گا تو اللہ کے ہاں روزِ قیامت جوابدہ ہوگا، اور عورتوں

کے یہ حقوق کیوں نہ ہوں؟ اس لیے کہ دونوں کا مادہ تخلیق ایک جیسا ہے، دونوں کے جذبات اور دونوں کی فطرت ایک جیسی ہے۔ اگر مرد کو راحت و آرام کی ضرورت ہے تو عورت بھی بے حس نہیں ہے، اگر مرد اپنی عزت اور انا کا بہت خیال رکھتا ہے تو عورت بھی اپنی بے عزتی، رسوائی اور توہین سے پریشان اور افسردہ ہوتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ رب العزت بار بار اہل ایمان کو توجہ دلاتا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ [۱]

”لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور قرابتداری کا بھی خیال رکھو۔ یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی فرما رہا ہے۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ بیک وقت تین باتیں بیان فرما رہا ہے:

- 1۔ مرد و عورت دونوں کا رب ایک ہے۔ یہ نہیں کہ مرد کا رب بڑا رحیم ہے اور عورت کا رب بڑا ظالم۔
- 2۔ نسل انسانی ایک ہے، مرد و عورت دونوں حضرت آدم علیہ السلام و حضرت حوا کی اولاد ہیں۔ لہذا جنس کی بنیاد پر مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں۔ نہ مرد برتر ہے نہ عورت کم تر۔
- 3۔ مرد و عورت کے حقوق و فرائض بھی یکساں ہیں۔ یہ تصور کہ حقوق مرد کے حصے میں آتے ہیں اور فرائض کا بوجھ عورت کے کندھوں پر ڈالا جاتا ہے ایک جاہلانہ تصور ہے، اسلام کی رو سے حقوق و فرائض کی ذمہ داری دونوں پر یکساں ڈالی گئی ہے۔ عورت کے باقاعدہ حقوق اللہ نے مقرر فرمائے ہیں جو مرد کو بہر صورت ادا کرنے ہیں۔ جب اللہ نے اس کو تمہارے لیے موجب سکون و راحت بنایا ہے، تمہارے اور اس کے درمیان محبت و رحمت کا رشتہ قائم کیا ہے۔ [۲] تو پھر

[۱] النساء: ۱

[۲] روم: ۲۱

لازم ہے کہ ایک دوسرے کی کمی، کوتاہی کو برداشت کرو۔ عورت کی سیرت میں، صورت میں کوئی بھی عیب معلوم ہو تو تمہیں کیا خبر کہ جو شے تمہیں ناپسند ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں کوئی بڑی منفعت اور کوئی بڑی مصلحت رکھ دی ہو۔ [۱] کہیں اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کے باہمی تعلق کی وضاحت ھُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ”وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو“ [۲] کہہ کر فرمائی ہے۔ لباس اور انسان میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ تمہارے لیے باعثِ زیب و زینت ہیں۔ وہ تمہارے اخلاق کی محافظ ہیں، تمہاری اولاد کی مائیں ہیں۔

مردانگی یہ نہیں کہ ایک آدمی مسلمان بھی ہو اور فخر کرتا پھرے کہ ”جی! میں بیوی کو دبا کر رکھتا ہوں۔“ نیک عورت تو نبی پاکؐ کے فرمان کے مطابق ”اللہ کی بخشی ہوئی بہترین نعمت ہے۔“ اور اس فانی اور ناپائیدار ”دنیا میں کوئی نعمت تقویٰ کے بعد نیک سیرت بیوی سے بڑھ کر نہیں۔“ اس نعمت کے ساتھ حسن سلوک کرنا، نرمی اور شفقت سے پیش آنا اور اگر ان سے کوئی غلطی و کوتاہی سرزد ہو جائے تو دینی خیر خواہی کی بنیاد پر ان کی اصلاح کرنا ضروری ہے۔

کیا عورت اسلام میں دوسرے درجے کی شہری ہے؟

جدید تہذیب یافتہ اور فرنگ زدہ مسلمان بڑے طمطراق سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مغربی معاشرے تو عورت مرد کے درمیان مساویانہ حقوق کے قائل ہیں جبکہ اسلام عورتوں کو دوسرے درجے کا شہری قرار دیتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی معاشرے میں عورت دوسرے درجے کی شہری ہے تو پھر اسلام میں پہلے درجے کا حامل کون ہے؟ کیا مرد پہلے درجے کا حامل ہے؟ حقائق تو اس سے انکار کرتے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ اسلام عورت و مرد کے درمیان چند بنیادی طبعی، نفسیاتی اور جسمانی اختلافات کی بنا پر ان پر الگ الگ ایسی ذمہ داریاں ڈالتا ہے جو ان کی طبعی و فطری مزاج سے میل کھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تو مرد و عورت اسلام کی نگاہ میں برابر ہیں۔ اگر عورت کو غصہ بھر کا حکم ہے تو مرد بھی اس حکم کا پابند ہے، اگر عورت کو اپنے جسم کو مناسب طریقے سے چھپانے کا

[۱] النساء: ۱۹

[۲] البقرہ: ۱۸۷

گھریلو نظم میں مرد کی سربراہی

حکم ہے تو یہ حکم مردوں کے لیے بھی ہے۔ اگر عورتوں کے لیے غیر محرم مردوں سے بے تکلفانہ ملنا ممنوع ہے، تو مردوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ اگر مرد اپنی پسند سے شادی کر سکتا ہے تو عورت بھی ایسا کر سکتی ہے، اگر مرد کسی مجبوری کے باعث اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے تو عورت بھی یہ حق رکھتی ہے۔ اگر مرد اپنے مال کا مالک ہے، تو عورت بھی اپنی ملکیت میں پورا اور مکمل تصرف رکھتی ہے، اگر مرد نیکی و تقویٰ کی بدولت اجر و ثواب کے اعلیٰ مدارج طے کر سکتا ہے، تو عورت کے لیے بھی قرب الہی کا بلند مقام حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بیٹی حقوق میں بیٹوں کے برابر مقام رکھتی ہے، بہن ہونے کی حیثیت سے وہ بھائی کی طرح اپنے حقوق کی مستحق ہے۔ ماں ہونے کی حیثیت سے وہ باپ سے تین گنا زیادہ مقام رکھتی ہے، البتہ بیوی ہونے کی حیثیت سے مرد کو اس پر ایک درجہ زائد حاصل ہے۔ مگر وہ انتظامی معاملات کو کنٹرول کرنے کے لیے ہے، نہ کہ عورت کو دوسرے درجے کا شہری قرار دینے کے لیے۔

آج بھی مغرب میں مرد ہی گھر کا حاکم ہے:

مغربی معاشروں میں لمبی چوڑی تحریک نسواں چلنے کے باوجود آج بھی گھر (ٹوٹے پھوٹے جیسے بھی گھر ہیں) میں مرد ہی حاکم ہے۔ وہی اپنے گھر کی پالیسی طے کرتا ہے۔ پھر ملک کی پالیسیاں بھی مرد ہی طے کرتے ہیں۔ سول میں، فوج میں، ملازمتوں میں غرض ہر جگہ مرد ہی کا کنٹرول ہے۔ لہذا مغرب میں بھی خواتین اپنے نظریہ مساوات مرد و زن کا نئے زاویوں سے جائزہ لینے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ مگر ان کے نظریات میں ابھی تک ٹیڑھ موجود ہے، اب وہ ملازمت اور گھردونوں میں اس طرح توازن پیدا کرنا چاہتی ہیں کہ اپنے مردوں کے ساتھ تصادم نہ ہو بلکہ ان کے ماتحت بن کر دونوں کام چلائیں۔ فرق صرف اتنا پڑا ہے کہ وہ پہلے مردوں کو اپنا مد مقابل، فریق ثانی سمجھتی تھیں اور اب ان کے ساتھ موافقت کرنا چاہتی ہیں، لیکن معاملات ان کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔ مرد خود ان کے مد مقابل اور حریف بن چکے ہیں۔ اس لیے یہ بحث کہ مرد افضل ہے کہ عورت؟ یا دونوں برابر ہیں، سرے سے غلط ہے۔ جہاں کہیں عورتوں نے فطرت کی عطا کی ہوئی ذمہ داریوں سے گریز کرتے ہوئے مرد بننا چاہا، چاہے سڑکوں پر گھومیں، ہوائی جہاز اڑائیں، حج اور وکیل بنیں، عمر بھر شادی نہ کریں، مرد کے مساوی بننے کے شوق میں مسلسل اپنے

شوہروں کو طلاق دیتی چلی جائیں، جوانی سے قبر تک برتھ کنٹرول کرتی چلی جائیں، مرد بننے کے لیے جو کچھ چاہیں، کریں، کوئی مردان پر رشک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ بلکہ ان سب حرکتوں سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہیں اور جتنا زیادہ وہ برتری کا اظہار کریں گی، اسی حساب سے ان کے اندرونی احساسِ کمتری کا اندازہ ہوتا جاتا ہے۔ لہذا صحیح راہ یہی ہے کہ وہ مردوں کے ماتحت رہیں اور ان کے ساتھ موافقت سے اپنے معاملات چلائیں۔ یعنی فطری ذمہ داریاں ادا کریں۔ چنانچہ اب مغرب کی دانشور خواتین جو خود کچھ عرصہ پہلے مساوات مرد و زن کے نظریہ کی شدت سے قائل تھیں، اپنے نظریات سے رجوع کرتے ہوئے خواتین کو گھروں میں واپس لوٹ آنے کے مشورے دے رہی ہیں۔

بے ٹی فریڈن (آزادی نسواں کی بہت بڑی علمبردار) نے 1963ء میں 'دی فیمینین مسک' 'The Feminine Mystique' نامی ایک کتاب لکھی تھی۔ اب خود ہی اپنے پرانے خیالات کی تردید میں اس نے ایک اور کتاب لکھی ہے اور وہ یہ ہے: دوسری سیلج 'The Second Stage'

اس میں وہ لکھتی ہے:

”اب میں نے وہ سب کچھ سننا شروع کر دیا ہے جسے پہلے سننے کی میں روادار نہ تھی۔ اب میں ان عورتوں کے خوف اور ان کے احساسات کی آواز سننے لگی ہوں جو ہماری تحریک کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی تھیں۔۔۔ اب عورت کی نجات کی تحریک کا پہلا مرحلہ ختم ہو گیا۔ ہم نے کچھ انقلابی نعرے دیئے تھے اور ان کا اثر بھی پڑا تھا۔ مگر اب وقت آ گیا ہے کہ ہم مرد اور عورت کے باہمی تعلقات میں خاندان اور کیریئر کے درمیان توازن پیدا کریں۔۔۔ پہلے ہم کیریئر کو خاندان اور مادہ دارانہ ذمہ داریوں پر ترجیح دیتے تھے۔۔۔“

اب وقت ہے کہ ہم ان نظریات سے رجوع کر لیں۔ مرد ہمارے محبوب ہیں، ہمارے ہمدرد، ہمارے معاون، ہمارے دوست، ہمارے بیٹے۔ ہاں! کبھی کبھی ہمارے دشمن بھی ہیں اور جو دشمن ہیں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ مگر جو ہمارے ہمدرد اور غمگسار ہیں ان کے ساتھ مل کر

ایک ایسے سماج، ایک ایسے ماحول اور ایسے نظام کو تشکیل دینا ہوگا جو سب کے لیے، مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے باعثِ رحمت ہو۔۔۔ اب ہمیں وہ مرحلہ شروع کرنا ہوگا جو کیریئر اور گھریلو زندگی دونوں کی ضرورتوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھے گا۔“

اسی طرح ایک اور خاتون جرمن گیریر نے 1970ء میں کتاب: The Female Unique (دی فیمل یونیک) لکھی مساوات مرد و زن کے حق میں، مگر بعد میں یہی خاتون اپنی تازہ ترین کتاب ”سیکس اینڈ ڈسٹنی (Sex and Destiny) میں اپنے پرانے نظریات سے رجوع کرتے ہوئے لکھتی ہے: ”وقت آ گیا ہے کہ ہم جائزہ لیں کہ ہم نے کیا کچھ کھویا اور کیا کچھ پایا ہے؟ ہمیں اپنے وجود کی بنیادی حقیقت کو پہچاننا ہے اور نئے پیش آمدہ سوالوں کے جواب تلاش کرنے ہیں۔ ان نئے سوالوں اور بنیادی ضرورتوں کا تعلق عورت کی اپنی ذاتی شناخت، اس کے وقار اور خاندان کے ساتھ اس کے تعلقات سے ہے۔“

اس طرح اسلام مرد کو گھر کا حاکم بناتا ہے، گھر کی زیادہ ذمہ داریاں اس کے سر پر ڈالتا ہے اور عورت کے مادرانہ وظائف اور گھریلو ذمہ داریوں کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ عورت کو عورت کی حیثیت سے معاشرے میں عزت و وقار اور احترام دیتا ہے۔ اس کی ناموس کو تحفظ دیتا ہے جبکہ یہ جدید مغربی خواتین مردوں کو گھروں میں حاکم سمجھنے پر بھی اپنے آپ کو مجبور پارہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں دو گنا کام بھی کر رہی ہیں جبکہ ان کی عصمت و عفت کے آگینے بھی چور چور ہو رہے ہیں، معاشرے میں عزت و وقار بھی نہیں رہا۔ تو پھر کیا مسلمان خواتین کے لیے یہ واجب نہیں ہے کہ وہ اللہ کے دیئے ہوئے احسانات پر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں اور برضا و رغبت اپنے مالک کے دیئے ہوئے عائلی نظام کے مطابق شوہروں کی قدر کرتے ہوئے مادرانہ وظائف اور خانگی ذمہ داریاں ادا کریں! بار بار یہ آیت پڑھنے کو جی چاہتا ہے گویا یہ آیت ہم مسلمان خواتین کو ہی مخاطب کر کے کہی گئی ہے: {فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ} [۱] ”تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ زَوْجِهَا
وَوَلَدِهَا وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ

فرمانِ نبویؐ (صحیح بخاری، کتاب الجمعہ)

”عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگران بنائی گئی ہے
اور (روزِ قیامت) اس سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔“

عورت کا مقصدِ وجود

- ❁ گھریلو زندگی کی تباہی
- ❁ عورت پر دوہرا بوجھ
- ❁ عورت کا گھر چھوڑنا معاشرے کا زوال ہے
- ❁ اسلام میں عورت کا کردار..... اور اس پر اجر و ثواب
- ❁ تجزیہ

عورت کا مقصد و وجود

ایک مسلمان مفکریوں رقمطراز ہیں:

”حیاتیات، عضویات، نفسیات اور عمرانیات کے تمام علوم اس امر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ بچے جننے اور پالنے کی خدمت کا عورت کے سپرد ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا فیصلہ خود فطرت نے کر دیا ہے۔ کسی مصنوعی تدبیر میں یہ طاقت نہیں کہ فطرت کے اس فیصلے کو بدل سکے۔ جو معاشرہ اس فطری تقسیم کو بدلنے کی کوشش کرے گا، خود مٹ جائے گا۔ عورت اپنی افتاد طبع اور اپنی فطری ساخت کے خلاف اگر کوشش کرے تو کسی نہ کسی حد تک مرد کے کاموں کا بوجھ سنبھال لے گی لیکن مرد کسی طرح بھی بچے جننے اور پالنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

تمام دنیا کے مرد چاہے کتنا ہی سرمایہ لیں وہ اپنی پوری صنف میں ایک معمولی درجہ کی ماں بھی پیدا نہیں کر سکتے، علم الحیات کی رو سے عورت ہی کو بچہ کی پیدائش اور پرورش کے لیے بنایا گیا ہے۔۔۔“ [۱]

بقائے نسل کا فریضہ اور ذمہ داری قدرت نے عورت پر ڈالی ہے۔ لہذا اس کے جسم کی ساخت بھی اسی طرح بنائی گئی ہے۔ بنیادی خلیے سے ہی عورت و مرد کا حیاتیاتی و نفسیاتی فرق واضح ہونے لگتا ہے۔ مرد کے ہارمونز الگ ہیں جبکہ عورت کے ہارمونز مختلف ہیں، یہ انسانی صنفوں کا فطری اختلاف ہے۔ ایک مغربی مفکر کوولڈ شوارز (Qowald Schwarz) رقمطراز ہے، اس کی کتاب کا نام ہی ”نفسیات جنس“ ہے:

”عورت کے نظام جسمانی کا ایک بڑا شعبہ خاص طور پر حمل کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ اگر کسی عورت کو اس کی جسمانی اور ذہنی ساخت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے روک دیا جائے تو وہ مرجھا کر رہ جاتی ہے جبکہ ماں بن کر وہ ایک تازہ اور دوامی جمال حاصل کرتی ہے۔۔۔ اس

[۱] عورت کی نفسیات، صفحہ 131، از: ایم اے ملک

حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مردانہ شخصیت عورت سے انتہائی مختلف ہے، یہ سمجھنا مشکل بھی نہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ دونوں میں سے ہر صنف کی ساخت بنیادی طور پر جداگانہ نوعیت رکھتی ہے۔۔۔“

پھر وہ اپنی بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے: ”ہمارے جسم کا ہر عضو اپنا تقاضا پورا کرنا چاہتا ہے۔ اگر اسے اس سے روکا جائے تو پورا جسمانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ عورت کے عورت ہونے کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ہاں بچہ ہو۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس کے اندر مادرانہ صفات ہیں، اس وجہ سے بھی نہیں کہ باہر سے اس پر اخلاقی فرض عائد کیا گیا ہے بلکہ اس کا اپنا عضویاتی نظام بنا ہی اس بات کے لیے ہے کہ اس کے ہاں بچہ پیدا ہو، تو پھر عورت کو اس کے جسمانی و عضویاتی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکنے کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ یہ محرومی عورت کی پوری شخصیت پر اپنا برا اثر ڈالے!“

اسی طرح ایک اور مغربی مفکر! ”ایلیکس کارل“ (Alexis Carrel) جو فرانسیسی سرجن

ہے اور جسے نوبل پرائز بھی مل چکا ہے، اپنی مشہور کتاب "Man the unknown" میں لکھتا ہے:

”بنیادی حقیقت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے نسوانیت کی ترقی کے علمبردار یہ سمجھ بیٹھے

ہیں کہ اس کے جسم کا ایک ایک خلیہ اپنی صنفیت کی مہر اپنے اوپر لیے ہوئے ہے، یہی حال اس کے اعضاء کا اور آگے بڑھ کر اس کے نظام اعصاب کا ہے۔۔۔ لہذا عورتوں کو چاہیے کہ وہ مردوں کی نقالی چھوڑ کر اپنی مخصوص فطرت کے تقاضوں کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دیں۔۔۔

خواتین اپنا کمال ارتقاء حمل کے بعد ہی حاصل کر سکتی ہیں۔ جن عورتوں کا کوئی بچہ نہیں

وہ پوری طرح متوازن نہیں ہوتیں اور دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ اعصابیت زدہ ہوتی ہیں۔“

پھر آگے چل کر وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے:

”عورت کو حمل سے نفرت دلانا ایک بے کار کوشش ہے۔ عورت کو یکساں تعلیم، ذہنی

وجسمانی تربیت اور ویسی ہی امتگیں نہیں دینی چاہئیں جیسی لڑکوں کو دی جاتی ہیں، اساتذہ کو چاہیے کہ وہ مردانہ اور زنانہ ذہنی و جسمانی خصوصیات اور ان کے فطری تقاضوں کی طرف خصوصی توجہ دیں، کیونکہ ان خصوصیات کو پوری توجہ دینا ایک مہذب دنیا کی تعمیر کے لیے بہت ضروری ہے۔“

چیچ چیچ کر مغربی مفکر اب عورت کو توجہ دلا رہے ہیں کہ تمہارا اصل مقام گھر ہے، بچہ ہے، شوہر ہے۔ ایک اور مفکر Anthony M. Ludovici کا کہنا ہے: ”عورت کے لیے لازم ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کے مقابلے میں ہر دوسری چیز کو ثانوی حیثیت دے۔ ایسے لوگ جو تجرُّد کو غلط رنگ میں پیش کر کے عورت کو اس کی طرف دعوت دیتے ہیں اور پھر ترغیب دلاتے ہیں کہ اس کے لیے مادریت سے بڑھ کر یا اس کے ہم پلہ کوئی اور ذمہ داری بھی ہے، وہ نہ صرف عورت بلکہ پوری نسل انسانی کے دشمن ہیں۔“ ایک اور جگہ وہ عورت سے دشمنی کرنے والے نام نہاد ترقی پسندوں کو جھنجھوڑتا ہے: ”وہ تمام لوگ جو عورت کو فریب دیتے ہوئے مرد اور بچے کے معاملے میں اپنا بنیادی موقف درست کیے بغیر عورت کو کسی طرح کی خوشی، اطمینان اور تسلی کا جھانسنہ دلاتے ہیں، وہ جھوٹے، لپاٹیے اور مجرم ہیں۔“

بچوں کی تربیت اور نگہداشت عورت کی فطرت میں رکھی گئی ہے۔ اس تربیت اطفال کے لیے جو نفسیاتی خصوصیات ضروری ہیں وہ اس میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ مسٹر ہیولاک ایلین مشہور ماہر نفسیات اپنی کتاب "Man and woman" (مرد و عورت) میں لکھتا ہے:

”عورت دوسروں کی ہمدردی کے لیے تڑپتی ہے۔ اس میں خود مختاری کا جذبہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا جتنا مردوں میں ہوتا ہے۔“

یہ تو ہوئی مغربی مفکروں کی شہادت! جنہوں نے اپنے ماحول اور گرد و پیش کی مشکلات کو محسوس کیا اور گہرے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ عورت کو اس کی بنیادی ذمہ داریوں سے ہٹا کر باہر نکالنا ان کے لیے کتنی الجھنوں کا باعث ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ ایک طرف گھر برباد ہوئے، دوسری طرف گھروں کی بربادی سے خود پورے معاشرے کا زوال و انحطاط نمودار ہو گیا۔

تیسری طرف ان کی عددی نفری میں خوفناک کمی واقع ہو گئی۔ اب یہ مغربی مفکرین و دانشور بار بار اپنے ہم وطنوں کو اصلاح احوال پر توجہ دلا رہے ہیں:

گھریلو زندگی کی تباہی:

ملازمت چھوڑنا اور بچوں کے ساتھ گھر بیٹھنا مغربی عورت کے مزاج کے خلاف ہے۔ لہذا گھر ہوٹل یا محض تفریح گاہیں بن کر رہ گئے ہیں۔ ایک محقق Will Durant گھریلو زندگی کی تباہی پر بڑا پریشان ہے، وہ لکھتا ہے:

”عورت کو صنعت میں لانے کا قدرتی نتیجہ گھریلو زندگی کی تباہی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا پرانا اصل مشغلہ اس سے چرایا گیا ہے اور اب ”گھر“ دلچسپی سے خالی ہو کر رہ گیا ہے اور خود عورت بے مقصد اور بے اطمینان زندگی گزار رہی ہے، گھر جب اس طرح خالی ہو جائے کہ نہ اس میں کوئی کام کیا جاتا ہو اور نہ اس میں زندگی بستی ہو تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلتا تھا کہ مردوں اور عورتوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور وہ ادارہ جو دس ہزار سال سے برقرار تھا۔ ایک ہی دورِ نسل میں تباہ ہو گیا۔“ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مغربی عورت جوانی میں عیش کرتی ہے، بڑھاپے میں پچھتاتی ہے۔ پھر وہ اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے کتے، بندر اور خرگوش پال کر اپنا دل بہلاتی ہے۔

عورت پر دو ہر ابو جھ:

مشہور مورخ آرنلڈ ٹائسن بی ”ورلڈ ریویو“ مارچ 1949ء کے شمارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

”آج کی ”ترقی“ کا ایک انوکھا نتیجہ یہ ہے کہ عورتوں پر کام کا بوجھ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس سے پہلے یہ معاملہ کبھی پیش نہ آیا تھا۔ امریکی بیویوں کو نہ خانہ داری میں کوئی مدد حاصل ہو سکتی ہے، نہ وہ خود یکسوئی سے خانہ داری میں کوئی دلچسپی لے سکتی ہیں۔ لہذا آج کی عورت ایک دم دو ہر ابو جھ اٹھانے پر مجبور ہے، گھر میں بحیثیت بیوی کے اور دوسرا بوجھ دفتر یا کارخانے میں بحیثیت اجیر کے۔ زمانہ جنگ میں انگلستان کی عورتوں میں دو گنا کام کی یہ وبا ہمہ گیر تھی۔ یہ چیز کسی طرح بھی

امید افزا نہیں ہے۔“

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش

اقبال (ضربِ کلیم)

عورت کا گھر کو چھوڑنا معاشرے کا زوال ہے:

پھر یہی مورخ ٹائن بی جو تاریخ کے موضوع پر اور قوموں کے عروج و زوال کے فلسفے میں
گہرا ادراک رکھتا ہے، آگے چل کر لکھتا ہے:

”تاریخ میں کسی بھی قوم کے زوال کے دور بالعموم وہی ہوئے ہیں جن میں عورت نے
گھر کو چھوڑا ہے۔ مثلاً پانچویں صدی میں یونان جب ارتقاء کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہا تھا، اس
وقت عورت گھر میں موجود تھی۔ مگر الیگزینڈر کے دور میں جب شہری ریاستوں کی ٹوٹ پھوٹ
ہونے لگی، ٹھیک ایسی ہی تحریک نسواں وہاں بھی موجود تھی جیسے ہمارے ہاں آج کے دور میں۔“

ہمیں اللہ کے دیئے ہوئے نظامِ حیات نے پہلے سے ایک معتدل، ہر عیب و نقص سے
پاک راستہ دکھا دیا تھا کہ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے، اس کا شوہر اور اس کے بچے ہیں مگر
مغرب کی جدید تحریک مساواتِ مرد و زن نے بڑھ بڑھ کر مسلم ممالک پر تابڑ توڑ حملے کیے اور
مسلمان عورت بھی آنکھ بند کر کے ترقی اور حقوق کے نام پر ان کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے اسی
راستے پر چل پڑی، لیکن اب زبردست معاشرتی فساد رونما ہو گیا ہے۔ خود ان کے اپنے مفکر اپنی
عورتوں کو گھروں میں واپس لانا چاہتے ہیں، وہ اپنے معاشی اور عمرانی بحران کا اصل حل یہی سمجھتے
ہیں کہ عورتیں بیرونِ خانہ کے سارے کام چھوڑ کر اپنے اصل محاذ کو سنبھال لیں۔ اب ان کا نقطہ نظر
تبدیل ہو رہا ہے۔ اس وقت امریکہ میں وہ عورت قابلِ قدر سمجھی جانے لگی ہے جو بیرونِ خانہ کی
ذمہ داریاں اٹھانے سے گریز کرے۔

اسلام میں عورت کا کردار۔۔۔ اور اس پر اجر و ثواب:

حاملانِ کتابِ الہی اور وارثانِ سنتِ نبویؐ کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ میری پیاری مسلمان بہنوں سے اپیل ہے کہ وہ ایک بار پھر شعور کے ساتھ اپنا ایمان تازہ کریں اور اسلام کی طرف برضا و رغبت رجوع کریں۔ جہاں ہمارے لیے ہمارے فطری وظائف یعنی حمل، زچگی، رضاعت وغیرہ میں جو بے پناہ اجر و ثواب پنہاں ہے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اسی میں ہمارے لیے حقیقی خوشی اور سچا اطمینان ہے۔

اللہ نے عورت کے وجود کو مرد کے لیے باعثِ سکون بنایا ہے اور عورت سراپا محبت اور تسکین ہے۔ اب اگر یہ سرچشمہ تسکین بھی سوکھ جائے تو مرد کو جو پہلے ہی کرخت ہے، وحشی اور فتنہ انگیز ہونے سے کون بچائے گا؟ لہذا ہمیں گھروں کو شوہروں کے لیے جائے سکون بھی بنانا ہے۔

اسی میں ہمارے رب کی رضا ہے۔ یہی امہات المؤمنین اور خاتونِ جنت حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہن کی پیروی ہے۔ اس سے ہمارا معاشرہ فساد سے بچ سکتا ہے، بے حیائی و عریانی سے نجات پائی جاسکتی ہے اور اس میں تمدن کی صحیح تعمیر کا سامان موجود ہے۔

چنانچہ قرآنِ پاک میں سورۃ الروم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہی سے تمہاری

بیویاں پیدا کی ہیں تاکہ تم ان کے پاس آرام و سکون پاؤ اور اسی نے تمہارے

درمیان دوستی اور مہربانی رکھ دی۔ بے شک اس میں غور کرنے والے لوگوں کے

لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔“ [۱]

قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کے ذمے دو فرض مقرر کیے ہیں:

۱۔ خاوند کو سکون فراہم کرنا

۲۔ تولیدِ نسل انسانی

اور یہ دونوں ذمہ داریاں ہی عورت کے لیے گرانبار بوجھ ہیں۔ جن کا اللہ تعالیٰ نے بے

پناہ اجر و ثواب بھی رکھ دیا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

- 1- ”عورت اپنی حالتِ حمل، زچگی اور رضاعت، ان تینوں مرحلوں میں فضیلت میں ایسی ہے جیسے اسلام کی راہ میں سرحد کی نگرانی کرنے والا مجاہد (جو ہر وقت جہاد کے لیے تیار رہتا ہے) اور اگر درمیان میں اس کو موت آجائے تو اس کو شہید کے برابر ثواب ملتا ہے۔“ [۱]
- 2- ”نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ جب کوئی عورت اپنے شوہر سے حاملہ ہوتی ہے اور وہ شوہر اس سے راضی ہو تو اس کو ایسا ثواب ملتا ہے جیسا اللہ کی راہ میں دن کو روزہ رکھنے اور رات کو قیام کرنے کا۔ پھر جب اس کو درِ زہ ہوتا ہے اس کے لیے اس پر جو اجر و ثواب مخفی رکھا گیا ہے، اس کو آسمان وزمین والوں میں سے کوئی نہیں جانتا (مراد یہ ہے کہ وہ اجر بے پناہ ہے) جب وہ بچہ جنتی ہے اور بچہ اس کا جتنے گھونٹ دودھ پیتا ہے اور اس کے پستان سے جتنی دفعہ دودھ چوستا ہے ہر دفعہ اس کو ایک نیکی ملتی ہے اور اگر بچے کے سبب اسے رات کو جاگنا پڑے تو اس کو راہِ خدا میں ستر غلاموں کے آزاد کرنے کا ثواب ملتا ہے۔“ پھر آپؐ نے فرمایا: ”اے سلامت (سلامت آپؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ کی آیا کا نام ہے اور وہی اس حدیث کی راوی بھی ہیں) کیا تمہیں معلوم ہے کہ میری مراد کیا ہے؟ میں یہ بات ان خواتین کے بارے میں کہہ رہا ہوں جو ناز و نعمت میں پلنے کے باوجود صالح فطرت ہیں، اپنے شوہروں کی اطاعت شعار ہیں اور وہ اپنے شوہروں کی ناقدری نہیں کرتیں۔“ [۲]
- 3- ”جب کوئی عورت حاملہ ہوتی ہے تو اس کو رات کو قیام کرنے والے اور دن کو روزہ رکھنے والے کا ثواب ملتا ہے۔ پھر جب عورت اپنے بچے کو دودھ پلاتی ہے تو ہر گھونٹ دودھ پلانے پر اتنا اجر ملتا ہے گویا کسی جاندار کو زندگی دے دی۔ پھر جب دودھ چھڑاتی ہے تو فرشتہ شاباش دیتے ہوئے اس کے کندھے پر تھپکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ پچھلے گناہ تو سب معاف ہو گئے۔ (یعنی صغیرہ گناہ) اب آئندہ کے لیے عمل کر۔“ [۳]

[۱] طبرانی عن ابن عمر، بحوالہ کنز العمال، ج 16، صفحہ 411

[۲] ایضاً، صفحہ 405

[۳] ایضاً، صفحہ 412 نمبر 45160

”جس عورت کے تین بچے فوت ہو جائیں اور وہ ثواب کی امید پر صبر کرے تو جنت میں داخل ہوگی۔ اور وہ اس کے لیے دوزخ کی آگ کے مقابلے میں آڑ بن جائیں گے یعنی اس کو دوزخ کی آگ سے بچالیں گے۔“ ایک عورت بولی: ”یا رسول اللہ! جس کے دو بچے فوت ہوئے ہوں؟“ فرمایا: ”دو کا بھی یہی ثواب ہے۔“ [۱] ایک روایت میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے ایک بچے کے فوت ہونے کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے اس کا بھی بڑا ثواب بتایا۔

آپؐ نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر کسی عورت کا حمل گر جائے اور وہ ثواب سمجھ کر اس پر صبر کرے تو وہ ناقص بچہ بھی اپنی ماں کو گھسیٹ کر جنت میں لے جائے گا۔“ [۲]

”جو عورت زچگی کے وقت فوت ہو جائے وہ شہید ہے۔“ [۳]

”دنیا کا بہترین خزانہ نیک بیوی ہے کہ خاوند اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے، جب شوہر اسے کوئی کام کہے تو اس کی اطاعت کرے اور جب شوہر گھر میں نہ ہو تو اپنی عزت و آبرو بچا کے گھر میں بیٹھی رہے۔“ [۴]

”دنیا کی بہترین نعمتوں میں سے کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں ہے۔“ [۵]

”قریش کی نیک عورتیں بھی خوب ہیں، ان میں دو ایسی صفتیں ہیں جو دوسروں میں نہیں، ایک تو اپنے بچے پر خوب شفقت کرتی ہیں، دوم: ”اپنے خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔“ [۶]

[۱] بخاری

[۲] احمد، ابن ماجہ

[۳] ابوداؤد، نسائی

[۴] نسائی

[۵] ابن ماجہ

[۶] بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ

ایک دفعہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس کے ساتھ دو بچے تھے۔ ایک کو گود میں اٹھائے ہوئے تھی، دوسرے کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ آپ نے دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ یہ عورتیں اوّل بچے کو پیٹ میں رکھتی ہیں، پھر جنتی ہیں دودھ پلاتی ہیں، پھر ان کے ساتھ کتنی محبت اور مہربانی کرتی ہیں! اگر ان کا شوہروں سے برتاؤ برانہ ہو تو ان میں سے جو نماز کی پابند ہیں سیدھی جنت میں چلی جایا کرتیں۔“ [۱]

غور فرمائیں! یعنی ایک طرف تو عورتوں کا اپنے بچوں کی خاطر حمل وزچگی کی تکلیف برداشت کرنا، پھر انھیں محبت و شفقت سے پالنا بہت اجر و ثواب کا باعث ہے مگر خاوندوں کی نافرمانی کرنے کے باعث ان کا اجر کم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے شوہروں کی قدر کریں، ان کی خدمت و اطاعت میں کمی نہ کریں، تو سیدھی جنت میں چلی جائیں۔ اللہ! اللہ! عورتوں کو ان دو کاموں پر اتنا ثواب بتایا جا رہا ہے کہ مردوں کے ہمت و محنت طلب اور جہاد جیسے بڑے کاموں کے برابر ہے۔

جب کوئی شخص فوت ہو جائے تو میت کی نماز جنازہ میں شرکاء اس کے لیے مغفرت اور بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ مگر معصوم بچے کی نماز جنازہ میں بچے کے لیے دعا نہیں کی جاتی۔ وہ تو معصوم ہے، بے گناہ ہے بلکہ اس کو اللہ کے یہاں اپنا سفارشی اور وسیلہ بنانے کی دعا کی جاتی ہے۔ وہ دعا یہ ہے۔

”اے اللہ! اس بچے کو ہمارے لیے اجر اور نیکیوں کا ذخیرہ بنا دے، اس کو آخرت میں ہمارے حق میں شفاعت کرنے والا بنا دے۔“ گویا وہ بچہ اپنی ماں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔

یہ ثواب عظیم، یہ مراتب عالیہ ایک مسلمان عورت کو ہی ملتے ہیں۔ وہ آخرت میں بڑا اجر و ثواب حاصل کرنے کی آرزو مند رہتی ہے۔ حقیقی کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے، جنت کا

[۱] مسند احمد، طبرانی، ابن ماجہ، مستدرک عن ابی امامہ، کنز العمال، ج ۱۶، ۴۵۱۳۳

حصول ہے۔ اس کے برخلاف مغربی عورت کا نہ تو آخرت پر ایمان ہے نہ مرنے کے بعد کسی اجر و ثواب کی توقع۔ پھر اپنے یہی فرائض ادا کرنے سے ہی مسلمان عورتوں کو دنیا میں بھی سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے، اپنے شوہر کی خدمت اور اپنے معصوم بچوں سے شفقت و پیار سے جو سکون حاصل ہوتا ہے، وہ بیرون خانہ بھاگ دوڑ میں نہیں مل سکتا۔ بلکہ باہر بھاگ دوڑ کرنے کے بعد تھکی ماندی عورت جب گھر آتی ہے تو گھر کے کام بھی بھاگم بھاگ کرتی ہے۔ دورانِ ملازمت میں گھر کی فکر، گھر میں ادارہ کی فکر، کہیں صحیح سکون نہیں مل سکتا۔ البتہ مستقل چڑچڑاپن اور بیزاری ضرور حصے میں آتی ہے، جو بالآخر بہت سے عوارض کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

دوسری طرف گھریلو ذمہ داریاں صحیح طرح سے ادا نہ کر سکنے پر قیامت والے دن عورت کی باقاعدہ پاز پرس ہوگی جبکہ ملازمت نہ کرنے پر باز پرس نہیں ہے۔ یہ گھریلو ذمہ داریاں ادا کرنا تو عورتوں پر فرض ہے۔ ان کو نہ ادا کرنے پر اللہ تعالیٰ ناراض ہوگا۔ ملاحظہ ہو حدیث نبویؐ

الْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدَيْهَا وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ [۱]

”عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگران بنائی گئی ہے۔ قیامت والے دن اس سے ان کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔“

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

”جو عورت بیوہ ہو جائے وہ خاندانی بھی ہو اور مالدار بھی، وہ اپنے بچوں کی خدمت اور پرورش میں مصروف ہو کر اپنا رنگ میلا کر لے یہاں تک کہ وہ بچے بڑے ہو کر اپنے گھر والے ہو گئے یا فوت ہو گئے تو ایسی عورت جنت میں میرے اس طرح قریب ہوگی جیسے شہادت والی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی۔“ [۲]

[۱] صحیح بخاری، کتاب الجمعہ

[۲] طبرانی

اندازہ فرمائیے کہ اولاد کی خاطر عورت کی محنت و مشقت بارگاہِ الہی میں کتنا اہم مقام رکھتی ہے! بچوں کی پرورش اور ان کی تربیت شریعتِ اسلامی کی نگاہ میں بہت اہم وظیفہ ہے۔ علامہ ابنِ خلدون ایک مقام پر لکھتے ہیں:

”دنیا کے اندریوں تو بہت سے کام اہم اور ضروری ہیں۔ مگر بچوں کی تربیت اور ان کی دماغی و ذہنی صلاحیتوں کی حفاظت سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان عورت دن ہو کہ رات، اس کام میں مصروف و منہمک رہتی ہے۔ وہ اپنے بچے کو اس لیے نہیں پالتی کہ یہ اس کا نخبِ جگر ہے، اس کا نورِ نظر ہے، اس کے بطن سے پیدا ہوا ہے یا بڑھا ہے میں اس کے کام آئے گا بلکہ ان کی تربیت اور محنت و مشقت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی امانت ہے۔ اس کو اس طرح قوم کے سپرد کرنا ہے کہ وہ ملک و ملت کی صحیح خدمت اور راہنمائی کر سکے۔ اس کے پیش نظر اپنے آرام و آسائش سے زیادہ دین و وطن کا آرام و آسائش ہوتا ہے۔“ [۱]

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

”یہ فرائض عورت ہی کے لیے مخصوص ہیں کہ وہ کھانے پینے اور لباس تیار کرنے کی خدمت انجام دے، شوہر کے مال کی حفاظت کرے، بچوں کی تربیت کرے اور وہ تمام امور جن کا تعلق گھر اور گھر ہستی کے ساتھ ہے، ان کی انجام دہی کی وہ ذمہ دار ہے۔“ [۲]

حدیث نبویؐ ہے: عَلَيْكُنَّ بِالنَّيْتِ فَإِنَّهُ جِهَادُكُنَّ [۳]

”اے خواتین! تم گھروں میں رہو۔ امور خانہ داری انجام دینا ہی تمہارا جہاد ہے۔“

سید قطبؒ لکھتے ہیں: ”پرورش گاہوں میں پلنے والے بچے ناقص انسانیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہاں جو عورت ماں بن کر بچوں کو پالتی ہے وہ جذبہٴ مادری سے محروم ہوتی ہے، پھر

[۱] ”اسلام اور عورت“ از: عبدالقیوم ندوی، صفحہ 118

[۲] حجة الله البالغة

[۳] عیون الاخبار، ج 4، صفحہ 74

بچوں کو ان تربیت گاہوں میں بھیجنے کے لیے ایک اور احمقانہ حرکت کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ماں خود ملازمت کرے تاکہ بچے کی تربیت کرنے والی آیا کی تنخواہ دے سکے۔“ نوکروں کے ہاتھوں پلنے والے بچے جب باہر کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو معاشرتی برائیوں کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ سینماؤں، شراب خانوں، جو خانوں، کلبوں میں جانا شروع کر دیتے ہیں۔ کورس کی کتابوں کے بجائے گند اور فحش لٹریچر پڑھنے لگتے ہیں۔ اور اللہ و رسولؐ کے نافرمان ہوتے جاتے ہیں۔

جبکہ ماں کی حسن تربیت سے بچے نیک اور شریف بنتے ہیں۔ گھر میں محبت، ہمدردی، ایثار و تعاون کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ پھر عورت رفیقہ حیات کی حیثیت سے بھی وفاداریوں اور جاں نثاریوں کا پیکر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندان کی ساری نعمتیں اس کے دم سے ہیں اور اس کی غیر موجودگی سے جو خلا پیدا ہوتا ہے، وہ کسی طرح بھی پر نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے خواتین کا رات کو سوتے وقت بچوں کو قرآنی قصے، انبیاء علیہ السلام کے واقعات، صحابہ کرامؓ کی ایمان افروز کہانیاں سنانا بچوں کو بہت اثر کرتا تھا اور وہ بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کے لیے بے تاب ہو جاتے تھے۔ مگر آج ایک طرف ٹی۔وی کلچر، دوسری طرف ماؤں کا اپنے دائرہ کار سے انحراف۔۔۔ مل کر گھر کے ادارہ کو منہدم کر رہے ہیں، جو کسی طرح بھی ہمارے لیے مبارک نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے عورت کے فرائض منصبی کے بارے میں شریعت اسلامی کا قانون! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۖ [۱]

”جس نے اللہ کی حدود سے تجاوز کیا اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا۔“

گویا عورت کا فطری فرائض میں کمی بیشی یا رد و بدل کرنا دراصل اپنی ہی ذات پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

تجزیہ:

ایک طرف تو مغرب کا نظریہ مساواتِ مرد و زن ہے، جس کے مطابق عورتیں کسب معاش کے لیے گھروں کو خیر باد کہہ کر باہر نکل آئیں۔ ملازمت میں بچے جننا اور پالنا دونوں ہی مشکل کام تھے، لہذا عورتوں کو مادرانہ فرائض ادا کرنے بلکہ شادی کرنے سے بھی نفرت دلائی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ مخلوط معاشرے میں جنسی خواہش تو انہوں نے ہر جگہ پوری کر لی، مگر اس کے قدرتی و فطری نتیجہ ”حمل“ سے حتی الامکان جان چھڑانا چاہی۔ بے شمار مانع حمل ادویات کا استعمال شروع ہوا۔ پھر بھی حمل قرار پاتے رہے، ان سے ولادت سے قبل Abortion کے ذریعے سے جان چھڑانے کی کوشش کی گئی۔ پھر بھی جو بچے پیدا ہوئے، عورتوں نے ان کو اپنے عیش اور کمائی دونوں کے راستے میں رکاوٹ سمجھ کر ان سے جان چھڑانے کی بھرپور کوشش کی، بے دردی سے اپنے بچوں کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی گئی۔ نوزائیدہ بچوں کو گٹروں میں پھینکنا، گاڑی کے نیچے دے دینا، کیل مار مار کر ان کو ختم کر دینا، پارکوں میں پھینک دینا جیسے دلدوز مناظر وجود میں آتے رہے۔ مائیں خود (جن کو خالق کائنات نے ممتا عطا کی ہے، اپنی فطرت کو مسخ کر کے) اپنے بچوں کے حق میں جلاد بنتی رہیں۔ پھر بھی بچ جانے والے بچے اکثر ماں اور باپ کے درمیان نزاع کا باعث بنتے رہے۔ طلاقوں کی کثرت کی وجہ سے بچوں کا بیشتر حصہ بھی عورتوں ہی کے حصے میں آیا۔ ان کو گھروں میں تالے لگا کر کام پر جانا، بسا اوقات ایسے واقعات ہوئے کہ بچے گھروں میں بند ماں کا انتظار کر رہے ہیں اور ماں کسی وجہ سے پہنچ نہ پائی تو دونوں تینوں بچے جتنے گھر میں موجود تھے ماں کا انتظار کرتے کرتے اس جہانِ فانی ہی سے کوچ کر گئے۔ پھر کچھ بچے ماں کی ممتا اور شفقت بھرے لمس سے محروم، بچے گھروں یعنی Day Care Centers میں پرورش پانے لگے۔ کچھ بچوں نے اپنی محرومی اور احساسِ تنہائی کو ختم کرنے کے لیے منشیات کا سہارا لیا۔ جبکہ کچھ بچوں نے خودکشی کی راہ اپنائی، کچھ بچوں نے تشدد، مار دھاڑ اور قتل و غارت جیسے جرائم میں پناہ لی۔ اس

خاندانی خلفشار کے دور میں بہت کم بچے ایسے خوش قسمت نکلے جو ماں باپ دونوں کی توجہ اور شفقت اور پھر مناسب تعلیم و تربیت پا کر معاشرے کے باوقار شہری بن سکے۔ بلکہ وہاں ”ڈاگ کلچر“ عام ہو رہا ہے۔ کتے سے پیار اور کتے کے لیے وصیت، مگر اپنی نسل پیار، وصیت ہر چیز سے محروم ہے۔

یہ اہل مغرب کا اپنی آئندہ نسل کے ساتھ سلوک ہے۔ وہ کتے بلی سے زیادہ پیار کرتے ہیں مگر اپنی نسل کو پالنے کے لیے ان کے پاس نہ نفسیاتی جذبے ہیں اور نہ وقت ہے۔ اس سے ایک تو ان کی آبادی خوفناک حد تک کم ہو گئی، دوم اگلی نسل اخلاق و تہذیب سے یکسر عاری، جرائم پیشہ اور منشیات کی عادی بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت مغربی معاشرہ بڑی ابتری کا شکار ہے۔ اب ان کے مفکر و دانشور، پریشان حال عورت کو اس کے فطری فرائض یا دد لار ہے ہیں۔

جب اہل مغرب نے مسلمانوں پر غلبہ پایا تو ان پر رجعت پسند اور دقیانوسی ہونے کی پھبتی کسی عورتوں کو ستر و حجاب کی بندشوں سے آزاد کرنے کی ترغیبیں دیں، خاندانی منصوبہ بندی کے ڈول ڈالے۔ ٹی۔ وی، وی۔ سی۔ آر، بلیو پرنٹس کے ذریعے سے ہماری معاشرت تبدیل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مسلمان عورت کو بھی کسبِ معاش میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے تیار کیا گیا۔ ”بچے دو ہی اچھے“ ”چھوٹا خاندان، زندگی آسان“ جیسے دلفریب نعرے رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب بھی ہر سال فیملی پلاننگ کے لیے امریکہ سے اچھی خاصی ”ایڈ“ آرہی ہے۔ مقصد یہی ہے کہ مسلم خواتین بھی اہل مغرب کی طرح گھروں سے باہر نکل مخلوط ثقافت کو رواج دیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف عورتیں اپنے شوہروں کا کما حقہ احترام نہیں کرتیں، ان کے تعلقات میں اب مقابلے کا رنگ پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے اور دوسری طرف دو تین سے زیادہ بچے جننا کوئی بھی عورت اپنے لیے باعثِ عار سمجھنے لگتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ مبارک تَزَوُّجُ الْوُحْدِ الْوَلُودَ فَإِنَّ مَكَاثِرَ بَكْمُ الْأُمَمِ [۱] ”ایسی عورتوں سے نکاح کرو

جو خاوندوں سے محبت کرنے والی اور زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہوں، بیشک میں تمہاری کثرت کی بنا پر روز قیامت دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔“ طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا ہے۔ فیملی پلاننگ یا بہبود آبادی کے پراپیگنڈے کا اتنا نمایاں اثر ہو رہا ہے کہ یہاں لاہور میں عمومی فضا یہ بن گئی ہے کہ جس عورت کو تیسرا چوتھا حمل ٹھہر جائے وہ محلے کی خواتین سے چھپتی پھرتی ہے کہ میری رشتہ دار اور ہمسائی خواتین مجھے کیا کہیں گی [۱] ہم نے آپس میں مل کر قسم کھائی تھی کہ ہم اب اپنا چوتھا بچہ نہیں ہونے دیں گی۔

گزشتہ سال ماہ ستمبر 1995ء میں بیجنگ (چین کا دارالخلافہ) میں اقوام متحدہ کی طرف سے خواتین کی چوتھی بڑی عالمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے ایجنڈے میں اسقاطِ حمل، بچے پیدا کرنے کے معاملے میں عورت کی خود مختاری اور ہر شعبہ زندگی میں عورت کی مرد کے ساتھ مکمل مساوات جیسے مطالبات سرفہرست تھے، مسلم ممالک کی خواتین نے بھی اس ایجنڈے پر اتفاق کیا، پھر اس کے مطابق اپنے اپنے ممالک میں لائحہ عمل طے کرنے اور اس ایجنڈے کو بروئے کار لانے کا معاہدہ کیا۔ خود پاکستانی وزیراعظم بے نظیر نے بھی اس ایجنڈے پر دستخط کرتے ہوئے ان دفعات کو وطن عزیز۔۔ ایک نظریاتی مملکت۔۔ پاکستان میں عملاً قائم

[۱] یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔ میں اپنے گھر کے قریب ایک ہمسائی کے ہاں بیمار پرسی کے لیے گئی تو اس نے پریشانی کے عالم میں بتایا کہ میں اب کیا کروں؟ ہم پانچ چھ خواتین نے مل کر یہ قسم کھائی تھی، اب مجھ سے یہ قسم ٹوٹ گئی ہے، اب میں ان کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہ گئی۔۔ جہالت کا یہ عالم ہو گیا کہ مسلمان کہلانے والی خواتین آنے والی روح کو روکنا خود اپنے اختیار میں سمجھنے لگی ہیں۔

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس تعلیم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اس علم کو اربابِ نظر موت!
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت
(ضربِ کلیم)

کرنے کا وعدہ کیا۔

پاکستان میں اس وقت یو۔ این۔ او کی طرف سے ”ہیومن رائٹس کمیشن“ اور بے شمار این۔ جی۔ اوز (یعنی غیر سرکاری تنظیمیں، جو زیادہ تر یہودیوں پر مشتمل ہیں) خواتین کو بے راہرو کرنے، انھیں گھر کے محاذ سے باہر نکالنے اور اختلاط مرد زون کو فروغ دینے کے خصوصی ہدف کے تحت کام کر رہی ہیں۔ مزید برآں سرکاری میڈیا، لٹریچر، پریس بھی اسی مشن میں مشغول ہیں، قومی سطح پر ان والدین کو انعامات دیئے جا رہے ہیں جو اپنے بچے دو سے زیادہ نہیں ہونے دیتے۔

اب یہ دیندار مسلم خواتین کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس مغربی پراپیگنڈے کے آگے بند باندھیں، اپنے گھریلو محاذ کو مضبوط بنائیں، اسلامی تعلیمات کو خواتین کے اندر عام کریں۔ میڈیا، پریس اور مخرب اخلاق لٹریچر کے پھیلانے ہوئے زہریلے اور مسموم اثرات کو زائل کرنے کے لیے جہاد کریں اسی میں ہمارے لیے عزت اور فلاح و کامیابی کا راز مضمر ہے۔

6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿وَلَا تَقْرُبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾
”بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔“
(الانعام: 151)

اسلام اور پاکدامنی

- ✽ مغربی تہذیب کا مقدمہ
- ✽ حیا ایک بہت بڑی قوت ہے
- ✽ اسلام کا نظام عفت و عصمت
- ✽ حیا کا جذبہ فطری ہے
- ✽ حیا اسلام کا اہم جز ہے
- ✽ عفت و عصمت (پاک دامنی) اور حیا کا گہرا تعلق
- ✽ پاک دامنی کی تاکید
- ✽ بے باک نگاہ
- ✽ فواحش کی ممانعت
- ✽ بدکاری کی ممانعت پر قرآن کریم کے مزید احکام
- ✽ بدکاری کے دنیوی و اخروی نقصانات و سزائیں
- ✽ قانون رجم
- ✽ پاک دامنی قائم رکھنے کی تدابیر
- ✽ محرمات کا قانون
- ✽ حرمت زنا
- ✽ نکاح
- ✽ لباس اور ستر
- ✽ ستر کی حدود
- ✽ استیذان
- ✽ خلوت کی ممانعت
- ✽ پردہ (حجاب)
- ✽ مبادیات زنا سے بچنے کی تاکید
- ✽ فتنہ نظر
- ✽ جاہلی بے پردگی سے بچنے کی ممانعت
- ✽ فتنہ زبان
- ✽ زیوروں کی آواز کا فتنہ
- ✽ خوشبو کا فتنہ
- ✽ ستر کا چھپانا
- ✽ اپنے عیوب اعلانیہ بیان کرنے سے اجتناب
- ✽ تہمت لگانے کی ممانعت
- ✽ فحاشی پھیلانے کی ممانعت
- ✽ ہم جنس پرستی
- ✽ عمل قوم لوط

اسلام اور پاکدامنی

مغربی تہذیب کا مقدمہ:

اہل مغرب کو اسلام کے شرم و حیا اور ستر و حجاب کے احکام پر شدید اعتراض ہے۔ وہ عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کے قائل ہیں اور ستر یا حجاب کی پابندیوں کو عورت کی نشوونما اور ترقی کے حق میں ستم قاتل قرار دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان عورت بھی مغربی عورت کی طرح یہ تمام پابندیاں توڑ کر گھر سے باہر نکل آئے اور زندگی کے ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرے۔

حیا ایک بہت بڑی قوت ہے:

لیکن اسلام اس بات کا قائل ہے کہ شرم و حیا ایک بہت بڑی قوت اور طاقت ہے۔ جب تک شرم و حیا معاشرے میں برقرار رہے، وہ معاشرہ ہر لحاظ سے ترقی پذیر رہتا ہے، لیکن جب عفت و عصمت اور شرم و حیا پامال ہونے لگیں اور بے حیائی اور فحاشی کا رواج عام ہو جائے تو یہ چیز اجتماعی اور انفرادی دونوں لحاظ سے معاشرے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر رہتی ہے۔ اس لیے اسلام کے حیا اور عفت و پاکدامنی کے احکام پر تفصیلاً روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

اسلام کا نظام عفت و عصمت

حیا کا جذبہ فطری ہے:

حیا کے معانی شرم اور جھجک کے ہیں، کوئی برا یا فحش کام کرتے وقت دل میں کچھ جھجک، بے چینی اور بے قراری سی پیدا ہوتی ہے، اسے حیا کہا جاتا ہے۔ یہ حیا دل میں جتنی زیادہ ہوگی، انسان اتنا ہی برائیوں سے دور رہے گا کیونکہ جب کبھی اس کو برائی کا خیال آئے، اس کے دل میں

یکدم اضطراب و بے چینی پیدا ہوگی، اس کا ضمیر اسے جھنجھوڑے گا کہ یہ کام مت کرو یہ اچھا نہیں۔ اب اگر وہ وہ آدمی اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے گا، تبھی سکون و اطمینان پائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بندہ کے اندر یہ حیا کا جو ہر رکھا ہے۔ انسان فطرتاً نیکی پسند ہے اور برائی سے نفرت رکھنے والا ہے۔

اسی طرح بعض فرائض انسان پر عائد ہوتے ہیں، اگر انسان ان سے پہلو تہی کرنا چاہے تب بھی دل میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے، اندر سے آواز آتی ہے کہ تمہیں یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔ پس یہ حیا کا جذبہ ہی ہے جو اسے اپنا فرض ادا کرنے پر ابھار رہا ہے۔ جس شخص کے دل کی ایسی کیفیت ہو، جو اسے اپنا فرض چھوڑنے یا برا کام کرنے پر اندر سے ملامت کرے اور اس میں بے چینی اور اضطراب پیدا کرے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حیا دار ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ برائی کی طرف جاتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہ کریں، آرام سے اپنے فرائض چھوڑ دیں، ان کو اس پر کوئی افسوس و ملامت نہ ہو تو ان کے بارے میں یہی کہا جائے گا وہ ”بے حیا“ ہیں۔

حیا اسلام کا اہم جز ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ شُعْبَةً وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيْمَانِ [۱]
 ”ایمان کی ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔“

آپؐ نے مزید فرمایا:

إِنَّ لِكُلِّ دِيْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ [۲]
 ”ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیا ہے۔“

یعنی جس طرح ایمان اور اسلام انسان کو برائیوں سے روکتے ہیں، اسی طرح حیا بھی برائیوں سے روکتی ہے لہذا حیا، ایمان اور اسلام کا بہت اہم جز ہے۔ مزید آپؐ نے فرمایا:

[۱] صحیح مسلم: 35

[۲] ابن ماجہ: 4181

إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ ۝۱

”جب تجھ میں حیا نہیں تو پھر تیرا جو جی چاہے کر۔“

مراد یہ ہے کہ برائیوں کی طرف جانے سے ”حیا“ ہی روکتی ہے جب حیا ختم ہو جائے اور فطرت ہی گناہوں کی وجہ سے بدل گئی ہو تو پھر انسان ہر گناہ اور برائی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”بے حیائی جس چیز میں بھی ہو اسے عیب دار بنادیتی ہے اور حیا جس کام میں بھی موجود ہو اسے خوبصورت بنادیتی ہے۔“ [۲] حضرت ابو بکر صدیقؓ کا فرمان ہے: ”جو قوم بے حیائی کی طرف قدم بڑھائے گی، اللہ اسے مصیبتوں میں مبتلا کر دے گا۔“

عفت و عصمت (پاک دامنی) اور حیا کا گہرا تعلق:

اسلامی اخلاق میں حیا کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، چنانچہ زندگی کا وہ شعبہ جو انسان کی صنفی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اس میں بھی اصلاح احوال کے لیے حیا ہی سے کام لیا گیا ہے۔ مرد و عورت کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے لیے شدید کشش رکھ دی ہے مگر ان کے درمیان تعلقات کو نکاح کا پابند کر دیا ہے۔ جو مرد و عورت اس پابندی کا پوری طرح خیال رکھے اور ادھر ادھر تو جہ نہ کرے اسے پاکباز، پاک دامن، عفیف، حیا دار اور با عصمت کہا جاتا ہے۔ مگر جو انسان (مرد ہو یا عورت) اس پابندی کو توڑ دے، ادھر ادھر منہ کالا کرنے لگ جائے، وہ بدکردار اور بدچلن ہے۔ یہ بدکاری اسلام میں بہت بڑا گناہ سمجھا گیا ہے۔

پاک دامنی کی تاکید:

چنانچہ سورہ نور میں ارشاد ہوتا ہے۔ (مرد و عورت دونوں کو یکساں تاکید کی گئی ہے):

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ۝

[۱] بخاری: 6120؛ السلسلة الصحيحة 2/296

[۲] ترمذی، احمد، ابن ماجہ (صحیح الجامع: 5655)

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَقُلْ
لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ ﴿٣١﴾
”اے نبی! مومن مردوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہوں کو (غیر عورتوں کو
دیکھنے سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے
زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور
اے نبی! مومن عورتوں سے بھی کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہوں کو (غیر مردوں کی
دید سے) باز رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔“

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ پاک دامن رہنا چاہتے ہو تو اپنی نگاہ کی حفاظت کرو۔ غلط
نگاہ، اصل گناہ یعنی زنا تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس طرح نگاہوں کی بیا کی فتنے
جگاتی ہے۔ لہذا غرض بصر کی بہت تاکید کی گئی ہے۔

بے باک نگاہ:

نفس کا سب سے بڑا چور بے باک نگاہ ہے۔ لہذا قرآن وحدیث دونوں سب سے پہلے
اس کی گرفت کرتے ہیں۔ نگاہ نیچی رکھنے سے مراد نگاہ کو ان چیزوں سے ہٹا لینا ہے جن کی طرف
دیکھنا شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے اور شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد یہ ہے کہ نفس کی خواہش کرنے
کی جتنی ناجائز صورتیں ہیں، ان سب سے اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھیں۔ مثلاً زنا، عمل قوم لوط
وغیرہ۔ غلط نگاہ دراصل دل کی قاصد اور پیغامبر ہوتی ہے۔ لہذا نگاہ کی حفاظت شرمگاہ کی حفاظت
ہے۔ جو شخص اپنی نگاہ آزاد چھوڑ دے، اپنی بیوی یا اپنی محرم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو
نگاہ بھر کر دیکھے۔۔۔ پھر دوبارہ سہ بارہ دیکھے تو یہ آنکھوں کا زنا ہے۔۔۔ اس کی دبی دبائی
چنگاری پھر انگارہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

عورت کی نگاہ تو اور بھی فتنے جگاتی ہے۔ جذبات میں عورتیں مردوں سے بڑھ کر ہیں، وہ
جلد متاثر ہو جاتی ہیں لہذا عورتوں کو اپنی نگاہ کی حفاظت کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

پھر شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد صرف ناجائز شہوت رانی سے پرہیز نہیں بلکہ اپنے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے سے بھی پرہیز کرنا ہے۔

اسلامی معاشرہ کو خصوصاً عورت کی عفت و عصمت اور پاکیزگی کا بے حد پاس ہے، عفت اور عصمت سے مراد ہی یہ ہے کہ عورت کے چہرے پر کسی غیر مرد کی نگاہ نہ پڑے۔ اس کی محبت اور تعلق کا محور و مرکز صرف اور صرف ایک ہی شخص ہو یعنی اس کا شوہر۔ اور صرف وہی اس کے جمال اور زیبائش سے محفوظ ہو۔ عائلی زندگی کی اساس ”زوجین کی باہمی محبت اور اخلاص“ ہے۔ جب یہ محبت و اخلاص زوال پذیر ہوتا ہے تو قومیں زوال پذیر ہونے لگتی ہیں اور جب تک اس محبت و اخلاص کی قدر کی جاتی ہے اور اس کی حفاظت کی جاتی ہے، معاشرہ پرسکون اور ترقی پذیر ہوتا ہے۔

مرد اور عورت دونوں کو الگ الگ اور یکساں اپنی عفت کی حفاظت کی تاکید کی گئی ہے۔ ایک جگہ عفت و عصمت کی حفاظت کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:-

﴿وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا
وَالذَّاكِرَاتِ ۚ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ [۱]

”اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں اور بکثرت اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور عورتیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔“

☆ حضرت یوسف علیہ السلام کی تعریف خصوصاً بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۚ﴾ [۲]

”واقعی میں (اس عورت) نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ (یوسف) پاک صاف رہا۔“

☆ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفت یوں بیان فرمائی:

[۱] الاحزاب: 35

[۲] یوسف: 32

﴿سَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ﴾ [۱]

”وہ سردار ہوں گے، اپنے نفس کو بہت روکنے والے (نفس کے فریب میں مبتلا نہ ہونے والے) اور نبی ہوں گے اور بہت نیک صالح ہوں گے۔“

☆ حضرت مریم علیہا السلام پر دشمنوں نے بدکاری کی تہمت لگائی تو اللہ تعالیٰ نے برأت فرمائی:

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ [۲]

”مریم بنت عمران، جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔“

☆ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ پر دشمنوں نے تہمت لگائی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی عفت و

پاکدامنی کا اعلان زوردار انداز میں فرمایا۔ رہتی دنیا تک قرآن نے ان کی پاک دامنی کو اپنے دامن میں محفوظ کر لیا:

﴿أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۖ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾ [۳]

”یہ اس بات سے پاک ہیں جو وہ کہتے ہیں، ان کے واسطے مغفرت اور عمدہ رزق ہے۔“

پاکیزہ نفس، پاک دامن لوگ اللہ کو کتنے محبوب ہیں! اس کا اندازہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ہوتا ہے کہ ”روز قیامت اللہ تعالیٰ سات لوگوں کو اپنے عرش کے سایہ تلے جگہ دے گا جبکہ اس کے علاوہ کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔ تو ان میں ایک وہ شخص بھی ہوگا جس کی نشوونما ہی اللہ کی بندگی میں ہوئی ہو اور ایسا شخص بھی جس کو کسی صاحبِ مرتبہ اور عالی نسب عورت نے اپنے پاس بلایا اور زنا کرنے کی دعوت دی مگر اس خدا کے بندے نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ”میں اللہ سے ڈرتا ہوں“ اور ایسا شخص بھی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے، اپنے اعمال کا خیال کر کے اس کی آنکھیں پر غم ہو جاتی ہیں۔“ [۴]

[۱] آل عمران: 39

[۲] التحريم: 12

[۳] النور: 26

[۴] بخاری: 660؛ مسلم: 1031؛ ترمذی: 2391

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز تبلیغ ہی سے مسلمانوں کو پاک دامنی کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ ہر قل شاہِ روم کے دربار میں ابوسفیان نے، جس نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا (ہر قل کے اس سوال پر کہ وہ نئے نبی تمہیں کس بات کی تعلیم دیتے ہیں؟) یہ بات کہی: آپ ہمیں نماز، صدقہ، پاکدامنی اور صلہ رحمی کی تاکید فرماتے ہیں۔“ [۱]

چنانچہ صحابہ کرامؓ کے بہت سے ایسے واقعات سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد ان کو حسب سابق کچھ خواتین نے گناہ کی دعوت دی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ مثلاً مرثد بن ابی مرثد غنوی۔ یہ سب وہ کردار ہیں جو قیامت کے خوف سے وجود میں آتے ہیں۔ اسلام ایسی ہی اعلیٰ صورت کی توقع ہر مسلمان سے کرتا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عفت کی حفاظت کے لیے بہت سی دعائیں بھی اس سلسلہ میں مروی ہیں۔ مثلاً:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْهُدٰی وَالتَّقٰی وَالعِفَافَ وَالعِلٰی
 ”اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، تقویٰ، پاکدامنی اور غنا کی درخواست کرتی/کرتا ہوں۔“

اَللّٰهُمَّ اَلْهِنِّیْ رُشْدِیْ وَاعِزِّیْ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ
 ”اے اللہ! مجھے راہِ راست کی توفیق عطا فرما اور نفس کی برائی سے مجھے اپنی پناہ میں رکھ۔“ [۲]

خواتین کے گوہرِ عفت و عصمت کی حفاظت کا اسلام نے بہت اہتمام فرمایا ہے۔ اسلام کے سوا ہر تہذیب اور نظام نے عورت کے اس حق کو مسل کر رکھ دیا ہے۔ اسلام میں عورت کی شرم و حیا ہی اس کی اصل خوبی بتائی گئی ہے۔ مولانا مودودیؒ فِیْہِیْنَ قُصِرَاتُ الطَّرْفِ کی تشریح میں لکھتے ہیں: ”یہ عورت کی اصل خوبی ہے کہ وہ بے شرم اور بے باک نہ ہو بلکہ نظر میں حیا رکھتی ہو۔“

[۱] بخاری، کتاب بداء الوحی حدیث نمبر 7

[۲] ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ

اس لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کے درمیان عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے ان کے حسن و جمال کی نہیں بلکہ ان کی حیاداری اور عفت مآبی کی تعریف فرمائی۔ [۱] پھر اسلام عورت کی موتی جیسی آبرو کی حفاظت بھی بہت کرتا ہے۔ کوئی شخص اگر عورت پر غلط طور پر بدکاری کی تہمت لگائے اور عدالت میں ثبوت پیش نہ کر سکے، تو اسلام ایسے شخص کو اتنی (80) کوڑوں کی سزا دیتا ہے اور آئندہ اس کی شہادت کسی معاملہ میں قبول نہیں کی جاتی۔ عورت کی عصمت کی حفاظت کا قانون صرف اور صرف اسلام ہی میں ہے۔ آپ جب مردوں سے بیعت لیتے تو اس میں یہ بات خصوصاً شامل ہوتی تھی کہ وہ پاک دامنی اختیار کریں گے اور بدکاری نہیں کریں گے۔ اسی طرح خواتین سے بیعت لیتے وقت بھی یہ بات اس میں خصوصاً شامل ہوتی (وَلَا يَزْنِيْنَ) کہ بدکاری نہیں کریں گی۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اے امت محمد! اللہ سے زیادہ کوئی اس بات پر غیرت کرنے والا نہیں کہ وہ اپنے بندے یا بندی کو بدکاری کرتے ہوئے دیکھے۔ اے امت محمد! اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنتے اور زیادہ روتے۔“ [۲]

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بدکاری بہت بڑا گناہ ہے۔ تمہارا بے دھڑک اللہ کے احکام کی نافرمانی کرنا اور غفلت میں ہنستے رہنا اس بات کی علامت ہے کہ تم اپنے انجام سے غافل ہو۔ ان بد اعمالیوں سے جو ناپاک لذت ملتی ہے، وہ تو عارضی ہے مگر ان کی سزا کے طور پر جو عذاب ہوگا وہ اتنا ہولناک ہوگا کہ لمحے کے لیے سہنا بھی ناقابل برداشت ہوگا، پھر وہ دائمی بھی ہوگا۔

فواحش کی ممانعت:

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَلَا تَقْرُبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾ [۳]

[۱] تفہیم القرآن، ج 5، ص 268، آیت نمبر 56

[۲] بخاری

[۳] الانعام: 151

”بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔“

”فواحش کا اطلاق ان تمام افعال پر ہوتا ہے جن کی برائی بالکل واضح ہے۔ قرآن میں زنا، عمل قوم لوط، برہنگی، جھوٹی تہمت اور باپ کی منکوحہ سے شادی کرنے کو فحش افعال میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں چوری، شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو من جملہ فواحش کہا گیا۔ اسی طرح دوسرے تمام شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں اور ارشادِ الہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال نہ علانیہ کیے جائیں نہ چھپ کر۔“^[۱]

”فواحش فاحشہ کی جمع ہے اور لفظ فحش، فحشاء اور فاحشہ سب مصدر ہیں، جن کا اردو میں ترجمہ بے حیائی سے کیا جاتا ہے اور قرآن وحدیث کی اصطلاح میں ہر ایسے برے کام کے لیے یہ الفاظ بولے جاتے ہیں جن کی برائی اور فساد کے اثرات برے ہوں اور دور رس ہوں۔ فحش اور فحشاء کے اس عام مفہوم میں تمام بڑے گناہ داخل ہیں خواہ اقوال سے متعلق ہوں یا افعال سے، ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن اور قلب سے۔ بدکاری اور بے حیائی کے جتنے کام ہیں وہ سب بھی اس میں داخل ہیں۔ اسی لیے عام زبان میں یہ لفظ بدکاری کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔۔۔۔۔ حکم یہ دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کے پاس بھی نہ جاؤ۔ پاس نہ جانے سے مراد یہ ہے کہ ایسی مجلسوں اور مقامات سے بچو جہاں جا کر اس کا خطرہ ہو کہ تم گناہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔“ (معارف القرآن)

بدکاری کی ممانعت پر قرآن کریم کے مزید احکام:

﴿وَلَا تَقْرُبُوا الزَّيْنٰۤی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۚ وَسَاۤءَ سَبِيْلًا﴾^[۲]

”بدکاری کے قریب بھی نہ پھنکو، وہ بہت برا کام ہے اور بہت ہی برا راستہ۔“

سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کی کچھ صفات بیان فرمائی ہیں۔ ان

کی ایک صفت یہ بھی ہے:

﴿وَلَا يَزْنُوْنَ ؕ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَمًا ۖ﴾^[۳] یُضَعَفْ لَهُ

[۱] تفہیم القرآن، ج اول، ص 599، حاشیہ نمبر 130

[۲] بنی اسرائیل: 32

الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ ﴿٦٨﴾

”یعنی وہ بدکاری نہیں کرتے، اور جو کوئی ایسا کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پا کر رہے گا اسے روز قیامت دو گنا چگنا عذاب دیا جائے گا اور وہ ذلیل و خوار ہو کر اس میں ہمیشہ کے لیے پڑا رہے گا۔“

اس سے ثابت ہوا کہ زنا بہت بڑا گناہ ہے۔

☆ نبی پاکؐ کا فرمان ہے: ”شُرک کے بعد کوئی گناہ اس نطفہ سے بڑھ کر نہیں ہے جس کو کوئی شخص ایسے رحم میں رکھے جو شرعاً اس کے لیے حلال نہ تھا۔“ ﴿٦٩﴾

☆ مزید فرمایا: ”جب کوئی شخص زنا کرتا ہے اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا“ ﴿٦٩﴾

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو زلیخا (اور مصری خواتین) نے بدکاری کے لیے دعوت دی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اللہ بچائے! وہ میرا مربی ہے۔ اس نے مجھے کتنی اچھی طرح رکھا۔ ایسے حق فراموش لوگ فلاح نہیں پاسکتے“ (گویا زانی ظالم ہے۔ رب کی دی ہوئی قوتوں کو اسی کے منشا کے خلاف استعمال کرتا ہے) چنانچہ انہوں نے اس فعل بد کے مقابلے میں اپنے لیے قید خانہ کو ترجیح دی اور (اس بے حیائی کے مقابلے میں) نو سال تک قید میں رہنا قبول فرمالیا۔ یہی عصمتِ پیغمبرانہ ہے۔

بدکاری کے دنیوی و اخروی نقصانات و سزائیں:

حیا اور پاک دامنی ایک بہت بڑی قوت ہے اور بدکاری انسان کو بزدل، کمزور اور کھوکھلا بنا دیتی ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس قوم کے پاس وسائل زیادہ ہوں، فوج اور اسلحہ موجود ہو، لوگ ہنرمند و تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے ہوں وہ قوم طاقتور ہوتی ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب کسی قوم کے لوگ فحاشی اور بدکاری میں بدمست ہوں تو قوت و طاقت رکھنے کے باوجود وہ دلیرانہ دشمن

﴿٦٩﴾ الفرقان: 68-69

﴿٦٩﴾ ابن کثیر، ج 3، ص 38

﴿٦٩﴾ مشکوٰۃ، باب الایمان بحوالہ سنن ابی داؤد 4690

کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتے۔ جس طرح جنگ عظیم میں فرانس کے ساتھ پیش آیا اور پہلے ہی حملے میں انہوں نے حملہ آوروں کے آگے سپر ڈال دی۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر قوم کے زوال میں جنسی بے راہ روی، عیاشی اور فحاشی سرفہرست رہی ہیں۔ وہاں ”دل لگی اور تفریح“ کے نام پر ایسی شرمناک بے حیائی موجود تھی جو بالآخر اسی معاشرے کی بربادی کا باعث بن گئی۔

کسی گناہ کی شدت کا اندازہ اس پر دی جانے والی سزا کی شدت سے لگایا جاسکتا ہے۔ سورہ نور، آیت نمبر 2 میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ ۚ وَلَيَشْهَدَ عَذَابُهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [۱]

”زانی عورت ہو یا مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملہ میں ان دونوں پر ترس کھانے کا جذبہ دامن گیر نہ ہوا اگر تم اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان کو سزا دیتے وقت وہاں اہل ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔“ (یعنی اس سزا کی خوب تشہیر بھی ہوتا کہ آئندہ کوئی ایسا کام نہ کر سکے۔)

قانونِ رجم:

احادیث میں وضاحت ہے کہ اگر زانی شادی شدہ ہو تو اس کی سزا یہ بتائی گئی ہے کہ اسے رجم کیا جائے یعنی پتھر مار مار کر اسے ہلاک کر دیا جائے۔ اردو میں اسے سنگسار کرنا کہتے ہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس عمل کے مرتکب شادی شدہ لوگوں کو سنگسار کیا گیا تھا اور آپ کی سنت کے مطابق خلفاء راشدینؓ کے دور میں بھی سنگساری کے واقعات پیش آئے۔

☆ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: ”کون سے اعمال لوگوں کو زیادہ جنت میں لے کر جائیں گے؟“ آپؐ نے فرمایا: ”اللہ سے ڈرنا

اور اچھا اخلاق۔“ آپؐ سے پوچھا گیا کہ کون سے امور لوگوں کو زیادہ تر دوزخ میں ڈالے جانے کا باعث بنیں گے؟ فرمایا: ”زبان اور شرم گاہ۔“ [۱]

☆ آپؐ نے فرمایا: ”کون مجھے ضمانت دیتا ہے اس چیز کی جو اس کے دونوں جبروں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور اس چیز کی جو اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے (یعنی شرم گاہ) تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں“ مراد یہ ہے کہ پاک دامنی تو جنت میں لے جانے والی ہے جب کہ بدکاری اور زنا دوزخ میں لے جانے والے ہیں۔ [۲]

☆ ”آپؐ نے فرمایا کہ ”خیانت کرنے والے مرد کی گواہی جائز نہیں نہ خیانت کرنے والی عورت کی۔ نہ بدکار مرد یا بدکار عورت کی اور نہ اس کی جو اپنے بھائی کے لیے کینہ رکھے۔“ [۳] یعنی اپنی پاک دامنی کی حفاظت نہ کر سکنے والوں کے لیے دنیا میں رسوائی کی یہ بہت بڑی شکل ہے کہ اس کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان قابل غور ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

☆ ”جب کسی قوم میں زنا پھیل جاتا ہے تو اسے قحط سالی کی مصیبت میں مبتلا کیا جاتا ہے اور جب کسی قوم میں رشوت کی گرم بازاری ہوتی ہے تو اس پر (دشمن کا) رعب و خوف طاری کر دیا جاتا ہے۔“ [۴]

☆ ”جب کسی قوم میں زنا عام ہو جائے اور کھلم کھلا ہونے لگے تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو طاعون کی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے اور ان میں ایسی بیماریاں پھوٹ پڑتی ہیں جن سے ان سے پہلے لوگ ناواقف تھے۔“ (جیسے آج کل ایڈز یا کرونا کا مہلک خوفناک مرض پھیلا ہوا ہے)۔ [۵]

[۱] ترمذی

[۲] صحیح بخاری: 1395

[۳] ابوداؤد

[۴] مشکوٰۃ، کتاب الحدود

[۵] ابن ماجہ: 4091

مغربی ممالک میں کھلم کھلا بے حیائی کے نتیجے میں جو مہلک نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ ایٹم بم سے بھی زیادہ مہلک اور لاعلاج ثابت ہو رہے ہیں۔ دنیا کے سارے علاج زنا کاری کے دنیاوی عذاب یعنی نت نئی بیماریوں اور دیگر نقصانات (جس میں حسب و نسب کا خلط ملط ہونا، حرامی بچوں کا احساس محرومی کا شکار ہونا، خواتین کی عزت کا پامال ہونا وغیرہ شامل ہیں) سے نہیں بچا سکتے۔

قربان جائیے! اللہ و رسولؐ نے عفت و عصمت کو محفوظ رکھنے والے قوانین دے کر دنیا پر کتنا بڑا احسان کیا ہے! حقیقت یہ ہے کہ جس معاشرے میں حیا و پاک دامنی ہو، وہاں گھروں کے اندر بھی فضا پُر امن اور پُر اعتماد ہوگی اور باہر معاشرے میں وہ مضر اثرات اور تخریبی سرگرمیاں نہیں پھیلیں گی، جو معاشرے کے افراد کی صحت، دولت اور وقت کا بہت سا حصہ ہضم کر جاتی ہیں۔ یہی صحت، دولت، وقت جب مضر سرگرمیوں سے بچ کر مثبت اور تعمیری کاموں پر صرف ہوتے ہیں تو لازماً معاشرے کے لیے قوت اور طاقت کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح اللہ کے احکام انسان کے لیے باعثِ رحمت و برکت ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن پاک میں فرمانِ الہی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (۱۹) ﴿۱﴾

”جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے گروہ میں فحاشی پھیلے، وہ دنیا و آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

ایسے ماحول میں اگر جنسی جرائم اور بچوں، بچیوں پر وحشیانہ تشدد بڑھتا جا رہا ہے اور کوئی ہلکی سی سزا بھی مجرموں کو نہیں دی جا رہی ہے تو پھر ہم اللہ کے سوا کس سے داد فریاد کریں۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے وطن عزیز پاکستان میں قرآن و سنت کے احکامات نافذ کرتے ہوئے اس غیر ملکی بیہودہ ثقافت کو دیس نکال دے سکیں کہ اب اس ثقافت کے خالق بھی اس کے ہاتھوں مجبور و لاچار ہو رہے ہیں۔

پاک دامنی قائم رکھنے کی تدابیر:

اپنی پاکدامنی اور عفت و عصمت کو برقرار رکھنے کے لیے اسلام نے ہمیں باقاعدہ ایک نظام دیا ہے۔ جس کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں۔

1- محرمات کا قانون:

پہلے تو محرمات کا قانون ہے۔ جس سے یہ مراد ہے کہ وہ مرد اور عورتیں جو انتہائی قریبی رشتہ داری کی وجہ سے اکٹھے رہنے پر مجبور ہیں، ان کو محرمات قرار دے دیا گیا ہے۔ مثلاً ماں بیٹا، بھائی بہن، چچا اور بھتیجی، بھتیجا اور پھوپھی، خالہ اور بھانجا، ماموں اور بھانجی، سوتیلہ باپ اور بیٹی، سوتیلی ماں اور بیٹا، ساس اور داماد، سرور بہو، رضاعی مائیں، رضاعی بہنیں اور رضاعی باپ۔
[۱] یہ سب رشتے محرم رشتے شمار کیے جاتے ہیں یعنی یہ رشتے رکھنے والے مرد اور عورت ایک دوسرے کی طرف جنسی میلان کا تصور نہیں کر سکتے۔ (سوائے ان بدنیت لوگوں کے جن پر حیوانیت غالب آچکی ہو)۔

2- حرمتِ زنا:

محرمات کے بعد ہر وہ عورت جو عملاً کسی کے نکاح میں ہے، اس سے بھی نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ ﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ﴾ [۱] اس کے بعد جو عورتیں بچتی ہیں ان کے ساتھ بھی ہر قسم کا بلا ضابطہ صنفی تعلق چاہے علانیہ ہو چاہے مخفی ہو، حرام قرار دیا گیا ہے۔ ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزَّوْجَ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾ [۲] ”زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو، وہ بہت برا کام ہے اور بہت ہی برا راستہ۔“ پھر اسلام نے بے حیائی کے پیشہ پر بھی پابندی عائد کی ہے۔

[۱] النساء: 23-24

[۲] النساء: 24

[۳] بنی اسرائیل: 32

3- نکاح:

اس طرح صنفی انتشار کے تمام راستے بند کر کے ایک باضابطہ راستہ قائم رکھا گیا ہے اور وہ نکاح ہے کہ نکاح کی شکل میں تم اپنی جنسی ضرورت پوری کرو۔ یہ نکاح باضابطہ ہونا چاہیے اور اس کا اعلان ہونا چاہیے کہ سارے معاشرے کو پتہ ہو کہ فلاں عورت اور فلاں مرد آپس میں میاں بیوی بن چکے ہیں۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے:

”ان عورتوں کے سوا جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔ تم ان کو مال (مہر) دے کر نکاح کرو پاک دامنی کی خاطر۔۔۔ نہ کہ آزاد شہوت رانی کی خاطر۔ پس ان عورتوں کے وارثوں کی رضامندی سے ان سے نکاح کرو۔۔۔ اس طرح کہ وہ بھی شریفانہ زندگی گزارنے والی ہوں نہ یہ کہ کھلے بندوں یا چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں۔“^[۱]

اس طرح جو صنفی تعلق نکاح کے بغیر ناجائز، حرام اور بہت برا راستہ قرار دیا گیا ہے، وہی دائرہ ازدواج کے اندر نہ صرف جائز ہے بلکہ اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ اس کو کارِ ثواب قرار دیا گیا ہے، اس کے مقابلے میں مجردی زندگی اختیار کرنا یعنی نکاح نہ کرنا بہت زیادہ ناپسند کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پیش کیے جاتے ہیں۔ جن سے اس تاکید کا پتہ چلتا ہے:

☆ یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانہ اغض

للبصر، واحصن للفرج^[۲]

”نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جسے بھی نکاح کی استطاعت ہو اسے

نکاح کر لینا چاہیے کیونکہ یہ نظر کو نیچی رکھنے والا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے

والا ہے۔“

☆ ”بخدا میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کی ناراضی سے بچنے والا ہوں، مگر

[۱] النساء: 24-25

[۲] بخاری: 5065؛ مسلم: 1400

مجھے دیکھو کہ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، یہ میری سنت ہے۔ جو شخص میری سنت سے اجتناب کرے، اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔“ [۱]

☆ عکاف بن بشر تمیمیؒ ایک روز آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے استطاعت ہونے کے باوجود شادی نہیں کی تھی، آپؐ نے فرمایا: ”تب تو تم شیطان کے بھائی ہو۔“ نکاح تمام رسولوں کی سنت ہے کیونکہ یہ پاک دامنی کو قائم رکھنے کا ضامن ہے۔

☆ نبی کریمؐ کا ایک اور ارشاد ہے: ”جو شخص پاکدامن اور عقیف ہو کر اللہ سے ملنا چاہے اس کو شریف عورت سے شادی کرنی چاہیے۔“ [۲]

☆ نکاح اگر ایک طرف عفت و عصمت کو برقرار رکھنے کا ذریعہ ہے تو دوسری طرف بقائے نسل کے لیے بھی ضروری ہے۔ نبی کریمؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

☆ تَزَوُّجُوا الْوُدُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرُكُمْ الْأُمَمَ [۳]
”خوب محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورت سے شادی کرو، اس لیے کہ تمہاری کثرت سے میں دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔“

☆ ایک اور حدیث میں نکاح کو نصف دین فرمایا گیا ہے۔

☆ إِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّينِ [۴] ”بندہ نے جب شادی کر لی

تو (عصمت محفوظ ہونے کی بنا پر) نصف دین پورا کر لیا۔“ یعنی شرعی حدود میں اپنی خواہشات پوری کرنے کے باعث بے راہ روی کے امکانات ختم ہو گئے۔ دونوں کا مستقبل محفوظ ہو گیا۔ دائرہ عمل معین ہو جاتا ہے۔ اپنی اپنی ذمہ داریوں کی نوعیت بھی طے ہو جاتی ہے۔ لہذا دونوں جم کر اپنی صلاحیتیں اپنے فرائض پر لگا دیتے ہیں۔

[۱] متفق علیہ

[۲] ابن ماجہ

[۳] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد: 2050؛ النسائی: 3227

[۴] مشکوٰۃ: 3032؛ بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان: 5486

☆ سورۃ النور، آیت 32 میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو بھی بے نکاح ہوں (مرد یا عورت، خواہ ابھی نکاح نہ ہوا ہو یا وفات و طلاق کی وجہ سے اب تجرد ہو گیا ہو) تم ان کا نکاح کرو جو غریب ہوں تو (نکاح کے سبب) اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا اور اللہ کشائش والا ہے۔

اس طرح نکاح بے شمار معاشی اور معاشرتی فوائد کے ہمراہ انسان کو پاک دامن رہنے میں بہت زیادہ مدد دیتا ہے۔ نکاح سے خاندان وجود میں آتا ہے۔ میاں بیوی کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے لیے باعث سکون و راحت بنایا ہے۔ پھر اس خاندانی نظام میں مرد کو صدارت عطا کی گئی ہے۔ بیرون خانہ کی تمام ذمہ داریاں یعنی کسب معاش اور دیگر کام مرد کے ذمہ ہیں، جبکہ عورتوں کو حکم ہے کہ گھروں میں ٹکی رہیں اور اندرون خانہ کے تمام کام انجام دیں۔ چونکہ عورت کا دائرہ کار اس کا گھر ہی بنایا گیا ہے لہذا اسے بغیر ضرورت باہر نہیں نکلنا چاہیے اور اگر ضرورت کی بنا پر باہر جانا پڑ جائے تو کچھ پابندیوں کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے، جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

4- لباس اور ستر:

پاکدامنی قائم رکھنے کے لیے ایک ضروری حکم یہ ہے کہ انسان برہنہ نہ رہے بلکہ لباس کا اہتمام کرے خصوصاً جسم کے وہ حصے جن کو ظاہر کرنے میں انسان کی فطری حیال منع ہے، ان کا خصوصی خیال رکھے۔ ستر کو نہ ڈھانپنا بھی بے حیائی کی ایک شکل ہے اور اس سے تاکید کے ساتھ روکا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿يَبْنَىٰٓ اٰدَمَۙ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوَآتِکُمْ وَرِیْشًا ۚ وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ ۝۱﴾ [۱]

”اے بنی آدم! ہم نے تم پر لباس نازل فرمایا تاکہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانپنے اور تمہارے لیے باعثِ زینت بنے۔ اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔“

اس آیت کی رو سے جسم ڈھانپ کر رکھنا ہر مرد و عورت کے لیے فرض کر دیا گیا ہے۔ اللہ نے اس میں شرم و حیا کا مادہ رکھا اور پھر اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اسے اپنے آپ کو ڈھانپ کر رکھنے کے لیے لباس فراہم کرنا سکھایا۔ یہ لباس ایک طرف تو اس کی فطرت کا تقاضا ہے، دوسری طرف اس کو گرمی و سردی کے موسمی اثرات سے بھی بچاتا اور اس کو خوبصورتی عطا کرتا ہے۔ گویا انسان کو زینت اور خوبصورتی لباس پہننے سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ عریاں رہنے سے یا نیم عریاں یا باریک، مختصر تنگ، چست لباس پہننے سے یا کمر، سینہ، بازو، پنڈلیاں نگلی کرنے سے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ تقویٰ کا لباس بہترین ہے۔ یعنی لباس کے معاملے میں خدا خوفی سے کام لینا ضروری ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ لباس ستر پوش ہو۔ اعتدال کے ساتھ ذریعہ زینت بھی ہو۔ اسے غرور و تکبر اور ریا کا ذریعہ نہ بنایا جائے، نہ لباس پر بے دریغ خرچ کیا جائے۔ اسی طرح دوسروں کی بیہودہ نقالی کرنے سے بھی بچا جائے۔ مرد عورتوں والا لباس نہ پہنیں اور نہ عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگیں۔

زمانہ جاہلیت میں لوگ بے تکلف نگے ہو جاتے تھے۔ غسل اور قضائے حاجت کے وقت پردہ ضروری نہ تھا بلکہ کعبہ کا طواف بھی برہنہ ہو کر کیا جاتا تھا اور اسے کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا، خواتین تک طواف کے لیے برہنہ ہو جاتی تھیں۔ عموماً عورتوں کا لباس اس طرح کا تھا جس میں سینے کا کچھ حصہ، بازو، کمر اور پنڈلیاں کھلی رہتی تھیں (بالکل یہی کیفیت آجکل مغربی خواتین کے لباس میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ اب مشرق میں بھی ہر جگہ یہی کچھ ہونے لگا ہے)۔ اس پر آیت مبارکہ نازل ہوئی:

﴿وَلْيَضْحَكُنَّ يَخْمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ﴾ [۱]

”عورتیں اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رکھیں (جسے آجکل

دوپٹہ کہتے ہیں)۔“

تب مسلمان خواتین نے اپنے تہہ بند لیے، انھیں کناروں کی طرف سے پھاڑ کر ان سے

اپنے سینوں کو ڈھانپ لیا۔ [۲]

ایک دفعہ امام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی بھتیجی حفصہؓ بنت عبد الرحمن ان کے پاس آئیں۔ انہوں نے باریک دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ حضرت عائشہؓ نے باریک دوپٹہ پھاڑ دیا اور حفصہؓ کو ایک موٹی چادر اوڑھادی۔^[۱]

باریک یا نیم عریاں لباس، لباس کے دونوں مقاصد پورے نہیں کرتا، نہ وہ ستر ڈھانپ رہا ہے اور نہ باعث زینت ہے۔ مثلاً اوڑھنی کا مقصد سر، سینہ اور گردن کو ڈھانپنا ہے وہ اوڑھنی اگر اتنی باریک ہے کہ اوڑھے ہونے کے باوجود سب کچھ نگاہور ہا ہے تو پھر اوڑھنی کا وجود بے معنی ہو جاتا ہے اور چونکہ یہ لباس باریک ہے اس لیے مکمل زینت بھی نہیں دے رہا۔ ستر ڈھانپنے کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ کیجئے:

☆ ”کوئی مرد کسی مرد کو اور کوئی عورت کسی عورت کو برہنہ نہ دیکھے۔“^[۲]

☆ ”خبردار! برہنہ ہونے سے بچو۔ تمہارے ساتھ وہ ہیں جو کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے (یعنی کراما کا تبین) سوائے قضائے حاجت اور وقت مباشرت کے۔“^[۳]

☆ ”جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس وقت بھی ستر ڈھانکے اور گدھوں کی طرح بالکل ننگا نہ ہو جائے“ (ابن ماجہ) یعنی ایک دوسرے کے ستر کو دیکھنا ناپسندیدہ ہے۔

ستر کی حدود:

شرعی اصطلاح میں ستر جسم کے ان حصوں کو کہا جاتا ہے جنہیں بیوی یا شوہر کے سوا ہر ایک سے چھپانا ضروری ہے۔ مرد کے لیے ناف اور گھٹنے کے درمیان کا حصہ ستر ہے جبکہ عورت کے لیے ستر کی حدود مختلف ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا پورا جسم سب لوگوں سے چھپائیں۔ ایک بار حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ (جو حضرت عائشہؓ کی بہن تھیں) نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے باریک لباس پہن کر آئیں۔ جسم اندر سے جھلک رہا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

[۱] موطا امام مالک

[۲] مسلم، ابوداؤد، ترمذی، صحیح مسلم (باب تحریم النظر الی العورات)

[۳] ابن ماجہ، ترمذی

نے فوراً نگاہ پھیر لی اور فرمایا: ”اے اسماء! جب عورت بالغ ہو جائے تو مناسب نہیں کہ اس کے جسم کا کچھ حصہ نظر آئے سوائے اس کے اور اس کے۔“ یہ فرما کر آپؐ نے اپنے چہرے اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ فرمایا [۱]

☆ نبیؐ پاک کا ارشاد ہے: ”اللہ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو لباس پہن کر بھی تنگی کی تنگی رہیں۔“ [۲]

☆ ”وہ عورتیں جو لباس پہنے ہوئے ہیں مگر عریاں ہیں، خود دوسروں کی طرف مائل ہوتی ہیں اور دوسروں کو اپنی طرف (نازداد اسے) مائل کرتی ہیں، وہ جنت میں داخل نہ ہو سکیں گی نہ اس کی خوشبو پائیں گی حالانکہ اس کی خوشبو پانچ سو برس کی مسافت سے آنے لگے گی۔“ [۳]

ایک دوسرے کے ستر کو چھونا یا ہاتھ لگانا اور دیکھنا بھی حرام ہے۔ پس جو لوگ دوسروں کے سامنے بے تکلف گھٹنے کھولتے اور تیل کی مالش کراتے ہیں انھیں اس پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

دس سال کی عمر سے لڑکے اور لڑکیوں کے بستر الگ کیے جائیں۔ ہر ایک کو الگ الگ چادر میں سلا یا جائے۔

5۔ استیذان:

یہ بھی عفت و عصمت کو قائم کرنے کی ایک تدبیر ہے کہ کسی دوسرے کے ہاں جب جاؤ تو بے دھڑک ان کے گھر نہ چلے جاؤ، بلکہ اجازت لے کر جاؤ، تاکہ عورتیں اپنی اوڑھنی اور پردہ وغیرہ ٹھیک کر لیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا﴾ [۴]

[۱] ابوداؤد

[۲] صحیح مسلم: 1388

[۳] صحیح مسلم کتاب اللباس والزیۃ حدیث نمبر 5582-2128؛ شعب الایمان 2650/6

[۴] النور: 27

”اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو

جب تک اہل خانہ سے پوچھ نہ لو اور جب داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو۔“

مقصد یہ ہے کہ اپنے گھر میں عورت مرد اجنبیوں کی نگاہ سے محفوظ رہیں، ان کی نظر اس حال میں نہ پڑے جو ان کو ناگوار محسوس ہو۔ اس حکم کے ساتھ ہی آپؐ نے یہ حکم بھی دیا کہ کوئی گھر کے باہر سے گھروں کے اندر نہ جھانکے، کیونکہ اجازت مانگے مگر ساتھ اندر بھی جھانک لے تو اجازت مانگنے کا مقصد فوت ہو گیا۔

پھر سورۃ احزاب میں حکم نازل ہوا: ”جب تم عورتوں سے کوئی چیز مانگو تو پردے کی اوٹ

سے مانگو۔ اس میں تمہارے دلوں کے لیے بھی پاکیزگی ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی“ [۱]

یہ اجازت مانگنے یا پردے کی اوٹ سے چیز لینے کا حکم گھر کے خادموں کے لیے بھی

ہے۔ حضرت انسؓ اور حضرت بلالؓ نبی پاکؐ کے خادم خاص تھے۔ آپؐ کے پاس مستقل

رہتے تھے۔ انہوں نے حضرت فاطمہؓ سے اُن کا بچہ مانگا تو حضرت فاطمہؓ نے پردہ کی اوٹ میں

سے پکڑا یا۔

6- خلوت کی ممانعت:

ایک پابندی پاک دامنی کی خاطر مسلمانوں پر یہ بھی لگائی گئی ہے کہ شوہر کے سوا کوئی مرد

کسی عورت کے پاس علیحدگی میں نہ بیٹھے، نہ اس کے جسم کو مس کرے خواہ اس کا قریب ترین عزیز

ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی تخلیہ اور لمس سے منع کیا گیا ہے۔

☆ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ”خبردار! عورتوں کے پاس تنہائی میں نہ جاؤ۔ ایک انصاری

نے عرض کیا: ”دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا ارشاد ہے؟“ فرمایا: ”وہ تو موت ہے۔“ [۲]

☆ ”شوہروں کی غیر موجودگی میں عورتوں کے پاس نہ جاؤ کیونکہ شیطان تمہارے اندر خون

[۱] الاحزاب: 53

[۲] یعنی وہ تو گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں ان سے اگر پردہ نہ کیا گیا تو دوسروں کی نسبت یہاں فتنہ کا امکان

زیادہ ہے۔ صحیح بخاری: 5332؛ صحیح مسلم: 2172

کی طرح گردش کر رہا ہے۔“ [۱]

☆ ”آج کے بعد سے کوئی شخص کسی عورت کے پاس اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں نہ جائے جب تک اس کے ساتھ ایک دو آدمی اور نہ ہوں۔“ [۲]

حدیث لَا یَخْلُوْنَ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلَّا كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ
یعنی کوئی شخص تنہائی میں کسی عورت سے ملاقات نہ کرے، کیونکہ ان میں پھر
تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ [۳]

لس (یعنی غیر عورت کو چھونا) کے بارے میں نبی پاک کا ارشاد ہے:-

☆ جس شخص نے کسی عورت کا ہاتھ چھوا جس کے ساتھ اس کا جائز تعلق نہ ہو تو اس ہتھیلی پر
قیامت کے روز انگارہ رکھا جائے گا۔“ [۴]

آنحضور ﷺ جب عورتوں کی بیعت لیتے، تو ان کے زبانی اقرار کو کافی سمجھتے۔ ان کا
ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لیتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپؐ نے کبھی ایسی عورت کے ہاتھ
کو مس نہیں کیا جو آپؐ کے نکاح میں نہ ہو۔ [۵]

یہ احکام جوان عورتوں کے لیے ہیں، رہ گئی سن رسیدہ عورتیں، جو بہت بوڑھی ہو چکی ہیں،
معاشرتی ضروریات کے پیش نظر ان کے ہاں علیحدگی میں بھی جایا جاسکتا ہے اور ان کو چھونا بھی
ممنوع نہیں۔ مثلاً حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کا بوڑھی نابینا عورت کے ہاں جا کر اس کے گھر
کے کام کاج کرنا۔ اسی طرح جسم کو ہاتھ لگانے میں محرم اور غیر محرم کے درمیان فرق ہے۔ مثلاً
ماں اپنے بیٹے کا بوسہ لے، بھائی اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے سواری سے اتارے یا اس پر

[۱] ترمذی

[۲] مسلم

[۳] سنن ترمذی عن عبد اللہ بن عمرؓ

[۴] صفحہ 291 بحوالہ نصب الراية ج 4 صفحہ 240 'پردہ' ص ۲۹۱

[۵] بخاری: 6674؛ صحیح مسلم: 3470

چڑھائے وغیرہ۔ نبی پاک ﷺ جب سفر سے واپس آتے حضرت فاطمہؓ کو گلے لگا کر ان کے سر کا بوسہ لیتے۔ اس طرح ضرورت پڑنے پر ڈاکٹر مریض عورت کی نبض وغیرہ دیکھ سکتا ہے۔

7۔ پردہ (حجاب):

ایک اور قانونی بندش عصمت و عفت کے تحفظ کی خاطر حجاب کا قانون ہے۔ پردہ یا حجاب دو طرح کا ہوتا ہے:

(1) گھر کے اندر محرم رشتہ داروں کے سامنے عورت اظہار زینت کر سکتی ہے۔ مگر اس طرح کہ سر، سینہ وغیرہ موٹے دوپٹے اور اوڑھنی سے ڈھکے ہوئے ہوں۔ مگر گھر کے اندر جو غیر محرم رشتہ دار ہیں ان سے چہرے کا پردہ بھی کیا جائے گا مگر گھونگھٹ وغیرہ، یہ پردہ اس طرح کا نہیں جیسے باہر کے اجنبی لوگوں سے ہوتا ہے وگرنہ گھریلو زندگی اجیرن ہو جائے، مثلاً خالوزاد، ماموں زاد، دیور، جیٹھ وغیرہ۔ تاہم ان کے ساتھ نہ تو بے تکلفی سے گفتگو ہو اور نہ ضرورت سے زائد ہو۔ سادگی اور وقار کے ساتھ ممکن حد تک پردے کے ساتھ ضروری کام سرانجام دیے جاسکتے ہیں۔

(2) لیکن گھر سے باہر نکلنے کے احکام بالکل دوسری نوعیت کے ہیں۔ عورت کا اصل مقام اور دائرہ عمل تو اس کا گھر ہی ہے۔ مگر جب ضرورت پڑے تو چند پابندیوں کے ساتھ سادگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے گھر سے باہر جاسکتی ہے (پردہ کے احکام کی پوری تفصیل اگلے باب میں دی جا رہی ہے)۔

8۔ مبادیاتِ زنا سے بچنے کی تاکید:

بے حیائی، بدکاری، زنا وغیرہ مخصوص جنسی فعل کا نام ہے جس کا ارتکاب دائرہ ازدواج سے باہر کیا جائے، مگر اخلاقی لحاظ سے دوسروں کی طرف ہر طرح کا میلان اور جھکاؤ دراصل زنا ہی ہے۔ ایک لمبی حدیث میں نبی اکرمؐ کا فرمان ہے:

”آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا

پکڑنا ہے، پاؤں کا زنا چلنا ہے، دل کا زنا آرزو اور تمنا ہے۔ پھر شر مگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کر دیتی ہے۔“ [۱]

چنانچہ غیر محرم اور اجنبی کے حسن سے آنکھ کا محفوظ ہونا، اس کی آواز سے کانوں کا لذت پانا، اس سے گفتگو کرنے کے لیے ملائم زبان استعمال کرنا، اس کے کوچے کی خاک چھاننے کے لیے قدموں کا بار بار اٹھنا، ہاتھوں سے شہوت انگیز ناول، رسالے، فلمیں پکڑنا یا غیر عورت کو چھونا، دل کا برائی کی نیت کرنا، یہ سب مہادیات ہیں گناہ کی، قانونی طور پر تو ہم ان کو زنا نہیں کہہ سکتے مگر حیا اور پاکدامنی کے کو تو ال دل کے ان چوروں کو ضرور پکڑ لیتے ہیں۔ مندرجہ بالا حدیث میں ان سب فتنوں کی مفصل طور پر نشاندہی کی گئی ہے۔

1- فتنہ نظر:

قرآن پاک میں سورۃ نور، آیت 30 میں مومن مردوں اور آیت 31 میں مومن خواتین کو اجنبیوں کو دیکھنے سے منع کرتے ہوئے نگاہ نیچی رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فتنہ نگاہ کی وضاحت اس طرح فرمائی:

”اے علیؓ ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو، پہلی نظر (جو اچانک پڑ گئی تھی) وہ تو معاف ہے، مگر دوسری نظر معاف نہیں“ کیونکہ وہ اراداً ڈالی جائے گی۔ مراد یہ ہے کہ پہلی نظر کے بعد فوراً نگاہ پھیر لو۔ [۲]

مسند احمد کی روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ”کسی مسلمان کی جب پہلی مرتبہ کسی عورت کے حسن پر نظر جا پڑے پھر وہ اپنی نگاہ پست کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنی عبادت میں حلاوت اور شربنی پیدا کر دیتا ہے۔“ [۳]

[۱] مشکوٰۃ، باب الایمان، بحوالہ صحیح بخاری: 6243

[۲] ترمذی: 2777؛ ابوداؤد

[۳] مشکوٰۃ: 3124؛ باب النظر الی المخطوبہ بحوالہ احمد

2- جاہلی بے پردگی سے ممانعت:

عورتوں کا بن ٹھن کر گھروں سے باہر نکلنا اپنے حسن کی نمائش کرتے پھرنا اور ناز و ادا سے چلنا شریعت کی نگاہ میں بہت معیوب ہے۔ ہر وہ زینت اور ہر وہ آرائش جس کا مقصد شوہر کے سوا دوسروں کے لیے جاذبِ نظر بننا ہو، شریعت نے اس کے لیے ایک جامع اصطلاح ”تبرج جاہلیہ“ استعمال کی ہے۔ لباس، بالوں کی آرائش چہرے کا میک اپ، باریک و شوخ کپڑوں کا انتخاب حتیٰ کہ خوب صورت اور خوش رنگ برقع جو دوسروں کو جاذبِ نظر محسوس ہو، سب اسی ”تبرج جاہلیہ“ کے ضمن میں آتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾ [۱]

”اپنے گھروں میں ٹکی رہو اور دورِ جاہلیت کی طرح سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔“

عورت کے اندر فطرتاً آرائش و زیبائش کا جذبہ ہوتا ہے، چنانچہ وہ اپنے گھر میں آرائش کر سکتی ہے، اپنے شوہر کے لیے آرائش کرنا ضروری ہے مگر جس آرائش میں ذرا بھر بھی بری نیت (دوسروں کو دکھانے کی) شامل ہو وہ جاہلیت کی آرائش ہے۔

پھر عورتوں کو گھروں میں بیٹھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ عورتوں کے گھر سے باہر نکلنے سے جو مخلوط معاشرہ قائم ہوتا ہے اس میں عفت اور پاکدامنی کا قائم رہنا محال ہے۔ مرد و عورت کے آزادانہ و بے باکانہ میل جول کے غلط نتائج مغرب میں صدیوں سے نکل رہے ہیں اور اب مشرقی معاشرہ بھی پیچھے نہیں رہ گیا، خود ہمارے پاکستان میں صورت حال بہت خراب ہو چکی ہے۔ چنانچہ تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ خواتین کے لیے پردہ کا شرعی حکم معاشرہ کو پاک صاف رکھنے کے لیے سراپا رحمت ہے۔

3- فتنہ زبان:

اسلام کا حکم ہے کہ اگر عورت کو کسی غیر مرد سے بات کرنا پڑ جائے تو وہ پردہ کی اوٹ سے

ہی ہو، باتوں میں شیرینی اور حلاوت پیدا نہ ہونے پائے مبادا کہ اسی سے بدطینت کو شرارت کا موقع مل جائے۔ ارشادِ بانی ہے:

﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾ [۱]

”دلی زبان سے بات نہ کرو کہ جس کے دل میں (بدنیتی کی) بیماری ہے وہ تم سے کچھ امیدیں وابستہ کر لے گا، بات سیدھے طریقے سے کرو۔“

غیر مرد سے حلاوت اور شیرینی سے بات کرنا، دوسروں کی غلط ملط کہانیاں مزے لے لے کر بیان کرنا اور مزے لے لے کر سنا، شاعرانہ غزلیں، عشق و محبت کے افسانے بیان کرنا ان سب کی ممانعت ہے۔ ان پر قانون کا پہرا تو نہیں بٹھایا جاسکتا مگر تقویٰ، پاکدامنی ضرور ان سب فتنوں سے آگاہ کرتی ہے۔

4- زیوروں کی آواز کا فتنہ:

عورتوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ زیور پہنے ہوں اور ان کے چلنے سے زیوروں کی جھنکار، پائیل اور گھنگرو وغیرہ کی آوازیں آرہی ہوں۔ سورۃ نور، آیت 31 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ”اور وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے (زیور وغیرہ) اس کا حال معلوم ہو جائے (یعنی ان کی جھنکار سنائی دے)۔“

5- خوشبو کا فتنہ:

خوشبو بڑا تیز رو قاصد ہے جو بہت جلد ایک شریر النفس انسان کا پیغام دوسرے شریک پہنچا دیتا ہے۔ عورت چاہے کتنے پردے کے اندر ہو، وہ خوشبو لگائے کہیں سے گزر رہی ہو، سب مرد مڑ کر اس کی طرف نگاہ اٹھائیں گے، اس کی خوشبو فضا میں پھیل پھیل کر دوسروں کے جذبات کو متحرک کرے گی، لہذا اسلام نے اس فتنہ کا (جسے بڑا معمولی سمجھا جاتا ہے) بہت سخت نوٹس لیا

ہے، اس حوالے سے آنحضور ﷺ کے ارشادات گرامی ملاحظہ ہوں:

☆ ایما امرأۃ استعطرت فمرت علی قوم لیجدوا من ریحها فھی زانیۃ [۱]
 ”جو عورت خوشبو لگا کر لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے وہ آوارہ قسم کی عورت ہے۔“

حتیٰ کہ مسجد میں آتے ہوئے بھی عورت خوشبو استعمال نہیں کر سکتی۔

”جب تم سے کوئی عورت مسجد میں آئے تو خوشبو نہ لگائے۔“ [۲]

اگر عورت گھر میں خوشبو لگائے ہوئے ہو، اسے اتفاقاً باہر جانا پڑ جائے تو غسل کر کے خوشبو کا اثر زائل کرے، تب گھر سے باہر نکلے۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

☆ ”مردوں کے لیے وہ خوشبو مناسب ہے جس کی خوشبو نمایاں ہو مگر رنگ نمایاں نہ ہو اور عورت کے لیے وہ خوشبو مناسب ہے جس کا رنگ نمایاں ہو مگر خوشبو مخفی ہو (جیسے مہندی)۔“

6- ستر کا چھپانا:

ہیجانی کیفیت پیدا کرنے والی چند اور بھی باتیں ہیں جن سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔ مثلاً: ”کوئی مرد دوسرے مرد کا ستر نہ دیکھے، نہ کوئی عورت کسی دوسری عورت کا ستر دیکھے۔“ [۳]
 ☆ ”کوئی مرد دوسرے مرد کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ لیٹے اور نہ کوئی عورت دوسری عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں لیٹے (کیونکہ اس سے شہوت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ چیز بسا اوقات سحاق اور کبھی لواطت کی طرف مائل کرتی ہے، یہ دونوں بہت برے فعل ہیں)۔“

[۱] سنن نسائی، کتاب الزینۃ (باب ما یکرہ للنساء من الطیب): 5126

[۲] موطا، مسلم

[۳] مشکوٰۃ

7- اپنے عیوب اعلانیہ بیان کرنے سے اجتناب:

بے حیائی سے تعلق رکھنے والے کاموں کا بار بار ذکر کرنا بھی حیا کے خلاف ہے کیونکہ جب معاشرے میں بار بار فحش اور گندی باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور مزے لے لے کر عشقیہ قصے کہانیاں بیان کی جاتی ہیں تو پھر آہستہ آہستہ ان اعمال کی برائی کا احساس کم ہوتا جاتا ہے۔ ان کے متعلق جھجک اور حیا ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ پھر لوگ ان برے افعال کو خود عملاً کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ساتھ اپنے ان کاموں کو نمک مرچ لگا کر معاشرے میں بیان بھی کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح وہ مزید برائیوں کے دروازے کھولتے رہتے ہیں۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میری امت کے گناہ بخش دیئے جائیں گے سوائے ان لوگوں کے جو خود اپنے گناہوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی وہ رات کو برا فعل کرتے ہیں اور اللہ اس کے اوپر پردہ ڈال دیتا ہے۔ مگر وہ خود کہنے لگتے ہیں: ”اے فلاں! میں نے تورات کو فلاں فلاں کام کیا تھا“ حالانکہ اللہ نے اس کے عیب پر پردہ ڈال دیا تھا۔“ [۱] تو اب خود ہی اس عیب کو مزے مزے سے لوگوں میں بیان کر کے مزید فحاشی پھیلانے کا سبب بن رہا ہے۔

8- تہمت لگانے کی ممانعت:

سورہ نور، آیت 4 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں..... پھر وہ چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو۔ ایسے لوگ خود ہی فاسق ہیں۔“ پھر آگے چل کر سورۃ نور، آیت نمبر 23 اور 25 میں ارشاد ہوتا ہے: ”جو لوگ پاکدامن بے خبر عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا و آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ (وہ اس دن کو بھول نہ جائیں) جب ان کی اپنی زبانیں اور ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ ان کو وہ بدلہ بھر پور دے گا جس کے مستحق ہیں اور انھیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے اور وہ سچ کو سچ کر دکھانے والا ہے۔“

دوسروں پر بدکاری کی تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے، اسلام نے اس سے سختی سے منع کیا ہے۔ عصمت مرد کی بھی اتنی ہی قیمتی ہے جتنی کہ عورت کی، عموماً سمجھا جاتا ہے کہ صرف عورت کی عصمت قابل حفاظت ہے، مرد کی کیا بات ہے، اس کی عصمت درمی کا کسی کو کیا پتہ چلتا ہے؟ دنیا دار تو ایسی بات کہہ دیتے ہیں جبکہ ہمارے دین نے مرد کے اوپر تہمت لگانے والے کی سزا بھی اتنی (80) کوڑے رکھی ہے اور عورت پر الزام لگانے والے کی سزا بھی اسی کوڑے ہے۔ واضح رہے کہ خود جرم زنا کی سزا (غیر شادی شدہ کے لیے) سو کوڑے ہے۔ یعنی الزام لگانے کی سزا اصل جرم کے مقابلے میں صرف 20 کوڑے کم ہے۔ تاکہ آئندہ کبھی کوئی ایسی بات بلا ثبوت اپنی زبان سے نکالنے کی جرات نہ کرے۔ اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص غلط یا صحیح واقعات مزے لے لے کر دوسروں سے بیان کرتا ہے، دوسرے اس میں مزید نمک مرچ لگاتے ہیں، اس طرح بے حیائی کی ایک رو چل پڑتی ہے اور برے میلانات رکھنے والوں کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ کہاں کہاں ان کے لیے قسمت آزمائی کے مواقع ہو سکتے ہیں۔ بالفرض کسی نے ارتکاب کیا بھی ہے تب بھی چار گواہوں کی موجودگی کی شرط اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ کوئی بھی شخص ایسے ہی بلا ثبوت اٹھ کر دوسروں کی عصمت کو داغدار نہ کرنے لگے۔ کوئی مرد یا کوئی عورت کسی شریف مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگائے تو لازماً اس سزا کا مستحق ہے۔ اگر کسی نے گناہ کیا بھی ہے اور الزام لگانے والے نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے مگر چار گواہ نہیں لاسکتا تو پھر خاموش رہے، تاکہ گندگی جہاں پڑی ہے وہیں پڑی رہے، آگے نہ پھیل سکے۔ اسلام کا منشا تو گندگی کو سمیٹنا ہے نہ کہ مزید آگے پھیلا نا۔

9- فحاشی پھیلانے کی ممانعت:

ہر وہ سرگرمی جس کا تعلق معاشرے میں فحاشی پھیلانے سے ہے، اس پر تنبیہ فرماتے ہوئے سورہ نور، آیت 19 میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۖ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (19) ﴿۱﴾

”جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان میں فحاشی پھیلے وہ دنیا و آخرت میں دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔ (اس کی خرابی) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

”آیت کے الفاظ فحش پھیلانے کی تمام صورتوں پر حاوی ہیں۔ فحاشی پھیلانے والی سرگرمیوں میں افراد مصروف ہوں یا ادارے، اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ انھیں ایسا کرنے سے روکے اور انھیں قرار واقعی سزا دے۔ بدکاری کے اڈے، قحبہ خانے بھی اس ضمن میں شامل ہیں اور ہیجان پیدا کرنے والے ذرائع مثلاً فحش لٹریچر، عریاں تصویریں، ریڈیو، ٹی وی، وی۔سی۔ آر، ڈش انٹینا وغیرہ وہ سب چیزیں، جنہوں نے مل کر معاشرے میں آگ لگا رکھی ہے، یہ سب مجرم ہیں اور سب سزا کے مستحق ہیں، ان سے اجتماعی زندگی کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ پر اعتماد کرو اور ان تمام برائیوں کو پوری قوت سے مٹانے اور دبانے کی کوشش کرو۔ یہ کوئی معمولی باتیں نہیں ہیں جن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ دراصل یہ بہت بڑی بڑی خرابیاں ہیں جن کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔“ [1]

حضرت ابو بکرؓ نے خلیفہ منتخب ہوتے ہی جو پہلا خطبہ دیا تھا اس میں خصوصاً ذکر فرمایا:

”کبھی ایسے نہیں ہوتا کہ قوم اللہ کی راہ میں جہاد چھوڑ دے اور اللہ ان پر ذلت مسلط نہ کرے اور کسی قوم میں فحش باتیں پھیلیں اور اللہ تعالیٰ اس کو عام مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔“

10۔ عمل قوم لوط:

اس کی دو قسمیں ہیں: (1) وطی فی الدبر (2) ہم جنس پرستی۔ دونوں اسلام میں حرام ہیں۔ نبی پاکؐ کا ارشاد ہے: ”جو شخص حائفہ سے، یا اپنی بیوی سے دبر میں اپنی خواہش پوری کرے یا کاہن کے پاس آئے اس نے نبی پاکؐ کے لائے ہوئے دین سے انکار کیا۔“ [2] یعنی وطی فی الدبر اپنی عورت (بیوی) کے ساتھ ہو یا کسی غیر کے ساتھ، کسی حال میں جائز نہیں۔

[1] تفہیم القرآن، ج سوم، سورۃ نور حاشیہ نمبر 16

[2] ترمذی

11۔ ہم جنس پرستی:

(استلذ اذ بالمثل) یعنی مرد کا مرد سے اپنا جنسی میلان پورا کرنا یا عورت کا عورت کے ساتھ مصروف ہونا، یہ بھی عمل قوم لوط کہلاتا ہے۔ قوم لوط نے ہی اس کا آغاز کیا اور قرآن پاک کے بیان کے مطابق ان کی خباثت اس سلسلہ میں اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ حضرت لوط کے بار بار سمجھانے پر بھی باز نہ آئے حتیٰ کہ مہمان کی بھی پروا نہ تھی، حضرت لوط سے ان کے مہمانوں (جو دراصل فرشتے تھے) کا تقاضا کرنے آگئے۔ بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ جتنا برا ان کا کام تھا، اتنی ان کو سخت سزا دی گئی کہ زمین کا اوپر والا حصہ نیچے کر دیا گیا (یعنی ان کو تہ وبالا کر دیا)، پھر ان پر لگاتار کنکر کے پتھر برسائے گئے جن پر رب کی طرف سے نشان لگے ہوئے تھے۔ [۱]

یہ بیماری بھی تاریخ میں ہر دور میں موجود رہی ہے، مگر جتنی شدت کے ساتھ بیسویں صدی کے آخری نصف سے پھوٹی ہے اتنی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ بالآخر امریکہ، فرانس، برطانیہ، سویڈن جیسے مہذب ممالک نے اس کو قانوناً جائز قرار دے دیا۔ بلکہ 2020ء کے شروع میں ایمنسٹی انٹرنیشنل نے سوشل میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں فخریہ انداز میں اپنے ان کارناموں کی تشہیر کی:

- ☆ ہم جنس پرستی دنیا کے 123 ممالک میں قانونی طور پر منظور ہو چکی ہے۔
- ☆ اسقاطِ حمل کا حق عورت کو قانونی طور پر 67 ممالک میں مل چکا ہے۔
- ☆ سزائے موت دنیا کے 106 ممالک میں کالعدم قرار دی جا چکی ہے جبکہ 42 ممالک میں کام جاری ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل نے 2020ء کو ہم جنس پرستی کے سال کے طور پر منانے کا اعلان بھی کیا۔ وکرو وکرو اللہ۔ قریب تھا کہ ان کی اخلاق باختہ حرکتوں کی پیش قدمی جاری رہتی اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کرونا وائرس کی عالمی وبا نے دنیا کے تمام ممالک کو اور بالخصوص مغربی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ساری دنیا کے عوام کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ سماجی تقریبات اور سیمینارز اور کانفرنسز مؤخر کر دی گئیں اور ساری دنیا کا ہدف اب زندگی کی بقا کو

برقرار رکھنے میں صرف ہونے لگا۔ اسلامی احکامات بالخصوص صفائی اور طہارت، پاکیزہ خوراک، آزادانہ اختلاط کی ممانعت کی حکمتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ امریکی صدر سکارف کی اہمیت بیان کرتے نظر آئے۔ وہ ممالک جن کو عورتوں کے حجاب سے تکلیف تھی اب اپنی ساری آبادی کے لیے ماسک کو ضروری قرار دینے لگے۔

عمل قوم لوط کے مرتکب کی سزا اسلام میں بڑی سخت رکھی گئی ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: عن عبد اللہ ابن عباس أن رسول اللہ قال لا ينظر اللہ الى رجل آتی رجلاً أو امرأَةً فی الدُّبُرِ [۱] ”سیدنا عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف نظرِ رحمت سے نہ دیکھے گا جو کسی مرد کے پاس آتا ہے یا کسی عورت کی دبر میں جماع کرتا ہے۔“ مزید آپ کا فرمان مبارک ہے: تم جس کو بھی عمل قوم لوط میں مبتلا دیکھو تو فاعل (جو کرنے والا ہے) اور مفعول بہ (جس کے ساتھ یہ عمل ہو رہا ہے) دونوں کو قتل کر ڈالو، ان دونوں کے لیے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ معافی کی کوئی صورت نہیں، یہ غیر فطری فعل زنا سے کئی گنا زیادہ برا ہے۔ یہ وہ ملعون فعل ہے جس پر نبی پاک ﷺ نے بار بار لعنت فرمائی۔ اس سے بچنے کی ترکیب حافظ ابن حجر نے (مفتاح الخطابة، ص 217 میں) یہ بیان کی ہے کہ مالدار لڑکوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کیا جائے کیونکہ یہ اپنی شکل و صورت اور لباس و پوشاک میں سراپا فتنہ ہیں، بسا اوقات یہ عورتوں سے بڑھ کر فتنہ ثابت ہوتے ہیں۔ پھر انہوں نے امام سفیان ثوریؒ اور امام احمدؒ کے حوالوں سے لکھا ہے کہ قریب البلوغ خوبصورت لڑکوں سے جتنا ممکن ہو پرہیز کرنا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿يُذْنِبْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَّابِیْهِنَّ ط﴾
”(عورتیں) اپنے اوپر چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔“
(الاحزاب: 59)

ستر و حجاب کے احکام

- بے پردگی بڑا فتنہ ہے
- عورت میں حیا کی کمی..... دشمن کی کامیابی
- غصہ بھر
- گھروں کے اندر پردے کی تفصیلات از روئے حدیث
- باپردہ خواتین عملی میدان میں
- اظہارِ زینت کی ممانعت
- عفت و پاکدامنی کے فوائد
- گھر سے باہر نکلنے وقت پردے کے احکام
- مخالفین پردہ کی سرگرمیاں
- نقاب کی پابندی کے ساتھ باہر نکلنے کے احکام
- بعض مستشرقین کا اسلام کے عائلی نظام کو خراجِ تحسین
- آزادانہ اختلاطِ مرد و زن کی ممانعت
- نماز اور مسجد
- پردہ کی مخالفت میں دلائل اور ان کے جوابات
- حج
- زیارتِ قبور اور جنازوں میں شرکت
- جہاد میں خواتین کی شرکت
- تجزیہ
- پردے کے لیے عقلی دلائل
- بے پردگی کے بارے میں علامہ اقبال کا نقطہ نظر
- پردہ قدیم اقوام میں بھی رائج تھا
- بے پردگی کے نقصانات
- بے حیائی کے مہلک نتائج تاریخ کی روشنی میں
- بے پردگی کے نتائج تاریخ کی روشنی میں

ستر و حجاب کے احکام

بے پردگی بڑا فتنہ ہے:

اسلام امن و سلامتی کا ضامن اور فتنہ و فساد کا دشمن ہے۔ ارشادِ بانی ہے:

﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ [۱]

”اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے“

کیونکہ قتل سے تو صرف ایک یا دو جانوں کا اتلاف ہوتا ہے لیکن فتنہ سے ہزاروں جانوں کے ضیاع کا احتمال ہے۔ قرآن پاک کے نزدیک فتنہ ہر وہ چیز ہے جو انسان کے دل و دماغ میں کشمکش کا باعث بن جائے اور آخر کار اس کی عقل، ضمیر اور اس کے عزم و استقامت میں ضعف پیدا کر دے، جس کی بنا پر حق و صداقت پر قائم رہنا ناممکن ہو جائے۔ خطرناک ترین فتنہ شیطان کا ہے جس نے انسان کی ضلالت و گمراہی کا آغاز ہی بے پردگی اور بے حجابی سے کروایا، اس کو بہلا پھلا کر اس کا لباس اتروا دیا (یعنی حضرت آدم و حضرت حوا علیہما السلام) جس سے ان کے جسم کے مستور حصے ننگے ہو گئے اور وہ جنت سے نکال دیئے گئے۔ ارشادِ بانی ہے:

﴿يَبْنِيْ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَا اَخْرَجَ اٰبَوٰيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا﴾ [۲]

”اے بنی آدم! کہیں تمہیں شیطان اس طرح نہ بہکا دے جس طرح (بہکا کر)

اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکلوا یا تھا اور ان کے لباس اتروا دیئے

تھے تاکہ ان کے ستر انہیں دکھا دے۔“

[۱] البقرہ: ۱۹۱

[۲] الاعراف: ۲۷

اس طرح بے پردگی بہت بڑا فتنہ ہے، مگر بد باطن انسانی شیطان، بڑے تعلیم یافتہ پروفیسر بزم خود اتنے دلفریب دلائل دیتے ہیں کہ خود اللہ نے انسان میں ذوقِ جمال و دیعت کیا ہے۔ اس ذوقِ جمال سے وہ فطرت کے تمام مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے تو پھر انسانی جمال سے وہ کیوں لطف اندوز نہ ہو۔ چنانچہ مرد و عورت دونوں ایک دوسرے سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے باکی سے گھور گھور کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، آہستہ آہستہ یہ دیدہ بازی نفس کے شیطان کی انگینت پر شوق وصال کو تیز کر دیتی ہے۔ لہذا اسلام میں جہاں مرد اور عورت دونوں کو غصّ بھر کا حکم دیا گیا اور حصارِ نکاح قائم کیا گیا، وہاں اس کے ساتھ ہی خواتین کا دائرہ عمل گھر تک محدود کر دیا گیا ہے۔ دوسری طرف چند محرم رشتہ داروں کو چھوڑ کر باقی سب سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اس کا حسن عام نہ ہو۔ ستر و حجاب کے احکام شریعت اسلامیہ میں بڑے اہم ہیں۔ معاشرتی نظام میں نکاح و طلاق کے احکام جتنے اہم ہیں اتنے ہی اہم یہ ستر و حجاب کے احکام ہیں تاکہ شیطان نفس کے لیے کہیں سے چور دروازہ نہ نکل سکے۔ اس کے باوجود اگر پھر بھی کوئی شرارت کرے تو سخت عبرتناک سزا سے دوچار ہو۔

ستر اور حجاب کے ضمن میں کچھ ہدایات تو وہ ہیں جو گھر کے اندر اختیار کرنا ضروری ہیں۔ گھر میں دو قسم کے رشتہ دار ہوتے ہیں: محرم اور غیر محرم۔ محرم کے احکام مختلف ہیں جبکہ غیر محرم کے بارے میں ہدایات دوسری ہیں، جو سب ترتیب وار بیان کیے جاتے ہیں:

گھر کے اندر عورت اپنے جن عزیزوں کے سامنے اظہارِ زینت کر سکتی ہے ان میں شوہر، باپ، سر، بھائی، بھتیجے، بھانجے، سگے ماموں، سگے چچا، میل جول کی مسلمان عورتیں اور کمسن بچے شامل ہیں، مگر گھر میں بھی اوڑھنی کا اہتمام ضروری ہے۔ اوڑھنی کی اس طرح ہکل ماری جائے جس سے سر، سینہ اور گردن ڈھکی ہوئی ہو۔ پھر اسے اپنے زیور کی جھنکار بھی پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ سورہ نور میں گھر کے اندر عورت کے پردے کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے:

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَرَادَ اللَّهُ بِمَا يَصْنَعُونَ﴾^{۳۵}

وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ
فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ
يُخْمَرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ
أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ
إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنَاتِ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنَاتِ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا
مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولَى الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ
أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا
يَضْرِبْنَ بَأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ ۚ ﴿٣١﴾

”اے نبی! آپ ایمان والوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور
اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ طریقہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور
یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے جو وہ کرتے ہیں اور آپ مسلمان عورتوں سے
بھی کہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں
اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور اپنے
سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بکل مار لیا کریں اور اپنا بناؤ سنگار نہ ظاہر کریں مگر
ان لوگوں کے سامنے: شوہر، باپ، خسر، بیٹے، سوتیلے بیٹے، بھائی، بھتیجے،
بھانجے، اپنی عورتیں، اپنے غلام، وہ مرد خدمتگار جو عورتوں سے کچھ مطلب نہیں
رکھتے اور وہ لڑکے جو ابھی عورت کی پردہ کی باتوں سے آگاہ نہیں ہوئے، اور وہ
اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ جو زینت انہوں نے چھپا رکھی
ہے اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔“

ان آیات میں پہلے اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو غرض بصر (یعنی نگاہیں
بچا کر چلنا) اور شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کی تلقین فرمائی ہے، پھر عورت کے اس پردے کی

تفصیل بیان فرمائی ہے جو اسے گھر کے اندر اپنے محرم رشتہ داروں سے کرنا ہے۔ یعنی اُس کا سر، سینہ وغیرہ اچھی طرح بنگل (اوڑھنی) سے ڈھکا رہے۔ پھر ان محرم مردوں کے سامنے بھی زیب و زینت کے اظہار کو روکا گیا ہے۔ یہ گھر کے اندر پردے کی تفصیل ہے جس کی پابندی مسلمان عورت کو اختیار کرنا لازمی ہے۔

اس آیت میں جہاں بھائی کا ذکر ہے، اس سے اپنا حقیقی بھائی مراد ہے۔ چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھا زاد، خالہ زاد اور اس طرح کے وہ بھائی جن سے شادی جائز ہو سکتی ہے، وہ یہاں ہرگز مراد نہیں ہیں۔ ان خالہ زاد، چچا زاد بھائیوں سے بھی (جو اگرچہ قریبی ہیں مگر ان سے نکاح جائز ہے) پردہ اسی طرح ضروری ہے جس طرح غیروں سے۔ ہندوستان اور دیگر ممالک میں چچا زاد اور ماموں زاد وغیرہ سے جو بے پردگی کا رواج ہے یہ شریعت کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہاں بہن بھائی کے لڑکے سے سگا بھانجا اور سگا بھتیجا ہی مراد ہے، سوتیلہ مراد نہیں۔ آیت میں لفظ ”اپنی عورتیں“ سے اپنے میل جول کی دینی بہنیں مراد ہیں، جن کے طور اطوار اور اخلاق نیک شریف عورتوں والے ہیں۔ کیونکہ کافر یا غیر متعلق عورتوں کے سامنے زینت کے اظہار کی وجہ سے بسا اوقات عورتیں اخلاقی اور مالی دونوں قسم کی آفتوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں بلکہ بعض حالات میں اسی کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ اسی طرح وہ ملازم مراد ہیں جو بڑھاپے کی وجہ سے جنسی میلان سے خالی ہوں (نوجوان ملازم سے پورا پردہ کیا جائے گا۔ یہ بے قاعدگی بھی ہمارے معاشرے میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے) اسی طرح وہ بچے جو ابھی بلوغ کے تقاضوں سے نا آشنا ہوں، ان کے سامنے بھی زینت ظاہر کی جاسکتی ہے۔

غَضِّ بَصَر:

اس آیت میں پہلا حکم جو مسلمان مرد اور عورت کو دیا گیا ہے، وہ غَضِّ بَصَر ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اجنبی عورتوں کے حسن اور ان کی زینت سے لطف اندوز ہونا مردوں کے لیے اور اجنبی مردوں کو دیکھنا عورتوں کے لیے فتنہ و فساد کا موجب ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(زنا العین النظر) ”آنکھوں کا زنا نظر بازی ہے۔“ [۱]

[۱] صحیح بخاری، کتاب الاستیذان، باب زنا الجوارح دون الفرج

قتلہ کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے لہذا پہلے اسی دروازے کو بند کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غضب بصر کے فوراً بعد شرمگاہوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ بدکاری اور زنا کی پہلی سیڑھی خراب نظر ہی تو ہے۔ لہذا مسلمانوں کو نگاہ کی حفاظت کا تاکید حکم ہے اور اگر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے اور نگاہ فوراً پھیر لینی چاہیے، دوسری بار ادھر نظر کرنا گناہ ہے۔ نبی پاکؐ کا ارشاد ہے: ”اے علیؓ! ایک بار نظر پڑ جانے کے بعد دوبارہ نہ دیکھو کیونکہ پہلی نظر تو تمہیں معاف ہے دوسری نہیں۔“ [۱]

یہاں اوڑھنی یا دوپٹے کا ذکر کیا گیا ہے، لازمی ہے کہ یہ دوپٹہ موٹا ہو کہ جسم نظر نہ آئے۔ گھر کے اندر پردہ کے بارے میں کچھ مزید احکام بھی شریعت نے دیئے ہیں جو ذیل میں بیان کیے جا رہے ہیں: کسی شخص کے زنانہ خانے میں جہاں اس کے بیوی بچے رہتے ہوں، دوسرے شخص کو داخل ہونے کی اجازت دو شرطوں کے ساتھ دی گئی ہے:

(۱) صاحب خانہ کے ساتھ اس کو استیناس حاصل ہو۔ لفظ ”استیناس“ کا مادہ انس بمعنی محبت ہے، اس تعلق سے، چاہے یہ تعلق رشتہ داری کا ہو، محبت والفت کا ہو یا ملازمت اور غلامی وغیرہ کا ہو، بہر حال اس قسم کے تعلق کے بغیر کسی کے زنانہ مکان میں داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں دی گئی۔

(۲) صاحب خانہ سے ”استیذان“ یعنی زنانہ مکان میں داخل ہونے سے پہلے اہل خانہ سے اجازت حاصل کر لی جائے۔ اس اجازت کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کیا جائے۔ اگر سلام کا جواب مل جائے تو سمجھو کہ اجازت ہے ورنہ اٹھ پاؤں واپس چلے آؤ۔ حدیث میں وضاحت کی گئی ہے کہ تین بار سلام کرو، اگر پھر بھی اجازت نہ ملے تو واپس آ جاؤ۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ۚ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ

[۱] مشکوٰۃ: 3110؛ بحوالہ سنن ابی داؤد جامع ترمذی: کتاب الادب: باب نظر النجاء

تَذَكُّرُونَ ﴿٢٤﴾ ﴿١﴾

”اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اہل خانہ سے پوچھ نہ لو اور جب داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو، یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے۔“ ﴿٢﴾

اس سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے عزیز و اقارب بھی اس کے زنان خانہ میں صرف اسی صورت میں داخل ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے شرعی طریقے سے اجازت لے لی ہو۔ اس صورت میں ان پر لازم ہے کہ نگاہیں نیچی رکھیں، گھر کی عورتوں کو گھورنے یا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے ان سے گفتگو کرنے کی کوشش نہ کریں۔ دوم یہ کہ گفتگو بھی تہذیب و شائستگی کے دائرے کے اندر ہو اور شرم و حیا کے منافی نہ ہو۔ نیز اپنے حدود و ستر کا پورا اہتمام رکھیں اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو نفس کے فاسد میلانات کو ابھارنے والی ہو۔

اس وقت گھر کی خواتین کو بھی چند باتوں کا اہتمام کرنا ہوگا:

(1) وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں اور بے باکی سے آنے والے مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالیں۔

(2) اپنے سروں پر اوڑھنیاں ڈال لیں اور اچھی طرح ان کی بکل مار لیں۔

(3) اظہار زینت نہ کریں، سمٹ سمٹا کر رہیں، اپنے آپ کو سنبھال کر رکھیں تاکہ دوسروں کی نگاہ خواہ مخواہ ان کی طرف نہ اٹھے۔

(4) اس دوران اگر کسی ضرورت سے گھر کے اندر آنے جانے کی ضرورت پیش آئے تو دبے پاؤں آئیں جائیں، زمین پر پاؤں مار کر نہ چلیں کہ زیوروں کی جھنکار سنائی دے۔

(5) اگر کسی مرد سے بات کرنے کی نوبت آئے تو گفتگو میں لوج اور نزاکت پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سیدھے سادھے الفاظ میں مطلب کی بات کہہ کر فوراً گفتگو ختم

﴿١﴾ النور: 27

﴿٢﴾ اس قرآنی حکم کی وضاحت فرماتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے کسی کے گھر میں جھانکنے سے بھی منع فرمادیا۔

کر دیں۔ قرآن پاک میں سورۃ احزاب میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾ [۱]

”دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں کوئی خرابی ہے وہ تم سے کچھ توقعات نہ وابستہ کر بیٹھے، بات سیدھے سادے انداز میں کرو۔“

بڑے اخلاق سے ہنس نہس کر اور بنا بنا کر مردوں سے باتیں کرنا شریعت کے نزدیک کسی طور پر جائز نہیں ہے۔

(6) پھر غیر محرم مردوں سے کچھ لینا دینا ہو تو پردے کی اوٹ سے لیا دیا جائے۔ سورۃ احزاب میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ذَلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ﴾ [۲]

”جب تم کو ان عورتوں سے کوئی چیز مانگتی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو، یہ طریقہ تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔“

گھروں کے اندر پردہ کی تفصیلات از روئے حدیث:

احادیث میں ان قرآنی احکامات کی مزید وضاحت ملتی ہے مثلاً:

(1) ایک شخص نبی پاک ﷺ کے مکان کے دروازے کے سوراخ سے آپ کے گھر کے اندر جھانک رہا تھا۔ آپ کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جس سے اپنا سر کھجلا رہے تھے، جب آپ نے اسے دیکھا تو فرمایا: ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اندر جھانک رہے ہو تو میں اس چیز سے تمہاری آنکھ پھوڑ دیتا۔“ پھر آپ نے فرمایا: ”مکان کے اندر داخل ہونے کی لیے اجازت لینے کی شرط نگاہ کو روکنے کے لیے ہی تو لگائی گئی ہے۔“ [۳]

[۱] الاحزاب: 32

[۲] ایضاً: 53

[۳] صحیح بخاری: 5924 (کتاب الاستیذان، باب من اطلع فی بیت قوم)

ستر و حجاب کے احکام

امام بخاریؒ نے یہ روایت بیان کر کے باب باندھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے گھر کے اندر جھانکنے کی کوشش کرے اور صاحب خانہ کسی چیز سے اس کی آنکھ پھوڑ ڈالے تو اس پر کوئی دیت یا تاوان عائد نہیں ہوگا۔^[۱]

(2) غلام کے بارے میں ہدایت گزر چکی ہے کہ اس سے پردہ نہ ہو۔ اس سے وہ غلام مراد ہے، جو مکمل طور پر آپ کے ماتحت ہے۔ اگر کسی شخص کا غلام مکاتب بن جائے جس کے پاس ادا کرنے کے لیے رقم موجود ہو تو اس سے پردہ کرنا چاہیے۔^[۲]

مگر اس سے آج کل کے ملازم مرد مراد نہیں لیے جاسکتے، کیونکہ یہ ہمارے زیر دست نہیں ہوتے۔ ان کے کام کے اوقات مقرر ہیں، وہ اس وقت تک کے لیے ماتحت ہیں۔ دوم یہ کہ وہ اپنی اصل حیثیت میں آزاد ہیں۔ چاہے تو ہمارے ہاں کام کریں چاہے نہ کریں۔ سوم: اکثر اس قسم کے مرد ملازم جب بھی موقع ملتا ہے، اہل خانہ پر دست درازی کرنے، عزتیں لوٹنے، گھر میں چوری کروانے میں مددگار بنتے ہیں۔ لہذا ان مرد ملازموں سے بہر حال پردہ ضروری ہے۔

(3) ایک دفعہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں، وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیکھ کر منہ پھیر لیا اور فرمایا: ”اے اسماءؓ جب عورت بالغ ہو جائے تو بجز اس کے، اور اس کے، اسکے جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آنا چاہیے“ یہ کہہ کر آپؐ نے چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔^[۳]

یہ اسماءؓ نبی پاک ﷺ کی سالی تھیں، ام المومنین حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ اور ہتھیلیوں کے کھولنے کی اجازت دینے والی حدیث کا تعلق گھر کے اندر کے پردہ سے ہے نہ کہ باہر کے پردہ سے۔

(4) اپنے عزیزوں میں جس قسم کی احتیاط کی ضرورت گھر کے اندر ہے اسی قسم کی احتیاط ملحوظ

[۱] صحیح بخاری: 6902

[۲] سنن ابی داؤد: 4106

[۳] ایضاً

رکھ کر وہ باہر بھی ایک دوسرے کے قریب ہو سکتے ہیں مثلاً سنن ابی داؤد (کتاب المناسک) میں حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ (آنحضورؐ کی سالی) ہی کی ایک روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حج کے لیے نکلے۔ جب مقامِ عرج میں پہنچے تو نبی پاکؐ بھی اترے اور ہم بھی اترے، حضرت عائشہؓ نبی پاکؐ کے پاس بیٹھ گئیں اور میں اپنے باپ کے پاس بیٹھ گئی۔

(5) اسی طرح جو چادر گھر کے اندر سر پر ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے وہ بھی موٹی ہونی چاہیے۔ حضرت وحیہ بن خلیفہ کلبی سے روایت ہے کہ رسول ﷺ کے پاس قباطی (یعنی مصری) کپڑے آئے۔ آپؐ نے ان میں سے ایک کپڑا مجھے بھی عنایت فرمایا اور فرمایا کہ اس کے دو حصے کر کے ایک حصہ کی اپنی قمیض بنوالو اور دوسرا اپنی بیوی کو دوپٹہ بنانے کے لیے دو۔ مگر اسے کہنا کہ وہ اس کے نیچے ایک اور کپڑا لگا لے تاکہ یہ (پتلا دوپٹہ) جسم کی غمازی نہ کرے۔ [۱]

اظہارِ زینت کی ممانعت:

مندرجہ بالا بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خاص دائرہ ہے جس کے اندر عورت اپنی زینت ظاہر کر سکتی ہے (اس کے باہر زینت کے اظہار سے پرہیز لازم ہے)۔ زینت ظاہر کرنے سے مراد یہ ہے کہ لباس اور ستر کا پورا خیال رکھے۔ چہرے اور ہاتھوں کے سوا عورت کا پورا جسم ستر ہے، جس کو باپ، بھائی، بیٹے چچا، ماموں تک کے سامنے کھولنا جائز نہیں۔ حتیٰ کہ عورت پر بھی عورت کے ستر کا کھلنا ممنوع ہے (یعنی ایک عورت کو دوسری عورت کا ناف سے لیکر گھٹنے تک کا حصہ دیکھنا حرام ہے، باقی حصہ جسم کو دیکھنا مکروہ ہے)۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ جس زینت کے اظہار کی اجازت ان محرم رشتہ داروں کے سامنے دی گئی ہے، وہ سترِ عورت کے علاوہ ہے یعنی زیورات، اچھے لباس سے آراستہ ہونا، لپ شک، میک اپ وغیرہ۔ بالوں کی تراش خراش اور وہ تمام آرائشیں جو عورتیں طبعی ذوق کی بنا پر عموماً گھروں میں

کیا کرتی ہیں، اس قسم کی زینت کا اظہار صرف محرم رشتہ داروں کے سامنے جائز ہے یا ان لوگوں کے سامنے جن کے اندر صنفی میلانات نہیں ہیں۔

(أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولَى الْإِرْبَةِ سے یہی لوگ مراد ہیں) یا ان لوگوں کے سامنے جو فتنے کا سبب نہ بن سکتے ہوں (نِسَاءً) سے مراد اپنے میل جول کی عورتیں یا وہ بچے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہیں ہیں)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کا منشا یہ ہے کہ عورتوں کے اظہار زینت کو ایسے حلقہ تک محدود کر دیا جائے جس میں ان کے حسن اور آرائش و زیبائش سے کوئی فتنہ سامانی پیدا ہونے کا خدشہ نہ ہو، یا صنفی انتشار کے اسباب فراہم ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

اس حلقے سے باہر جتنے بھی مرد ہیں ان کے سامنے زینت کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ حتیٰ کہ خواتین چلتے وقت پاؤں بھی اتنے آہستہ رکھیں کہ چھپی ہوئی زینت (زیور وغیرہ کی جھنکار) ظاہر نہ ہو اور اس ذریعہ سے وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل نہ کر سکیں۔ اگر عورتیں بن ٹھن کر ایسے لوگوں کے سامنے آئیں جو صنفی میلانات رکھتے ہیں تو لامحالہ اس کے غلط اثرات مرتب ہو کر رہیں گے۔ ضروری نہیں کہ عورتوں کے ایسے اظہار زینت سے ہر عورت فاحشہ بن جائے یا ہر مرد لازماً بدکار ہو جائے، مگر بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ آزادانہ زینت اور بے باکانہ اختلاط مرد و زن معاشرے میں بے شمار مفسد پیدا کرنے کا موجب ہے۔ سوال یہ ہے کہ عورتوں کا اس طرح بن ٹھن کر نکلنا، آرائش کا اتنا شوقین ہونا، پھر اس طوفان میں روز افزوں اضافہ آخر کس بات کی غمازی کرتا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ مردوں سے داد و تحسین کی متمنی ہیں! یہ آغاز بے شک بڑا معصوم ہو مگر اس کے نتائج بہت بھیانک ہیں، جو تمام معاشرے پر قیامت کی سی تاریکی پھیلا دیتے ہیں۔ فرمانِ نبویؐ ہے:

☆ مَثَلُ الرَّافِلَةِ فِي الزَّيْنَةِ فِي غَيْرِ أَهْلِهَا كَمَثَلِ ظُلْمَةِ يَوْمٍ الْقِيَمَةِ لَا نُورَ لَهَا

”اجنبیوں میں ناز و ادا سے چلنے والی عورت ایسی ہے جیسے روز قیامت کی تاریکی

جس میں کوئی نور نہیں۔“ [۱]

☆ ”ہر آنکھ زنا کرتی ہے (اس لیے عورت کو چاہیے کہ وہ مردوں کی نگاہوں سے بچ کر گزر جائے) پھر جب کوئی عورت عطر لگا کر مجلس سے گزرتی ہے تو وہ ایسی اور ایسی ہوتی ہے (یعنی زانیہ)“ [۲]

قرآن پاک میں جہاں غیر لوگوں کے سامنے زینت کے اظہار کی ممانعت ہے وہاں ایک استثناء بھی ہے: إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا کا مطلب یہ ہے کہ وہ زینت جو خود بخود ظاہر ہو جائے۔ لوگوں نے اس استثناء سے بہت کچھ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کا ٹھیک مفہوم مفسرین کی آراء کے مطابق یہی ہے کہ عہدِ دوسروں کے سامنے اپنی زینت ظاہر نہ کرو، ہاں! جو زینت خود بخود دوسروں کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ مثلاً قد و قامت، جسمانی تناسب وغیرہ یا کام کاج کے لیے ہاتھ کھولنا پڑ جائے یا کبھی ضرورت کی خاطر چہرہ کھولنا پڑ جائے، اس میں آپ کی نیت زینت کے اظہار کی نہ ہو تو اس کا کھولنا جائز ہے۔

گھر سے باہر نکلتے وقت پردہ کے احکام:

سورۃ احزاب، آیت نمبر 59 میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ۖ ذَٰلِكَ أَذْنٰى أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۖ﴾ [۳]

”اے نبی! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں۔ اس تدبیر سے توقع یہ ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انھیں ستایا نہ جائے۔“

[۱] ترمذی، باب ماجاء فی کراہیۃ خروج النساء فی الزینہ

[۲] ابوداؤد 4/173؛ ترمذی 5/2786

[۳] الاحزاب: 59

”اس آیت میں چہرے کو چھپانے کا حکم ہے۔ لفظ جلابیب جمع ہے جلاب کی، جس کا معنی ہے: بڑی چادر جو سارے جسم کو چھپالے۔ دوسرا لفظ ہے يُذْنِبْنَ عَلَيْنَهُنَّ اس کا مطلب ہے: اوپر سے نیچے کوئی چیز لٹکانا۔ تو پھر يُذْنِبْنَ عَلَيْنَهُنَّ مِنْ جَلَّابٍ بِیْہُنَّ کا مفہوم ہوگا: ”اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکالیا کریں۔“ اسی کو گھونگھٹ نکالنا کہتے ہیں مگر مقصد گھونگھٹ یا کوئی خاص وضع نہیں ہے بلکہ مقصد چہرے کو چھپانا ہے، چاہے وہ گھونگھٹ سے چھپایا جائے یا نقاب یا کسی اور طریقہ سے۔ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ جب مسلمان عورتیں اس طرح مستور ہو کر باہر نکلیں گی تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ شریف عورتیں ہیں بے حیا نہیں ہیں لہذا کوئی اس سے تعرض نہ کرے گا۔ [۱]

”امام المفسرین حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیریوں بیان کی ہے: ”اللہ تعالیٰ نے مسلمان خواتین کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی ضرورت سے نکلیں تو سر کے اوپر سے اپنی چادروں کے دامن لٹکا کر اپنے چہروں کو ڈھانپ لیا کریں۔“ [۲]

امام محمد بن سیرینؒ نے حضرت عبیدہ بن حارث انصرمی سے اس آیت کی علمی تفسیر دریافت کی تو انہوں نے خود چادر اوڑھ کر بتایا اور اپنی پیشانی اور ناک اور ایک آنکھ کو چھپا کر ایک آنکھ کھلی رکھی۔ خود امام جریر طبریؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”اے نبی! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ جب اپنے گھروں سے کسی حاجت کے لیے نکلیں تو لونڈیوں کے سے لباس نہ پہنیں کہ سر اور چہرہ کھلے ہوں بلکہ وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے گھونگھٹ ڈال لیا کریں تاکہ کوئی فاسق ان سے تعرض نہ کر سکے اور سب جان لیں کہ وہ شریف عورتیں ہیں۔“ [۳]

آغاز سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک اس آیت کا مذکورہ بالا ایک ہی مفہوم سمجھا گیا

[۱] پردہ، ابوالاعلیٰ مودودیؒ: صفحہ 316

[۲] بحوالہ تفسیر ابن جریر طبری

[۳] تفسیر طبری ج 22، صفحہ 29، بحوالہ پردہ۔ 316

”محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ“

وابستہ ہونے کا اعلان بھی ضرور کریں اور پھر ترمیم و اصلاح کے کلہاڑوں سے اسلام کی مرمت بھی کرتے رہیں۔ یہ شریعت اللہ کی بنائی ہوئی ہے، کسی کے ترمیم کرنے سے اس میں ذرا بھر تغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ شریعت حیا دار اور عفت مآب مسلمان خواتین کے لیے ہے۔ اس حکم نقاب کے اندر عفت و عصمت کی حفاظت کے سارے سامان موجود ہیں اور چہرے کا نقاب اترتے ہی بہت سے فتنے سراٹھانے لگتے ہیں۔

چہرہ کا پردہ کیوں؟

انسان کی دلکشی کا مرکز و محور تو اس کا چہرہ ہے، جسم کا سب سے زیادہ جاذب نظر حصہ۔ ایک طرف پورا جسم بغیر چہرہ کے ہو دوسری طرف صرف چہرہ بغیر جسم کے ہو تو دونوں میں سے زیادہ دلکشی کیا اس تصویر میں نہیں جہاں صرف چہرہ (بغیر جسم کے) نظر آ رہا ہے۔ جب اصل مقصود صنفی انتشار کو روکنا ہو باقی مذکورہ بالا تمام سامان کیے جائیں صرف چہرہ کھلا چھوڑ دیا جائے، تو کیا مقصود حاصل ہو جائے گا؟ اس کا جواب عقل یہی دیتی ہے کہ چہرے پر نقاب لازماً ہونا چاہیے تاکہ عفت و عصمت کو محفوظ رکھنے کی جملہ تدبیریں صحیح نتائج دے سکیں۔

نقاب کی پابندی کے ساتھ باہر نکلنے کے احکام

یہ احکام درج ذیل ہیں:

1 ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾ [۱]

”اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھی رہو اور زمانہ جاہلیت کے سے بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو۔“

زمانہ جاہلیت میں عورتیں بن سنور کر دوپٹے سر پر ڈال کر اس کے دونوں پلو پیچھے پھینک دیا کرتی تھیں۔ پھر ان کی چال بھی ناز و ادا والی ہوتی کہ ہر قدم زمین پر نہیں بلکہ دیکھنے والوں کے دلوں پر پڑے۔ لہذا اس طرح بن سنور کر گھروں سے باہر نکلنے سے منع کر دیا گیا۔ تبرج کے لفظی

معافی نمایاں ہونا، ابھرنا، کھل کر سامنے آنا کے ہیں۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ تمہارا اصل مقام گھر ہے، اس لیے گھروں میں وقار سے اپنی ذمہ داریاں انجام دیتی رہو اور اگر کبھی تمہیں باہر جانے کی ضرورت پڑ جائے تو سادہ انداز میں گھر سے نکلو۔ زیب و زینت گھر کے اندر کی جاسکتی ہے مگر گھر سے باہر نکلتے وقت سادگی اور پردہ کا اہتمام لازمی ہے۔ باہر نکلتے وقت نمایاں ہونے کا اہتمام کرنا دورِ جاہلیت کا کام تھا، اب اس سے مکمل گریز کرو۔

2 ﴿وَلَا يَصْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ﴾^[1]
 ”اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں جس سے ان کی مخفی زینت (یعنی زیوروں کی جھنکار وغیرہ) ظاہر ہو جائے۔“

اونچی ایڑی کی جوتی ٹک ٹک کر کے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ بھی اس میں شامل ہے۔ گھنگھرو دار پراندے، پازیبیں وغیرہ نہ استعمال کی جائیں اور اگر کی جائیں تو پاؤں بہت آہستہ رکھے جائیں۔

3 ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ﴾^[2]
 ”دبی زبان سے بات نہ کرو کہ جس شخص کے دل میں مرض ہو وہ کسی طمع میں نہ مبتلا ہو جائے۔“

جب آواز میں شیرینی پیدا کرنے کی ممانعت ہے تو پھر عورت کے منہ سے نکلا ہوا نغمہ اور موسیقی غیر محرم کے سامنے کتنی سختی سے ممنوع ہے، بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

4 خوشبو لگا کر بھی عورت کو گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے اور اگر پہلے سے خوشبو لگا رکھی ہے اور اچانک باہر جانا پڑ گیا ہے تو خاص اہتمام سے دھو کر اس خوشبو کا اثر زائل کرنے کے بعد گھر سے نکلنا چاہیے۔ سنن ابی داؤد کی ایک روایت ہے کہ ایک عورت حضرت

[1] النور: 31

[2] الاحزاب: 32

ابو ہریرہؓ کے پاس سے گزری، اس نے خوشبو لگا رکھی تھی۔ آپؐ نے پوچھا: ”کیا تو مسجد سے آرہی ہے؟“ اس نے کہا: ”ہاں“ اس پر حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: ”میں نے اپنے محبوب حضرت ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو عورت مسجد میں آنے کے لیے خوشبو لگائے اس کی نماز قبول نہ ہوگی، جب تک وہ واپس جا کر اسی طرح غسل نہ کرے جس طرح غسل جنابت کیا جاتا ہے۔“ [۱]

بلکہ عورتوں کے لیے وہ خوشبو جائز ہے جس میں رنگ ہو اور خوشبو نہ ہو۔ ترمذی کی ایک روایت میں مذکور ہے: طَيِّبُ النِّسَاءِ لَوْ نَ لَا رِيحَ لَهُ ”عورتوں کی خوشبو تو رنگ والی ہوتی ہے نہ کہ مہک پھیلانے والی۔“ [۲]

5 گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں سفر کچھ لمبا ہو اور وہاں کچھ وقت لگنے کا امکان ہو تو ساتھ محرم کا ہونا ضروری ہے۔ عورت بغیر محرم کے سفر نہیں کر سکتی۔

6 اسی طرح گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں غصّ بصر کی تاکید ہے کہ مرد و عورت ایک دوسرے کی طرف بے باکانہ نگاہ سے نہ دیکھیں اور اگر کسی پر اتفاقیہ نظر پڑ جائے تو فوراً نگاہ پھیر لی جائے۔

آزادانہ اختلاط مرد و زن کی ممانعت:

عورتوں کو ضرورت کی بنا پر گھر سے نکلنے کی اجازت دی گئی ہے مگر اس کو صرف حقیقی ضرورت تک ہی محدود رکھا جانا چاہیے اور باہر نکلنے کی جملہ شرائط کی پابندی کے ساتھ ہی وہ نکلے۔ قرآن کریم میں سورۃ احزاب، آیت نمبر 53 میں ارشاد ہوتا ہے:

”اے ایمان والو! نبیؐ کے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک تمہیں اس کی اجازت نہ دی جائے، کھانا کھانے کے لیے نہ کہ کھانے کی تیاری کا انتظار کرتے ہوئے۔ پھر جب تمہیں بلا یا جائے تو داخل ہو جاؤ، پھر جب کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور بیٹھے باتوں میں نہ لگے رہو۔“

[۱] ابوداؤد 4/4174؛ ابن خزیمہ 3/1682

[۲] سنن ترمذی 5/106

یہ بات نبیؐ کے لیے باعثِ اذیت تھی مگر وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تو حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا اور جب تم کو ازواجِ نبیؐ سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو، یہ طریقہ تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی۔“

یہ بات اس آیت سے واضح ہے کہ عورتوں اور مردوں کا آزادانہ میل جول، ایک ہی مجلس میں مل بیٹھ کر گپ شپ لڑانا، دعوتوں میں اکٹھے کھانا پینا، تفریحات میں ایک ساتھ شامل ہونا، دفتروں، کلبوں، پارکوں میں باہم خوش گپیاں کرتے پھرنا، مخلوط انجمنیں اور مخلوط تقریبات اسلام کی تہذیب نہیں ہے، مخلوط سکول و کالج بلکہ مخلوط تعلیم ہی سے یہ آیت منع کر رہی ہے۔ یہ آیت اگرچہ ظاہر الفاظ کے لحاظ سے ازواجِ نبیؐ سے متعلق معلوم ہوتی ہے، مگر اس کا حکم عام ہے۔ آنحضور ﷺ نے ان قرآنی احکامات کی وضاحت میں جو ہدایات اور احکام دیئے ہیں، ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس آیت کا حکم سب مسلمان مردوں اور عورتوں کو شامل ہے۔

نماز اور مسجد:

آپؐ نے عورتوں کے لیے گھر میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا لیکن مسجد میں آنے سے ان کو روکا نہیں البتہ گڈ ہونے سے منع ضرور فرمایا۔

☆ حمزہؓ بن ابواسید انصاری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ نبیؐ مسجد سے نکل رہے تھے کہ آپؐ نے دیکھا کہ مرد اور عورت راستے میں باہم مل گئے ہیں، تو آپؐ نے عورتوں سے فرمایا: ”تم پیچھے ہٹ جاؤ، تمہارے لیے راستے کے درمیان میں چلنا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ راستہ کے کنارے کنارے چلو۔“ چنانچہ اس حکم کے بعد عورتیں دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں، یہاں تک کہ ان کی چادریں دیواروں کے ساتھ الجھتی تھیں۔ [۱]

☆ نبی پاک ﷺ اس بات کا اہتمام فرماتے کہ نماز سے فارغ ہونے پر کچھ دیر مرد وہیں ٹھہرے رہیں تاکہ عورتیں پہلے اٹھ کر چلی جائیں پھر مرد جائیں، اس طرح راستے میں مرد و عورت کا اختلاط نہ ہونے پائے۔ [۲]

[۱] سنن ابی داؤد: 4727، بیہقی شعب الایمان

[۲] ایضاً

☆ سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت ہے کہ نبی پاکؐ نے مسجد نبویؐ کا ایک دروازہ صرف عورتوں کے لیے مخصوص فرما دیا تھا۔ آج تک وہ دروازہ موجود ہے اور اس کا نام باب النساء ہے یعنی صرف خواتین کے آنے جانے کے لیے دروازہ۔ اسی طرح عیدین کی نماز میں بھی عورتوں کو شامل ہونے کی تاکید تھی، مگر ان کا اجتماع مردوں سے الگ تھلگ ہوتا تھا۔ نبی پاکؐ پہلے مردوں کو خطاب کرتے، وہاں سے فارغ ہو کر آپؐ خواتین کی طرف تشریف لاتے اور پھر ان کو خطاب فرماتے۔

☆ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی پاکؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی مرد عورتوں کے درمیان چلے۔ [۱]

☆ آپؐ نے فرمایا: ”مردوں کی بہترین صف پہلی ہے اور بدترین صف آخر والی ہے، جبکہ عورتوں کے لیے نماز میں بہترین مقام آخری صف ہے اور بدترین مقام پہلی صف ہے۔ [۲] چنانچہ نماز میں بھی مردوں اور عورتوں کی صفیں الگ الگ ہونی چاہئیں۔ مرد و عورت ایک دوسرے کے پاس کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھیں خواہ وہ شوہر اور بیوی ہوں یا ماں بیٹا۔“ مراد یہ ہے کہ محرم خواتین بھی جماعت میں مردوں سے پیچھے کھڑی ہوں۔ پھر نماز میں خوشبو لگا کر آنے سے بھی منع فرما دیا۔ [۳]

جج:

اسی طرح حج میں طواف کے دوران بھی مرد و خواتین کو باہم خلط ملط ہونے سے روکا گیا ہے۔ بخاری میں عطاء سے روایت ہے کہ ”عہد نبیؐ میں عورتیں مردوں کے ساتھ طواف کیا کرتی تھیں مگر مردوں سے الگ رہ کر۔“ حضرت عمرؓ نے بھی طواف میں مردوں اور عورتوں کو گڈمڈ ہونے سے روک دیا تھا۔ ایک دفعہ آپؐ نے ایک مجمع میں (جو عورتوں کا تھا) ایک مرد کو دیکھا تو پکڑ کر

[۱] ابوداؤد: 4728

[۲] صحیح مسلم: 440

[۳] موطا

کوڑے لگوائے۔ نیز صحابہ کرامؓ اس بات کا اہتمام کرتے کہ وہ اپنی عورتوں کو صبح سویرے مزدلفہ سے منیٰ روانہ کر دیں۔ تاکہ وہ لوگوں کے آنے سے پہلے صبح کی نماز اور رمی سے فارغ ہو جائیں۔

زیارتِ قبور اور جنازوں میں شرکت:

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں جنازے میں شرکت بڑی اہمیت کی حامل ہے مگر خواتین کو اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ صحیح بخاری میں ام عطیہؓ کی روایت ہے:

”مُهِينَا عَنْ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ وَلَمْ يَعْزِمُ“ [۱]

”ہمیں جنازوں میں شرکت سے منع کیا گیا تھا، مگر اس امر میں آپؐ کی طرف سے سختی نہیں کی گئی تھی۔“

ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث ہے کہ

لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَوَارَاتِ الْقُبُورِ [۲]

”نبی پاکؐ نے بکثرت قبروں پر جانے والیوں کو لعنت فرمائی تھی۔“

نماز ایک مقدس عبادت ہے، مسجد پاکیزہ مقام ہے، حج میں انسان انتہائی پاکیزہ جذبات کے ساتھ اللہ کے سامنے حاضر ہوتا ہے، جنازوں اور قبروں کی حاضری میں ہر شخص کے سامنے موت کا تصور ہوتا ہے، یہ سب مواقع ایسے ہیں جن میں صنفی جذبات یا تو بالکل مفقود ہوتے ہیں اور اگر ہوتے ہیں تو مغلوب ہوتے ہیں، مگر پھر بھی اسلامی شریعت ان موقعوں پر بھی عورتوں اور مردوں کے اختلاط کی اجازت نہیں دے رہی۔ پاک مقاصد کے لیے عورتوں کے جذبات کی رعایت کرتے ہوئے انہیں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تو دی ہے مگر حجاب کی اتنی پابندیاں لگادی ہیں کہ فتنے کے تمام امکانات ختم ہو کر رہ جائیں۔ کیا یہ قانون درسگاہوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، کلبوں، پارکوں، انجمنوں، کارخانوں، دفاتروں، تھیٹروں، سینماؤں، رقص گاہوں میں مرد و عورت کو گپ شپ لگانے، چیٹنگ کرنے اور باہم تفریح منانے کی اجازت دے سکتا ہے؟

[۱] صحیح بخاری: 1278؛ صحیح مسلم: 938

[۲] ترمذی: 1056

جہاد میں خواتین کی شرکت:

خواتین کی سرگرمیوں کا اصل میدان ان کا گھر ہے، لہذا وہ جہاد سے مستثنیٰ ہیں۔ نبی پاک کا فرمان ہے:

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ [۱]

”عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد کی نگران ہے اور وہ ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔“

چنانچہ ام ورقہ بنت نوفل نے غزوہ بدر میں نبی پاک ﷺ سے شرکت کی اجازت مانگی تو آپؐ نے فرمایا: ”جا کر اپنے گھر بیٹھو۔“ [۲]

حالانکہ جنگ بدر میں افراد کی بہت زیادہ ضرورت تھی کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مگر آپؐ نے اس وقت غزوہ بدر میں عورتوں کی شرکت کو ناپسند فرمایا۔ آپؐ نے عورتوں سے فرمایا کہ تم اپنے گھر ٹکی رہو، یہی تمہارا جہاد ہے۔ [۳]

2 ایک صحابیہؓ نے نبی پاک ﷺ سے سوال کیا: اللہ نے مردوں پر جہاد فرض کیا ہے، وہ اگر کامیاب ہوں تو مالی غنیمت حاصل کرتے ہیں۔ اگر شہید ہوتے ہیں تو رب کے پاس زندہ ہیں جہاں ان کو روزی ملتی ہے۔ ہمارا کونسا عمل ان کے اس عمل کے برابر ہو سکتا ہے؟ تو آپؐ نے جواب دیا: ”اپنے شوہروں کی اطاعت کرنا اور ان کے حقوق پہنچانا“ (ترغیب و ترہیب)۔ ایک دفعہ آپؐ نے حج کو عورتوں کا جہاد قرار دیا۔

دور جاہلیت سے یہ رواج چلا آ رہا تھا کہ میدان جنگ میں عورتیں ساتھ جاتیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، پانی پلاتیں، دوا دارو کرتیں، مردوں کا حوصلہ بڑھاتیں۔ اگر کبھی ضرورت

[۱] بخاری: 1057/2

[۲] ابوداؤد: 591

[۳] صحیح بخاری: 2875

پیش آتی تو خود بھی اسلحہ اٹھا لیتی تھیں۔ لیکن نبی پاک نے جنگوں میں خواتین کی شرکت کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی۔ اس لیے صرف چند خواتین جنگ میں حصہ لے سکیں اور جنگوں میں شامل ہوتی رہیں مگر لڑنے کے لیے نہیں بلکہ ان کا کام پانی پلانا، مرہم پٹی کرنا، لڑنے والوں کے لیے کھانا پکانا، مجاہدین کے پیچھے کیمپ کی حفاظت کرنا وغیرہ ہوتا ہے۔

اس دوران ان کا لباس ستر ہوتا، اگرچہ پردے کی حدود میں ایمر جنسی کی وجہ سے کچھ کمی واقع ہو جاتی۔ یہ طریقہ احکام حجاب نازل ہونے کے بعد بھی باقی رہا۔

جنگ احد میں جب مجاہدین اسلام کے پاؤں اکھڑ گئے اس وقت بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلیمؓ اپنی پشت پر پانی کے مشکیزے لاد لاد کر لڑنے والوں کو پلاتی رہیں۔ حضرت ام سلیطہؓ اور ام عمارہؓ بھی جنگ احد میں بہادری سے لڑتی رہیں بلکہ خواتین کی ایک جماعت تھی جو زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول تھی۔

حضرت ام عطیہؓ نے سات لڑائیوں میں شرکت کی۔ کیمپ کی حفاظت، مجاہدین کے لیے کھانا پکانا، زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری کرنا ان کے سپرد تھا۔ مگر یاد رہے کہ یہ صرف چند خواتین تھیں جو لڑنے کے علاوہ دیگر خدمات انجام دیتی تھیں۔ جبکہ آپؐ اس بات کا اہتمام فرماتے کہ یہ خواتین بھی اپنے محرم مردوں کے ساتھ جائیں، اکیلی نہیں جاسکتیں۔ پھر یہ بھی پابندی تھی کہ وہ آپؐ کی اجازت کے بغیر شریک نہ ہوں۔ ایک مرتبہ غزوہ خیبر میں پانچ چھ عورتیں آپؐ کی اجازت کے بغیر فوج کے ہمراہ ہو گئیں تو آپؐ نے ان کو سخت تنبیہ فرمائی: ”تم کس کی اجازت سے گھر سے نکلیں اور کس کے ساتھ نکلیں؟“ [۱]

خواتین کے لیے ایک اور پابندی یہ بھی تھی کہ میدان جنگ میں ان کی خدمت کا دائرہ اپنے خویش و اقارب اور عزیزوں کی حد تک محدود رہتا تھا۔ وہ حتی الوسع خلط ملط ہونے سے پرہیز کرتی تھیں۔ پھر وہ اپنے محرم بزرگوں کی اجازت سے اور پھر انہی کے ہمراہ آتی جاتی تھیں۔

تجزیہ:

ظاہر بات ہے کہ ایسے موقعوں پر حجاب کی پابندیاں کچھ نرم ہو جاتی ہیں، چہرہ اور ہاتھ ضرورت کے مطابق کھل جائیں تو مضائقہ نہیں مگر جو نہی حالات نارمل ہوں حجاب کو فوراً اپنی اصل حدود پر واپس آ جانا چاہیے۔ جیسے اضطراری کیفیت میں حرام کا استعمال بقدرِ رسدِ رفق جائز ہے مگر ضرورت ختم ہوتے ہی وہ حرام ہو جائے گا، اسی طرح جنگ ختم ہوتے ہی وہ چند عورتیں جو محاذِ جنگ پر گئی تھیں، اپنے اصل محاذ یعنی گھر کو سنبھال لیں گی اور پہلے کی طرح حجاب کی پابندی کرنے لگیں گی۔

بحث ختم کرنے سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ خود آنحضورؐ جب صحابیات سے (جو اس امت کی بہترین اور صالح ترین خواتین تھیں) بیعت لیتے تو آپؐ عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتے تھے بلکہ ایک پیالہ میں پانی ڈال کر سامنے رکھ لیتے۔ خواتین اسی میں ہاتھ ڈالتی جاتیں، آپؐ بھی اس میں ہاتھ ڈالتے۔ بس اسی کو خواتین کی بیعت فرمایا: آپؐ نے فرمایا: ”میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کیا کرتا۔“ [۱] جب خود رسول اللہؐ اتنے محتاط ہیں تو پھر ہم جیسی خواتین کے لیے مردوزن کے آزادانہ اختلاط، خواتین کے سیر سپاٹے اور بازاروں میں شاپنگ کی گنجائش کہاں سے نکلتی ہے؟

[۱] موطا امام مالک: 982/2؛ مسند امام احمد: 357/6

پردے کے لیے عقلی دلائل

بے پردگی اور آزادی نسواں کے بارے میں علامہ اقبال کا نقطہ نظر:

آزادی نسواں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ایک مرتبہ مفکر پاکستان ڈاکٹر علامہ اقبال نے فرمایا: ”جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی، وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی غلطی پر پشیمان ہوئی ہے۔ عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عاید کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ اگر اسے اس کے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگا دیا جائے جو مرد ہی انجام دے سکتا ہے تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا، مثلاً عورت کو، جس کا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے، ٹائپسٹ یا کلرک بنادینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی معاشرہ کو درہم برہم کرنے کی افسوس ناک کوشش بھی ہے۔“ [۱] ”علامہ اقبال کا اپنا عمل بھی اسی کے مطابق تھا مثلاً [۲] فقیر سید وحید الدین آگے چل کر ”شمع خانہ یا شمع محفل“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

”ڈاکٹر محمد اقبال اور سید امجد علی انگلستان میں مقیم تھے، ایک دن ڈاکٹر صاحب لندن کی مشہور دکان ”سیلف“ پر ضرورت کی چیزیں خریدنے گئے اور سیلز گرل کو جرابیں دکھانے کو کہا، وہ لڑکی تیزی کے ساتھ سامان لینے چلی گئی۔ جب واپس آئی تو ڈاکٹر صاحب پر استغراق کی کیفیت طاری ہو چکی تھی، وہ یہ بھی بھول گئے کہ یہاں کیوں آئے ہیں، کہاں کھڑے ہیں اور لڑکی کو کیا آرڈر دیا تھا؟ سیلز گرل جب یہ چیزیں لے کر ان کے سامنے پہنچی تو ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا:

[۱] روزگار فقیر، صفحہ 66

[۲] علامہ کو حکومت کی طرف سے لارڈ ولنگٹن کے عہد میں سفیر بنا کر جنوبی افریقہ بھیجنے کی پیشکش کی گئی۔ شرط یہ تھی کہ ان کی بیگم تمام سرکاری محفلوں میں شرکت کیا کرے گی۔ علامہ اقبال نے پیشکش واپس کر دی مگر بیوی کو بے پردہ کرنا منظور نہ کیا۔ خود علامہ اقبال کا عمل بھی اس کے مطابق تھا۔

”تم یہاں کس لیے کھڑی ہو؟“ لڑکی یہ سن کر آبدیدہ ہو گئی۔ ڈاکٹر اقبال کی باتوں میں اسے غمخواری اور ہمدردی کی جھلک نظر آئی، اور غمخوار و ہمدرد کے سامنے ہر کوئی اپنا دکھ درد بیان کرنے کے لیے بے تاب رہتا ہے، لڑکی بولی: ”میرے والدین کی آمدنی بہت ہی کم ہے، اس لیے مجھے اپنی اور اپنے گھر کی کفالت کے لیے نوکری کرنا پڑتی ہے۔ آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: ”اس خاتون کو تو کسی گھر کی روشنی بننا تھا۔ اولاد کی صحیح تربیت کا فرض انجام دینا تھا، اس کی تخلیق کا مقصد بازار کی رونق بن کر جرابیں فروخت کرنا تو نہ تھا۔۔۔“ [۱]

اگر علامہ اقبال پاکستان میں کام کرنے والی آج کی ماڈل گرلز کو کمانے کی خاطر مختلف پوز بنانا کر ماڈلنگ کرتے دیکھتے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی؟ بہر حال اس مسلمان قوم کا منصب کیا تھا اور اب یہ کس طرح تحت الثریٰ تک پہنچ چکی ہے، ساڑھے تیرہ سو سال تک عورت پردہ کے اندر تھی، اسلامی حدود و قیود کی پابند تھی تو اس کو ایسی کوئی مجبوری لاحق نہ تھی۔ افسوس آج اس کو کیسی بھیا تک اور خوفناک قسم کی مجبوریاں یکدم لاحق ہو گئی ہیں اور ابھی یہ نوبت خدا معلوم کہاں تک پہنچے گی؟

۔ محو حیرت ہوں یہ مسلم عورت کیا سے کیا ہو جائے گی؟

پردہ قدیم اقوام میں بھی رائج تھا:

یونانی تہذیب میں پردے کا مکمل رواج تھا۔ اسی طرح روم میں بھی تھا۔ خود عرب میں بھی پردے کی پابندی موجود تھی، حمیری بادشاہ مدتوں تک چہرے پر نقاب ڈالتے رہے۔ خود کئی عباسی خلفاء بھی پردے کی اوٹ سے احکام صادر کیا کرتے تھے۔

”یونان میں تو پردے کا یہ عالم تھا کہ دو ہزار سال تک ایکٹنگ خاص مردوں تک محدود رہی۔ قدیم دور میں عورت کبھی سٹیج پر آ کر کام نہ کرتی تھی۔۔۔ کامیڈی اور ٹریجڈی ہر قسم کے سٹیج ڈراموں میں لڑکے ہی لڑکیوں کا پارٹ ادا کیا کرتے۔۔۔ خود شیکسپیر کے تمام ڈراموں میں بھی لڑکیوں کے کردار لڑکوں نے ہی ادا کیے۔

اس دور میں ڈاکٹر اپنے کمرے میں پتلے رکھتے، مریضہ عورت اس پتلے پر انگلی رکھ کر اپنی

تکلیف کی جگہ بتاتی۔ پھر ڈاکٹر کپڑے کے اوپر سے مریضہ کے جسم پر ہاتھ لگا کر دیکھتا، یہ بھی مریضہ کے شوہر یا اس کی ماں کے سامنے ہوتا۔ کسی عورت کا اکیلے ڈاکٹر کے پاس جانا بے شرمی سمجھا جاتا تھا۔^[۱]

بے پردگی کے نقصانات:

نبی پاک کا فرمان ہے: ”عورت پردے کی چیز ہے۔ جب یہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا رہتا ہے۔“^[۲]

حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”دنیا شیریں اور ہری بھری ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں حاکم بنانے والا ہے۔ پھر وہ دیکھے گا کہ تم اس میں کیسے عمل کرتے ہو؟ پس دنیا (میں محو ہو جانے) سے بچو اور عورتوں سے بچو کیونکہ بنو اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں سے شروع ہوا تھا۔“^[۳]

یہاں عورتوں سے بچنے کی ہدایت دینے سے یہ مراد نہیں کہ رہبانیت اختیار کر لی جائے کیونکہ نکاح کو تو شریعت نے آدھا دین قرار دیا ہے اور اس سے بلا وجہ گریز کو سخت برا سمجھا گیا ہے۔ یہاں عورت سے بچنے کی ہدایت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کو اپنے اعصاب پر سوار کر لینے اور ان کے معاملے میں غیر شرعی طرز عمل اختیار کرنے سے بچا جائے، کیونکہ اس سے انجام کار قوم تباہی کے گڑھے میں جا گرتی ہے۔ بسا اوقات تاریخ میں عورتوں کی وجہ سے بڑی بڑی جنگیں ہوئیں۔ خود تاریخ اسلام میں ایسے واقعات اکثر ہوئے کہ غیر مسلم خواتین نے مسلمان ذمہ داروں کو بیوقوف بنا کر دین اسلام اور اسلامی مملکت کو زبردست نقصان پہنچایا۔ جن کے اعصاب پر نامحرم عورتیں سوار ہوں، ان کا معاملہ ان کی ذاتی عیاشی تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی

ڈاکٹر چرڈ لیون سائن

A HISTORY OF SEXUAL CUSTOMS, BY: DR LEWIN SOHN
M.D PAGE:286

مصنف ابن ابی شیبہ: 270؛ صحیح مسلم: 1021؛ سنن ترمذی: 1173

صحیح مسلم: 2742؛ ترمذی: 2191

ستر و حجاب کے احکام

محبوب عورتوں کے اشاروں پر ناچتے ہوئے اپنی حقیر اور ناپاک خواہشوں کے عوض ملک و ملت کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

لہذا اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ محرم اور غیر محرم عورتوں کی تمیز رکھو۔ پھر محرم عورتوں کو بھی اپنے اعصاب پر اتنا سوار نہ کر لو کہ ان کے ہاتھوں میں کھلونے بن جاؤ اور نیکی، بدی کی پہچان، ہنر بھول جاؤ، دین اور ایمان، ملک و ملت اور معاشرہ و خاندان کے لیے ضرر رساں بن جاؤ۔ دوسری طرف دوسرے متعلقین کے حقوق ادا کرنے سے غافل ہو جاؤ اور بے گناہوں پر ظلم کرنے میں دلیر ہو جاؤ۔

پردہ کا حکم واجب الادا ہے۔ یہ نص قرآنی ہے۔ اس کو ترک کرنا اتنا ہی بڑا گناہ ہے جس طرح نماز نہ پڑھنا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا وغیرہ۔ اگر نماز و زکوٰۃ قرآن پاک کے حکم ہیں تو یہ بھی قرآن پاک ہی کا تاکیدی حکم ہے بلکہ اسلام کے معاشرتی نظام کی اساس ہے۔ جس طرح اسلام کے مالی نظام میں سود حرام ہے، اسی طرح معاشرتی نظام میں بے پردگی حرام ہے۔ کیونکہ یہ اپنے جلو میں بہت سے مفاسد لے کر آتی ہے، پہلے بے حجابی پھر فیشن پرستی، پھر بے باکی و شوخ نگاہی اور پھر عریانی و بے حیائی وغیرہ۔

بے حیائی کے مہلک نتائج تارتخ کی روشنی میں

دنیا میں کفر و شرک سے بڑھ کر بے حیائی مہلک ہے۔ کسی پیغمبر کی بیوی بے حیاء نہ تھی اگرچہ مشرک کئی گزری ہیں۔ شیطان بھی اس نکتے کو بخوبی سمجھتا ہے لہذا:

- (1) حضرت آدم و حوا سے جو گناہ کروایا اس کے نتیجہ میں وہ بے ستر ہو گئے۔
- (2) حضرت لوط کی قوم پر اسی بے حیائی کی بنا پر پتھر برسائے گئے اور وہ نیست و نابود کر دیئے گئے۔
- (3) یونانی تہذیب بڑے عروج پر تھی، آخر ان میں بے حیائی پھیلی اور یہی ان کے زوال کا باعث بنی۔

- (4) رومی تہذیب نے بہت ترقی کی، مگر اسے بھی بے حیائی نکل گئی۔

(5) فلورا کے نام پہ ان میں بے حیائی کے میلے لگتے تھے۔ یہ ان میں سب سے زیادہ بے حیا عورت تھی، جو ننھی رہا کرتی تھی۔

(6) ظہور اسلام کے وقت بھی یہی بے حیائی عروج پر تھی۔ مرد، عورتیں حمام میں اکٹھے ہو کر ننگے نہاتے، خانہ کعبہ کا طواف ننگے کرتے۔

(7) 37ھ میں جب مسلمانوں نے بیت المقدس پر حملہ کیا، تو عیسائیوں نے دورویہ خوبصورت عورتیں کھڑی کر دیں کہ اگر مسلمانوں نے ان پر نظر اٹھا کر دیکھ لیا تو ہم سمجھ جائیں گے کہ یہ ہم سے بیت المقدس نہیں لے سکتے، لیکن اگر مسلمان فوج نے ان کو نہ دیکھا تو ہم اس کا یہ مطلب لیں گے کہ ان کا بیت المقدس پر قبضہ ہونا لازمی ہے لہذا ہم ان کو چابیاں دے دیں گے۔ چنانچہ جب مسلم فوج وہاں سے گزری تو ایک فوجی نے بھی ان پر نگاہ غلط انداز نہ ڈالی تو ان کے پادری چابیاں مسلمانوں کے حوالے کرنے پر راضی ہو گئے۔

(8) 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بھی اسرائیل نے یہی چال چلی، رات کو مصر، اردن اور شام تینوں ملکوں کے جرنیلوں کو ہر طرح سے امن و امان کا یقین دلایا، خود ان کا ایک وزیر ان جرنیلوں کے ساتھ رات کو دادِ عیش دیتا رہا۔ اس طرح ان کو غافل رکھ کر اسرائیلی فوج نے حملہ کر دیا۔ تینوں مقامات پر رات کو جرنیلوں نے خوب دادِ عیش دی، رات شباب و کباب میں گزاری۔ صبح نشہ میں مست پڑے تھے کہ یکدم اسرائیلی فضائیہ نے ان تینوں فوجوں پر بمباری شروع کر دی اور تینوں ملکوں کے کافی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح خود اسرائیل کا رقبہ پہلے سے دوگنا ہو گیا علاوہ ازیں بیت المقدس پر بھی اس کا قبضہ محکم ہو گیا۔

(9) قاہرہ کانفرنس اور پھر اس سے اگلے سال بیجنگ کانفرنس بھی مسلمانوں میں بے حیائی پھیلانے ہی کی سازشیں ہیں، مسلمانوں کے اندر کنڈوم کلچر، ہم جنس پرستی، سکولوں کے معصوم بچوں میں جنسی تعلیم کا باقاعدہ آغاز وغیرہ، یہ عالم اسلام کے خلاف بڑی گہری صیہونی سازشیں ہیں۔

بے پردگی کے نتائج تاریخ کی روشنی میں:

انیسویں صدی کے انسائیکلو پیڈیا میں مذکور ہے: ”رومیوں کی خواتین خانہ داری کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سوت کاتیں، اس کو صاف کر کے اس کے کپڑے بناتیں۔ وہ سخت پردہ کرتی تھیں، حتیٰ کہ جو عورت دایہ گیری کا کام کرتی تھی وہ بھی گھر سے نکلتے وقت بھاری نقاب سے اپنا چہرہ چھپاتی۔ اس کے اوپر موٹی چادر اوڑھتی جو ایڑی تک لٹکتی رہتی۔ پھر اس چادر پر بھی ایک اور عبا اوڑھتی جس کے سبب اس کی شکل تو کیا اس کے جسم کی بناوٹ بھی پتہ لگانا مشکل ہوتا۔“ [۱]

اس دور میں رومی تمام شعبہ ہائے زندگی میں بھی ترقی پذیر تھے۔ پھر جب ان میں عیش پرستی اور لہو و لعب کا شوق پیدا ہوا تو انہوں نے عورتوں کو بھی بے پردہ کر دیا۔ کچھ ہی دنوں میں عورتیں شمع محفل بننے لگیں، پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ عظیم الشان حکومت تباہ و برباد ہو گئی اور اس تباہی کا بڑا سبب عورتوں کی آزادی تھی۔ تاریخ کی روشنی میں علامہ فرید وجدی تحریر کرتے ہیں: ”پھر جب ان عورتوں کو بے پردہ بنایا گیا تو بشری تقاضے کی بنا پر مردان پر مائل ہونے لگے۔ ان کے لیے آپس میں کٹنا مرنا شروع ہو گئے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو ماننے میں کوئی شخص بحث نہیں کر سکتا۔“ [۲]

عورت میں حیا کی کمی۔۔۔ دشمن کی کامیابی:

ایک ماہر نفسیات لکھتے ہیں: ”حقیقت یہ ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک زوال پذیر نہیں ہوتی جب تک اس کی عورتیں زیور حیا سے مزین اور اس کے مرد شمشیر غیرت سے مسلح ہوں۔ عورت میں حیا اور مرد میں غیرت دو ایسی خصوصیات ہیں جن کی اساس ماحول اور معاشرے پر نہیں انسانی جبلت پر ہے۔ جب تک گمراہ کن تصورات اور ترغیب و تحریص سے ان کی فطرت

[۱] اسلام کا نظام عفت و عصمت، از: مولانا ظفر الدین، ص 328 بحوالہ علامہ لوئس پیرول کا مضمون ”ریویو

آف ریویوز“ ج 11، مضمون ”پولیٹیکل فساد“

[۲] ایضاً، صفحہ 326، 327

بالکل مسخ کر کے نہ رکھ دی جائے، مرد بے غیرت اور عورت بے حیا نہیں ہوتی۔ کوئی مرد اپنی بیوی، بہن یا بیٹی کو کسی نامحرم کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پا کر اشتعال میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دوسری طرف مردانہ جارحیت سے اپنی عفت و عصمت کا تحفظ نسوانی جبلت ہے۔ چھپنا، چھپانا، شرمانا، بلش کرنا، جھپینا جنہیں بعض مغربی ماہرین نے محض ناز و ادا اور غمزہ و عشوہ قرار دے کر ان کی اہمیت گرانے اور شرم و حیا کی جڑ کاٹنے کی کوشش کی ہے، درحقیقت بنیادی نسوانی اوصاف ہیں، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کوئی عورت سوائے طوائف کے جنسی پیش قدمی نہیں کرتی۔“ [۱]

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ عصمت مآب بیبیوں نے حفظ ناموس کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے اور عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی، مگر جب مرد غیرت سے اور پھر عورتیں حیا سے محروم ہو جائیں تو پھر شکست و ذلت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔۔۔ مرد جب مار کھاتا ہے، اپنے ہی گھر سے کھاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دشمن کسی قوم کی بہو بیٹیوں کو حیا سوز افعال و کردار کی ترغیب دیتا ہے تاکہ شرم و حیا نام کی کوئی چیز ان کے دامن میں نہ رہے۔ پھر جب عورتیں بے حیا ہو جائیں اور مرد بے غیرت تو پھر اقوام اپنے دفاع سے غافل ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ کامیاب جنگیں وہی رہیں جو اپنی خواتین کے ناموس کی حفاظت کی خاطر لڑی گئیں۔ جب تک مردوں میں اپنی خواتین کے لیے غیرت موجود رہی اور عورتوں میں حیا و وقار کی حفاظت کا جذبہ بیدار رہا، اس قوم پر کوئی غیر حکومت نہ کر سکا۔ اسی لیے علامہ اقبال نے لکھا ہے۔

نسوانیتِ زن کا نگہاں ہے فقط مرد

قیمتی متاع کی حفاظت:

لوگ اپنے سامان، کپڑے، زیور غرض ہر چیز کی حفاظت کا پورا بندوبست کرتے ہیں۔ گھروں کو تالے لگاتے ہیں، زیورات بنکوں میں رکھتے ہیں، گھروں پر چوکیداروں اور کتوں کا بندوبست کرتے ہیں تو کیا خاتون جو بیٹی ہے، ماں ہے، بہن ہے، بیوی ہے، کے حسن کی حفاظت کا بندوبست کرنا ضروری نہیں؟ عفت و عصمت انسان کی قیمتی متاع ہے۔ شرم و حیا انسان کا قیمتی

[۱] تلخیص از: عورت کی نفسیات، صفحہ 133'132 از: ایس۔ ایم۔ اے ملک

زیور ہے۔ اپنے اس قیمتی سامان کی حفاظت کرنا ضروری نہیں؟ اپنی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو اوباشوں کی نگاہوں سے بچانا ضروری نہیں ہے؟ جس کی معمولی سی خیانت بھی دلوں کے امن، چین اور سکون کو تباہ کر دے گی، گھر کو برباد کر دے گی، بچوں کی پریشانیوں میں اضافہ کر دے گی۔ افسوس ہے ان مردوں پر جو اپنی عورتوں کو خود بے پردہ دیکھنا چاہتے ہیں، پردہ کا اہتمام کرنے والوں کا مذاق اڑاتے اور ان کو رجعت پسند کہتے ہیں، دیندار لوگوں کو مشورے دیتے ہیں کہ زمانہ کے ساتھ چلو، وقت کے تقاضوں کو پیچانو، اس طرح علماء اور مثلاً کا مذاق اڑاتے ہیں! حالانکہ یہ جو کچھ فیشن کے نام پر کرتے ہیں، سب پرانے رواج ہیں۔ مثلاً اونچی ایڑی کی جوتی کا رواج بنی اسرائیل کی خواتین میں موجود تھا۔ ساڑھی پانچ ہزار سالہ پرانا لباس ہے جب انسان کو ابھی سینا نہیں آتا تھا، اس وقت کپڑے کو اسی طرح عورتیں لپیٹ لیتی تھیں، سندھی لباس بھی کئی ہزار سال پرانا لباس ہے، مگر پہن کر عورتیں غرور سے اچھلتی پھرتی ہیں کہ ہم نے جدید ترین فیشن اختیار کر لیا ہے۔ مگر اللہ اور اس کا رسولؐ تو تکبر اور شیخی کے لباس کو سخت ناپسند فرماتے ہیں۔ اسی طرح وہ بے پردہ رہ کر ماڈرن اور تہذیب یافتہ کہلانا پسند کرتی ہیں۔ حضرت فاطمہؓ اور حضرت عائشہؓ کا پردہ مشہور ہے، اب جو خواتین اللہ کے حکم حجاب اور ان صحابیاتؓ کے فعل کو برا سمجھتی ہیں تو کیا وہ اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتی ہیں؟ جہنم کی آگ سے ڈرنا چاہیے کہ وہ بہت سخت عذاب ہے۔

مولانا مودودیؒ رقمطراز ہیں: ”آج ملک کی ترقی کا مفہوم صرف معاشی پیداوار کی ترقی سمجھ لیا گیا ہے۔ اس کے لیے عورتوں اور مردوں سب کو لا کر معاشی میدان میں کھڑا کر دیا گیا ہے، حالانکہ ترقی، صرف معاشی پیداوار بڑھانے کا نام نہیں ہے۔ اگر عورتیں گھروں میں بیٹھ کر نئی نسل کو تربیت دیں، انھیں انسانی اقدار سے باخبر کریں، ان کے اندر اعلیٰ اخلاق اور خدا پرستی پیدا کرنے کی کوشش کریں تو یہ بھی ترقی کا ایک اہم ذریعہ ہے، ملک کی ترقی کا صرف یہی ایک ذریعہ نہیں ہے کہ مرد بھی کارخانوں میں کام کریں اور عورتیں بھی کارخانوں میں کام کریں، ترقی کا یہ بھی ایک ذریعہ ہے کہ گھروں میں بچوں کو انسانیت کی تربیت دے کر تیار کیا جائے تاکہ وہ دنیا میں انسانیت کے راہنما بن سکیں۔“ [۱]

باپردہ خواتین عملی میدان میں:

”ڈاکٹر خدیجہ فیروز الدین نے اپنی ملازمت کی ابتداء مدراس میں بطور ٹیچر سے کی۔ پھر ہیڈ مسٹریس بنیں۔ بعد ازاں انسپکٹر آف سکولز، پھر گورنمنٹ گرل کالج، امرتسر کی پرنسپل بنیں۔ آپ نے ساری مدت ملازمت میں طبقہ نسواں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا۔ جس شہر میں بھی ان کا تقرر ہوا، انہوں نے وہاں اس شہر کی خواتین کے لیے اجتماعات کا اہتمام کیا، خواتین کو اپنی حالت سدھارنے، فضول رسم و رواج ترک کرنے اور اسلامی عقائد، اسلامی اصول و ارکان کی پیروی کرنے کی تلقین کی۔ وہ ہمیشہ پاؤں میں جرابیں اور ہاتھوں میں دستانے پہنے رہتی تھیں اور باپردہ تھیں۔ ان کی زندگی واضح ثبوت ہے کہ عورت پردہ کے ساتھ بھی باہر نکل کر عورتوں کی فلاح و بہبود کے کام کر سکتی ہے۔“ [i]

آج کل پردہ تعلیمی اداروں اور خصوصاً جامعات میں اجنبی اور غیر مانوس نہیں رہا، بہت سی طالبات یونیورسٹیوں میں حجاب کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ دراصل یہ اعتراض کہ اس سے عورت کو گھر سے باہر ملازمت یا دیگر فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، مشاہدے کے برعکس ہے۔ خواتین لیڈی ڈاکٹرز پردہ کے ساتھ آپریشن کر رہی ہیں۔ خواتین پردہ کے ساتھ وکالت، ٹائپنگ وغیرہ جیسے فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ بہت سی ڈاکٹرز، وکیل اور جج خواتین باپردہ بھی ہیں اور قابلیت کا لوہا منوا چکی ہیں۔

گزشتہ دنوں ایک باپردہ پائلٹ خاتون کیپٹن شہناز لغاری صاحبہ نے تو باپردہ خواتین کی ایک انجمن بھی بنائی تھی۔ جس کا نام ہے: ”انٹرنیشنل ویمن حجاب تحریک“ وہ خود اس تحریک کی چیف آرگنائزر ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ”پاکستان ویمن پائلٹ ایسوسی ایشن“ کی بھی چیئر پرسن ہیں۔ خود فیلڈ میں باپردہ کام کرتی ہیں۔ کمرشل پائلٹ ہیں اور خواتین میں حجاب کو فروغ دینے میں بہت کوشاں ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ پردہ تعلیم میں رکاوٹ نہیں بلکہ معاون اور مددگار ہے۔ جب کہ بے

پردگی حصولِ تعلیم میں رکاوٹ ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوتا ہے کہ جو شخص اپنی نگاہ کو پاک رکھے تو حق تعالیٰ اس کے قلب و ذہن کو علم اور معرفت عطا فرمائیں گے جو اسے پہلے حاصل نہ تھی۔ گویا علم کی ترقی تو اخلاقِ فاضلہ، حیا، پاکدامنی اور تقویٰ و طہارت سے عبارت ہوتی ہے اور یہ چیزیں پردہ سے حاصل ہوتی ہیں۔

امام شافعی کا ایک حکیمانہ شعر ہے۔

شکوٰۃ الی وَ کِیِّعِ سوءِ حفظی
فَدَلَّنِی عَلٰی تَرْکِ الْمَعَاصِی
فَإِنَّ الْعِلْمَ نَوْرٌ مِنْ آلِهِ
وَنُورُ اللَّهِ لَا يُعْطٰی لِعَاصِی

”میں نے اپنے استاد امام وکیع سے کمزوری حافظہ کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ گناہ چھوڑ دو کیونکہ علم تو انوارِ الہی میں سے ایک نور ہے اور اللہ کا نور گناہ گاروں کو نہیں ملا کرتا۔“

مغرب میں خواتین میں اسلام تیزی سے مقبول ہو رہا ہے۔ فرانس، جرمنی، امریکہ، برطانیہ وغیرہ میں خواتین کی کثیر تعداد مغربی دنیا میں عورت کی تذلیل کو دیکھ کر اسلام کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ وہ برضا و رغبت پردہ اور حجاب کے احکام اپنے اوپر لاگو کرتی ہیں اور پردہ کو ایک عظیم نعمت سمجھتی ہیں۔ بلکہ بیشتر مغربی خواتین پردے ہی کی نعمت کے باعث حلقہٴ بغوشِ اسلام ہوئیں۔ ان میں سے ایک نو مسلم خاتون جو جاپان سے تعلق رکھتی ہیں، ”خولہ لکاتا“ انہوں نے پردے کے بارے میں اپنے تاثرات ایک مضمون ”حجاب کے اندر“ بیان کیے۔ جس میں حجاب کے گرانقدر فوائدِ خصوصی طور پر بیان کیے ہیں۔

عفت و پاکدامنی کے فوائد:

کسی بھی شخص کی عفت اور پاکدامنی کا معاملہ صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کے دور رس سماجی اثرات ہیں۔ مرد و عورت دونوں کے لیے ایک دوسرے میں کشش اس لیے رکھ دی گئی ہے کہ وہ مل کر انس و محبت کی زندگی گزار سکیں۔ پھر وہ دونوں افراد حصارِ نکاح میں آنے

کے بعد اس تعلق کو پائیدار بناتے ہیں تاکہ خانگی زندگی کو استحکام حاصل ہو۔ اس طرح ان کی زندگی یکسو ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی تمام قوتیں اور صلاحیتیں ایک مخصوص دائرے میں لگا دیتے ہیں تاکہ اپنے درخت کے پھل سے خود ہی فائدہ اٹھا سکیں۔ وہ اپنی اس قوت و صلاحیت میں نہ تو کسی اور کو شریک کرتے ہیں اور نہ ہی دلچسپیاں اس دائرے سے باہر صرف کرتے ہیں۔ پھر جس طرح ان کی اپنی زندگی اصولوں پر گزرتی ہے، اسی اصول پرستی سے وہ اپنی اگلی نسل کو بھی روشناس کرا سکتے ہیں۔ معاشرہ بھی پھر سکون کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ ملکی تعمیر و ترقی کے کاموں کے لیے یہ خاندانی استحکام اور معاشرتی سکون بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مخالفین پردہ کی سرگرمیاں:

مگر ہمارا یہ سکون و اطمینان، ہمارا یہ خاندانی نظام، یہ معاشرتی استحکام ان مغرب زدہ لوگوں کو نہیں بھاتا، وہ دن رات عورت کی مظلومی کا رونا روتے ہیں کہ اس کو گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا گیا ہے۔ وہ مردوں کے تشدد کا شکار ہے بدترین غلامی کی زندگی گزار رہی ہے۔ لہذا اسے باہر نکالو۔ وہ باہر کی آزاد فضا میں سانس لے، اس میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ دراصل وہ اپنی عیاشی کی خاطر عورتوں کو گھروں سے باہر نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ اباحت پسندی اور معاشرتی انار کی پھیلا نا چاہتے ہیں۔

مصر کے ایک غیر مسلم ادیب سلامہ موسیٰ کی تحریریں اسلام دشمنی کا نمونہ تھیں۔ وہ اپنے ہفتہ وار جریدہ کے ذریعہ سے مسلمان عورتوں کو بار بار ترغیب دلاتا: ”اپنی بوسیدہ روایات توڑ پھینکو اور گھروں سے باہر نکلو۔ جرات و حوصلہ کے ساتھ مردوں سے ملو جلو۔ کارخانوں اور دفاتروں میں ملازمتیں سنبھال لو۔ یہ سب کچھ تمہیں اس لیے نہیں کرنا کہ تمہیں ان کاموں کے انجام دینے کی کوئی حقیقی ضرورت درپیش ہے، بلکہ اس لیے کہ تم ان ذمہ داریوں سے بچ سکو جو نسل انسانی کی ماں کی حیثیت سے تم پر ڈالی گئیں ہیں۔۔۔ سڑک پر سے گزرتے ہوئے جو عورت نظر نیچی کر کے چلتی ہے، وہ دراصل جرات و خود اعتمادی سے محروم اور مردوں کے خوف میں مبتلا ہوتی ہے۔ مگر جب تجربے کے بعد اس میں روشن خیالی پیدا ہوگی تو اس کا خوف خود بخود ذائل ہو جائے گا اور پھر وہ جرات مندی سے صنف مخالف کا سامنا کرنے لگ جائے گی۔“

پاکستان کے ادیب اس انارکی میں مصری ادیب سے کچھ کم نہ رہے۔ اس طرح کی تحریروں، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ سے ہمارے ہاں بھی زبردستی بے پردگی پیدا کی گئی۔ تعلیمی اداروں میں مینا بازاروں، ورائٹی شوز اور ڈریس شوز کے اہتمام ہونے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پردہ رجعت پسندی کا نشان ٹھہرا، لباس چست ہونے لگے، جنسی آوارگی بڑھنے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہمارے ہاں کھلے چہروں، زرق برق لباسوں اور بناؤ سنگھار کا طوفان اٹھا ہے، اس وقت سے اخلاقی حادثات اور جرائم کا تناسب بڑھ گیا ہے۔

مستشرقین کے اعتراضات اور ان کی تقلید میں بعض ”مسلمان مستغربین“ کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کی ایک جھلک ہمیں ایک ترقی پسند مصنف مظہر الحق خاں کی کتاب ”پردہ اور تعددِ ازواج“ میں نظر آتی ہے، جس میں وہ لکھتا ہے (ص 107):

”حرم (پردہ) کا رواج خلیفہ ولید دوم کے عہد میں شروع ہوا۔ خلافت عباسیہ (عباسی خلفاء نقاب پہن کر دربار میں بیٹھتے) کے قیام کے بعد اس کا رواج اشرافیہ (بیگمات) سے پھیل کر متوسط بلکہ غریب طبقوں تک پہنچ گیا۔۔۔۔۔۔ اس نے عباسی دور کی عورت کو مغرور اور مجبور بنا دیا۔۔۔۔۔۔ ستم کے نفوذ، غیر محدود کثرتِ ازواج اور کنیزداشتگی کی وجہ سے مسلمان عورت کی ذلت اور رسوائی انتہا کو پہنچ گئی۔ اسے اپنے قریبداروں کی ملکیت اور مملوکہ سمجھا جانے لگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی عورت کے لیے باہر کی دنیا کے لیے کام کاج، سرگرمیوں اور تکیلات میں حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے نزدیک پردہ، برقع، حرم، زنان خانہ قسم کی چیزیں قرونِ اولیٰ یعنی عہدِ نبیؐ اور دورِ خلفاء راشدین میں نہیں تھیں بلکہ عباسی خلفاء کے دور میں شروع ہوئی تھیں۔“ (ایضاً، ص 103)

مگر ان اعتراضات کے جوابات خود مغربی دانشوروں سے سنیے کہ وہ کیا سوچتے ہیں۔

بعض مستشرقین کا اسلام کے عاکلی و تمدنی نظام کو خراجِ تحسین:

گستاخی بان رقمطراز ہے: ”لفظ ”حرم“ عربی میں عموماً ان تمام چیزوں پر مشتمل ہے جن کی حرمت کی جاتی ہے۔ یوں ”حرم“ سے مراد مکان کا وہ حصہ ہے جو بالکل الگ تھلگ اور فی الواقع

ہر مسلمان کی نظر میں محترم ہے یعنی عورتوں کی سکونت کا حصہ۔“ [۱] آگے چل کر وہ لکھتے ہیں: ”اہل یورپ عموماً حرم کو ایک مقام عیش و عشرت سمجھتے ہیں جہاں مصیبت زدہ قیدی عورتیں کاہلی کی زندگی بسر کرتی ہیں، لیکن یہ خیال بالکل خلاف واقع ہے کیونکہ مشرقی بیویوں کو (یورپی بیویوں کے برعکس، جو معاملات، جھگڑوں اور جسمانی تکالیف میں مبتلا ہیں) ماسوائے خانہ داری کے اور کوئی شغل نہیں اور یہی شغل ان کے لیے موزوں بھی ہے۔“ [۲]

تعدّدِ اِزواج کو مظہر الحق خاں تمام معاشرتی خرابیوں کی جڑ اور تذلیلِ انسانیت کی بنیاد سمجھتا ہے۔ مگر گستاوی بان اس کا بھی اعتراف کرتا ہے:

”یورپی مؤرخین سمجھتے ہیں کہ تعدّدِ اِزواج اسلام کے تمدنی نظام کی اساس ہے یہی دینِ اسلام کی اشاعت کا سبب بنا۔ پھر وہ اسی کو مشرقیوں کے تنزل کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ وہ اس طرح ان بد نصیب عورتوں کی نسبت بہت زیادہ واویلا مچاتے ہیں جو حرم کی دیواروں کے اندر بند اور مہیب خواجہ سراؤں کے پنجہ میں گرفتار ہیں، جو اپنے مالکوں کی ادنیٰ ناراضی پر بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دی جاتی ہیں۔ مگر یہ تصویر بالکل خلاف واقع ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس باب کے پڑھنے والے اگر تھوڑی دیر کے لیے اپنے یورپی تعصبات کو ایک طرف رکھ دیں تو وہ قائل ہو جائیں گے کہ مشرق کو تعدّدِ اِزواج کی رسم نے اخلاقی ترقی تک پہنچایا ہے اور ان کے خانگی تعلقات کو مستحکم بنایا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یورپی عورت کے مقابلے میں مشرقی عورت کا اعزاز و اکرام زیادہ ہے۔“ [۳]

موسیوڈے ایمس کے بقول ”شوہر اپنی بیوی کے ساتھ بڑی خوش خلقی سے پیش آتا تھا۔ کوئی مرد عورت سے مزدوری کروا کے اس کی کمائی نہیں لیتا تھا بلکہ مرد ہی عورت کو دیتا تھا، اور ماں کی عزت تو پرستش کی حد تک کی جاتی تھی۔“ [۴]

[۱] تمدن عرب، مترجم: سید علی بلگرامی، صفحہ 552

[۲] ایضاً، صفحہ 553

[۳] تمدن عرب، صفحہ 537

[۴] ایضاً، صفحہ 550

موسیو ایہیں لکھتا ہے کہ ہم انکار نہیں کر سکتے کہ عربوں کی خانگی زندگی کا مذاق بہت مفید اور اعلیٰ درجہ کا ہے۔ [۱]

پردہ کی مخالفت میں دلائل اور ان کے جوابات

مخالفین پردہ اپنے جو دلائل پیش کرتے ہیں، پردہ پر جو اعتراض جڑتے ہیں وہ (مع جواب) درج ذیل ہیں:

اعتراض نمبر 1

”اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمیں اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں پر اعتماد نہیں ہے، اس لیے ہم ان کو پردہ کا پابند کرتے ہیں۔“

جواب: حقیقت یہ ہے کہ پردہ کا سہارا لینے والی عورت بڑی عزت دار، باحیا اور غیرت والی ہے۔ وہ حملہ آور کے مقابلہ میں اپنے نفس کی حفاظت و قوی ہتھیاروں سے کرتی ہے۔ ایک تو فطری جذبہ شرم و حیا، دوم: اس کا ظاہری پردہ۔ حملہ آور اس کو با پردہ دیکھ کر اس کے دامنِ عفت کو ہاتھ لگانے کی جسارت بھی نہیں کر سکتے۔ میں خود برقع کے اندر محسوس کرتی ہوں کہ مردوں کی ہوسناک نگاہیں صرف میرے برقع تک ہی پہنچ سکتی ہیں، میرے لباس اور جسم تک نہیں پہنچ سکتیں، میرے چہرے کو نہیں دیکھ سکتیں۔ جب کہ اگر یہ برقع کا حصار نہ ہو تو ان کی نگاہیں براہِ راست میرے چہرے اور میرے جسم تک پہنچیں۔ مجھے تو برقع کا حصار بہت ہی مضبوط حصار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے اندر میں اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھتی ہوں۔

اعتراض نمبر 2

ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [۲]

[۱] تہذیب عرب، صفحہ 549

[۲] البقرہ: 185

کہ ”اللہ تعالیٰ تمہیں آسانی دینا چاہتا ہے اور تنگی نہیں دینا چاہتا۔“ مگر دوسری طرف تو پردہ کرنا تو بذاتِ خود بڑی مصیبت ہے لہذا شریعت کا مشا پردہ نہ کرنے سے پورا ہوتا ہے۔“

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ شروع شروع میں ہر کام مشکل ہوتا ہے، مگر جب انسان اس کو مسلسل کرتا رہے تو عادی ہونے کی وجہ سے وہ کام اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن پاک میں نماز کی مثال دی ہے:

﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ [۱]

”نماز پڑھنا بڑا مشکل ہے مگر اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے چنداں مشکل نہیں ہے۔“

بعینہ اللہ سے ڈرنے والی خواتین کی لیے پردہ ذرا مشکل نہیں ہے۔ فرض کیا یہ وقتی طور پر مصیبت بھی ہو تب بھی یہ بہت بڑی مصیبتوں سے نجات دلانے والی بھی تو ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اس مزاحمانہ کشمکش میں جو قدم پیچھے ہٹا وہ پھر ہٹتا ہی چلا جاتا ہے۔ لہذا وہ کوشش کے ساتھ اور گہرے شعور کے ساتھ پردہ کی پابندی کرتی ہیں۔

اعتراض نمبر 3

”پردہ صحت کے لیے مضر ہے۔ چونکہ حجاب سے فطری جذبات اندر ہی اندر سلگتے رہتے ہیں تو پھر موقع ملنے پر وہ زیادہ شدت کے ساتھ ابھرتے ہیں اور مزید بھیانک نتائج سامنے لاتے ہیں۔“

جواب: اگر واقعی پردہ صحت کے لیے مضر ہوتا تو پھر وہ مسلمان خواتین جو ساڑھے تیرہ صدیوں تک مسلسل پردہ کرتی رہی ہیں تو پھر ان عورتوں میں شرح اموات مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی اور ان میں بیماری وراثتاً چلتی رہتی، آنے والی نسلیں ان بیماریوں کا ضرور شکار ہوتیں، مگر یہ سب باتیں تاریخ اور مشاہدہ دونوں کے خلاف ہیں۔ علم الحیات (Biology) نے یہ تو ثابت کر دیا ہے کہ پردہ نشیں عورتوں کی اولاد بے پردہ عورتوں کے مقابلے میں زیادہ قوی الجشہ ہوتی ہے، اس

طرح دورِ حاضر میں مغرب و مشرق کے بدکاری و زنا کاری کے ریکارڈ اور شرح اموات کا مقابلہ و موازنہ بھی کر لیں! خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ اعصاب مشرقی عورتوں کے زیادہ کمزور ہیں یا مغربی عورتوں کے اور خود کشی کی شرح کدھر زیادہ ہے! پردہ دار ممالک میں یا بے پردگی کے شکار ممالک میں؟ حقیقت ہے کہ وہاں عشق و محبت سے ناکامی کی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں عورتیں خود کشی پر مجبور ہو جاتی ہیں۔

خود مغرب کے تجربات یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ بے حجابی اور مرد وزن کے اختلاط سے جنسی جذبات زیادہ بھڑکتے ہیں۔ زنا اور بدکاری عام ہوتی ہے۔ ان آزادانہ جنسی تعلقات کے نتیجے میں بے شمار جسمانی، دماغی اور اعصابی امراض پھیل رہے ہیں، جن سے مغربی تہذیب کی چولیں اہل چکی ہیں۔ کیا ایڈز کا مرض کسی ناگہانی آسمانی عذاب سے کم ہے؟ ان بھیانک نتائج کو دیکھنے کے بعد تو ہر سلیم الفطرت آدمی بے پردگی کو مذموم قرار دیتے ہوئے قانونِ حجاب کو زیادہ ضروری قرار دے گا۔ مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے علمِ کامل کی بنا پر اپنے بندوں کو یہ عظیم الشان قانون دے دیا ہے۔ اہل مغرب اپنے ہاں کے نتائج کو دیکھ کر اب خود عورتوں کو گھر بٹھانے کے لیے مجبور ہوتے جا رہے ہیں۔ اٹلی، جرمنی میں ”عورتیں گھروں کی طرف واپس ہوں، کی تحریک آج سے پچاس سال پہلے سے شروع ہو چکی ہے۔ روس میں 1987ء میں روسی صدر خردشیف نے کہا تھا کہ عورتیں اپنے چولہوں کی آگ جلائیں اور مرد محاذِ جنگ کی آگ جلائیں، یعنی عورتوں کو گھروں میں پابند کیا جائے۔ خود مغرب میں اب ایک نئی تحریک چل رہی ہے۔ جس کا نام ہے: ”FREEDOM IN HIJAB“ کہ ہمیں حجاب اور پردہ میں ہوسناک نگاہوں سے آزادی کی نعمت نصیب ہو رہی ہے۔

اعتراض نمبر 4

”پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟ اس سے ملک کئی نسلیں پیچھے چلا جائے گا۔“ (اگست 1982ء میں وفاقی حکومت کے شعبہ خواتین کی چیئر مین کا بیان جو اخباروں میں چھپا تھا) جواب: یہ بھی ایک مفروضہ ہے۔ مسلمان خواتین نے پردہ میں رہ کر جو عظیم الشان کارنامے انجام

دیئے ہیں، تاریخ کے صفحات ان کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔ خواتین کے کارنامے اپنی عظمت اور شان میں کسی طرح بھی مردوں سے کم نہیں ہیں، حضرت عائشہؓ کے علمی مرتبہ سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ایک تہائی دین ان کے ذریعے امت تک پہنچا ہے۔ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ حتیٰ کہ خلفائے راشدین تک اکثر کام میں ان سے مشورہ کرتے اور ان کے مشورے پر عمل بھی کیا جاتا۔ شفا بنت عبد اللہ کے سامنے بڑے بڑے علماء و محدثین نے زانوائے تلمذ طے کیا۔ کیا حضرت ام سلمہؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ، فاطمہؓ بنت خطابؓ، خنساءؓ نے اعلیٰ و ارفع مقام حاصل نہیں کیا تھا! ایک طرف وہ علم کی انتہائی حدوں تک پہنچیں دوسری طرف اپنے وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی رجحانات پر بھی اثر انداز ہوتی رہیں۔ پھر ان کی گودوں میں وہ لعل و جواہر پروان چڑھے، جنہوں نے تاریخ کو درخشاں و تابناک بنا دیا۔ ایسے بڑے بڑے مجاہدین، جرنیل، حکمران، آئمہ فن اور علماء ان کی تربیت سے پیدا ہوئے جن کے علمی اور تہذیبی احسانات سے دنیا آج تک فیض یاب ہو رہی ہے۔ اس طرح وہ پورے حجاب کے ساتھ ملی و قومی خدمات بجالاتی رہیں۔ لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

ہاں! اگر ترقی سے آپ کی مراد آج کے فنونِ لطیفہ کے نام پر عریانی، فحاشی اور رقص و موسیقی کی ترقی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پردہ اس ترقی کی راہ میں واقعی رکاوٹ ہے۔ ایک پردہ نشین مسلمان خاتون تو عفت و حیا، لطف و محبت اور اطاعت و وفا شعار جیسی اعلیٰ قدروں کی امین ہے۔ اسلام کا اس سلسلہ میں اپنا خاص نقطہ نظر ہے۔ اس کے نزدیک ترقی وہ ہے جو انسان میں اعلیٰ اخلاق پیدا کرے۔ لہذا وہ ترقی جن سے یہ قدریں پامال ہوں، اس کو اسلام ترقی تسلیم ہی نہیں کرتا۔ بے پردہ عورت چاہے عالمہ فاضلہ ہی کیوں نہ ہو مگر تعلقات کے لحاظ سے ضرور اس کی نگاہیں وسیع ہوتی ہیں۔ جونگا ہیں وسعت کی عادی ہو چکی ہیں، انھیں سمیٹ کر ایک مرکز پر لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

آج بہت سی خواتین ”فنونِ لطیفہ“ سے ہٹ کر واقعی علوم و فنون میں بھی ترقی کر رہی ہیں

اور علمی و تحقیقی خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف بے پردگی کی بنا پر ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکی ہیں، حالانکہ یہ ترقی بے پردگی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان کی محنت، جدوجہد اور خلوص و لگن سے کام کرنے کا نتیجہ ہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے کہ جو بھی خلوص اور لگن سے کام کرتا ہے ضرور پھل پاتا ہے۔ پھر باپردہ خواتین نے بھی بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ خدیجہ فیروز کا نام کون نہیں جانتا! باپردہ خواتین ڈرائیور بلکہ پائلٹ تک موجود ہیں۔

دراصل ترقی کا تعلق حجاب اور بے حجابی سے نہیں بلکہ ان سہولتوں سے ہے جو عورت کو ملتی ہیں۔ آپ باپردہ خواتین کو پوری سہولتیں مہیا کر دیں، وہ بے پردہ عورتوں کے مقابلے میں زیادہ یکسوئی سے کام کر سکتی ہیں اور زیادہ بہتر نتائج دے سکتی ہیں۔

آج تو ہماری خواتین کا مسئلہ ہی یہی ہے کہ ان کو مخلوط اداروں میں داخلہ لینا پڑتا ہے، جو اصل میں لڑکوں کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ اسی مردانہ نصاب اور مردانہ ماحول میں عورتوں کو پڑھنا پڑھتا ہے۔ اگر آپ مخلوط تعلیم کا خاتمہ کر دیں، خواتین کے لیے الگ یونیورسٹیاں ہوں، عورتوں کی ضرورت کے مطابق ان کے الگ نصاب ہوں تو یقیناً نہایت خوشگوار نتائج سامنے آئیں گے۔ آج امریکہ، بھارت، جاپان، روس، جرمنی وغیرہ میں خواتین کے اعلیٰ تعلیمی ادارے موجود ہیں..... تو یہاں وطن عزیز پاکستان میں کیوں نہیں بن سکتے! آخر ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے بڑی شان سے پوری دنیا پر حکومت کی ہے۔ اس دور میں مسلمان خواتین مکمل طور پر باپردہ ہوتی تھیں..... ان کے پردے نے مسلمانوں کی ترقی میں کوئی رکاوٹ ڈالی تھی؟

اعتراض نمبر 5

”بے پردگی میں عورت کی عزت ہے، آزادی ہے، جبکہ پردہ میں غلامی ہے“
جواب: یہ مخالفین حجاب کا استدلال تو ہو سکتا ہے کہ بے پردگی میں عورت کے لیے عزت ہے، آزادی ہے جبکہ پردہ میں غلامی ہے، مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ روس، چین، امریکہ و

یورپ میں عورت کو آزادی ہے، مگر اس طرح کہ اس کو قلی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ جو کبھی سڑکوں پر جھاڑ دیتی نظر آتی ہے، جو کبھی مردوں کی طرح بھاری بھاری بوجھ اٹھاتی، پتھر ڈھوتی اور دیگر مردانہ کام کرتی ہیں، اس طرح صنف نازک کی نزاکت کو ختم کر کے اسے دوہرے بوجھ اٹھانے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ وہ بچے جنے، ان کو پالے پوسے، ملازمت بھی کرے، بازار سے سودا سلف بھی لائے، حقیقت میں مردوں نے آزادی کا دھوکا دے کر عورتوں کو بیوقوف بنا دیا ہے۔ وہ دوہرا کام کرنے کے باوجود اس کو اپنے لیے عزت اور آزادی سمجھ رہی ہیں، کجاوہ رتبہ کہ عورت گھر بیٹھی رہے اور مرد کما کر اس کے ہاتھ پر آمدنی رکھ دے۔ وہ زمانے کے گرم دسر سے محفوظ گھر میں بیٹھی امن سے اپنی گھرداری چلاتی رہے، اور کجاوہ دور کہ مرد آرام سے گھر لیٹے ہوئے ہیں۔ بیوی بازار شاپنگ کے لیے گئی ہوئی ہے، اپنا سامان تو اس نے لانا ہی ہے میاں کی عینک، جوتی اور اس کے کپڑے بھی، گھر میں پکنے والی سبزی گوشت بھی عورت ہی لارہی ہے۔ یاد دفتر، کارخانے میں وہ کام کرنے گئی ہوئی ہے۔ بقول حسرت موہانی

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بے پردگی کے حامی کہتے ہیں کہ یورپ میں عورت کی بڑی عزت ہے وہاں اس کو سڑکوں پر کوئی نہیں چھیڑتا، حالانکہ یہ بالکل سفید جھوٹ ہے۔ مغربی ممالک میں بھی عورتوں پر اس طرح آوازے کسے جاتے ہیں، زور زور سے مرد سیٹیاں بجاتے اور چھیڑتے ہیں، وہاں شام کے اندھیرے کے بعد عورتوں کا گھروں سے نکلنا مشکل ہے۔ وہاں کی پولیس نے عورتوں پر حملہ کے ڈر سے ان کو ہدایت کر رکھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے پاس سیٹی رکھیں اور خطرہ کے وقت فوراً بجا دیں، تاکہ پولیس کا سپاہی ان کی مدد کو پہنچ سکے۔ پھر یہ جنسی جرائم اور تشدد ان ممالک میں اتنا زیادہ ہے، زنا بالجبر اور جنسی طور پر خوفزدہ کرنے کے واقعات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

لندن کے روزنامہ ڈیلی ٹیلی گراف (18 ستمبر 1978ء) کے مطابق ایک پولیس افسر

نے کہا: ”اب جنسی جرائم کے خاتمے کے لیے پھانسی اور دوسری سخت ترین سزائیں تجویز ہونی چاہئیں کیونکہ ان کے بغیر جنسی جرائم کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔“

جہاں تک عزت کا تعلق ہے، عزت تو خاوند کی خدمت کرنے والی گھر کی مالکہ خاتون مشرق ہی کو حاصل ہے، ملازمت کرنے والی تو ہر جگہ اپنے باس کو خوش کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہے۔ اس طرح یہ آزادی اس کے لیے بجائے رحمت کے زحمت بن جاتی ہے! بجائے عزت کے ذلت بن جاتی ہے۔

اعتراض نمبر 6

مخالفین پردہ کی ایک دلیل یہ ہے کہ ”شرم و حیا تو دل میں ہوتی ہے، آنکھوں میں ہوتی ہے۔ الحمد للہ! ہم میں وہ موجود ہے، پردہ سے تو ہم الٹا لوگوں کی لعنت ملامت کا نشانہ بنتے ہیں۔“

جواب: اہمات المؤمنین اور صحابیات رضوان اللہ علیہن اجمعین سے بڑھ کر آج کون سی خاتون پاکیزہ نفس اور باحیا ہو سکتی ہے، ان کو تو اللہ تعالیٰ نے پردہ سے مستثنیٰ نہ فرمایا، کیا نعوذ باللہ! ان کے دل میں حیا نہ تھی، آنکھوں میں شرم نہ تھی۔ ان کو تو یہ حکم ہوا کہ ”اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلوں کا کیا کریں تاکہ وہ پہچان لی جائیں (کہ وہ شریف خواتین ہیں) اور ان کو نہ ستایا جائے۔“ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حجاب چاہے وہ چادر کی شکل میں ہے یا برقع وغیرہ کی شکل میں، خواتین کی شرم و حیا اور شرافت کی پہچان ہے اور جو عورت پردہ میں نہیں ہے، وہ بہت جلد مردوں کی چھیڑ چھاڑ کا نشانہ بن سکتی ہیں بلکہ بنتی رہتی ہیں۔

اب آپ خود بتائیں کہ خواتین خود تو بن سنور کر گھر سے نکلیں اور مردوں پر پابندی لگائیں کہ وہ ہماری طرف نہ دیکھیں۔ حیا آپ کے بقول آپ کے دل میں تو ہے مگر آپ دوسروں کے دل پر تو پابندی نہیں لگا سکتے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ دوسروں کی چھیڑ چھاڑ کا گلہ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ڈھانپ لیں۔ آج کل جو فحاشی، اجتماعی زنا (GANG RAPE)، زنا بالجبر کے روز افزوں واقعات ہیں (ہر اخبار، رسالہ ان واقعات کا منہ بولتا ثبوت ہے) کیا وہ بے پردگی

کے ہی تلخ ثمرات نہیں! کیا یہ باپردہ خواتین کے ساتھ پیش آرہے ہیں یا بے پردہ خواتین کے ساتھ؟ یہ اتنے بیوٹی پارلرز، پاپ سنگنگ کے مراکز، میوزک سینٹرز کیوں بڑھتے جارہے ہیں؟ ہر عمل کی ایک روح ہوتی ہے اور ایک قالب، آپ کے کہنے کے مطابق پردہ کی روح تو دل کی شرم و حیا ہے جو آپ میں موجود ہے۔ لہذا پردہ کی کیا ضرورت؟ تو پھر کہنے دیجئے کہ نماز کی روح تو عاجزی و انکساری ہے۔ روزے کی اصل روح تقویٰ ہے۔ قربانی کا اصل مقصد جذبہ قربانی ہے، حج کا حقیقی مقصد ذہنی انقلاب ہے۔ تو کیا ان تمام عبادات کی ظاہری شکلوں کو ختم کر دیا جائے اور صرف ان کی روح کو دوسرے طریقوں سے حاصل کر لیا جائے؟ کیا نماز بغیر وضو کے اور رکوع و سجود کے، روزہ بغیر سحری و افطاری کے اور حج خانہ کعبہ کی زیارت و طواف کے بغیر درست تصور ہوگا؟ اگر نہیں ہو سکتا تو پھر شرم و حیا کا جذبہ چہرے اور جسم کو چھپائے بغیر کیسے نشوونما پاسکتا ہے! یاد رکھیں! یہی جواب دل کے پردے، آنکھ کی حیا اور نیت کی پاکیزگی کا مظہر ہے۔ بے شک اللہ ہماری نیتوں کو جانتا ہے، مگر نیک نیت ہونے کے ساتھ ساتھ نیک عمل ہونا بھی ضروری ہے۔ کیا یہی بات ہمارا سر شرم سے جھکا دینے کے لیے کافی نہیں کہ فرانس کی طالبات تو سکارف کی خاطر قانونی جنگ لڑیں، امریکی نو مسلم خواتین پردہ کی غرض سے پاکستان سے برقعوں کے نمونے منگوائیں جبکہ ہماری اپنی مسلمان بہنیں برقعوں سے جان چھڑانے کے لیے دل اور آنکھ کی حیا کے فلسفے پیش کرتی پھریں!

اعتراض نمبر 7

استعماری قوتوں کا یہ اعتراض بھی ہے کہ ”پردہ کی وجہ سے ہماری آدھی سے زیادہ آبادی گھروں میں بے کار پڑی ہے۔ جبکہ پاکستان جیسا غریب ملک اتنی بڑی آبادی کو بے کار چھوڑنے کا متحمل نہیں ہو سکتا لہذا عورت کا کسب معاش کرنا وقت کا تقاضا ہے۔“

جواب: عورت گھر میں رہ کر جو ذمہ داریاں سرانجام دیتی ہے یعنی گھرداری، شوہر کی خدمت، اگلی نسل کی تربیت، کیا یہ سب فضول کام ہیں اور اصل کام کمانا ہی ہے؟ اور کیا یہ واقعی ایک معقول بات

ہے؟ یورپ و امریکہ میں جنگِ عظیم کے موقع پر بہت سے مرد جنگ میں کام آگئے تو عورتوں کو آگے بڑھ کے کارخانے اور دفتر سنبھالنے پڑے۔ جب ان کو باہر کی دنیا میں کچھ آزادی ملی تو پھر انہوں نے از خود گھرداری، شوہر کی خدمت اور تربیتِ اطفال جیسے کاموں سے جان چھڑانا چاہی۔ پھر اس سے جو بھیا تک نتائج نکلے، اس سے کون واقف نہیں! حقیقت یہ ہے کہ خاندانی زندگی کا استحکام، افراد خانہ میں محبت و خلوص تبھی پیدا ہو سکتا ہے جب عورت گھر کے اندر رہے۔ معاشرہ تبھی مستحکم ہوگا جب معاشرہ کی بنیادی اکائی یعنی ”گھر“ مضبوط ہوگا۔

2 شوہر اپنے اپنے میدانِ کار میں اسی وقت صحیح کام سرانجام دے سکتے ہیں، جب ان کو یہ یقین ہو کہ گھر اور بچوں کو سنبھالنے والی میری بیوی گھر میں موجود ہے۔ اگر مرد اپنے گھر کی طرف سے ہی مطمئن نہ ہو تو وہ کوئی قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا۔ گویا مردوں کے بڑے بڑے اور عظیم الشان کارناموں کے پیچھے وہ سکون کام کر رہا ہے، جو گھر میں ان کو بیویاں مہیا کر رہی ہیں۔۔۔ کیا یہ معاشرہ کی خدمت نہیں، قوم کی تعمیر نہیں، کیا اس کا نام بے کاری ہے؟

3 بچوں کی پرورش، مناسب دیکھ بھال اور ان کی حسن تربیت عورت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ بچے کی خاطر عورت کو چوبیس گھنٹے کی بے لوث ڈیوٹی دینا پڑتی ہے۔ انسان سازی کوئی معمولی کام تو نہیں۔ جوتے بنانا، کپڑے بنانا، سیلز گرل بننا، ڈرائیور، نرس، ٹائپسٹ وغیرہ بننا تو اس کے مقابلے میں بہت معمولی کام ہیں اور کوئی بھی شخص ان کاموں کو کر سکتا ہے، مگر بچوں کی ماں صرف ایک ہے۔ اس کا متبادل دنیا کی کوئی چیز نہیں۔ بچوں کو تو صرف ”ماں“ چاہیے۔ ان کا ایک ہی مطالبہ ہے کہ ہماری ماں گھر میں موجود ہو تو ہمیں ذہنی سکون ملتا ہے، کام کرنے کو دل چاہتا ہے اور اگر ماں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر ماں کی بیرونِ خانہ ملازمت سے اگلی نسل بگڑ جائے، احساسِ محرومی کا شکار ہو جائے، نشہ، تشدد، ماردھاڑ اور جرائم کی عادی ہو جائے، تو کیا یہ معاشرہ کی ترقی ہوئی یا تخریب؟ وہ خواتین جن کے بچوں کا کوئی متبادل بندوبست ہو سکتا ہے، ان کی قریبی عزیز خاتون ان کو سنبھالنے والی ہے یا بچے بڑے ہو چکے ہیں، ایسی صورت میں عورت جزوقتی کام کر لے، ان شعبوں میں جہاں اس کی واقعی ضرورت ہے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں مگر شرط یہی

ہے کہ یہ کام اسلامی احکام اور شرعی حدود کے اندر رہ کر انجام دیا جائے اور دوسری طرف ماں بچوں کو بھی مناسب وقت دے۔ آج کل تو بچے اس قدر محروم ہیں کہ ماں باپ دونوں کام پر گئے ہیں اور بچے ان کے انتظار میں محرومیوں کا شکار ہیں۔

پاکستان کے معاشی و معاشرتی حالات کی روشنی میں دیہات میں رہنے والی خواتین بڑی چادریں لے کر کھیتی باڑی کے کاموں میں مردوں کا ہاتھ بٹا سکتی ہیں، بلکہ ان کے تعاون کے بغیر دیہی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ جانوروں کو چارہ دیتی ہیں، ان کی دیکھ بھال کرتی اور ان کا دودھ دوہتی ہیں، وہ کھیتوں پر اپنے مردوں کے لیے کھانا لے کر جاتی ہیں، عورتوں کے ساتھ مل کر فصل کی کٹائی اور چنائی کرتی ہیں۔ یہ اور اس نوعیت کے دیگر کام شرعی حدود میں رہتے ہوئے انجام دیئے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں کو خود عورتوں کے علاج کے لیے طبی پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ گھروں کے اندر سلائی کڑھائی کے ذریعہ سے بھی وہ کما سکتی ہیں۔

ایسے کارخانے جہاں صرف عورتیں کام کرتی ہیں، ضرورت کے تحت ان کے اندر کام کرنے میں مضائقہ نہیں۔ خواتین کے ایسے بازار بھی قائم کیے جاسکتے ہیں، جہاں دکاندار بھی خواتین ہی ہوں۔ خواتین کے سکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں خواتین اساتذہ کی تدریس بلکہ طالبات کو پڑھانے کے لیے خواتین اساتذہ ہی ہونی چاہئیں۔ خواتین کی یونیورسٹی بھی ہو، جہاں سارا عملہ خواتین پر ہی مشتمل ہو۔ غرض وہ تمام شعبے جن میں خواتین اسلامی حدود میں رہتے ہوئے خدمت کر سکتی ہیں، صرف ان میں کام کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

ملک کی آدھی آبادی کو گھر سے باہر نکالنے کا مقصد دراصل اور ہے۔ یہ اس مغربی کلچر کو پھیلانے کا ذریعہ ہے، جس کو پھیلانے میں ہمارے ذرائع ابلاغ صبح و شام مصروف ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری کوششوں سے ملک میں ایک ہلڑ بازی برپا ہے، ثقافت اور کلچر کے نام پر رقص و سرود کے بازار گرم ہو چکے ہیں۔ لہذا اس نام نہاد آزادی سے خواتین محروم ہی بھلی ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف اسلام کے نام پر خواتین کے مکمل تحفظ، عزت احترام اور ترقی و رفعت کا نام لیا

جاتا ہے، دوسری طرف ہالی وڈ کی ثقافت زبردستی یہاں رائج کی جا رہی ہے۔

علماء اگر سلف صالحین کی پیروی کرتے ہیں تو ہمارا مغرب زدہ طبقہ انھیں اندھے فضلاء اور لکیر کا فقیر گردانتا ہے، حالانکہ ان حضرات کا اپنا یہ حال ہے مغرب کے اصول و قوانین کی اندھی پیروی میں یہ لوگ ان سے بھی چار قدم آگے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قربانی ایک وحشیانہ رسم ہے۔ ادھر سے جواب ملتا ہے کہ ہمارے دین میں قربانی تو ہے ہی نہیں، یہ تو مُلّا کی ایجاد ہے۔ ادھر سے پردے کی مخالفت میں آواز اُٹھتی ہے اور ادھر سے جواب ملتا ہے کہ یہ پردہ تو مولویوں کی اختراع ہے۔ ہمارے ہاں تو صرف شرم و حیا کی تعلیم دی گئی ہے۔

ادھر سے گھر کی چار دیواری سے عورتوں کو نکالنے کی تلقین ہوتی ہے تو یہاں آزادی نسواں کی تحریکیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ادھر سے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی صدا بلند ہوتی ہے تو اس کو فوراً قرآن سے برآمد کرنے کی کوششیں ہونے لگتی ہیں۔

سوشلزم اور کمیونزم کی تحریکیں چلتی ہیں تو ہمارے مفکرین اس ملحدانہ اور لادینی نظام کو بڑے شد و مد سے عین اسلامی ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ ان بے کردار خواتین کی تقلید میں ہمارے ہاں بھی فحاشی، آرٹ اور ثقافت کا لباس پہن لیتی ہے۔ اس فکری غلامی کا یہ حال ہو گیا ہے کہ آج عالم اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا عالم و محقق خواہ کتنی ہی معقول بات کہے، اس کی طرف ہمارا مغرب زدہ طبقہ نگاہ التفات ڈالنا پسند نہیں کرتا، مگر ادھر سے کتنی بھی فضول اور لچر بات آجائے تو ہمارے ہاں وہ سائینٹفک حقیقت کے نام سے ایمان و اعتقاد کا حصہ بن جاتی ہے۔۔۔۔۔ اس روش کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے کہ اب اپنے پیغمبرؐ کی باتیں بھی ترقی پسندوں کے نزدیک دریا برد کرنے کے قابل نظر آرہی ہیں لیکن اگر وہی بات کوئی مغربی مفکر کہہ دے تو اسے بلند پایہ علمی دریافت کا نام دے دیا جاتا ہے۔

دل نہ چاہے تو رسالت کا بھی ارشاد غلط

من کو بھا جائے تو بھانڈوں کی خرافات بجا

8

فرمانِ نبویؐ

أَنْ تَطْعَمَهَا إِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوَهَا إِذَا كَتَسَيْتَ

(احمد۔ ابوداؤد 2142، ابن ماجہ)

”جب خود کھاؤ تو اپنی بیوی کو بھی کھلاؤ

اور جو لباس خود پہنو ویسا بیوی کو بھی پہناؤ۔“

عورت اور معاشی مسائل

- ❁ عورت کا دائرہ کار
- ❁ معاشی بوجھ مرد پر
- ❁ عورت کا نان نفقہ مرد کے ذمے ہے
- ❁ کیا عورت مرد کی طرح کما سکتی ہے؟
- ❁ کیا عورت کی معاشی جدوجہد عورت کے اپنے حق میں ہے؟
- ❁ اسلام میں عورت کی معاشی پوزیشن مضبوط ہے
- ❁ عورت کی حقیقی مجبوری
- ❁ چند تمدنی ضروریات
- ❁ معاشی جدوجہد کے لیے چند حدود
- ❁ کیا دور جدید میں عورت کے لیے کمانا واقعی ضروری ہے؟
- ❁ کیا عورت کی مرد سے صرف معاشی احتیاج ہے؟
- ❁ اسلام اور سرمایہ داری
- ❁ الغرض عورت کی ملازمت سے

عورت اور معاشی مسائل

مغرب میں آج عموماً یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ عورت کو معاشی جدوجہد کرنے کی آزادی اور حق حاصل ہے مگر اسلام نے اسے اس حق سے محروم کر رکھا ہے، وہ معاشی طور پر مرد کی محتاج ہونے کی بنا پر حقیر سمجھی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں آج مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہر ایک کے لیے کام کرنا اور کمانا ضروری ہو گیا ہے۔ لہذا عورت کو مرد کی طرح ہر شعبہ زندگی میں کام کرنے کی آزادی ملنی چاہیے۔

مندرجہ بالا مسائل بار بار اہل مغرب اور ان کے ہمینوا مغرب زدہ مسلمان حضرات و بیگمات کی طرف سے دہرائے جاتے رہے ہیں۔ ذیل میں انہی سوالوں کا جواب اختصار سے دیا گیا ہے:

دائرہ کار:

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اسلام میں مرد و زن کوئی حریف یا مخالف جنس نہیں ہیں، نہ ان میں کوئی معرکہ کارزار گرم ہے۔ اسلام کا مقصد نہ تو مردوں کی حمایت ہے نہ عورتوں کی۔ اس کے پیش نظر ذکور و اناث من حیث الانسان برابر ہیں اور مقصد اسلامی معاشرہ کی تخلیق ہے۔ اسلام انسان کی بھلائی اور اصلاح کے لیے کام کرتا ہے۔ دوسری طرف وہ نظام فطرت بھی ہے۔ لہذا اسلامی نظام زندگی کے فرائض و واجبات کے تعین میں بھی فطری راستہ اختیار کرتا ہے۔ مرد اور عورت کو وہی فرائض سپرد کرتا ہے جو ان کی فطری صلاحیتوں کے عین مطابق ہیں۔ کوئی بھی انسان جب غیر جانبداری سے اسلامی نظام حیات کا مطالعہ کرے، خصوصاً اس میں مرد و زن کے باہمی تعلقات کی نوعیت کا گہرا جائزہ لے تو وہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مرد و زن کے الگ الگ دائرہ کار کے باوجود دونوں میں باہم انس ہے، محبت ہے، شفقت ہے، ہمدردی و تعاون ہے، ایثار

و قربانی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قدر دان ہیں۔ اور اپنے اپنے فرائض خوشدلی سے ادا کرتے ہیں۔

معاشی بوجھ مرد پر:

کسبِ معاش کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ عورت کی نرمی و نزاکت اور جذباتیت، نفسیات، فطرت اور جسمانی ساخت یہ تمام امور بس اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ عورت گھر میں رہے اور نسلِ نو کو پالنے پونے کی ذمہ داری سنبھالے۔ جب کہ مرد کی فطرت اور اس کی جسمانی قوت و صلاحیت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ بیرونِ خانہ کے مشکل اور پر مشقت کام انجام دے۔ ظاہر ہے کہ معاش کی خاطر، کمانے کی خاطر بڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے۔ گرم سرد حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ملک کا دفاع کرنا، دشمن سے لڑنا، سڑکیں، پل، کارخانے، فیکٹریاں، صنعت، زراعت وغیرہ جیسے کام عورت کے بس کا روگ نہیں مگر مرد کی فطرت کے عین مطابق ہیں، لہذا کما کر لانے کی ذمہ داری مرد کی ہے۔ ویسے بھی کمانا کوئی حق نہیں ہے، یہ تو فرض ہے بلکہ مشکل فرض۔ اگر کسی مرد کو گھر بیٹھے بٹھائے باعزت طور پر روزی مل رہی ہے تو وہ باہر جا کر روٹی کمانے کی مشقت کیوں برداشت کرے گا؟ کیوں در بدر کی ٹھوکریں کھائے گا؟

عورت کا نان نفقہ مرد کے ذمے ہے:

بیٹی ہو یا بہن ہو، بیوی ہو یا ماں ہر حال میں عورت کا مالی بوجھ شریعت اسلامیہ نے مرد پر ڈالا ہے۔ عورت گھر کی ملکہ ہے۔ وہ گھر کے امور انجام دے اور مرد، سالانہ، ماہانہ، ہفتہ وار اور یومیہ جس طرح اسے سہولت ہو اپنے اہل و عیال کا خرچہ برداشت کرنے کا ذمہ دار ہے۔ عورت کا کام یہ ہے کہ مرد کی لائی ہوئی کمائی کو سلیقہ سے استعمال کرے۔ اس میں اسراف اور فضول خرچی نہ کرے۔ نہ مرد سے اس کی استطاعت سے زیادہ سوال کرے۔

ہاں! اگر مرد استطاعت ہونے کے باوجود عورت کو خرچ کم دیتا ہے جس سے گھر کے مصارف پورے نہیں ہوتے، تو ضرورت کے مطابق عورت خود بھی مرد کی جیب میں سے اخراجات لے سکتی ہے۔ مگر یہ ضرورت کے مطابق ہونا چاہیے، فضول خرچی اور چٹخارے بازی

کے لیے نہیں۔

دو در رسالت میں حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہند بنت عتبہؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ابوسفیان تو خرچ دینے میں تنگی سے کام لیتے ہیں۔ میرا اور بچوں کا خرچ صحیح طور پر پورا نہیں ہو پاتا۔ کیا میں اس کو علم ہوئے بغیر اس کے مال سے کچھ لے لیا کروں؟ فرمایا: ”ہاں! اتنی رقم تم لے سکتی ہو جس سے تمہارا اور بچوں کا خرچ مناسب انداز میں پورا ہو جائے۔“ [۱]

اور جو آدمی سرے سے اپنے گھر والوں کو خرچہ دیتا ہی نہیں (اس کی وجہ خواہ اس کی اپنی عیاشی ہو یا سستی یا کام کرنے کی اس میں اہلیت نہ ہو) تو وہ عورت عدالت میں مقدمہ کر سکتی ہے۔ عدالتی چارہ جوئی سے بھی مسئلہ حل نہ ہو تو پھر بذریعہ عدالت ان دونوں میں تفریق کروادی جائے گی (بشرطیکہ عورت علیحدہ ہونا چاہتی ہو)۔

کیا عورت مرد کی طرح کما سکتی ہے:

اول تو عورت مرد کے مقابلے میں کمزور ہے۔ جب بھی کمانے کی خاطر باہر نکلے گی جگہ جگہ اس کو مرد سے پالا پڑے گا، لہذا ہر مشقت والی ڈیوٹی سے وہ خود بخود نکلتی جاتی ہے۔ پیچیدہ اور دقت طلب کاموں میں اس کی ناکامی اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ پُر خطر مہمات کے لیے، دشمن سے مقابلہ کے لیے کبھی اس کا انتخاب نہیں ہوتا، مردوں کے مقابلے میں عموماً ہلکی پھلکی ملازمت اس کو دی جاتی ہے، مثلاً سیلز گرل، ٹائپسٹ، کلرک، سیکرٹری، ٹیچر، نرس، ڈاکٹر وغیرہ۔ پھر ان ہلکی پھلکی ملازمتوں میں بھی اس کی قوتِ کار مرد کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے ماہواری، حیض و نفاس وغیرہ کے مراحل سے وقتاً فوقتاً گزرنا پڑتا ہے اور اگر کام کر بھی لیتی ہے تب بھی مرد کے مقابلے میں اس کو تنخواہ کم ملتی ہے، حتیٰ کہ وہ ممالک جنہوں نے مساواتِ مرد و زن کو بطور اصول اپنے ہاں رائج کر رکھا ہے وہ بھی مرد و عورت کی تنخواہ میں فرق کرتے ہیں۔

عورت کی معاشی جدوجہد عورت کے اپنے حق میں ہے یا خلاف ہے؟

عورت نے باہر نکل کر مردوں کی طرح کمانے کی کوشش تو ضرور کی مگر عملاً یہ طاقتور اور کمزور کا مقابلہ تھا۔ مرد اپنی قوت و صلاحیت کی وجہ سے آگے ہی رہا، حتیٰ کہ وہ کام جو عورت مدتوں سے گھر میں کرتی چلی آئی ہے، ان میں بھی مرد کی کارکردگی عورتوں سے بہتر ہے، مثلاً مرد باورچی ہو، درزی ہو، دھوبی ہو، ان میدانوں میں بھی اس کی مہارت عورت سے زیادہ ہے۔ پہلے کی طرح آج بھی ہر جگہ قیادت مرد ہی کی ہے، گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی۔ تمام عہدے اور ذمہ دار پوسٹیں اسی کے پاس ہیں اور زندگی کے تمام شعبوں پر وہی چھایا ہوا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود آج عورت کی معاشی پوزیشن پہلے سے کچھ اچھی ہو گئی ہے مگر کس قیمت پر؟ دین و اخلاق کی قربانی دے کر، دامن عفت و عصمت کو داغدار کرنے کے بعد! کیونکہ سارے ذرائع معاش تو مردوں کے پاس ہیں اور عورت اس کے کاروبار کی پبلٹی کے لیے ایک ذریعہ ہے۔ ہر معمولی سے معمولی چیز پر بھی عورت کی دلکش تصویر ضرور موجود ہوگی۔ کھلے بازار میں بیٹھ کر مرد کے لیے اس کی مصنوعات ناز و ادا سے فروخت کرے، ہوٹلوں اور کلبوں میں مہمانوں کا استقبال کرے، ان کی خاطر تواضع کرے، ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس بنے، بیمار مردوں کی اپنی دلکش مسکراہٹ سے تیمارداری کرے

۔ ہر روز بن سنور کے ٹو آتی ہے اس طرح
سسرال جیسے جاتی ہے سج کر کوئی دلہن
(عنایت علی خان)

عورت کی معاشی جدوجہد معاشرہ کے لیے مفید ہے یا نقصان دہ؟

عورت کے باہر جا کر کمانے سے خاندان کا ادارہ برباد ہوتا ہے، بچے پریشان اور بوڑھے ضعیف والدین الگ حیران۔ گھر ہوٹل بن کر رہ گئے۔ مرد کما کر گھر آیا، رات گزار کر چلا گیا۔ بعینہ عورت کما کر گھر آئی، تھکی ماندی بستر پر جا پڑی۔ پھر اٹھ کر جلدی جلدی گھر کی صفائی کی، برتن صاف کیے، کھانا بنایا، بچوں کو کھلایا اور پھر ملازمت کے لیے نکل کھڑی ہوئی اور بچے ہیں کہ ماں کی

جھلک دیکھنے سے محروم۔ دوسری طرف معاشرہ میں ہر جگہ مرد و عورت کے اکٹھا رہنے سے بے حیائی و فحاشی کا ایک طوفان اٹھ پڑا۔ ناجائز بچوں کی کثرت ہو گئی۔ اسقاطِ حمل، جنسی امراض کی کثرت، جنسی اور اخلاقی جرائم میں بے حد اضافہ ہوا۔ خاندان برباد ہو گئے، شیرازے بکھر گئے، بچے ماں باپ کی محبت و شفقت سے محروم ہو کر شراب اور نشہ میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ طلاقیوں کی شرح 50% تک پہنچنے لگی۔ حاصل کیا ہوا؟ دنیا و آخرت کی بربادی ہی بربادی!

اسلام میں عورت کی معاشی پوزیشن مضبوط ہے:

مسلمان عورت کو گھر سے باہر جا کر کمانے کی ضرورت نہیں۔ بیٹی ہے تو باپ کی ذمہ داری ہے، بیوی ہو تو شوہر اس کے لیے ذمہ دار ہے۔ بہن کی کفالت بھائی کرے گا اور ماں کی بیٹا۔ وجہ یہ ہے کہ عورت کی گھریلو ذمہ داریاں اسلام کی نگاہ میں بہت اہم ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ عورت اپنے معاش کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر اپنے یہ خانگی فرائض سرانجام دے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت پر کوئی معاشی بوجھ نہیں رکھا گیا۔ آخر یہ خانگی ذمہ داریاں جو کل وقتی یعنی چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی ہے، یہ انجام دینے کے بعد اگر اس پر کسبِ معاش کا بوجھ بھی ڈالا جاتا تو یہ عورت پر انتہائی ظلم ہوتا۔ بات صرف اتنی نہیں کہ عورت کو اپنے معاشی مسائل سے بے فکر رکھا گیا ہے بلکہ اس کی معاشی پوزیشن کو مضبوط بنایا گیا ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک طرف اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری مرد کے ذمے ہے، دوسری طرف وہ وراثت میں اپنا باقاعدہ حق وصول کرتی ہے، ماں باپ، شوہر، بیٹا، بیٹی کی وراثت میں اسے لازماً یہ حق ملتا ہے۔ بعض اوقات بھائی بہن کے مال میں سے بھی وراثت کا حصہ مل سکتا ہے۔ پھر مرد کی طرف سے اس کو نہر ملتا ہے، جو خالص اسی کا حق ہے۔ پھر اس کو جو تحفے تحائف ملتے ہیں، ان کی بھی وہ مالک ہوتی ہے۔

ان ذرائع سے عورت کو جو آمدنی حاصل ہوتی ہے، اس کی وہ خود مالک ہے اور یہ آمدنی اس کے پاس محفوظ ہے کہ جیسے چاہے خرچ کرے۔ چاہے تو اپنے شوہر کے لیے خرچ کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ اس کے مقابلے میں مرد کے اوپر بے شمار معاشی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ جو کچھ کماتا ہے یا وراثت میں حاصل کرتا ہے، زیادہ تر ان ذمہ داریوں پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ لہذا ایک

طرف تو اسلام میں عورت کی معاشی پوزیشن مضبوط بنادی گئی ہے، دوسری طرف معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے بچانے کی مؤثر طور پر تدبیر کی گئی ہے، جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں رونما ہوتی ہیں۔

عورت کی حقیقی مجبوری:

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی عورت کا واقعتاً کوئی کفیل نہیں ہوتا مثلاً بیوہ خاتون اپنے یتیم بچے کیسے پالے؟ یا کسی مرد کی آمدنی اتنی محدود ہے کہ اس میں گھر کا دال دلیہ نہیں چل سکتا، اور عورت اپنے گھریلو معاملات پورے کرنے کے لیے مرد کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔

اس صورت میں اسلام کا اپنا ایک کفالتی نظام ہے۔ وہ سرکاری بیت المال سے تمام محتاجوں کو حصہ دلواتا ہے۔ یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے تمام ضرورتمند، محتاج اور معذور لوگوں کی مالی مدد کرے اور ان کے اخراجات کی کفیل بنے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ”اگر دریائے فرات کے کنارے ایک بکری بھی بھوکی مر گئی تو روز قیامت حکمران کو اس کا جواب دینا پڑے گا۔“ پھر اسلام ہر صاحب استطاعت پر زکوٰۃ فرض کرتا ہے، صدقات و خیرات کے نظام کے ذریعے سے اپنے رشتہ داروں اور ہمسایوں کی خبر لینے کی تلقین کرتا ہے۔ اس طرح اسلامی معاشرہ میں کسی خاتون کو اپنے یا اپنے یتیم بچوں یا اپنے چھوٹے بھائی بہنوں یا بوڑھے ماں باپ کے لیے کمانے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

☆ نبی پاک ﷺ کا فرمان ہے: ”کیا میں تمہیں بہترین صدقہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ اپنی اس بیٹی پر خرچ کرو جو بیوہ یا مطلقہ ہو کر تمہارے پاس آگئی ہے اور اب اس کا کوئی کمانے والا نہیں ہے۔“ [۱]

☆ اب دیکھئے! خود مغربی مفکر عورت کے لیے اجتماعی کفالت پر زور دے رہے ہیں۔ مفکر آگسٹ کونٹ ”النظام السیاسی“ میں لکھتا ہے:

”شوہر یا کسی اور قریبی رشتہ دار کی عدم موجودگی میں سوسائٹی کا فرض ہے کہ عورت کی

[۱] مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ؛ مستدرک علی الصحیحین للحاکم: 7345

ضروریات کا اپنی دولت سے انتظام کرے تاکہ اسے معاش کی ضرورت سے مجبور ہو کر گھر سے باہر کی زندگی میں اپنے آپ کو مبتلا نہ کرنا پڑے، کیونکہ حتی الامکان عورت کی زندگی کو اپنے گھر کے دائرے میں محدود رہنا چاہیے اور ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ عورت خارجی زندگی کے مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ رہے اور قدرت نے اس کو جس دائرے میں محدود کر دیا ہے، اس سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہو۔“ [1]

لیکن موجودہ حالات میں جبکہ دنیا میں کہیں بھی صحیح طور اسلامی حکومت نہیں ہے، مسلمان بھی اہل مغرب کی طرح مادیت اور نفسا نفسی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اپنے غریب رشتہ داروں اور ہمسایوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے بلکہ خود چچا اپنے یتیم بھتیجیوں کی ساری جائیداد ہتھیا کر انہیں گھر سے باہر نکل دیتے ہیں۔ ان حالات میں خواتین مجبور ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے بچوں کا معاشی بار بھی اٹھائیں۔ یہ صورت حال اسلامی احکام کی پامالی کی بنا پر پیش آرہی ہے۔ ان حالات میں عورت کے کمانے پر اسلام کوئی قدغن نہیں لگاتا۔ اس کے لیے گھریلو دستکاریاں موجود ہیں۔ مثلاً سلائی کڑھائی کا شعبہ، گھر میں کپڑے بیچنا، گندم اناج وغیرہ فروخت کیے جاسکتے ہیں۔ اگر معاش کا بندوبست گھر میں ہو سکے تو بہتر ہے ورنہ حجاب کی پابندی برقرار رکھ کر بیرون خانہ بھی کوئی ذریعہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ کسانوں کی خواتین ان کے ساتھ کھیتوں میں برابر کام کرتی ہیں۔ بالکل سادگی اور حیا کے ساتھ وہ اپنے کام میں مصروف رہتی ہیں۔ خود عہد نبویؐ میں بعض صحابیاتؓ بھی گھر سے باہر جا کر کام کیا کرتی تھیں۔ مثلاً حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ اپنے شوہر کی زمین پر ان کی معاونت کیا کرتی تھیں، ایک صحابیہؓ جمعہ کے روز چقندر پکا کر فروخت کیا کرتی تھیں۔

تمدنی ضروریات:

بعض تمدنی ضروریات بھی ہیں جو عورت سے بیرون خانہ فرائض کی انجام دہی کا تقاضا کرتی ہیں۔ مثلاً زنانہ تعلیمی اداروں میں بچیوں کی تعلیم و تربیت خواتین ہی کے ہاتھوں انجام پانا

[1] علامہ فرید آفندی مصری کی کتاب ”المرأة المسلمة“ کا اردو ترجمہ بعنوان ”مسلمان عورت“ از: ابوالکلام آزاد

ناگزیر ہے۔ بلکہ زنانہ اداروں میں استاد، کلرک، وارڈن، ٹائپسٹ وغیرہ خواتین ہی ہونی چاہئیں۔ ان کے لیے خواتین ہی ڈاکٹر ہوں۔ پھر خواتین کے عدالتی حقوق کی چارہ جوئی کے لیے خواتین وکیل کا ہونا بھی ضروری ہے۔

مگر خواتین کے لیے اس ”شوقیہ“ ملازمت کی اجازت ہرگز نہیں، جو ستر و حجاب کی پابندیوں کے بغیر مکمل ہار سنگھار کے ساتھ کی جائے۔ جس میں ہر روز عورت گھر سے اس طرح بن سج کر نکلے جس طرح کوئی دلہن اپنے سسرال جا رہی ہے۔ جو خواتین محض اپنے ”سوشل سٹیٹس“ کو بلند کرنے کے لیے اور ”آؤٹنگ اور تفریح“ کے نکتہ نظر سے ملازمت کرتی ہیں، وہ حیا اور عفت کے نام پر بدنماداغ ہیں۔ قوانین قدرت کو توڑنے اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے کا نتیجہ سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں نکلتا۔ ایک طرف گھر، گھر نہیں رہے، اولاد کو تربیت نہیں ملتی، مرد کو عورت کی توجہ اور محبوبیت نہیں ملتی، گھروں میں آتشِ محبت سرد ہو چکی ہے، عورت خوش مزاج اور شوہر کی مزاج شناس بیوی نہیں رہی بلکہ مردوں کے برابر محنت و مشقت برداشت کرنے کی وجہ سے اپنے مردوں کی مد مقابل اور حریف بن گئی ہے۔ پردہ چھوڑ کر گھر سے باہر نکل کر اس کے مصائب میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے، اس کے پاس اب اخلاقی اور دماغی عاجزی انکساری نہیں رہ گئی۔ دوسری طرف بے حیائی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

یہ مشرق کی بیٹی تہذیبوں کی رانی
مغرب میں کھو کر ہوئی ہے دیوانی
عنایت اڑیں گی کہاں تک یہ نادان
آخر ہوں گی اک دن پشیمان
(عنایت علی خان)

عورت کی معاشی جدوجہد کے لیے بعض حدود:

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ عورت کے لیے کسبِ معاش بالکل ممنوع بھی نہیں ہے مگر اس کے لیے کچھ حدود اور ضابطے ہیں جن کی پاسداری کرنا لازم ہے۔

کوئی جزوقتی ملازمت ہو، جس سے خانگی ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں۔ کیونکہ اس کی خانگی ذمہ داریاں اصل اور بنیادی ہیں۔ ان کے نقصان کی قیمت پر ملازمت کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کسب معاش اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے مردوں (شوہر، باپ، بھائی وغیرہ) کی اجازت سے ہونی چاہیے وگرنہ اس سے خاندانی نظم بگڑتا ہے۔ تیسری پابندی یہ ہے کہ عورت حجاب اور سادگی کا اہتمام کرے، علاوہ ازیں یہ کام کسی نسوانی ادارے میں ہو۔ اختلاط مرد و زن کی کسی مرحلے میں گنجائش نہیں ہے کیونکہ اس اختلاط سے پیدا ہونے والی خرابیوں کے مقابلے میں عورت کی کمائی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔

موجودہ حالات میں عملاً ان پابندیوں کے ساتھ کام کرنا بڑا مشکل ہے کیونکہ مسلمان معاشروں میں بھی ہر جگہ مخلوط معاشرہ موجود ہے۔ حتیٰ کہ خالص زنانہ اداروں میں بھی مردوں کا اتنا عمل دخل ہے کہ وہاں بھی قدم قدم پر حجاب کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ پھر آج کی ”ثقافت“ اور ”کلچر“ نے ان نسوانی اداروں کی سرگرمیاں بھی اس طرح بدل کر رکھ دی ہیں کہ شریعت کی حدود کے اندر کام کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بہر حال یہ مسلمان معاشروں کی کمزوری ہے کہ وہ ضرورتمند خواتین کے لیے شریعت کے ضابطوں کے مطابق کسی معاشی نظام کا بندوبست نہیں کر سکے۔

کیا دورِ جدید میں واقعی عورت کے لیے کمانا ضروری ہے؟

آج ہر مرد اور عورت کی زبان پر ایک ہی بات ہے کہ جی آجکل تو مہنگائی اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ اکیلے مرد کی کمائی سے گزارا ہو ہی نہیں سکتا لہذا عورتوں کو ضرور معاشی جدوجہد میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے تاکہ خاندان کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ میں نے اس مسئلہ پر جتنا بھی غور کیا ہے، مجھے یہ بات بالکل بے معنی نظر آئی ہے۔ عورت اصلاً گھر کی مالکہ ہے۔ قیامت والے دن اس سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ تم نے کتنا کمایا یا نہیں کمایا تو کیوں نہیں کمایا؟ اس سے سوال یہ ہوگا کہ خاوند کی خدمت کتنی کی، بچوں کی تربیت کیسی کی، ان کو مخلص مسلمان اور سچا دیندار بنایا یا نہیں؟ میری نگاہ میں خود کما کر لانے والی بلکہ بچوں کو سونے کے نوالے کھلانے والی خواتین کے مقابلے میں وہ خواتین زیادہ محترم اور قابلِ قدر ہیں جنہوں نے گھر میں کچھ نہ ہونے کی وجہ سے خود بھی

فاقہ کیا اور بچوں کو بھی فاقہ کروایا، مگر ساتھ ان کو قناعت کا سبق ذہن نشین کروایا کہ آج تو ہم اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔ آج ہمارے گھر سنتِ نبویؐ پر عمل ہو رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم باری تعالیٰ سے دعا فرمایا کرتے تھے: ”اے اللہ! مجھے ایک دن کھانا کھلانا تاکہ اس دن میں کھا کر تیرا شکر ادا کروں اور ایک دن مجھے نہ کھلانا تاکہ اس دن میں صبر کروں، تیری طرف عاجزی و زاری کروں اور تجھے یاد کروں اور دونوں صورتوں میں اجر و ثواب حاصل کر سکوں۔“ [۱]

اصل میں آج ہماری تمام دینی و اخلاقی اقدار بدل گئی ہیں۔ اب ہمارے سامنے مادی اقدار رہ گئی ہیں۔ مغرب کا معیارِ زندگی ہم نے بلا کم و کاست اپنا لیا ہے، جس کے مطابق پیسہ اور چمک ہی سب کچھ ہے۔ اس نظام کے مطابق تقویٰ، اخلاق اور کسبِ حلال سب فرسودہ اور دقیانوسی چیزیں ہیں۔ تہذیبِ حاضر سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہمارے پاس پیسہ ہونا چاہیے اور زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے، لہذا آج کے حالات میں عورتوں کا کمانا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ آج یہ بات بھی صحیح ہے کہ جس طرح پہلے رشتہ دار، بیوہ عورت اور یتیم بچوں کی کفالت کیا کرتے تھے آج سکے چچا بھی توجہ نہیں کرتے بلکہ یتیم بچوں کا سارا مال بھی چھین لیتے ہیں مگر یہ خرابی تو موجودہ مسلم معاشرے کی ہے، اس کا ذمہ دار اسلام نہیں ہے۔ اسلام تو بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا پورا بندوبست کرتا ہے۔ آج ایسی عورت اگر اپنے یتیم بچوں کو کھلانے کے لیے معاشی جدوجہد کرتی ہے تو اسلام کی نگاہ میں ایسی عورت دوہرے اجر و ثواب کی مستحق ہے، جو واقعی ضرورت کی بنا پر کمانے پر مجبور ہے۔ مگر عموماً عورتوں کی کمائی مالی لحاظ سے پورا فائدہ نہیں دے پاتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت روزانہ باہر جانے کے لیے نت نئے کپڑوں اور میک اپ کا بندوبست کرتی ہے۔ کمائی کا کم و بیش آدھا حصہ تو انہی پر خرچ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ جتنی دیر گھر سے باہر رہتی ہے اتنی دیر کے لیے ایک دو ملازموں کا بندوبست بھی کرے گی، کافی پیسہ ان پر بھی اٹھ جاتا ہے، پھر چونکہ وہ کماتی ہے لہذا گھر کی آرائش اور ٹیپ ٹاپ، عمدہ فرنیچر وغیرہ گھر میں ضرور ہونا چاہیے۔ بچوں کے کپڑے بھی ریڈی میڈ ہوں (کیونکہ سینے کا وقت نہیں ملتا) بچوں کی ٹیوشن فیس بھی دینی ہے (کیونکہ ان کو پڑھانے کے لیے وقت نہیں) پھر درزی، دھوبی کے بھی اخراجات غرض کون کون سے زائد اخراجات ہیں، جو عورت کو

گھر سے باہر نکلنے کی وجہ سے اٹھانا پڑتے ہیں۔ ساری جمع تفریق کر لیں، عورت کی کمائی گھر کی کسی بنیادی یا حقیقی ضرورت کو بھی پورا نہیں کرتی، سب اوپر کے اخراجات پر ہی اٹھ جاتا ہے۔

اس کے بجائے اگر عورت کفایت شعاری کو اپنا مطمح نظر بنائے، خود اپنے بچوں کو (ٹیوشن کے بجائے) پڑھائے، ان کے کپڑے خود سیئے (ریڈی میڈ لینے کی بجائے)، گھر کی تمام ضرورتوں کو مرد کی کمائی کے اندر سلیقہ شعاری سے پورا کرے تو یقیناً ملازمت کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اپنی ضروریات کو محدود کرنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ اپنے اور بچوں کے آٹھ آٹھ اور دس دس جوڑے نہ ہوں، چار پانچ کے اندر گزر بسر کی جاسکتی ہے۔ کھانے اعلیٰ اور بیش قیمت نہ ہوں، دال روٹی پر بھی گزارا کیا جاسکتا ہے۔ نمود و نمائش اور رسوم و رواج پر نہ خرچ کیا جائے، غرض اگر عورت چاہے تو کتنی بچت بھی کر سکتی ہے اور کتنے مسائل اپنے ناخن تدبیر اور سلیقہ سے سلجھا سکتی ہے۔ لہذا بڑھتی ہوئی ضروریات تو ایک مفروضہ ہے۔ جن کو اپنے اپنے زاویہ نظر کے مطابق کم بھی کیا جاسکتا ہے اور بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔ یہ مادی دوڑ تو اتنی بری چیز ہے کہ جب اس راہ پر انسان چل نکلے تو پھر قارون کا خزانہ بھی کم پڑ جائے اور ہل من مزید کی طلب پھر بھی باقی رہے۔ لہذا اپنے آپ کو محدود کرنا اور کفایت شعاری اختیار کرنا عورت کے اپنے اختیار اور مفاد میں ہے۔

دوسری طرف عورت کے گھر میں رہنے سے افراد خانہ کو جو محبت اور ہمدردی ملتی ہے، عورت کی پوری توجہ گھر کی طرف ہونے سے تمام افراد خانہ کو جو خوشگوار طمانیت کا احساس ہوتا ہے تو کیا اس کا مقابلہ ان گھرانوں سے کیا جاسکتا ہے جہاں خواتین کمانے کے لیے گئی ہیں اور گھر کا سکون درہم برہم ہے، خاوند الگ ناراض، بچے پریشان، بوڑھے صورت حال پر حیران! غرض الامان الحفیظ

سوال یہ ہے:

کیا واقعی عورت کی معاشی جدوجہد ضروری ہے، خاندان اور معاشرہ کے اتنے بڑے نقصان کی قیمت پر؟ کیا ہمارے معاشرے میں واقعتاً مردوں کی اتنی کمی واقع ہو گئی ہے کہ اب عورتیں کمانے لگ جائیں؟ کیا مرد ہزاروں کی تعداد میں روزگار کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہیں؟ تو پھر عورتوں کو مردانہ کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ رہا سوال کا اگلا حصہ کہ اگر عورت معاشی طور پر خود کفیل ہو تو وہ مردوں کی محتاج نہیں رہے گی، میرا سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں صرف ایک معاشی

احتیاج ہی ہے اور کوئی احتیاج اس کے علاوہ نہیں ہے؟ معاشی ضرورت ٹھیک ہے، ایک بڑی ضرورت ہے مگر یہی ایک ضرورت نہیں اور بھی کتنی ضرورتیں ہیں جو عورتوں کو مردوں سے ہیں۔ کیا جنسی ضرورت سے انکار کیا جاسکتا ہے؟ پھر انہیں مردوں کا تحفظ چاہیے، مردوں کی شفقت چاہیے، مردوں کا تعاون چاہیے۔ کوئی بھی ادارہ یا گھر صرف عورتوں کے ہاتھوں نہیں چل سکتا۔ قدم قدم پر عورتوں کو مردوں کے تعاون کی ضرورت ہے، کیونکہ باہر کے کام بہر حال مرد نے ہی کرنے ہیں۔ تو پھر معاشی طور پر عورت کے لیے مرد سے مانگنے میں کیا خرابی ہے؟ اس سے عورت کے احترام اور وقار میں فرق نہیں آتا، کیونکہ وہ پھر بھی ماں ہے، بیٹی ہے، بہن ہے، بیوی ہے، اسلام نے اس کی معاشی ضروریات پوری کرنا مردوں پر فرض قرار دیا ہے۔ لہذا عورت کا نہ کمانا اس کے وقار اور نسائیت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا۔ آخر مردوں کو بھی عورتوں سے کئی قسم کی احتیاج ہے جس سے ان کی مردانگی کی تحقیر نہیں ہوتی، اس لیے عورتوں کو بھی اپنا خداداد حق وصول کرنے میں کسی تحقیر کا خیال ذہن میں نہیں لانا چاہیے۔

اسلام اور سرمایہ داری:

اب ذرا ذکر ہو جائے اشتراکی اور سرمایہ دارانہ معاشروں کا کہ وہاں طلاق اور بیوگی دونوں شکلوں میں عورت ہی بچوں کی کفالت کی ذمہ دار ہے، جبکہ اسلام میں عورت کسی بھی شکل میں بچوں کے مالی اخراجات کی ذمہ دار نہیں ہے، نہ شوہر کے گھر، نہ طلاق کی شکل میں، نہ بیوگی کی صورت میں۔ بیوگی کی صورت میں بچوں کا چچا، ماموں، دادا، جو کوئی بھی موجود ہو ان کی کفالت کا ذمہ دار ہے۔ اس کے برعکس یورپ اور امریکہ میں عورت روٹی کپڑے اور نان نفقہ کے لیے عدالت میں مقدمہ نہیں کر سکتی، نہ اس کو وراثت کا حق ہے۔ تو پھر وہ وہاں کمانے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کیوں نہ کھائے؟

اسلام کا اپنا کفالتی نظام موجود ہے، جہاں بیوہ اور محتاج خواتین کی ذمہ داری اس کے قریبی رشتہ داروں، ہمسایوں اور بیت المال پر ہے، عورت کو کبھی کمانے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا۔ لیکن بالفرض عورت ملازمت کرنا چاہے تو اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق کر سکتی ہے۔ مگر یہ فرض ہر گز نہیں ہے جبکہ مغربی معاشرہ اس کو ناگزیر قرار دیتا ہے۔

اور پھر جس نے ملازمت کرنی ہو وہ مشنری جذبے سے اور عوام کی خدمت کے جذبے سے کرے معاشی نقطہ نگاہ سے نہ کرے۔ معیشت کو اتنا بالا دست سمجھنا مغرب کا نقطہ نظر ہے، یہ اسلام کا موقف ہرگز نہیں ہے۔ علاوہ ازیں معاشی نقطہ نظر سے عورت کی ملازمت منفی پہلو بھی رکھتی ہے۔

الغرض عورت کی ملازمت سے:

(1) گھر، گھر والی سے، بچے ماں سے، شوہر بیوی سے اور بوڑھے معذور افراد خدمت کرنے والوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔

(2) ملازمت میں عہدوں پر نا اہل افراد بھرتی ہونے سے کام کی ترقی کی رفتار رک جاتی ہے، دوسری طرف مردوں میں بے روزگاری بڑھتی ہے۔

(3) دورانِ ملازمت دفاتر، فیکٹریوں غرض ہر جگہ عورتوں کا مردوں کے شانہ بشانہ اٹھنے بیٹھنے سے مردوں میں بھی انتشار اور انارکی بڑھتی ہے، اس طرح بے حیائی اور فحاشی کو فروغ ملتا ہے۔

(4) عورتوں کو مردوں کی نگاہ میں جاذبِ نظر بننے کے لیے نئے ملبوسات اور میک اپ پر بیش قیمت اخراجات کرنے پڑتے ہیں، جس سے عورتوں کی آدھی کمائی انہی فضولیات پر صرف ہو جاتی ہے۔

(5) گھر کے کاموں کے لیے ملازمہ، آیا اور کئی نوکروں کا بندوبست کرنا پڑتا ہے، پھر اپنی حیثیت کے مطابق گھر، فرنیچر اور بچوں کے سٹیش پر خرچ کرنا ہوتا ہے۔ گویا آدھی کمائی اپنے سٹیش کو بنانے پر اور آدھی ملازموں پر اٹھ جاتی ہے، مگر امورِ خانہ پھر بھی ابتر اور پریشان رہتے ہیں۔

(6) جائے ملازمت تک کی آمد و رفت بھی ایک بڑا مسئلہ ہے اور دورانِ ملازمت بھی بے شمار ناخوشگوار واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ بہر صورت عورتوں کا گوہرِ آبدار (یعنی عفت و عصمت) پامال ہوتا ہے۔ ہوسناک نگاہوں کا نشانہ بننے سے ان میں بے باکی پیدا ہوتی ہے۔ پھر مردوں کے میدان میں ان سے مسابقت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ لہذا شرم و حیا اور نسوانیت آہستہ آہستہ رخصت ہوتی جاتی ہے۔

(7) خود کمانے والی عورت کا شوہر بھی بے پروا ہو جاتا ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے آخر ماں ہے، بچوں کو بھوکا تو نہیں مرنے دے گی۔ پھر بعض مرد اپنی کمائی جوئے، شراب خوری و عیاشی میں لگا دیتے ہیں، بعض دوسری شادی رچا لیتے ہیں۔ بہر صورت کمانے والی عورت کو اپنے بچے خود ہی پالنا پڑتے ہیں۔ عورت کو دوہری ذمہ داریوں کے تلخ نتائج کا اس وقت اندازہ ہوتا ہے جب وہ مسلسل تھکن، چڑچڑے پن اور کئی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ دوسری جانب گھریلو نظام ابتر، تیسری طرف بچوں کا جرائم میں ملوث ہونا بھی ایک لمحہ فکریہ ہے۔ چنانچہ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے ایک شاعرہ بے اختیار کہہ اٹھتی ہے۔

عورت نے گھر چھوڑ دیا	عہد وفا کو توڑ دیا
صبر و رضا کی پتلی نے	صبر کا دامن چھوڑ دیا
کاٹ میں لیٹا بچہ پوچھے	ماں کی نرم آغوش کہاں؟
جنت کی خوشبو میں بسا	بستر جیسا دوش کہاں؟
خواہش پیسہ کمانے کی	دفتر تک لے آئی ہے
حرص و طمع کی سبقت نے	کیسی قیامت ڈھائی ہے
اس کے تقدس کا شیشہ	بھوکی نظر نے توڑ دیا
عورت نے گھر چھوڑ دیا	عہد وفا کو توڑ دیا
تہذیبِ افرنگ نے ہے	ان کی آنکھ کو پھوڑ دیا
گمراہی نے سب اس کا	حسن، شباب نچوڑ دیا
یہ انجانی منزل پر	غفلت میں آ پہنچی ہے
گھر کا اک چراغ تھی جو	محفل میں جا پہنچی ہے

(اقم حماد)

9

لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ (فرمانِ نبویؐ)
”ولی کے بغیر کسی عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا۔“
(ابوداؤد 2085، احمد، ترمذی)

ولایتِ نکاح کا مسئلہ

- ❁ لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے
- ❁ ولی کی لغوی و اصطلاحی تعریف
- ❁ خاندان میں ولی کا کردار
- ❁ شادی کے موقع پر ولی کی اہمیت
- ❁ از روئے شریعت نکاح کا مقصد
- ❁ اخلاق کی حفاظت، موڈت و رحمت
- ❁ محبت کی شادی کی نفسیات
- ❁ مولانا زاہد الراشدی کا مراسلہ
- ❁ شاہ ولی اللہ دہلوی کا قول
- ❁ ولی کی شرط کیوں؟
- ❁ از روئے قرآن ولی کی رضا ضروری ہے
- ❁ احادیث کی رہنمائی
- ❁ ولی کی ضرورت باکرہ کو بھی ہے ثنیہ کو بھی
- ❁ عقلی جواز
- ❁ خاندان کا استحکام
- ❁ گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کا انجام
- ❁ مغربی کلچر کو شائع کرنے کا منظم پروگرام
- ❁ ایک مشکل اور اس کا حل
- ❁ حکمنین
- ❁ سول میرج ایکٹ

ولایت نکاح کا مسئلہ

لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے

26 ستمبر 1996ء کے اخبارات میں لاہور ہائیکورٹ کا ایک اہم فیصلہ شائع ہوا۔ جس میں فاضل عدالت نے ولی کی اجازت اور رضامندی کے بغیر نو جوان لڑکی کے از خود شادی کر لینے کو ناجائز قرار دیا اور لڑکیوں کا اغوا اور لؤ میرج کے بڑھتے ہوئے رجحان پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ نیز ان معاملات میں عدالتوں کی طرف سے اسلامی قوانین کے اطلاق کی بجائے ان سے گریز و اعراض پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔

مگر پھر کچھ عرصہ بعد یعنی 11 مارچ 1997ء کو لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس خلیل الرحمن رمدے اور جسٹس ملک قیوم نے مشہور زمانہ ”صائمہ ارشد کیس“ میں صائمہ اور ارشد کی لؤ میرج کو جائز قرار دے دیا۔

عدالت کے یکے بعد دیگرے ان دو متضاد فیصلوں پر دنیا بھر میں مختلف ردِ عمل کا اظہار کیا گیا۔ کسی نے عدالت کے پہلے فیصلے کو سراہا اور بعد والے فیصلے پر اپنی تشویش کا اظہار کیا، تو کسی نے پہلے فیصلے کے خلاف سخت احتجاج کیا اور دوسرے فیصلے پر خوشی سے بھنگڑے ڈالے اور خواتین کو ”اپنے حقوق“ مل جانے پر فرط مسرت کا اظہار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں کے اندر اندر لاہور ہائیکورٹ میں لؤ میرج (محبت کی شادی) کے اتنے کیس سامنے آنے لگے کہ خود جسٹس خلیل الرحمن رمدے (جنہوں نے صائمہ اور ارشد کی شادی کو جائز قرار دیا تھا) کو تشویشناک لہجے میں یہ کہنا پڑا کہ ”لڑکیوں کو خود مختاری دینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ پورے ملک کی لڑکیاں گھروں سے بھاگ کر خود شادی کر لیں۔“ [۱]

بہر حال وطن عزیز پاکستان میں لو میرج کی وبا روز افزوں ہے۔ ہفت روزہ ”ندائے ملت“ کی رپورٹر عارفہ صبح خان نے ایک فیچر میں اپنی رپورٹ پیش کی کہ اس وقت پاکستان میں لو میرج کی سالانہ شرح 23 ہزار ہے۔ صرف لاہور میں سالانہ 600 لڑکیاں محبت کی شادی کر رہی ہیں۔ کراچی، حیدر آباد، لاہور، رحیم یار خاں، ملتان، سکھر، سرگودھا، اوکاڑہ غرض ہر جگہ شہروں میں صورت حال بہت گھمبیر ہے۔ لاہور کے دارالامان میں روزانہ ایک لڑکی لو میرج کر کے حدود کیس میں آتی ہے، یہ تعداد بسا اوقات 4 تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ لیکن ایسا کوئی دن نہیں گزرتا کہ لاہور کے دارالامان میں کوئی لڑکی قدم نہ رکھے۔ [۱] یہ 1997ء کے حالات ہیں۔ آج اس کی سنگینی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

اس وقت مغرب میں خاندانی نظام بالکل برباد ہو چکا ہے، وہاں ہر ایک مادر پدر آزادی چاہتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا خاندانی نظام دنیا کا بہترین اور اعلیٰ نظام ہے۔ اہل مغرب ہمارے اسی خاندانی نظام کو بگاڑنا چاہتے ہیں، لہذا الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا، اخبارات و رسائل، آرٹ اور ثقافت غرض ہر طریقے سے مسلمانوں میں بے حیائی پھیلائی جا رہی ہے۔ اب نوجوان دوشیزہ خصوصی ٹارگٹ ہے کہ اسے اپنی مرضی کی شادی کا اختیار ہونا چاہیے۔

پھر بعض سادہ لوح لوگوں کو عورت کی نام نہاد آزادی کے نعرہ سے ہمنوا بنانے کے لیے فقہائے امت میں اختلافات کا شوشہ چھوڑا جاتا ہے حالانکہ کوئی دانا بینا مسلمان مفروضہ لڑکی کی شادی کی حمایت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مرعوب زدہ خواتین کی طرف سے ایک یہ اعتراض بھی بڑے زور و شور سے اٹھایا جا رہا ہے کہ اسلام عورت کو نکاح اور شادی کے سلسلے میں پورے حقوق نہیں دیتا۔ اس نے ولی کی رضا کی شرط عاید کر کے عورت پر زیادتی کی ہے، بالغوں کے ایک جائز حق پر ڈاکہ ڈالا ہے۔

لہذا اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے ہمیں پہلے تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ولی کہتے کسے ہیں، خاندانی زندگی میں اس کا کردار کیا ہے اور آیا نکاح کسی فرد کا ذاتی معاملہ ہے یا دو خاندانوں کا اور خود معاشرہ کا اس سے کتنا تعلق بنتا ہے؟

ولی کی تعریف اور خاندانی زندگی میں اس کا کردار

لغوی معانی:

ولی عربی کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معانی سرپرست، دوست، مددگار، کام کا منتظم، رشتہ دار اور وارث کے ہیں۔^[۱]

کہا جاتا ہے: **اَللّٰهُ وَلِيُّكَ**: ”اللہ تیرا حافظ و نگران ہے۔“

اصطلاحی معانی:

اصطلاح میں ولی کا لفظ سرپرست اور ذمہ دار کے لیے بولا جاتا ہے، جو اخلاص اور محبت سے مدد کرنے والا ہو اور لوگوں کو دکھانے اور سنانے کے لیے مدد کرنے والا نہ ہو۔^[۲]

قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا نَصِيْرٍ﴾^[۳]

یعنی ”اللہ کے سوا کوئی تمہارا حمایتی اور مددگار نہیں۔“

خاندان میں ولی کا کردار:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی انتہائی درجے کا مخلص اور ہمدرد ہے، جو اپنی عقل اور سمجھ کی بنا پر پورے خاندان کے مفاد کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس طرح کسی بھی گھر کا سربراہ اس کا ولی ہوتا ہے۔ وہ افراد خانہ کے مشورے سے ان کی خوراک، تعلیم، رہائش، علاج اور جملہ امور کا انتظام کرتا ہے۔ گھر سے باہر کے معاملات ہوں یا گھر کے اندر کے، سب معاملات کا وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنے بچوں کے نکاح و طلاق کے مسائل کا بھی وہ ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہی گھر کا ولی اپنے ہاں

[۱] المنجد، عربی/اردو، صفحہ 1107، مطبوعہ احمد پرنٹنگ کارپوریشن، ناظم آباد، کراچی

[۲] مترادفات القرآن، صفحہ 800

[۳] البقرہ: 107

جناز کا بھی بندوبست کرتا ہے۔ مردم شماری کا معاملہ ہو یا انتخابی فہرستوں کی تیاری، ہر گھر کے ولی سے ہی پوچھا جاتا ہے۔ گھر والوں کے برادری کے ساتھ مراسم، کوئی مقدمہ بازی، لڑائی جھگڑا ہر ایک میں اسے ہی اپنی ذمہ داری نبھانا ہوتی ہے۔ کسی بچے بچی کا کسی تعلیمی ادارہ میں داخلہ ہو، اس کے داخلہ فارم پر جب تک اس کے ولی کے دستخط نہ ہوں گے، تعلیمی ادارہ اس کو داخلہ نہیں دیتا۔ حالانکہ پڑھنا تو بچے نے ہے مگر جب تک اس کا ولی ذمہ دار نہیں بنتا، ادارہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ خاندانی زندگی میں ولی کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ جب گھر کا ولی فوت ہو جاتا ہے تو فوراً گھر والے میٹنگ کر کے کسی کو (میت کے بھائی یا بیٹوں میں سے کسی ایک کو) ولی نامزد کرتے ہیں۔ برادری کا ولی فوت ہو جائے تو اس کے لیے بھی اسی طرح تمام برادری والے مل کر ولی کا انتخاب کرتے ہیں۔

زندگی کے ہر معاملہ میں:

یہ ولی تو زندگی کے ہر موڑ اور ہر شعبہ میں موجود ہوتا ہے۔ کالج کا پرنسپل اس کا ولی ہے، فوج کا کمانڈر انچیف اس کا ولی ہے، کوئی پبلک ادارہ ہو یا پرائیویٹ کمپنی، ہر کسی کا ولی (ذمہ دار) ہوتا ہے۔ نام بیشک مختلف ہو جائیں مگر ہر چھوٹے، بڑے، سرکاری و غیر سرکاری اداروں یا گروہوں کے لیے مختلف ناموں اور القاب سے ان کے ولی (یا قیّم) موجود ہوتے ہیں اور اس ادارے کے تمام کام اس ولی کے ذریعے سے سرانجام پاتے ہیں۔

اہمیت و ضرورت:

کیا کسی تعلیمی ادارے کا ملازم اپنے پرنسپل سے اجازت لیے بغیر دس پندرہ دن کی رخصت پر چلا سکتا ہے؟ حالانکہ سال میں پچیس چھٹیاں لینا اس کا حق ہے اور اس حق کو پرنسپل ختم نہیں کر سکتا۔ مگر یہ حق پرنسپل سے اجازت لے کر ہی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پرنسپل کہہ سکتا ہے کہ ان دنوں پہلے ہی دو اساتذہ رخصت پر ہیں، آپ چند دن ٹھہر کر یہ رخصت حاصل کریں یا ابھی پندرہ دن کی رخصت نہیں بلکہ آٹھ دن کی لے لیں، بقیہ سات دن کی کچھ عرصہ بعد لے لینا وغیرہ۔ اب ملازم کا حق واضح ہے، قانونی طور پر تسلیم شدہ ہے، پرنسپل اس کا یہ حق ختم نہیں کر سکتا،

پھر بھی وہ پرنسپل کو نظر انداز کیے بغیر رخصت پر نہیں جاسکتا بلکہ اس سے مشورہ کرے گا۔ بغیر کسی جھگڑے کے یہ فیصلہ ان کے مابین طے ہوگا۔

شادی کے موقع پر ولی کی اہمیت:

بالکل یہی معاملہ شادی، نکاح کے معاملات میں لڑکی اور اس کے ولی کا ہے۔ یہ نکاح لڑکی کی مرضی و مشورے سے ہوگا، مگر ولی کے ذریعے سے طے پائے گا۔ اس نکاح کے تمام انتظامات اسی نے کرنے ہیں۔ پہلے موزوں رشتے کا انتخاب، پھر شادی کا انعقاد اور پھر تاحیات اس شادی سے پیدا شدہ اچھے یا برے مسائل کا بندوبست بھی اسی نے کرنا ہے۔ اہل مغرب کے ہاں شادی تو ایک معمولی معاملہ ہے، جیسے ڈبل روٹی کے توس بنا لیے، مگر مسلمانوں کے ہاں یہ زندگی کا اہم ترین مرحلہ ہے۔ یہ ایک دینی رابطہ و معاہدہ ہے، یہ محض دو افراد کا تعلق نہیں بلکہ دو خاندانوں کی عزت اور وقار کا معاملہ ہے اور اس معاملے کو دونوں خاندانوں کے ولیوں نے ہفتوں، مہینوں اور بسا اوقات سال سال بھر کے غور و خوض کے بعد طے کرنا اور پھر اسے عمر بھر نبھانا ہوتا ہے۔

از روئے شریعت نکاح کا مقصد:

1- اخلاق و عصمت کی حفاظت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح [۱] کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ”یہ نصف ایمان ہے۔“

إِذَا تَزَوَّجَ الْعَبْدُ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ نِصْفَ الدِّينِ [۲]

[۱] مغرب میں نکاح تو ایک سماجی معاہدہ ہے دو افراد کے درمیان مگر اسلام میں نکاح سنتِ انبیاء ہے۔ واجب ہے، یہ عبادت ہے، نکاح کا مقصد نئے خاندان کی تشکیل ہے۔ بوقتِ نکاح ولی کے علاوہ دو عادل گواہوں کی موجودگی بھی از روئے شریعت ضروری ہے۔

[۲] رواہ البیہقی فی شعب الایمان

پھر اس نکاح کا جو مقصد قرآن پاک میں بتایا گیا ہے وہ اخلاق و عفت کی حفاظت ہے۔ نکاح کو لفظ ”إِحْصَان“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ”حصن“ کا مطلب ہے قلعہ اور ”إِحْصَان“ سے مراد قلعہ بندی ہے۔ جو مرد نکاح کرتا ہے وہ ”مُحْصِن“ ہے اور جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ ”محصنہ“ ہے یعنی وہ قلعہ کی حفاظت میں آگئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مُحْصِنَاتٍ غَيْرِ مُسْفِحَاتٍ وَلَا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَانٍ﴾ [۱]

”(یعنی ایسی عورت سے نکاح کرو) جو پاکدامن ہوں نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے بدکاری کرنے والیاں۔“

2- مردوں سے بھی یہی بات کہی گئی ہے:

﴿أَجَلٌ لَّكُمْ مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرِ مُسْفِحِينَ﴾ [۲]

”اس کے علاوہ باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئی ہیں بشرطیکہ شہوت رانی کے لیے نہیں بلکہ پاکدامن رہنے کے لیے تم اپنے مال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو۔“

غرض مرد و عورت دونوں کا پاکدامن رہنا ضروری ہے۔ اخلاق و عفت کی حفاظت ہی کے لیے یہ نکاح کیا جا رہا ہے تو کیا اخلاق و عفت کی حفاظت اس شادی میں ہو سکتی ہے جو ولی کے بغیر لڑکی لڑکا از خود ہی چوری چھپے رچالیں؟ شادی اور نکاح کے انعقاد کا موقع کتنے مرحلوں کے بعد آتا ہے۔ ان کا معاشرت اور چوری چھپے کی آشنائیاں کتنی مدت پہلے سے چل رہی ہوتی ہیں۔ تب ہی تو دو خاندانوں کی ناراضگی مول لے کر اور ان کو نظر انداز کر کے وہ یہ رشتہ رچاتے ہیں۔ غرض ایک مسلمان جس غرض کے لیے شادی کرتا ہے یعنی اپنے ایمان کو مکمل کرنے کے لیے اور پاکدامنی

[۱] النساء: 25

[۲] ایضاً: 24

حاصل کرنے کے لیے۔ وہ اغراض تو سرے سے ہی بغیر ولی کے شادی کرنے میں ختم ہو کر رہ گئیں اور صرف حیوانی و شہوانی تعلق برقرار رہ گیا، (جس کی شریعت نے ممانعت کی ہے۔)

2- موڈت و رحمت:

دوسرا اہم مقصد شریعت نے یہ بتایا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان محبت، مہربانی، خیر خواہی اور ہمدردی ہوتا کہ دونوں یک جان دو قالب بن کر اپنی آئندہ نسل کی صحیح تربیت بھی کر سکیں اور اپنے تمدنی فرائض کو بھی بطریق احسن پورا کر سکیں۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا
إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ﴾ [۱]

”اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کر سکو اور اس نے تمہارے درمیان رحمت اور محبت پیدا کر دی ہے۔“

3- کفو:

نکاح کا مقصد تب پورا ہوتا ہے جب دونوں صنفوں کا ازدواج کفو کے اصول پر ہو یعنی بیشتر معاملات میں ان کے درمیان ہمسری اور برابری ہو، تاکہ زیادہ سے زیادہ محبت اور رحمت پیدا ہو سکے اور برقرار بھی رہ سکے اور وہ ایک دوسرے سے حقیقی سکون پاسکیں۔ جو مرد اور عورت دینداری، اخلاق، حسب و نسب، طرز معاشرت، رہن سہن (بلکہ عملی و فکری استعداد میں بھی) ہم پلہ ہوں، وہاں نکاح کی کامیابی کا امکان زیادہ ہے۔

چنانچہ ہمیں شریعت نے انتخاب زوج کے لیے باقاعدہ معیار دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تُنْكَحُ النِّسَاءُ لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا

فَاُظْفِرْ بِذَاتِ دِينٍ تَرَبَّتْ يَدَاكَ

”کسی عورت کے ساتھ چار باتوں کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے: مال و دولت، اس کا

حسب نسب، اس کا حسن اور اس کی دینداری۔ تم دین دار عورت کو حاصل کرنے

میں کامیاب ہونا، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں (یہ جملہ بے تکلفی کا ہے)۔“ [۱]

دیندار عورت سے شادی کرنے کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی لیے دے رہے ہیں کہ وہ

شوہر کے حقوق کا خیال رکھے گی، اولاد کی صالح تربیت کرے گی۔ اس طرح ایک دیندار خاتون

ہی نکاح کے مقاصد کو بطریق احسن پورا کر سکتی ہے۔

اس کے برعکس چوری چھپے دوستی کی شادی اور محبت کی شادی، بے شمار مفاسد سے بھرپور

ہوتی ہے۔ اصل میں مغربی تہذیب میں شادی کے لیے صرف دو معیار ہیں: ظاہری خوبصورتی اور

مال و دولت۔ ان کے شادی کے معاملات اسی کی بنا پر انجام پاتے ہیں، اور پھر اسی لیے فوراً طلاق

پر ختم ہو جاتے ہیں۔

محبت کی شادی کی نفسیات:

محبت کی شادی کی خرابی یہ ہے کہ اس میں دو انسان ظاہری شخصیت سے متاثر ہوتے

ہیں۔ لڑکیاں فلمی ہیروئن کی طرح سج دھج کر باہر نکلتی ہیں، جب وہ اپنے متوقع شوہر سے

ملاقاتیں کرتی ہیں تو سر سے پاؤں تک سرخی پاؤڈر کی تہوں میں ملفوف، قیمتی اور اچھے ملبوسات سے

بنی سنوری ادا میں دکھا دکھا کر خیالی اور تصوراتی باتیں کرتی ہیں، اسی طرح لڑکے بھی بنے سنورے

ہوتے ہیں۔ دونوں کو آنے والی ذمہ داریوں کا مطلق علم نہیں ہوتا۔ آخر وہ عدالتوں میں جا کر لو

میرج کر لیتے ہیں۔ پھر جب عملی زندگی میں لڑکی اپنے اصل حلیے میں نظر آتی ہے، اس کی سرخی اور

غازے کی تہیں اترنے لگتی ہیں، اب نہ اس کا رنگ روپ اتنا خوشنما رہتا ہے اور نہ آنکھوں کا جادو

برقرار رہتا ہے۔ اب وہ ناز و ادائیں بھی نہیں رہتیں۔ جب گھر داری سر پر پڑتی ہے تو کھانا پکانے،

برتن مانجنے، صفائی کرنے، کپڑے دھونے جیسے کام بہت مشکل لگتے ہیں۔ دوسری طرف مصنوعی میک اپ بھی ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ اب دونوں میں تنخیاں جنم لینے لگتی ہیں، پھر ایسی لڑکیوں کو سسرال والے بھی قبول نہیں کرتے لہذا ان کے ساتھ نبھانا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ پھر یہ لڑکیاں سسرال سے الگ تھلگ مغربی طرز کی زندگی گزارنے پر شوہر کو مجبور کرتی ہیں، یہاں سے باقاعدہ لڑائی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ دونوں کو اپنے آئیڈیل میں بے شمار نقائص اور تباہی نظر آنے لگتی ہیں..... پھر لڑکیوں کے لیے نتیجہ بے انتہا بھیانک نکلتا ہے۔ لڑکا تو چند ماہ کے بعد دوبارہ شادی رچا لیتا ہے جبکہ ایسی شکستہ لڑکی یا تو دارالامان میں پناہ ڈھونڈتی ہے یا خود سوزی کر لیتی ہے یا کسی بازار حسن کا رخ کر لیتی ہے۔ بہر صورت ماں باپ بھی اس کو قبول نہیں کرتے۔ اس طرح معاشرے میں فحاشی اور بے حیائی بڑھتی ہے، خاندانی نظام برباد ہوتا ہے۔ ولی اور ذمہ دار کے سامنے تو بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں، اسی بنا پر وہ اطاعت کا استحقاق رکھتے ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا خود لڑکی کے لیے، اہل خاندان کے لیے اور خود معاشرے کے لیے، سب کے لیے نقصان و زیاں کا باعث بنتا ہے، مگر اس کے باوجود ایک طبقہ کا اصرار ہے کہ باکرہ بالغہ لڑکی بغیر ولی کی اجازت کے اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔ یہ فقہ کا فیصلہ ہے، اس پر کیسے پابندی عائد کی جاسکتی ہے؟ اس طبقہ نے اس موقع پر فقہی جمود کا سہارا لے کر غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں، حالانکہ مغربیت کا بھرپور مقابلہ کرنے کے لیے اس قسم کی فقہی موشگافیاں ختم ہو جانی چاہئیں۔

چنانچہ 13 مئی 1996ء کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں 13 علمائے کرام کا ایک اہم اجتماع خاص اس موضوع پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا۔ اس میں مولانا زاہد الراشدی کا ایک مراسلہ بنام لاہور ہائیکورٹ پڑھ کر سنایا گیا۔ پہلے تو انہوں نے مولانا انور شاہ کاشمیری کے حوالے سے ولایت نکاح کے مسئلے پر جمہور علماء کا موقف پیش کیا، جو مولانا کی کتاب ”فیض الباری شرح صحیح البخاری“ میں دیا گیا ہے:

1- امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ عاقلہ، بالغہ کنواری

لڑکی ولی کی رضا مندی اور اجازت کے بغیر نکاح نہیں کر سکتی، بلکہ ولی کی اجازت اور رضا کی صورت میں بھی ایجاب و قبول کا اختیار لڑکی کو حاصل نہیں، اس کی طرف سے یہ ذمہ داری ولی ہی سرانجام دے گا۔

2- احناف میں سے امام یوسف اور امام محمد کا فتویٰ یہ ہے کہ عاقلہ، بالغہ لڑکی ولی کی رضا کے بغیر نکاح نہیں کر سکتی، البتہ ولی کی رضا اور اجازت کی صورت میں وہ ایجاب و قبول خود کر سکتی ہے۔

3- امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ عاقلہ، بالغہ لڑکی اپنا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر بھی کر سکتی ہے، البتہ اسے اس طرح نکاح کرنے کی صورت میں ”کفو“ کے تقاضوں کا لحاظ رکھنا ہوگا اور اگر اس نے ولی کی اجازت کے بغیر ”غیر کفو“ میں نکاح کر لیا تو ولی کو نہ صرف اعتراض کا حق ہے بلکہ وہ تنسیخ نکاح کے لیے عدالت سے رجوع کر سکتا ہے۔

4- ”کفو“ کا مفہوم فقہائے کرام کے ارشادات کی روشنی میں یہ ہے کہ کسی لڑکی کا نکاح ایسی جگہ نہ ہو جہاں لڑکی کا ولی اور اہل خاندان اپنے لیے عار محسوس کریں، ”کفو“ کے اسباب فقہاء نے اپنے اپنے عرف و ذوق کے مطابق مختلف بیان کیے ہیں، جن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ لڑکی اور اس کا خاندان جس سوسائٹی میں رہتے ہیں، وہاں کے عرف اور معاشرتی روایات کے مطابق جو بات بھی ان کے لیے باعث عار سمجھی جاتی ہو وہ ”کفو“ کے اسباب میں شامل ہوگی۔ کیونکہ ”کفو“ کی علت سب فقہاء نے ”رفع ضرر عار“ بیان کی ہے اور عار کے اسباب ہر معاشرہ اور عرف میں مختلف ہوتے ہیں۔

5- اس تفصیل کی روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت امام ابو حنیفہ کا موقف سب سے زیادہ قرین انصاف اور متوازن معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں لڑکی اور اس کے ولی دونوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اسی بنیاد پر سید محمد انور شاہ کا شمیری نے امام صاحب کا مذہب یہ بیان کیا ہے کہ نکاح میں لڑکی اور اس کے ولی دونوں کی رائے کا اکٹھا ہونا ضروری ہے اور

یہ بات انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ اس لیے کہ نکاح صرف دو افراد کے باہمی تعلق کا نام نہیں بلکہ دو خاندانوں کے باہمی تعلقات، معاشرہ میں ان کی عزت و وقار، اولاد کی کفالت و تربیت اور پھر ایک نئے تشکیل پانے والے خاندان کے مستقبل کے معاملات اس نکاح سے وابستہ ہیں اور اصول یہ ہے کہ کسی فیصلہ سے جتنے لوگ بھی متاثر ہوتے ہوں فیصلہ کرتے وقت ان سب کے مفادات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

6- مغربی تمدن نے اسی مقام پر دھوکہ کھایا ہے کہ مغربی دانشوروں نے فرد کی آزادی اور عورت کے حقوق کے پر فریب عنوان کے ساتھ نکاح کو دو افراد کا ذاتی معاملہ قرار دے کر اس کے باقی لوازمات و نتائج کو نظر انداز کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مغربی معاشرہ خاندانی زندگی کے نظام اور رشتوں کے تقدس سے محروم ہو چکا ہے اور مغرب کا عائلی نظام انارکی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ جس کا ذکر چوٹی کے مغربی دانشوروں کی زبان پر بھی انتہائی حسرت کے انداز میں ہونے لگا ہے۔

اس سلسلہ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خاتون اول مسز ہیلری کلنٹن کے دورہ پاکستان کے موقع پر شائع ہونے والی اس خبر کا حوالہ دینا بھی ضروری ہے کہ:

”امریکی خاتون مسز ہیلری کلنٹن اسلام آباد کالج فار گرلز کی اساتذہ اور طالبات کے ساتھ گھل مل گئیں، ان سے ایک گھنٹہ سے زیادہ بے تکلفانہ گفتگو کی۔ ہیلری کلنٹن نے طالبات سے ان کے مسائل دریافت کیے۔ طالبات نے دوستانہ انداز میں کلنٹن کی اہلیہ کو سب مسائل بتائے، فورتحہ ایئر کی طالبہ نائیلہ خالد نے امریکی خاتون اول سے پوچھا کہ امریکی طالبات کا بنیادی مسئلہ کیا ہے؟ اس پر خاتون اول نے کھل کر گفتگو شروع کی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کی طالبات کا مسئلہ تعلیم کی مناسب سہولیات کا فقدان ہے، تعلیمی اداروں میں فنڈز کی کمی کا مسئلہ ہے مگر امریکہ میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہاں بغیر شادی کے طالبات اور لڑکیاں حاملہ بن جاتی ہیں۔ اس طرح بے چاری لڑکی ساری عمر بچے کو پالنے کی ذمہ داری نبھاتی ہے، ایک دوسری

طالبہ وجہہ جاوید نے کہا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ اس پر ہیلری کلنٹن نے کہا کہ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان، اپنے مذہب اور معاشرتی اقدار سے بغاوت نہیں کرنی چاہیے۔ مذہبی و سماجی روایات اور اصولوں کے مطابق شادی کے بندھن میں بندھنا چاہیے، اپنی اور اپنے والدین کی عزت و آبرو اور سکون کو غارت نہیں کرنا چاہیے۔ مسز ہیلری کلنٹن نے کہا کہ وہ اسلام اور عیسائیت کی شادی کے خلاف نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں مذہبی روایات کا احترام کرتے ہوئے شادی ہوتی ہے، اس لیے یہاں لڑکیوں کے مسائل کم ہیں۔“

اس پس منظر میں ہماری استدعا یہ ہے کہ مسلمانوں کے خاندانی معاملات کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرتے وقت اسلامی احکام و قوانین، معاشرتی روایات اور عدالتی نظام کے ساتھ ساتھ مغربی معاشرہ میں ”فیملی سسٹم“ کی تباہی کے اسباب کو بھی سامنے رکھا جائے، کیونکہ یہ کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہوگی کہ مغرب جس دلدل سے واپسی کے راستے تلاش کر رہا ہے، ہم آزادی اور حقوق کے نام نہاد مغربی فلسفہ کی پیروی کے شوق میں قوم کو اسی دلدل کی طرف دھکیلنا شروع کر دیں۔ امید ہے کہ آپ ان معروضات پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔ (یکم مئی 1996ء)

(پھر انہوں نے تیرہ علمائے کرام کے دستخطوں کے ساتھ یہ خط صائمہ ارشد کیس کے فیصلہ

سے پہلے 2 مئی 1996ء کو عدالت عالیہ لاہور کے ڈویژنل بنچ کے نام ارسال کیا تھا)

تجزیہ:

اس خط کے مطابق علامہ انور شاہ کاشمیری کے حوالے سے احناف کا جو موقف بیان کیا گیا ہے کہ نکاح میں ولی اور لڑکی دونوں کی رضا مندی ضروری ہے، اگر واقعی احناف کا یہی موقف ہے تو باقی تمام ائمہ اسلام چاہے مالکی ہوں یا حنبلی، شافعی ہوں یا احمدیث وہ پہلے ہی لڑکی اور ولی دونوں کی رضا کے قائل ہیں۔ جب صورت حال یہ ہے کہ علامہ انور شاہ کاشمیری جو احناف کے بہت بڑے عالم ہیں، وہ اس مسئلے میں حنفی مذہب اور دوسرے فقہی مذاہب کے درمیان مطابقت وہم آہنگی بیان

کر رہے ہیں تو پھر آج حنفی مذہب کی ایسی تعبیر پر کیوں اصرار کیا جا رہا ہے، جس میں اختلاف نمایاں ہو اور اس مغرب زدگی کی تائید کی جائے جس کا مقصد مسلمان عورت کو ہر قسم کے قید و بند سے آزاد کر کے مغربی عورت کی طرح بے حیا بنانا اور بے راہ رو کرنا ہے؟

وقت کی ضرورت:

اس وقت مسئلہ مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کی برتری کا اثبات ہے اور ہماری نوجوان نسل میں اندھا دھند مغرب کا رنگ ڈھنگ اختیار کرنے کی جو روش ہے، اس کے انسداد کی ضرورت ہے نہ کہ اس کو بڑھانے کی۔ جب ہماری نوجوان نسل وہی مغربی تعلیم پڑھ رہی ہے جس کو انگریزوں نے مسلمانوں کو غیر مسلم بنانے کے لیے وضع کیا تھا اور ہمارے تعلیمی ادارے بھی اسی طرح مخلوط ہیں جو انگریز کی خواہش اور اس کے منصوبے کے عین مطابق ہیں، تو پھر اس کا نتیجہ بھی واضح ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ لڑکے لڑکیوں میں شرم و حیا مفقود ہوتی جا رہی ہے اور اسلام کے تصور حیا و عفت کے برعکس والدین کی اجازت اور مرضی کے بغیر این۔ جی۔ اوز کی حوصلہ افزائی اور قتل غیرت کی مخالفت کی بنا پر لو میرج کا سلسلہ بھی روز افزوں ہے۔ لڑکے لڑکیاں شادی سے قبل ایک دوسرے کو سمجھتے اور پرکھتے ہیں، والدین سے ورے ورے وہ شادی بیاہ کے پیام باندھتے ہیں اور اگر والدین مخالفت کریں تو انہیں نظر انداز کرنے کے لیے عدالتی تحفظ بھی موجود ہے۔

فقہی موشگافیاں ختم کی جائیں:

سوال یہ ہے کہ کیا کوئی عالم دین، کوئی صاحب فکر و نظر، کوئی دین کا فہم و شعور رکھنے والا اس صورت حال کو برداشت کرنے کو تیار ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں! تو پھر آپ مذہب حنفی کا سہارا لے کر کیوں باپ کے حق ولایت کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں جو مغربیت کے بڑھتے ہوئے طوفان میں والدین کے پاس ایک واحد سہارا ہے؟ افسوس کہ بعض فقہاء نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو شریعت سے بالکل مخالف ہے۔ عموماً ولایت والی احادیث کو ضعیف کہہ کر ٹالا

جاتا ہے حالانکہ وہ سند کے لحاظ سے صحیح اور مضبوط ہیں۔^[۱]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے بھی بیان کر دی جائے۔
شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں: ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لا نکاح الا بولی“ بغیر ولی کے نکاح جائز نہیں۔“ یاد رکھو! عقد کے بارے میں عورتوں کو ان کی عقل اور سمجھ کی کمی کی وجہ سے پورے اختیارات دے دینا قرین مصلحت و ثواب نہیں۔ اکثر اوقات وہ فائدہ یا نقصان سمجھنے سے قاصر رہتی ہیں اور خاندانی شرافت کا بہت کم لحاظ کرتی ہیں، غیر کفو کو اپنا شریک حیات پسند کر لیتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی قوم پر ننگ و عار عاید ہوتا ہے۔ اس خرابی کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اولیاء و سرپرست بھی عقد نکاح کے اختیارات میں ان کے ساتھ شریک ہوں۔ علاوہ ازیں جملہ اقوام میں یہ قانون جاری و ساری ہے اور گویا ان کی فطرت کا یہ تقاضا بھی ہے کہ مردوں کو عورتوں کے معاملات میں اختیار حاصل ہو اور وہ ان کے نگران اور محافظ ہوں، ان کے مصائب کا بوجھ انہی کے کندھوں پر ہو اور عورتوں کے اہم امور کا حل و عقد بھی انہی کے ہاتھ میں ہو۔ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ﴾^[۲] کا مضمون اور انعقاد نکاح کے لیے ولی کو شرط قرار دینے میں اس کی عزت افزائی ہے کیونکہ عورتوں کا مطلق العنان ہو کر خود نکاح کر لینا ایک طرح کی بے حیائی ہے۔ اس میں ان کے اولیاء اور سرپرستوں کی کسر شان اور عورتوں کی من مانی کا مظاہرہ ہے۔ ایک وجہ اور بھی ہے کہ تشہیر کے ذریعے سے نکاح سفاح (حرام کاری) سے ممتاز کرنا بھی بہت ضروری ہے اور وہ تشہیر ہی کیا ہوئی جس میں عورت کا اپنا ولی بھی مجلس نکاح میں حاضر نہ ہو۔“^[۳]

[۱] اگر تفصیل مطلوب ہو تو شیخ ناصر الدین البانی جو اس وقت عالم اسلام کے ایک بڑے محدث ہیں، کی

کتاب ارداء الغلیل، ج: 6، صفحہ: 235 تا 243 کو ملاحظہ کر لیا جائے

[۲] النساء: 34

[۳] حجة الله البالغة، حصہ دوم، صفحہ: 536

ولی کی شرط کیوں؟

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی اذن ولی کی شرط اس لیے نہیں لگائی گئی کہ اس سے عورتوں کے حقوق تلف کرنا مقصود ہے یا اس پر ظلم روا رکھنے کی یہ ایک صورت ہے بلکہ یہ تو عورت کی قدر افزائی ہے کہ اس کے سر پرست، ذمہ دار مرد اپنے ہاتھ سے اسے روانہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد والے تمام معاملات میں بھی، والدین کے دل و دماغ اس کی مدد کے لیے موجود ہیں۔ بچی جو ابھی زندگی کے نشیب فراز سے واقف نہیں، اس میں اس کے والدین کی اصابتِ رائے اور تجربہ اس کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ علاوہ ازیں الفت و محبت کی راہ بھی یہی ہے کہ ایک شخص اپنا معاملہ خود طے کرنے کے بجائے اپنے ماں باپ، اعزہ و اقارب یا احباب کے سپرد کر دے۔ اس طرح وہ اپنا مقصد بھی حاصل کر لیتا ہے، بلکہ زیادہ اچھے طریقے سے حاصل کر سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ولی کے ذریعے سے لڑکی کا نکاح معاشرہ کی ایک ایسی پختہ روایت رہی ہے جس کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوئی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا رواج کیوں نہیں پڑا؟ جواب واضح ہے کہ یہ کوئی مستحسن بات نہیں کہ لڑکے لڑکیاں اپنے نکاح خود چلانے لگیں اور الفت و محبت، امن و امان، مدد و تعاون کے سارے معاشرتی تعلقات ختم کر کے رکھ دیں، دوسری طرف ماں باپ مارے بے عزتی کے منہ چھپانے لگ جائیں۔

از روئے قرآن ولی کی رضا ضروری ہے:

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

1- ﴿وَلَا تُنْكَحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ط﴾ [۱]

”اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ

لے آئیں۔“

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن حزم اپنی کتاب ”المحلی“ میں لکھتے ہیں:

”یہاں خطاب عورتوں کے ولیوں کو ہے عورتوں کو نہیں، کیونکہ نکاح عورتیں خود نہیں کر سکتیں بلکہ ان کے ولی سرانجام دیتے ہیں۔“ [۱]

2- ﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَّامِي مِنْكُمْ﴾ [۲]

”تم میں سے جو لوگ مجرد ہیں (مرد ہوں یا عورت ان کے) نکاح کر دو۔“
یمن کے چیف جسٹس امام شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر (ج: 4، ص: 28) میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس آیت میں اولیاء کو مخاطب کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خاوند مخاطب ہیں مگر پہلی بات ہی زیادہ صحیح ہے اور اس آیت میں دلیل یہ ہے کہ عورت اپنا نکاح خود نہیں کر سکتی۔“
امام قرطبی بھی اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں: ”اس آیت میں اس امر کی دلیل ہے کہ عورت کا کوئی حق نہیں کہ وہ ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کرے اور یہی اکثر علماء کا قول ہے۔“ [۳]

3- ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ

أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ﴾ [۴]

”جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو تم ان کو نہ روکو اس بات سے کہ وہ اپنے (زیر تجویز) شوہروں سے نکاح کر لیں، جب کہ وہ معروف طریقے سے باہم نکاح پر راضی ہوں۔“

علامہ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”اس آیت میں اس امر کی دلیل ہے کہ عورت خود اپنا نکاح نہیں کر سکتی اور نکاح بغیر ولی کے نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ترمذی اور ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث بیان کی ہے کہ نبی

[۱] المحلی، ج: 9، ص: 421

[۲] النور: 32

[۳] تفسیر قرطبی، ج: 12، ص: 236

[۴] البقرہ: 232

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”عورت عورت کا نکاح نہیں کر سکتی اور نہ عورت اپنا نکاح آپ کر سکتی ہے۔“ [۱] (اس آیت کی مزید تشریح امام بخاری کی ایک حدیث سے ہو رہی ہے۔)

وہ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں اپنی صحیح میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ میں نے اپنی ہمشیرہ کا نکاح ایک آدمی سے کیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے طلاق دے دی۔ حتیٰ کہ عدت گزر گئی، پھر اس نے نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ جس پر میں نے کہا کہ میں نے اس کے ساتھ تیرا نکاح کیا، اس کو تیرا بستر بنایا، تیری عزت کی لیکن تو نے اسے طلاق دے دی اور اب پھر نکاح کا پیغام لے کر آ گیا ہے؟ اللہ کی قسم! اب وہ کبھی تیری طرف نہیں لوٹے گی اور وہ آدمی برا بھی نہ تھا اور وہ عورت بھی اس سے رجوع کرنا چاہتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی، جسے سن کر میں نے کہا کہ یا رسول اللہ! اب میں ان کا آپس میں نکاح کر دوں گا۔ چنانچہ میں نے اس کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا۔ [۲]

اس آیت کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: ”اگر وہ عورت از خود اپنا نکاح کرنے کی مجاز ہوتی تو پھر اپنے بھائی کی محتاج نہ ہوتی۔ علاوہ ازیں لفظ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (تم ان کو مت روکو) بالکل بے معنی ہوتے۔“ [۳]

قابل غور بات ہے کہ یہاں لفظ ”تم“ سے کون مراد ہے؟ لڑکی کا ولی اس کو روک رہا ہے، اللہ روکنے سے منع کر رہا ہے۔ کیا یہاں ”ولی“ کے علاوہ کوئی اور مراد ہو سکتا ہے؟ اگلا سوال یہ ہے کہ ماں باپ کے علاوہ لڑکی طلاق کے بعد کہاں جائے گی؟ اور جب وہ ماں باپ کے پاس آئے گی تو کیا پھر وہ ان کے مشورے اور رضا کو نظر انداز کر کے از خود شادی کر سکتی ہے؟ ولی کے بغیر تو وہ قدم بھی نہیں اٹھا سکتی۔

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج اول، ص: 323، طبع از: مکتبہ قدوسیہ

[۲] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب لا نکاح الا بولی، حدیث نمبر 5130؛ ابوداؤد: 2087

[۳] فتح الباری

احادیث کی راہنمائی:

1- ”لَا نِكَاحَ إِلَّا بِوَلِيٍّ“ (ولی کے بغیر نکاح صحیح نہیں) یہ روایت حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم یعنی چار صحابہ سے مروی ہے۔^[۱]

2- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ”جس عورت نے بھی ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ نکاح باطل ہے، وہ نکاح باطل ہے، وہ نکاح باطل ہے۔ اگر ان کا آپس میں ملاپ ہو گیا تو اس عورت کو حق مہر دیا جائے گا، اگر ان کا اختلاف اور جھگڑا ہو تو سلطان وقت اس عورت کا ولی ہوگا، جس کا کوئی ولی نہ ہو۔“^[۲]

3- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کوئی عورت کسی دوسری عورت کا نکاح نہ کرے اور نہ عورت خود اپنا نکاح کرے۔“^[۳]

ان تینوں احادیث کو خوب چھان پھٹک کر عالم اسلام کے موجودہ دور کے بڑے محدث شیخ ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب ارواء الغلیل میں صحیح قرار دیا ہے۔

4- لَا تُنْكَحُ الْاَيِّمُ حَتَّى تُسْتَأْمَرَ وَلَا تُنْكَحُ الْبِكْرُ حَتَّى تُسْتَأْذَنَ ”بیوہ کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس سے مشورہ نہ کر لیا جائے اور باکرہ کا نکاح اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس سے اجازت حاصل نہ کر لی جائے۔“^[۴]

5- ”شوہر دیدہ عورت خود اپنی ذات کی ولی سے زیادہ حقدار ہے اور کنواری کے نکاح کے وقت اس سے اجازت لے لی جائے اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔“^[۵]

[۱] ابوداؤد، کتاب النکاح: 2085؛ ترمذی کتاب النکاح: 1101؛ ابن ماجہ: 1881

[۲] ابوداؤد: 2083؛ ترمذی: 1102؛ ابن ماجہ: 1879

[۳] ابن ماجہ، دارقطنی

[۴] صحیح بخاری: 5136؛ صحیح مسلم: 1419؛ ترمذی: 1109

[۵] مسلم

حدیث نمبر 4 اور حدیث نمبر 5 کا مفہوم یہ ہے کہ ”ائیم“ سے مشورہ لیا جانا ضروری ہے۔ اسی طرح باکرہ سے اجازت لینا ضروری ہے، ولی کا فرض ہے کہ وہ ان سے مشورہ اور اجازت لے۔ ان احادیث کا یہ مفہوم ہرگز نہیں بنتا کہ ولی اور اہل خانہ اور اعزہ ان کے نکاح سے بالکل بے گانہ اور بے تعلق رہیں، ائیم اور شیب کی مرضی مقدم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، مگر اس مرضی کا انعقاد ولی ہی کے ذریعے سے ہوگا۔ اسی طرح باکرہ کی رضائی جائے گی مگر اس کا اول و آخر بند و بست ولی ہی کے ذریعے سے ہوگا۔

مسلمان خواتین کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہیں، اللہ اور رسولؐ کے احکامات کی پابند ہیں، وہ اہل مغرب کی طرح مادر پدر آزاد نہیں ہیں اور اللہ کا یہی فیصلہ ہے کہ:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ [۱]

”کسی ایماندار مرد یا ایماندار عورت کو یہ حق نہیں کہ جب کسی معاملہ میں اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دیں تو پھر وہ اپنی پسند اور مرضی اختیار کرتے پھریں۔ (یعنی اپنی من مانی کرتے رہیں)۔“

از روئے حدیث ولی کی ضرورت باکرہ کو بھی ہے اور شیب (شوہر دیدہ) کو بھی:

ولی کی اجازت اور اس کی رضا کی ضرورت نہ صرف بالغ بچی کو ہے بلکہ شوہر دیدہ عورت چاہے وہ مطلقہ ہو یا بیوہ، اس کو بھی ہے۔ حدیث لا نکاح الا بولی (ولی کے بغیر کسی عورت کا نکاح نہیں ہو سکتا) میں تمام عورتیں شامل ہیں۔ اس حدیث کو سترہ راویوں نے بیان کیا ہے۔ اگر دس راوی بھی ہوں تو وہ حدیث متواتر کے درجے کو پہنچ جاتی ہے اور یہاں تو سترہ صحابہؓ اس حدیث کو بیان کر رہے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت ابن ماجہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

”کوئی عورت دوسری عورت کی ولی بن کر نکاح نہ کرے اور نہ کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے۔ جو عورت اپنا نکاح خود کرے وہ زانیہ ہے۔“

امام ترمذی لکھتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا عمل ”لانکاح الا بولی“ پر ہے، اسی طرح تابعین میں سے سعید بن مسیب، امام حسن بصری، قاضی شریح، امام ابراہیم النخعی، عمر بن عبدالعزیز، سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام عبداللہ بن مبارک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ علیہم کا بھی یہی موقف ہے۔^[۱]

عقلی جواز:

عقلی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ولی کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیا انیم یا شیب (یعنی شوہر دیدہ عورت) اپنے گھر والوں سے بے نیاز ہو سکتی ہے؟ کیا اسے ان کے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے؟ آخر وہ طلاق کے بعد اپنے ولی کے علاوہ کس گھر میں جائے گی؟ پھر کیا وہ اپنے گھر والوں سے کہہ سکتی ہے کہ فلاں مرد میری نگاہ میں ہے، اس کے متعلق مجھے اتنی باتیں تو معلوم ہیں، باقی متعلقہ باتوں کا آپ پتہ کر دیں؟ وہ اپنے گھر والوں کی معلومات کی روشنی میں اپنی رائے پر غور کرے گی۔ ممکن ہے کہ اس کو جوئی معلومات ملیں، ان کی روشنی میں اپنا سابقہ انداز فکر بدل کر کسی اور شخص کے بارے میں غور کرنے لگے۔

باکرہ کی ضرورت:

ولی کی عملی ضرورت باکرہ کو تو شیب یعنی (شوہر دیدہ عورت) سے کہیں زیادہ ہے۔ چاہے وہ کسی لڑکے کے ساتھ کتنا ہی آزادانہ گھومے پھرے، اس کے ساتھ ”دلکش“ قسم کے ادبی اور عشقیہ ڈائلاگ بولے۔ مگر وہ یہ بات کیسے معلوم کر سکتی ہے کہ اس کے گھر کا ماحول کیا ہے، اس کے خاندان کے رسوم و رواج کیا ہیں، کیا یہ لڑکا شراب تو نہیں پیتا، کیا اس کی پہلے بیوی تو نہیں ہے، کیا اس کے گھر

میں حرام کی کمائی تو نہیں کھائی جاتی، کیا اس خاندان میں مقدمہ بازی کی وبا تو نہیں؟ سسٹنگ، ملک سے غداری اور جاسوسی وغیرہ کی وبا تو نہیں ہے؟ لڑکی اپنی جذباتی کیفیت میں اندھا دھند چھلانگ لگاتی ہوئی اس کے ساتھ گھر سے بھاگ جائے گی، انجام سے بالکل بے پروا ہو کر ایک اچھے مستقبل کی امید پر..... مگر کیا واقعی اس کا مستقبل اس کے خوابوں کے مطابق ہوگا؟ ہرگز نہیں!

خاندان کا استحکام:

خاندان اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اسی کی وجہ سے انسان کو معاشرتی مقام ملتا ہے جب وہ خاندان کے اندر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی بیوی ملکہ ہوتی ہے، اس کو ذرا خاندان سے نکالے تو ملکہ اور چمارن میں کیا فرق رہ گیا؟ [۱] پھر کسی معاشرہ اور ریاست کی تعمیر میں خاندان ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرتا ہے۔ اگر خاندان مستحکم اور مضبوط ہو تو اس کا مطلب ایک مضبوط و مستحکم معاشرہ ہے اور اگر معاشرہ کی بنیادی اکائی یعنی خاندان ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو، اُس کا کوئی سربراہ نہ ہو یا سربراہ کی مرضی و منشا کے بغیر افراد خانہ کو اپنے معاملات خود چلانے کی آزادی مل جائے تو اس سے خاندان کی چولیس ہل جاتی ہیں۔ شادی جیسا اہم ترین معاملہ آخر ولی کی اجازت اور منشا کے بغیر طے پا جانا کیا خاندان کے ادارے کو برقرار رہنے دے گا؟ وہ کون سی ضمانت ہے جو بچوں کو اپنے نکاح خود کرنے کی اجازت دے کر اسلامی معاشرہ کو ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت سے بچا سکے گی؟ ماں باپ کی رضا کے بغیر کسی غیر محرم کے ساتھ معاملات عشق طے کرنا اور پھر آبرو باختہ بن کر غیر محرم کے ساتھ بھاگ جانا معاشرہ کی اسلامی قدروں کو کہاں تک ”اسلامی“ رہنے دے گا؟ کیا یہی وہ حد نہیں ہے جس کو پھلانگنے کی اجازت دینا یعنی ایسے نکاحوں کو عدالت کی طرف سے قانونی اور جائز قرار دینا مسلمانوں کے تمام معاملات کو ابتر اور پراگندہ کر کے رکھ دے گا..... بچوں کو گھر،

[۱] چمارن اس لیے چمارن ہے کہ وہ چمار کی بیوی ہے اور ملکہ اس لیے ملکہ ہے کہ وہ بادشاہ کی بیوی ہے۔ اگرچہ اسلام اس ذات پات کا قائل نہیں مگر یہ ایک حقیقت تعارف کی خاطر ناگزیر ہو جاتی ہے۔ جب کوئی لڑکی اپنے گھر سے نکل جائے تو گھر میں وہ شہزادی تھی یا کسی معزز گھرانے کی بیٹی! مفرد رہنے کے بعد وہ صرف ایک آبرو باختہ لڑکی ہے اور بس۔

خاندان اور خود شریعت سے باغی کر دے گا، اس طرح امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کے مقاصد کو بروئے کار لانے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ مسلم معاشرہ کے والدین، اہل اقتدار، علماء، اساتذہ، صحافی سب اہل علم و فکر کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ماحول کے بگاڑ کو درست کرنے اور اس طرح کی بے راہ روی ختم کرنے کے لیے بھرپور مہم چلائیں۔ گھروں کے ماحول سنواریں، بچوں کی تربیت درست انداز میں کریں اور معاشرے سے ہیجان پرور فلمیں کیشیں ختم کریں اور گھر سے بھاگنے والی لڑکیوں کے طرز عمل کی حوصلہ شکنی کریں۔

مہم آزادی نسواں کی علمبردار خواتین [۱] لڑکیوں کو گھروں سے باغی بنانے میں اور شرعی احکام کو پامال کروانے میں تو بڑی دلچسپی رکھتی ہیں، مگر کیا انہوں نے کبھی ایسی لڑکیوں کے نتائج اور انجام کا سروے کرنے کی زحمت بھی کی ہے؟ نوخیز انجان بچیوں کو گھروں سے بھگانا ہی ان کی ساری تنگ و تاز کا حاصل ہے۔ اس کے بعد ان پر کیا بنتی ہے؟ اس سے یہ خواتین بالکل بے نیاز بن جاتی ہیں۔ یہ کہہ کر وہ کیسے چھوٹ سکتی ہیں کہ ہم ان لڑکیوں کو حق دلوانے کے لیے تو محنت کر سکتے ہیں، قبر تک ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

عموماً ایسی بچیاں صرف چند ماہ بلکہ چند دنوں کے بعد ہی صورت حال بالکل برعکس پاتی ہیں۔ معاشقہ تو صرف چند دن چلتا ہے، اب وہ زندگی کی منجد ہار میں غوطے کھانے کے لیے اکیلی ٹامک ٹوئیاں مارتی پھرتی ہیں۔ اگر والدین ساتھ ہوتے تو ہر مرحلہ پر اس کی مشکل حل کرتے اور ان کے معاملات سنوارتے۔ مگر اب تو وہ حالات کے رحم و کرم پر ہے۔ لہذا مرضی کی شادی کرنے والی 95% لڑکیوں کا انجام بہت ہی عبرت ناک ہوتا ہے۔ پھر ان کا راستہ یا تو عورتوں کے تاجروں کی طرف جاتا ہے یا پھر خودکشی کی طرف۔ ان کا معاملہ ”نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن“ والا بن کر رہ جاتا ہے..... اس کے برعکس صرف 5% ایسی شادیاں کامیاب ہو سکتی ہیں۔

یوں ”نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم“ والا مسئلہ بن جاتا ہے۔ شریعت کی مخالفت مول لے کر رب کو ناراض کیا، والدین کو ناراض کیا۔ مگر خاوند بھی اپنا نہ بن سکا۔

[۱] عاصمہ جہانگیر، حنا جیلانی، مہناز رفیع اور دیگر خواتین اور این جی اوز وغیرہ۔

مغربی کلچر کو شائع کرنے کا منظم پروگرام:

اصل میں اہل مغرب نے عورت کو کسبِ معاش کی خاطر گھر سے باہر نکال لانے کے بعد اگلا ٹارگٹ یہ رکھا ہے کہ نوجوان دوشیزہ کو گھر سے باہر نکال کر مسلم خاندانوں کا شیرازہ منتشر کر دیا جائے۔ ان کے خیال میں اسلامی معاشرت میں والدین کا خود بچیوں کی شادی کرنا ان کے مذموم عزائم کی راہ میں حائل تھا۔ جب تک یہ کام نہ ہو جائے اور لڑکیاں لڑکے خود آزادانہ نکاح نہ کرنے لگیں، مغربی کلچر پوری طرح مسلمانوں میں پھیل نہیں سکتا۔ لہذا انہوں نے باقاعدہ تنخواہ دار ایجنٹ اس کام پر مامور کیے ہیں۔ اسلام کی اجازت فقط یہ تھی کہ عورتوں سے، باکرہ ہوں یا ثیبہ، ان کی شادی کرتے وقت ان کے مشورے اور رضا کو پیش نظر رکھا جائے مگر اس بات کو اس حد تک بڑھا دیا گیا کہ ولی ختم کرو، لڑکی اتنی آزاد ہو جائے کہ جب چاہے اور جدھر چاہے جا کر نکاح کر لے۔ ایسی باتیں صریح طور پر اسلامی معاشرت کو ختم کرنے کی سازش ہیں۔ ہمارے یہاں کا سارا عشق پرور اور ہیجان انگیز ماحول، مخلوط تعلیم گا ہیں، ٹی۔وی، کیبل، ڈش، بلیو پرنٹس، گندی فلمیں، گندے رسائل و اخبارات، جتنے بھی لوگ یا ادارے اس عشق پرور ماحول میں آگ لگانے کا باعث ہیں، سب اللہ کے ہاں مجرم ہیں۔ یہ فحش اور بے حیائی کو پھیلانے کے مجرم ہیں، یہی نوجوان بچیوں کے بگاڑ کے ذمہ دار ہیں۔

ایک مشکل اور اس کا حل:

اب ایک مشکل باقی رہ جاتی ہے کہ نکاح کے لیے ولی اور لڑکی دونوں کی رضامندی ضروری ہے، مگر بعض اوقات کچھ استثنائی حالات بھی پیش آ سکتے ہیں۔ مثلاً والدین جو عموماً توشیفیق درجیم ہوتے ہیں، مگر چند ایک ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اپنی مصلحتوں کے مطابق (بچی کی رضا کو نظر انداز کر کے) شادی کر دیتے ہیں اور بچی کو اس جگہ شادی پسند نہیں ہوتی، یا آجکل ایسے بھی حالات پیش آرہے ہیں کہ لڑکیاں ملازمت کرتی ہیں اور ان کی آمدنی گھر کے معاشی حالات کو سنبھالادے رہی ہے۔ ایسی صورت میں والدین بچی کی شادی کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ایسی صورت میں بچی کیا کرے؟

جواب: یہ دو مختلف الگ الگ کیفیتیں ہیں اور دونوں کے الگ الگ جواب بالترتیب درج ذیل ہیں:

1- سنن نسائی کی ایک روایت ہے کہ ایک عورت دربارِ نبویؐ میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ! میرے باپ نے میری شادی میرے چچا زاد سے کر دی ہے جو مجھے پسند نہیں ہے۔“ اس عورت کی بات سن کر آپؐ نے معاملہ اس عورت کے سپرد کر دیا کہ تمہیں اس نکاح کو برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہے۔ تب اس لڑکی نے کہا: ”یا رسول اللہ! میرے باپ نے جو کچھ کیا، میں اس کی اجازت دے چکی ہوں، لیکن اس وقت سوال کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں عورتوں کو آگاہ کر دوں کہ باپ کے ہاتھ میں یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ بالغ لڑکی کا نکاح اس کی رضا حاصل کیے بغیر کر دے۔“ [۱]

یہ سنن نسائی کی روایت ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ والد یا سرپرست جو کوئی بھی ہے اس کے لیے لڑکی کی رضا لینا لازم ہے۔ اگر اس کی مرضی کے برعکس نکاح ہو گیا، تو اسے برقرار رکھنے یا نہ رکھنے کا لڑکی کو اختیار ہے۔ اگر وہ برقرار نہیں رکھنا چاہتی تب بھی وہ اپنی مرضی اپنی بہن، والدہ، سہیلی کسی بھی ذریعے سے اپنے والد تک پہنچائے گی اور وہ والد اور سرپرست ہی اس نکاح کو فسخ کرے گا اور اس کو فسخ کر کے دوبارہ اس کی رضامندی کے ساتھ اس کا نکاح کرے گا۔

ایک طرف یہ روایت لڑکی کے اختیار کو اگر مستقل قرار دے رہی ہے تو دوسری طرف ولی کو بھی اس کی ذمہ داری یاد دلا رہی ہے کہ وہ لڑکی کی رضامندی کو نظر انداز کر کے اس کا رشتہ طے نہیں کر سکتا۔ اب یہ اسی کی ذمہ داری ہے کہ اس نکاح سے بچی کو طلاق دلائے یا خلع کرائے اور دوبارہ اس کی منشا و مرضی کے مطابق اس کا عقد کرے۔

اگر آج کا مغرب زدہ طبقہ اس روایت سے لڑکی کی مادر پدر آزادی کا مطلب کشید کر رہا ہے تو وہ شریعت کی منشاء کے خلاف ہے، کیونکہ یہ نص پیش کی جا چکی ہے کہ بغیر اذن ولی کوئی نکاح نہیں ہو سکتا۔ آخر کن الفاظ سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ اب لڑکی خود کوئی لڑکا ڈھونڈے اور دونوں عدالت میں پیش ہو کر از خود اپنا نکاح رچالیں؟ از خود کوئی لڑکا ڈھونڈنا بغیر عشق و معاشقہ کے ممکن نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ غیر محرم لڑکے کے ساتھ کوئی شریف زادی تنہا جانے کو آمادہ نہیں ہو سکتی۔ گھروں سے فرار اختیار کرنے والی لڑکیاں اگر پہلے شریف زادیاں تھیں بھی، تو اپنے اس

عمل سے اب وہ شریف نہیں رہیں، بلکہ ذلیل اور آوارہ منس بن گئی ہیں۔ شریعت کے پورے اجتماعی نظام مثلاً غصن بھر، ستر و حجاب، محرم کے بغیر سفر، چوری چھپے دوستی و معاشرت غرض کس کس گناہ کی وہ مرتکب نہیں ہوئیں؟ شریعت کی کتنی حدود وہ پامال کر چکی ہیں! پھر وہ اپنے والدین کی ٹھنڈی چھاؤں اور اعزہ و اقارب کی شفقت کو لات مار کر باہر نکلی ہیں۔ لہذا نرم سے نرم الفاظ میں بھی وہ شریعت کی باغی قرار پاتی ہیں۔

رہا یہ سوال کہ لڑکی نے تو اپنے سر پرست تک یہ بات پہنچا دی ہے کہ اس کا نکاح اس کی مرضی کے برعکس ہوا ہے مگر سر پرست اس نکاح کو ختم کرنے یا فسخ کرنے کو بالکل تیار نہیں ہے تو پھر وہ کیا کرے؟
حکمنین:

اسلام نے ایسے خانگی مسائل جو گھر کے اندر حل نہیں ہو رہے، ان کے حل کے لیے خاندان کے ادارے کو اختیار دیا ہے۔ نکاح و طلاق کے مسائل کے بارے میں قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاتَّبِعُوا حُكْمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحُكْمًا مِّنْ أَهْلِهَا﴾^[۱] یعنی ایک معتمد آدمی مرد کی طرف سے اور ایک معتمد آدمی عورت کے گھر والوں میں سے اٹھے اور خاندان کے مسئلے کو خاندان کے اندر ہی حل کر لے۔

چنانچہ یہ خاندان کا ادارہ لڑکی کے حق کی بازیابی کے لیے سر پرست کو مجبور کر سکتا ہے۔ اگر پھر بھی لڑکی کا سر پرست اس پر آمادہ نہ ہو تو پھر معاملہ عدالت میں جاسکتا ہے۔ عدالت دیکھے گی کہ کس کی بات درست ہے؟ لڑکی کی یا باپ کی؟ اگر باپ کے پاس کوئی معقول وجہ نہ ہو تو عدالت باپ کو نظر انداز کر کے لڑکی کی مصلحت کو ترجیح دے گی۔

شیخ الحدیث مولانا عبدالمالک ایک فتوے کے جواب میں تحریر کرتے ہیں:

”اگر سمجھوتہ نہ ہو سکتا ہو تو پھر کیا کیا جائے؟ ایسی صورت میں حدیث شریف میں واضح کر دیا گیا ہے کہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ کس کی بات درست ہے؟ باپ کی یا لڑکی کی؟ باپ کے پاس کوئی معقول وجہ نہ ہو تو عدالت باپ کی مرضی نہیں، لڑکی کی مرضی کو فوقیت دے گی، لیکن اس

کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ بھاگ جائے۔ اگر لڑکی ایسا کرے گی تو ماں باپ اور خاندان کی حق تلفی کرنے کی مجرم شمار ہو کر تعزیری سزا کی مستحق ہوگی، اسی طرح لڑکا بھی۔ یعنی لڑکی اس بات کی پابند ہے کہ والد کے گھر میں رہ کر والد کے ملنے جلنے والوں، پنچایت یا عدالت کے ذریعے سے اپنا حق حاصل کرے۔ اگر باپ اس کا حق اس کے بغیر دینے کے لیے تیار نہ ہو تو اس صورت میں عدالت یا معاشرہ والد کو مجبور کریں گے کہ وہ لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے مطابق کرے۔

اس وقت جو مختلف واقعات پیش آئے ہیں ان میں عدالتوں کا فرض تھا کہ لڑکیوں کو والدین کے سپرد کرتے اور انہیں ایک محدود وقت دیتے کہ اس میں لڑکی کی شادی اس کی مرضی سے کر کے عدالت کو رپورٹ دیں، لیکن عدالتوں نے لڑکیوں کو معاشقہ کرنے والوں کے ساتھ رخصت کر کے بے راہ روی کا دروازہ کھول دیا ہے۔“ [۱]

2- رہی دوسری صورت کہ والدین سرے سے لڑکیوں کے نکاح کرتے ہی نہیں ہیں، حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب جوان بچی کا مناسب رشتہ مل جائے تو بالکل دیر نہیں کرنی چاہیے۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، یہ غیر مناسب بات ہے۔ اس صورت میں خاندان کے دوسرے بزرگ افراد لڑکی کے سرپرست کو ایسا کرنے پر مجبور کریں۔ اگر پھر بھی بات نہیں بنتی، تو لڑکی پھر بھی از خود نکاح نہیں کر سکتی بلکہ عدالت تک معاملہ پہنچائے گی اور قاضی لڑکی کے ولی کو مجبور کرے گا۔ بصورت دیگر خود ولی بن کر اس کا نکاح کروادیں گے، فرمان نبویؐ مسند احمد اور ترمذی میں موجود ہے کہ **اَلْسُلْطَانُ وَلِيٌّ مِّنْ لَاَ وَلِيٍّ لَّهٗ** (جس عورت کا کوئی سرپرست نہ ہو تو حاکم وقت اس کا ولی ہے)

یہاں اصل ولی موجود تو ہے مگر اپنی ذمہ داری پوری نہ کر سکنے کی بنا پر کالعدم سمجھا گیا اور خاندان کے دوسرے قریبی رشتہ دار لڑکی کے نکاح کے ذمہ دار ٹھہریں گے۔“

سول میرج ایکٹ:

کورٹ میرج، سول میرج یا لو میرج کو عرف عام میں عدالتی شادی کہا جاتا ہے۔ یہ سپیشل کورٹ میرج ایکٹ مجریہ 1872ء ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق کوئی مسلمان عدالت میں شادی

نہیں کر سکتا اور نہ ہی شادی کروانا عدالت کا کام ہے۔ اس قانون کے تحت شادی کے خواہشمند لڑکی اور لڑکے کو عدالت میں یہ بیان دینا پڑتا ہے اور مجسٹریٹ کے سامنے یہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ ان کا دنیا کے کسی بھی مذہب اسلام، ہندومت، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، سکھ مذہب وغیرہ سے تعلق نہیں۔ اس پر مجسٹریٹ ایک تصدیق نامہ لکھ دیتا ہے: ”چونکہ ان کا دنیا کے کسی بھی مذہب سے تعلق نہیں لہذا وہ شادی کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ اگر وہ لڑکا یا لڑکی یہ ظاہر کریں کہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر عدالت ان کو پابند کر سکتی ہے کہ وہ اپنے مذہب اور اپنے عائلی قوانین کے مطابق رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں۔“ یہی وجہ ہے کہ عدالتی شادیوں میں مذہب سے لا تعلقی کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ دوسری اہم شق یہ ہے کہ اس ایکٹ کے تحت اس جوڑے کی درخواست برائے عدالتی شادی 15 دن تک مستہر کی جائے تاکہ اگر کسی کو اس شادی پر کوئی اعتراض ہو تو وہ پیش کر سکے۔

قانونی ماہرین کی نظر میں اس وقت جتنی بھی شادیاں ہو رہی ہیں، وہ محض فراڈ اور دھوکہ ہیں۔ کوئی لڑکی عدالت کے سامنے بیان دیتی ہے کہ اس کے ماں باپ یا اس کی سوتیلی ماں اس پر ظلم کر رہے تھے یا اس کا نکاح کسی بوڑھے کے ساتھ کیا جا رہا تھا لہذا وہ گھر چھوڑ کر صرف تین کپڑوں میں بھاگ آئی ہے۔ اب فلاں لڑکے کی پناہ میں ہے لہذا اسے شادی کی اجازت دی جائے (حالانکہ یہ سب دھوکا ہوتا ہے، وہ کافی زیور اور رقم وغیرہ لے کر گھر سے بھاگتی ہیں)۔

افسوسناک پہلو تو یہ ہے کہ بظاہر یہ سارا کام عدالت کے نام پر ہوتا ہے حالانکہ عدالت تو صرف ایک تصدیق نامہ جاری کرتی ہے، شادی کروانا عدالت کا کام نہیں ہے۔ اب اگلا مرحلہ شروع ہوتا ہے، عدالت کے باہر بہت سے جعلی اشٹام فروش، وثیقہ نویس اور خود ساختہ وکیل جعلی نکاح فارم اور جعلی مہرے لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ اس جوڑے کے نکاح کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ صرف آدھے گھنٹے میں وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اس میں اشٹام کی خریداری، لکھت پڑھت، مجسٹریٹ کی جعلی یا اصلی تصدیق، نکاح خواں کا انتظام، جعلی گواہیاں، مٹھائی کھانا، ہار پہنانا، تصاویر بنانا اور مبارک سلامت پیش کرنا وغیرہ سب شامل ہوتا ہے۔ ضیاء دور میں حدود آرڈیننس نافذ ہوا تھا۔ اب اس کے بعد تو یہ پورے کا پورا کاروبار جعلی ہوتا ہے اور جعلی مہروں اور جعلی پتوں پر کام ہوتا ہے تاکہ کوئی وکیل، نکاح خواں یا گواہ پکڑا نہ جاسکے۔ پسند کی

شادیاں کروانے والا یہ مخصوص گروہ عدالتوں کے باہر چکر لگاتا رہتا ہے اور ہر جوڑے سے 500 روپے لے کر 5000 روپے تک بٹور لیتا ہے۔ لڑکی عموماً نقدی یا قیمتی زیورات گھر سے چرا کر لائی ہوتی ہے۔ اس کو تقریباً سارے اخراجات کرنا پڑتے ہیں اور وہ عدالت سے جو بیان حاصل کرتے ہیں اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ اغوا کے مقدمہ سے بچ جاتے ہیں۔

ایسی 90 فیصد شادیاں عام طور پر ناکام ہوتی ہیں اور بہت سی قانونی پیچیدگیاں اور معاشرتی مسائل جنم دیتی ہیں۔ اس میں نقصان سارا لڑکی ہی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ لڑکا تو کچھ عرصہ بعد اسے چھوڑ دیتا ہے اور پھر وہ نئی شادی رچا لیتا ہے، مگر لڑکی کی ساری زندگی محرومیوں کی داستان بن جاتی ہے۔ پسند کی ان شادیوں میں عموماً لڑکا تو حاوی رہتا ہے جبکہ لڑکی اپنے والدین، اعزہ و اقارب، بہن بھائیوں سب کو چھوڑ کر آئی ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ نکاح عدالت میں چیلنج ہو جائے (مثلاً صائمہ کیس) تو لڑکا صرف لڑکی کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اگر لڑکی یہ بیان دے دے کہ میں خود لڑکے کے ساتھ آئی ہوں تو لڑکے کا بچاؤ ہو جاتا ہے ورنہ وہ اغوا اور حدود کیس میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

1992ء میں سپریم کورٹ کے ایک فل بینچ نے جو جسٹس محمد رفیق تارڑ، جسٹس محمد کرم شاہ اور جسٹس محمد تقی عثمانی پر مشتمل تھا، اس نے یہ لکھا تھا: ”یہ نظریہ کہ ایک نوجوان لڑکی یا لڑکا یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے جیون ساتھی کی تلاش میں نکل کھڑا ہو، اسلامی تعلیمات کے صریحاً خلاف ہے۔ ویسے بھی خاوندوں کی تلاش، ان کی آزمائش اور متعلقہ تجربات میں خوفناک خطرات موجود ہیں۔“ صائمہ ارشد کیس میں ججوں نے یہ بات کہی کہ پسند کی شادی کے بارے میں ہمارا پاکستانی قانون تو خاموش ہے، لہذا اب عدالت کو ایسے کیسوں کے بارے میں اپنا اصل کردار ادا کرنا چاہیے (کیونکہ سول میرج ایکٹ میں کسی بھی مذہب سے لا تعلقی کا اظہار کرنا ضروری ہے، لہذا مسلمان اس کے تحت شادی کر ہی نہیں سکتا)۔

عدالت کو بالغ لڑکی اور لڑکے (جو والدین کے خلاف عدالت سے رجوع کرتے ہیں) کی شکایت سننی چاہیے، اگر وہ محسوس کرے کہ شکایت درست ہے تو پھر شکایت کنندہ کو باقاعدہ اجازتی سرٹیفکیٹ دے، یعنی وہ والدین کو طلب کریں، سارے حالات سے آگاہی حاصل کریں اور پھر خود ولی بن کر عدالتی اجازت نامہ جاری کریں اور حکومت کا یہ کام ہے کہ وہ باقاعدہ ایسا قانون بنائے یا آسان طریق کار وضع کرے جو ہماری روایات و اقدار کے مطابق ہو۔

10

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً﴾
(القرآن)

”تم نے ان عورتوں سے جو فائدہ اٹھایا اس کے بدلے ان کے
مہر بطور فرض ادا کرو۔“

(النساء: 24)

مہر

❁ مہر صرف عورت کا حق ہے

❁ مہر کی حقیقت

❁ مہر خوشی سے ادا کرنا چاہیے

❁ مہر کا حکم قطعی اور ابدی ہے

❁ مہر کی مقدار

❁ مہر واجب الادا ہے

❁ عورت کو مہر میں تصرف کا حق ہے

❁ ادائیگی کے لحاظ سے مہر کی قسمیں

❁ مہر کے بارے میں غلط تصورات اور ان کا حل

مہر

مہر صرف عورت کا حق ہے:

اعتراض کرنے والے نکتہ اٹھاتے ہیں کہ اسلام تو مہر کے عوض عورت کو فروخت کر دیتا ہے یا مہر کے عوض عورت کو خرید لیا جاتا ہے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے بلکہ یہ اصل حقیقت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، لہذا پہلے لفظ مہر کی حقیقت کو جاننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر مہر لڑکی کے ماں باپ وصول کرتے یا مہر دے کر مرد عورت کا مالک بن جاتا تو یہ بات شاید صحیح ہوتی، مگر یہاں حقیقت بالکل مختلف ہے۔ مہر کا مال صرف عورت کا ہوتا ہے، وہ اس کی مالک ہوتی ہے۔ وہ اس میں پوری طرح تصرف کرنے کی مجاز ہے، اس میں نہ تو عورت کے والدین دخل اندازی کر سکتے ہیں نہ اس کا شوہر، یعنی شادی کے بعد بھی عورت کی اپنی انفرادی پوزیشن برقرار رہتی ہے۔

مہر کی حقیقت:

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَبِمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ﴾ [۱]

”پھر تم نے ان عورتوں سے جو فائدہ اٹھایا تو انہیں ان کا اجر (یعنی مہر) دو۔“

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرد نکاح کے ذریعہ عورت سے جو فائدہ اٹھاتا ہے، مہر اسی کا صلہ اور بدلہ ہے۔ گویا مرد کو عورت پر جو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں وہ مہر کا معاوضہ ہیں۔ قرآن

مہر
پاک میں لفظ ”مہر“ استعمال نہیں ہوا، بلکہ اس کے لیے ”اجر“، ”صدقہ“، ”فریضہ“ وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہر سے مرد عورت کو خریدتا نہیں۔ نہ ہی عورت پر اس کو مالکانہ حقوق مل جاتے ہیں، عورت کی انفرادی حیثیت حسبِ سابق برقرار رہتی ہے۔ مہر تو مرد کو عورت سے جنسی استفادہ کا حق عطا کرتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی مرد سے یہ فائدہ اٹھاتی ہے مگر اسلام نے عورت پر کسی قسم کی مالی یا معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ اس لیے وہ اس استفادہ کے عوض کچھ ادا کرنے کی مکلف نہیں ٹھہرائی گئی۔ لہذا عورت تو مہر وصول کرنے کی حقدار ہے مگر اسے مرد کو کچھ ادا نہیں کرنا ہوتا۔ حق مہر سے عورت کو تحفظ ملتا ہے، اس کو فرض قرار دینے سے نکاح کی پائیداری مقصود ہوتی ہے۔

مہر کے بارے میں قرآن پاک کی تعلیمات مندرجہ ذیل ہیں:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أَجُورَهُنَّ﴾ [۱]

”تم کو ان عورتوں سے نکاح کر لینے میں کوئی حرج نہیں جب کہ تم ان کو ان کے مہر دے دو۔“

معلوم ہوا کہ نکاح میں مہر کی ادائیگی ضروری ہے، بلکہ نکاح اور بدکاری میں مہر ہی سے تمیز ہوتی ہے۔ ارشادِ بانی ہے:

﴿أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسْفِحِينَ﴾ [۲]

”تم (ان عورتوں کو) اپنے مالوں کے بدلے طلب کرو قیدِ نکاح میں لانے کے لیے نہ کہ بدکاری کے لیے۔“

یعنی ان عورتوں کو مہر دے کر ان سے نکاح کرو اور غرض یہ ہے کہ ساری زندگی اسے نکاح میں رکھیں گے، یہ نہیں کہ دو چار ماہ جنسی خواہش پوری کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیں گے۔ نکاح اور

[۱] الممتحنہ: ۱۰

[۲] النساء: ۲۴

سفاح (بدکاری) میں فرق ہی یہ ہے کہ نکاح اس ارادہ سے ہوتا ہے کہ زوجین کا باہمی تعلق مستقل ہوگا دونوں ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں گے، اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے جب کہ سفاح (زنا) میں آدمی وقتی طور پر اپنی جنسی خواہش پوری کر کے عورت کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور اس کی کوئی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ مہر مقرر کرنے میں نکاح کی پائیداری مقصود ہوتی ہے۔ پھر نکاح اور سفاح میں فرق صرف مہر کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ مرد پر عورت کی جو مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں سے ایک مہر بھی ہے۔ یہ ہوگا تو نکاح درست ہوگا وگرنہ نہیں۔ چنانچہ احادیث سے بھی اس کی وضاحت ملتی ہے۔

نبی پاکؐ کا ارشاد ہے:

أَحَقُّ الشُّرُوطِ أَنْ تُؤْفَوا بِهِ مَا سَتَحَلَّلْتُمْ بِهِ الْفُرُوجَ
 ”جن شرطوں کو تم پورا کرتے ہو ان میں سے سب سے زیادہ پورا ہونے کی مستحق

شرط وہ ہے جس کی وجہ سے تم نے عورتوں کی ناموس کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔“ [۱]

”جس نے مال کے عوض کسی سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہیں

کرے گا، وہ دراصل زانی ہے۔“ [۲]

اس لیے بعض فقہاء کا یہ قول ہے کہ مہر ارکانِ نکاح میں سے ہے، اگرچہ بوقتِ نکاح اس کا ذکر نہ بھی ہوا ہو۔ شوافع اس کو عورت کا حق قرار دیتے ہیں جب کہ احناف اس کو شریعت کا حق قرار دیتے ہیں۔

مہر خوشی سے ادا کرنا چاہیے:

حکم ربانی ہے:

﴿وَأَتُوا النِّسَاءَ صَدُقَتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ [۳]

[۱] بخاری و مسلم

[۲] کنز العمال

[۳] النساء: 4

مہر

یعنی ”عورتوں کو مہر خوش دلی سے ادا کرو۔“

ثابت ہوا کہ مہر ادا کرتے وقت دل میں تنگی یا ملال نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں مہر کے لیے لفظ ”صدقہ“ استعمال کرنا بڑا با معنی ہے۔ یہ لفظ ”صدق“ سے بنا ہے، جو کذب کی ضد ہے۔ مہر کے لیے لفظ ”صدقہ“ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ اس کامیاں بیوی کے درمیان موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دل سے شریعت کی موافقت کرتے ہیں، یا مہر شوہر کے دعوائے محبت میں سچا ہونے کی دلیل ہے۔

جو چیز شوہر کے خلوص و محبت کی دلیل ہو اس کو بیوی کی قیمت قرار دینا تو مرد کے خلوص و محبت کی توہین ہے۔ پھر آگے لفظ ”نخلہ“ نے مزید وضاحت کر دی ہے کہ یہ مہر خود بخود خوشی سے ادا کیا جائے گا، اس میں ٹال مٹول نہ ہوگی۔ کیونکہ جو چیز تکرار اور بحث مباحثہ کے بعد دی جائے، اسے نخلہ یعنی تحفہ اور عطیہ نہیں کہا جاسکتا۔

مہر کا حکم قطعی اور ابدی ہے:

قرآن و سنت کی رو سے مہر ادا کرنا لازمی ہے۔ اس کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص نکاح کے وقت مہر کا ذکر بھی نہ کرے یا یہ شرط لگا دے کہ وہ مہر ادا نہیں کرے گا، تب بھی خود بخود اس کو دینا واجب ہو جائے گا۔ کیونکہ مہر کا حکم تو اللہ کی طرف سے ہے، لہذا اس میں بندے کا کوئی اختیار ہی نہیں کہ وہ دے یا نہ دے۔ لہذا مہر کا حکم قطعی ہے اور تا قیامت ابدی ہے۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ آج کل جو خواتین کما رہی ہیں ان کو مہر کی کیا ضرورت ہے؟ یہ مفروضہ بھی بالکل غلط ہے۔ مہر کی اپنی افادیت ہے، جو بہر حال برقرار ہے۔ چاہے عورت صاحب مال ہو یا خود کماتی ہو، بہر صورت نکاح کی شکل میں اسے مہر ادا کرنا ہوگا۔ فائدہ اس کا دونوں کو ہے، مرد کو بھی اور عورت کو بھی۔ مرد نے چونکہ مہر دینا ہوتا ہے، اس نے پیسہ صرف کرنا ہے لہذا وہ عورت کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ قابل قدر سمجھتا ہے کہ مہر دینے کے بعد ہی مجھے اس پر زوجیت کے حقوق حاصل ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر مرد عورت کو طلاق دے دے تو ایک تو اس کا موجودہ بیوی کا مہر جائے گا، پھر دوسری شادی کے لیے از سر نو مہر کی رقم خرچ کرنا ہوگی۔ اس طرح مہر کی

رقم طلاق کی راہ میں بھی رکاوٹ ہے، آدمی سو بار سوچتا ہے۔ جہاں اس نے رقم خرچ کی ہوتی ہے، اسے وہ فضول میں ضائع نہیں جانے دیتا، لہذا اس سے حتی الوسع نبھاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ عورت کو مہر کا یہ فائدہ ہے کہ نئے گھر میں آنے پر یہ اس کی دلجوئی ہے اور اس کی مالی مدد ہے، جس کو وہ اپنے اخراجات میں صرف کرنے کی مجاز ہے۔

مہر کی مقدار:

اصل مسئلہ یہ ہے کہ مہر کی مقدار کتنی ہو، زیادہ ہو یا کم؟ شریعت نے از خود مہر کی مقدار مقرر نہیں کی ہے بلکہ ہر آدمی پر حسبِ توفیق بوجھ ڈالا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿لِيُنْفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِۦ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَّا آتَاهَا ۚ﴾ [۱]

”خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق خرچ کرے اور جس کو رزق کم دیا گیا ہے وہ اسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ نے جسے جتنا کچھ دیا ہے وہ اس سے زیادہ کا اسے مکلف نہیں کرتا۔“

اس سے ثابت ہوا کہ مہر حسبِ توفیق ہو۔ نہ اپنی ہمت سے زیادہ اور نہ کم (اگرچہ یہ آیت مہر کے تعین کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ مرد کے عورت پر خرچ کرنے کے بارے میں اصل الاصول ہے۔ تاہم مہر بھی اس خرچ کا ہی ایک حصہ ہے) اپنی خوشی سے کئی لاکھ روپیہ بھی باندھ دیا جائے اور اس کی ادائیگی کر دی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَأَتَيْتُمَا حُدُودَهُنَّ فَنِظَرَا ۚ﴾ [۲]

”تم ایک عورت کو ڈھیروں مال دے چکے ہو۔“

[۱] الطلاق: 7

[۲] النساء: 20

مہر

دوسری طرف نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات ہیں:

إِنَّ أَكْثَرَ النِّكَاحِ بَرَكَهٖ أَيْسَرُ كَمُؤْنَةٍ ۝ [۱]

”وہ نکاح بڑی برکت والا ہے جس میں محنت کم ہو (یعنی مہر اور خرچہ کم ہو)۔“

احادیث سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ مہر میں مبالغہ کرنا یا مرد کی ہمت سے زیادہ مہر باندھنا ناروا ہے۔ نبوی دور میں قبیلہ بنی فزارہ کی ایک خاتون دو جوتیوں کے مہر پر راضی ہو گئی تھی۔ اسی طرح ایک خاتون سیدہ ام سلیمؓ کو ابو طلحہؓ نے جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے، نکاح کا پیغام دیا۔ آپؐ نے نکاح کے لیے شرط ان کا اسلام قبول کرنا طے کر دی۔ جس پر ابو طلحہؓ نے اسلام قبول کر لیا اور دونوں کا نکاح ہو گیا۔ اس نکاح میں شوہر کا اسلام قبول کر لینا ہی حضرت ام سلیمؓ کا مہر ٹھہرا۔ [۲] معلوم ہوا کہ کم مہر باندھنا جائز ہے جب کہ دونوں فریق اس پر راضی ہوں۔ کھجور یا ستو کی مٹھی، جوتی کے جوڑے، لوہے کی انگوٹھی تک بھی حق مہر ہو سکتا ہے۔ قرآن کی سورتیں یاد کروانے پر بھی حق مہر ادا ہو گیا۔ کہیں مرد کا اسلام قبول کرنا ہی عورت کا حق مہر بن گیا۔ یہ سب صورتیں مہر کی کمی اور بیشی، دونوں پر دلالت کرتی ہیں۔

حضرت عمرؓ کا قول ہے: ”حد سے زیادہ مہر مقرر نہ کرو۔ کیونکہ یہ بات دنیا میں قابلِ فخر یا آخرت میں اللہ کے ہاں مفید بات ہوتی تو پھر رسول اکرمؐ اپنی بیویوں کا حق مہر زیادہ باندھنے کے زیادہ حقدار تھے۔ مگر آپؐ کی سب بیویوں کا حق مہر (سوائے حضرت ام حبیبہؓ کے اور حضرت خدیجہؓ کے) اور سب بیٹیوں کا حق مہر (سوائے حضرت فاطمہؓ کے) بارہ اوقیہ اور نصف سے زائد نہ تھا۔ جو 500 درہم بنتے ہیں۔ جو ہمارے اوزان کے مطابق 131¼ تولہ چاندی یا 1837½ گرام چاندی بنتی ہے۔ حضرت فاطمہؓ کا حق مہر 400 مثقال چاندی تھا۔

[۱] مسند احمد۔ بیہقی فی شعب الایمان

[۲] نسائی، کتاب النکاح

ازواج مطہرات کا عمومی حق مہر

کتب احادیث کی رو سے ازواج مطہرات کا عمومی حق مہر 500 درہم ہوتا تھا جو ہمارے آجکل کے مرؤہ اوزان کے مطابق 1837.5 گرام یا پھر 131.25 تولے چاندی بنتا ہے۔ اتنی چاندی کی موجودہ مالیت نکال لی جائے تو یہی ازواج مطہرات کا عمومی حق مہر قرار پائے گا۔

درہم دراصل چاندی کا ایک سکہ تھا جس کا وزن کم و بیش ہوتا رہتا تھا لہذا درہم کا وزن متعین کرنے میں ماہر محققین کے نزدیک کچھ اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ مذکورہ بالا وزن یعنی 1837.5 گرام یا 131.25 تولے چاندی مولانا صفی الرحمن مبارکپوری کی تحقیق کے مطابق بیان کیا گیا ہے اور برصغیر پاک و ہند میں یہی وزن رائج ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے اپنی ازواج کے حق مہر کس طرح مقرر کیے، درج ذیل تفصیل سے معلوم ہو جائے گا:

حضرت خدیجہؓ کا حق مہر 20 اونٹ تھا۔ 20 اونٹوں کی موجودہ قیمت کافی زیادہ ہے۔^[۱]
حضرت ام حبیبہؓ کا حق مہر چونکہ شاہ نجاشی نے ادا کیا تھا وہ بھی چار ہزار درہم یا دینار تھا.....

تقریباً تمام کتب سیرت میں یہ -/4000 دینار ہی دیا گیا ہے یا پھر -/4000 درہم۔
حضرت سودہ کا حق مہر 400 درہم مقرر کیا گیا تھا۔^[۲]

حضرت عائشہؓ کا مہر 500 درہم تھا..... ایک روایت کے مطابق ان کو ایک مکان دیا

گیا تھا۔^[۳]

حضرت صفیہؓ کا حق مہر ان کی آزادی تھا۔

[۱] ”تذکار صحابیات“ از طالب ہاشمی

[۲] سید سلیمان ندوی

[۳] ایضاً

حضرت ام سلمہؓ کا حق مہر خُرے کی چھال سے بھرا ہوا تکیہ، دو مشکینزے اور دو چکیاں تھا۔
حضرت میمونہ بنت حارث کا حق مہر بھی 500 درہم مقرر کیا گیا تھا۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کی بیٹیوں کا حق مہر بھی 500 درہم کے کم و بیش ہی تھا۔ صرف
حضرت فاطمہ الزہراءؓ کا حق مہر 400 مثقال چاندی تھا جو 150 تولے چاندی بنتی ہے۔

اس طرح آپ ﷺ کی سب ازواج مطہرات (سوائے حضرت خدیجہؓ اور ام حبیبہؓ کے) اور سب بیٹیوں کا حق مہر (سوائے حضرت فاطمہؓ کے) (بارہ اوقیہ اور نصف) یا
500 درہم = 131.25 تولہ چاندی تھا لہذا 131.25 تولے چاندی کی موجودہ قیمت نکال لی
جائے۔ ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ حق مہر اس ستودہ صفات ہستی نے ادا کیا، جو صبح و شام تبلیغ
اور دینی امور سرانجام دینے میں مصروف رہتے تھے۔ جن کے کاشانہ میں دو دو ماہ تک چولہا بھی نہ
جلتا تھا۔

اگرچہ مہر کی کم از کم مقدار فقہ حنفیہ میں دس درہم اور فقہ مالکیہ میں پانچ درہم ہے، مگر حقیقت
یہ ہے کہ شرع میں اس کی مقدار، بالکل معین نہیں کی گئی۔ اس کی بنیاد تو میاں بیوی کے درمیان پیار و
محبت ہے لہذا اگر بیوی تھوڑا بھی لینے پر راضی ہو تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے! اسی طرح مرد کو اپنی
حیثیت کے مطابق دینا چاہیے۔ وہ اپنی استطاعت سے زیادہ بھی دے سکتا ہے تو اس میں کوئی حرج
نہیں۔ البتہ دونوں باتوں میں مبالغہ درست نہیں کہ وہ صاحب حیثیت ہو کر بھی کمینگی اختیار کرے،
یا محض نمود و نمائش کے لیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر مہر باندھ لے۔

قرآن کریم نے اس ضمن میں اسی قسم کی ہدایت دی ہے جو درج ذیل ہے:

﴿فَإِنْ كُحِّوْهُنَّ بِأَذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾^[۱]

”ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کرو اور معروف کے مطابق ان

کے مہر ادا کرو۔“

یہاں ”اجور“ سے مراد ”مہر“ ہے اور اس ”مہر“ کو ”معروف“ کا پابند بنایا گیا ہے۔ معروف سے یہاں مراد کسی بھی دور کا رسم و رواج یا خاندانی روایات ہیں، جن کو عام طور پر پسندیدہ نظر سے دیکھا جاتا ہو۔ اس لیے جس مقدار کو بھی معقول یا مناسب سمجھا جائے، وہی صحیح مہر قرار پائے گی۔ اس میں مرد اور عورت دونوں کے باہمی اعتماد، سماجی حیثیت کی بھی رعایت ہونی چاہیے اور زمانہ و حالات کی بھی، وگرنہ وہ اچھی نظروں سے نہ دیکھا جائے گا۔

مہر واجب الادا ہے:

پس نکاح کے وقت جو رقم بھی بطور مہر مقرر ہوگئی، اس کو پورا کرنا مرد پر لازم ہے۔ اگر وہ اس قرارداد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مرد سے روک لے۔

مہر مثل:

بعض اوقات بوقت نکاح مہر کا ذکر نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں بھی مہر ادا کرنا لازم ہے۔ اس کو ”مہر مثل“ کہا جاتا ہے۔ یعنی عورت کے خاندان میں عموماً عورتوں کو جو حق مہر ملتا ہے وہی اس کو ملے گا۔ مہر مثل میں ان عورتوں کا اعتبار کیا جاتا ہے جو عورت کے باپ کے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں مثلاً اپنی بہنیں، پھوپھیاں، چچا زاد بہنیں وغیرہ۔ اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وہ روایت ہے جس کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ فتویٰ ہر ایسی عورت کے حق میں تھا جس کا مہر نکاح کے وقت مقرر نہ کیا گیا تھا۔ تو آپؓ نے فرمایا کہ اسے اپنے خاندان کی عورتوں کے مہر کے مثل ملے گا۔ مہر مثل میں والدہ یا اس کے خاندان کے مہر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر والدہ باپ ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہو تو اس صورت میں اس کے مہر کا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

عورت کو مہر میں تصرف کرنے کا حق ہے:

پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ مہر کا مال مکمل طور پر صرف عورت کا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے اعزاز و اکرام میں ہوتا ہے لہذا نہ تو عورت کے والدین اس سے یہ مال لے سکتے ہیں اور نہ شوہر اس کے مال میں کوئی اختیار رکھتا ہے۔ عورت اس مال کو اپنی مرضی سے استعمال کرے گی۔ چاہے تو اس سے کاروبار کرے، چاہے ہبہ کرے اور چاہے تو باہمی محبت و اعتماد کے طور پر وہ مرد کو مال (پورا یا اس کا کچھ حصہ) معاف کر دے۔ اگر وہ خوش دلی سے اپنے مہر کا کچھ حصہ مرد کو معاف کر دے تو مرد اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ مگر یہ معاف کرنا مرد کے جبر کے نتیجہ میں نہ ہو بلکہ عورت کی اپنی خوشی اور محبت کی وجہ سے ہو۔ ارشادِ الہی ہے:

﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا﴾^[۱]

”پھر اگر وہ بخوشی اس میں سے کچھ دے دیں تو تم مزے سے اسے کھا سکتے ہو۔“

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت نے مہر معاف کر دیا مگر بعد میں پھر اس کا مطالبہ کر دیا، ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ تو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ کہیں اس نے جبر کی بنا پر تو معاف نہیں کیا تھا؟ اگر شوہر کے جبر کے نتیجے میں معاف کیا تھا تو مرد کو اسے حق مہر ادا کرنا پڑے گا۔ یہ حضرت عمرؓ اور قاضی شریح کا فیصلہ ہے۔ انہوں نے قاضیوں کو لکھا: ”عورتیں رغبت سے بھی اور خوف سے بھی (مہر) دے دیتی ہیں۔ اگر عورت مہر دینے کے بعد پھر رجوع کرنا چاہے تو اسے اس کا حق حاصل ہوگا۔“^[۲]

[۱] النساء: 4

[۲] تفہیم القرآن، جلد اول، سورۃ النساء، حاشیہ نمبر 7

قرآن پاک میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا تَرَضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِيضَةِ ۚ﴾ [۱]
 ”اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ مہر مقرر ہونے کے بعد تم آپس کی رضامندی سے اس کے بارے میں کوئی بات طے کر لو۔“

چنانچہ عورت اور مرد کی رضامندی سے مہر میں کمی بھی ہو سکتی ہے اور زیادتی بھی، ادائیگی جلد بھی ہو سکتی ہے اور تاخیر سے بھی، معافی بھی ہو سکتی ہے اور تبدیلی بھی۔ مثلاً مہر میں زیور متعین تھا، اس کی بجائے رقم دے دی، باغ متعین تھا اس کے بجائے دکان دے دی وغیرہ۔ یہ تمام کمی بیشی تو دونوں کے باہمی اعتماد پر ہے۔ اس لیے شریعت نے معاملہ دونوں کی رضامندی پر چھوڑ دیا ہے تاکہ معاملات خوشگوار انداز میں چلتے رہیں۔

اسلام..... حقوقِ نسواں کا محافظ:

اندازہ کریں کہ اسلام نے عورتوں کے حقوق کا کس حد تک خیال رکھا ہے۔ دنیا کی تمام نام نہاد ترقی پسند تہذیبیں جو آزادیِ نسواں کی آڑ میں شہوت پرستی کو فروغ دینا چاہتی ہیں، فی الحقیقت ان کے پاس عورت کی فلاح و بہبود کے لیے کوئی ٹھوس پروگرام نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن و سنت نے عورت کو جو تحفظ دیا ہے، مالی اور معاشرتی دونوں لحاظ سے غیر اسلامی تہذیبیں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ مہر کا رکنِ نکاح ہونا اور پھر مہر میں عورت کو تصرف کا اختیار دینا عورت کو مالی لحاظ سے بھی فائدہ دیتا ہے اور معاشرتی لحاظ سے بھی اس کے لیے اعزاز و اکرام ہے۔

ادائیگی کے لحاظ سے مہر کی قسمیں:

(۱) مہرِ مَکْجَل (۲) مہرِ مَوْجَل

(1) مہرِ مؤجل:

وہ مہر جو نکاح کے وقت ہی ادا کر دیا جاتا ہے۔

(2) مہرِ مؤجل:

مہرِ مؤجل اس مہر کو کہتے ہیں جو خاوند کچھ مدت کے بعد ادا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ مگر آج کل مہرِ مؤجل کا مفہوم یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ نکاح کے وقت لاکھوں کی دستاویز لکھ دی جاتی ہیں مگر دل میں یہ ہوتا ہے کہ کون لیتا ہے اور کون دیتا ہے! گویا ابتدا ہی سے یہ سارا کام نمائی ہوتا ہے اور ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس نیت کے ساتھ (یعنی مہر ادا نہ کرنے کی نیت سے) جو نکاح کیا جائے وہ ابتدا ہی سے فاسد ہے۔ حقیقی مہرِ مؤجل یہ ہے کہ اس میں واضح طور پر یہ مذکور ہو کہ مرد اتنی مدت میں اسے ادا کر دے گا۔ جس مہر میں مدت کا تعین نہ کیا گیا ہو وہ مہر عند الطلب (ON DEMAND) کی حیثیت رکھتا ہے کہ جب عورت مطالبہ کرے اسے دے دیا جائے۔

مہر کے بارے میں غلط تصورات اور ان کا حل:

ہمارے ہاں مہر کے بارے میں ایک اور غلط تصور رائج ہو گیا ہے کہ وہ یا تو طلاق کے وقت ادا کیا جاتا ہے یا مرتے وقت بیوی سے معاف کر لیا جاتا ہے۔ اگر مرد کو بیوی سے مرتے وقت معاف کرانے کی مہلت نہ ملی ہو تو موت پر اس کے ترکہ میں سے بیوی کو ادا کر دیا جائے گا، مگر یہ سارا نقطہ نظر مہر کی روح کے بالکل خلاف ہے۔ حق تو یہی ہے کہ مہر فوراً ادا کیا جائے اور اگر سہولت کی خاطر مرد کو مہلت دے دی جاتی ہے تو اس کا یہ مفہوم ہر گز نہیں ہونا چاہیے کہ اب طلاق کے علاوہ کبھی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہر خدا ترس مسلمان کو مہر کی ذمہ داری سے جلد از جلد فارغ ہونے کی فکر کرنا چاہیے اور عداً یا لا پرواہی سے ٹال مٹول کر کے قرض چھوڑ کر نہیں مرنا چاہیے، کیونکہ اس طرح تو وہ مقروض مرتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو مقروض کی نماز جنازہ بھی پڑھانے سے انکار فرما دیتے تھے۔

لہذا ضروری ہے کہ:

(1) حق مہر مالی استطاعت سے بڑھ کر نہ باندھے جائیں۔ (2) فی الفور ان کو ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔ (3) اگر وہ زیادہ ہیں اور فوراً ادا نہیں کیے جاسکتے تو ان کو قسط وار ادا کیا جائے یا کچھ حصہ بیوی سے معاف کر دیا جائے۔ بیوی بھی اگر نیک دل ہوگی تو ضرور اس سلسلے میں تعاون کرے گی۔

مگر مردوں نے آج کل حکم قرآنی ”باہمی رضامندی سے حق مہر میں کمی بیشی“ سے جو مفہوم مراد لیا ہے کہ لازماً عورتوں سے معاف ہی کروانا ہے اور لازماً حق مہر کو مؤجل ہی رکھنا ہے، یہ شریعت کے ساتھ مذاق ہے۔

اس رجحان کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔ اس کے مقابلے میں تھوڑا حق مہر باندھنا اور پھر اس کو جلدی ادا کرنا بہت اچھا ہے۔ زیادہ حق مہر باندھنے میں ایک اور بھی قباحت ہے۔ اگر خدا نخواستہ میاں بیوی میں موافقت نہ ہو سکے تو یہ مہر کی زیادتی خود عورت کے لیے بہت بڑا وبال بن جاتی ہے۔ مرد اتنا بڑا مہر اس کو دے نہیں سکتا، لہذا وہ غریب مُعلق پڑی رہتی ہے۔ ”نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن“ والا معاملہ بن جاتا ہے۔

بوقتِ نکاح مہر کی عدم صراحت کی صورت میں تمام مہر معجل متصور ہو تو بہت اچھا ہے اور اگر یہ نکاح کے وقت ہی بیوی کو زیورات، کپڑوں وغیرہ کی شکل میں دے دیا جائے تو اور بھی اچھا ہے۔ کیونکہ بعد میں مہر ادا کرنے کی جتنی بھی شکلیں ہیں، ان میں نزاع والی کوئی نہ کوئی بات پیدا ہو جاتی ہے اور مرد فوراً کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے بیوی سے معاف کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ یہ معافی قانوناً ہونی چاہیے بلکہ اشٹام پر لکھی جائے، اس پر سرپرست گواہوں کے دستخط ہوں، تاکہ بعد میں کوئی اختلاف پیدا نہ ہو سکے۔

مشرّف دور میں صدر مشرف نے اپنی کابینہ میں ایک بل منظور کیا جس کے مطابق طے کیا گیا کہ ”نکاح نامے میں لکھا جانے والا حق مہر شادی کے وقت لازماً ادا کرنا ہوگا۔ اور فیملی

ہر
 کورٹس عورتوں کے مقدمات ایک ماہ کے اندر نمٹانے کی پابند ہوں گی۔^[۱]
 مگر افسوس ہے اس آرڈیننس پر کوئی عمل نہیں ہو سکا۔ پھر یکم ستمبر 2007 کو حکومت نے
 حکم دیا کہ نکاح نامے میں جو مہر لکھا جائے، شوہر کو اس کو فوراً ادا کرنے کا پابند کیا جائے۔ وفاقی
 کابینہ نے فیملی کورٹس کو پابند کیا کہ خلع، جہیز اور جائیداد کے مقدمات کو ماتحت عدالتیں 3 ماہ میں
 جبکہ ہائی کورٹ ایک ماہ میں نمٹانے کی پابند ہوگی۔ (نوائے وقت لاہور) مگر افسوس کہ عمل درآمد
 نہیں ہو رہا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 ﴿فَإِنْ كُنْتُمْ أَحِبُّوْنَ مَا طَآبَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مِثْلِيْ وَلَوْلَا رُبْعٌ
 فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةٌ﴾
 ”تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں، ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے
 نکاح کرلو۔ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ
 عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کافی ہے۔“ (النساء: 3)

تَعْدِدِ اَزْوَاجٍ

- ✿ مخالفت کی اصل وجہ
- ✿ تَعْدُوْا زَوَاجَہ کا آغاز کب ہوا؟
- ✿ مرد کی ضرورت
- ✿ عورت کا بانجھ پن
- ✿ معاشرتی ضرورت
- ✿ کیا عورت کو بھی چار شادیوں کی اجازت مل سکتی ہے؟
- ✿ ہولناک نتائج
- ✿ اسلام میں تَعْدُوْا زَوَاجَہ کے احکام
- ✿ حکم نہیں بلکہ اجازت ہے
- ✿ دوسری شادی عیاشی یا تفریح کا ذریعہ نہیں
- ✿ پابندیوں کی تفصیل
- ✿ جائزہ

تَعْدِ دَازِوَج

ایک مرد کا کئی بیویوں سے شادی کر لینا تَعْدِ دَازِوَج کہلاتا ہے۔ دورِ جدید میں اسلام پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان میں سے ایک اہم اعتراض اسلام کا ایک سے لے کر چار عورتوں تک کے ساتھ شادی کر لینے کی اجازت دینا بھی ہے کہ ”انسان کی فطرت تو ایک بیوی کا تقاضا کرتی ہے، لہذا یہ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ دوسری طرف عورت کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہے کہ ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی بھی آجائے اور ساری عمر اس کی حریف اور مد مقابل بن کر اس کو چڑاتی رہے۔ یہ صریح ظلم و زیادتی ہے۔“

چنانچہ اس ”صریح ظلم و زیادتی“ کو روکنے کے لیے بعض ممالک میں قانوناً صرف ایک ہی بیوی رکھنے کی اجازت ہے۔ بعض ممالک میں تَعْدِ دَازِوَج پر کوئی پابندی تو نہیں مگر اخلاقی اور معاشرتی طور پر اس کو بہت برا سمجھا جاتا ہے، جبکہ عرب ممالک میں تَعْدِ دَازِوَج پر نہ کوئی قانونی پابندی ہے اور نہ اس کو معاشرتی اور اخلاقی طور پر برا سمجھا جاتا ہے۔

مخالفت کی اصل وجہ..... ان کا مخصوص پس منظر:

اہل مغرب قانونی طور پر تَعْدِ دَازِوَج کے مخالف ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں میں ابتدا ہی سے عورتوں سے تعلقات رکھنا روحانیت کے خلاف اور نیا داری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ جہاں عورت کو ”گناہ کا دروازہ“ اور ”غارت گردِ ربائی“ سمجھا جاتا ہو، وہاں سرے سے شادی کرنا ہی مستحسن خیال نہ کیا جاتا تھا، لہذا وہاں ”تَعْدِ دَازِوَج“ کو کیسے گوارا کیا جاسکتا تھا؟ وہاں ایک بیوی کی اجازت بھی مجبوری اور ناگزیر برائی کے طور پر دی جاتی تھی۔ آج کا جدید مغرب بھی عیسائیت کے اس قدیم راہبانہ تصور سے نجات نہیں پاسکا، یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کے قانون

تَعْدِیَّہٗ زَوَاج پر بڑھ بڑھ کر حملے کرتا ہے، پھر ان سے مرعوب ان کے مسلمان شاگردوں نے بھی انہی کے انداز میں اعتراض اٹھانے شروع کر دیئے۔^[i]

تَعْدِیَّہٗ زَوَاج کا آغاز کب ہوا؟

اگر تَعْدِیَّہٗ زَوَاج کوئی ”ظلم و زیادتی“ ہے تو اس ظلم و زیادتی کا آغاز ابتدائی دور کے انسان نے کیا تھا۔ دنیا کی بیشتر قوموں میں اس کا رواج رہا ہے۔ تمام مذاہب نے اس کی اجازت دی ہے اور سب پیغمبروں کی ایک سے زیادہ بیویاں رہی ہیں۔ عرب معاشرے میں تو اس کا بہت زیادہ رواج تھا۔ بعض لوگ دس دس تک شادیاں کر لیتے تھے۔ غیر محدود بیویاں رکھنے کا جو رواج تھا اسلام نے اس کو حرام ٹھہراتے ہوئے اسے صرف چار تک محدود کر دیا کہ اب صرف چار شادیاں کرنا جائز ہے، اس سے آگے بڑھنا حرام اور ناجائز ہے۔ ہندوؤں میں بھی کئی شادیوں کی اجازت ہے۔ تورات اور انجیل میں پیغمبروں کی ایک سے زائد بیویوں کا ذکر آتا ہے۔ مسئلہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ اسلام نے چار شادیوں کا حکم نہیں دیا، بلکہ پہلے سے موجود دس دس بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا ہے۔

[i] پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرا نے 1955ء میں اپنی عرب نژاد سیکرٹری عالیہ بیگم سے دوسری شادی کر لی، ان کی پہلی بیوی نے اس پر بہت طوفان اٹھایا۔ محمد علی بوگرا کے سیاسی دشمنوں نے اس دوسری شادی کا باقاعدہ سکیڈل بنادیا اور اسے عورت کی مظلومیت اور اس کی پریشانیوں میں اضافے کا نام دیا، آخر یہ مخالفت کا طوفان اتنا بڑھا کہ حکومت کو کئی کمیشن بٹھانے پڑے۔ اسی کے نتیجے میں پاکستان کے عائلی قوانین وجود میں آئے، جن میں ”دوسری شادی“ اور ”یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ“ یہ دو مسائل سرفہرست تھے۔ حکومت کے یہ نام نہاد عائلی قوانین (جو اسلام کے خاندانی قوانین سے بہت کچھ مختلف تھے) اسمبلیوں میں تو پاس نہ ہو سکے، البتہ 21 جولائی 1961ء کو اپوا کی حقوق نسواں کمیٹی کی سفارشات پر صدر ایوب نے مارشل لاء کے زور پر ان کو صدارتی آرڈیننس کی شکل میں نافذ کر دیا۔ بعد میں 15 جنوری 1980ء میں ان قوانین کو صدر ضیاء الحق کے دور میں خود وزارت مذہبی امور نے خلاف اسلام ٹھہرایا مگر عوام کے اختلاف اور فکری انتشار نیز مغرب زدہ اپوائی بیگمات کے مظاہروں کے باعث صدر ضیاء الحق بھی ان کو منسوخ نہ کر سکے۔

مرد کی ضرورت:

تَعْدِیَّاتِ زَوَاج کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مرد اور عورت دونوں کی فطرت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ابتدا ہی سے مرد کا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی طرف رجحان رہا ہے۔ اگر وہ ایک شادی پر اکتفا کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فی الواقع دوسری بیوی کی خواہش یا ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ جن لوگوں کے اندر جنسی خواہش زیادہ شدید ہوتی ہے اور ایک بیوی سے ان کا گزارا نہیں ہوتا، ان کو دوسری شادی کی اجازت نہ ہو تو وہ ضرور حرام کاری میں مبتلا ہو جائیں گے۔ سوچنا چاہیے کہ کیا حرام کاری کی خرابیاں زیادہ ہیں یا دوسری شادی کرنے کی؟ دوسری طرف عورت کی یہ کیفیت ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً حیض، نفاس، حمل، رضاعت کے مراحل سے دوچار ہوتی رہتی ہے۔ ان مراحل میں عورت کے فطری جذبات نسبتاً کمزور پڑ جاتے ہیں اور بعض حالات میں تو وہ بالکل جنسی تعلقات کے قابل نہیں رہتی مثلاً حیض و نفاس (اسی وجہ سے شریعت نے ان ایام میں مباشرت سے منع فرما دیا ہے)۔ پھر زمانہ حمل میں مباشرت سے بعض اوقات بچے کو بھی ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی طرح رضاعت کے دور میں بھی عورت جسمانی طور پر کمزور ہوتی ہے۔ پھر وہ مرد کے مقابلے میں بوڑھی بھی جلد ہو جاتی ہے۔ لہذا اگر کوئی شخص ایک بیوی پر قناعت نہیں کرتا اور وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ اس کی اپنی مجبوری ہوئی نہ کہ پہلی بیوی پر زیادتی۔

عورت کا بانجھ پن:

بعض ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں جن میں تَعْدِیَّاتِ زَوَاج مسئلے کا واحد حل ہو سکتا ہے، مثلاً بیوی کا بانجھ ہونا یا کسی ایسے دائمی مرض میں مبتلا ہونا جس کی وجہ سے زوجہ از دو اجی تعلقات کے قابل ہی نہ رہے۔ اب خاوند مستقل اولاد کی نعمت سے کیوں محروم رہے یا دوسری شکل میں وہ اپنی فطری خواہش کا کیا بندوبست کرے؟ ان حالات کا معقول علاج دوسری شادی ہی ہے (ایسے حالات میں بعض اوقات خود بیویاں ہی اپنے شوہروں کو دوسری شادی کرنے کا مشورہ دے دیتی ہیں)۔ ان سب حالات میں اگر مرد کو یک زوجی کا ہی پابند کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ

نکلے گا کہ یا تو وہ باہر داشتائیں تلاش کرتا پھرے گا یا اگر کوئی بہت شریف اور پاکدامن ہے تو وہ اعلان کیے بغیر کہیں دوسرا نکاح کر لے گا (ضمیر کی خلش کو مٹانے کے لیے)۔ مگر اسلام کی نظر میں خفیہ نکاح کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہذا ناگزیر ہے کہ اسے کھلے عام دوسری شادی کرنے کی اجازت دی جائے۔ اسلام نے، جو کہ دین فطرت ہے، مرد کی فطرت اور اس کی مجبوریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوسری بیوی کی اجازت دی ہے۔ رہ گئی پہلی بیوی تو یہ اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہے۔ بانجھ ہونے کی صورت میں چاہے تو طلاق لے کر الگ ہو جائے اور چاہے تو اس کے ساتھ رہ جائے۔ اگر پہلی بیوی دائم المریض ہے تو اس کے لیے یہ بات زیادہ مفید ہے کہ شوہر دوسری شادی کر لے۔ اگر ان حالات میں شوہر کو مجبور کیا جائے کہ پہلے والی بیوی کو طلاق دو پھر تم دوسری شادی کر سکتے ہو، تو کیا یہ پہلی عورت کے ساتھ ظلم نہ ہوگا؟ خصوصاً اس شکل میں جب کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے تیار بھی ہو اور خود شوہر بھی اسے چھوڑنا نہ چاہتا ہو۔

تَعُدِّ دِاَز وَاِج..... ایک معاشرتی ضرورت:

تَعُدِّ دِاَز وَاِج بسا اوقات ایک معاشرتی ضرورت بھی بن جاتی ہے۔

- 1- عموماً تو معاشرے میں مرد عورتوں کا تناسب یکساں رہتا ہے مگر جب کسی قوم کو جنگ سے واسطہ پیش آتا ہے تو اس میں زیادہ تر مرد ہی کام آتے ہیں اور وہ بھی نوجوان تو مند۔ اس طرح معاشرے میں عورتوں کا تناسب بڑھ جاتا ہے، بہت سی عورتیں بیوہ ہو جاتی ہیں، نوجوان بچیوں کے لیے بر نہیں ملتے۔ یوں مردوں اور عورتوں کا توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں تَعُدِّ دِاَز وَاِج ایک ناگزیر ضرورت بن جاتا ہے تا کہ معاشرہ اس جنسی طوفان اور بے حیائی کے سیلاب سے بچ سکے جو عموماً جنگوں کے بعد یکدم بہہ نکلتا ہے۔ مردوں کی تعداد کم ہونے سے بہت سی عورتیں بے آسرا رہ جاتی ہیں، جن کی روزی کی کوئی شکل تو پیدا کی جاسکتی ہے مگر ان کی جذباتی اور صنفی تسکین کا کیا بندوبست ہو؟ دوسری طرف ایسی بے آسرا خواتین مردوں کی ہوس رانی کا شکار بن جاتی ہیں مگر سچی جذباتی تسکین سے پھر بھی نا آشنا رہتی ہیں۔ شوہر کی محبت اور بچوں کی محبت جس کے بغیر ان کی زندگی نامکمل اور بے کیف رہتی ہے، کو ساری عمر ترستی ہی رہتی ہیں (اور کوئی صالح

معاشرہ اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتا۔

کیا اس طرح کے حالات میں ایسی خواتین کو معاشرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے؟ تاکہ جس طرح چاہیں ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی صنفی تسکین کرتی رہیں اور معاشرے میں بے حیائی کی زبردست وبا پھوٹ پڑے، جس طرح عملاً دونوں عظیم جنگوں کے بعد یورپی ممالک میں عموماً اور فرانس میں خصوصاً واقع ہوا اور فرانسیسی قوم اسی صنفی انارکی کے باعث اپنا استحکام، عظمت اور تمام تر وقار کھو بیٹھی۔

کیا یہ معاشرتی انتشار اور بے حیائی کی وبا اور اس کے نتیجے میں معاشرے کا فساد و ابتری بہتر ہے یا یہ بہتر ہے کہ مرد کو قانوناً ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت ہو بشرطیکہ وہ اسلام کی عائد کی ہوئی شرط ”عدل“ کو ملحوظ رکھے؟

2- افرادی قوت، قوم کی پائیداری اور استحکام میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ دفاع، صنعت و حرفت، زراعت، تجارت غرض ہر شعبہ میں ترقی کے لیے افرادی قوت کی اہمیت مسلمہ ہے۔ زیادہ افرادی قوت حاصل کرنے کا اہم ذریعہ تَعَدُّ دَازِوَاج بھی ہے۔ کیونکہ عورت تو عموماً چالیس پینتالیس سال کے بعد اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتی، مگر مرد ستر سال تک بھی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ عورت کو بار آور کر سکے، اب اگر وہ دوسری شادی کر لے تو اس کا پھر سے اولاد والا سلسلہ قائم ہو سکتا ہے۔ لہذا جن اقوام کو اپنی افرادی قوت میں اضافہ کرنا مطلوب ہوتا ہے وہ خود تَعَدُّ دَازِوَاج کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ فرانس، اسرائیل، روس، جرمنی وغیرہ میں آج بھی اس حوصلہ افزائی کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

دوسرا اعتراض:

دوسرا اعتراض عموماً فرنگ زدہ خواتین کی طرف سے ایک اور انداز میں اٹھایا جاتا ہے۔ مساوات مرد و زن کی قائل عورتیں کہتی ہیں کہ اگر مردوں کو ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت ہے تو پھر یہ اجازت عورتوں کو بھی ملنی چاہیے کہ وہ ایک سے زیادہ مردوں سے شادی کر سکیں۔

جواب:

یہ اعتراض اتنا بیہودہ اور لغو ہے کہ ایک باحیا عورت کو اس بات کا تصور کرنے سے بھی گھن آتی ہے۔ یہ تو بحث برائے بحث ہے جس کا عورت کی فطرت سے بالکل واسطہ نہیں۔ ویسے بھی ایک عورت اپنی طبعی و جسمانی کمزوری کی بنا پر ایک سے زیادہ شوہروں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ حیض و نفاس اور حمل و رضاعت کی مجبوریاں ایسی ہیں کہ وہ بعض اوقات صرف ایک مرد یعنی اپنے شوہر کی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتی۔

جو عورتیں کئی مردوں کی خواہش کی تسکین کا سامان بنتی ہیں ان کا اپنا گوہرِ عفت و عصمت تو برباد ہوتا ہی ہے، مگر ساتھ وہ اتنی جنسی بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہیں کہ وہ خانگی زندگی کے قابل نہیں رہتیں، اولاد کی نعمت سے تو وہ مستقل طور پر محروم ہو جاتی ہیں اور اگر اولاد ہو بھی جائے تو اس سے بہت سے معاشرتی مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں، مثلاً یہ بچہ کس کا ہے؟ کون اس بچے کا باپ ہے؟ اس بچہ کو کس کی طرف منسوب کیا جائے؟ کون اس کی کفالت کرے؟ اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کون لے لے، وہ کس کا وارث ہے؟ اور اس قسم کے بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب دیا ہی نہیں جاسکتا۔ اس کے برعکس اگر ایک مرد کی دو تین بیویاں ہوں تو چاہے کسی بیوی سے اولاد ہو مگر ہے تو اسی مرد کی اور وہ بچہ اسی کی طرف منسوب ہوگا، وہی اس کا کفیل اور اس کا وارث ہے اور اس کی تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہے۔

ہولناک نتائج:

علاوہ ازیں ایک عورت کا اگر کئی مردوں سے تعلق ہو تو اس کا ایک اور بھیانک نتیجہ نکلتا ہے۔ ہر مرد اس کو پورے طور پر پانے کی کشمکش میں دوسرے مردوں سے لڑنے بھڑنے لگ جاتا ہے کیونکہ مرد اپنی بیوی کے معاملے میں (خود کتنا ہی برا کیوں نہ ہو) باغیرت ہوتا ہے کہ اس کی بیوی کا کسی دوسرے مرد کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ لڑائیاں پھر چھوٹے پیمانے سے شروع ہو کر بعض اوقات بڑی خوفناک شکل اختیار کر لیتی ہیں، تاریخ ایسی کئی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ایک عورت کی خاطر طویل طویل جنگیں ہوتی رہیں۔ ہمارے ہاں تو ایک کہاوت بھی اسی مضمون پر مشتمل ہے کہ لڑائی کی بنیاد زن، زن اور زمین ہوتی ہے۔ لہذا ایک عورت کا کئی شوہروں یا مردوں سے تعلق رکھنا خطرناک نتائج پر مشتمل ہے۔

اسلام میں تَعْدُدِ اَزْوَاج کے احکام

1- اسلام کا رجحان:

اسلام کا رجحان یک زوجگی کی طرف ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَإِنْ كُنْتُمْ لَا تَرْضَوْنَ مِنَ النِّسَاءِ مِثْلِي وَثُلُثَ وَرُبْعَ، فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً﴾ [۱]

”تو عورتوں میں سے جو تم کو پسند ہوں ان سے نکاح کرلو، دو عورتوں سے، تین عورتوں سے یا چار عورتوں سے، پس اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کافی ہے۔“ [۲]

اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی صورت میں مرد اس بات کا پابند ہے کہ وہ ان سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف کا برتاؤ کرے۔ جس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ مرد کو صرف ایک بیوی پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔ گویا جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے اسلام تَعْدُدِ اَزْوَاج کے مقابلے میں ایک بیوی کے حق میں ہے۔ مگر بعض اوقات مرد کو ایک بیوی کا پابند کرنا خود انصاف ہی کے تقاضوں کو پامال کرنے کے مترادف بن جاتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا بحث میں واضح کیا جا چکا ہے، اس طرح کے غیر معمولی حالات میں اسلام ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دیتا ہے، مگر شریعت کے اس حق سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مرد بیویوں کے درمیان ان تمام معاملات میں عدل و مساوات کا پابند رہے جو اس کے اپنے بس میں ہیں، مثلاً: غذا، لباس، مکان اور شب باشی، حسن معاشرت میں سب کے ساتھ عدل اور برابری کا سلوک کرے۔

[۱] النساء: 3

[۲] یہ آیت جنگ احد کے بعد نازل ہوئی۔ اس جنگ میں ستر کے قریب صحابہ کرامؓ شہید ہو گئے تھے اور بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام میں ازواجی زندگی ذمہ داریوں سے گھری ہوئی ہے۔ ایک ہی بیوی کی بے پناہ ذمہ داریاں مرد کو اٹھانا پڑتی ہیں، جو تَعْتُدْ اَزْوَاج کی شکل میں اور بھی بڑھ جاتی ہیں، اسلام نے ایک سے زائد بیویاں رکھنے پر اتنی حدود و قیود عائد کی ہیں کہ بغیر کسی حقیقی ضرورت و مجبوری کے کوئی مسلمان ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا۔

2- حکم نہیں بلکہ اجازت ہے:

پھر ایک سے زیادہ شادی کی اجازت دینا مسلمانوں پر فرض نہیں کہ تم ضرور چار شادیاں کرو جیسا کہ مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے۔ بلکہ یہ تو ہنگامی حالات کے لیے بوقتِ مجبوری ایک اجازت ہے اور وہ اجازت بھی کئی پابندیوں کے ساتھ مقید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملی زندگی میں مسلمانوں کی اکثریت ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتی ہے۔ ہزاروں کی آبادی میں سے چند لوگ ایسے نکلیں گے جو اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

3- دوسری شادی عیاشی یا تفریح کا ذریعہ نہیں:

اسلام نے جو اجازت دی ہے اس کے ساتھ اتنی پابندیاں ہیں کہ مخالفین کا یہ داویلا کہ عیاشی کی خاطر چار چار شادیاں کرنے کی اجازت ہے، بالکل غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اسلام نے نہ تو اس کی ہمت افزائی کی، نہ شوق دلایا بلکہ اس کی پیچیدہ ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خوب سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھانا ورنہ روز قیامت اللہ کے آگے جواب دینا پڑے گا۔

4- پابندیوں کی تفصیل:

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان انصاف نہ کرے (اور صرف ایک طرف جھک جائے) وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ جھکا ہوا ہوگا۔“ [1]

چنانچہ اس عدل و انصاف میں یہ بات شامل ہے کہ وہ دونوں یا تینوں بیویوں کے نان

[1] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب القسم، بحوالہ ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ

نفقہ کی ذمہ داری اٹھائے، ان کے لیے جدا جدا مکان کا بندوبست کرے۔ باری باری سب بیویوں کے ہاں رات گزارے اور ان سے اچھا رویہ رکھے۔ یہ عدل و انصاف ان تمام امور میں ہونا چاہیے جو انسان کے اپنے بس میں ہیں۔

عدل و انصاف اسلام کے تمام معاملات کی جان ہے، اسلام نے عدل کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اگر اندیشہ محسوس ہو کہ عدل نہیں ہو سکتا تو پھر ایک پر ہی اکتفا کیا جائے۔ باقی رہ گیا معاملہ دلی میلان و محبت کا، کسی کی طرف دلی میلان زیادہ اور کسی کی طرف کم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سیدہ عائشہؓ فرماتی ہیں:

”بیشک نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم، جو چیزیں تقسیم کی جاسکتی تھیں، ان میں تو اپنی ازواج کے درمیان عدل سے تقسیم فرماتے، اس کے بعد فرماتے: ”اے اللہ! جن باتوں پر مجھے اختیار ہے، ان میں میں نے تقسیم کر دی اور جو معاملہ میرے اختیار میں نہیں (طبعی میلان، دلی محبت) اس میں میری گرفت نہ فرماتا۔“ [۱]

مگر اس سے یہ بھی مراد نہیں کہ آدمی محبت اور قلبی تعلق کے نام پر صرف ایک طرف جھک جائے اور دوسری بیوی کو بالکل نظر انداز کر دے کہ جو عملاً شوہر کے ہوتے ہوئے بھی بے شوہری کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دی جائے۔ قرآن پاک نے بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے:

﴿فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمِيلِ فَتَنُذُّوْهَا كَالْمُعْلَقَةِ﴾ [۲]

”پھر کسی ایک کی طرف بالکل جھک نہ جاؤ کہ دوسری کو معلق ہی چھوڑ دو۔“

عموماً صورت حال یہ پیش آتی ہے کہ مرد کو دوسری بیوی سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور وہ پہلی کو نظر انداز کرنے لگ جاتا ہے۔ لہذا قرآن نے توجہ دلائی ہے کہ ایسی صورت حال ہرگز پیش نہ آئے، دوسری بیوی تو تمہیں مرغوب ہے ہی پہلی کے بھی سارے حقوق ادا کرو۔ پھر جس طرح دوسری بیوی کو وہ تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو پہلی بیوی کو ہوتے ہیں

[۱] مشکوٰۃ المصابیح، بحوالہ مذکورہ بالا

[۲] النساء: 129

اور دونوں سے یکساں حسن سلوک ہونا چاہیے، بعینہ ان کے بچوں کا معاملہ ہے، ان بچوں کے حقوق بھی مساوی ہوں اور ان کے ساتھ یکساں شفقت و محبت کا برتاؤ ہو۔ یہ صورت حال پیش نہ آئے کہ ایک عورت کے بچوں کے سارے ناز و نخرے اٹھائے جا رہے ہیں اور دوسری بیوی اپنے بچوں کو پالنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں برتن دھونے اور ان کی صفائیاں کرنے پر مجبور ہو گئی ہے، یا گھر میں لوگوں کے کپڑوں کی سلائی کر کے اپنے بچوں کو پال رہی ہے۔

یہ بات خصوصاً اس لیے قابل ذکر ہے کہ ہمارے ہاں برصغیر پاک و ہند میں معاملہ بالکل اسی طرح کا ہے کہ عموماً دوسری بیوی اور اس کے بچے سونے کے نوالے کھاتے ہیں، گھر میں رزق ہن کی طرح برستا ہے، مرد اسی کو اپنا گھر سمجھتا ہے اور پہلے والی بیوی اس طرح نظر انداز ہو جاتی ہے کہ وہ بیچاری تنگی ترشی سے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ وہ خود بھی بے آسرا اور بچے بھی بے سہارا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ جہالت ہے، سخت ظلم و زیادتی ہے۔ اس زیادتی سے اسلام کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام اسی لیے عدل کی کڑی شرط عاید کرتا ہے، وہ حکم دیتا ہے کہ اگر تم دو بیویوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے تو پھر ایک بیوی پر ہی اکتفا کرو۔

ماحصل:

- 1- ظہور اسلام کے وقت عرب میں دس دس شادیاں کرنے کا رواج تھا۔ اسلام نے اس کو حرام ٹھہرایا اور صرف چار تک محدود کر دیا۔
- 2- عام حالات میں اسلام کا رجحان یک زوجگی کی طرف ہے۔
- 3- مجبوری کے عالم میں اس نے دوسری، تیسری شادی کرنے کی اجازت دی ہے مگر ساتھ مساوات اور عدل کی کڑی شرط عاید کر دی ہے۔ اگر عدل نہ ہوگا تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے۔
- 4- عملاً یہ عدل کی شرط اتنی کڑی ہے کہ اسے پورا کرنا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ لہذا دوسری اقوام کے مقابلے میں مسلمانوں میں دوسری شادی کا رواج سوائے اشد ضرورت کے بہت کم ہے۔ حتیٰ کہ ہزار میں سے چند لوگ اس اجازت سے فائدہ اٹھانے والے نظر آئیں گے۔

5- اہل مغرب میں قانوناً تو یک زوجگی کا رواج ہے مگر عملاً صورت حال یہ ہے کہ ہر مرد کی کئی کئی داشتائیں ہیں، اس غیر قانونی کثرت ازواج میں مرد پر کسی عورت کی یا اس کی اولاد کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی، جس سے صنفی انارکی اور بے حیائی و باکی طرح ان ملکوں میں عام ہو رہی ہے۔ پھر اس کی وجہ سے بے شمار بیماریاں اللہ کے عذاب کے طور پر نازل ہو رہی ہیں۔ کیا یہ صورت حال بہتر ہے یا یہ کہ اگر مرد کو ضرورت ہو تو وہ باقاعدہ نکاح کرے ان کے درمیان انصاف کرے، ان کی پوری ذمہ داری اٹھائے اور پھر بھی وہ پابند ہو کر بیک وقت چار سے زیادہ شادیاں نہ کر سکے۔

6- پھر چار شادیوں کی اجازت دراصل عورتوں ہی کے فائدے کے لیے ایک روک تھام ہے نہ کہ مردوں کے لیے بے جا رعایت، کیونکہ مرد شادی رچانے میں اتنا بے باک نہیں ہو سکتا جتنا ناجائز تعلقات قائم کرنے میں۔

7- مرد کا گناہ میں ملوث ہونا زیادہ بڑا گناہ ہے یا عورت کو سوکن برداشت کرنے پر آمادہ کرنا! لہذا شریعت نے گناہ کو تو حرام قرار دیا، دوسری طرف عورت کے حقوق کا اس طرح دفاع کیا کہ مرد کو سب بیویوں کے درمیان عدل و مساوات کا پابند کر دیا تاکہ عورت کو مرد کی دوسری شادی سے کم از کم نقصان پہنچے۔ اصل میں ہمارے ہاں افرنگیوں کی دیکھا دیکھی دوسری شادی معیوب سمجھی جاتی ہے ورنہ عرب ممالک میں تو دو دو، تین تین بیویاں رکھنے کا رواج ہے۔ وہاں خواتین اس بات کی عادی ہوتی ہیں، اس لیے ان کے لیے یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ نہیں بنتا۔

8- قدیم معاشروں میں بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی عاید نہ تھی۔ یہودیت اور عیسائیت میں تَعْدِیَّاتِ زَوَاج کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔ ہندومت میں بھی ایسی کوئی پابندی نہیں ملتی۔ توراۃ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عموماً انبیاء علیہم السلام کی ازواج ایک سے زیادہ تھیں۔ مثلاً

3 بیویاں

حضرت ابرہیم علیہ السلام کی

4 بیویاں

حضرت یعقوب علیہ السلام کی

4 بیویاں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی

9 بیویاں

حضرت داؤد علیہ السلام کی

حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں کی تعداد تو 700 تک بیان کی جاتی ہے (واللہ اعلم) جبکہ قرآن پاک کی طرح تالمود (شرح توراۃ) میں بھی بیویوں کی تعداد کو 4 تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح عیسائیت میں بھی ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت موجود تھی۔ مگر یہ سینٹ پال تھا جس نے یونانی قانون کی پیروی میں عیسائیوں میں صرف ایک بیوی کے تصور کو فروغ دیا اور آج بھی عیسائیوں کے مارمن فرقہ کے لوگ تَعْدِدِ اَزْوَاج کے قائل ہیں بلکہ اس پر عمل پیرا ہیں۔^[1]

حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے زیادہ معقول، منصفانہ اور انسان کی فلاح کا ضامن کوئی مذہب یا دوسرا نظام زندگی نہیں ہے۔ اس کے اندر اگر مغربی تہذیب کے زیر اثر کسی کو کیڑے نظر آتے ہیں تو پھر وہ کوئی اور دین تلاش کر لے۔ اسلام کا صالح معاشرہ یک زوجگی کو قانوناً رائج کر کے کھلی بے حیائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ زنا اور بدکاری کو حرام قرار دے کر تَعْدِدِ اَزْوَاج کی قانونی اجازت دینے والا حکیمانہ دین فی الحقیقت اسلام ہی ہے۔ جس نے مرد و عورت کی جسمانی ساخت، ان کی نفسیات اور ان کی عملی ضرورت کا پورا پورا لحاظ کیا ہے۔

اور اب خود چرچ کا ایک سے زائد شادی کی اجازت دینے کا مطالبہ:

روزنامہ ”نوائے وقت“ مورخہ 27-04-1997 کی خبر ہے کہ جوہنبرگ میں ”افریقی چرچ“ کی ایک تنظیم نے کیتھولک عیسائی مسئولین سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مقامی عیسائیوں کو ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دے دیں۔ کیونکہ ان کے جائزے کے مطابق اسلام قبول کرنے والوں میں بعض افراد وہ بھی ہیں جنہوں نے محض اسی رخصت کی وجہ سے اسلام قبول کیا ہے۔ ویسے بھی افریقہ میں ایک سے زیادہ نکاح مقامی رسم و رواج میں شامل ہے۔

12

أَبْغَضُ الْحَلَالِ عِنْدَ اللَّهِ الطَّلَاقُ
(فرمان نبوی)

”اللہ کے ہاں حلال اشیاء میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔“
(ابوداؤد، ابن ماجہ)

مسئلہ طلاق

- طلاق پر جدید دور کی خواتین کے اعتراضات
- طلاق یہودی مذہب میں
- عیسائیت کے ہاں طلاق
- ہندومت میں طلاق
- اسلام کا ضابطہ طلاق
- نکاح ایک سنجیدہ معاہدہ ہے
- طلاق کی واقعی ضرورت کب پیش آتی ہے؟
- طلاق سخت ناپسندیدہ ہے
- طلاق کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہو؟
- عدالت کے ذریعے سے طلاق کی خرابیاں
- طلاق کے باب میں اسلام کے معقول اور مناسب احکام
- بعض احتیاطی اقدامات
- اصلاح کی کوشش کی جائے
- خاوند کی بدسلوکی کا علاج
- دونوں طرف سے ثالث اصلاح کی کوشش کریں
- اگر طلاق ناگزیر ہو جائے تو؟
- طلاق کی تعداد مقرر کر دی
- رجوع کی مدت مقرر کر دی
- طلاق حیض کی حالت میں نہ دی جائے
- عدت کے دوران میں عورت شوہر ہی کے گھر میں رہے گی
- عدت میں رجوع کرنے کا اختیار
- رخصتی کے موقع پر حسن سلوک کی تاکید
- تیسری اور آخری طلاق
- تین طلاقیں کا مسئلہ
- حلالہ نکالنے والے اور نکلوانے والے پر اللہ کی لعنت
- اکٹھی تین طلاق دینا
- تین طلاق کو ایک رجعی طلاق قرار دینے والے علماء
- اصلاح کی کوشش
- مطلقہ کا معاشی مسئلہ
- مطلقہ کا معاشی حل کیا ہو؟
- مطلقہ کو نان نفقہ دینا مغرب میں رائج ہے
- مطلقہ کو نفقہ نہ دینے کے دلائل
- اب دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں
- طلاق کے بعد مرد اپنی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو گیا ہے
- قرآن کے حکم متعہ یا متاع سے کیا مراد ہے؟
- طلاق یافتہ عورت کی کفالت کا بندوبست کیا ہو؟

مسئلہ طلاق

1- دور جدید میں اسلام کے ضابطہ طلاق پر بھی بہت سے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں، مثلاً طلاق کا اختیار صرف مرد کو کیوں ہے؟ یہ تو عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی ہے۔ مرد کو ذرا غصہ آیا اور فوراً ہنستی بستی عورت کا مستقبل تار یک کر دیا اور اسے بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا، ساتھ ہی بچوں کا مستقبل بھی تار یک کر دیا۔ حق طلاق مرد سے چھین کر عورت کو دیا جانا چاہیے۔

2- اس ظلم و زیادتی کا کفارہ یہ ہے کہ مرد مطلقہ عورت کو تاحیات نفقہ ادا کرے اور یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ مرد کو یہ نفقہ ادا کرنے کا پابند بنائے۔

ان اعتراضات کا جواب بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دوسرے مذاہب کے ضابطوں کا مختصر سا ذکر کر دیا جائے:

یہودی مذہب میں طلاق:

یہودیوں کے ہاں طلاق کے معاملے میں کوئی پابندی نہ تھی، نہ شوہر پر کسی قسم کی ذمہ داری تھی۔ جونہی شوہر کا دل چاہتا بغیر کسی خلش کے فوراً طلاق دے کر بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا، بیوی اسی وقت دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کر سکتی تھی، عدت کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ توراۃ کے الفاظ یہ ہیں: ”اگر کوئی مرد کسی عورت سے بیاہ کرے اور اس کے بعد ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ رہے، اس لیے کہ مرد نے اس میں کوئی بیہودہ بات پائی، تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں دے دے اور اسے اپنے گھر سے باہر کرے، پھر جب وہ گھر سے نکل گئی تو جا کر دوسرے مرد کی ہو رہے۔“ [۱]

یہودیوں کے ہاں طلاق کے مسئلہ میں اتنی آزادی تھی کہ طلاق کی کراہت کا تصور تک ختم ہو گیا تھا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیوی کی بدکرداری کے علاوہ طلاق کی مطلقاً اجازت نہ دی تھی۔ یہودیوں نے صرف ایک اجازت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر چھوٹے بڑے سبب سے طلاق دینا شروع کر دی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس بگاڑ کی اصلاح یوں کی کہ طلاق کے خلاف نہایت سخت رو یہ اپنایا۔

عیسائیت کے ہاں طلاق:

”پھر وہ فریسی حضرت عیسیٰ کو آزمانے کو آئے اور کہنے لگے: ”کیا ہر ایک سبب سے اپنی بیوی کو چھوڑ دینا روا ہے؟“ اس نے جواب میں کہا: ”کیا تم نے نہیں پڑھا کہ جس نے انہیں بنایا اس نے ابتدا میں ہی انہیں مرد اور عورت بنا کر کہا کہ اس سبب سے مرد باپ اور ماں سے جدا ہو کر اپنی بیوی کے ساتھ رہے اور وہ دونوں ایک جسم ہوں گے۔ وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لیے جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آپ جدا نہ کرے۔“ انہوں نے کہا: ”پھر موسیٰ نے کیوں حکم دیا ہے کہ طلاق نامہ دے کر بیوی چھوڑ دی جائے۔“ اس نے کہا کہ موسیٰ نے تمہاری سخت دلی کے سبب سے تم کو اپنی بیوی چھوڑ دینے کی اجازت دی۔ مگر ابتدا میں ایسا نہ تھا اور میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے۔“ [۱]

چنانچہ عیسائیوں کے اکثریتی فرقہ کیتھولک کے ہاں طلاق مطلقاً ناجائز ہے۔ موت کے بغیر کوئی چیز میاں بیوی کو جدا نہ کر سکتی تھی، البتہ ظہور اسلام کے صدیوں بعد پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا تو انہوں نے بہت کوشش کر کے طلاق کو جائز قرار دے دیا۔ لیکن وہ بھی اس صورت میں کہ عدالت میں کسی ایک فریق کا بدکار ہونا یا ظلم و زیادتی کرنا ثابت کر دیا جائے مگر بعد میں صنعتی انقلاب کے نتیجے میں فحاشی پھیلنے کے بعد وہاں جب مذہب سے بغاوت کا جذبہ رونما ہوا، تو طلاق بھی ہر پابندی سے آزاد ہو گئی اور اب ان ممالک میں طلاق کی وہ کثرت ہے کہ نکاح اور طلاق دونوں کی شرح تقریباً یکساں ہو گئی ہے۔ اب ایک رپورٹ کے مطابق ہر دو میں سے ایک شادی طلاق پر ختم ہوتی ہے۔

[۱] انجیل، کتاب متی، باب 3-19 سے 10 تک، باب 5 آیات 31-32، کلام مقدس، مطبوعہ 2007

ہندومت میں طلاق:

جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، وہ طلاق سے واقف ہی نہیں۔ آج بھی ہندومت میں طلاق ناجائز چلی آرہی ہے، اگرچہ حالات سے مجبور ہو کر اہل ہند اس کو جائز قرار دینے کی انتہائی کوشش کر رہے ہیں مگر ابھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ ویسے عورت کو معمولی معمولی باتوں پر فارغ ضرور کر دیا جاتا ہے مگر وہ بھی سزا کے طور پر کہ وہ ہمیشہ معلق بیٹھی رہے۔

طلاق دور جاہلیت میں:

ظہور اسلام کے وقت عرب میں طلاق کا بہت زیادہ رواج تھا۔ ایک آدمی عورت کو کئی کئی دفعہ طلاق دیتا، مگر عدت گزرنے سے پہلے رجوع کر لیتا، اس طرح عورت نہ اپنے گھر میں بستی نہ الگ ہو سکتی، بعض اوقات تو وہ سو، سو بار تک طلاق دے دیا کرتے۔ جس سے عورتوں کی زندگی عذاب بن کر رہ گئی تھی۔

اس طرح طلاق کے بارے میں تمام مذاہب اور نظاموں میں بے انتہا افراط و تفریط اور بے اعتدالیوں پائی جاتی تھیں۔ یہ اسلام ہے جس نے ان بے اعتدالیوں کے درمیان اپنے لیے ایک صاف ستھری و توازن والی راہ اپنائی۔

اسلام کا ضابطہ طلاق

عالمی مسائل نظام زندگی میں اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ اگر ایک بار ازدواجی زندگی کی بنیادوں میں کوئی غلط رجحان گھس آئے تو خاندانی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ گھر معاشرہ کا ابتدائی یونٹ، تمام انسانی تعلقات کا ابتدائی سرچشمہ اور تہذیبی شعور کی اولین تربیت گاہ ہے۔ اگر عالمی قوانین صحیح ہوں گے تو اس ادارہ کے بناؤ کا سبب بنیں گے اور اگر معاشرتی قوانین غلط ہوں گے تو گھر کے ادارہ کو بنیاد سے اکھاڑ کر رکھ دیں گے اور بالآخر پورے معاشرہ کے نظام زندگی کو غلط روش پر ڈال دیں گے۔ لہذا ایسے گہرے اور نازک مسائل جذبات کی فضا میں حل نہیں ہو سکتے، نہ مظاہروں سے ان پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ تو سنجیدہ فکر اور گہرے شعور کے متقاضی ہیں۔ لہذا اسلام نے طلاق کی اجازت ضرور دی ہے مگر اس سے پہلے بے شمار اصلاحی اقدامات کیے ہیں اور اخلاقی ہدایات کا درس دیا ہے۔

نکاح ایک سنجیدہ معاہدہ ہے:

نکاح کے ذریعہ مرد و عورت زندگی بھر کی رفاقت کا عہد باندھتے ہیں۔ جس کو قرآن پاک نے ”میثاق غلیظ“ (النساء، آیت 21) یعنی پختہ عہد کا نام دیا ہے، اس سنجیدگی سے کیے گئے عہد کو آسانی سے توڑنے کی اجازت نہیں دی گئی اسی طرح طلاق بھی ایک معمولی معاملہ نہیں ہے، یہ ایک انتہائی اقدام ہے۔ لہذا نکاح اور طلاق جیسے مسائل جذبات کی نظر نہیں کیے جاسکتے، نہ ہی مذاق اور گپ شپ ان میں روا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدُّ النِّكَاحِ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ [۱]

”تین باتیں ایسی ہیں جن میں سنجیدگی تو سنجیدگی ہے ہی مگر ان کا مذاق بھی سنجیدہ

ہی سمجھا جائے گا یعنی نکاح، طلاق اور رجوع کرنا۔“

لَيْسَ مِنْنَا مَنْ خَبَّبَ الْمَرْأَةَ عَلَى زَوْجِهَا [۲]

”اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں جو کسی عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بھڑکائے۔“

جو دین ٹوٹے ہوئے کو جوڑنے اور منتشر افراد کی شیرازہ بندی کے لیے آیا ہے، اس دین کا پیروا اگر میاں بیوی کے تعلقات کو بگاڑتا ہے تو پھر اس میں اپنے دین کی کوئی جھلک باقی نہیں رہ جاتی۔

طلاق کی واقعی ضرورت:

رشتہ نکاح کے قیام کا منشا تو بلاشبہ یہی ہے کہ عورت اور مرد اس رشتہ سے منسلک ہو کر عفت کی زندگی گزاریں اور تاحیات اس بندھن کو نہ کھلنے دیں۔ لیکن بعض اوقات کوئی ایسی مجبوری بھی پیش آ جاتی ہے کہ نکاح کے مقاصد پورے ہوتے نظر نہیں آتے، ان میں وہ اخوت و محبت قائم نہیں رہ سکتی۔ کبھی ان کے درمیان اتنا زیادہ معاشی و معاشرتی فرق ہوتا ہے کہ اس کا دور کرنا

[۱] ترمذی، ابوداؤد۔ کتاب الطلاق

[۲] سنن ابی داؤد للالبانی، الجزء الاول: 1908

دشوار ہو جاتا ہے اور کبھی دونوں کی ذہنی اور علمی سطح ایک جیسی نہیں ہوتی۔ لہذا وہ ایک دوسرے سے مانوس نہیں ہو پاتے۔ کبھی کوئی اخلاقی کمزوریاں بھی سامنے آ جاتی ہیں کہ وہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں عقل و شعور کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں میں علیحدگی ہو جائے۔ ان حالات میں دونوں کے اکٹھا رہنے کے بے شمار نقصانات ہیں۔ مثلاً:

- 1- مرد عورت کو اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہوئے اس سے بدترین سلوک روار کھے گا۔
- 2- ہر وقت دونوں کی چیقلش گھر کے ماحول کو جہنم بنا دے گی۔
- 3- بچوں کی تربیت متاثر ہوگی، تعلیم و تربیت ناقص رہ جانے سے وہ کئی ذہنی اور اعصابی بیماریوں کا شکار ہو جائیں گے۔

جبکہ اگر وہ دونوں الگ ہو جائیں تو ممکن ہے کہ اس عورت کا کسی ہم ذوق سے نکاح ہو جائے اور وہ وہاں جا کر بہت خوش رہے جبکہ دوسری طرف مرد بھی اپنی پسند کی عورت سے شادی کر لے اور اس طرح یہ علیحدگی ان دونوں کے حق میں باعثِ رحمت بن جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جو ایک فطری مذہب ہے اور انسان کی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے ضابطے و احکام بناتا ہے، ایسے ناگزیر حالات میں اس نے طلاق کی گنجائش بھی رکھی ہے۔ اسلام میں نہ تو عیسائیوں کی طرح طلاق کا دروازہ بالکل بند ہے اور نہ یہودیوں کی طرح کھلی اجازت ہے بلکہ ضرورت کے وقت طلاق دینا جائز تو ہے مگر اس کے لیے بہت سی پابندیاں ہیں۔ تاکہ انسان کو طلاق کا فیصلہ کرتے کرتے بھی خاصا وقت لگ جائے اور وہ خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے کہ اگر طلاق کے بغیر معاملہ صحیح رہ سکتا ہو تو یہ آخری قدم اٹھایا ہی نہ جائے۔

طلاق سخت ناپسندیدہ ہے:

طلاق دینے میں جلدی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس فعل سے دو خاندانوں کا مستقبل وابستہ ہے، ان کی عزت و آبرو اور عفت و اخلاق کا معاملہ ہے۔ شریعت میں گو طلاق جائز ہے مگر آخری چارہ کار کے طور پر حلال کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ الطَّلَاقُ [۱]

”اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے۔“

آپ کا ارشاد ہے:

”شادی کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں

کو پسند نہیں فرماتا۔“ [۲]

ایک دفعہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا خَلَقَ اللَّهُ شَيْئًا عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَبْغَضُ إِلَيْهِ مِنَ

الطَّلَاقِ [۳]

”اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کوئی چیز طلاق سے زیادہ ناپسندیدہ پیدا

نہیں فرمائی۔“

اگر ایک طرف مرد کو بار بار یہ توجہ دلائی جا رہی ہے کہ طلاق بہت بری چیز ہے تو دوسری

طرف عورتوں کو بھی تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ ”جو عورت بغیر کسی مجبوری کے شوہر سے طلاق کا مطالبہ

کرے اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے۔“ [۴]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس عورت نے اپنے خاوند سے بلا وجہ خلع لیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ

پائے گی۔“ [۵]

چنانچہ عورت کے لیے بھی صرف اس وقت طلاق کا مطالبہ جائز ہے جب حدود اللہ کے

ٹوٹنے کا خطرہ لاحق ہو جائے، مثلاً مرد وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے قابل ہی نہ ہو، جیسے عنین

[۱] ابوداؤد، ابن ماجہ

[۲] حقوق الزوجین، صفحہ: 61، احکام القرآن للجصاص، ج ۲، صفحہ: 110

[۳] مشکوٰۃ بحوالہ دارقطنی

[۴] مشکوٰۃ بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی

[۵] ترمذی: 1186

(نامرد) خصی، محبوب وغیرہ، اس وقت طلاق کا مطالبہ واجب ہو جاتا ہے۔ یا نان نفقہ ادا نہیں کرتا یا اداقتضا ضرار و تعدی کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں بھی طلاق کا مطالبہ جائز ہوگا۔

طلاق کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہو؟

مغرب زدہ خواتین کو اس بات سے زیادہ پر خاش ہے کہ طلاق کی گرہ مرد کے ہاتھ میں کیوں ہے؟ عورت کو بھی طلاق کا اختیار کیوں نہیں دیا گیا؟ یا پھر عیسائیوں کی طرح یہ اختیار مرد و عورت دونوں سے لے لیا جائے اور عدالت کے حوالے کر دیا جائے۔ جبکہ اسلام یہ اختیار مرد ہی کو دیتا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِلَّا أَنْ يَعْفُوَا أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ﴾ [۱]

”یہ اور بات ہے کہ عورتیں نرمی برتیں (اور مہر نہ لیں) یا وہ مرد جس کے اختیار

میں عقد نکاح ہے نرمی سے کام لے (پورا مہر دے دے)۔“

اور اسی طرح فرمان نبویؐ بھی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا الطَّلَاقُ بِيَدِ مَنْ أَخَذَ بِالسَّاقِ [۲]

”لوگو! سن لو کہ طلاق کا اختیار تو شوہر کو ہے۔“ [۳]

علاوہ ازیں طلاق کے معاملات میں ساری ضمیریں مذکر ہی استعمال کی گئی ہیں۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ نکاح کی گرہ تو مرد ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اس کو باندھنے والا اور وہی اس کو

کھولنے والا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مرد گھر کا قوام ہے۔ گھر کی مصلحتوں سے زیادہ واقف، نسبتاً

دور اندیش اور معاملہ فہم ہوتا ہے۔ پھر شادی کے سلسلہ میں اس نے کافی اخراجات برداشت کیے

ہوتے ہیں۔ مہر اور نفقہ وغیرہ، پھر عدت کے دور کا نفقہ بھی اسی نے ادا کرنا ہے۔ اسے دوسری شادی کی

ضرورت ہوئی تو دوبارہ اس کو سارے اخراجات پھر کرنے پڑیں گے۔ پہلی بیوی کو اس نے جائیداد،

[۱] البقرہ: 237

[۲] مجمع الزوائد

[۳] تفہیم الاحادیث، ج 5، صفحہ: 106 از سید مودودی

زیور یا مال دیا تھا وہ بھی اس کو واپس نہ مل سکا، پہلی بیوی کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری بھی ساتھ ساتھ اس کو اٹھانی ہے۔ اس لیے وہ لوگ خیالی دنیا میں رہتے ہیں جو مرد کے حق طلاق پر اعتراض کرتے ہیں۔ مرد کے لیے تو طلاق میں جو زبردست مادی نقصان ہے اسی کے پیش نظر اس کو سو بار سوچنا پڑتا ہے، پہلے گھر کا اجڑنا پھر اس کی تعمیر کرنا کوئی ہنسی مذاق کا کام نہیں ہے۔

اس کے برعکس اگر یہ حق طلاق عورت کو مل جائے تو اس میں بعض خرابیاں ہیں۔ مثلاً گھر بسانے کی پوری مالی ذمہ داری تو مرد کی ہو اور اس نے عورت پر بے بہا خرچہ کیا ہو مگر طلاق کا اختیار عورت کو مل جائے، چونکہ مرد کے مقابلے میں عورت زیادہ جذباتی ہوتی ہے وہ کسی وقتی جوش اور جذبہ کے تحت مرد سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے اور اس سے طلاق کا تناسب بہت بڑھ سکتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ مرد بھی وقتی جوش اور غصہ کے تحت ہی طلاق دیتا ہے، مگر اصل صورت حال یہ ہے کہ مرد کو جذبات کے ساتھ ساتھ اپنے مالی اخراجات پر بھی نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اسے طلاق سے بہت سا مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے، جو کہ عورت کو نہیں اٹھانا پڑتا۔ عورت تو اگر حق طلاق رکھتی ہو تو ذرا سے غصہ پر مرد کو طلاق دے کر، بچوں کو اس کے حوالے کر کے، مہر اور زیورات لے کر گھر سے نکل کھڑی ہوگی۔ پھر نئے مہر اور نئے ساز و سامان کے ساتھ دوسرے مرد سے شادی کر لے گی۔ کیا یہ انصاف ہے کہ خرچ کرنے والا ایک فریق ہو اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے فریق کو مل جائے؟ اس طرح عورت کو حق طلاق دینے سے طلاقوں کی شرح بہت بڑھ جائے گی۔ ان وجوہ سے عورت کی طرف اس اختیار کو منتقل کر دینا اس سکیم کے بالکل خلاف ہے جو اسلام نے اپنے ازدواجی قانون میں پیش نظر رکھی ہے، یہ غلط طریقہ اگر رائج ہو جائے تو مسلم معاشرے بھی طلاق کی ایک ایسی وبا سے دوچار ہو جائیں جس سے اب تک وہ محفوظ چلے آتے ہیں۔

واضح ہونا چاہیے کہ کوئی عورت اپنے طور پر ہی اپنے آپ پر چاہے 100 طلاقیں واقع کر لے۔ شوہر کی مرضی کے بغیر ایک طلاق بھی واقع نہ ہوگی۔ البتہ عورت کا یہ شریعت الہی کے خلاف کھلا مذاق ضرور ہوگا۔ جب نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے تو اس کی مرضی کے بغیر عورت کو طلاق نہیں ہو سکتی۔ اس صورت میں عورت کے لیے خلع کا دروازہ کھلا ہے (خلع پر بحث اگلے باب میں آرہی ہے)۔

امام مالک یہی فتویٰ دیتے تھے کہ اگر شوہر والدین یا حکومت کے مجبور کرنے پر طلاق دے، مگر اس کی طلاق دینے کی دل سے نیت نہیں ہے تو وہ طلاق واقع نہ ہوگی..... ان کا یہی فتویٰ تھا کہ جبر کی بنا پر دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، اور اسی مسئلہ پر ان کو حکومتِ وقت کی طرف سے سزا بھی دی گئی تھی۔ مگر وہ اپنے موقف پر قائم رہے تھے اور اس سے پیچھے نہ ہٹے تھے۔

عدالت کے ذریعے سے طلاق کی خرابیاں:

بعض حلقوں کی طرف سے یہ تجویز دی جاتی ہے کہ پھر طلاق کا اختیار مرد سے لے کر عدالت کو دے دیا جائے تاکہ اس کا انحصار صرف مرد کی خواہش پر نہ رہے۔ عدالت فریقین کو بٹھا کر ان میں مصالحت کرائے اور اگر مصالحت میں ناکام رہے تو پھر طلاق کی ڈگری جاری کر دے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عدالت سے طلاق کی ڈگری لینا واقعی معقول ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ میاں بیوی کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر کے عدالت معاملے کو اور زیادہ بگاڑ سکتی ہے اس کی اصلاح نہیں کر سکتی، ہو سکتا ہے کہ زوجین کے اختلافات بالکل معمولی اور عارضی ہوں مگر عدالت میں جا کر وہ زیادہ پیچیدہ اور نازک صورت اختیار کر لیں، کیونکہ ایک دفعہ جب کوئی معاملہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے تو طرفین کا غرور انہیں کسی قسم کی مصالحت کے قابل رہنے ہی نہیں دیتا۔ اس لیے معقول رویہ یہی ہے کہ چھوٹے معاملات کو عدالت میں نہ لے جایا جائے، عدالت کو صرف اہم اور بڑے امور میں مداخلت کرنی چاہیے، وہ بھی اس صورت میں جب کہ مصالحت کے تمام ذرائع ناکام ہو چکے ہوں۔

1- زوجین کے سلسلے میں اسلام کی تعلیم کے مطابق مصالحت کروانے کا کام زوجین کے عزیز واقارب اور مخلص احباب بھی کر سکتے ہیں۔

2- پھر عدالت سے طلاق دلوانے میں ایک اور بڑی قباحت یہ ہے کہ ہر فریق عدالت کو مطمئن کرنے کے لیے بوقت ضرورت سخت اور سنگین الزامات لگائے گا، اس پر یقینی طور پر جوابی الزامات کا سلسلہ بھی شروع ہوگا، دونوں کی سیرت و کردار اتنا مجروح ہوگا کہ سوسائٹی میں ان کا وقار گر جائے گا اور بعد میں کوئی ان سے شادی کے لیے تیار نہ ہوگا۔

3- علاوہ ازیں عدالتوں میں جانے والے کیس طویل مدت تک معرض التوا میں پڑے رہتے ہیں، اس پوری مدت میں وہ کیسے ایک دوسرے کو برداشت کر پائیں گے؟

طلاق کے باب میں اسلام کے معقول اور مناسب احکام بعض احتیاطی اقدامات:

ازدواجی زندگی میں بعض ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جبکہ میاں بیوی کا آپس میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی بات پسند نہیں ہے تو اس کا حل یہ نہیں کہ فوراً طلاق دے دی جائے بلکہ جذبات اور خواہشات کے غلبہ سے نکل کر ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے۔ فوری تاثر کے بجائے اہم تر اور وسیع تر مفادات کی خاطر ایک دوسرے کی معمولی غلطیوں کو برداشت کرنا چاہیے اور حسن سلوک کا رویہ ہی برقرار رکھا جائے۔ ارشادِ بانی ہے:

﴿وَعَاشِرُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ، فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ [۱]

”اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں بہت کچھ بھلائی رکھ دی ہو۔“

اصلاح کی کوشش کی جائے:

اختلاف کے وقت مرد پر لازم ہے (کیوں کہ مرد گھر کا نگران اور بیوی کی ضروریات کی فراہمی کا ذمہ دار ہے) کہ وہ اپنی بیوی کو راہِ راست پر لانے کے لیے حسب ضرورت اس کے ساتھ سختی کرے، اسے سرزنش کرے۔ نرمی اور سختی ہر دو طریقوں سے اصلاح کی بھرپور کوشش کرے تاکہ گھر کے معاملات گھر کے اندر ہی بخیر و خوبی حل ہو جائیں۔ ارشادِ بانی ہے:

﴿وَالَّتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاصْرَبُوهُنَّ، فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ

سَبِيلًا ﴿١﴾

”جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو ان کو نصیحت کرو اور ان کو خوابگا ہوں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ تمہاری اطاعت کر لیں تو پھر ان پر سختی کرنے کا کوئی بہانہ مت ڈھونڈو۔“

جو عورت سرکشی پر آمادہ اور شوہر کی بات کو تسلیم نہ کر رہی ہو، اس کے لیے تین اصلاحی اقدامات ترتیب وار بیان کیے گئے ہیں:

پہلے زبانی نصیحت کرو، ہو سکتا ہے کہ اسی سے کام بن جائے۔ اس کے اندر اللہ کا خوف اور آخرت کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کرو، باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاؤ، نرمی اور محبت سے اجتماعی مصالح اور فوائد کا احساس دلاؤ۔ اس میں کامیابی نہ ہو تو دوسرے نمبر پر تادیبی کارروائی یہ ہے کہ خوابگا ہوں میں ان سے الگ رہو۔ گویا سزا کے طور پر یہاں ترک مباشرت کی اجازت دی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اپنے حسن، دلکشی اور ناز و ادا سے خاوند کو مجبور نہیں کر سکتی۔ اس سے اس کا رویہ معقول ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔

لیکن اگر اس سزا کے بعد بھی اس کی اصلاح نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس قدر خود سر اور سرکش ہے کہ سوائے جسمانی سزا کے اور کسی طرح اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ صورت پیدا ہو جائے تو پھر آخری چارہ کار کے طور پر اس کو مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر اس مار پیٹ کا مقصد اصلاح ہونا چاہیے نہ کہ اسے اذیت پہنچانا، لہذا یہ مار پیٹ بہت ہلکی ہونی چاہیے۔ یعنی یہ

ضرب ”صَرْبًا غَيْرَ مُبْتَرِحٍ“ ہو یعنی وہ مار جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔ ﴿٢﴾

آپ کا ارشاد ہے: ”اگر وہ تمہارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں تو ان کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔ منہ پر نہ مارا جائے اور گالم گلوچ بھی نہ کی جائے۔“ یعنی ایسی مار نہ ہو جس سے جسم پر کوئی نشان پڑے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مسواک یا اس جیسی کسی چیز سے مارا جائے۔ نبی پاک کا ارشاد ہے: ”تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح

﴿١﴾ النساء: 34

﴿٢﴾ فرمان نبوی، صحیح مسلم

نہ مارے جس طرح اونٹوں کو مارا جاتا ہے۔ پھر رات کو اسی سے مجامعت کرنے لگ جائے۔“ [۱]

یہ سزا صرف اس نافرمانی پر دی جاسکتی ہے جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہو، نہ یہ کہ مرد اپنے ہر جائز و ناجائز حکم کی اطاعت پر اصرار کرے۔ پھر قصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا ضروری ہے۔ زیادتی پر سرکشی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے وہاں ترک کلام ناجائز ہے، جہاں ترک کلام سے بات بن سکتی ہے وہاں خوابگاہ الگ کرنا غلط ہے اور جہاں خوابگاہ الگ کرنا کافی ہے وہاں مارنا ظلم شمار ہوگا۔ اگر مرد ان ہدایات سے ہٹ کر وحشیانہ طریقہ سے عورت کو مارنا پٹینا شروع کر دے تو خود اسلامی قانون اس کے خلاف عورت کی چارہ جوئی کرے گا۔ امام نووی شرح صحیح مسلم میں بیان کرتے ہیں کہ شریعت نے جس حد کے اندر عورت کو مارنے کی اجازت دی ہے اگر اس سے بھی عورت انتقال کر جائے تو شوہر کے خاندان والوں (عائلہ) پر دیت واجب ہو جائے گی جبکہ اس قتل خطا کا کفارہ تنہا شوہر کو برداشت کرنا ہوگا۔ (واضح رہے کہ قتل خطا میں دیت بھی ہے اور کفارہ بھی) (صفحہ 297، نووی، شرح صحیح مسلم) اس قتل کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے یا پھر دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا اور دیت اس کے علاوہ ہے۔ (بحوالہ سورۃ النساء: 93) [۲]

خاوند کی بدسلوکی کا علاج:

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِنْ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ﴾ [۳]

”اگر کسی عورت کو اپنے خاوند سے بدسلوکی اور بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی

[۱] بخاری

[۲] اندازہ کریں کہ بیوی کو غلطی سے قتل کرنے کی بھی کتنی بھاری سزا اس کو بھگتنا پڑے گی۔ دیت تو 100 اونٹ کی قیمت عورت کے والدین کو ادا کرنا ہوگی اور کفارہ کے طور پر خاوند کو ایک مومن غلام آزاد کرنا ہوگا یا پھر دو ماہ مسلسل روزے رکھنے ہوں گے۔ تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملاحظہ کی جائے۔

[۳] النساء: 128

خرج نہیں کہ دونوں آپس میں کسی طرح صلح کر لیں اور یہ صلح ہی (بہر حال) بہتر ہے۔“ [۱]

شریعت نے ایک طرف مرد کو عورت کی کمزوریوں سے درگزر کرنے کی تلقین کی ہے تو دوسری طرف عورت کو کہا جا رہا ہے کہ شوہر سے صف آرائی کی جگہ صلح صفائی کی امکانی کوشش کرے۔ مرد اس سے بے رخی کر رہا ہے یا اس سے زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے تو اپنے کچھ حقوق سے دست بردار ہو کر مرد سے بنائے رکھنے کی کوشش کرے۔ بچوں کی خاطر، اپنے گھر کی خاطر کچھ محرومیاں قبول کر لے۔ نان نفقہ، لباس شب باشی وغیرہ کے اس کے جو حقوق ہیں ان میں کچھ کی گوارا کر لے، کیونکہ قرآن پاک کے الفاظ میں دونوں میں تفریق ہو جانے کے مقابلے میں (وَالصُّلْحُ خَيْرٌ) صلح ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اس حکم کا مقصد عورت کی تحقیر ہرگز نہیں ہے بلکہ ایک اصلاحی قدم ہے۔ یہ ایک اخلاقی ہدایت ہے عورت کے لیے کہ اپنا گھر بنائے رکھنے کی خاطر یہ چارہ کار بھی کر دیکھے۔ ممکن ہے کہ اسی سے معاملات سدھ جائیں اور علیحدگی کی نوبت نہ آنے پائے۔

دونوں طرف سے ثالث اصلاح کی کوشش کریں:

اگر میاں بیوی کے درمیان جھگڑا بڑھ جائے اور ان کے تعلقات بگڑنے لگیں تو پھر حکم یہ ہے کہ دونوں طرف کے ذمہ دار حضرات سر جوڑ کر بیٹھیں اور ان کے اختلافات دور کرانے کے لیے پوری کوشش کریں، ایک ثالث مرد کے رشتہ داروں میں سے ہو اور ایک ثالث عورت کے رشتہ داروں میں سے۔ اگر خلوص ہو تو انشاء اللہ! مسائل کے حل کی کوئی نہ کوئی راہ نکل آئے گی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

[۱] مرد و عورت کے درمیان کامل مساوات کا مطالبہ کرنے والے کہہ سکتے ہیں کہ زیادتی جب خاوند کی ہو تو اس کے جواب میں عورت کو بھی پھر مرد کو مارنے اور پیٹنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض بھی برائے اعتراض ہے۔ کیونکہ عورت جسمانی طور پر کمزور ہے، عموماً وہ خاوند کی پٹائی کر سکنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہوتی۔ مگر دوسری بات جو اس سے بڑھ کر حقیقت ہے کہ وہ ایسے خاوند کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھ ہی نہیں سکتی جو اتنا کمزور ہو کہ اس کے ہاتھوں پٹا اور مار کھاتا رہے۔ لہذا عورت چاہے مغرب کی ہو یا مشرق کی، عموماً وہ اپنے شوہر کو زد و کوب کرنا پسند ہی نہیں کرتی۔

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ
وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُّوفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا ۚ
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا خَبِيرًا﴾^[۱]

”اگر تم لوگوں کو میاں بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے
رشتہ داروں میں سے اور ایک حکم عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو۔
اگر وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان اصلاح کی صورت
نکال دے گا۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔“

ممکن ہے کہ ان رشتہ دار ثالثوں کی مصالحت مفید ثابت ہو اور معاملات بگڑنے سے بچ
سکیں، یہ تدبیر ہمارے معاشرے کا بہترین معمول رہی ہے۔ خصوصاً دیہاتی ماحول میں گھروں
کے بے شمار تنازعات اسی طرح نمٹائے جاتے ہیں۔

اگر طلاق ناگزیر ہو جائے تو؟

طلاق کے سلسلے میں بھی اسلام نے اس قدر اصلاحی اقدامات کیے ہیں تاکہ زیادہ سے
زیادہ وقت غور و خوض کے لیے مل سکے، یہ اصلاحی پابندیاں درج ذیل ہیں:

1- طلاق کی تعداد مقرر کر دی:

عرب کے لوگ اپنی عورتوں کو بے شمار طلاقیں دیتے اور پھر دورانِ عدت رجوع کر لیتے، جس
سے عملاً عورت بڑی خستہ حال رہتی۔ طلاق دینا پھر رجوع کر لینا، پھر طلاق دینا اور دورانِ عدت
رجوع کر لینا ان کے لیے ہنسی کھیل تھا، مگر عورت شوہر والی ہونے کے باوجود عموماً معلق ہی رہتی۔
قرآن پاک نے اس زیادتی کا سخت نوٹس لیا کہ صرف دو بار طلاق رجعی دی جاسکتی ہے۔ طلاق رجعی
وہ طلاق ہے جس میں آدمی کو دورانِ عدت رجوع کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۖ فَمَا مَسَّكَ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسَرَّحَ بِإِحْسَانٍ ۖ﴾^[۲]

[۱] النساء: 35

[۲] البقرہ: 229

”طلاق دو مرتبہ ہے۔ پھر یا تو بھلے طریقے سے روک لیا جائے یا پھر شریفانہ طریقے سے چھوڑ دیا جائے۔“

دو کے بعد اگر تیسری طلاق دے دی تو بیوی جدا ہو جائے گی، اور معاملہ مشکل بن جائے گا۔

2- رجوع کی مدت مقرر کر دینا:

دور جاہلیت میں رجوع کے لیے کوئی مدت مقرر نہ تھی، بسا اوقات مرد دو دو سال تک عورتوں کو لٹکائے رکھتا۔ پھر مدت بعد اس سے رجوع کر لیتا، اس طرح عملًا نہ تو وہ عورت کے حق ادا کرتا نہ اسے اپنے سے جدا کرتا۔

اسلام نے اس زیادتی کا ازالہ کرنے کے لیے ایک مدت مقرر کر دی، جس کے دوران عورت سے رجوع ہو سکتا ہے، اس مدت کا نام عدت ہے۔ عدت کے اندر رجوع کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ مرد کو کرنا ہے، اگر اس نے رجوع نہیں کیا تو عورت خود بخود اس سے آزاد ہو گئی۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۖ... وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا﴾ [۱]

”جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے، وہ تین حیض تک اپنے آپ کو روک رکھیں..... اگر ان کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس مدت میں وہ ان کو واپس لے آنے کے زیادہ حقدار ہیں۔“

یہ اس جوان عورت کا ذکر ہے جسے حیض (ماہواری) آتی ہو۔ جو عورتیں کم سنی، بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے حیض سے دو چار نہ ہوں، ان کی عدت تین ماہ اور حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہے:

﴿وَالَّذِي يَدُسِّنَ مِنَ الْمَحِيضِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنْ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ ۖ وَالَّذِي لَمْ يَحِضْنَ ۖ وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۖ﴾ [۲]

[۱] البقرہ: 228

[۲] الطلاق: 4

”اور تمہاری جو عورتیں حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اگر تمہیں ان کے بارے میں شبہ ہو تو پھر (جان لو) کہ ان کی عدت تین ماہ ہے اور یہی حکم ان عورتوں کے لیے ہے جن کو ابھی حیض نہ آیا ہو اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ ان کا حمل وضع ہو جائے۔“

جن عورتوں کا نکاح ہو گیا مگر ابھی خلوت صحیحہ سے پہلے طلاق ہو گئی تو ان کی کوئی عدت نہیں ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا﴾ [۱]

”اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو پھر انہیں چھوٹنے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے، جس کے پورے ہونے کا تم ان سے مطالبہ کر سکو۔“

مختلف عورتوں کے لیے عدت مختلف ہے، مگر اس عدت اور طلاق رجعی کا جو فائدہ ہے وہ یہی ہے کہ اس پورے عرصہ میں از سر نو غور و فکر کا موقع مل جائے، اس طرح یہ بھی اجازت ہے کہ ان دونوں طلاقوں کے درمیان چاہے عدت کے اندر رجوع کرے، چاہے عدت گزرنے کے بعد، زوجین غلطی محسوس کریں تو از سر نکاح کر کے پھر باہم مل بیٹھیں۔

طلاق کے اعداد و شمار اٹھا کر دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی ممالک میں طلاق کی شرح دوسرے ممالک کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے، یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام کا قانون طلاق دنیا کے لیے رحمت ہے اور زحمت کا اس میں نام تک نہیں۔ تاہم جوں جوں مغربی تہذیب اسلامی ممالک میں پھیل رہی ہے اس کی وجہ سے طلاق میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔

پھر طلاق دینے کا جو مسنون طریقہ کار ہے وہ بھی طلاق کی شرح کو کم کرنے میں معاون ہے۔ چنانچہ طریقہ کار میں ان ہدایات کا لازمی طور پر خیال رکھا جانا چاہیے۔

3- طلاق حیض کی حالت میں نہ دی جائے:

چونکہ حیض کی حالت عموماً بیماری ہی کی ایک کیفیت ہے، اس دوران عورتیں چڑچڑی اور بد مزاج ہو جاتی ہیں، بسا اوقات اس کیفیت میں ایسی باتیں ان سے سرزد ہونے لگتی ہیں جو مرد کو پسند نہ ہوں بلکہ خود عورتیں بھی عام حالات میں ان کو پسند نہ کریں، اس لیے حیض کے دوران طلاق دینے سے منع کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں اس دوران مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق برقرار نہیں رہ سکتا جو دونوں کی باہمی محبت و دلچسپی کا ذریعہ ہے، لہذا اس کیفیت میں بد مزگی پیدا ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ اس لیے حیض کی حالت میں طلاق دینے سے روکا گیا ہے۔

علاوہ ازیں مرد کو پابند کیا گیا ہے کہ حیض کے بعد حالت طہر میں یعنی پاکیزگی کی کیفیت میں ہم بستری کیے بغیر ایک طلاق دے۔ طہر میں ہم بستری کیے بغیر طلاق دینے میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ مثلاً عورت کا غیر حاملہ ہونا واضح رہے گا۔ پھر عام حالات میں تو مرد چاہتا ہے کہ عورت کے ایام سے فارغ ہونے کے فوراً بعد وہ ہم بستر ہوں، جس سے ان کے بہت سے اختلافات خود بخود ختم ہونے لگتے ہیں یا ان میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ اس لیے ہدایت کی گئی ہے کہ حالت طہر میں جنسی وظیفہ ادا کیے بغیر طلاق دی جائے، یہ ایک مشکل کام ہے، مرد اسی وقت اس شرط میں پورا اتر سکتا ہے جبکہ فی الواقع اس کو عورت سے نفرت پیدا ہو چکی ہو، یا اس نے طلاق کا پورا فیصلہ کر لیا ہو۔

ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض کے زمانہ میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ سن کر ناراض ہوئے، پھر آپؐ نے فرمایا: ”اے کہو کہ اس سے رجوع کرے اور اسے اپنے پاس رکھے۔ جب وہ حیض سے پاک ہو اور وہ اسے طلاق دینا چاہتے ہوں تو ہم بستری سے قبل طہارت کی حالت میں طلاق دے۔“ [۱]

بہتر تو یہ ہے کہ صرف ایک طلاق پر اکتفا کیا جائے اور عدت گزر جانے دی جائے اور اگر دوسری طلاق دینا ہی ہو تب دوسرے طہر میں بغیر مباشرت کے دی جائے، صحابہ کرامؓ بھی ایک طلاق کے بعد عدت گزر جانے دیتے تھے۔ اسی کو طلاق کا بہترین طریقہ شمار کیا گیا ہے۔

4- عدت کے دوران عورت شوہر ہی کے گھر میں رہے گی:

طلاق کے بعد جب تک عدت پوری نہ ہو جائے مزد عورت کو گھر سے نہیں نکال سکتا، الا یہ کہ عورت سے کوئی بے حیائی کا فعل سرزد ہو جائے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ [۱]

”زمانہ عدت میں عورت کو گھر سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، الا یہ کہ وہ کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کریں۔“

عدت کے دوران عورت کو اپنے ہاں رکھنے میں مصلحت یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ایک ساتھ رہنے سے پھر وہ ایک دوسرے کی طرف مائل ہو جائیں اور کوئی اصلاح کی شکل نکل آئے۔

5- عدت میں رجوع کرنے کا اختیار:

ایک یا دو طلاق کی شکل میں عدت کے دوران مرد کو رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اس دوران عورت کو شوہر کی خدمت کرنا اور اس کا حکم ماننا ضروری ہے بلکہ اسے زیب و زینت اختیار کرنی چاہیے تاکہ مرد کا دل اس کی طرف مائل ہو سکے۔ عدت کے دوران رجوع کر لے یا عدت گزرنے پر دوبارہ نکاح کر سکے۔ اگر رجوع کی شکل بنے یا نکاح کی، دونوں شکلوں میں تاکیدِ حکم حسن سلوک کا ہے۔ قرآن پاک میں سورہ بقرہ آیت 231 میں ارشاد ہوتا ہے: وَلَا تُنكِسْكُوهُنَّ دُونَ ذَلِكَ مُبَيِّنَةً ۚ ”ظلم و زیادتی کی خاطر ان کو نہ روکنا بلکہ“ انہیں روکنا ہے تو معروف طریقے سے روکنا یا پھر بھلے طریقے سے ان کو رخصت کر دو۔“ (بقرہ: 231) لہذا پیار، محبت اور حسن سلوک سے رہنے کی نیت ہے تو رجوع کر لیں۔ یہ رجوع ستانے یا تنگ کرنے کی خاطر نہ

ہو، وگرنہ پھر ان کو اچھے انداز سے رخصت کر دو۔

6- رخصتی کے موقع پر حسن سلوک:

حکم ربانی ہے:

﴿سَبِّحْ حُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ﴾ [۱]

”ان کو بھلے طریقے سے رخصت کرو۔“

عورت کو طلاق اور عدت کے مراحل سے فارغ ہونے پر رخصت کرنے کے لیے

”تسریح“ یا ”سراح“ کے الفاظ آئے ہیں، جن کا مطلب ہے روانہ کرنا۔

طلاق پر خوشی کا اظہار کرنا شیطانی کام ہے۔ مگر دلوں میں غمی ہونے کے باوجود یہ معاملہ معروف طریقے سے نبھایا جائے۔ ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے جس سے عورت یا اس کے لواحقین کی دل آزاری ہو۔ اگر مہر واجب الادا ہو تو ادا کیا جائے۔ اگر پہلے ادا کیا جا چکا ہے تب بھی اسے کچھ تحفے تحائف دیئے جائیں، دیا ہوا مال واپس نہ لیا جائے۔ پھر عدت پوری ہو چکنے کے بعد عورت کے نکاح ثانی میں حائل نہیں ہونا چاہیے، نہ ہی اسے گھر میں زبردستی روکا جائے اور نہ اس پر کوئی الزام تراشی کی جائے۔ معروف طریقے سے رخصت کرنے میں حکمت یہ ہے کہ جب کبھی وہ بعد میں ایک دوسرے کو یاد کریں تو اچھے انداز میں یاد کریں، ناگوار یادیں دل میں لیے ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ اسلام مومن کے گھر بار کی بہت عزت و حرمت ملحوظ رکھتا ہے، اس کی بے حرمتی اسلام کو کسی حال میں گوارا نہیں۔ کاش! مسلمان خود بھی اپنی اور خاندان کی عزت و حرمت کا اتنا خیال رکھتے!

7- آخری طلاق:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا

غَيْرَہَا﴾ [۲]

[۱] البقرہ: 231

[۲] البقرہ: 230

”پھر اگر مرد عورت کو طلاق دے دے تو اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں

ہے یہاں تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح کر لے۔“ [۱]

پہلی دو طلاقیں تو رجعی تھیں، مگر ان کے بعد اب یہ تیسری طلاق مغلظ ہو گئی۔ یعنی اب نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہا اور نہ تجدید نکاح کا بلکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کامل طور پر جدا ہو گئے۔ تا وقتیکہ اس کا نکاح کسی اور سے ہو اور پھر وہاں سے اتفاقاً طلاق ہو جائے یا وہ بیوہ ہو جائے، اس طرح ان کی فرقت واقع ہو جائے۔ اس طرح قرآن اور سنت کے مطابق طلاق دینے کا مناسب طریقہ کار بھی یہی ہے کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے۔ صحابہ کرامؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ لیکن اگر بالفرض دوسری طلاق بھی دینا چاہتا ہے تو دوسرے طہر میں دے، پھر تیسری بھی دینا چاہتا ہے تو وہ تیسرے طہر میں دے۔ رہی یہ صورت کہ بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی جائیں تو یہ جاہلوں کا طریقہ ہے، شریعت کی رو سے سخت گناہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہت زیادہ مذمت بیان فرمائی ہے۔ حضرت عمرؓ بیک وقت تین طلاقیں دینے والے شخص کو دُڑے لگوا کر تے تھے۔

نسائی کی ایک روایت مشکوٰۃ میں موجود ہے کہ ایک شخص نے یکدم تین طلاقیں دے ڈالیں تو نبی پاکؐ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا: ”کیا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مذاق کرتا ہے، جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟“ اس پر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ! کیا میں

[۱] یہ اتنی کڑی شرط ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو تیسری طلاق دینے سے پہلے بار بار سوچے گا اور اس وقت تک طلاق نہ دے گا جب تک طلاق دینے کا حتمی فیصلہ نہ کر لے۔ رہی شرط دوسرے شوہر سے نکاح کرنے کی! تو آج کل تین طلاقیں دینے والے کو مفتی حضرات یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ کسی شخص کو اس بات پر تیار کر لو کہ وہ تمہاری مطلقہ سے نکاح کر لے اور پھر فعل مباشرت انجام دینے کے بعد اس کو طلاق دے دے پھر تم اس سے از سر نو نکاح کر لینا۔ اس کو فقہی اصطلاح میں حلالہ کہا جاتا ہے۔ مگر اس فعل حلالہ کو شریعت میں سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ پلاننگ بنا کر اپنی مطلقہ کا کسی سے نکاح کروانا اور پھر اسے کچھ دے دلا کر اس سے طلاق دلوانا اور بعد ازاں خود اس سے نکاح کرنا یہ بہت ہی شرمناک حیلہ ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کرائے کے سانڈ ”حمیس مستعجار“ سے تشبیہ دی ہے۔ مراد کرائے کا سانڈ ہے۔

اس (اللہ تعالیٰ سے مذاق کرنے والے شخص) کو قتل کر دوں؟“ آپؐ نے فرمایا: ”نہیں۔“

تین طلاقیں کا مسئلہ:

اب مسئلہ یہ ہے کہ جس شخص نے ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالیں تو کیا اسے رجوع کا حق حاصل ہوگا یا یہ طلاقیں بائن ہوں گی اور وہ رجوع کا اختیار نہیں رکھتا؟ تو احناف کے نزدیک بلکہ عام فقہاء کے نزدیک بھی یہ بائن ہوں گی اور رجوع کا حق باقی نہیں رہے گا۔

اصل میں ایک مجلس میں تین طلاقیں وقتی غصہ اور ناگواری کی وجہ سے دی جاتی ہیں، دوسری وجہ دین کے احکام سے ناواقفیت ہے۔ شریعت نے اس مسئلہ پر اتنے غور و خوض کے مواقع دیئے ہیں، مگر انسان اپنے وقتی غصہ کی وجہ سے اپنے پر خود ہی کاٹ لیتا ہے۔ اگر شریعت کے احکام پر پوری طرح عمل درآمد ہو تو یہ پیچیدگیاں پیدا نہ ہوں جو عجلت اور جلد بازی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

بعض لوگوں نے تیسری طلاق کے بعد والے مسئلہ کے لیے اس طرح کا حیلہ ڈھونڈا ہے کہ جس عورت کو تین بار طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نامدوم ہو اور پھر اس سے نکاح کرنا چاہے تو وہ اس عورت کا نکاح کسی اور شخص سے کرادے اور پھر کچھ دے دلا کر اس کو وہاں سے بھی طلاق دلوا دے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف وضاحت فرمائی ہے کہ تحلیل کے لیے خلوت صحیحہ کی شرط لازمی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”وہ اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک دوسرا شوہر اس عورت سے اور وہ عورت دوسرے شوہر سے لطف اندوز نہ ہو لے۔“ [۱]

پھر جو شخص محض اپنی مطلقہ کو اپنے لیے حلال کرنے کے لیے کسی اور سے اس کا نکاح کروائے اور جو اس غرض سے نکاح کرے، دونوں پر لعنت فرمائی گئی ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَعَنَ اللَّهُ الْمُحِلَّ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ [۲]

[۱] حقوق الزوجین، صفحہ: 58

[۲] ابوداؤد، ترمذی

”اللہ کی لعنت ہو اس پر جو حلالہ کرے اور اس پر بھی جس کے لیے حلالہ کیا گیا ہو۔“

فی الواقع اس طرح کے نکاح اور زنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس صریح حرام اور شرمناک حیلے کا فتویٰ دینے والوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ اس کے برعکس نبی پاکؐ کے عہد اور ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں بیک وقت دی گئی تین طلاقیں ایک طلاق شمار ہوتی تھیں۔ لہذا ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقوں کو اب بھی ایک طلاق شمار کیا جائے۔ [۱]

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو یک دم تین طلاقیں دے دیں۔ پھر انہیں بہت افسوس ہوا، نبی پاکؐ سے ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ تو نے یہ طلاق کیسے دی؟ (وہ بولے کہ بخدا! میری نیت ایک ہی طلاق کی تھی، آپؐ نے فرمایا کہ تیری نیت ایک ہی طلاق کی تھی؟ انہوں نے عرض کیا: ”جی ہاں! (میری نیت ایک ہی طلاق کی تھی)“ تو نبی پاکؐ نے فرمایا: ”یہ ایک ہی ہے۔ اگر تو چاہے تو رجوع کر لے۔“ (مسند احمد) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ پھر رکانہ نے رجوع کر لیا۔

جو شخص ایک مجلس میں تین طلاقیں دے دیتا ہے اور اس کی نیت ایک ہی طلاق کی ہوتی ہے ظاہر ہے اس کے پیچھے وقتی غصہ کام کر رہا ہوتا ہے، وہ کوئی غور و خوض کر کے طلاق نہیں دیتا جبکہ شریعت کا منشا یہی ہے کہ طلاق سوچ سمجھ کر دی جائے۔ لہذا اہل حدیث فقہاء کے نزدیک یہ ایک رجعی طلاق ہے اور حلالہ کے حیا سوز اور گندے طریقے کے مقابلے میں یہ مسنون طریقہ بہت ہی راحت بخش اور پیچیدگیوں کو دور کرنے والا ہے، واللہ الحمد!

صحیح مسلم میں ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق دور نبویؐ، دور صدیقیؓ اور دور فاروقیؓ کے ابتدائی دو تین سالوں تک پوری امت میں ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا۔ نبی پاکؐ کے دور میں جب ایک آدمی نے اپنی بیوی کو یک دم تین طلاقیں دیں تو آپؐ مارے غصے کے کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ کیا میری موجودگی میں کتاب اللہ سے یہ مذاق کیا جاتا ہے۔ آپؐ کے غصے کو دیکھ کر ایک صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میں اسے قتل نہ کر دوں؟ مگر آپؐ نے قتل کرنے کی اجازت نہ دی۔

[۱] صحیح مسلم، عن ابن عباسؓ

اس واقعہ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاق دینا شرعی نقطہ نظر سے کتنا بڑا گناہ اور مکروہ فعل ہے۔ مگر دور جاہلیت کی یہ مکروہ عادت نبی کریمؐ کی وفات کے بعد پھر عود کر آئی تو حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی اس عادت کو چھڑانے کے لیے بطور سزا تین طرح کے اقدامات کیے۔ (گو وہ خود ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک رجعی طلاق ہی واقع ہونے کے قائل تھے)۔ [۱]

1- وہ ایک مجلس میں تین طلاق دینے والوں کو بدنی سزا بھی دیتے تھے، یعنی کوڑے لگواتے تھے۔

2- ایک مجلس کی تین طلاق کو انہوں نے تین ہی شمار کرنے کا قانون نافذ کر دیا۔

3- جب لوگوں نے اپنی عادت پر کنٹرول کرنے کے بجائے حلالہ کی باتیں کرنا شروع کر دیں تو آپؐ نے حلالہ نکالنے اور نکلوانے والے دونوں کے لیے رجم کی سزا مقرر کر دی، اس طرح یہ فتنہ کچھ مدت کے لیے دب گیا۔ گویا دور فاروقیؓ میں بھی اس کارِ معصیت کی اصلاح اس طرح ہوئی کہ حلالہ کے دروازہ کو سختی سے بند کر دیا گیا تھا اور یہ ان کی اصلاح کی وقتی تدبیر تھی۔

مگر آج صورت حال بالکل مختلف ہے۔ آج کا المیہ یہ ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں دینا جرم سمجھا ہی نہیں جاتا بلکہ جہالت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ عوام تو درکنار خواص بھی یہ سمجھتے ہیں کہ جدائی کے لیے تین طلاق دینا ضروری ہے۔ حالانکہ طلاق کی بہترین اور مسنون صورت یہی ہے کہ صرف ایک طلاق دے کر عدت گزر جانے دی جائے۔ تاکہ عدت گزرنے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ تاکہ اگر زوجین کی پھر خواہش ہو تو وہ تجدید نکاح کر سکیں یا اگر زیادہ ہی نفرت اور بگاڑ پیدا ہو چکا ہو تو پھر تین طہروں میں مباشرت کیے بغیر الگ الگ طلاق دے کر اپنی حسرت پوری کر لیں۔

آج کے دور میں یکبارگی تین طلاق دینے والے کو کوئی بدنی سزا نہیں دی جاتی، کوئی اسے اس کے گھناؤنے جرم اور کتاب اللہ کے ساتھ مذاق جیسے قبیح فعل کا احساس نہیں دلاتا۔ کوئی تو اسے

[۱] بروایت موطا امام مالک۔ ان کا یہ قانون غیر محتاط لوگوں کے لیے تیزیر کے طور پر تھا۔

حلالہ کی راہ دکھا دیتا ہے۔ (گویا جرم مرد کرے مگر اس کی سزا بیوی کو ملے جو بے قصور ہے۔) اور کوئی اسے ایک طلاق رجعی کی خوشخبری سنا کر مطمئن کر دیتا ہے۔ اسے کچھ نہ کچھ سزا ضرور دی جائے تاکہ اسے اپنے فعلِ شنیع کا احساس ہو۔ حضرت عمرؓ کی یہی سنت ہے کہ حلالہ کرنے والے اور کرانے والے کو جرم کی سزا دیتے تھے اور تین طلاقیں یکدم دینے والے کو کچھ بدنی سزا بھی دیتے تھے۔

تین طلاق کو ایک رجعی طلاق قرار دینے والے فقہاء:

یہ گروہ حضرت عمرؓ کے فیصلے کو وقتی اور تعزیزی مانتے ہیں اور سنت نبویؐ کو ہر زمانے کے لیے معمول سمجھتے ہوئے ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک ہی شمار کرتے ہیں، اس گروہ میں ظاہری، اہلحدیث، شیعہ اور آئمہ اربعہ کے بعض علماء شامل ہیں۔^[۱]

بہر حال موجودہ دور کے علمائے احناف نے اس مسئلہ پر خود بھی غور و خوض کیا۔ اس مقصد کے لیے احمد آباد (بھارت) میں نومبر 1973ء میں ”ایک مجلس کی تین طلاق“ کے موضوع پر سیمینار منعقد ہوا۔ اس میں فاضل علماء احناف نے ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک قرار دینے کی سفارش کی۔ آج کل مندرجہ ذیل ممالک میں ایک مجلس کی تین طلاق کو ایک رجعی طلاق شمار کرنے کا قانون نافذ کر دیا گیا ہے:

- (1) مصر 1929ء میں، (2) سوڈان 1935ء میں، (3) اردن 1951ء میں،
- (4) مراکش 1958ء میں، (5) عراق 1959ء میں، (6) پاکستان 1962ء میں۔

[۱] یہ سارا بیان توفیق کی کتابوں میں ہی دیکھا جاسکتا ہے، یہ اس تفصیل کا مقام نہیں ہے۔ بہر صورت امام ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری شرح صحیح بخاری، ج 9، صفحہ 29 پر تین طلاقیں کو ایک قرار دینے والے صحابہؓ کی فہرست دی ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ اور زبیرؓ بن عوام، ابو موسیٰ اشعریؓ..... تابعین میں سے عکرمہ، طاؤس، محمد بن اسحاق، داؤد بن علی وغیرہ۔ تبع تابعین میں امام فخر الدین رازی (م 606ھ)، امام ابن تیمیہ (م 728ھ)، امام ابن قیم (م 751ھ)، امام ابن حجر عسقلانی (م 852ھ)، علامہ بدر الدین العینی (م 755ھ)، امام طحاوی، امام شوکانی، نواب صدیق حسن خاں (م 1307ھ) عبدالحی لکھنوی (م 1302ھ)، شبلی نعمانی (م 1322ھ)، یہ سب ایک رجعی طلاق کے قائل ہیں۔

چونکہ یہ فتویٰ (یک بارگی تین طلاق کو تین ہی شمار کرنا) ایک تو سنت کے خلاف تھا، دوسرا انسانی فطرت کے بھی خلاف تھا۔ لہذا خود کچھ علمائے احناف ان کے اس فتویٰ سے متفق نہیں ہیں۔ مثلاً دور حاضر میں - 1 مولانا اشرف علی تھانوی، 2 - مولانا عبدالحی فرنگی محلی، 3 - مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی، 4 - مولانا محمد عبدالحلیم قاسمی صدر علمائے احناف پاکستان، 5 - مفتی حبیب الرحمن، مدرسہ امینیہ دہلی، 6 - مولانا محفوظ الرحمن قاسمی فاضل دیوبند، 7 - پیر کرم شاہ ازہروی، مدیر ماہنامہ ”ضیائے حرم“ بھیرہ۔^[۱]

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام واقع حیدرآباد دکن)

لکھتے ہیں:

”مگر ہمارے زمانے میں جہالت اور ناواقفیت اور شرعی تعلیمات سے دوری کے باعث صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ طلاق واقع ہی اس وقت ہوتی ہے جب تین بار طلاق کا لفظ کہا جائے۔ ان حالات میں مناسب ہوگا کہ جہاں صرف لفظ طلاق کا تکرار ہو اور تاکید کا معنی مراد لیا جاسکتا ہو تو وہاں اسے ایک ہی طلاق واقع قرار دی جائے اور قضا میں بھی اس شخص کی نیت کا اعتبار کیا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء نے اس مسئلہ میں پیش قدمی کی ہے اور فتاویٰ میں اس کی رعایت شروع کر دی ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر دارالعلوم دیوبند کا ایک فتویٰ ملاحظہ ہو۔ (آگے فتویٰ کا سوال و جواب تفصیلاً لکھا ہے)۔

پھر آگے چل کر مولانا سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

”ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے دوسرے دارالافتاء اور اہل علم بھی اس کے مطابق فتوے دیا کریں، اس لیے کہ قریب قریب پورے ملک کا عرف یہ ہے کہ لوگوں نے ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب تک تین طلاق کا لفظ استعمال نہ کیا جائے طلاق واقع ہی نہ ہوگی۔“^[۲]

[۱] یہ ساری تفصیل ماہنامہ محدث (اکتوبر 1992ء) کے مضمون ”تظلیق ملاحہ“ از: مولانا عبدالرحمن کیلانی

سے لی گئی ہے۔

[۲] جدید فقہی مسائل، صفحہ 423 تا 425

مطلقہ کے معاشی مسائل:

عموماً بات اس انداز سے کی جاتی ہے کہ اب مطلقہ بیچاری کیا کرے، اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ کیسے پالے؟ ان کا مستقبل بالکل تاریک ہو جائے گا لہذا مرد کو پابند کیا جائے کہ وہ اپنی مطلقہ کو نان نفقہ ادا کرے۔ چنانچہ 55ء کے عائلی قوانین کے کمیشن کے سوالنامہ میں یہ سوال دیا گیا تھا: ”کیا ازدواجی و عائلی عدالت کو مطلقہ کے مطالبہ پر یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ مطلقہ کو تاحیات یا تا عقد ثانی نفقہ دلوائے؟“

یہ سوال بھی اعتراض برائے اعتراض ہے، وگرنہ اسلام کا پورا کفالتی نظام موجود ہے۔ وہ ہر مرحلہ پر ہر حالت میں عورت کی کفالت کا بندوبست کرتا ہے۔ یہاں تفصیلاً اس سارے مسئلے پر بحث کی جا رہی ہے۔

کا مطالبہ:

اصل بات یہ ہے کہ مغربی تمدن اور اہل مغرب کے طور طریقے بعض حضرات کے لیے ایک آئیڈیل کا درجہ رکھتے ہیں، وہاں چونکہ یہی قانون رائج ہے کہ عورت مرد سے طلاق لینے یا اسے طلاق دینے، (کیونکہ وہاں عورتیں از روئے قانون اسی طرح مردوں کو طلاق دے سکتی ہیں جس طرح مرد عورتوں کو دیتے ہیں) کے بعد بھی اس سے خرچہ وصول کرتی رہتی ہے اور تاحیات حیات اس سے لطف اندوز ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے روشنی و ترقی کا تقاضا یہی ہے کہ اسی اصول کو یہاں بھی نافذ کیا جائے۔ چنانچہ کبھی تاحیات نفقہ یا تا عقد ثانی نفقہ ادا کرنے کی بات کی جاتی ہے تاکہ طلاق دینے والے کو طلاق دینے کے جرم کی قرار واقعی سزا دی جاسکے، کبھی اس کی جائیداد میں عورت کو طلاق کے باوجود حصہ دار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور کبھی یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ جتنے سال انہوں نے ازدواجی زندگی گزاری ہے، اتنے مہینے شمار کر کے اس حساب سے مرد اپنی

مطلقہ کو نفقہ ادا کرے تاکہ اس مصیبت زدہ عورت کی کوئی تلافی ہو سکے۔ [۱]

سوال یہ ہے کہ جہاں طلاق واقع ہوگئی، عدت ختم ہوگئی، دونوں میں کامل جدائی ہوگئی، اب وہاں عورت کو نفقہ ادا کرنے کا پابند کر کے کس تہذیب و تمدن کو رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ از روئے اسلام مطلقہ کا بار سابق شوہر پر کچھ صورتوں میں پہلے ہی موجود ہے:

1- قرآن و حدیث میں وہ صورتیں معین کر دی گئی ہیں، جن میں ایک مطلقہ عورت طلاق دینے والے شوہر سے نفقہ پانے کی حقدار ہوتی ہے اور یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ وہ ان مختلف صورتوں میں کتنی دیر کے لیے حقدار ہے۔ مثلاً پہلی دو طلاقوں میں چاہے رجعی ہوں یا بائن، عدت تک عورت کو نفقہ اور رہائش دونوں ملیں گے۔ [۲]

2- اگر مطلقہ حاملہ ہے تو وضع حمل تک رہائش و نفقہ کی حق دار ہے۔

3- اس کے بعد اگر وہ بچے کو دودھ پلاتی ہے تو اس دوران بچے کے اخراجات اور ماں کے اخراجات دونوں باپ کے ذمہ ہوں گے۔

4- اپنی ساری اولاد بھی عورت اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ اگر لڑکا ہے تو سات سال تک اور لڑکی ہے تو نو برس تک یا ایک قول کے مطابق بالغ ہونے تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے، اور اس چھوٹی اولاد کے جملہ اخراجات بھی باپ کے ذمہ ہوں گے۔ عورت صرف اسی صورت میں ان اخراجات سے محروم ہو سکتی ہے جب کہ وہ کسی ایسے مرد سے نکاح کرے، جو اولاد کے لیے اجنبی اور غیر محرم ہو اور سابق خاوند یہ مطالبہ کرے کہ میری اولاد مجھے واپس دلائی جائے۔

[۱] بلکہ 1976ء کے حقوق نسواں کمیشن کی سفارش اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ (1) جس طرح مرد عورت کو طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی اپنے خاوند کو طلاق دینے کا حق دیا جائے۔ (2) جو عورت پانچ سال تک ایک مرد کے نکاح میں رہے وہ سابق شوہر کی جائیداد میں سے قید نکاح سے آزاد ہونے کے بعد بھی حصہ دار قرار پائے (3) عدت کے زمانہ کے علاوہ شادی شدہ زندگی کے لیے ہر سال کے لیے ایک ماہ کے حساب سے شمار کر کے سابق زوجہ کو نان نفقہ ادا کرے۔

[۲] الطلاق: 6

مطلقہ کو اس کے علاوہ سابق شوہر کی جائیداد کا وارث بنانا یا اس کے اخراجات کا پابند بنانا کسی طرح بھی کتاب و سنت سے ثابت نہیں ہوتا۔ بعض اس غرض کے لیے سورہ بقرہ کی آیت نمبر 241 پیش کرتے ہیں:

﴿وَلِلْمُطَلَّاقِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝﴾ [۱]

”طلاق یافتہ عورتوں کو دستور کے مطابق متاع دینا اہل تقویٰ پر لازم ہے۔“

مطلقہ کا نفقہ ادا کرنے کے خلاف دلائل:

1- طلاق پانے کے بعد مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعاً اجنبی ہو چکے ہیں اور طلاق مغلط میں یہ اجنبیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ (کیونکہ عام عورتوں سے تو نکاح ہو سکتا ہے مگر یہاں ایک کڑی شرط نکاح میں حائل ہے اور وہ یہ کہ جب تک غیر سے نکاح نہ کر لے اور پھر دوسرے شوہر کی وفات یا اتفاقاً طلاق کے ذریعہ وہاں سے بھی جدائی نہ ہو جائے) لہذا مرد ایک غیر اور اجنبی عورت کو کس بنا پر نفقہ ادا کرے؟۔ خود عقل بھی یہ نہیں مانتی کہ ایک شخص جو ایک عورت کو طلاق دے چکا ہے اور اب اس سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کا حقدار نہیں ہے، اس کو تازہ زندگی یا تاعد ثانی اس کے مصارف کا بار اٹھانے پر کیوں مجبور کیا جائے۔ کوئی خود دار یا شریف عورت خود بھی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ ایک غیر شخص (جواب اس کا شوہر نہیں رہا) سے اخراجات وصول کرے۔ یہ شریف خواتین کی توہین کے مترادف ہے۔

2- طلاق کے بعد جس طرح عورت تمام ازدواجی ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئی ہے، اسی طرح مرد بھی ان ذمہ داریوں سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ اگر سابقہ بیوی کا نفقہ اسی طرح اس کے ذمہ رہے تو پھر اس کو طلاق دینے میں فائدہ کیا ہوا؟ کیا اس سے بہتر نہ تھا کہ وہ طلاق ہی نہ دیتا بلکہ اس کو معلق چھوڑ دیتا اور عملاً اس کو تمام حقوق سے محروم کیے رکھتا؟ طلاق کے بعد بھی مرد پر نفقہ کو لازم قرار دینے کا یہ منطقی نتیجہ نکلے گا کہ مرد طلاق کا راستہ چھوڑ کر ایسی عورت، جسے وہ بسانا نہ چاہتے

ہوں، کو معلق چھوڑ دیں یا معلق چھوڑنے پر مجبور کر دیئے جائیں۔ کیونکہ مرد نے اپنا دوسرا نکاح بھی کرنا ہے، اس کے مہر اور دیگر اخراجات بھی کرنے ہیں۔ اگر وہ پہلی کے نفقہ سے ہی فارغ نہیں ہو پاتا تو عقد ثانی کے اخراجات کیسے پورے کرے گا۔ لہذا وہ دوسرا نکاح کرے گا تو اس کے اخراجات برداشت کرے گا اور پہلی کو معلق چھوڑ دے گا۔ یا پھر دوسری شکل یہ ہے کہ اس کو طلاق دے کر اسی کا نفقہ ادا کرتا رہے اور دوسرے نکاح کا بوجھ نہ اٹھا سکے کی بنا پر تجرُّد اختیار کرے۔ مگر اس میں قباحت یہ ہے کہ اس طرح مرد کے بے راہرو ہونے کا ڈر ہے۔ اس طرح بے حیائی اور حرام کاری کا راستہ کھلتا ہے۔

3- دونوں طلاق کے بعد ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہو جاتے ہیں، لیکن اگر نفقہ کا راستہ کھلا رہے تو یہ معاشی مسئلہ حل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ دراصل دونوں کے تعلقات کھلے رکھنے کا ایک چور دروازہ ہے۔ آہستہ آہستہ ملاقاتیں شروع ہوتی ہیں، بے تکلفی بڑھتی ہے اور پھر وہ سب کچھ ہونے لگتا ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ متعدد ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ طلاق کے بعد بھی وہ جنسی تعلقات میں ملوث پائے جاتے ہیں۔

4- اس کا ایک اور نقصان یہ ہے کہ جب عورت کو پتہ ہے کہ اس کو طلاق کے بعد بھی نفقہ ملتا رہے گا تو وہ بات بات پر طلاق کا مطالبہ کرنے لگتی ہے اور جب وہ تفویض طلاق کا حق بھی لے چکی ہو اور نفقہ کا بھی منوا چکی ہو تو اندازہ کیجیے کہ اس سے طلاقیوں کی شرح یک دم کس طرح بڑھ جائے گی۔

(یہ بھی طرفہ تماشہ ہے کہ ایک طرف عورت اپنے لیے کمانے کا حق مانگتی ہے تاکہ مرد کی بالادستی سے نجات حاصل کر سکے، دوسری طرف طلاق کے بعد بھی وہ سابقہ شوہر سے نان نفقہ مانگتی ہے)۔

اصل بات یہ ہے کہ مدتوں ہندوانہ اور مسیحانہ تصور رہا ہے کہ رشتہ ازدواج دائمی ہے، یہ موت ہی سے ختم ہو سکتا ہے، اسی کے اثرات اب تک ان کے معاشروں میں موجود ہیں جن کی بنا پر وہ طلاق کے باوجود سابق شوہر کو مطلقہ کو ضروریات زندگی فراہم کرنے کا مکلف بناتے ہیں۔ اگر مسلم معاشرے میں بھی یہ بنیاد پڑ گئی تو پھر اسلامی معاشروں میں بھی گھروں کا امن و سکون

غارت ہو کر رہ جائے گا جس طرح ہندو یا مغربی معاشروں میں ہو رہا ہے۔ [۱]

اب جائیداد میں وارث بنانے کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ جب طلاق کے ذریعے سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو چکے ہیں تو مطلقہ کی سابق شوہر کی جائیداد میں وراثت کیسی؟ (ہاں! اگر عدت کے دوران مرد فوت ہو جائے تو عدت کی بنا پر عورت مرد کے ترکہ میں سے حقدار ہے، حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے اپنی اہلیہ کو طلاق دی تھی مگر عدت گزرنے سے قبل ان کا انتقال ہو گیا تو امیر المومنین حضرت عثمانؓ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرنے کے بعد ان کی مطلقہ کو میراث میں سے حصہ دلا یا تھا) عام حالات میں جائیداد میں سے مطلقہ کو حصہ دلانا تو اتنا دلچسپ لطیفہ ہے کہ اپنی مثال آپ ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد ہی اس کا ترکہ تقسیم ہوتا ہے۔ زندگی میں مرد اپنی طلاق یافتہ عورت کو کس طرح جائیداد میں سے حصہ دے سکتا ہے یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد وارثوں کو اس کے طلاق دینے کے تصور کا خمیازہ بھگتنا پڑے؟

اب رہی بات ”متاع“ دینے کی، جو کہ حکم قرآنی مَتَّعُوْهُنَّ سے اخذ کر کے، اس سے نفقہ کا حق کشید کیا جا رہا ہے کہ جب تک عورت زندہ ہے اس کو یہ متاع ملنا چاہیے۔ لہذا لفظ ”متاع“ سے کیا مراد ہے؟ یہ متعین کرنا ضروری ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس سے کسی بھی نوعیت کا فائدہ اٹھایا جائے متاع یا متعہ ہے۔ (المفردات فی غریب القرآن، مادہ متع)

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسَلُّوْهُنَّ مِنْ وَرَآءِ حِجَابٍ ۖ﴾ [۲]

”جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کے پیچھے سے مانگو۔“

الغرض متعہ یا متاع سے مراد وہ سامان ہے جس سے کچھ فائدہ اٹھایا جاسکے، قرآن پاک

[۱] ہندوستان نے تو اس غرض کے لیے باقاعدہ قانون بھی بنادیا ہے۔ شاہ بانوبیگم کے کیس میں اپریل 1985ء میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے مدھیہ پردیش ہائی کورٹ (صوبائی عدالت) کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے کہا: مطلقہ مسلمان بیوی کو عدت گزر جانے کے بعد بھی نان نفقہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے۔“

میں سورۃ البقرہ، آیت نمبر 236 و متعوهن کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آیت اس صورت میں طلاق یافتہ عورت کو متاع دینے کا حکم دے رہی ہے جبکہ مہر طے نہ ہوا ہو اور خلوت سے قبل ہی ان کو طلاق دے دی جائے، اس شکل میں ان کو کچھ متاع دے کر رخصت کیا جائے۔ فقہائے احناف کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ متاع مہر مثل کے نصف سے زیادہ نہیں ہو سکتا، مگر پانچ درہم سے کم بھی نہ ہو (کیونکہ ان کے نزدیک مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے) امام شافعیؒ کے مطابق صاحب حیثیت شخص ایک خادم کا متاع دے، اوسط درجے کا آدمی ایک جوڑا کپڑے دے، کم از کم درجہ یہ ہے کہ تیس درہم یا اس کے برابر قیمت کی کوئی چیز دی جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میاں بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کم و بیش پر اتفاق کر لیں۔ قرآن پاک نے تو کہا ہے کہ صاحب حیثیت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق دیں۔ دوسری جگہ فرمایا مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ کہ یہ متاع معروف کے مطابق دیں۔ ساتھ اس کو حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ اور دوسری بار حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ فرمایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ متقی اور محسن بننے کے لیے ہر مطلقہ کو کچھ نہ کچھ متاع دینا چاہیے، جو اپنی حیثیت کے مطابق عورت کی دل جوئی کے لیے ہو۔ اس متاع کو بڑھا کر پوری زندگی کا نفقہ قرار دینا ایک ایسی زیادتی ہے جس کی اس آیت کی رو سے قطعاً کوئی گنجائش نہیں نکلتی علاوہ ازیں جب عورت آزاد ہے، وہ مرد کے فائدہ کے لیے کچھ کرنے کی پابند نہیں تو پھر وہ نفقہ لینے کی مستحق کیسے بن سکتی ہے؟

طلاق یافتہ عورت کی کفالت کا مسئلہ؟:

اسلام کا کفالتی نظام مکمل ہے، اس میں کہیں بھی کمی یا نقص نہیں ہے۔ اگر چودہ سو سال سے اس میں کوئی کوتاہی محسوس نہیں کی گئی تو آج کا ایک یہ کوتاہی کہاں سے پیدا کر لی گئی؟ بہتر تھا کہ پہلے اسلام کے کفالتی نظام کا مطالعہ کر لیا جاتا، چنانچہ طلاق یافتہ عورت کا معاشی مسئلہ کئی طریقے سے حل ہو سکتا ہے:

- 1- بعض اوقات عورت خود صاحب جائیداد ہوتی ہے۔ مہر، وراثت وغیرہ کے ذریعہ سے اس کی پوزیشن ایسی ہوتی ہے کہ وہ خود اپنا گزارا کر سکے۔
- 2- بعض اوقات اس کا کوئی جائز ذریعہ معاش بھی ہو سکتا ہے۔ عورتیں گھروں میں سلائی کڑھائی وغیرہ کا کام کر لیتی ہیں، بزازی کی دکان کھول لیتی ہیں، ملازمت بھی کر سکتی ہیں۔

3- ایسی حالت میں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی طلاق یافتہ بیٹی کی کفالت کر لے، اگر باپ اس پوزیشن میں نہیں ہے، تو بھائی کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنی بہن کا خرچہ برداشت کرے۔ چچا بھی یہ ذمہ داری اٹھا سکتا ہے۔ اگر اولاد جوان اور اہل ہے تو وہ والدہ کی کفالت کر سکتی ہے، بیت المال بھی اس کی مدد کر سکتا ہے۔

4- لیکن اس مسئلہ کا جو اصل حل اسلام نے بتایا ہے وہ یہ ہے: ﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَّامِي مِنْكُمْ﴾ [۱] ”تم میں سے جو لوگ مجرد ہیں ان کے نکاح کر دو۔“

یہاں لفظ ایامی ہے جو لفظ آیم کی جمع ہے، جو اکیلے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے چاہے وہ بیوی یا شوہر فوت ہو جانے یا طلاق ہو جانے کی بنا پر اکیلا ہو یا ابھی شادی ہی نہ ہوئی ہو، تو حکم یہ ہے کہ فوراً بر ملتے ہی ان کی شادی کر دو۔ ہمارے ہاں بر صغیر پاک و ہند میں عورت کے لیے نکاح ثانی کو معیوب سمجھا جاتا ہے، لہذا مغرب زدہ خواتین کا سارا زور اسے تاحیات نفقہ دلانے پر ہے، جبکہ شریعت نے کسی کو کسی حال میں بھی مجزؤ (یعنی اکیلا) رہنے کی اجازت نہیں دی۔ جب اس کا عقد ثانی ہو جائے گا تو دوسرا شوہر خود بخود اس کے نفقہ کا ذمہ دار ہوگا۔ عرب ممالک میں اب بھی بیوہ یا مطلقہ کا کوئی مسئلہ ہی نہیں، وہاں فوراً ان کے دوسرے نکاح کر دیئے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ طلاق کی ناپسندیدگی، طلاق کا طریقہ کار، حکمین کی کوششیں ہر ایک قدم طلاق میں رکاوٹ ڈالنے والا اور عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دینے والا ہے۔ ان سب اقدامات کی وجہ سے عملاً اسلامی معاشرے میں شرح طلاق بہت کم ہے (لیکن جوں جوں مغربی انداز و اطوار اپنائے جا رہے ہیں، طلاق کی شرح بھی بڑھتی جا رہی ہے) پھر بھی اگر ایسا واقعہ پیش آ ہی جائے تو عقد ثانی کا حکم ہے۔ عورتوں کے حق میں یہ زریں ہدایات فی الواقع کائنات کے خالق و مالک اور عالم الغیب والشہادۃ ہی کی عطا کردہ ہیں، خود خالق ہی مخلوق کے تقاضوں کو بطریق احسن سمجھ سکتا ہے۔ بجا فرمایا باری تعالیٰ نے:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ [۲]

”یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ کے قانون سے بڑھ کر کس کا قانون اچھا ہو سکتا ہے!“

13

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ﴾

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ؕ﴾

”اگر تمہیں یہ خوف ہو کہ وہ دونوں حدود الہی پر قائم نہ رہ سکیں گے
تو ایسی صورت میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو
کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔“

(البقرہ: 229)

خلع کا حق

- ✿ خلع پر اعتراض
- ✿ قانونی پہلو
- ✿ حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف
- ✿ مال کی قربانی
- ✿ صرف معاوضہ ادا کرنا کافی نہیں، بلکہ مرد کا راضی ہونا بھی ضروری ہے
- ✿ طرفین کی رضامندی کافی ہے
- ✿ عدالت سے رجوع کرنے کا حق
- ✿ عہد رسالت اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں خلع کے مختلف واقعات
- ✿ کن وجوہات کی بنا پر خلع کا مطالبہ کرنا جائز ہے؟
- ✿ رجوع کا حق نہیں
- ✿ خلع کا معاوضہ
- ✿ حق خلع کے سلسلے میں قاضی کے اختیارات
- ✿ حقوق نسواں کمیٹی 1976ء کی بحث خلع کے معاملے میں

حقِ خلع

خلع کا لفظی مطلب ”اُتار دینا“ ہے اور شرعی اصطلاح میں اس سے یہ مراد ہے کہ بیوی اگر کسی معقول وجہ کی بنا پر خاوند سے جدائی چاہتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گزر بسر نہ کر سکتی ہو تو اپنا حق مہر واپس کر کے شوہر سے خلع یا تفریقِ نکاح حاصل کر سکتی ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا يَجِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا بِمَا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾ [۱]

”تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو اس میں کچھ بھی واپس لو۔ الا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ایسی صورت میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں (اس مال کو لینے میں) جسے دے کر عورت خود کو چھڑا لے۔“

”فدیہ“ اس بدل یا معاوضہ کو کہتے ہیں جسے دے کر جان بچائی یا چھڑائی جائے۔ اس آیت مبارکہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ شوہر نے بیوی کو جو کچھ دے رکھا ہے یعنی مہر، زیور، کپڑے وغیرہ یا کوئی اور چیز جو اس کے نام لگوا دی تھی، طلاق دینے کی صورت میں اس میں سے کچھ بھی واپس لینا اس کے لیے حلال نہیں۔ البتہ اگر بیوی خود کسی معقول وجہ کی بنا پر شوہر سے علیحدہ ہونا چاہے تو حق مہر واپس دے کر اپنے نفس کی خود مالک بننا چاہے تو پھر کوئی گناہ نہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ

اس نکاح سے آزاد ہو سکتی ہے۔

خلع پر اعتراض:

خلع پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ بھی عورت کے استحصال کی ایک شکل ہے۔ مرد عورت کو الگ کرنا چاہتا ہے، مگر طلاق نہیں دیتا کیونکہ اس طرح مہر واپس کرنا پڑتا ہے۔ وہ عورت کو اتنا تنگ کرتا ہے کہ عورت مجبور ہو جائے اور بالآخر اپنا مہر یا شوہر کا دیا ہوا کوئی اور مال واپس دے کر اس سے علیحدگی چاہے۔

مگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ یہ اعتراض تو وہی شخص کر سکتا ہے جو خلع کی نوعیت اور حقیقت سے ناواقف ہے۔

شریعت اسلامی نے جس طرح مرد کو طلاق کا حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ پسند نہیں کرتا اور جس کے ساتھ کسی صورت بھی نبھانہ نہیں کر سکتا تو اسے طلاق دے دے، مگر یہ طلاق بالکل آخری چارہ کار ہے۔ جس سے پہلے بھی کئی اخلاقی ہدایات دی گئی ہیں اور طلاق کے دوران بھی کئی ایسی گنجائشیں رکھی گئی ہیں کہ وہ جدا ہونے سے پہلے کئی بار سوچ لیں، گویا طلاق مرد کی طرف سے نبھانہ نہ کر سکنے کی صورت میں آخری چارہ کار ہے، بالکل اسی طرح اسلام نے عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ وہ جس مرد کو نا پسند کرتی ہے اور کسی طرح بھی اس کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی، وہ مرد سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے۔ مگر یہ خلع کا استعمال بھی عورت کے لیے آخری چارہ کار کے طور پر ہے۔

خلع کا اخلاقی پہلو:

شریعت کا یہ حکم ہے کہ محض ذاتی خواہشات کی تسکین کے لیے طلاق یا خلع کو کھیل نہ بنالیا جائے۔ چنانچہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات درج ذیل ہیں:

﴿إِيْمَاْمُرَاٰةٍ سَاَلَتْ رَوْجَهَا طَلًا قَا فِيْ غَيْرِ مَا بَاَسَ فَحَرَامٌ عَلَيْهَا رَاٰ حُجَّةُ الْجَنَّةِ﴾
 ”جس عورت نے بغیر کسی وجہ کے مرد سے طلاق مانگی تو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔“

”خلع کو کھیل بنا لینے والی عورتیں منافق ہیں۔“ [۱]

لہذا نبی پاکؐ کی یہ ہدایات ہیں کہ خلع اور طلاق کو صرف آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے ان کو کھیل نہ بنالیا جائے۔
قانونی پہلو:

مگر ان سب ہدایات کے باوجود بعض اوقات ناگزیر حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ دلوں میں نفرت ہے، رشتہ ازدواج ایک مصیبت بن گیا ہے، مقاصد نکاح پورے نہیں ہو رہے، مگر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ اس لیے بندھے ہیں کہ اس گرفت سے آزاد ہونے کی کوئی صورت نہیں، تو پھر عورت کو خلع کی اجازت ہے مگر ساتھ ہی اس پر متعدد پابندیاں لگا دی گئی ہیں جو مندرجہ ذیل آیت سے ظاہر ہو رہی ہیں:

﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ۖ﴾ [۲]

”اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ جو مال تم ان عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو، مگر اس صورت میں جب اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے سوا اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو پھر دونوں پر اس مال کے بارے میں کوئی گناہ نہ ہوگا جو عورت معاوضہ میں دے دے۔“

ان پابندیوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

[۱] معجم الکبیر للطبرانی ۱۷/ ۳۳۹، صحیح النسائی

[۲] البقرہ: ۲۲۹

1- حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف:

خلع کی اجازت صرف اس شکل میں ہے جب کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو، یہاں فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ خلع بھی ویسی ہی بری چیز ہے جیسے طلاق، مگر جب خوف ہو کہ اب مقاصد نکاح پورے نہیں ہو رہے، دونوں میں سے کسی ایک کے لیے دوسرے کے حقوق ادا کرنے مشکل ہو رہے ہیں، اس طرح حدود اللہ کے ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے تو ایسی صورت میں خلع کی اجازت ہے۔

2- مال کی قربانی:

جس طرح مرد کو اپنی خواہش سے طلاق دیتے وقت اپنے مال کی قربانی گوارا کرنا پڑتی ہے اسی طرح عورت جب خلع چاہے گی تو اسے بھی مال کی قربانی گوارا کرنا پڑے گی، یعنی وہ اس مال کا پورا حصہ یا کچھ حصہ واپس کر کے جدا ہو سکتی ہے، جو اس نے شوہر سے لیا تھا۔

3- صرف معاوضہ ادا کرنا کافی نہیں:

خلع حاصل کرنے کے لیے صرف فدیہ دینے والی عورت کی خواہش کافی نہیں بلکہ یہ معاملہ اس وقت مکمل ہوگا جب فدیہ لینے والا بھی راضی ہو۔ مراد یہ ہے کہ صرف مال پیش کر کے خود بخود عورت علیحدہ نہیں ہو سکتی، بلکہ علیحدگی کے لیے ضروری ہے کہ جو مال وہ پیش کر رہی ہے مرد اس کو قبول کر کے اُسے فارغ کر دے۔

4- طرفین کی رضا مندی کافی ہے:

خلع کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ عورت شوہر کا دیا ہوا پورا مال یا اس کا کچھ حصہ جب مرد کو دے اور مرد اس کو قبول کر کے طلاق دے دے، تب یہ معاملہ مکمل ہوگا۔ جب تک مرد رضا مند نہ ہو یہ معاملہ پورا نہیں ہو سکتا۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہِ کے الفاظ وضاحت کر رہے ہیں کہ مرد و عورت باہم مل کر فیصلہ کر لیں اور گھر کا معاملہ گھر کے اندر ہی طے ہو جائے تو خلع مکمل ہو گیا۔ کسی تیسرے فرد، عدالت یا اولی الامر کو یہاں

مداخلت کا کوئی حق نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔

5۔ یہاں مخاطب مردوں کو کیا جا رہا ہے۔ فَإِنْ خِفْتُمْ پس اگر تم ڈرو۔ مراد یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کے درمیان یہ مسئلہ طے نہیں پارہا تو پھر وہ دونوں اپنے گھر کے مردوں کے سامنے اپنا مسئلہ رکھیں۔ ایک یا دو مرد عورت کی طرف سے بیٹھیں، اسی طرح ایک یا دو مرد میاں کی طرف سے بیٹھیں اور وہ مل کر میاں کو خلع کی طرف مائل کریں۔ لیکن میاں پھر بھی نہیں مان رہا تو پھر معاملہ عدالت تک پہنچایا جائے گا۔

6۔ عدالت سے رجوع کرنے کا حق:

عدالت کی مداخلت کا جواز تب پیدا ہوتا ہے جب عورت مال دے کر عقد نکاح سے رہائی چاہتی ہے، مگر مرد اس پر آمادہ نہیں ہے پھر ان کے بزرگوں نے مرد کو خلع دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، مگر کامیاب نہ ہو سکے تو پھر اس صورت میں عورت عدالت سے رجوع کرنے کا حق رکھتی ہے۔ مذکورہ بالا آیت فَإِنْ خِفْتُمْ إِلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ میں خِفْتُمْ کی ضمیر میاں بیوی کے علاوہ اولی الامر ہی کی جانب ہے۔ اولی الامر کا اولین فرض بھی حدود اللہ کی حفاظت ہے۔ مگر جب وہ دیکھیں کہ اب حدود اللہ پوری نہیں ہو رہیں تو پھر انہیں مداخلت کر کے عورت کا وہ حق اسے دلوا دینا چاہیے جو الہی حدود کے تحفظ کی خاطر اللہ تعالیٰ نے عورت کو عطا کیا ہے۔

عہد رسالت اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں خلع کے مقدمات:

باقی رہ گئیں خلع کے بارے میں تفصیلی جزئیات! مثلاً وہ کون سی وجوہ ہیں جن کو حدود اللہ کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی گئی ہے؟ یا خلع کے سلسلے میں قاضی کو کچھ اختیار حاصل ہے بھی یا نہیں؟ پھر قاضی کو ہی کلی اختیار حاصل ہے؟ وغیرہ وغیرہ ان کی تفصیل ہمیں دور نبویؐ اور خلفائے راشدین کے عہد میں ہونے والے خلع کے مقدمات سے ملتی ہے۔

1۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں خلع کا جو مشہور مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش ہوا وہ ثابت بن قیس سے ان کی دو بیویوں کا خلع حاصل کرنا تھا۔ ان کی ایک بیوی جمیلہ بنت عبد اللہ بن ابی سلول نبی پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔ (یہ تفصیلات مختلف

روایات سے ہیں):

”یا رسول اللہ! میرے اور اس (یعنی ثابت بن قیس) کے سر کو کوئی چیز جمع نہیں کر سکتی۔ میں نے خیمے کے پردے کو جو اٹھایا تو دیکھا کہ وہ سامنے سے چند آدمیوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان سب سے زیادہ کالا، سب سے زیادہ پست قد اور سب سے زیادہ بد شکل تھا۔ میں اپنے خاوند میں کوئی شرعی یا اخلاقی عیب نہیں دیکھتی البتہ مجھے اس کی شکل سخت ناپسند ہے۔ جب وہ میرے پاس آتا ہے تو میرا دل چاہتا ہے کہ اگر خدا کا خوف مانع نہ ہو تو میں اس کے منہ پر تھوک دوں۔“ [۱]

نبی پاکؐ نے ان کی یہ شکایت سنی تو فرمایا: ”کیا تو مہر میں لیا ہوا باغ اس کو واپس کر دے گی (جو اس نے تمہیں دیا تھا)؟“ انہوں نے عرض کیا: ”ہاں یا رسول اللہ! بلکہ اگر وہ زیادہ چاہے تو زیادہ بھی دوں گی۔“ حضورؐ نے فرمایا زیادہ تو نہیں مگر تو اس کا باغ واپس کر دے۔“ پھر ثابت کو حکم دیا کہ باغ واپس لے لو اور اس کو طلاق دے دو۔“ [۲]

2- ثابت بن قیس کی دوسری بیوی حبیبہ بنت سہل انصاری تھیں۔ ان کا واقعہ بھی موطا امام مالک میں اور سنن ابوداؤد میں بیان ہوا ہے کہ ایک دن حضور پاکؐ صبح کو گھر سے باہر نکلے تو حبیبہ بنت سہل کو کھڑے پایا، پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے عرض کیا: لا انا ولا ثابت بن قیس یعنی میں اور ثابت بن قیس اکٹھے نہیں رہ سکتے۔“ ان کو بھی اپنے خاوند سے بد صورتی ہی کی شکایت تھی۔ انہوں نے بھی کہا تھا: ”یا رسول اللہ! اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو ثابت کے منہ پر تھوک دیتی۔“ نبی پاکؐ نے یہاں بھی وہی فیصلہ دیا، یعنی ثابت بن قیس نے جو کچھ بیوی کو دیا تھا، وہ ان کو واپس دلا کر خلع دلا دیا۔

3- خلع کا ایک مقدمہ حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی پیش آیا۔ آپ کے پاس ایک عورت نے اپنے شوہر سے خلع حاصل کرنے کے لیے اپیل کی۔ آپؐ نے عورت کو نصیحت کی اور خلع سے باز

[۱] بخاری، ابن ماجہ

[۲] ایضاً

رہنے کی تلقین کی۔ وہ نہ مانی تو آپ نے اس کو کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی کوٹھڑی میں قید کر دیا۔ تین دن کے بعد اسے نکال کر اس کا حال احوال دریافت کیا تو وہ بولی: ”خدا کی قسم! مجھے انہی تین راتوں میں راحت نصیب ہوئی ہے۔“ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کو خلع دینے کا حکم دیا۔

4- حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ کا بھی ایک خلع کا واقعہ پیش آیا۔ ربیع بنت معوذ بن عفراءؓ نے اپنے شوہر سے کہا کہ میرا سارا مال لے لو اور خلع دے دو۔ وہ مان گیا اور فیصلہ ہو گیا مگر ان کے چچا نے یہ معاملہ حضرت عثمانؓ تک جو اس وقت خلیفۃ المومنین تھے، پہنچانا ضروری سمجھا۔ حضرت عثمانؓ نے اس خلع کو برقرار رکھا۔

کن وجوہات کی بنا پر خلع کا مطالبہ کرنا جائز ہے؟

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ”اگر تم ڈرو کہ وہ حدود اللہ قائم نہ رکھ سکیں گے تو پھر کچھ مضائقہ نہیں کہ عورت کچھ معاوضہ دے کر عقد نکاح سے آزاد ہو جائے۔“ اس میں حدود اللہ قائم نہ رکھ سکنا اصل سبب ہے۔ حدود اللہ سے مراد وہ فرائض ہیں جو میاں بیوی پر ایک دوسرے کی طرف سے واجب الادا ہوتے ہیں۔ اگر شوہر زوجیت کے حقوق ادا کرنے کے قابل ہی نہ ہو یا کسی کوتاہی کی بنا پر ایسا کر رہا ہو تو بیوی کو خلع کا مطالبہ کرنے کا حق ہے۔

مذکورہ بالا آیت اور مندرجہ بالا خلع کے واقعات سے خلع کے لیے مندرجہ ذیل وجوہ پر روشنی پڑتی ہے:

- 1- شوہر کا بد صورت ہونا۔ 2- ازدواجی تعلقات کے قابل نہ ہونا۔ 3- نان نفقہ ادا نہ کرنا۔ 4- بیوی کو مارنا پیٹنا۔ 5- بیوی کو خاوند سے نفرت۔ 6- طبعیتوں کا اختلاف اتنا زیادہ ہو کہ نبھاہ نہ ہو سکتا ہو۔ 7- شوہر بے دین ہو اور کبائر میں مبتلا ہو۔

رجوع کا حق نہیں:

فقہاء کے نزدیک خلع کے بعد شوہر کو رجوع کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ عورت نے معاوضہ ادا کر کے قید نکاح سے رہائی حاصل کی ہے۔ اب وہ اپنے نفس کی خود مالک ہے۔ اس طرح خلع سے حاصل کی ہوئی آزادی طلاق بائن کے حکم میں ہے۔ ہاں! اگر بعد میں دونوں رضامند ہو

خلع کا حق

جائیں تو نیا نکاح کر سکتے ہیں۔ خلع کی عدت احادیث کی روشنی میں ایک حیض یا ایک ماہ ہے۔
خلع کا معاوضہ:

خلع کا معاوضہ کتنا ہو؟ اس کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہوتی ہے۔ آپؐ نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ شوہر خلع کے معاوضہ میں اپنے دیے ہوئے مال سے کچھ زیادہ وصول کرے۔ اس پر فقہاء کا اتفاق ہے۔ اگر یہ ناگواری شوہر کی طرف سے پیدا ہوئی ہو تو شوہر کو عوض لینا مکروہ ہے اور اگر ناگواری بیوی کی طرف سے ہو تو پھر بھی یہ مسلمہ بات ہے کہ شوہر مہر سے زیادہ نہیں لے سکتا۔

امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو خلع پر مجبور کرنے کے لیے اسے تنگ کرے، مار پیٹ کرے، نفقہ اور شب باشی وغیرہ کے حقوق ادا نہ کرے اور عورت مجبور ہو کر خلع حاصل کر لے تو یہ خلع باطل ہو جائے گا۔ یعنی عورت تو آزاد ہو جائے گی مگر شوہر کو معاوضہ واپس کرنا ہوگا۔ گویا یہ معاملہ طلاق کے حکم میں ہوگا۔

حق خلع کے سلسلے میں قاضی کے اختیارات:

خلع کا مسئلہ خلطِ بحث کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ فقہاء کے اقوال اور بحثوں نے تو خلع کا حق حاصل کرنا عورت کے لیے ناقابلِ عمل بنا دیا ہے۔ ایک فریق کا استدلال اس طرح کا ہے کہ ”خلع تو صرف زوجین کے درمیان معاملہ ہے، اس میں حکومت کو دخل دینا اور دخیل بنانا قطعاً درست نہیں ہے۔ نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔ وہی چاہے تو کھول سکتا ہے۔ لہذا گھر میں معاملہ طے پا جائے تو بہتر و گرنہ پھر عورت اسی طرح گزارا کرے۔ بہر صورت عدالت کو خلع کا حق نہیں دیا جاسکتا۔“ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عملاً یہ حق عورتوں سے سلب کر لیا گیا اور ان کو مجبور و بے بس بنا کر رکھ دیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شریعت نے واقعی مرد و عورت کے حقوق کے درمیان توازن قائم نہیں رکھا ہے؟ جب زوجین ایک دوسرے کے حقوق ادا نہ کر سکیں، دلوں میں نفرت بیٹھ جائے، مقاصدِ نکاح پورے نہ ہو رہے ہوں تو مرد اس ناخوشگوار صورتحال میں طلاق کا قانونی حق استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن جب عورت مجبور ہو جائے، اس کے لیے نبھاہ کرنا مشکل ہو

جائے اور اس کے پاس اس بندھن کو ختم کر نیکا کوئی طریقہ بھی نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے؟ کیا وہ تمام عمر مصیبت کی زندگی بسر کرے، خودکشی کرے، حرام کاری میں مبتلا ہو جائے، یا سرے سے ہی وہ دین اسلام کو خیر باد کہہ دے؟ کیا اسلامی شریعت واقعی اس ظلم کا حکم دے سکتی ہے یا اس ظلم کو برداشت کر سکتی ہے؟ [۱]

اصل بات یہ ہے کہ خلع کے مسئلے میں عدالتوں کا باقاعدہ کردار ہے۔ جس کو شریعت تسلیم کرتی ہے۔ آیت فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ خُودُہٗی قاضی یا اولی الامر کے اختیارات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اس میں زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغے کے ساتھ ہے۔ پھر خِفْتُمْ کا خطاب کس کو ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ زوجین کو تو ہو نہیں سکتا، لہذا ماننا پڑے گا کہ یہاں خفتم (تم اندیشہ کرو) کے مخاطب اولی الامر ہیں کہ اگر زوجین میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو پاتا تو پھر اولی الامر کا کام ہے کہ وہ ان کے درمیان خلع کروادیں۔ یہ صحیح ہے کہ پہلے گھر میں بات طے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ خلع کے کئی واقعات میاں بیوی کے درمیان طے پائے اور خلفاء نے ان کو سنا تو ان کو برقرار رکھا۔ بلکہ بعض اوقات خلفاء کو اطلاع تک نہ دی گئی۔ اسلامی شریعت از دو واجی جھگڑوں کا پبلک میں آنا پسند نہیں کرتی۔ اس لیے اس نے مرد و عورت دونوں کو قانونی اختیار دیے ہیں کہ وہ جہاں تک ممکن ہو گھر کے اندر ہی اپنے طلاق یا خلع کے معاملات نمٹالیں۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا تو آخری چارہ کار ہے، جب گھر میں کوئی تصفیہ نہ ہو رہا ہو۔ بعض اوقات شوہر واقعی بڑے ضدی اور شر پسند ہوتے ہیں، وہ عورتوں کو صحیح طریقہ سے بساتے بھی نہیں اور ان کو خلع دینے پر بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ لہذا شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا چارہ کار

[۱] مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب ”حقوق الزوجین“ میں مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے: ”کیا کسی میں اتنی جسارت ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی شریعت پر اتنی کھلی ہوئی بے انصافی کا الزام عائد کر سکے۔ یہ جسارت اگر کوئی کرے تو اسے اقوال فقہاء سے نہیں بلکہ کتاب و سنت سے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے کہ اللہ و رسولؐ نے خلع کے معاملے میں قاضی کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔“

خلع کا حق

بھی اس غرض کے لیے مقرر کر دیا ہے اور وہ ہے تصفیہ نہ ہونے کی شکل میں عدالت کا فیصلہ۔ خلع کے جتنے واقعات ہمیں دور نبویؐ و خلفائے راشدینؓ کے دور میں ملتے ہیں، ان سے معاملہ کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ثابت بن قیس کی بیویوں کی شکایت پر آپؐ نے ثابت بن قیس سے فرمایا: طلقھا۔ فارقھا۔ خل سبیلہ لہ سب امر کے صیغے ہیں۔ شوہر کو عدالت حکم دے رہی ہے۔ اسی سے پتہ چل جاتا ہے کہ عدالت مختار ہے، مجاز ہے۔ وہ عورت کی شکایت پر مرد ہی کو عقدِ نکاح کو کھولنے کا حکم دے رہی ہے اور پھر ایک روایت میں فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا کے الفاظ آتے ہیں۔ یعنی آپؐ نے ان دونوں (ثابت اور اس کی بیوی) کو جدا کر دیا، یعنی آپؐ کے حکم سے وہ الگ الگ ہو گئے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ضدی قسم کا شوہر عدالت کے کہنے پر بھی خلع دینے پر آمادہ نہیں ہوتا، تو پھر ایسی صورت میں عدالت اس شخص کو سزا دینے کی مجاز ہے، عدالت کا کام مشورہ دینا نہیں کہ کوئی مانے، چاہے نہ مانے، بلکہ عدالت کا کام فیصلہ سنانا اور نہ ماننے والے کو سزا دینا ہے۔ حضرت علیؓ کے عہد میں ایک ایسے ہی ضدی شوہر نے بات ماننے سے انکار کر دیا تو آپؐ نے اسے قید کروا دیا تھا۔ ایسی صورت میں قاضی خود اپنے اختیار سے کام لے کر دونوں کے درمیان تفریق کرادے گا۔ یہ تیسرا چارہ کار ہوگا جس کا استعمال بوقتِ ضرورت کیا جاسکتا ہے۔

حقوق نسواں کمیٹی 1976ء کی بحث خلع کے معاملے میں:

مندرجہ بالا بحث کے بالکل برعکس خلع کے معاملے میں ایک بحث حقوقِ نسواں کمیٹی 1976ء نے بھی چھیڑی ہے۔ اس کا بھی جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ کی سفارشات دفعہ نمبر 33 میں لکھا: ”مسلم لاء کے تحت جو عورت خلع کے اصول پر تفریقِ نکاح کا مطالبہ کرے اور خاوند کو مالی معاوضہ دینے پر تیار ہو اسے اپنا حق تفریقِ نکاح استعمال کرنے کے لیے عدالت یا قاضی کے سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ خلع کے معاملے میں عدالت سے رجوع کرنا ضروری نہیں۔ اگر زوجین باہمی رضامندی سے خلع کر لیں تو ٹھیک ہے ورنہ جب عورت کسی شوہر

کو پسند نہیں کرتی اور وہ اسے خلع دینے پر آمادہ نہیں تو جس طرح مرد از خود طلاق دے سکتا ہے، اسی طرح عورت بھی اپنا حق خلع از خود استعمال کر سکتی ہے، اسے عدالت سے تنسیخ نکاح کی ڈگری لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی مرد کو فارغ کر دے اور جہاں جی چاہے چلی جائے، عدالت کو اس معاملہ میں صرف اتنا اختیار ہے کہ جو فیصلہ یہ یا معاوضہ وہ چاہے تجویز کر دے اور خاوند سے خلع دلا دے یا تنسیخ نکاح کا فیصلہ کر دے۔ پہلی صورت حال جس کے مطابق صدیوں سے مجبور خواتین کو خلع کے حقوق سے محروم رکھا گیا ایک انتہا تھی، اب حقوق نسواں کمیٹی اس انتہا کا ازالہ کرتے کرتے دوسری انتہا تک پہنچ گئی کہ عورت مرد سے بات کرے، وہ مان جائے تو ٹھیک وگرنہ خود ہی وہ ازالہ نکاح یا طلاق کی مختار ہے۔

جبکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ عورت اگر خلع لینا چاہتی ہے، مگر مرد نہیں مان رہا تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی۔ عدالت خاوند کو طلب کر کے اسے طلاق یا خلع کا حکم دے اور چاہے تو مالی معاوضہ طے کرے۔ اگر خاوند آمادہ ہو جائے تو ٹھیک ہے وگرنہ عدالت اپنے اختیارات سے نکاح کو کالعدم قرار دے دے گی۔ چونکہ نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے، عدالت پہلے اسے معاملہ نمٹانے کا حکم دے گی، لیکن اگر وہ رضا مند نہیں ہے تو پھر عدالت تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کر دے گی۔

یہ حقوق نسواں کمیٹی جس حق کا مطالبہ کر رہی ہے، وہ عورتوں کے لیے نکاح کے بندھن کو خود کھولنے کا اختیار ہے، ازالہ نکاح جس طرح مرد کر سکتا ہے، اسی طرح یہ کمیٹی بھی خلع کے پردے میں غیر مقید اور بے دریغ حق طلاق عورت کو دینا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ جب عورت یہ فیصلہ کر لے کہ وہ اس شوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی، تو اسے یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ خود ہی نکاح کا خاتمہ کر سکے اور عدالت کا کام صرف اتنا ہو کہ وہ اس کے اوپر مہر تصدیق لگا دے اور مالی معاوضہ طے کر دے۔

شریعت کا حکم ہے کہ نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے، عورت خود نکاح کو ختم نہیں کر سکتی۔ ناپسندیدگی کی صورت میں خاوند سے علیحدگی کا مطالبہ کرے، بات نہ بنے تو عدالت سے

خلع کا حق

رجوع کر کے وہاں سے نکاح کا عدم کر دائے۔ عورت از خود بندش نکاح سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ آگے دفعہ نمبر 35 میں چل کر مزید یہ الفاظ اس کمیٹی نے شامل کیے: ”کمیٹی مزید سفارش کرتی ہے کہ خلع کے لیے معاوضہ متعین کرنے کے معاملے میں اُسے ایک اپیل کا حق ہونا چاہیے۔“

یہ عبارت ظاہر کرتی ہے کہ حقوق نسواں کمیٹی یہ چاہتی ہے کہ عدالت کا اصل کام صرف یہ دیکھنا ہے کہ خاوند کو کچھ معاوضہ دلایا جائے یا نہیں اور اگر دلایا جائے تو کتنا دلایا جائے؟ اپیل اگر ہوگی تو اسی مقدار کو مقرر کرنے کے سلسلے میں ہوگی، تنسیخ نکاح یا خلع کے جائز و ناجائز ہونے کا مسئلہ اٹھانا سرے سے عدالت کا کام ہی نہیں، یہ سب معاملہ عورت کے اختیار پر ہی منحصر ہے۔ اس طرح یہ کمیٹی خلع کے پردے میں بے دریغ طلاق کا اختیار عورت کو دینا چاہتی ہے، جو صریحاً شریعت کے ساتھ مذاق ہے اور کوئی تابع شریعت خاتون ایسی الٹی سیدھی سفارشات کی تائید نہیں کر سکتی۔

ضمیمہ:

اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کا بنیادی مقصد تو یہ تھا کہ وہ پاکستانی آئین کی غیر اسلامی شقوں کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالے اور تمام نئے قوانین بھی قرآن و سنت کے مطابق بنائے جائیں۔ 1962ء سے قائم یہ ادارہ اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا اس کا انحصار اہل اقتدار و اختیار پر رہا ہے۔ بہر حال گزشتہ ادوار میں اس کو علامہ علاؤ الدین صدیقی، جسٹس حمود الرحمن، جسٹس چیمہ اور جسٹس تنزیل الرحمان جیسے فاضل ارکان بطور چیئرمین میسر آتے رہے اور یہ قرآن و سنت کے مطابق سفارشات حکومت وقت کو پیش کرتے رہے۔

جسٹس حمود الرحمن کی پیش کی گئی سفارشات کی روشنی میں صدر جنرل ضیاء الحق کے دور میں پارلیمنٹ سے کئی احکام پر قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی ہوئی جن میں سے اہم ترین حدود قوانین کا مسودہ پاس کرانا تھا۔ 1977ء میں حدود قوانین کا مسودہ پاس تو ہو گیا مگر اس کو نافذ کرنے کے لیے جس ہوم ورک کی ضرورت تھی، بد قسمتی سے وہ نہ ہو سکا۔ نافذ کرنے والی انتظامیہ کو پوری ٹریننگ نہ دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قانون کا پولیس کے ہاتھوں غلط استعمال اور دیگر بہت سے عوامل نے مل کر ان قوانین کے نفاذ کو غیر مؤثر کر دیا۔ دوسری طرف مغربی

تہذیب کی یلغار، این۔ جی۔ اوز کا شور و ہنگامہ، سب نے مل کر کچھ ایسا ماحول بنایا کہ اعتدال پسندی اور روشن خیالی کے پردوں میں ان سے قوانین گریز کی بے شمار راہیں نکالی گئیں۔ اسلامی قانون سے انحراف کی تدبیریں بروئے کار لائی گئیں۔ بے شمار ٹی۔ وی چینلز پر میڈیا ٹراکس کر کے عوام الناس کی رائے ان قوانین کے خلاف بنائی گئی اور بالآخر 5 نومبر 2006ء کو پارلیمنٹ سے حدود قوانین کو کینسل کرنے کا قانون پاس کر لیا گیا۔ اگر حدود قوانین کو پاکستانی اسمبلی سے پاس کروانے کا کام جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ہوا تھا تو اس کو عملاً غیر موثر بنانے کا مسودہ جنرل مشرف نے اپنی ربرسٹپ اسمبلی سے پاس کروا لیا۔

نومبر 2006ء میں اگرچہ حدود قوانین کو اسمبلی سے غیر موثر قرار دینے کی قرارداد اسمبلی سے پاس کروالی گئی۔ مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ اس طرح خواتین کو تحفظ ملے گا اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک ختم ہو جائے گا۔ مگر بعد کے حالات میں سب نے دیکھ لیا کہ خواتین کے مسائل تو پہلے سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ عورت کس طرح پہلے سے بھی زیادہ غیر محفوظ ہو گئی ہے۔ جب کہ مجرم کھلے عام پھرتے ہیں اور ان پر کوئی پابندی لگانے والا نہیں۔ اب چند دن قبل اسلامی نظریاتی کونسل نے مزید کچھ نئی سفارشات پارلیمنٹ کو پیش کی ہیں، دلیل یہی ہے کہ یہ عورت کے حقوق کو محفوظ بنادیں گی۔ ان سفارشات میں کچھ چیزیں قرآن و سنت کی رو سے قابل اعتراض ہیں اور کچھ چیزیں اصلاح احوال کے لیے مناسب ہیں۔ یہاں ان کا ترتیب وار جائزہ لیا جا رہا ہے۔

1۔ طلاق دینے کا جو طریق کار آپ تجویز کر رہے ہیں۔ وہ قرآن کے صریح احکام کے خلاف ہے۔ قرآن پاک نے طلاق کے احکام سورۃ البقرہ آیات 226 سے 241 تک اور سورۃ الاحزاب و سورۃ الطلاق میں بیان فرمائے ہیں۔ وہ سب احکام صریح نص ہیں۔ ان میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک کے مطابق نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔ عورت کا شوہر کو طلاق کے لیے تحریری نوٹس دینا اور پھر نوے دن کے اندر شوہر کا عورت کو طلاق دینے کے لیے پابند ہونا اور اگر وہ طلاق نہ دے تو نوے دن کی عدت گزرنے پر خود بخود نکاح کا نسخ قرار پانا یہ دفعہ قرآن و

سنت کی کس دلیل سے حاصل کی گئی ہے۔ بہتر ہے کہ یہاں طلاق اور خلع کے سلسلے میں استعمال ہونے والی کچھ اصطلاحات کی سادہ سی وضاحت کر دی جائے مثلاً:

طلاق:

جب مرد خود عورت کو طلاق دے۔ طلاق دیتے وقت جو کچھ اس خاتون کو مال، زیور کپڑے وغیرہ پہلے سے دے چکا ہے۔ اس میں سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتا اور اگر عورت کو ابھی تک اس نے مہر نہیں دیا تو پھر اس کو مہر ادا کرنا ضروری ہوگا۔

خلع:

اگر عورت محسوس کرے کہ اس کا موجودہ شوہر کے ساتھ گزارا نہیں ہو رہا اور مرد طلاق دینے پر بھی آمادہ نہیں ہے۔ تو پھر عورت خود مرد سے علیحدگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ مرد نے عورت کو جو حق مہر دیا ہے، خلع کی شکل میں عورت کو وہ حق مہر واپس کرنا ہوتا ہے اور اگر مرد دی ہوئی کوئی اور چیز (یعنی زیور مال وغیرہ) بھی مانگ لے، تو عورت وہ مالی معاوضہ اور مہر دے کر اپنے آپ کو آزاد کروا لیتی ہے۔ اسی کا نام خلع ہے۔ طلاق میں مرد عورت سے کچھ نہیں لے سکتا۔ بلکہ مہر ابھی تک نہ دیا ہو تو وہ بھی اس وقت دینا ضروری ہے۔ جب کہ خلع میں عورت کو مرد کی دی ہوئی اشیاء جو وہ مانگے مہر سمیت واپس کرنا پڑتی ہیں۔ اگرچہ پسندیدہ یہی ہے کہ مرد عورت سے صرف حق مہر طلب کرے۔

بہر حال خلع مؤثر تب ہوتا ہے جب شوہر بیوی کی بات مان لے۔ گھر کے بزرگ بھی اس پر دباؤ ڈالیں تاکہ وہ عورت کو خلع دے دے۔ لیکن اگر مرد عورت کو خلع دینے پر آمادہ نہیں ہے تو پھر بات عدالت تک پہنچے گی۔ گھر کے بزرگ خلع کا بندوبست کریں گے۔ بالفرض شوہر عدالت کے کہنے پر بھی خلع دینے پر آمادہ نہیں ہے تو پھر عدالت تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کرتی ہے یعنی وہ اپنے اختیارات کو استعمال میں لا کر اس عورت کا نکاح اس مرد سے فسخ کر دیتی ہے۔ تنسیخ نکاح میں مرد کو عورت سے کچھ نہیں ملتا۔ کیونکہ اب یہ خلع کی شکل نہیں رہی بلکہ عدالتی اختیارات سے دونوں کو جدا کیا گیا ہے۔

یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ اگر عورت کا طلاق کا مطالبہ مرد مان لیتا ہے تو عورت کو کچھ

مال یا معاوضہ وغیرہ نہیں دینا پڑتا۔ جبکہ خلع کی شکل میں عورت کو مرد کا دیا ہوا مہر (اور اگر مزید مطالبہ ہو) تو مزید اشیاء بھی دینا پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً این۔ جی۔ اور عورت کی طلاق پر زور دیتی ہیں، وہ خلع کی بات کم ہی کرتی ہیں۔

اس ساری بحث سے گزرنے کے بعد ہمارے لیے ان سفارشات کی حقیقت کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ تفویض طلاق کی بات کرتی ہیں کہ عورت کو کچھ نہ دینا پڑے۔ کہا گیا ہے کہ نوے دن کے اندر خود بخود نکاح فسخ ہو جائے گا۔ یہ شرعی قوانین کے منافی ہے۔ نکاح عدالت کے ذریعے فسخ ہوتا ہے۔ گھر بیٹھے بیٹھے نہیں ہو سکتا یا پھر مرد نکاح کو طلاق کے ذریعے ختم کر سکتا ہے۔

2۔ طلاق کی رجسٹریشن [1] کروانے کی سفارش کی گئی ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ طلاق دینے کے باوجود عملی ثبوت نہ ہونے کے باعث مرد اس سے انکار کر دے۔ یہ صورت حال عملاً پیش آتی رہتی ہے۔ عورت کہتی ہے کہ مرد نے مجھے طلاق دے دی ہے اور مرد اس کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح عملاً کئی گھرانوں میں سات آٹھ بار مرد نے طلاق دی ہوتی ہے اور بعد میں انکار کر دیتا ہے اور وہ دونوں اکٹھے رہائش رکھتے ہیں، ماں باپ بھی ایسے معاملات کو پتہ چل جانے کے باوجود خود ساختہ بدنامی کے ڈر سے دباتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ماں باپ طلاق کی صورت میں اپنی بیٹی کی آگے شادی کرتے ہیں تو سابقہ شوہر دعویٰ کر دیتا ہے کہ اس کی بیوی کو اغوا کیا جا رہا ہے اور اس نے تو کوئی طلاق دی ہی نہ تھی لہذا طلاق کے موقع پر کوئی ایسا بندوبست ضرور ہونا چاہیے کہ مرد کا طلاق دینے کا ثبوت موجود ہو۔ اس کے لیے رجسٹریشن تو ضروری نہیں ہے خود قرآن پاک کا حکم موجود ہے۔ اس کو لاگو کیا جانا ضروری ہے۔ سورۃ الطلاق آیت نمبر 2 میں حکم ہے ﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَوٰی عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ کہ عدت کے دوران رجوع کرتے وقت یا عورت کو رخصت کرتے وقت دو صاحب عدل لوگوں کو گواہ بنالیا کرو اور یہ گواہ بھی اللہ کی خاطر ٹھیک ٹھیک گواہی دیں۔

[1] زبانی طلاق دی جاتی ہے تو وہ قرآن و سنت کی روشنی میں مؤثر ہو جاتی ہے مگر موجودہ دور کے بعض اہم مسائل کے پیش نظر اگر رجسٹریشن کی بات کی گئی ہے تو یہ ٹھیک کہی جاسکتی ہے۔

بہر حال بوقت رجوع یا طلاق، حکم قرآنی کے مطابق دو گواہ صاحب عدل بنالیے جائیں تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ اٹھ سکے۔ اگر رجسٹریشن کو گواہوں کے قائم مقام سمجھ لیا جائے تب بھی ٹھیک ہے۔

3۔ کونسل نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ خاوند شادی کے وقت اپنے تمام اثاثہ جات کی تفصیل نکاح نامے میں درج کرے۔ اوّل تو یہ پابندی لگانا ہی غلط ہے۔ شرعاً اس کی گنجائش نہیں۔ دوم اگر کوئی اپنے اثاثہ جات لکھ بھی دے مگر وہ غلط بیانی سے کام لے تو وہاں بیوی بچے یا دوسرے رشتہ دار کیا کر لیں گے۔ آج کل کون اپنے مالی گوشوارے صحیح طور پر پیش کر رہا ہے۔

4۔ کونسل نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو تفویض طلاق کا حق دے اور نکاح نامہ میں دیئے گئے تفویض طلاق والے خانے کو خواتین ضرور پر کریں۔ بلکہ آجکل کئی این۔ جی۔ اور تعلیمی اداروں میں ایسے پروگرام کر رہی ہیں کہ طالبات کو تعلیم کے نام پر نکاح نامہ پر کرنے کا طریقہ بتاتی ہیں اور اس میں تفویض طلاق والی شق کو ضرور ”ہاں“ میں پر کرنے کا مشورہ دیتی ہیں۔

اگرچہ تفویض طلاق کا اختیار بعض حالات میں مرد عورت کو دے سکتا ہے مگر اس صورت کو عام کرنا تو معاشرے میں اباحت پھیلانے کا باعث ہوگا۔ نکاح کرتے وقت اس میں خرابی کی ایک صورت پہلے ہی مضمحل ہوگی۔ نکاح تو وہی صحیح اور جائز ہوتا ہے جس میں خانہ آبادی کی اپنی طرف سے پوری پوری کوشش اور ارادہ موجود ہو۔ اگرچہ نکاح فارم میں یہ دفعہ ایوب دور میں شامل کی گئی تھی۔ لیکن عملاً خواتین اس خانہ کو خالی چھوڑ دیتی ہیں۔ پھر یہ عملاً مغربی تہذیب کو لانے کی سازش ہے۔ لہذا اس کی بھرپور حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔

5۔ نظریاتی کونسل نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ سفر حج کے لیے عورت کے لیے محرم کی شرط ختم کر دی جائے۔ تو عرض یہ ہے کہ پاکستان میں تو عورت کو اکیلے سفر کرنے کی مکمل اجازت ہے مگر سعودی عرب میں یہ اجازت نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ محرم کی شرط تو دین نے خود لگائی ہے۔ اگرچہ فقہ جعفریہ والے بغیر محرم سفر حج کی اجازت دیتے ہیں اور امام شافعی بھی بوڑھی خاتون کو حج کرنے والی واقف و شناسا خواتین (جن کے محرم ساتھ موجود ہیں) کے ہمراہ حج پر جانے کی اجازت دیتے ہیں، تاہم سفر حج ایک

پاکیزہ سفر ہے جس میں عموماً خرابی کی شکل کم ہوتی ہے۔ شریعت حکمت کی بنا پر اس میں بھی محرم کی شرط لگاتی ہے۔ آخر اس سے ہماری حکومت، این۔ جی۔ اوز اور نظریاتی کونسل جو نو خیز طالبات کو مغربی ممالک میں اکیلے حصول تعلیم کے لیے بھیجنے کی راہیں کھولنا چاہتے ہیں۔ وہ کس آیت یا حدیث سے یہ گنجائش پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی اجازت دے کر ہم کس تہذیب کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

6۔ کونسل کی ایک دو سفارشات اچھی بھی ہیں مثلاً صاحب حیثیت لوگوں کو اپنے غریب اقرباء کی مدد کرنے کے لیے قانوناً پابند کیا جائے۔ یہ بہت اچھی تجویز ہے اس پر عمل ہونا چاہیے اور اس کے لیے ضرور قانون سازی ہوتا کہ غربت کے خاتمہ کا سامان ہو سکے اور سفید پوشوں کو گھر بیٹھے ضروریات زندگی میسر ہو سکیں۔

لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ زمانہ بڑی برق رفتاری سے آگے جا رہا ہے اگر اس وقت موجودہ حکومت ان سفارشات کو منظور نہیں کرتی تو اگلی حکومت کو منظور کرنا پڑے گا۔ لہذا عوام کو انہیں ذہنی طور پر قبول کر لینا چاہیے۔

ہمارے پاس اس کا یہ جواب ہے کہ ہم اللہ کے قانون کو اعتدال پسندی کی نذر کرنے والوں میں کیوں شامل ہوں؟ ہم تو ہر ممکن اس کا دفاع کریں گے اور تا زندگی ان شاء اللہ کرتے رہیں گے۔ اللہ نہ کرے ہم ان لوگوں میں شامل ہوں جنہوں نے شریعت کا حلیہ بگاڑا۔ ہم اپنی ممکن حد تک شرعی احکام کے دفاع اور ان کے نفاذ کے لیے جان لڑائیں گے عملی طور پر ان کے نفاذ کے لیے کوشش کریں گے۔ اللہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کی توفیق عطا کرے اور ہمیں معاشرے میں قرآن و سنت کے نظام کو قائم کرنے کی حتی المقدور توفیق دے۔

لہذا صورت حال کی اصلاح کے لیے کچھ ہماری بھی سفارشات ہیں:

عورت کو ”حقوق اور آزادی“ کے نام پر وہ حقوق عملاً دینے کے لیے جدوجہد کریں جو اللہ و رسول ﷺ نے خود اسے دیئے ہیں۔ اسے جاگیر داری کے چنگل سے نکالا جائے۔ اسے دینی تعلیم، حق وراثت اور حق ملکیت دیا جائے۔ شادی میں اس کی پسند کو ملحوظ رکھا جائے۔ بروقت

شادی کی جائے۔ جہیز اور شادی کے بے تحاشا اخراجات کو کنٹرول کیا جائے۔ اس کی تعلیم وغیرہ میں اسے تحفظ مہیا کیا جائے۔ مخلوط محفلوں اور مخلوط سوسائٹی سے اسے بچانے کے لیے قانون سازی کی جائے۔ نکاح، طلاق وغیرہ کے مقدمات کو عدالت کو جلد از جلد نمٹانے کا پابند کیا جائے۔ بیک وقت تین طلاقیں دینے پر تعزیر دی جائے۔ شادی سے پہلے مرد کو عورت کے حقوق ادا کرنے کی تربیت دینے کے لیے تین ماہ کا تربیتی کورس یونین کونسلوں کے ذریعے سے کروانا لازمی قرار دیا جائے وغیرہ۔ آج پاکستان میں ہر طرف افراتفری کا دور ہے سیاسی استحکام مفقود ہے۔ عدلیہ پابند ہے امن وامان مندوش ہے۔ بیروزگاری اور مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ دی ہے اس افراتفری کے وقت آپ پہلے سے متفقہ مسائل کو متنازعہ بنا کر اور غیر شرعی قانون سازی کر کے عورتوں کے حوالے سے بے جا آزادیوں کی اجازت دے کر، آخر آپ کن آقاؤں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اعتدال پسندی اور جدت سازی کے نام پر آپ اپنے خاندانی نظام کے استحکام کو کیوں پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں؟ خدا را تقلید مغرب سے باز آئیے اور اسلام کے دامن میں پناہ لیجیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 ﴿فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتْنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ
 أَنْ تَضِلَّ أَحَدُهُمَا فَتَذَكَّرَ أَحَدُهُمَا الْأُخْرَىٰ﴾
 ”(اگر دو مرد نہ ہوں) تو پھر جو گواہ تمہیں پسند ہوں،
 ان میں سے ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے
 تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

(البقرہ: 282)

اسلام میں عورت کی نصف شہادت

- ✿ عورت کا دائرہ کار
- ✿ لفظ ”شہادت“ کی تحقیق
- ✿ اسلام میں شہادت کی اہمیت
- ✿ شہادت کی مختلف اقسام
- ✿ شہادت کے لیے شرائط
- ✿ اصل بحث
- ✿ چند مشہور تفسیروں سے اقتباسات
- ✿ احادیث کی رو سے مذکورہ آیت کی وضاحت
- ✿ عورت کی شہادت کا نصف ہونا ہی عین انصاف ہے
- ✿ مزاج طبع
- ✿ روزمرہ کے مشاہدات
- ✿ مغربی مصنفین کی تحقیقات
- ✿ سہو و نسیان
- ✿ عورت کا دائرہ کار
- ✿ تنہا عورتوں کی شہادت
- ✿ روایت حدیث کے سلسلے میں عورت پر اعتماد
- ✿ شریعت کا عورت پر اعتماد
- ✿ شہادت کے متعلق تفصیلات
- ✿ فرنگ زدہ قلیل طبقہ کا اعتراض
- ✿ مذکورہ مخصوص واقعہ پر بحث
- ✿ ایک اعتراض اور اس کا جواب
- ✿ آخر میں ایک گزارش

اسلام میں عورت کی نصف شہادت

ایک مدت دراز سے ہمارے ہاں اسلامی قوانین معطل ہو چکے ہیں اور اسلام کا اجتماعی نظام منہدم ہو چکا ہے، اس کی جگہ مغربی تہذیب کے پروردہ مسلمان اپنے اپنے مسلمان ملکوں میں انگریزی قانون کو رائج کرنے کی بھرپور کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں، بد قسمتی سے ”اسلامی جمہوریہ پاکستان“ میں بھی یہ مہم پورے زور شور سے جاری ہے۔ سیکولر اہل اقتدار تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آئے دن اسلامی قوانین کی یکے بعد دیگرے ”تدوین نو“ کے نام پر بیخ کنی کرتے رہتے ہیں اور ”اجتہاد“ کے نام پر تمام اسلامی قوانین کی اسلامی روح کو ختم کر کے اس کو مغربی رنگ دینا چاہتے ہیں، کبھی وزیر قانون کا یہ اعلان ہوتا ہے کہ حدود آرڈیننس اور اسلام کا قانون شہادت خلاف انسانیت اور ظالمانہ ہے، ہم اس کو ختم کر کے دم لیں گے، کبھی مغرب زدہ خواتین اسلام کی طرف سے عورتوں کو دیے گئے حقوق و فرائض پر چیں بہ جبیں ہوتی ہیں اور اسلام آباد میں مظاہرے کرتی نظر آتی ہیں کہ ”جب عورت کی دراشت آدھی ہے، دیت آدھی ہے، شہادت آدھی ہے تو پھر اس کا روزہ، اس کی نماز، زکوٰۃ اور حج بھی آدھا کیا جائے۔“

کبھی اسلامی قوانین کا مذاق اڑانے والوں کا نقطہ نظر ان الفاظ میں سامنے آتا ہے کہ ”جب تم کہتے ہو کہ عورت کی شہادت آدھی ہے تو غور کرو کہ اس کی زد کہاں جا پڑتی ہے! تمہاری ایک بیوی تو نصف ہوئی، دو عورتیں ملیں گی تو مکمل بیوی بنے گی۔“ کبھی وفاقی شرعی عدالت کے ایک سینئر جج صاحب عورت کی نصف شہادت کے مسئلہ پر ایک خاتون سے یوں مخاطب ہوتے ہیں: ”حیرت ہے کہ تم عورت ہو کر عورت کی نصف شہادت والے قانون کو درست اور معقول سمجھتی ہو۔“ تو کبھی کہا

جاتا ہے: ”عورت کو نصف حق شہادت دے کر عورت کی توہین اور تحقیر کی گئی ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ایسی گستاخانہ باتیں سوچنا اتنی ناپاک جسارت ہے، جس کی سزا سے مسلمان نہ اس دنیا میں محفوظ رہ سکتے ہیں نہ آخرت میں۔ اللہ ہمیں مخلص مومن بنائے اور عذاب سے محفوظ رکھے، آمین!

اس باب میں عورت کی نصف شہادت کے مسئلے پر بحث کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کی نفسیات، مزاج، دائرہ کار اور فطری وظائف کے پیش نظر حقیقت وہی ہے جو شریعت نے پیش کی ہے، اس کے علاوہ باقی سب کچھ جہالت ہے یا غلط فہمی۔

عورت کا دائرہ کار:

عورت کی ذمہ داریاں اندرون خانہ تک محدود ہیں، اس لیے ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھ تمام مسلمان عورتوں کو حکم الہی ہے: وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (سورۃ الاحزاب) ”اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھی رہو۔“

مفسرین کے نزدیک اس آیت کی رو سے تمام مسلمان خواتین کو حکم ہے کہ وہ گھروں کے محاذ پر جمی رہیں اور اگر باہر نکلنے کی ضرورت ہے تو پردے کی پابندی کریں۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

﴿يُذْنِبْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَاسِهِنَّ﴾ ①

”اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلوں کا لیا کریں۔“

سنن ابوداؤد کی مندرجہ ذیل حدیث عورت کے دائرہ کار کو بخوبی واضح کر رہی ہے:

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهَا وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ

”عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہداشت کرنے والی ہے اور

اس سے ان کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔“

حقیقت یہ ہے کہ یہ تقسیم کار کائنات کی فطری روش سے ہم آہنگ ہے اور اسی سے کائنات کا حسن و جمال قائم ہے۔ عورت کا فطری دائرہ کار متعین ہونے کے بعد لفظ ”شہادت“ پر بحث کرنا

ضروری ہے۔

لفظ ”شہادت“ کی تحقیق:

شہادت کے لغوی معانی ”خبر قاطع“ یعنی فیصلہ کن بیان یا ثبوت جو کسی متنازعہ مسئلہ میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ مقدمات و معاملات کے فیصلے عموماً چار پانچ دلیلوں کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں:

(1) ملزم کا اقرار (2) شہادت (3) حلف یا قسم (4) لعان (5) قرائن یعنی (Circumstantial Evidence) جہاں ملزم خود اقرار نہ کر رہا ہو وہاں فیصلہ کرنے کے لیے قاضی کو شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا اسلام میں گواہی کو اس کی اہمیت کے پیش نظر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قرآن پاک میں لفظ ”شہادت“ کبھی تو مشاہدہ کے معنی میں آتا ہے، مثلاً قَالُوا اَنْشَهِدُ اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ میں نَشْهَدُ سے مراد گواہی دینا ہے۔ کبھی قسم کے معنوں میں مثلاً لعان کے ضمن میں (..... اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ) سے مراد قسم کھانا ہے اور کبھی خبر کے معنوں میں، مثلاً روایت ہلال کے سلسلے میں لفظ شہادت ہمیشہ خبر کے معنوں میں ہوتا ہے مگر جب یہ لفظ مقدمات اور معاملات کے ضمن میں آئے گا تو اس سے مراد عدالت میں کسی خاص واقعہ کے بارے میں قسم کھا کر صحیح اور درست صورت حال بیان کرنا ہے۔

اسلام میں شہادت کی اہمیت:

معاشرے عدل و انصاف ہی کی بنا پر استوار ہوتے ہیں اور رہتے ہیں۔ لہذا اسلام میں شہادت کو فرض کفایہ شمار کیا گیا ہے۔ جس کو صحیح صورت حال معلوم ہو اس کا فرض ہے کہ وہ درست اور سچی گواہی دے، تاکہ مقدمہ کا صحیح فیصلہ ہو، بے قصور بری ہو، حقدار اپنا حق وصول کر سکے اور مجرم سزا پا سکے۔ لہذا قرآن پاک میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهُ اِثْمٌ قَلْبُهُ ۚ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝۱﴾ [1]

”اور گواہی نہ چھپاؤ، جو کوئی گواہی چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا اور اللہ

تمہارے اعمال کو جاننے والا ہے۔“

اللہ کے پیارے بندوں کی صفت قرآن پاک میں یہ بیان کی گئی ہے:

وَلَا يَشْهَدُونَ الزُّوْرَ (الفرقان) ”اللہ کے بندے جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔“ جھوٹی

گواہی دینے سے یا خلاف واقعہ بات کہنے سے شریعت اسلامی میں سختی سے منع کیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ

الزُّوْرِ﴾^[۱]

”بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی گواہی سے بچو۔“

(یہاں بت پرستی اور شرک کو ہم معنی کہا گیا ہے) صحیح بخاری و صحیح مسلم بلکہ دیگر کتب

حدیث میں جہاں کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں پہلا گناہ کبیرہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا

ہے، دوسرا والدین کی نافرمانی کرنا، جھوٹی گواہی دینا اور جھوٹ بولنا ہے۔ آپ ﷺ پہلے ٹیک

لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، اس آخری بات کو اتنی بار دہرایا کہ ہم دل

ہی دل میں یہ تمنا کرنے لگے۔ کاش آپ خاموشی اختیار کر لیں۔^[۲] اس جھوٹی شہادت میں جعلی

تعلیمی سند، غلط شناختی کارڈ، نقلی دستاویزات، فرضی اقرارنامے اور جعلی کرنسی وغیرہ یہ تمام جھوٹی

گواہی کے ضمن میں آتے ہیں۔^[۳]

شہادت کی مختلف اقسام:

حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب ”الطَّرِيقُ الْحَكِيمِيَّةُ“ صفحہ 24 پر ”الْبَيِّنَةُ“ (یعنی

شہادت یا Evidence) کی تعریف میں لکھا ہے: ”شریعت میں ”بینہ“ سے مراد وہ چیز ہے جو حق

[۱] الحج: 30

[۲] صحیح بخاری، الشہادات: 2654

[۳] ”معاشرے کے مہلک گناہ“ از عبدالستار حماد، ص 44

کو واضح دظاہر کر دے۔ یہ کبھی چار گواہوں کی ہوتی ہے، کبھی تین کی، کبھی دو کی اور کبھی صرف ایک مرد یا ایک عورت کی۔ کبھی حلف اٹھانا یا اس سے انکار کرنا بھی شہادت کا ہم معنی ہو جاتا ہے اور کبھی شہادۃ الحال (Circumstantial Evidence) کی دوسری قسمیں بھی ہو سکتی ہیں۔“

شہادت کے لیے شرائط:

گزشتہ بحث سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں گواہی دینا اور شہادت کا فریضہ ادا کرنا بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ یہ ہر انسان کا ”حق“ نہیں، بلکہ چند خاص معتبر اور متقی لوگوں کو ہی شہادت کے منصب پر فائز کیا جاسکتا ہے۔ خود قرآن پاک نے مَعْن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ کہہ کر اس کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ یعنی گواہ عاقل و بالغ ہو، عادل ہو۔ (عادل سے یہ مراد ہے کہ وہ راست باز اور راست رو ہو۔ لوگوں کے درمیان قابل اعتبار سمجھا جائے) اس کی بینائی صحیح سالم ہو اور اس نے واقعہ کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ کیا ہو۔ اس کا حافظہ اور ضبط صحیح ہو کہ واقعہ کو جزئیات کے ساتھ یاد رکھ سکتا ہو۔ آگے اس کو من و عن بیان کرنے پر بھی قادر ہو۔

جو چیز دیکھنے کی ہو اس کی عینی شہادت ضروری ہے، جو بات سننے کی ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ قول اس نے خود سنا ہو اور قائل کو خود دیکھا ہو۔ جس سے سنا ہو اگر اس کو دیکھا نہ ہو تو محض سننے سے اس کے متعلق شہادت غیر مقبول ہوگی۔ اسی طرح ریڈیو یا فون یا پردے کے پیچھے سے آواز پر شہادت کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک قاضی کے سامنے حاضر ہو کر گواہ بات نہ کرے اور قاضی اس کو خود نہ دیکھے، اس کی شہادت غیر مقبول ہوگی۔

اصل بحث:

اب آئیے اصل بحث کی طرف! عورت کی نصف شہادت کے بارے میں قرآن پاک میں سورۃ بقرہ میں قرض کے لین دین اور مالی معاملات کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَأَسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ، فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتْنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ﴾ [۱]

”اور اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ بنالیا کرو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں، گواہ وہ ہوں جنہیں تم پسند کرتے ہو تا کہ اگر ایک ان میں سے بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے۔“

یاد رہے کہ ہندومت ہو یا بدھ مت بلکہ خود یہودیت کسی میں عورت کی گواہی سرے سے تسلیم ہی نہیں کی گئی، یہ اسلام ہی ہے جس نے عورت کو کچھ معاملات میں شہادت کا حق دیا ہے۔ مگر ساتھ ہی اپنے علم کامل اور تحقیق کی بنا پر عورت کی گواہی کو مرد کے مقابلے میں نصف تسلیم کیا ہے۔ انجیل میں بھی یہی نظام شہادت مانا گیا ہے۔^[۱]

مُتَّجِد دین کی تاویل:

دور جدید کے تفسیر بالرائے سے کام لینے والے مُتَّجِد دین اس آیت کی تفسیروں کرتے ہیں کہ گواہی تو ایک عورت دے گی، لہذا شاہدہ (گواہی دینے والی) وہی ہے جبکہ دوسری مُنْكَرَہ (یاد دلانے والی) ہے۔ جو شہادت کے کسی حصہ کو بھولنے پر اطلاع دے گی لہذا ثابت ہوا کہ ”اسلام میں عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے۔“

جبکہ قرآن پاک مِّنْ تَّرْضُوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ کے الفاظ لا کر بیک وقت دونوں عورتوں کو مع ایک مرد کے شاہد قرار دے رہا ہے۔ (دوسری صورت میں وہ ایک مرد اور ایک عورت کو تو شاہد کہتا اور دوسری عورت کو مُنْكَرَہ) مگر اس نے سب کو شہداء کہا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں عورتوں کی حیثیت شاہد ہی کی ہے اور وہ دونوں بیک وقت گواہی دیں تو تب ان کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوگی۔ ویسے بھی مندرجہ بالا تفسیر پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ (آپ کے بقول) ایک عورت کی یادداشت قوی ہونے کی شکل میں دو کے بجائے اگر ایک ہی عورت کی گواہی قبول ہو سکتی ہے، تو پھر ہمیں بھی یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اگر دونوں عورتوں کی یادداشت کمزور ہے تو پھر دو کے بعد تیسری، تیسری کے بعد چوتھی عورت کو بھی ایک مرد کے بجائے گواہی کے لیے لایا جاسکتا ہے، نعوذ باللہ من ذلک!

اصل بات یہی ہے کہ اگرچہ عورت کی یادداشت قوی ہو تب بھی اللہ کا حکم یہی ہے کہ ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی سے مکمل نصاب بنتا ہے۔

اس آیت (282 بقرہ) کی تفسیر میں چند مشہور تفسیروں سے اقتباسات:

1- امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ”اکیلی عورت کی گواہی غیر مقبول ہے۔ جب دو عورتیں ہوں گی تب ایک گواہی بنے گی۔ اس طرح دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہوگی۔“ [۱]

2- امام شوکانی ”فتح القدیر“ ج 1، ص 301/302 پر لکھتے ہیں: ”تنہا عورتوں کی شہادت

مردوں کے بغیر غیر مقبول ہے سوائے ان معاملات کے جو عورتوں ہی سے مخصوص ہیں۔“

3- تفسیر ”روح المعانی“ میں اس آیت کی تفسیریوں درج ہے: ”ایک مرد اور دو عورتوں کی

شہادت ہمارے نزدیک قصاص اور حدود کے علاوہ باقی تمام معاملات میں ہے جب کہ

امام شافعی اس آیت کو مالی معاملات سے خاص سمجھتے ہیں اور امام مالک حدود و قصاص کے

علاوہ ولاء اور احسان میں بھی عورت کی شہادت کو جائز نہیں سمجھتے، البتہ وہ وکالت اور

وصیت میں (بشرطیکہ اس میں غلام کی آزادی یعنی عتق کا مسئلہ نہ ہو) جائز سمجھتے ہیں۔ تنہا

عورتوں کی شہادت کو وہ ولادت و بکارت، بچہ زندہ پیدا ہوا یا مردہ جیسے نسوانی مسائل میں

قبول و جائز سمجھتے ہیں۔“ (ج 1، ص 50)

4- شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنی مشہور کتاب ”حجة اللہ البالغہ“ ج دوم، ص 473 پر تحریر کرتے

ہیں: ”قصاص اور حدود میں صرف دو مردوں کی شہادت ہی قابل اعتبار ہے۔ اس کی اصل

امام زہری کا یہ قول ہے کہ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے یہ طریقہ چلا آتا ہے کہ حدود

کے معاملات میں عورت کی شہادت قبول نہیں کی جاتی۔“ البتہ مالی معاملات میں ایک مرد

اور دو عورتوں کی شہادت مقبول ہے اور اس کی اصل سورۃ بقرہ کی آیت فَإِنْ لَّمْ يَكُفُوا

رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَيْنِ ہے ”اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنا سکتے ہو)“ اور اللہ نے عورتوں کی کثرت کی وجہ بھی اپنے اس قول میں بیان فرمادی کہ ”اگر ان دونوں میں سے ایک چوک جائے تو پہلی دوسری کو یاد دلا دے۔“ یعنی عورتیں ناقص العقل ہیں، پس عدد کی زیادتی سے اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہوا۔

5- امین احسن اصلاحی صاحب ”تذکر قرآن“ میں (ج 1، ص 597 پر) رقمطراز ہیں: ”اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آسکیں تو اس کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اس لیے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہوگا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سد باب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لیے ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں سہارے کا بھی انتظام فرمادیا ہے۔“

6- شام کے معروف عالم دین ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اپنی کتاب ”الْمَرْأَةُ بَيْنَ الْفِقْهِ وَالْقَانُونِ“ میں ص 32/33 پر تحریر کرتے ہیں: ”عورت کی نصف شہادت کا مسئلہ عزت و بے عزتی یا اہلیت اور عدم اہلیت کا نہیں بلکہ یقین کی بنا پر فیصلہ کرنے اور قضا میں احتیاط برتنے کا ہے۔ فیصلہ کرتے وقت احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ہر عادلانہ قانون کی ضرورت ہوا کرتا ہے۔“

یہاں بطور نمونہ چند قدیم اور چند جدید مفسرین کی تفسیروں سے اس آیت کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مفسرین دو عورتوں کی شہادت کو ایک مرد کی شہادت کے برابر سمجھتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر خازن (ج 1، ص 258)، احکام القرآن (ج 1، ص 255/256)، بیبان القرآن (از: غلام وارث، ج 1، ص 194) میں درج ہے کہ اگر وہ کچھری کے استفسارات سے گھبرا کر کچھ کا کچھ کہہ دے تو دوسری ٹھیک بات بتا دے۔

احادیث کی رو سے مذکورہ آیت کی وضاحت:

اب اس کے بعد قانون اسلامی کے دوسرے ماخذ یعنی حدیث کی طرف آئیے! کیونکہ سلف کا یہی طریقہ ہے کہ وہ قرآن کی مشکلات کی وضاحت حدیث رسول سے کرتے ہیں کیونکہ رسول مقبولؐ سے بڑھ کر قرآن کریم کے منشا و مفہوم کو سمجھنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلُ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ ①

”عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں آدھی ہے۔“

2- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”اے عورتوں کے گروہ! تم صدقہ و خیرات زیادہ کیا کرو..... میں نے تم سے زیادہ عقل و دین میں ناقص ہونے کے باوجود عقلمند مردوں کی مت مارنے والا کوئی نہیں دیکھا۔“ عورتوں نے سوال کیا: ”یا رسول اللہ! ہماری عقل اور دین کا کیا نقصان ہے؟“ آپؐ نے فرمایا: ”عقل کی کمی کا ثبوت یہ ہے کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہوتی ہے اور دین کا نقصان یہ ہے کہ عورتیں مخصوص ایام میں نہ روزہ رکھتی ہیں نہ نماز ادا کرتی ہیں۔“ ②

3- فَشَهَادَةُ امْرَأَتَيْنِ تَعْدِلُ شَهَادَةَ رَجُلٍ ③

”دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔“

عورت کی شہادت کا نصف ہونا ہی عین انصاف ہے:

اب آئیے قرآن و حدیث کے بعد عقلی دلائل کی طرف! یہ مسئلہ تفاوت مرد و زن کا ہے ہی

① کتاب الحیض

② صحیح مسلم، آج کل اس حدیث کو ہی موضوع ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر یہ دو تین سندوں سے مروی ہے اس لیے کس کس سند کو موضوع کہا جائے گا۔ آخر بات کچھ تو ہے ہی جو مختلف حوالوں اور سندوں سے بیان ہوئی ہے۔

③ صحیح مسلم، عن ابی ہریرہؓ

نہیں، نہ اس میں کوئی حقوق و مساوات کی بحث ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے مرد و عورت کی شہادت [۱] کے درمیان فرق رکھا ہے، مگر اس فرق کو عورت کی توہین سمجھنا سراسر زیادتی ہے۔ یہ فرق خود عورت کے اپنے حالات، فطرت، مزاج، اس کے دائرہ کار اور وظیفہ حیات ہی کے اندر موجود ہے۔ مثلاً:

مزاج طبع:

جذبات کی لطافت، وجدان کی نزاکت اور زود حسی ایسی خصوصیات ہیں جو عورت کے مزاج کا لازمی جز ہیں۔ ان کے نتیجے میں عورت میں شدید جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہی جذباتیت ہی تو ممتا کی جان ہے۔ جو بچے کی پرورش کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ بچے کی پرورش کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ جذباتی ہونی چاہئیں تاکہ بچے کی ضروریات پوری کرنے کے موقع پر دل و دماغ سے سوچنے کی نوبت ہی نہ آئے اور کسی سستی یا تاخیر کے بغیر عورت اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بے تابانہ اٹھ جائے۔ لیکن دوسری طرف یہ جذباتیت گواہی کے لیے غیر موزوں بلکہ نقصان دہ ہے۔ وہاں تو عقلی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تحلیل و تجزیہ، سوچ و بچار، درست مشاہدہ، درست قوت حافظہ اور بلا کم و کاست حالات کو بیان کرنا ضروری ہے۔ عورت پڑھی لکھی بھی اکیلی کچھری جانے سے گھبراتی ہے۔ وہ چلی بھی جائے تو قاضی کی جرح سے پریشان ہو کر بھی غلط بات کہہ سکتی ہے، گھبرا کر بھول سکتی ہے۔ ویسے بھی عورت پر حیض، نفاس، حمل، زچگی اور رضاعت وغیرہ کے جوا دوار گزرتے ہیں وہ اس کی طبیعت میں چڑچڑاپن پیدا کر دیتے ہیں، اور چڑچڑے پن سے پھر وہی جذباتیت نمودار ہوتی ہے۔

[۱] اس ساری صورت حال میں مسئلہ شہادت سرے سے زیر بحث نہیں ہے۔ یہ تو بے ججائی کو، عریانی و فحاشی کو پاکستانی معاشرے میں فروغ دینے کی ایک شکل ہے۔ وگرنہ آج ہمارے معاشرے میں مالی معاملات میں بھی عورتوں کو گواہی دینے کی ضرورت کہاں پیش آتی ہے! کتنے فیصد یانی ہزار عورتیں عدالت میں جا کر گواہیاں بھگتاتی ہیں؟ یہ مسئلہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکی ہوں ان خواتین کی طرف سے اٹھایا گیا ہے جنہوں نے علماء کرام کی داڑھی کو ”جنگل“ کا نام دیا، زنا کے مجرم کو ”مظلوم“ گردانا اور شادی کو ایک ”گھناؤنے بندھن“ سے تعبیر کیا، دیکھیے روزنامہ ”جسارت“ 10 مارچ 1983ء۔

سید قطب شہید اپنی کتاب ”اسلام اور جدید ذہن کے شکوک و شبہات“ میں تحریر کرتے ہیں: ”ہوسکتا ہے کہ وہ جس مجرم کے خلاف یا حق میں گواہی دے رہی ہو وہ کوئی حسین عورت ہو اور وہ ضد اور جلاپے کی وجہ سے اس کے خلاف جھوٹی شہادت دے بیٹھے۔ اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ملزم کوئی نو عمر مرد ہو جس کو دیکھ کر گواہ کی مامتا بیدار ہو جائے اور وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کو بچانے کی کوشش میں کوئی خلاف حقیقت گواہی دے بیٹھے۔ مگر جہاں دو عورتیں بیک وقت عدالت میں گواہی دے رہی ہوں وہاں پر ان دونوں کا ایسی غلطی میں مبتلا ہو جانا اور غلط شہادت دینا بعید از قیاس ہے کہ جہاں ایک حقیقت کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوگی وہاں دوسری عورت اس کی اصلاح کر دے گی۔ اس طرح شہادت کے غلط ہونے کا امکان دور کیا جا سکے گا۔“ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ملزم کوئی بارعب شخصیت ہو اور وہ اس کے رعب تلے دب کر خلاف حقیقت بیان دے بیٹھے، تو پھر دوسری اس کی اصلاح کر دے گی۔ چنانچہ ماہر نفسیات ہیولاک ایلس (HEOLOCK ELLIS) اپنی کتاب ”مرد و عورت“ میں لکھتا ہے: ”اب آئیے مغربی معاشرہ کی طرف جہاں کی عورت مشرقی عورت کی نسبت زیادہ بے باک ہے۔ ذمہ داری سے اپنی دفتری ڈیوٹیاں بھی انجام دیتی ہے، اس کو خود اعتماد ہونے کا دعویٰ بھی ہے مگر عملاً صورت حال یہ ہے کہ اہل مغرب کے تمام دفاتر، تجارتی مارکیٹیں اور بازار ہر جگہ مرد ہی چھایا ہوا ہے، ہر جگہ مرد کا تسلط ہے اور عورت اس کے ماتحت کام کرتی ہے۔ ملازمت میں عورت کی شرح ایک تہائی بھی تسلیم کر لی جائے تب بھی یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ کوئی ذمہ داری کا منصب عورت کے حوالے نہیں کرتے۔ ایک ہی پوسٹ پر مرد اور عورت تعینات ہوں تو مرد کی تنخواہ زیادہ ہوگی اور عورت کی کم اور کارکردگی کا مجموعی تناسب بھی مرد کا زیادہ ہوتا ہے اور عورت کا کم۔ عورت کی پستی، توہین اور حقارت کا تصور ان کے ذہنوں میں برابر جاگزیں ہے۔ ایک مغربی مصنف LEE. H. BOWKER اپنی کتاب ”WOMEN AND CRIME IN AMERICA“ کے صفحہ نمبر 259 پر لکھتا ہے:

”بچوں کی نظمیں، پریوں کی کہانیاں، دیو مالائی افسانے، قانونی کتب، بچوں کی کہانیاں جو بچوں کو ہفتہ کے ساتوں دن یاد کرائی جاتی ہیں ان سب میں ایسی باتیں موجود ہوتی ہیں جن میں عورتوں کو پست مخلوق کی طرح دکھایا جاتا ہے۔“ مشہور انگریز ادیب ”چارلس لیب“ بچوں کی مندرجہ ذیل نظم کو بہت پسند کرتا تھا۔ یہ نظم بھی بچوں کو ہفتے کے ساتوں دن یاد کرانے کے لیے لکھی گئی ہے بلکہ چارلس لیب اپنے دوستوں کو بھی خطوں میں لکھ لکھ کر یہ نظم بھیجا کرتا تھا۔ نظم مندرجہ ذیل ہے:

I MARRIED A WIFE ON SUNDAY.

SHE BEGAN TO SCOLD ON MONDAY.

BAD WAS SHE ON TUESDAY.

WADDLING WAS SHE ON WEDNESDAY.

WORSE WAS SHE ON THURSDAY.

DEAD WAS SHE ON FRIDAY.

GLAD WAS I ON SATURDAY NIGHT.

TO BURY MY WIFE ON SUNDAY.

”لی۔ ایچ باؤکر“ کے مندرجہ بالا اقتباس اور خصوصاً بچوں کی نظم پڑھیے اور سردھنیے! کیا یہی وہ مطلوبہ مقام ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے ہماری بیگمات کا طبقہ اتنا بے تاب و بیقرار ہے؟ ”عورتوں میں بہ نسبت مردوں کے تاثر اور انفعالیات کا مادہ زیادہ ہوتا ہے“ پھر ہمارے روزمرہ کے مشاہدات بھی اس بات کا ثبوت بن جاتے ہیں۔

روزمرہ کے مشاہدات:

- 1۔ بہت سے روزمرہ کے مشاہدات ایسے ہیں جن سے حقیقت حال کا اندازہ ہوتا ہے:
- اگر کہیں مرد بھی وکیل ہو اور عورت بھی وکیل تو آپ مرد کو وکیل چنیں گے یا اپنا مقدمہ عورت وکیل کے حوالے کریں گے؟

- 2- عورتیں خود یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ کچھری جانے سے کتنا گھبراتی ہیں۔ اگر بامرِ مجبوری جانا بھی پڑ جائے تو کسی مرد کو ساتھ لے کر جائیں گی۔ حتیٰ کہ خود پڑھی لکھی عورتیں بھی کچھری کا رخ نہیں کرنا چاہتیں کہ وہ حج کی تفتیش سے حواس باختہ ہو جاتی ہیں۔
- 3- مرد اکیلا ہر جگہ چلا جاتا ہے مگر عورت کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جہاں جائے مرد ساتھ ہو، چاہے یہ اپنا چار پانچ سال کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔
- 4- بچہ بیمار ہو، باپ پر سکون ہوگا مگر ماں کا حال ناگفتہ بہ ہوگا۔ اسی طرح خدا نخواستہ بچہ فوت ہو جائے، باپ بہادری اور صبر سے کام لے گا مگر ماں پر غشی پڑتی جاتی ہے۔
- 5- مرد معاملات کا تجزیہ بنظرِ غائر کرتا ہے مگر عورت تجزیہ کرنے سے گھبراتی ہے وہ بہت جلد جذبات کی رو میں بہہ کر یک طرفہ فیصلہ کر ڈالتی ہے۔
- 6- نکاح، شادی، طلاق وغیرہ کے معاملات میں عورت (2:1) کے حساب سے گواہ بن سکتی ہے مگر ترجیح مرد کو ہی دی جاتی ہے۔ خود عورت بھی مرد ہی کو گواہ بنا کر مطمئن ہوتی ہے۔
- 7- ذرا اور آگے چلیے! لیڈی ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ مگر خود مرد حضرات یہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی کی زچگی مرد ڈاکٹروں سے انجام پائے، محض اس وجہ سے کہ عورت کے مقابلے میں مرد زیادہ کامیاب اور محتاط آپریشن کر سکتے ہیں بلکہ بعض خواتین بھی خود یہی چاہتی ہیں۔ یہ مشاہدات کہاں تک گنوائے جائیں! خود ہماری روایات بھی ایسی ہیں کہ عورت ہر ذمہ داری اور احتیاط کا کام مرد کے حوالے کر کے مطمئن ہو جاتی ہے۔ مرغی تک وہ خود ذبح نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے بھی وہ مرد کی تلاش میں رہتی ہے۔ اسلام نے عورت کی مالی حیثیت کو تسلیم کیا ہے، وہ کما سکتی ہے پھر وہ اپنی کمائی اور اپنی جائیداد میں خود تصرف کر سکتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ اپنی رقم کسی کاروبار میں لگانے کے لیے اپنے گھر کے کسی مرد ہی کے حوالے کر دیتی ہے۔ یہ سب حقائق اس بات کے لیے مضبوط دلیل ہیں کہ عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں آدھی کیوں رکھی گئی ہے۔

بقولِ اقبال:

”نسوانیتِ زن کا نگہاں ہے فقط مرد“

اب خاص ”شہادت“ کے بارے میں مغربی مفکرین کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں:

”ہم اپنے آپ کو بار بار مجبور پاتے ہیں کہ اس حقیقت کا اعتراف کریں کہ عورت کبھی اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر کوئی واقعیت پسندانہ فیصلہ کر سکے۔“

(از بار BAUER)

ایک ممتاز مغربی سکالر ”شو پنہار“ لکھتا ہے: ”انصاف کی عدالتوں میں عورتیں، مردوں کی نسبت اکثر اوقات جھوٹی قسمیں کھانے کی مجرم پائی گئی ہیں یہاں تک کہ اب تو یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ آیا عدالتوں میں ان سے حلف لیا بھی جائے یا نہیں؟“

ہیولاک ایلس اپنی کتاب ”مرد و عورت“ (MAN AND WOMAN) میں لکھتا ہے: ”عورت میں دھوکہ دینے کی عادت ایک طبعیاتی حقیقت ہے، جسے ناملائم الفاظ اور بے رحمانہ انداز میں تقریباً ہر قوم کی ضرب المثل میں بیان کیا جاتا ہے۔ بعض ممالک میں تو عورت کی شہادت کو قانونی طور پر مرد کی شہادت سے کمتر درجے پر رکھا جاتا ہے۔“

ایک اور مغربی دانشور لیوڈوسی (LUDOVICI) اپنی کتاب ”WOMAN“ میں ص 320 پر رقمطراز ہے: ”وگلاء اس حقیقت سے واقف ہیں کہ خواتین سے عدالتی جرح میں عہدہ برآ ہونا مشکل کام ہے۔ اپنے خلاف ہونے والی عدالتی تحقیقات میں خلطِ بحث میں الجھا دینے میں ان کی مہارت انہیں ضدی اور پر پیچ گواہ بنا دیتی ہے، خصوصاً جب وہ کچھ چھپانا چاہتی ہوں۔“

ایک ماہر نفسیات ڈاکٹر ہارڈنگ (M.E. HARDING) اپنی کتاب THE WAY OF ALL WOMEN میں لکھتا ہے: ”عورتوں کے لیے مشکل مقام وہ ہوتا ہے جب ان سے کہا جائے کہ کسی مسئلہ کی جزئیات کو پوری صحت کے ساتھ بیان کریں۔“

اب یہ ساری آراء ”کسی رجعت پسند ملا“ یا دقیا نوسی مولوی کی نہیں ہیں، بلکہ مغرب کے ممتاز علماء و محققین کی ہیں۔ انہوں نے یہ آراء قدیم دور کی خواتین پر تحقیق کے نتیجے میں حاصل نہیں کیں بلکہ آج مرد کے مساوی مرتبہ کی خواہاں اور دوش بدوش چلنے والی مغربی جدید خواتین پر تحقیق کے نتیجے میں حاصل کی ہیں کہ (1) وہ تفصیلی جزئیات یاد نہیں رکھ سکتی۔ (2) یاد رکھ بھی لیں تو

صاف بیان نہیں کر سکتیں۔

اب یہی بات جب قرآن پاک کہتا ہے: **وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ** (سورہ زخرف، 43/18) کہ ”نزاعی معاملہ کے وقت وہ اپنا مافی الضمیر واضح نہیں کر سکتی“ تو پھر ڈاکٹر ہارڈنگ کی جدید تحقیق کہ ”عورت جزئیات پوری صحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتی“ کیا اسی قرآنی آیت کی وضاحت نہیں ہے! ثابت ہو گیا کہ جزئیات کو تفصیل کے ساتھ بیان نہ کر سکتا عورت کی طبیعات اور نفسیات میں شامل ہے۔ اب عورت کی اس کمزوری کی وجہ سے عدالت میں شہادت خراب ہوتی ہے۔ خصوصاً متنازعہ فیہ معاملات جہاں بال کی کھال نکالی جاتی ہے اور باریک باریک اختلاف زیر بحث لائے جاتے ہیں، وہاں عورت ایسی جزئیات کی صراحت میں ناکام رہ جاتی ہے۔

اس سے دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر قرار دینے کی حکمت واضح ہو گئی۔ اس میں عورت کی تذلیل و تحقیر نہیں ہے بلکہ اس کی فطرت ہی کے پیش نظر اس پر شہادت کا بار کم سے کم ڈالا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی شریعت میں عورت کو حج اور قاضی بھی مقرر نہیں کیا گیا۔ گویا اس کو گواہ کی حیثیت یا حج کی حیثیت سے ایوان انصاف میں لانا نہ صرف اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے بلکہ جدید دور کی علمی تحقیقات کے بھی خلاف ہے۔ وطن عزیز میں کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں مقدمات کا سامنا کرنے والی خواتین کو مخالف فریق کی طرف سے تشدد اور بے عزتی کا نشانہ بنایا گیا۔^[۱] اس پر مغربی افکار کے تحت قائم ہونے والی خواتین کی بہت سی ”این جی اوز“ نے صدائے احتجاج بلند کی کہ مقدمات میں ملوث خواتین کو عدالتوں میں حاضری سے استثناء ہونا چاہیے۔ اس پر مردوں کی طرف سے اعتراض اٹھایا گیا کہ جب عورتیں، ہر جگہ مردوں کے

[۱] روزنامہ ”نوائے وقت“ 3 اگست 1989ء میں خبر شائع ہوئی کہ دو خواتین منڈی بہاؤ الدین کی عدالت میں تاریخ بھگت کر گھر جا رہی تھیں کہ (ملزمان) فریق مخالف کے لوگ انہیں تھانہ لے گئے۔ جہاں ان پر تشدد کیا گیا، برہنہ کر کے رقص پر مجبور کیا گیا، رات بھر پولیس مین ان کے ساتھ زیادتی کرتے رہے اور صبح انہیں ابولہان حالت میں چھوڑ دیا گیا۔

مساوی حقوق چاہتی ہیں تو پھر انہیں مردوں کی طرح تمام انتظامی اور معاشرتی ناہمواریوں کا بھی حصہ دار بننا چاہیے۔ انہیں جنس کی بنیاد پر رعایتیں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

انگریز معاشرے میں تو پردے کا کوئی سوال نہیں نہ ہی یورپ کے کسی قانون میں پردہ نشین عورتوں کے لیے کسی رعایت کی گنجائش ہے۔ مگر متحدہ ہندوستان میں خود انگریزوں نے جب فوجداری قوانین نافذ کیے تو تعزیراتی قوانین کی دفعہ 205 کے تحت فوجداری قوانین میں ملوث پردہ دار خواتین کو عدالت میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اب بھی یہ دفعہ پاکستانی قانون تعزیرات میں موجود ہے۔ صرف یہ پابندی ہے کہ جس دن عورت کی ذاتی حاضری کے بغیر مقدمہ کی پیش رفت نہ ہو سکے، اس دن عورت لازماً اپنی حاضری کو یقینی بنائے۔ باقی دنوں میں وہ بے شک عدالت میں خود حاضر نہ ہو۔

کلکتہ ہائی کورٹ نے تو اس قانون کو اور بھی وسعت دی تھی کہ ”اگر مجسٹریٹ پردہ دار ملزم خاتون کی عدالت میں حاضری کو لازمی خیال کرتا ہے، تو اسے چاہیے کہ ایسے اقدامات کرے، جس سے اس پردہ دار ملزم خاتون کی شناخت کی کارروائی اس کے گھر ہی میں مکمل ہو سکے۔“

3- عورت کا دائرہ کار:

کسی حقیقت کی رسائی تک جتنا دخل آدمی کی فکر و فہم کو ہوتا ہے اتنا ہی اس کے طبعی ذوق اور عملی دائرہ کار کا بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی واقعہ کسی کے دامن تو جہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے پھر وہ اس کی تہہ تک پہنچنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ مگر دوسرا شخص اس واقعہ کے پاس سے سرسری طور پر گزر جاتا ہے کیونکہ وہ اس کی طبیعت یا دائرہ کار سے غیر متعلق ہوتا ہے۔ ایک کاروباری آدمی علمی مسائل کو اتنی تیزی سے نہیں سمجھ سکتا جس طرح کہ ایک طالب علم۔ یہی حال عورت کا ہے۔ اس کا ذہنی مزاج اور اس کے عمل کی دنیا دونوں مرد کے مزاج اور دائرہ کار سے الگ ہیں لہذا وہ اپنے دائرہ کار کے اندر ہونیوالے واقعات تو بخوبی مشاہدہ کر سکتی ہے اور عمدگی سے ان کو ضبط کر سکتی ہے۔ مگر اپنے حدود عمل سے باہر ہونیوالے واقعات کا نہ تو وہ مرد کی طرح مشاہدہ کر سکتی ہے نہ اس کی طرح ضبط کر سکتی ہے، تو فطری دائرہ کار کے مطابق شہادت کا بار عورت

پر کم سے کم ہونا عقل کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شریعت نے اس کے حدودِ عمل سے باہر ہونے والے معاملات میں بھی اس کی شہادت قبول کی ہے۔ مگر سہو و نسیان کے احتمال کے پیش نظر دوسری عورت کی موجودگی لازمی قرار دے دی ہے۔

تنہا عورتوں کی شہادت:

رہے وہ معاملات جن میں عورت شب و روز لگی رہتی ہے اور جو اس کے ذوق، مزاج اور رجحان سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں، ان میں شریعت نے اس کی گواہی کو مرد کی گواہی کی طرح مکمل اور پورا شمار کیا ہے۔ بلکہ امام شعبی نے تو یہاں تک کہا ہے:

”مِنَ الشَّهَادَاتِ مَا لَا يَجُوزُ فِيهِ إِلَّا شَهَادَةُ النِّسَاءِ“

”شہادت کی بعض ایسی قسمیں ہیں جن میں صرف عورتوں ہی کی شہادت جائز ہے۔“

اس مسئلہ میں امام زہری کا بیان یہ ہے: ”سنت یہ رہی ہے کہ صرف عورتوں کی شہادت ان معاملات میں جائز ہے، جن سے عورتوں کے علاوہ کوئی دوسرا واقف نہیں ہوتا۔ یعنی بچے کی ولادت یا ان کے عیوب وغیرہ۔“

دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں کے مخصوص معاملات میں صرف عورتوں ہی کی شہادت معتبر ہے۔ وہاں مرد کی گواہی کی ضرورت ہے نہ افادیت۔ انہی کی گواہی پر شریعت کے احکام نافذ ہوتے ہیں، مثلاً اگر بچہ زندہ پیدا ہونے کی شہادت دی گئی، تو پھر اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔ اس کے متعلق احکام وراثت پر بھی عمل ہوگا ورنہ نہیں، یا یہ مسئلہ کہ عورت باکرہ ہے یا نہیں بالغ ہے یا نابالغ، ان کے امراض کی شہادت، حمل کی مدت کا تعین، گورنمنٹ یا پرائیویٹ ملازم عورتیں عورتوں ہی کی شہادت (سرٹیفکیٹ) کی بنا پر رخصت کا حق حاصل کرتی ہیں اور ان سب باتوں کا بعض اوقات نکاح اور اس کے متعلق مسائل پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ نبی پاکؐ نے رضاعت کے سلسلے میں صرف ایک عورت کی شہادت قبول کر کے عقبی بن حارث اور اس کی بیوی اُمّ یحییٰ بنتِ وہاب میں جدائی کروادی تھی۔

البتہ اس بات میں فقہاء کا اختلاف موجود ہے کہ عورتوں کے مخصوص مسائل میں بھی کتنی

عورتوں کی شہادت ضروری ہے؟ امام مالک دو عورتوں کی شہادت کے قائل ہیں جبکہ بعض فقہاء چار عورتوں کی شہادت کے قائل ہیں۔ امام ثوری اور احناف کے نزدیک ایک عورت ہی کی شہادت کافی ہے۔ احناف اس بات کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ عورتوں کے پوشیدہ مقامات کو دیکھنے میں جتنی قباحت مردوں کے لیے ہے اتنی ہی قباحت ایک عورت کے مقابلے میں زیادہ عورتوں کے معاہدہ کرنے میں بھی ہے۔ لہذا ایک ہی عورت کی گواہی کافی ہونا ہی مصلحت کا تقاضا ہے۔

علاوہ ازیں جہاں حالات تقاضا کرتے ہوں وہاں عام معاملات میں بھی ایک عورت کی شہادت قرائن کی موجودگی میں قبول کی جائے گی۔ مثلاً جائے وقوعہ پر اتفاق سے کوئی مرد موجود نہ ہو اور وہاں صرف عورتیں ہی گواہ ہوں۔ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔ مثلاً حضرت معاویہؓ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے صرف حضرت ام سلمہؓ کی شہادت پر ایک مکان کے متعلق جھگڑے کا فیصلہ کر دیا۔^[۱]

اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی واقعہ کا فیصلہ صرف ایک یا دو آدمیوں کی زبانی شہادت ہی پر موقوف نہیں ہوتا بلکہ بہت سے داخلی اور خارجی قرائن اور علامات ایسی ہوتی ہیں جو اصل حقیقت کی وضاحت کر رہی ہوتی ہے مگر یہ علامات بہر حال دو ٹوک اور قطعی نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ شریعت نے فیصلہ کی بنیاد انسانوں کی قطعی اور دو ٹوک گواہی پر ہی رکھی ہے۔ البتہ بعض مخصوص معاملات کے سوا عام حالات میں ان معاملات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اگر یہ علامات کہیں واضح شکل میں موجود ہوں یا احتیاط اور تقویٰ ایک خاص طرح کے فیصلہ کا تقاضا کر رہے ہوں تو شریعت نے صرف ایک گواہ کو بھی کافی سمجھا ہے۔ چنانچہ امام زہری سے روایت ہے کہ تین مختلف گھرانوں میں شادی بیاہ کے ذریعہ سے رشتہ قائم ہوا تو ایک عورت حضرت عثمانؓ کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ یہ سب میری رضاعی اولاد ہیں اور میں نے ان کو دودھ پلایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی شہادت کی بنا پر ان کے نکاح فسخ کر دیئے۔

[۱] ”عورت اسلامی معاشرہ میں“ صفحہ ۱۸۷، از: جلال الدین عمری

روایت حدیث کے سلسلہ میں عورت پر اعتماد:

عورتوں سے جو احادیث مروی ہیں خواہ زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو، تمام علماء و فقہاء امت نے ان پر کُلّی اعتماد کیا ہے اور روایات کے سلسلے میں مرد و عورت کا فرق کیے بغیر ان کو یکساں اہمیت دی ہے۔ بعض احادیث ہم تک ایسی سندوں سے پہنچی ہیں، جن میں کئی کئی خواتین موجود ہیں۔ خود امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی نے ایسی بہت سی روایتیں قبول کی ہیں، جن کی سندوں میں دو دو، تین تین خواتین کا ذکر ہے، کیا یہ عورت پر اعتماد کی دلیل نہیں ہے! اسی طرح روایت حدیث کے متعلق عورتوں نے جو جرح و تعدیل کی ہے، اس کو تسلیم کیا اور ان کی رائے کے مطابق کسی راوی حدیث کی روایات کو قبول یا رد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

شریعت کا عورت پر اعتماد:

اس مسئلہ میں بھی اسلامی قانون شہادت دوسرے مذاہب کے مقابلے میں ممتاز نظر آتا ہے۔ دوسری قوموں میں عورت کی شہادت سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر کہیں ہے تو صرف تائید مزید کے لیے۔ مثلاً یہودیت میں صرف تائید کے لیے ہے۔

ان امور سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شریعت عورت پر کُلّی اعتماد کرتی ہے۔ البتہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ایک حدیث روایت کرتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی عقیدت و احترام کا جذبہ ان میں غفلت یا بے توجہی کرنے سے انسان کو بچا لیتا ہے اور آدمی پوری شعوری کوشش سے ان کو ضبط کرتا ہے، جبکہ یہ نفسیاتی کیفیت روایت کے سلسلہ میں تو موجود ہوتی ہے مگر زندگی کے تمام معاملات میں نہیں ہوتی۔ لہذا شریعت نے روایت اور شہادت میں خود فرق قائم رکھا ہے۔ یعنی جن امور میں عورت براہ راست متعلق ہوتی ہے، وہاں ایک عورت کی شہادت کافی ہے اور جو چیزیں اس کے دائرہ کار سے باہر ہیں وہاں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر قرار دی گئی ہے۔ چنانچہ ”علامہ ابن رشد“ اپنی کتاب ”بداية المجتهد“ میں لکھتے ہیں: ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مالی معاملات میں ایک عادل مرد اور دو عادل عورتوں کی گواہی معتبر ہوگی، اللہ کے ارشاد ”فَرَجُلٌ وَامْرَأَتْنِ مَحْمُودَتَانِ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ“ کے مطابق۔^[۱]

شہادت کے متعلق تفصیلات:

قرآن مجید نے عورت کی شہادت کے سلسلہ میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں: "فَرَجُلٌ وَامْرَأَتْنِ" اور "أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَى" ان سے کئی ایک سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، وہ فقہ کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ البتہ ایک دو باتوں کا ذکر ضروری ہے:

1- تنہا عورتوں کی گواہی:

بعض فقہاء عورتوں کے مخصوص مسائل میں اور قرآن کے ساتھ عام مسائل میں بھی تنہا عورت کی گواہی کے قائل ہیں، جیسا کہ اوپر تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے۔

2- مشترکہ گواہی:

بعض فقہاء وہ ہیں جو صرف مالی معاملات میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی یعنی مشترکہ گواہی کے قائل ہیں، مثلاً امام مالکؒ اور امام شافعیؒ جبکہ بعض فقہاء حدود و قصاص کے علاوہ ہر معاملہ میں مرد و عورت کی مشترکہ گواہی قبول کرتے ہیں۔^[۱]

حدود و قصاص میں شہادت:

شہادت کی ایک تیسری قسم وہ ہے، جسے حدود و قصاص کہا جاتا ہے۔ جس میں کچھ فقہاء اس بات کے قائل ہیں کہ حدود و قصاص میں عورت کی گواہی سرے سے تسلیم ہی نہیں ہے۔ جبکہ بعض دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ جب عورت کے سہو و نسیان کی کمی دو عورتوں کی شہادت سے پوری کر دی گئی تو پھر ہر مسئلہ میں عورت کو گواہی کا حق ملنا چاہیے۔ علامہ ابن حزم اور علامہ ابن قیم جیسے بزرگوں کی رائے یہ ہے کہ اسلام ہر معاملہ میں شہادتِ نسواں کو جائز سمجھتا ہے۔ البتہ اس کی یہ رائے ضرور ہے کہ جن امور کا تعلق براہ راست مرد کی عملی زندگی سے ہے اور جو عورت کے

[۱] پھر بھی ان میں اس قدر احتیاط سے کام لیا گیا ہے کہ قاضی خود گھر میں پہنچے یا کسی کو بھیج کر عورت سے گواہی لے مگر اس کو عدالت میں طلب نہ کیا جائے۔

دارہ کار سے خارج ہیں، ان کے متعلق اس کی شہادت میں سہو و نسیان کا زیادہ امکان ہے۔ قتل، زنا، چوری، تہمت تراشی، ڈکیتی وغیرہ یہ سب جرائم بڑے سنگین اور بھیانک ہیں اور زنا کا معاملہ سنگین ترین ہے، جس کے لیے چار عینی گواہ چاہئیں۔ ایک طرف شریعت نے ان کی معین سزائیں رکھی ہیں، جن میں حاکم وقت اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں، دوم یہ کہ سزا پانے کے بعد آدمی زندہ رہ بھی جائے تب بھی معاشرہ میں اس کا وقار بری طرح مجروح ہوتا ہے اور عزت و احترام جاتا رہتا ہے۔ اس لیے ان کا فیصلہ یقیناً کامل کی بنا پر ہونا چاہیے، جبکہ عورت کی پوزیشن یہی ہے کہ وہ اصلاً گھر کی مالکہ ہے۔ ایک خاص ماحول میں اس کی پرورش اور تربیت ہوتی ہے۔ اسے ان حالات اور اسباب سے کم ہی واسطہ پیش آتا ہے جن میں یہ بھیانک جرائم سرزد ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے معاملے میں اس کا مشاہدہ اتنا مکمل اور درست نہیں ہوتا جتنا مرد کا ہوتا ہے۔ اپنے مزاج کی نرمی اور شدت احساس کی بنا پر قتل، چوری، ڈکیتی جیسے جرائم کا اہتمام پوری جزئیات کے ساتھ مشاہدہ کرنا، پھر اس کو بلا کم و کاست یاد رکھنا اور من و عن عدالت میں بیان کرنا اس کے لیے آسان نہیں ہے۔ لہذا حدود و قصاص کے ضمن میں امت نے اس کی گواہی کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ مگر جہاں صرف عورتیں ہی گواہ ہیں اور مقدمہ قتل یا چوری کا ہے، وہاں امت میں تنہا عورتوں ہی کی شہادت پر فیصلے کرنے کی نظیریں بھی موجود ہیں، مگر یاد رہے کہ آیت شہادت میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: **ان لہد یكونا رجلین فرجل وامراتان** (کہ جہاں دو مرد نہ ہوں وہاں بغرض سہولت دو عورتوں کا متبادل انتظام کر لیا جائے) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو مردوں کے ہوتے ہوئے عورتوں کو زحمت دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لہذا ان شاذ نظیروں (جن کی رو سے تنہا عورتوں کی شہادت پر ضرورت اور حالات کے مطابق فیصلے ہوئے) کو عموم کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، (جس طرح وضو جو اصل ہے تیمم کا متبادل نہیں ہو سکتا، جبکہ تیمم مجبوری کے وقت وضو کا متبادل ہو سکتا ہے) کیونکہ اس طرح عورتوں کی گھروں سے باہر آمد و رفت بڑھ جائے گی۔ جو اپنے اندر بے شمار مفاسد لیے ہوئے ہے۔ لہذا اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ ان کا ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کا دارہ کم سے کم کیا جائے۔ تاریخ میں ایسی بھی

مثالیں ملتی ہیں کہ عورتوں سے شہادت لینے کی ضرورت پڑی تو قاضی خود عورت کے پاس گیا، اس کو عدالت میں طلب نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدالت میں عموماً جرائم پیشہ لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے اور وہاں بعض اوقات بڑے غلیظ اور ناقابلِ بیان نکات اٹھائے جاتے ہیں۔

کتاب ”إزالة الخفاء“ ج چہارم، صفحہ 217 میں ایک واقعہ مذکور ہے۔ ایک مرد نے زبردستی ایک گھر کی خاتون سے زنا کیا۔ خاتون نے اٹھ کر چھری سے اس آدمی کو قتل کر دیا۔ بعد میں اس خاتون کے ہاں بچہ بھی اس زنا سے پیدا ہوا۔ مرد کے قتل کی تحقیق کرنے کے لیے حضرت عمرؓ خود اس خاتون کے گھر گئے اور اس کے باپ سے کہا کہ میں بچی سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ تحقیق کے بعد آپ پر واضح ہو گیا کہ وہ لڑکی تو بے قصور ہے اور اس نے اپنے دفاع میں آدمی کو قتل کیا ہے۔ آپ نے اس پر لڑکی کو بجائے ناراض ہونے کے شاباش دی کہ تم نے اچھا کام کیا ہے۔

عورت کے حقوق کی رعایت یہ ہے کہ صلح حدیبیہ میں حضرت ابو جندلؓ اپنے جسم کے زخم کھول کر دکھاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کو صبر کی تلقین کر کے نبی پاکؐ نے کافروں کے حوالے کر دیا۔ اسی وقت ایک عورت بھی بھاگ کر آگئی کہ میں مسلمان ہوں مگر میرا خاوند کافر ہے۔ آپؐ نے اس کو واپس نہ کیا۔

جہاں جہاں عورت سے زیادتی ہوئی، اسلام نے اس کا مداوا کیا ہے۔ مثلاً صحیح نسائی میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ صبح کے وقت خواتین منہ اندھیرے نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک خاتون سے کسی شخص نے زیادتی کی اور پھر غائب ہو گیا۔ پیچھے سے ایک اور آدمی آیا۔ خاتون نے رو کر بتایا کہ میرے ساتھ اس طرح جبراً زیادتی کی گئی ہے اور اب وہ اس طرف بھاگ گیا ہے۔ ایک تو اندھیرا اور عورت کی بدحواسی، لوگ بھاگ کر کسی دوسرے آدمی کو پکڑ لائے اور عورت نے کہہ دیا کہ اسی نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ عورت جھوٹ نہیں کہہ رہی لہذا اسی آدمی کو پکڑ لیا گیا، نبی پاکؐ نے اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا، مگر جب سنگسار کیا جانے لگا تو اصل مجرم نے سامنے آ کر اعتراف کر لیا۔ اس پر پہلے آدمی کو چھوڑ کر اصل مجرم کو سنگسار کر دیا گیا۔ اس طرح اس عورت کی داد رسی کی گئی۔

سابقہ بحث میں اسلام کے قانون شہادت میں عورت کے مقام و مرتبہ کا تعین کر لیا گیا ہے اور مقامِ شکر ہے کہ پاکستان میں بسنے والی عورتوں کی اکثریت اسلامی قانون شہادت پر مطمئن اور راضی ہے۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری ہے:

﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ ﴿٥٠﴾

”کیا یہ لوگ جاہلیت کا قانون تلاش کرتے ہیں؟ یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ کے قانون سے بڑھ کر کس کا قانون اچھا ہو سکتا ہے۔“

اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان کے غالب طبقہ نسواں کو اللہ کی طرف سے دیئے گئے حقوق پر کوئی گلہ شکوہ نہیں، کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اسی کو اپنے لیے محفوظ جائے عافیت سمجھتی ہیں اور اس کے دامن میں پناہ لینے کو اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتی ہیں۔ ویسے بھی مغرب کے تجربات نے اسلامی قوانین کی برتری پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ جس کی وجہ سے پاکستانی خواتین کے ایمان پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئے ہیں۔

مرعوب طبقہ کی مجبوری:

البتہ ہمارے ملک میں ایک افرنگ زدہ طبقہ ایسا موجود ہے، جو اسلام کے ہر حکم پر اعتراض کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، اس کا طریق واردات یہ ہے کہ پہلے ایک بہت نادر الوقوع مگر اشتعال انگیز واقعہ گھڑ لیا جاتا ہے۔ پھر اس مفروضہ کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس اس کے تدارک کی صرف ایک ہی شکل باقی رہ جاتی ہے کہ اسلام کے ”دقیانوسی اور ظالمانہ“ قانون کو چھوڑ کر مغرب کے بظاہر چمکتے دکتے قوانین کو بے دھڑک اختیار کر لیا جائے۔ مقامِ صد حیف ہے کہ خود اہل مغرب آہستہ آہستہ صدیوں کے تجربے کے بعد اسلامی قوانین کی بہتری اور برتری کے قائل ہو رہے ہیں مگر ہمارے ہاں کے نام نہاد مرعوب مسلمان مغربی قوانین پر مرے جا رہے ہیں اور اپنے ہاں کے جواہرات کو چھوڑ کر ان کے سنگریزوں کو

درآمد کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔

عورت کی نصف شہادت کے سلسلے میں ایک مفروضہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ کسی گھر میں یک دم ڈاکو آگھستے ہیں، وہ بچوں اور صاحب خانہ کو قتل کر ڈالتے ہیں اور تمام مال و اسباب لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ صرف ایک عورت باقی رہ جاتی ہے۔ اب اسلام حدود و قصاص کے مسئلے میں عورت کی شہادت کو سرے سے تسلیم کرتا ہی نہیں ہے یا کرتا ہے تو آدھا، اس مظلوم و بے بس عورت کا اتنا جانی و مالی نقصان پہلے ہو چکا، اب اس کی گواہی بھی ادھوری ہے۔ وہ کرے تو کیا کرے کہ اس کے مال کی بازیافت بھی ہو سکے اور مجرمین کو قرار واقعی سزا بھی مل سکے؟

اس طریق واردات کا مقصد عورتوں کو اشتعال دلا کر اسلامی قوانین سے برا بیگختہ کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر ہماری روشن خیال بیگمات عالمی نسوانی کانفرنسوں میں کیا منہ دکھائیں گی! لیکن اگر ذرا ٹھنڈے دل سے صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اتنی مایوس کن نہیں ہے! جتنی فرض کر لی گئی ہے۔

اس صورت حال کا فیصلہ کرنے سے پہلے میں آپ سے پوچھنا چاہوں گی کہ کیا اتنا تشدد دیکھنے کے بعد وہ عورت اپنے ہوش و حواس برقرار رکھ سکے گی؟ کیا وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ تمام جزئیات کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ کرے، ٹھیک ٹھیک اس کو یاد رکھ سکے اور پھر بلا کم و کاست درست گواہی دے سکے؟

بلاشبہ بعض عورتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا مشاہدہ قتل، چوری، ڈکیتی اور عصمت دری کی بھیانک وارداتوں میں قابل اعتماد قرار دیا جاسکے اور وہ انہیں عدالت کے سامنے ٹھیک طریقے سے پیش بھی کر سکیں، مگر بحیثیت ایک نوع کے عورت اس کی متحمل نہیں ہے اور قانون ہمیشہ اکثریت کو ملحوظ رکھ کر وضع کیا جاتا ہے۔ کیا یہ معقولیت ہے کہ اسلام جیسے ابدی اور ہمہ گیر قانون کی بنیاد عمومی اور کثیر الوقوع حالات کے بجائے اس قسم کے شاذ اور نادر الوقوع حالات پر رکھی جائے؟

مندرجہ بالا مخصوص واقعہ ایک استثنائی واقعہ ہے اور اس کا فیصلہ بھی استثنائی ہی ہوگا اور وہ یہ ہے کہ وہ عورت عدالت میں گواہی دے گی (اگر وہ دینے کے قابل ہے تو) آدھی اس کی

گواہی اور آدھی گواہی قرآن سے پوری کی جائے گی۔ قرآن یعنی طزم کے ہاتھ، پاؤں کے نشانات اور دیگر آلات جاسوسی وغیرہ اور اس طرح فیصلہ مکمل ہو سکے گا اور اگر عورت بالکل ہی گواہی دینے کے قابل نہ ہو تو اس کے تندرست ہونے کا انتظار کیا جائے گا اور جب اس کی دہشت دور ہوگی، تب اس کی گواہی اور قرآن کی گواہی مل کر فیصلہ کن ثابت ہوں گے۔ جس طرح عورت کی حکمرانی کے وکیل رحمت اللہ طارق نے سوال اٹھایا ہے کہ نتھو بھنگی کسی پردس آنے کی چوری کا الزام لگا کر بے گناہ چور کا ہاتھ کٹوا سکتا ہے کیونکہ اس کی گواہی معتبر ہے مگر فاطمہ جناح مرحومہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اصول شہادت کی نفسیات کا علم رکھنے کے باوجود اور کسی قاتل کی اچھی طرح شناخت کر لینے کے باوجود بھی اگر کہہ دے کہ یہ شخص قاتل ہے، خاص کر ان حالات میں کہ عینی شاہد موجود نہیں تو اس کی گواہی معتبر نہیں ہے..... یعنی مسلمان کا خون بیشک ضائع ہو جائے مگر اتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کا نتھو بھنگی کی گواہی جتنا اعتبار بھی نہیں؟ کیا خوب! کیا یہی ہے دینِ فطرت کا کمال؟

جواب: یہ تو مغربی جمہوریت کا کمال ہے کہ فاطمہ جناح اور نتھو بھنگی کے ووٹ میں کوئی فرق نہیں۔ یہ آپ کی روشن خیالی کا کمال ہے کہ امت کے علماء کرام کے مقابلے میں دو تین روشن خیالوں کا حوالہ دے کر اپنی روشن خیالی واضح کریں وگرنہ شریعت کا فیصلہ قرآن پاک میں یوں بیان ہو رہا ہے:

﴿قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَتُهُ﴾

الْخَبِيثُ ﴿١﴾

”اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہر حال یکساں نہیں ہیں۔ خواہ

ناپاک کی بہتات تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو۔“

لہذا ایک لاکھ نتھو بھنگی ایک طرف اور بندہ مومن ایک طرف! یہ بندہ مومن نتھو بھنگی کی پارٹی

کے تابع نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ محترمہ فاطمہ جناح کی گواہی کیوں قبول نہیں؟ تو یہ آج کی بات نہیں، یہ سلسلہ تو عہد نبویؐ اور عہد خلفاء راشدینؓ کے دور سے چلا آ رہا ہے۔ عورت کی گواہی بیٹے کے حق میں اور بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں اور خاوند کی گواہی بیوی کے حق میں اور بیوی کی گواہی خاوند کے حق میں قبول نہیں۔ اس طرح آقا غلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتا اور غلام آقا کے حق میں گواہی نہیں دے سکتا۔ عورت کی گواہی حدود و قصاص میں مقبول نہ ہونے سے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ شریعت محمدیہ میں باپ کی بیٹے کے حق میں اور بیٹے کی باپ کے حق میں، خاوند کی بیوی کے لیے اور بیوی کی خاوند کے لیے، آقا کی غلام کے لیے اور غلام کی آقا کے حق میں گواہی قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے عمومی بات، مخصوص حالات سے نبٹنا قاضی کا اپنا کام ہے، وہ ان حالات میں تعزیر دیتا ہے۔ اسلامی تعلیم کو سمجھ کر اپنایا جائے تو اسی میں خیر ہوگی۔ لیکن اگر تنہو بھنگی والی جمہوریت کو رائج کیا جائے تو اس میں عدم فلاح کا ہی سامان ہوگا۔

اصل بات یہ ہے کہ:

ہمارے جج، وکیل شروع سے انگریزی قانون پڑھتے رہے، اب ان کی اپنی نفسیات بھی انگریزی ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئین کی تعبیر کرتے ہوئے قرآن و سنت کی تعلیم کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کسی دینی مسئلہ کے حل کے لیے دینی راہنمائی کے بجائے انگریزی حیل و حجت کے طریقہ کو اپنایا جاتا ہے۔ جس سے مسئلہ سلجھنے کی بجائے الجھ جاتا ہے۔ اسی الجھاؤ سے وہ عورت کو قاضی بننے کا حق بھی دینا چاہتے ہیں اور ملک کی سربراہی کا بھی۔ مثلاً ایک صاحب رحمۃ اللہ طارق (جو عورت کی حکمرانی کے زبردست وکیل ہیں) لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ تو عورت کے قاضی بننے کے قائل تھے۔ یعنی جن معاملات میں عورت گواہی دے سکتی ہے، ان میں وہ فیصلہ بھی دے سکتی ہے۔ حالانکہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:

لَا تَكُونُ الْمَرْأَةُ حَكَمًا تَقْضِي بَيْنَ الْعَامَّةِ

”لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے عورت قاضی (یا حاکم) نہیں بن سکتی۔“ [۱]

[۱] جمع الجلال الدین سیوطی (غیر مطبوعہ، جامعہ ازہر میں موجود) جلد دوم

1984ء میں پاکستان کے وفاقی وزیر اطلاعات ظفر الحق صاحب نے کابینہ میں تقریر کرتے ہوئے واضح کر دیا تھا کہ قاضی ایک عورت کی شہادت سے (یا دو عورتوں کی، جیسی بھی صورت حال ہو) اور کچھ دوسرے قرائن سے ثابت ہو جائے کہ یہ شخص قاتل ہے تو وہ تعزیراً اسے قتل تک سزا دے سکتا ہے۔ عورتوں کا یہ کہنا کہ ڈاکو بعض حالات میں ایسے وقت میں ڈاکہ ڈالتے ہیں کہ وہاں کوئی مرد نہیں ہوتا، صرف ایک عورت گھر میں ہوتی ہے، تو ایسے حالات میں بھی مجرم ہرگز نہیں چھوٹ سکتے۔ ان کو پوری پوری سزا دی جائے گی۔ حتیٰ کہ تعزیراً پھانسی یا قتل تک کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ ایسی صورت میں عورت مدّعی ہوگی اور اسلامی حکومت اس کو مدعا علیہ سے انصاف دلانے کی پابند ہے۔

لیکن جہاں تک قصاص کا تعلق ہے، اس میں عورت کی گواہی قبول نہیں ہے۔ امام ابن شہاب زہری کا یہ قول اس سلسلے میں قابل ترجیح ہے:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور آپ کے بعد دونوں خلفاء جناب ابوبکرؓ اور جناب عمرؓ کی طرف سے یہی طریقہ جاری رہا ہے کہ حدود و قصاص کے معاملے میں عورت کی شہادت قبول نہیں ہوتی۔“ (مُصَنَّفُ ابْنِ ابی شیبہ)

اس سے ثابت ہوا کہ قصاص و حدود میں عورت کی گواہی قبول نہ ہونا سنت متواترہ ہے، قطعی ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا قول جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے منقول نہیں ہے۔

حدود و قصاص کے علاوہ باقی معاملات میں ایک عورت کی گواہی قرائن کے ساتھ مل کر فیصلہ گن ثابت ہوگی۔ قرائن کا بہر حال اسلامی قانون شہادت میں اہم مقام ہے۔ خود حضورؐ پاک نے قرائن کی بنا پر بعض اہم فیصلے صادر فرمائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی دو عورتوں کا ایک بچے کے بارے میں جھگڑا سن کر قرائن کی بنا پر جو فیصلہ دیا، وہ تاریخ و روایات میں موجود ہے۔ دراصل قرائن حدود و قصاص اور دیگر معاملات میں بلکہ ہر قسم کے مقدمات میں صحیح فیصلہ کرنے میں مددگار و معاون بنتے ہیں۔

آخر میں ایک گزارش:

اگر ہم اس طرح اہل مغرب کے سامنے پسپا ہونے لگیں تو پھر اسلام کے کس کس قانون پر نشتر چلائیں گے، کہاں کہاں سے بدنامی کا داغ دھوئیں گے! پھر تو ہمارے دین و ایمان کا پورا سرمایہ جدید زمانے کی مصلحتوں پر قربان ہوتے ہوتے دریا برد ہو جائے گا۔ اپنے دین و ایمان کو بچانے کی ایک ہی سبیل ہے کہ پوری ایمانی قوت و مومنانہ جرات سے کام لے کر دلائل کی قوت سے یہ ثابت کیا جائے کہ جس چیز کو دشمن اسلام بدنامی کہہ رہے ہیں، دراصل وہی نیک نامی کا طرہ امتیاز ہے اور دور جدید میں مسلمانوں کا سرمایہ افتخار ہے۔ پس عورت کی نصف شہادت کے سلسلے میں بھی ہمیں یہی راہ اپنانی ہوگی کیونکہ یہ مسئلہ نص قرآن، احادیث نبویؐ، تعامل صحابہؓ اور اجماع امت کی روشنی میں ایک مسلمہ مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے خلاف انفرادی اجتہاد کا کوئی وزن نہیں، پوری امت کا فقہی سرمایہ ایک طرف ہو اور چند لوگ شذوذ کی راہ اختیار کریں تو پھر وہ لوگ اپنا مقام خود متعین کر لیں!

15

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾

”مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔“

(النساء: 11)

اسلام میں عورت کی نصف وراثت

- ❁ صرف اسلام ہی عورت کو وراثت کا حق دیتا ہے
- ❁ لڑکی کی وراثت
- ❁ وراثت کے سلسلے میں ایک اہم اصول
- ❁ مرد کا حصہ دو گنا کیوں ہے؟
- ❁ معاشی پوزیشن کس کی مضبوط ہے؟ عورت کی یا مرد کی؟
- ❁ مرد کے دو گنے حصے پر اعتراض ناروا ہے
- ❁ بعض صورتیں، جہاں مرد و عورت کی وراثت میں فرق نہیں ہے
- ❁ آج کل عملاً عورت کا حق وراثت معطل ہے
- ❁ قرآن و سنت میں حق وراثت نہ دینے کی وعید

عورت کی وراثت

قرآن پاک میں مرد اور عورت کی وراثت کے حصے باقاعدہ متعین کر دیئے گئے ہیں، جس کے مطابق ایک اصولی تعلیم یہ ہے کہ ترکہ میں مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ ظاہر بین حضرات اور مساواتِ مرد و زن کے علمبردار وراثت کے اس کلیہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں مرد و عورت کے درمیان امتیاز کیا گیا ہے اور مرد کو عورت سے دو گنا دے کر عورت کی پوزیشن کو عملاً کمزور رکھا گیا ہے۔

لیکن یہ ایک بے بنیاد اعتراض ہے جو اسلام کے قانونِ وراثت کی حکمت و مصلحت سے نادانیت کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ اگر اسلام کے خاندانی نظام پر ایک نظر ڈال لی جائے تو یہ اعتراض بالکل ختم ہو کر رہ جاتا ہے، لہذا اس قانونِ وراثت کی حکمت و مصلحت کو سمجھنا ضروری ہے۔

صرف اسلام ہی عورت کو وراثت کا حق دیتا ہے:

حیرت کی بات ہے کہ اسلام کے قانونِ وراثت پر اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جنہوں نے خود ہمیشہ عورت کو وراثت سے محروم رکھا ہے۔ اسلام سے قبل عرب کے معاشرہ میں عورت وراثت سے مکمل طور پر محروم تھی۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ عورت نہ جنگ کر کے مال غنیمت حاصل کر سکتی ہے، نہ اپنا یا اپنے خاندان کا دفاع کر سکتی ہے اور نہ ہی کسی اور قسم کی معاشی دوزدھوپ کر سکتی ہے۔ لہذا وہ خاندان کی دولت کی وارث کیسے ہو سکتی ہے؟ ان کے ہاں وارث صرف وہ بالغ مرد ہوتے تھے جو دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ لہذا کمسن لڑکے بھی وراثت سے محروم ہی رکھے جاتے تھے۔

صرف عرب معاشرہ نہیں بلکہ تقریباً سبھی معاشروں نے ایسی ہی بے بنیاد باتوں کی بنا پر

عورت کو وراثت سے محروم بنادیا تھا۔ یہ صرف بڑی زرینہ اولاد کا حق تھا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ تورات اور انجیل میں عورتوں کا حصہ مقرر تو بے شک کیا گیا تھا مگر تقسیم کی تکلیف کو رفع کرنے کے لیے ساتھ ہی اپنے خاندان میں شادی کی سفارش کر کے (گنتی، باب 36، آیت نمبر 6 تا 8) عملاً اس حصہ کو تقریباً ختم ہی کر دیا گیا تھا۔ آج تک دوسرے مذاہب اور معاشروں نے عورت کو میراث میں اس طرح سے حصہ نہیں دلایا جس طرح اسلام نے اسے چودہ سو برس پہلے سے دے رکھا ہے:

لڑکی کی وراثت:

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ
نَصِيبًا مَّفْرُوضًا﴾^[۱]

”مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے، جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا
ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے
چھوڑا ہو۔ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ اور یہ حصہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔“

وراثت کے سلسلے میں ایک اہم اصول:

اسلام نے وراثت کو خاندان میں محدود رکھا ہے اور افراد خانہ کے درجہ بدرجہ حقوق مقرر

کر دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلا حق اولاد کا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ
الْأُنثَىٰ﴾^[۲]

”اللہ تعالیٰ اولاد کے معاملے میں تمہیں ہدایت فرماتا ہے کہ ایک مرد کا حصہ دو

[۱] النساء: 7

[۲] النساء: 11

عورتوں کے برابر ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں اور وراثت تقسیم اس طرح ہوگی کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا۔ یعنی اگر میت کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی وارث ہوگی تو کل تین حصے بنیں گے۔ ایک حصہ لڑکی کا اور دو حصہ لڑکے کے۔

قرآن کے اس اسلوب بیان سے ایک اصول یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شریعت میں اصل بنیاد تو لڑکی کا حصہ ہے جو بعض وجوہات کی بنا پر لڑکے یا مرد کے لیے دگنا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شریعت اسلامی کو لڑکیوں کی وراثت کی کتنی فکر ہے اور اس کی کتنی اہمیت ہے۔

مرد کا حصہ دو گنا کیوں ہے؟

رہ گئی یہ بات کہ مرد کو عورت سے وراثت میں دو گنا حصہ کیوں دلا یا گیا ہے؟ تو یہ کوئی پیچیدہ یا الجھا ہوا مسئلہ نہیں بلکہ ایک فطری اور منصفانہ تقسیم ہے۔ اسلام کے خاندانی نظام میں سارا معاشی بوجھ مرد ہی کے کندھوں پر ڈالا گیا ہے۔ خاندان کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس کو پورے خاندان پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ عورت کو کل ورثہ کا ایک تہائی حصہ صرف اپنی ذات کے لیے ملتا ہے، باقی دو تہائی مرد کو دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنی، اپنی بیوی اور اپنے بچوں کی ضروریات پوری کر سکے۔ عورت کی صورت حال یہ ہے کہ وہ باپ، بھائی، شوہر، بیٹا ہر ایک سے وراثت حاصل کرتی ہے۔ مگر اس کا اپنا خرچ بھی اس کے ذمے نہیں ہے بلکہ باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کے ذمہ ہے۔ اس کو جو وراثت کا مال ملتا ہے وہ اس کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ وہ اس کی ملکیت ہوتا ہے، وہ اس میں جیسے چاہے تصرف کرے۔ اپنے گھر میں یا گھر سے باہر جہاں بھی خرچ کرے یا کاروبار میں لگائے اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے۔ پھر وہ مرد سے نفقہ بھی وصول کرتی ہے، مہر اور دیگر تحفے تحائف بھی۔ دوسری طرف مرد کو وراثت میں جو کچھ ملتا ہے، وہ اس کی ہر آن بڑھتی ہوئی معاشی ذمہ داریوں کی بنا پر خرچ ہوتا رہتا ہے۔ مرد کی ذمہ داریاں ہی ایسی ہیں کہ اس کو عورت کے مقابلے میں لازماً دو گنا حصہ ملنا چاہیے۔

تو پھر اسلامی قانون وراثت کا یہی اصول ہے کہ لِكُلِّ حَسْبُ حَاجَتِهِ ہر آدمی کو

اس کی ضروریات کے مطابق دیا جائے۔“ اور اس کی ضروریات کا پیمانہ اس کی وہ معاشرتی ذمہ داریاں ہیں جن کا بوجھ اسے اٹھانا پڑتا ہے۔ وہ بیوی بچوں کی ضروریات پوری کر کے ان پر کوئی احسان نہیں رکھتا، بلکہ اپنے اوپر عائد اخلاقی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے۔

اسلام میں عورت کے نان نفقہ کا حق اتنا مضبوط و مستحکم ہے کہ اگر کوئی مرد بیوی کو نان نفقہ دینے سے انکار کر دے یا اپنی آمدنی کے لحاظ سے اس کو کم ادا کرے، تو عورت عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کر کے اس سے اخراجات وصول کر سکتی ہے، یا دوسری صورت میں اس سے علیحدگی بھی اختیار کر سکتی ہے۔

معاشی پوزیشن کس کی مضبوط ہے؟ عورت کی یا مرد کی؟

مندرجہ بالا ساری بحث سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ یہی کہ بسا اوقات عورت کی معاشی حیثیت اتنی مضبوط و مستحکم ہو جاتی ہے کہ وہ معاشی لحاظ سے اکثر و بیشتر مرد سے زیادہ بہتر حالت میں ہوتی ہے۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ صرف اسلام ہی عورت کو حقوق ملکیت عطا فرما رہا ہے ورنہ قدیم معاشرے میں کہیں عورت کی نہ تو کوئی جائیداد تھی نہ مال، نہ ہی عورت کی ملکیت کا کوئی تصور تھا۔ یورپی معاشروں میں بھی اگر عورت کماتی بھی تھی تو اس کا مال شادی سے قبل باپ کا اور شادی کے بعد شوہر کا ہوتا تھا۔ برطانیہ میں طویل احتجاج کے بعد صرف شادی شدہ عورت کو حق ملکیت مل سکا اور وہ بھی 1870ء میں۔

اس کے برعکس مسلم خواتین کو دولت کمانے، محنت مزدوری کرنے، تجارت کرنے غرض ہر طرح کے حقوق مردوں کے مساوی حاصل ہیں۔ اسلام نہ تو محنت مزدوری کے معاوضہ میں، نہ تجارت کے نفع کی تقسیم میں، نہ زمین سے حاصل ہونے والی آمدنی میں، کہیں بھی مرد و عورت کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں رکھتا۔ ان سب حقوق و مراعات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلم معاشروں میں عموماً عورتوں کی معاشی پوزیشن خاصی مضبوط ہوتی ہے۔ اس وقت سعودی عرب کی کل تجارت میں 40 فیصد وہاں کی خواتین ہی کا ہے۔ سعودی عرب کے دار الخلافہ ریاض میں 25 فیصد اور جدہ میں 50 فیصد سرمایہ عورتوں کا کاروبار میں لگا ہوا ہے۔ یہ سب ان کی ذاتی ملکیت ہے اور وراثت سے ان کو ملا ہوا ہے۔

مرد کے دو گئے حصے پر اعتراض ناروا ہے:

اس طرح اسلام نے عورت پر سے معاشی ذمہ داریوں کو ختم کر کے وراثت کی بعض صورتوں میں اس کا حصہ مرد سے نصف رکھا ہے۔ اس پر نہ تو مردوں کو اعتراض کرنا زیبا ہے اور نہ عورت یہ اعتراض اٹھا سکتی ہے کہ اس کا حصہ کم کیوں رکھا گیا ہے؟ ہاں! اگر دونوں کا حصہ وراثت میں مساوی ہوتا تو مرد ضرور یہ مطالبہ کر سکتا تھا کہ عورت کو بھی معاشی ذمہ داریوں میں شریک کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ حقوق اور ذمہ داریوں کے تعین کے حوالہ سے وراثت کی یہ تقسیم فطری اور منصفانہ ہے، عدل اور توازن پر مبنی ہے۔ اس سے بہتر تقسیم کا تصور بھی پیش نہیں کیا جاسکتا۔

حافظ ابن قیم نے مرد کے وراثت میں دو گئے حصے کی ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے کہ وراثت کا تعلق معاشی بوجھ کے ساتھ ہے۔ بیٹی کے مقابلہ میں بیٹا، باپ کی مالی و معاشی خدمت زیادہ بجالاتا ہے۔ لہذا اس کو میت کے ترکہ میں سے بھی زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔^[۱]

بعض صورتیں، جہاں مرد و عورت کی وراثت میں فرق نہیں ہے:

شریعت نے چند صورتوں میں مرد و عورت کو وراثت میں یکساں حصہ دلایا ہے، معاشی ذمہ داریوں سے قطع نظر جہاں رشتے کا معاملہ ہو۔ مثلاً (۱) میت کی اولاد بھی ہے اور بوڑھے ماں باپ بھی، تو اس صورت میں ماں اور باپ دونوں کا حصہ وراثت میں یکساں ہوگا۔ یعنی چھٹا حصہ (النساء: ۱۱) اس طرح (۲) انخیانی بھائی بہن (یعنی ماں جائے بہن بھائی) کہ ان میں بھی اسلام نے مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا (النساء: ۱۲) دونوں صورتوں میں وراثت میں مرد و عورت کو مساوی حصہ دیا ہے۔ (۳) اگر میت کا شوہر بھی ہو اور بہن بھی ہو تو آدھا شوہر کو ملے گا اور باقی آدھا بہن کو مل جائے گا۔

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وراثت کے معاملہ میں عورت سے کہیں بھی بے انصافی نہیں ہوئی۔ کہیں میت کے ساتھ عورت کے رشتہ کو اہمیت دی گئی ہے اور دوسری طرف مرد کی معاشی ذمہ داریوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر وراثت میں عورت کا حصہ کہیں کم ہے تو کہیں زیادہ اور بعض حالات میں مرد و عورت کے حصے مساوی بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ قرابت داری اور معاشی

ذمہ داریوں کے درمیان بے مثال توازن ہے۔ یہ توازن اسلامی شریعت کی وہ نمایاں خصوصیت ہے، جو اسے دوسرے مذاہب اور نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔

آج کل عملاً عورت کا حق وراثت معطل ہے:

آج کل عملاً عورت کا حق وراثت بعض مسلم معاشروں میں بری طرح پامال ہو رہا ہے خصوصاً برصغیر پاک و ہند میں مختلف حیلوں اور بہانوں سے عورت کو شرعی حق وراثت سے محروم رکھنے کی وہ بار و زافزوں ہے۔ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ عورتوں کو جہیز میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ وراثت کا بدل ہی تو ہے۔ جب انہوں نے لمبے چوڑے جہیز لے لیے تو وراثت میں ان کا کچھ بھی حصہ باقی نہیں رہتا۔ پاکستان میں جاگیردار، زمیندار اور وڈیرے عموماً اپنی لڑکیوں کی شادیاں خاندان سے باہر کرتے ہی نہیں کہ اس طرح کہیں جائیداد خاندان سے باہر نہ چلی جائے اور سندھ میں وڈیرے اپنی جائیداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹیوں کی شادیاں قرآن سے کر دیتے ہیں، اس طرح عملاً ساری عمر وہ کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔ یہ مسئلہ بڑا سنگین بن چکا ہے عموماً بھائی بہنوں سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تم ہم سے تعلق برقرار رکھنا چاہتی ہو تو وراثت کا خیال دل سے نکال دو اور بہنیں یہ سوچ کر کہ ماں باپ تو پہلے ہی فوت ہو چکے ہیں اب ہمارا میکہ صرف بھائیوں کے دم قدم ہی سے قائم ہے۔ اگر یہ بھی ناراض ہو گئے تو پھر ہم اپنے بھائیوں کی شکل دیکھنے سے بھی محروم رہ جائیں گے۔ لہذا وہ کہہ دیتی ہیں کہ ہم نے اپنی جائیداد کا حصہ تمہیں بخش دیا۔ حالانکہ جو حق وہ ”بخوشی“ بھائیوں کو بخش رہی ہوتی ہیں وہ خود اچھی طرح جانتی ہیں کہ یہ ان کی کتنی بڑی مجبوری ہے۔ چند خوفِ خدا رکھنے والے دین دار لوگوں کے علاوہ مسلمانوں کی اکثریت بہنوں کو وراثت کے حق سے محروم رکھ کر بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہی ہے۔

قرآن و سنت میں حق وراثت نہ دینے کی وعید:

قرآن پاک میں سورۃ نساء، آیت نمبر 11 اور 12 میں احکام وراثت بیان کرنے کے بعد آیت نمبر 14 میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾ [۱]

”اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے اور اس کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرے، اسے اللہ تعالیٰ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔“

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”جس نے کسی وارث کو وراثت سے محروم کیا، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی جنت کی وراثت ختم کر دے گا۔“ [۱]

حیرت ہے اتنی شدید وعید کے باوجود مسلمانوں میں یہ مرض بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ بہنوں کو جائیداد کے مطالبے پر ہر طرح سے تنگ کیا جاتا ہے، ان پر جبر و تشدد کیا جاتا ہے اور بعض صورتوں میں ان کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ رقمطراز ہیں:

”یہ ایک بڑی خوفناک آیت ہے جس میں ان لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں یا ان دوسری قانونی حدود کو توڑ دیں، جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدود کو توڑا۔ اس قانونِ وراثت کے سلسلہ میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں، وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں۔ کہیں عورتوں کو میراث سے مستقل طور پر محروم کیا گیا، کہیں صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھہرایا گیا، کہیں سرے سے تقسیم میراث ہی کے طریقے کو چھوڑ کر مشترک خاندانی جائیداد کا طریقہ اختیار کر لیا گیا، کہیں عورتوں اور مردوں کا حصہ برابر کر لیا گیا اور اب ان پرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت یہ ہے کہ بعض مسلمان ریاستیں اہل مغرب کی تقلید میں وفات فیکس (Death Duty) اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں۔ جس کے معانی یہ ہیں کہ میت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے، جس کا حصہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے تھے۔“ [۲]

[۱] مشکوٰۃ باب الوصایا، بحوالہ ابن ماجہ و بیہقی فی شعب الایمان عن ابی ہریرۃؓ

[۲] تفہیم القرآن، ج اول، حاشیہ نمبر 25 الف

عہد فاروقیؓ کا ایک فیصلہ بھی پیش خدمت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کو وراثت سے محروم کرنا صحابہ کرامؓ اور خصوصاً سیدنا عمر فاروقؓ کے نزدیک کتنا بڑا گناہ تھا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں غیلان بن سلمہ ثقفی نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی اور اپنا مال اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اس کو بلایا اور فرمایا: ”ہو سکتا ہے کہ اب تو چند دن ہی زندہ رہے۔ قسم بخدا! اگر تو نے اپنی بیویوں کی طلاق سے رجوع نہ کیا اور اپنے بیٹوں سے مال واپس نہ لیا تو میں تیری بیویوں کو تیرے مرنے پر میراث دلاؤں گا اور انھیں حکم دوں گا کہ تیری قبر پر سنگ باری کریں، جس طرح ابو رغال کی قبر پر ہوئی تھی۔“ اس پر اس نے اپنی بیویوں کی طلاق سے رجوع کر لیا اور اپنا مال بھی واپس لے لیا اور نافع نے بیان کیا ہے کہ وہ بعد میں صرف سات دن زندہ رہا اور کھلی کی روایت میں ہے کہ تیسرے روز ہی مر گیا۔^[۱]

ہمارے ملک میں بھی بہت سے صاحب جائیداد اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو میراث سے محروم کرنے کے لیے زندگی میں ہی اپنی جائیداد لڑکوں میں ہبہ کر کے اس کی رجسٹری کرا دیتے ہیں۔ امام احمد اس کو قابل گرفت سمجھتے ہیں کہ اس فاسد نیت سے تو بیویاں اور بیٹیاں جائیداد سے محروم کر دی جاتی ہیں، لہذا یہ ہبہ نہ تو صحیح ہے نہ قابل نفاذ۔ ایسے شخص کے فوت ہونے پر لڑکیوں کو بدستور حصہ ملنا چاہیے اور اس کا ہبہ منسوخ ہونا چاہیے۔ وہ اس کی دلیل میں حضرت عمرؓ کا مندرجہ بالا فیصلہ پیش کرتے ہیں۔ وطن عزیز میں بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے امام احمد کے موقف کی حمایت کر کے لڑکیوں کو ان کا جائز حق دلانے کی کوشش کی تھی، مگر ان کی کوشش کی پذیرائی نہ ہو سکی۔

توراة اور انجیل میں بھی لڑکیوں کو ایک حصہ وراثت دینے کا پابند کیا گیا ہے۔^[۲] مگر تقسیم کی تکلیف رفع کرنے کے لیے اپنے ہی خاندان میں شادی کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ”جس نے کسی وارث کی میراث کو ختم کیا یا قطع کیا، روز قیامت اللہ تعالیٰ اس کی جنت کی وراثت ختم کر دے گا۔“^[۳]

[۱] فقہ حضرت عمرؓ از: ڈاکٹر محمد رواں قلعہ جی، اردو ترجمہ: ساجد الرحمن صدیقی، ص 28

[۲] گنتی باب 27، نمبر 7

[۳] ابن ماجہ، بیہقی فی شعب الایمان

16

دِيَّةُ الْمَرْأَةِ عَلَى نِصْفٍ مِّنْ دِيَّةِ الرَّجُلِ

(الحديث)

عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔

(السُّنَنُ الْكُبْرَى لِلْبَيْهَقِيِّ ج 8: صفحہ 95)

اسلام میں عورت کی نصف دیت

- ❁ مسئلے کی نوعیت
- ❁ احادیث نبویؐ
- ❁ آثار صحابہؓ
- ❁ اجماع امت
- ❁ ثلث دیت کے بعد عورت کی نصف دیت
- ❁ دور جدید کے نامور علماء کی آراء
- ❁ نصف دیت کی حکمت
- ❁ نصف دیت کے مسئلے میں دو لوگوں کا اختلاف
- ❁ مغالطہ انگیزیاں اور ان کا جواب
- ❁ امام طحاوی کا مسلک
- ❁ ابوالولید باجی کا نظریہ
- ❁ شاہ ولی اللہ دہلویؒ
- ❁ طاہر القادری کی ایک اور مغالطہ انگیزی
- ❁ ایک اور شبہ
- ❁ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم کا لیکچر
- ❁ وکلاء حضرات سے شکایت
- ❁ عورت کی حق تلفی کا خوف
- ❁ ایک اشکال کا حل

اسلام میں عورت کی نصف دیّت

اسلام نے قتل خطا میں (یعنی ناحق کسی کی جان لینے میں) یا کسی انسان کو کوئی جسمانی نقصان پہنچانے پر جو مالی معاوضہ رکھا ہے اسے عربی میں دیّت کہا جاتا ہے اور فارسی میں خون بہا۔ اسلام کے قانون دیّت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں عورت کی دیّت مرد کی دیّت سے نصف رکھی گئی ہے۔ اس طرح عورت کو کمتر اور حقیر قرار دیا گیا ہے اور عورت و مرد میں فرق کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ آج کل چند ایک نام نہاد علماء، وکلاء نے اس مسئلہ کو اختلافی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہذا تفصیل بیان کی جا رہی ہے:

مسئلے کی نوعیت:

قتل کی دو قسمیں ہیں: (1) قتلِ عمد (2) قتلِ خطا

قتلِ عمد (یعنی کسی کو جان بوجھ کر اراداً قتل کرنے) کی سزا قصاص (جان کا بدلہ جان) ہے، چاہے مقتول مرد ہے یا عورت، اس کی سزا میں مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں۔ قتلِ خطا (جس میں قتل کرنے والے کا ارادہ شامل نہ ہو مثلاً گاڑی کے نیچے آخر خاتون ہلاک ہوگئی، اس میں ڈرائیور کا ارادہ شامل نہ تھا)، کی سزا قتل نہیں بلکہ دیّت ہے جو اونٹوں یا نقدی کی شکل میں ادا کی جاتی ہے۔ مسئلہ عورت کی دیّت کا ہے جو کہ مرد کے مقابلے میں آدھی ہوتی ہے۔

شرعی دلائل:

قتلِ خطا کی صورت میں مرد و عورت کے درمیان یہ فرق کیوں؟ اس کی وجہ درج ذیل شرعی دلائل ہیں، جو احادیث، آثارِ صحابہؓ اور اجماع امت پر مشتمل ہیں:

1- حضرت عمرو بن حزم کا مکتوب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عمرو بن

حزمؒ انصاری کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو یمن میں اپنے حکام شرجیلؒ اور حارثؒ کے نام ایک مکتوب ارسال فرمایا، جس میں بہت سے مسائل درج تھے۔ اسی خط کے آخر میں یہ ارشاد نبویؐ بھی تھا: **دِيَّةُ الْمَرْأَةِ عَلَى نِصْفٍ مِنْ دِيَّةِ الرَّجُلِ** [۱]

2- سب سے بڑی دلیل تو سنن نسائی کی حدیث ہے۔ ”ثُلُثُ تِكْ مَرْدٍ وَعَوْرَتُ كِي دِيَّتْ بَرَابَرْ“ ہے۔ اس کے بعد عورت کی دیت نصف ہے۔“ سنداً یہ روایت بالکل صحیح ہے۔ [۲] یہی حدیث عورت کی دیت کے سلسلہ میں اصل ماخذ سمجھی جاتی ہے۔

3- سنن کبریٰ بیہقی کی ایک روایت ہے: **دِيَّةُ الْمَرْأَةِ عَلَى نِصْفٍ مِنْ دِيَّةِ الرَّجُلِ** [۳] عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔ یہ حدیث معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے۔ امام بیہقی نے یہ حدیث دو سندوں سے بیان کی ہے اور دوسری سند میں امام بیہقی نے کچھ ضعف کی نشاندہی کی ہے۔ جبکہ اس کی پہلی سند کو خود انہوں نے صحیح کہا ہے۔ لیکن دو وجوہ سے یہ حدیث اپنے ضعف کے باوجود قابل استدلال ہے:

(i) سنن نسائی کی مذکورہ بالا صحیح حدیث اور حضرت عمرو بن حزمؒ کا مکتوب، جس کو ماہرین فن حدیث نے درست قرار دیا ہے۔ [۴]

لہذا اصول حدیث کی رو سے بیہقی کی یہ ضعیف روایت بھی باوجود اپنے ضعف کے قابل قبول ہے کیونکہ اس سے مندرجہ بالا دونوں صحیح حدیثوں کی تائید ہو رہی ہے۔

(ii) پھر آثار صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں سے بھی اس حدیث کی تائید ہوتی ہے:

آثار صحابہؓ:

امام ابن شہاب زہریؒ، مکحولؒ اور عطاءؒ (تابعین) سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے شہری علاقوں کے لوگوں پر سواونٹ کی قیمت ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار درہم مقرر کی تھی جبکہ شہری علاقوں

[۱] المغنی لابن قدامہ، ج ۸، صفحہ 402

[۲] سنن نسائی، کتاب القَوْدِ، باب عقل المرأة

[۳] ج ۸، صفحہ 95

[۴] ملاحظہ ہو: التَّعْلِيْقَاتُ السَّلَفِيَّةُ عَلَى سُنَنِ النَّسَائِي، ج 2، صفحہ 247

کی آزاد مسلمان عورت کی دیت پانچ سو دینار یا چھ ہزار درہم مقرر کی تھی اور اگر عورت کا قاتل دیہاتی ہوتا (جن کے پاس نقد رقم نہیں ہوتی تھی) تو پھر اس کی دیت 50 اونٹ مقرر کر دی تھی۔ [۱]

خلیفۃ الرسول حضرت عمرؓ نے جب یہ حکم صادر فرمایا کہ عورت کی دیت نصف یا پچاس اونٹ ہے تو کسی صحابیؓ نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ اس طرح وہ گویا دورِ فاروقیؓ کا ایک متفق علیہ قانون بن گیا۔

2- ابراہیم نخعی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں نے کہا ہے کہ عورت کے قتل نفس اور زخموں کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔ [۲]

اجماع امت:

آج تک ہر دور میں ہر مسلک کے اہل علم یہ قول نقل کرتے چلے آئے ہیں کہ امت کا اس مسئلے پر اجماع ہے۔ ایسا اجماع جسے تمام فقہاء اجماع قرار دیں، حجت شرعی بن جاتا ہے۔ مثلاً:

1- امام المفسرین ابن جریر طبری تحریر فرماتے ہیں: ”جن لوگوں کی بات کا اعتبار ہے وہ اس پر متفق ہیں کہ مومن عورت کی دیت مومن مرد کی دیت کا نصف ہے۔“ [۳]

2- اسی طرح امام فخر الدین الرازی ”التفسیر الکبیر، ج 10، صفحہ 233 پر لکھتے ہیں: ”اکثر فقہاء کا یہ مذہب ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔ (البتہ اصم اور ابن علیہ کا قول ہے کہ عورت کی دیت بھی مرد ہی کی مثل ہے) فقہاء کرام کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے نصف دیت کا ہی فیصلہ فرمایا تھا، چونکہ عورت کی میراث اور شہادت مرد کے مقابلے میں نصف ہے، ایسی ہی بات دیت کی ہے جبکہ امام اصم کی دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے: ”جس نے مومن کو خطا سے قتل کر دیا تو وہ ایک غلام آزاد کرے اور ساتھ ”دیہ مسلمہ“ کہا ہے یعنی اس کے اہل کو دیت ادا کرے۔“ پس عورت کی دیت مرد کے برابر واجب ہے۔“ [۴]

[۱] کتاب الاہم، از: امام شافعی، ج 6، صفحہ 106، سنن کبریٰ، از: بیہقی، ج 8، صفحہ 95

[۲] سنن کبریٰ، از: بیہقی، ج 8، صفحہ 96

[۳] تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج 4، صفحہ 137

[۴] امام اصم اور ابن علیہ کے موقف کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

3- امام ابن جوزی فرماتے ہیں: ”آزاد مسلمان عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔“ [۱]

4- ابن رشد: ”رہا عورت کی دیت کا مسئلہ تو علماء اس پر متفق ہیں کہ عورت کی دیت قتل مرد کی دیت سے آدھی ہے۔“ [۲]

5- علامہ شوکانی بھی اپنی شہرہ آفاق کتاب نیل الاوطار میں لکھتے ہیں: ”اس بات پر سب کا اجماع ہے۔“ [۳]

یہ تو تھا مفسرین کا نقطہ نظر، اب ائمہ اربعہ کا مسلک ملاحظہ کیجیے:

6- ائمہ اربعہ بھی عورت کی نصف دیت ہی کے قائل ہیں۔ امام شافعی لکھتے ہیں: ”مجھے قدیم اور جدید دور کے اہل علم میں سے ایک عالم بھی ایسا معلوم نہیں ہے جس نے عورت کی نصف دیت کے بارے میں اختلاف کیا ہو۔“ [۴]

ثالث دیت کے بعد عورت کی نصف دیت:

جہور کا اصولاً اس بات پر اتفاق ہے کہ قتل کی صورت میں عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے، مگر زخموں کی دیت کی تفصیلات میں ان کے درمیان کچھ اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک ایک تہائی دیت تک مرد و عورت کی دیت یکساں ہے۔ البتہ ایک تہائی کے بعد عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہو جائے گی۔ وہ اس کی دلیل سنن بیہقی کی عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ والی حدیث دیتے ہیں: ”عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے یہاں تک کہ اس کی دیت ایک ثلث کو پہنچ جائے۔“ اور اہل مدینہ کا تعامل بھی اسی روایت پر تھا۔

اس کے برعکس فقہاء احناف عورت کی مطلق نصف دیت کے قائل ہیں۔ امام شافعی پہلے

[۱] زاد المسیر، ج 2، صفحہ 164

[۲] بدایۃ المجتہد، ج 2، صفحہ 315

[۳] نیل الاوطار، ج 7، صفحہ 227

[۴] کتاب الام، از: امام شافعی، ج 6، صفحہ 106

امام مالک کی طرح تہائی تک برابر پھر اس کے بعد عورت کی نصف دیت کے قائل تھے، بعد میں وہ بھی احناف کی طرح مطلق نصف دیت کے قائل ہو گئے۔

الْمُخْتَصَر: جمہور کا اصولاً اس بات پر تو اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے (مگر زخموں کی تفصیلات میں ان کے درمیان کچھ اختلاف ہے، جس کی وضاحت کتب فقہ سے دیکھی جاسکتی ہے)۔

عالم عرب کے جدید نامور علماء کی نظر میں عورت کی دیت کا مسئلہ:

دور جدید میں مصر کے نامور عالم عبدالقادر عودہ شہید جن کے ٹھوس اور بے لاگ عدالتی فیصلوں کی ساری اسلامی دنیا میں دھوم رہی ہے، وہ بھی اپنی کتاب التَّشْرِيعُ الْجِنَائِيّ الْأِسْلَامِيّ (اسلام کا فوجداری قانون) ج 2، صفحہ 182 پر دیت کے موضوع پر مفصل کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فقہائے امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قتل میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہوگی۔ ان کی دلیل وہ تحریر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزمؓ کو لکھ کر دی تھی کہ ”عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہوگی۔“ اس مقدار پر تمام صحابہؓ کا اجماع ہے۔ تین خلفائے راشدین حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور صحابہ کبار میں سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہوگی اور کوئی ایک بھی ایسا قول منقول نہیں ہے جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ کسی صحابی نے اس بارے میں اختلاف کیا ہو، لہذا یہ قول اجماع کہلائے گا۔ نیز جس طرح عورت وراثت اور شہادت میں مرد کے مقابلے میں نصف نصاب کی حقدار ہوتی ہے، اسی طرح اس کی دیت بھی آدھی ہوگی۔“

اس وقت عالم عرب میں اسلامی قانون پر جسے سند کا درجہ حاصل ہے وہ اردن کے نامور فقیہ احمد الخضری ہیں، جوازھر یونیورسٹی، اردن یونیورسٹی اور امام محمد بن سعود یونیورسٹی (ریاض) میں اسلامی قانون اور غیر اسلامی قانون کے تقابلی مقابلہ کے پروفیسر ہیں۔ وہ اپنی کتاب ”اسلامی فقہ میں

قصاص، دیت اور مسلح بغاوت کے احکام“ میں عورت کی دیت کے بارے میں لکھتے ہیں: ”حنابلہ کا قول ہے کہ آزاد مسلمان عورت کی دیت آزاد مسلمان مرد کی دیت کا نصف ہے۔ ابن المنذر اور ابن عبد البر کہتے ہیں کہ اہل علم کا اجماع ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہوگی۔“ [۱]

سعودی عرب میں بھی اس وقت یہی قانون جاری ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سارے عالم اسلام کا یہی قانون ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے سوائے لیبیا کے، جس کا صدر کرنل معمر القذافی ہے۔ اپنی مخصوص افتاد طبع اور مذہب اباضی کی جانب مائل ہونے کی وجہ سے (جو خوارج اور معتزلہ کے مذہب کے قریب تر ہے) انہوں نے سارے عالم اسلام کے علی الرغم اہم اور ابن علیہ کی رائے کو اختیار کیا کہ عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر قرار دی گئی ہے۔ مگر لیبیا میں بھی اس کو پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی، وہاں تا حال انگریزی قانون ہی رائج ہے۔

نصف دیت کی حکمت:

1- صرف اسلام ہی عورت کے قتل کو اہمیت دیتا ہے:

جہاں تک انسانی شرف و وقار کا معاملہ ہے اسلام میں مرد و عورت کے مابین کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اسلام ہی وہ پہلا دین ہے جس نے معاشرے میں عورت کو عزت عطا کی، اس کو تحفظ دیا، اس کے مقام و منصب کا اعتراف کیا، یہی وجہ ہے کہ تمام جاہلی معاشروں کے برعکس عورت کے قتل کی صورت میں اس کا باقاعدہ قصاص دلایا۔ اگر اس کو کوئی مرد قتل کر دے تو بدلے میں وہ مرد قتل کیا جائے گا۔ جبکہ دوسرے معاشروں میں عورت کے قتل کو کوئی خاص بات سمجھا ہی نہیں جاتا۔ (تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں) مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام اس مساوات مرد و زن کا ہرگز قائل نہیں جو اس وقت جدید تہذیب کا تحفہ ہے۔ اس لیے تکریم انسانیت کا مفہوم اسلام اور مغربی تہذیب دونوں میں مختلف ہے۔ بعض چیزیں اسلام کے نزدیک عین

[۱] صفحہ 710، احمد الحضری کی عربی کتاب "القصاص والدیات والعصیان المسلح فی الفقہ

عزت اور وقار کی علامتیں شمار ہوتی ہیں مگر مغرب ان پر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور جس چیز کو مغرب عورت کی آزادی اور اس کا حق قرار دیتا ہے وہ ممکن ہے کہ اسلام کے نزدیک تذلیل نسوانیت پر مبنی ہو، مثلاً احکامِ ستر و حجاب کہ مسلمان عورت کے لیے یہ اس کی عزت اور وقار کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں، مگر مغرب کے نزدیک یہ عورتوں کی قید اور گھٹن کے مترادف ہے۔

معاشی ذمہ داریوں کے لحاظ سے مرد و عورت کا فرق:

اسی طرح اسلام نے مرد و عورت کا فطری دائرہ کار الگ الگ رکھا ہے، جبکہ مغرب بدوش بدوش کے فلسفہ کا قائل ہے اور عورت کو کارخانوں، فیکٹریوں، کلبوں، پارکوں میں غرض ہر جگہ گھسیٹ لایا ہے۔ اسلام عورت کی معاشی ذمہ داری مرد پر ڈالتا ہے۔ جبکہ مغربی عورت اپنی معاش خود کمانے پر مجبور ہے۔ چونکہ اسلام عورت کا پورا معاشی بوجھ مرد پر لادتا ہے لہذا میراث میں مرد کا حصہ عورت کے حصہ سے دو گنا کیا گیا ہے۔ اسی طرح عورت کی نصف دیت میں بھی وہی حکمت پنہاں ہے، جو عورت کی نصف میراث میں ہے۔ مرد کے قتل کیے جانے کی شکل میں ایک پورا خاندان اپنے کفیل سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لیے خاندان کی کفالت کے نقطہ نظر سے اس کی پوری دیت ضروری ہے، جبکہ عورت کے قتل کیے جانے کی شکل میں ایسی مالی دقت پیش نہیں آتی، اس لیے اس کی نصف دیت قطعاً غیر معقول نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں نصف دیت مقرر کرنے میں یہ جذبہ کہیں بھی کارفرما نہیں ہے کہ عورت نصف انسان ہے، یا وہ حقیر ہے۔ اس حکم میں معاشی پہلو مد نظر رکھا گیا ہے نہ کہ عورت کو نعوذ باللہ، حقیر سمجھنا۔

اگرچہ حالات بدل گئے ہیں اور کچھ عورتیں معاشی تنگ و دو میں شامل ہونے لگی ہیں، مگر پھر بھی بطور اصول، میراث میں عورت کا حصہ آدھا ہی رہے گا اور عورت کی دیت نصف ہی رہے گی کیونکہ اصول سب کے لیے ہوتا ہے۔ جہاں کوئی استثنائی صورت حال ہو اس کے لیے فیصلہ بھی استثنائی ہو سکتا ہے، جس کی وضاحت باب کے آخر میں دی جا رہی ہے۔

عورت کی نصف دیت کے ضمن میں دو لوگوں کا اختلاف:

پوری اسلامی تاریخ میں (یعنی 1400 سالہ دور میں) عورت کی دیت کا مسئلہ متفق علیہ رہا

ہے۔ ”صرف دو لوگوں کا اختلاف منقول ہے۔ جسے فقہاء نے شاذ قرار دیا ہے۔“ [۱]

یہ دو شخص کون ہیں؟ ابن قدامہ مقدسی نے ان کا نام الاصم اور ابن علیہ تحریر کیا ہے۔ لہذا ان دونوں کا حال بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

ابو بکر الاصم:

یہ اصم جس کا اصل نام عبدالرحمن بن کیسان ہے، اس کے متعلق لسان المیزان، صفحہ 427، ج 3 میں لکھا ہے کہ وہ معتزلی تھا اور ایک عجیب و غریب تفسیر کا مصنف تھا اور حافظ ذہبی نے اپنی کتاب ”سَيَرُ أَعْلَامِ النُّبَلَاءِ“ میں الاصم کے نام کے تحت ابو بکر الاصم ہی کا ذکر کیا ہے اور اسے شیخ المعتزلہ کہا ہے۔ [۲]

ابن علیہ:

ابن علیہ کے نام سے دو شخص مشہور ہیں: اسماعیل بن علیہ اور ابراہیم بن علیہ۔ یہ دونوں باپ بیٹے ہیں مگر اسماعیل بن علیہ کا شمار محدثین میں ہوتا ہے جبکہ ان کے بیٹے ابراہیم بن علیہ کا ذکر اصحاب تراجم نے اچھے انداز میں نہیں کیا۔ یہ الاصم کا شاگرد تھا، معتزلی تھا اور خلقِ قرآن کا قائل تھا۔ امام شافعی نے اس کے بارے میں کہا ہے: ضَالَّ يُضِلُّ النَّاسَ خود بھی گمراہ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا۔ [۳]

یہ دونوں شخص یعنی الاصم اور ابراہیم بن علیہ تاریخ میں اتنے گمنام ہیں کہ خود 90% علماء کو بھی ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ ان کی بات کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے! ایک طرف احادیث، آثارِ ائمہ مجتہدین، شیعہ حضرات سب کا متفقہ فیصلہ ہو کہ عورت کی دیت نصف ہے، ان کے مقابلے میں ایسے دو بد عقیدہ افراد کی رائے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

[۱] المغنی لابن قدامہ، ج 9، صفحہ 532

[۲] ج 9، صفحہ 402

[۳] تاریخ بغداد للخطیب، ج 6، صفحہ 22-20

یہ بھی اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ عورت کی نصف دیت کا ذکر کسی مستند یا معروف کتاب حدیث میں نہیں ہے اور یہ اعتراض اٹھانے والے عموماً وہ لوگ ہیں جو ایک طرف تو خود قرآن کریم ناظرہ پڑھنا بھی نہیں جانتے اور علم حدیث سے بالکل کورے ہیں۔ وہ علم حدیث کی اصطلاحات کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیا نسائی صحاح ستہ میں شمار نہیں ہوتی؟ حالانکہ نسائی کی حدیث ہی عورت کی نصف دیت کا اولین ماخذ ہے۔ پھر یہ نسائی کی روایت محدثین کے نزدیک بالاتفاق سند اور متن دونوں لحاظ سے صحیح قرار دی گئی ہے۔ جہاں تک بیہقی کی روایت کا تعلق ہے، اگرچہ اس کی سند میں کچھ ضعف ہے، مگر عمرو بن حزم انصاریؒ کی حدیث اور نسائی کی حدیث اس کی تائید کر رہی ہے، اس لیے اسے محدثین نے اختیار کر لیا ہے۔ یعنی اسے متلقی بالقبول کا درجہ حاصل ہے۔

عورت کی نصف دیت کے سلسلے میں ایک اور مغالطہ انگیزی یوں پیدا کی گئی ہے کہ امام طحاوی، ابوالولید باجی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی عبارات میں سے سیاق و سباق سے ہٹ کر چند عبارتیں نکال کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی عورت کی دیت اور مرد کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔^[۱]

[۱] اپریل 1984ء میں پاکستان میں قانون قصاص و دیت کا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تو چند وکلاء اور مغرب زدہ خواتین نے خوب ہنگامہ کیا۔ ان کا منشا یہ تھا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ قصاص میں عورت کی گواہی قبول ہو اور عورت کی دیت بھی مرد کے برابر ہو جائے، اس سلسلے میں کراچی کے وکیل خالد اسحاق نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے الٹے سیدھے دلائل پیش کیے جو عورت کی نصف دیت کے متفق علیہ مسئلہ کو شکوک و شبہات کی نظر کر دیں۔ بعد میں لاہور کے طاہر القادری صاحب نے بھی اخباروں میں اس نوعیت کے مضمون دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ واقعی قتل خطا میں عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے۔ حالانکہ خود طاہر القادری صاحب کا یہ حال ہے کہ حدیث فہمی سے بالکل نااہل بلکہ قرآن کی آیت کا بھی غلط ترجمہ کر کے اپنا مطلوب ثابت کر رہے تھے۔ اصل میں یہ دونوں صاحب یعنی خالد اسحاق اور طاہر القادری انگریزی قانون کے پروردہ ہیں اور انگریزی قانون یہی کہتا ہے کہ مرد و عورت دونوں کی دیت ایک جیسی ہونی چاہیے۔ وہ بار بار ”لسان المیزان“ اور ”نیل الاوطار“ کے حوالے دے کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ عورت کی نصف دیت والی حدیثوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، جبکہ ان کی اہمیت دلائل سے واضح کی جا چکی ہے۔

امام طحاوی:

ان بزرگ اماموں کی طرف جو بات منسوب کی گئی ہے، وہ دراصل ایک حدیث ہے جو سنن ابی داؤد، ج 2، صفحہ 267 پر اور السنن الکبریٰ للبیہقی کی ج 8، صفحہ 29 پر موجود ہے: ”الْمُؤْمِنُونَ تَتَكَافَوُ دِمَاءَهُمْ“ (یعنی مومنوں کے خون آپس میں برابر ہیں) اس حدیث کی وضاحت میں امام طحاوی تحریر فرماتے ہیں: ”ہم نے نبی پاکؐ کے فرمان الْمُؤْمِنُونَ تَتَكَافَوُ دِمَاءَهُمْ کے مفہوم پر غور کیا اور تمام اہل علم کو اس کی تشریح پر متفق پایا کہ یہ حدیث قصاص و دیت میں برابری کے لیے ہے۔ یہ حدیث اس بات کی نفی کرتی ہے کہ اونچے درجے کے شخص کو نیچے درجے کے شخص پر کوئی فضیلت ملے۔ اس میں اہل جاہلیت کے اس طرز عمل کی تردید ہے کہ وہ اونچے درجے کے آدمی کو نیچے درجے والے شخص کے مقابلے میں قتل نہ کرتے تھے۔ اس سے ہم نے یہ بھی سمجھا کہ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا، جس طرح عورت کو مرد کے بدلے میں قتل کیا جاتا ہے۔“ [۱]

امام طحاوی تو وضاحت کر رہے ہیں کہ نبی پاکؐ کے اس فرمان کا اصل مقصد اہل جاہلیت کے اس طرز عمل کی تردید کرنا ہے کہ وہ قصاص و دیت کے سلسلے میں اونچ نیچ، بڑے چھوٹے، عورت اور مرد میں فرق کرتے تھے۔ اونچے اور بڑے کو چھوٹے اور نیچے آدمی کے بدلے میں قتل نہیں کرتے تھے، اسی طرح عورت کے بدلے میں مرد کو قتل نہیں کرتے تھے (گویا دور جاہلیت کے امتیازات کی اس حدیث سے نفی کی گئی ہے)

اس طرح امام طحاوی کا یہ قول قصاص و دیت کے وجوب کے بارے میں ہے نہ کہ مقدار دیت کے بارے میں۔ امام طحاوی کی اسی عبارت کو آگے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کتاب أَشْعَثُ اللَّعَّاتِ میں بیان کیا ہے۔

اسی طرح ابوالولید باجی کی ایک عبارت جو ان کی کتاب الْمُنتَفَى، ج 7، صفحہ 78 پر ہے، وہاں وہ عورت کی دیت کے بارے میں بیان کرتے ہیں، اس جگہ کاتب کی غلطی سے آئٹھا

عَلَى دِيَّةِ الرَّجُلِ فِي الْقَلِيلِ وَالْكَثِيرِ میں ”علی“ اور ”دیتۃ الرجل“ کے درمیان ”النصف من“ کے الفاظ کتابت ہونے سے رہ گئے اور مطلب کچھ کا کچھ بن گیا۔ جسے طاہر القادری صاحب نے اپنے موقف کے حق میں استعمال کر لیا، حالانکہ اس کا اصل مفہوم یوں ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے ایک کمزور سند کے ساتھ یہ اختلافی روایت بھی ہے کہ قلیل و کثیر میں عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے۔ کاتب کی غلطی سے اس جملہ کا مطلب بالکل بدل گیا۔ حالانکہ سیاق و سباق سارا عورت کی نصف دیت کا مضمون بیان کر رہا ہے۔ لہذا اس قول سے حیلہ پر ویزی سے کام لیتے ہوئے حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ کی طرف دیت میں جو مرد و عورت کی برابری کی بات منسوب کی گئی ہے، وہ بالکل بے بنیاد ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کی طرف جو بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ دیت میں مرد و عورت کی برابری کے قائل ہیں وہ بھی بے بنیاد ہے، وہ بھی اپنی کتاب الْمُسَوَّى مِنْ أَحَادِيثِ الْمُؤَطَّلَا، ج 2، صفحہ 271 میں لکھتے ہیں: ”میں کہتا ہوں کہ امام مالک کا مسلک یہی ہے کہ ایک تہائی تک برابر اور بعد میں نصف دیت اور اکثر اہل علم کا مسلک یہی ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے اور عورت کے اعضاء اور زخموں کی دیت بھی مرد کی دیت سے آدھی ہے۔“ [۱]

طاہر القادری صاحب نے عورت کی نصف دیت کے بارے میں ایک اور مغالطہ انگیزی خود قرآنی آیت سے پیدا کی ہے۔ سورۃ النساء، آیت 92 میں قتل خطا کی جو دیت بیان ہوئی ہے، اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ”یہ آیت دیت کی مقدار کا تعین کر رہی ہے۔“ کہ یہ آیت خود کہہ رہی ہے وَدِيَّةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ پھر وہ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ”معروف دیت مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی“ اور چونکہ قرآن کی کوئی آیت یا کوئی صحیح حدیث عورت کی نصف دیت کا تعین نہیں کرتی، لہذا عورت کی معروف دیت بھی وہی ہے جو مرد کی ہے۔ اس طرح دونوں کی دیت برابر ہے۔“

طاہر القادری صاحب کا یہ جواز جتنا بودا اور کمزور ہے اس سے ہر وہ شخص واقف ہے، جو

[۱] بحوالہ ترجمان القرآن جون 1984ء

عربی زبان سے تھوڑا بہت بھی واقف ہو۔ یہ آیت وجوب دیت کو ثابت کرتی ہے نہ کہ مقدار دیت کو۔ اصل آیت یوں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحَرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَّةٌ مُسْلِمَةٌ
إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا﴾ [۱]

”جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس پر ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا واجب ہے اور دیت بھی (واجب ہے) جو اس کے خاندان والوں کے حوالے کر دی جائے گی مگر یہ کہ وہ لوگ اس دیت کو معاف کر دیں۔“

دوسرا مغالطہ یہاں لفظ مسلمہ کا ترجمہ: ”حوالہ شدہ یا سپرد کردہ“ ہے جو الی اہلہ کے الفاظ کے ساتھ مل کر اپنے پورے معانی دے رہا ہے۔ مگر انہوں نے ”مسلمہ“ کا ترجمہ ”معروف“، ”سالم“، ”پوری“ کر کے مرد و عورت کی دیت میں مساوات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بہت بڑی علمی خیانت ہے۔ حالانکہ قدیم و جدید تمام مفسرین نے مسلمہ کا ترجمہ مَوَدَّۃً اِلٰی اہلہ کیا ہے یعنی اس کے گھر والوں کے حوالے کر دی جائے گی۔

ایک اور شبہ اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ چونکہ قتلِ عمد میں قصاص کا حکم ہے اور قصاص مرد و عورت کا یکساں ہے، لیکن اگر مقتول کے وارث معاف کر دیں تو جس طرح مرد کی دیت ادا کی جائے گی اسی مقدار میں عورت کی بھی دیت ادا کی جائے گی، لہذا مرد و عورت کی دیت یکساں ہے۔ یہ ایک اور مغالطہ ہے جو قصاص کی مثال دے کر پیدا کیا گیا ہے۔

جواب: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم جو شام کے ایک نامور عالم دین اور ماہر قانون تھے، انہوں نے 1962ء میں دمشق یونیورسٹی میں ”فقہ اسلامی اور جدید قانون میں عورت کی حیثیت“ کے موضوع پر ایک طویل لیکچر دیا، جس میں بے شمار مردوں اور عورتوں نے شرکت کی۔ اس میں عورت کی دیت پر بات کرتے ہوئے فرمایا:

”دیت کا اصل اور گہرا تعلق اس نقصان سے ہے جو کسی مرد یا عورت کے قتل ہو جانے پر

دارثوں کو لاحق ہوتا ہے۔ قتل عمد میں قاتل پر قصاص لاگو ہوتا ہے، خواہ مقتول مرد ہو یا عورت اور خواہ قاتل مرد ہو یا عورت۔ قصاص میں ہم ایک انسان کا دوسرے انسان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں اور انسانیت میں مرد و عورت دونوں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ رہا قتلِ خطا یا قتلِ شبہ عمد تو یہاں بدلے میں انسانی جان لینے کا سوال نہیں ہے، بلکہ صرف یہ سوال ہے کہ جو ذات قتل ہو گئی ہے اس کے ورثاء کو مالی معاوضہ دلایا جائے۔ مالی معاوضہ لگاتے وقت ہمیشہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس حد تک مالی نقصان ہوا ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایک مرد کے قتل ہو جانے میں خاندان کو اتنا مالی نقصان پہنچتا ہے جتنا کہ ایک عورت کے قتل پر پہنچ سکتا ہے؟ جن بچوں کا باپ غلطی سے مارا گیا ہے یا جس عورت کا خاوند قتل خطا کی نذر ہو گیا ہے وہ دراصل اخلاق اور معنوی سہارے کے ساتھ ساتھ اپنے اس بنیادی مالی سہارے سے بھی محروم ہو گئے ہیں جو ان کا مالی بوجھ اٹھائے ہوئے تھا اور جن کی معاش کے لیے وہ ہمہ تن کوشاں رہتا تھا، لیکن اگر بچوں کی ماں قتل ہو گئی ہے یا مرد کی بیوی ماری گئی ہے تو وہ مادی سہارے سے نہیں بلکہ ایک اخلاقی آئینی سہارے سے محروم ہوئے ہیں، اس لیے مال اس نقصان کا معاوضہ نہیں بن سکتا۔

دیتِ مقتول کی جان کی قیمت نہیں ہے اور نہ قتلِ خطا کے بدلے میں جان لینا پیش نظر ہے، بلکہ وہ خاندانی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مادی نقصان کی تلافی کی ایک صورت ہے، جو مقتول کے خاندان کو پہنچ چکا ہے۔ یہ ہے عورت کی نصف دیت کا اصل الاصول! پھر خود ہمارے موجودہ قانون میں بھی مقتول کی دیت کی دو حدیں رکھی گئی ہیں۔ ایک حد زیادہ سے زیادہ دوسری کم از کم۔ یہ حدیں صرف اس بنا پر رکھی گئی ہیں کہ مقتول کے خاندان کو لاحق ہونے والے نقصان کے تحت مالی معاوضہ مقرر کیا جاسکے۔ انسانوں میں تفاوت ہوتا ہے، ایک وہ انسان ہے جو محنت و مشقت کرتا ہے اور قانوناً اپنے خاندان کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو محنت و مشقت نہیں کرتا اور نہ کسی کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہے۔ بلکہ وہ خود دوسروں کی طرف سے نان و نفقہ کا محتاج ہوتا ہے۔ کیا ان دونوں قسم کے انسانوں کو مالی معاوضہ میں یکساں رکھا جائے گا.....؟ [۱]

ان تمام وضاحتوں سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سارے عالم اسلام میں عورت کی دیت کے متعلق مسلم علماء، قانون دان اور ججوں کی رائے ایک ہی رہی ہے۔ ماسوا ایک آدھا ایسے ملک کے جہاں اسلام سے انحراف کی زد چل رہی ہو۔^[۱]

تحریف کرنے کا نقصان:

جدید دور کے بعض حضرات کا یہ رائے دینا کہ مرد و عورت کی دیت برابر ہونی چاہیے، مسلمہ و مشفقہ مسائل کے خلاف ہے۔ ایسی رائے کے اظہار سے امت مسلمہ کو نہ فائدہ پہنچے گا اور نہ امت کا اجتماعی ضمیر اسے قبول کرے گا، البتہ مغرب زدگی کے مریض حضرات کی ہمت افزائی ضرور ہوگی۔ مگر بات صرف دیت میں مرد و عورت کی مساوات کی نہیں ہے، یہ تو عورتوں کی وراثت، شہادت ہر بات میں مساوات کی ہے۔ پھر آگے بڑھ کر حجاب و ستر کے احکام بھی بدلیں گے، دین باز بچہ اطفال بن جائے گا۔ اور پھر صرف سیکولر ازم ہی رہ جائے گا۔ جس کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے آج مغربی عورت تذلیلِ نسوانیت کے آخری دہانے تک پہنچ چکی ہے۔ کیا ایسے قوانین سے پھر پوری شریعت اسلامی نہ بدلے گی!

ہمیں اس سارے قضیے میں شکایت مغرب زدہ خواتین سے نہیں بلکہ ان وکلاء حضرات سے ہے جو ذاتی مفاد اور خواہشات کی خاطر ان کو بے راہرو کرتے ہیں۔ پھر بھی ہمارے لیے یہ بات باعثِ اطمینان ہے کہ ملک کی کروڑوں خواتین نصف دیت پر مطمئن ہیں۔ مغرب زدہ خواتین کو زیادہ درد محسوس ہوتا ہے تو وہ مغرب میں ہی جا کر بس جائیں۔ کیونکہ اسلام کے خلاف قانون سازی اگر کر بھی لی جائے تو عام امت اس کو علماء کے موقف کے برعکس سمجھتے ہوئے قبول نہ کرے گی، ایوب خاں کے عائلی قوانین کا، یا پرویز مشرف کی حدود و قوانین میں ترمیم کا، حشر سب کے سامنے ہے۔

انگریزی قانون میں تو گواہ کا سچا اور عادل ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ ہمارے قانون دان حضرات اور وکیل چونکہ اسی انگریزی قانون کے عادی ہوتے ہیں، لہذا انہیں عورت سے

[۱] ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ جون ۱۹۸۴ء، مضمون: ”عورت کی دیت شرعی دلائل کی روشنی میں۔“

متعلق وراثت، دیت اور شہادت کے قانون غیر مانوس سے لگتے ہیں۔ وہ اپنی وکیلانہ مہارتوں سے ان میں کمی بیشی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی سند کی کمزوری کا بہانہ بنا کر ایک صحیح حدیث کو چھوڑ دیا، کہیں غلط سیاق و سباق سے اپنا من پسند مفہوم نکال لیا

۔ دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت

ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسارہ

عورت کی نصف دیت کا نقصان اس کے ورثاء کو ہے یا خود عورت کو؟

خالد اسحاق صاحب کو ایک اور بھی خدشہ لاحق ہے کہ عورت کی نصف دیت پر اصرار کرنے کی وجہ سے عورتوں کے اندر شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے۔ مگر یہ بات بھی غلط ہے۔ نصف دیت سے آخر عورت کی کیا حق تلفی ہو رہی ہے؟ اس کو غلطی سے قتل کرنے کی صورت میں جو دیت ملے گی وہ تو اُس کے ورثاء بھائی والدین خاوند وغیرہ کو ملے گی۔ آخر خود عورت کا اس میں کیا نقصان ہے یا اس کی بے حرمتی کا اس میں کیا جواز ہے؟ اس طرح نصف دیت ملنے کا نقصان اس کو تو نہیں بلکہ اس کے ورثاء کو ہوگا۔ اس کے برعکس مرد مقتول کی دیت اگر عورت سے دو گنی ہے، تو اس کا فائدہ مقتول کی بیوہ یا والدین بھائی کو پہنچے گا۔ اس لحاظ سے غور کیا جائے تو عورتوں میں شکوک و شبہات مسئلہ میراث کی وجہ سے پیدا ہو سکتے ہیں، مسئلہ دیت کی وجہ سے نہیں کہ دیت تو ورثاء کو ملنی ہوتی ہے اور خود عورت کے قتل اور زندگی کے بعد ملنی ہوتی ہے اور الحمد للہ! مسلمان خواتین نصف وراثت کی حکمت و مصلحت کو سمجھتی ہیں۔ پھر مغرب زدہ خواتین کو نصف میراث کے سلسلے میں جو جواب دیا جائے گا وہی جواب نصف دیت کے بارے میں بھی ہوگا۔

ایک اشکال کا حل:

”آج کل بہت سی خواتین بڑھ چڑھ کر مردوں کی طرح معاشی سرگرمیوں میں حصہ لے

رہی ہیں۔ لہذا امانے والی عورتوں کی دیت بھی مرد کے برابر ہونا چاہیے۔“

جواب: پہلی گزارش یہ ہے کہ عورتوں کا مردوں کے دوش بدوش معاشی تنگ و دو میں حصہ لینا اسلام میں مطلوب ہے نہ پسندیدہ، اس لیے اس خلاف اسلام اقدام کی وجہ سے اسلام اپنے ایک مسلمہ

اصول میں تبدیلی کیونکر گوارا کر سکتا ہے!

پھر عورتوں کی اکثریت شوقیہ ملازمت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ملازمت پیشہ خواتین اپنے بچے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں، پھر وہ اپنی تنخواہ سے خاندان کی کفالت نہیں کرتیں بلکہ اپنے نئے فیشن، بیش قیمت ملبوسات اور سامانِ آرائش و زیبائش وغیرہ پر خرچ کر ڈالتی ہیں۔ یہ ساری چیزیں تو معاشرے میں فساد و بگاڑ کا باعث ہیں، ایسی چیزوں کی اسلام کیونکر حوصلہ افزائی کرے گا؟

ہاں! چند خواتین ضرور ایسی ہو سکتی ہیں، جو واقعی کسی حقیقی مجبوری کی بنا پر ملازمت کرتی ہیں اور وہ اپنے خاندان کی کفیل ہیں۔ خاندان کا سارا مالی بوجھ انہی کے کندھوں پر ہے۔ اگر کوئی ایسی خاتون قتلِ خطا کی زد میں آ جاتی ہے تو ایسی عورتوں کے بارے میں قاضی کو اختیار دیا جاسکتا ہے کہ وہ نصف دینیت کے علاوہ حالات و ضروریات کے مطابق مزید رقم بطور تعزیر قاتل سے وصول کر کے متاثرہ خاندان کی دادرسی کرے۔ لیکن اسلام کا یہ اصول پھر بھی اپنی جگہ ناقابلِ تغیر رہے گا اور ہے کہ عورت چونکہ معاشی ذمہ داریوں سے آزاد ہے لہذا دینیت میں وہ مرد کے مساوی نہیں اور اسلام کا یہ اصول کسی تحقیر پر مبنی نہیں ہے، بلکہ بیان کردہ حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اسلام تو عورت کو گھر کی ملکہ بناتا ہے جبکہ مغربی ذہن اسے معاش کا کل پرزہ بناتا ہے، اسلام اس کو چراغِ خانہ بناتا ہے، مغرب اسے شمعِ محفل بناتا ہے، اسلام اسے صرف خاوند کی خدمت کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر مغرب اسے ایئر ہوسٹس، ”ماڈل گرل“، ”ریسپشن گرل“ اور ایکٹرس کی شکل میں ہر ہوس کار کا خدمت گار بناتا ہے۔ مسلمان عورت جس رستے پر چل نکلی ہے وہ قطعاً اس کی عزت کا راستہ نہیں، بلکہ اس کی تحقیر کا سامان ہے۔ اس میں اسلام سے بھی بغاوت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اسلام ان کی مساوی دینیت یا مساوی وراثت کے غیر فطری مطالبہ اور باغیانہ روش کی کیونکر حمایت کر سکتا ہے!

17

لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَوْ أَمَرَهُمْ امْرَأَةٌ (فرمان نبوی)

”وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو اپنے معاملات

(کی ذمہ داری) کسی عورت کے سپرد کر دے۔“

(صحیح بخاری، کتاب المغازی حدیث: 4163)

اسلام اور عورت کی سربراہی

- ✽ عورت کی قیادت اور سابقہ مذاہب
- ✽ ہندومت
- ✽ یہودیت
- ✽ عیسائیت
- ✽ اسلام کا نکتہ نظر
- ✽ قرآن پاک کے احکام
- ✽ احادیث نبویؐ
- ✽ سنت الہی
- ✽ نماز کی امامت
- ✽ اسلام میں سربراہ مملکت کی ذمہ داریاں
- ✽ عورت یہ بار نہیں اٹھا سکتی
- ✽ عورت کی نفسیات
- ✽ اجماع امت
- ✽ علامہ ماوردی کی رائے
- ✽ امام الحرمین جوینی، امام بغوی وغیرہم
- ✽ دور حاضر کے چند فتوے
- ✽ اسلامی ممالک کے دساتیر میں سربراہ
- ✽ حکومت کے لیے مرد ہونا لازم ہے
- ✽ پاکستان کے دستور کی رو سے عورت کی
- ✽ سربراہی جائز نہیں
- ✽ بے نظیر بھٹو کا سربراہ مملکت بننا
- ✽ مخالفانہ شبہات اور ان کا تجزیہ
- ✽ ارشاد احمد حقانی کا حدیث لن یفلح... الخ پر
- ✽ اعتراض
- ✽ مرد و زن کی مساوات کا اصول
- ✽ کیا حدیث کی سند کمزور ہے؟
- ✽ یہ اعتراض کہ دور نبویؐ میں کوئی عورت فارس کی
- ✽ حکمران نہیں بنی
- ✽ تاریخ کے سٹیج پر حکمران بننے والی غیر مسلم خواتین کی
- ✽ کارگزاری
- ✽ چند مسلمان خواتین کی حکمرانی کو سند جواز بنانا
- ✽ ملکہ بلقیس کی حکمرانی کو سند جواز بنانا
- ✽ ام ورقہؓ والی روایت سے استدلال
- ✽ خلافت سے متعلق عام آیات کو سند جواز بنانا
- ✽ جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شرکت سے استدلال
- ✽ مولانا اشرف علی تھانوی کے فتوے سے استدلال
- ✽ غزوات میں صحابیاتؓ کی شرکت سے استدلال
- ✽ فاطمہ جناح کی نامزدگی سے استدلال
- ✽ اسمبلیوں کی رکنیت سے استدلال
- ✽ علمائے کرام نے عورت کی حکمرانی کے جواز کا کبھی
- ✽ فتویٰ نہیں دیا
- ✽ بے نظیر کی ناکامی

اسلام میں عورت کی سربراہی

عورت کی سربراہی سے متعلق اسلام کا نکتہ نظر پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں سابقہ مذاہب کا نکتہ نظر بھی پیش کیا جائے:

عورت کی قیادت اور سابقہ مذاہب:

سابقہ مذاہب کی رو سے عورت اپنی اندرون خانہ کی ذمہ داریوں کی بنا پر بیرون خانہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے معذور ہے۔ اس سلسلہ میں ہندو، یہودی اور عیسائیوں کی مذہبی کتب کے احکامات درج ذیل ہیں:

ہندومت:

ہندوؤں کی مذہبی کتب کی رو سے عورت کے لیے ملک کی قیادت کا خواب دیکھنا بھی ممکن نہیں، مثلاً: ”عورتوں کا وجود صرف اس لیے ہے کہ بچے جنیں، ان کی پرورش کریں اور ہر روز خانہ داری کے کام میں مصروف رہیں۔“^[۱]

”اگر کسی بیوی کو اپنے شوہر کی طرف سے جائیداد ملتی ہے، تو اسے جائیداد کی بیع و فروخت کا کوئی اختیار نہیں۔“^[۲] پھر اولاد زینہ نہ ہو تو بھی بیٹی وارث نہیں بن سکتی بلکہ مُتَنَبِی (جو غیر کا بیٹا ہوتا ہے) وہ وارث ہوگا۔“^[۳]

[۱] منوسمیتی، نواں باب، اشلوک 27

[۲] اتھرووید کا نڈا، سواکت، 17 منتر 1

[۳] منوسمیتی

”کسی عورت کو خاوند سے حکومت نہیں مل سکتی۔“ [۱]

ان حالات میں عورت کے لیے معاشرتی و سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے، انتخابی مہموں کے لیے وقت نکالنے، اخراجات برداشت کرنے، الیکشن لڑنے اور سیاسی ذمہ داریاں تفویض کیے جانے یا ان کو نبھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

یہودیت:

یہودی کتب مقدمہ میں عورت کے بارے میں یہ احکام درج ہیں: ”ہر ماہ کا نصف حصہ ناپاک ہونے کی وجہ سے عورت بستی سے باہر رہے گی اور بھر شٹ رہے گی۔ مذہبی راہنما کے کفارہ دینے کے بعد ہی معمول کی زندگی گزار سکے گی۔ احکام زچگی یہ ہیں کہ لڑکا ہونے کی صورت میں 40 دن اور لڑکی ہونے کی صورت میں 80 دن عورت ناپاک رہے گی۔ بعد ازاں کاہن اس کی طرف سے کفارہ ادا کرے گا تو پاک ہوگی اور ڈیرے میں آ سکے گی۔“

یہودی روایات کے مطابق ”شیطان نے جنت میں پہلے حضرت حوا کو بہکایا۔ انہوں نے خود بھی ممنوعہ پھل کھایا اور پھر حضرت آدم کو بھی کھلایا، لہذا بارگاہ ایزدی سے عورت کو اس پر سزا ملی۔ بائبل کے الفاظ یہ ہیں: ”میں تیرے درد حمل کو بہت بڑھاؤں گا، تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔“ [۲]

الغرض عورت نسوانی کمزوریوں اور ان کی بنا پر عاید شدہ پابندیوں کی وجہ سے حکومتی ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہل نہیں۔ پھر مذہبی لحاظ سے مرد کی محکوم ہونے کی وجہ سے بھی وہ حکومتی بار اٹھانے کے لیے نا اہل ہے۔

عیسائیت:

بائبل بھی اسی طرح عورت کی معاشرتی یا سیاسی ذمہ داریوں کو پسند نہیں کرتی۔ چنانچہ حکم

[۱] اٹھارہویں کانڈا، سواکت 17، منتر 1

[۲] کتاب پیدائش، باب 3، آیت 16

ہے: ”مرد کو اپنا سر نہ ڈھانکنا چاہیے کیونکہ وہ خدا کی صورت اور اس کا جلال ہے۔ مگر عورت مرد کا جلال ہے، اس لیے کہ مرد عورت سے نہیں بلکہ عورت مرد سے ہے اور مرد عورت کے لیے نہیں بلکہ عورت مرد کے لیے پیدا کی گئی ہے، پس فرشتوں کے سبب سے عورت کو چاہیے کہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔“ [۱]

”عورتیں کلیسا کے مجمع میں خاموش رہیں، کیونکہ انہیں بولنے کی اجازت نہیں بلکہ تابع رہیں۔ جیسے تورات میں بھی لکھا ہے اور اگر کچھ سیکھنا چاہیں تو گھر میں اپنے شوہر سے پوچھیں، کیونکہ عورت کا کلیسا کے مجمع میں بولنا شرم کی بات ہے۔“ [۲]

مزید حکم ہے: ”اے بیویو! جیسا کہ خداوند میں مناسب ہے اپنے شوہروں کے تابع

رہو۔“ [۳]

جس مذہب کی رو سے مذہبی احکام بھی عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی سے نہیں پوچھ سکتی، اسے سیاسی جلسوں و جلوسوں میں شرکت، غیر مردوں سے بے باکانہ گفت و شنید اور اسمبلیوں میں خطابات کی آزادی کہاں ہو سکتی ہے؟

حاصل کلام یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب عورت کی قیادت و سیادت کی اجازت نہیں دیتے اور اس کی تمام تر ذمہ داریوں کو گھر، بچوں اور شوہر تک محدود قرار دیتے ہیں۔

اسلام کا نکتہ نظر:

اسلام کی رو سے بھی عورت کو سربراہ مملکت بنانا جائز نہیں۔ قرآن و سنت کے واضح احکامات کے پیش نظر عورت کسی اسلامی ریاست کی سربراہ نہیں ہو سکتی۔ اسلام دین فطرت ہے، اس نے مرد و عورت کی جداگانہ فطری صلاحیتوں کا اعتبار کیا ہے، ان دونوں کا الگ الگ دائرہ عمل

[۱] کرنتھیوں 7:11-10

[۲] ایضاً آیت 15:34-35

[۳] اکلوسیوں 3:18

تجویز کیا ہے تاکہ دونوں اپنے اپنے مقصدِ تخلیق کو بطریقِ احسن پورا کر سکیں۔ عورت کی سربراہی اس فطری نظام کے برعکس ہے۔ لہذا تجربہ جہاں بھی ہوگا ناکامی سے دوچار ہوگا۔ علامہ اقبال کی ایک تحریر ملاحظہ ہو: ”عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ ان فرائض میں اختلاف ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف کچھ اور وجوہ پر مبنی ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں۔ تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔“ [۱]

اصل بات تو فطری صلاحیتوں اور اس کے مطابق الگ الگ فرائض کی ہے۔ ان فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر یک گونہ برتری حاصل ہے۔ جس کو صرف اسلام ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب نے تسلیم کیا ہے۔

1- قرآنِ پاک کے احکام:

﴿الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ ۚ﴾ [۲]

”مرد عورتوں کے سربراہ ہیں، اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔“

عربی زبان میں قَوَّام منتظم اور نگران کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ قَوَّامیت کا منصب مرد کو عطا کیا ہے، اگرچہ اس آیت کا تعلق خانگی معاملات سے ہے۔ مگر اسے صرف خانگی امور تک محدود رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر گھر کی چھوٹی سی ریاست کی سربراہی بھی عورت کو نہیں دی گئی، تو گھروں کے مجموعے کے وسیع دائرے یعنی پوری اسلامی ریاست کی سربراہی کا منصب اسے کیسے دیا جاسکتا ہے! پھر مرد کے سربراہ ہونے کی وجہ بھی یہاں

[۱] زندہ رود، حصہ سوم، صفحہ 358

[۲] النساء: 34

بیان کر دی گئی ہے کہ عورت کو سربراہ نہ بنانا اس کی کوئی حق تلفی یا تحقیر نہیں ہے۔ بلکہ یہ تفاوت صلاحیتوں اور تقسیم کار کی بنا پر ہے۔ ایک طرف تو مرد کی ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی صلاحیتیں عورت سے زیادہ ہیں، جو اس کے فرائض اور دائرہ کار کے لحاظ سے ضروری ہیں، دوسرا سبب یہ ہے کہ وہ عورت کے نان نفقہ کا ذمہ دار اور کفیل ہے۔

2- مرد کی قنوتِ امت اور صلاحیتوں کا ذکر سورہ بقرہ، آیت نمبر 228 میں اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾

”اور عورتوں کے بھی معروف طریقے کے مطابق ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں، البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے اور اللہ غالب، حکمت والا ہے۔“

اس آیت میں ایک طرف تو قدیم جاہلانہ تصور کی تردید کی گئی ہے، جس کے مطابق عورتوں کا کام صرف مردوں کی خدمت کرنا تھا اور ان کا کوئی حق نہ ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دونوں کے حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی۔ مگر مرد کو عورت سے ایک درجہ زائد حاصل ہے۔ یہ زائد درجہ انتظامی امور ہی سے تعلق رکھتا ہے، کہ مرد کو گھر کی سربراہی کی ذمہ داری دی گئی ہے اور عورت کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کیا گیا ہے۔ جب عورت گھر کی چھوٹی سی ریاست کی سربراہ نہیں بن سکتی تو پوری ریاست کی ذمہ داری وہ کیسے نبھاہ سکتی ہے!

3- اللہ تعالیٰ نے جب طالوت کو بنی اسرائیل کا امیر مقرر فرمایا تو امیر مقرر کرنے کی وجہ قرآن پاک میں یہ بتائی گئی:

﴿وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ﴾ [۱]

”اللہ نے اسے علم اور جسم میں زیادہ (فراوانی) عطا فرمائی ہے۔“

اس سے ثابت ہوا کہ حکمران اور سربراہ مملکت کے لیے علمی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں

کی وافر موجودگی از حد ضروری ہے۔ یہ اس کی اہلیت کی شرائط میں شامل ہے۔ جبکہ صنفِ نازک کی نسوانی و جسمانی کمزوری تو سب کو معلوم ہے اور عقلی طور پر مردوں سے کم ہونا بھی ارشادِ رسولؐ سے ثابت ہے۔^[۱]

تو پھر عورت ریاست کی سربراہی کی ذمہ داریاں کس طرح پوری کر سکتی ہے! علاوہ ازیں جو معاشرے مساوات مرد و زن کے مدعی ہیں وہ بھی گھر میں عورت کو سربراہ خاندان تسلیم نہیں کرتے۔ وہاں بھی ہر جگہ مرد ہی کو سربراہ خاندان سمجھا جاتا ہے۔

سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے عورت کے دائرہ کار اور میدانِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾^[۲]

”اور اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھہری رہو اور پہلے کے دورِ جاہلیت کی طرح بن سنور کر گھر سے باہر نہ نکلو۔“

اس آیت سے بھی واضح ہے کہ عورت کا اصل دائرہ کار اور ذمہ داری اس کے گھر کی ذمہ داری ہے۔ بیرونی تمام ذمہ داریوں سے شریعت نے اسے سبکدوش کر دیا ہے، صرف خاص حالات میں وہ گھر سے باہر نکل سکتی ہے اور وہ بھی پردے کی پابندی کے ساتھ۔ اس آیت کی بہترین وضاحت خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک سے ہوتی ہے:

وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَى أَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهَا وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ^[۳]

”عورت شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد پر نگران ہے اور اس سے ان کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔“

[۱] یہ حدیث ”گھر کی سربراہی“ اور ”عورت اور مسئلہ شہادت“ میں دو جگہ بیان کی جا چکی ہے۔

[۲] الاحزاب: 33

[۳] صحیح بخاری، کتاب الجمعہ

گویا عورت کی اصل ذمہ داری قرآن و سنت کی رو سے امور خانہ داری کو انجام دینا ہے نہ کہ بیرون خانہ سیاسی سرگرمیاں۔ حکومت اور سربراہی کے تقاضے تو مندرجہ بالا قرآنی احکام کو توڑے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔ پردہ، مخلوط مجالس سے اجتناب، محرم کے بغیر سفر کی ممانعت وغیرہ سب ایسے احکام ہیں جو عورت کے لیے نظام مملکت چلانا ناجائز بنا دیتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ عورت باہر کی جدوجہد سے یکسو ہو کر اپنے گھر کی اصلاح اور اپنے گھرانے کی تربیت کا فریضہ انجام دے، جو درحقیقت پوری قوم اور پورے معاشرے کی بنیاد ہے۔ لہذا باہر کی کوئی ذمہ داری بطور اصول اس کو نہیں سونپی جاسکتی۔

2- احادیث نبویہ:

1- حضرت ابی بکرؓ کی مندرجہ ذیل حدیث اس سلسلے میں نص شمار ہوتی ہے، جو بخاری میں وارد ہوئی ہے:

لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَوْ اَمَرَهُمْ امْرَأَةٌ^[۱]
 ”وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جو اپنے معاملات کی ذمہ داری کسی عورت کے سپرد کر دے۔“

اس حدیث کی رو سے عورت کی حکمرانی ملت کے لیے تباہی و بربادی کا پیغام ہے نہ کہ فلاح و کامرانی کا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی عائشہؓ یا اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا، نہ صحابہ کرامؓ نے ان میں سے کسی کو سربراہی کے لیے منتخب کیا۔ حالانکہ ان دونوں خواتین کا امت مسلمہ میں بڑا مرتبہ و مقام ہے۔ علم و دانش، تقویٰ و دیانت، عفت و پاکدامنی میں وہ حقیقی معنوں میں بے نظیر تھیں۔ حضرت عائشہؓ تمام مسلمانوں کی والدہ محترمہ تھیں تو حضرت فاطمہؓ خواتین جنت کی سردار ہونے کی بنا پر گر انقدر مرتبہ کی حامل تھیں۔ مگر نہ خود انہوں نے اپنے آپ کو سربراہی کے لیے پیش کیا نہ صحابہ کرامؓ نے ان کا انتخاب کیا۔

2- ایک حدیث میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک

[۱] بخاری، کتاب المغازی

نشانی یہ ہے کہ اجتماعی معاملات عورتوں کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت زندگی موت سے بدتر ہوگی۔

أُمُورُكُمْ إِلَى نِسَائِكُمْ فَبَطْنُ الْأَرْضِ خَيْرٌ لَّكُمْ مِنْ ظَهْرِهَا ۝^[۱]
 ”(جب) تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد کر دیئے جائیں گے تو پھر
 تمہارے لیے زمین کا پیٹ اس کی پشت سے بہتر ہوگا۔“

مراد یہ ہے کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ خاتون کو وزیراعظم یا سربراہ مملکت بنالیا جائے تو ایسی صورت میں ذلت کی اس زندگی کو اطمینان سے نہ گزارو بلکہ اس کو بدلنے کے لیے جدوجہد کرو۔ اس فتنے سے اپنے آپ کو بچاؤ اور قوم کو بھی اس سے بچانے کی فکر کرو۔

3- عَنْ أَبِي بَكْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلَكَتِ
 الرِّجَالُ حِينَ أَطَاعَتِ النِّسَاءَ ۝^[۲]
 ”ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”مرد جب

عورتوں کی اطاعت کریں تو وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔“

اس حدیث کا مقصد بھی عورتوں کی حکمرانی کی ممانعت ہے۔ جہاں تک خواتین کے اچھے مشوروں کا تعلق ہے، ان پر عمل کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ خواتین کے مشوروں پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض اوقات عمل کیا ہے اور خلفائے راشدینؓ نے بھی خواتین کے بعض مشوروں کو قبول اور اختیار کیا ہے۔

4- لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ تَمْلِكُ رَأْيُهُمْ امْرَأَةً ۝ ”جابر بن سمرہؓ سے مروی ہے کہ نبی پاکؐ
 نے فرمایا: ”وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی جن کی سوچ پر عورت کی حکمرانی ہو۔“ ۝^[۳]

5- وہ تمام قرآنی آیات و احادیث بھی عورت کی حکمرانی کے ناجائز ہونے کی دلیل ہیں جن

[۱] سنن ترمذی، ابواب الفتن

[۲] مستدرک حاکم

[۳] مجمع الزوائد، از: حافظ نور الدین بیہقی، صفحہ 209

میں عورتوں کو بغیر ضرورت کے گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا گیا ہے اور ضرورت کے وقت گھر سے نکلنے وقت پردے کی شرائط موجود ہیں، پھر وہ محرم کے بغیر اکیلے سفر بھی نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ حج اور عمرہ کا سفر بھی محرم کے بغیر ممنوع قرار دیا گیا ہے، مخلوط مجالس اور آزادانہ میل ملاپ سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک کا انتظام چلانے کے ساتھ ان حدود کی پابندی نہیں ہو سکتی اور ان کو توڑے بغیر کوئی بھی خاتون سربراہ کی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتی۔ اس لیے وہ نہ وزیر اعظم بن سکتی ہے نہ صدر مملکت۔

3- سنتِ الہی:

سربراہی اور قیادت کے اصل مستحق تو انبیاء کرامؑ تھے۔ ان کی تربیت باری تعالیٰ نے خود براہِ راست کی تھی۔ انبیاء کے بعد پھر قیادت اور امارت کا مستحق وہی شخص بن سکتا ہے جو ان انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کا پابند ہو اور حکومت کا پورا کاروبار انہی کے احکامات کے مطابق چلاتا ہو۔ اس روئے زمین پر پہلا حکمران حضرت آدمؑ تھے، جو نبی بھی تھے اور مرد بھی تھے۔ نبیوں کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَسَلُّوا أَهْلَ
الدِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾^[1]

”اور آپ سے پہلے جو لوگ (نبی بنا کر) بھیجے گئے تھے وہ مرد ہی تو تھے۔ ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی تھی۔ پس پوچھ لو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔“

یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اس نے مردوں کو ہی پیغامبر بنایا اور کسی عورت کو کبھی پیغمبر نہیں بنایا گیا۔ اللہ کی یہ سنت کبھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اسلامی حکومت کا سربراہ تو رسول کا نائب ہوتا ہے اور نبی کے احکام کے مطابق ہی کاروبار حکومت چلاتا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ کوئی عورت اسلامی حکومت کی سربراہ نہیں ہو سکتی۔ اسی سنتِ الہی کے مطابق نہ صرف اسلام بلکہ یہودیت، عیسائیت، ہندومت غرض ہر مذہب میں عورت کی سربراہی ناجائز قرار دی گئی ہے۔

4- نماز کی امامت:

اسلام میں حکومت کی سربراہی اور نماز کی امامت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح نماز پڑھنے والے کو امام کہا جاتا ہے، اسی طرح سربراہ حکومت کو بھی امام کہا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں بہت سے مقامات پر سربراہ حکومت کو لفظ ”امام“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ علماء و فقہاء امامت کے دونوں معانی (یعنی حکومت کی سربراہی اور نماز کی امامت) میں اس طرح فرق کرتے ہیں کہ نماز کی امامت کو ”امامت صغریٰ“ اور حکومت کی سربراہی کو ”امامت کبریٰ“ کہتے ہیں۔ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت نماز میں مردوں کی امامت نہیں کر سکتی۔ جب وہ چھوٹے درجے کی امامت کی اہل نہیں ہے، تو پھر وہ بڑے درجے کی امامت یعنی حکومت کی سربراہی کی اہل کیسے ہو سکتی ہے! اسلام میں نماز کا حکومت کی سربراہی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ فقہاء اسلام لکھتے ہیں کہ حکومت کا سربراہ وہی ہونا چاہیے جو نماز کی امامت کی اہلیت رکھتا ہو۔ امامت کبریٰ (حکمرانی) اور امامت صغریٰ (نماز کی امامت) کی شرائط اہلیت یکساں ہیں۔ مذہب و سیاست کی جدائی کا تصور تو سیکولر ذہنوں کی پیداوار ہے وگرنہ دین اسلام میں دینی قیادت (نماز) کی جو شرائط ہیں وہی سیاسی قیادت (حکمرانی) کے لیے بھی ہیں۔ عورت جب نماز کی امامت کی اہل نہیں ہے تو سیاسی قیادت اور حکمرانی کی بھی اہل نہیں ہے۔ امامت کبریٰ کو امامت صغریٰ (نماز کی امامت) پر قیاس کرنے کی ایک مضبوط دلیل یہ بھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت میں نماز کی امامت کے لیے صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابو بکرؓ کو آگے بڑھایا تھا تو اس سے صحابہ کرامؓ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آپؐ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد امامت کبریٰ کے بھی سب سے زیادہ اہل ہیں۔

الغرض اسلام میں کسی ایسے سربراہ حکومت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جو کسی بھی حالت میں نماز کی امامت کا اہل نہ ہو۔ عورت خواہ تقویٰ و طہارت کے کتنے بلند مقام پر فائز ہو، وہ چونکہ نماز میں مردوں کی امامت نہیں کر سکتی لہذا امامت کبریٰ یا حکومت کی سربراہی کی ذمہ داری بھی اس کو نہیں دی جاسکتی۔

اسلام میں سربراہِ مملکت کی ذمہ داریاں:

قرآن و سنت کی رو سے اسلامی سربراہ کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ وہ محض قانونی سربراہ نہیں ہے بلکہ وہ اصلاً ملکی معاملات میں ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

الْإِمَامُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَأْيٌ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ^[۱]
 ”امام جو لوگوں کا سربراہ ہے وہ رائی اور نگران ہے، اس سے اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔“

اسلامی مملکت کے سربراہ کے فرائض میں یہ بات شامل ہے:
 ﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا
 الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾^[۲]
 ”یہی وہ لوگ ہیں اگر ہم انہیں زمین پر اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔“

غرض اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ شریعت کے احکام مملکت میں جاری و ساری کرے۔ اللہ کی حدود قائم کرے، دشمنوں سے ملک کی حفاظت کرے۔ نماز و زکوٰۃ کا پورا نظام قائم کرے۔ نیکی کی اشاعت کرے۔ تبلیغ و نصیحت کا حق ادا کرے۔ مملکت میں برائیوں کا قلع قمع کرے۔ مالیات کا نظم قائم کرے۔ بغاوت اور بد امنی کو روکے، ہر حال میں عدل و انصاف قائم کرے۔ غریبوں، معذوروں، ناداروں اور لاوارثوں کے مسائل حل کرے اور دوسری طرف امور خارجہ کو بحسن و خوبی ادا کر سکے۔ اتنی بھاری ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے تو انتہائی مستعد، باہوش اور صاحب تدبیر شخص ہونا چاہیے۔ جو ایک طرف فہم و فراست رکھتا ہو، دوسری طرف رعب و دبدبے کا مالک بھی ہو، مضبوط اعصاب کا مالک اور صاحبِ عزم و استقامت ہو۔ علم، تقویٰ، انتظامی

[۱] صحیح بخاری (893) باب الجمعة

[۲] الحج: 41

صلاحیت اور شجاعت کی صفات بھی اس کے اندر موجود ہوں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ تمام صلاحیتیں بیک وقت تو سارے مردوں میں بھی نہیں پائی جاسکتیں، عورت میں تو ان کا پایا جانا اور بھی دشوار ہے۔ پھر سربراہ مملکت کو اپنی رعیت سے رابطہ رکھنا بڑا ضروری ہے۔ لہذا وہ نماز جمعہ، نماز عیدین وغیرہ پڑھائے اور حج میں لوگوں کا امیر ہو۔ تاکہ ہر جگہ لوگ اس سے با آسانی مل سکیں اور وہ خود بھی ان کے حالات سے براہ راست آگاہ ہو سکے۔

عورت یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی:

نبی کریم کا ارشاد مبارک ہے:

الْمَرْأَةُ عَوْرَةٌ فَإِذَا خَرَجَتْ اسْتَشْرَفَهَا الشَّيْطَانُ ^[۱]

”عورت پوشیدہ چیز ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک جھانک میں لگا رہتا ہے۔“

اسی لیے مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ ^[۲]﴾

”اور جب تم ان (عورتوں) سے کوئی چیز طلب کرو تو پردے کے پیچھے سے طلب کرو۔“

اسلام کے وہ بہت سے احکام جن کی بجا آوری باہر نکلنے پر موقوف ہے، عورت کو ان سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے مثلاً:

- 1- نماز جمعہ مردوں پر فرض ہے، مگر عورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ ^[۳]
- 2- عورتوں کو جنازہ کے ساتھ قبرستان تک جانے سے منع کیا گیا ہے۔ ^[۴]

[۱] ترمذی، باب النکاح

[۲] الاحزاب: 53

[۳] سنن ابی داؤد، ابواب النکاح

[۴] صحیح البخاری، باب اتباع النساء الجنائز

- 3- عورت کو تنہا سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے، جب تک اس کا محرم ساتھ نہ ہو۔^[۱]
- 4- حج و عمرہ کے سفر میں بھی وہ محرم کے بغیر نہیں جاسکتی۔ اگر اسے محرم نہ ملے تو اس پر سے حج کی ادائیگی ساقط ہو جاتی ہے۔ مرتے وقت تک محرم نہ ملے تو حج نہ کرے (بلکہ حج بدل کی وصیت کر جائے)۔
- 5- اسی طرح جہاد کا فریضہ بھی (جو گھر سے باہر کا کام ہے) خواتین سے ساقط کر دیا گیا ہے۔
- 6- دور نبویؐ میں خواتین مسجد نبویؐ میں فرض نماز کی ادائیگی کے لیے حاضر ہوا کرتی تھیں۔ نبی پاکؐ نے اگرچہ ان کو مسجد میں باجماعت نماز میں شامل ہونے کی اجازت دے دی تھی (ان کے شوق کے پیش نظر) مگر پھر بھی آپؐ نے ارشاد فرمایا: **وَبُيُوتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ**^[۲] ”ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں۔“ آپؐ نے مزید ارشاد فرمایا: ”عورت کا کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ اور اندرونی کمرے میں نماز پڑھنا بیرونی کمرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔“^[۳] پھر اگر نماز باجماعت میں شامل ہوں تو مردوں کے پیچھے آخری صف میں کھڑی ہوتی تھیں اور جمعہ اور عیدین کے موقع پر خطبوں میں شامل ہوں، تب بھی ان کی نشست گاہ مردوں سے بالکل الگ تھلگ ہوتی تھی۔
- اب غور کرنے کی بات ہے کہ جس دین نے عورت کے تقدس اور اس کی حرمت کا اتنا اہتمام کیا ہے کہ دین کے بعض اہم ترین شعائر سے اس کو مستثنیٰ کر دیا ہے، اس کے بارے میں کیسے کہا جاسکتا ہے کہ وہ پورے ملک کی سربراہی جیسی اہم ترین ذمہ داری اس کو سونپ سکتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں کسی ایسے سربراہ کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے جو:
- ☆ کسی بھی حالت میں نماز کی امامت نہ کرا سکے اور نہ اذان دے سکے۔
- ☆ جس کا باجماعت نماز پڑھنا پسندیدہ نہ سمجھا جائے۔

[۱] جامع الترمذی، کتاب النکاح

[۲] سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ

[۳] سنن ابی داؤد

☆ جو اگر جماعت میں شامل ہو بھی جائے تو اس کو آخری صف میں تمام مردوں کے پیچھے کھڑا ہونا پڑے۔

☆ جس پر ہر ماہ میں چند دن ایسے گزرتے ہوں جب اس کے لیے مسجد میں داخل ہونا بھی جائز نہ ہو اور قرآن پاک کو چھونا بھی جائز نہ ہو۔

☆ جس پر جمعہ فرض نہ ہو۔

☆ جس کے لیے جنازے کے ساتھ جانا جائز نہ ہو۔

☆ جو بغیر محرم کے سفر نہ کر سکے اور راستہ میں بھی اس کو کناروں کے ساتھ ساتھ چلنے کا حکم ہو، وہ درمیان میں نہ چل سکتی ہو۔

☆ جو تنہا حج نہ کر سکے اور خلوت میں کسی سے ملاقات نہ کر سکے۔

☆ جس پر جہاد فرض نہ ہو۔

☆ جس کی گواہی اسلام میں آدھی گواہی شمار ہوتی ہو اور قصاص کے معاملے میں وہ گواہ نہ بن سکتی ہو۔

☆ جس کے لیے بلا ضرورت گھر سے نکلنا جائز نہ ہو۔ حتیٰ کہ انتہائی اہم معاملات میں بھی اس سے گھر کے اندر گواہی طلب کر لی جائے۔

☆ جس کا نان و نفقہ شادی سے پہلے باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر واجب ہو۔

☆ جو کسی کے نکاح میں ولی نہ بن سکے اور نہ وہ گواہ بن سکے۔

☆ اور حد یہ ہے کہ جسے اپنے ہی گھر میں بھی سربراہی کا منصب حاصل نہ ہو۔^[۱]

پس ثابت ہوا کہ اسلامی حدود و معاشرت کی پابندی کرتے ہوئے عورت کے لیے پبلک زندگی گزارنا ممکن ہی نہیں ہے۔ نیز وہ اپنی قوت، صلاحیت، اندازِ فکر، افتادِ طبع، جذبات و احساسات

[۱] قرآن کریم کی رو سے تو عورت گھر کی سربراہ نہیں ہے۔ مگر آزادی نسواں کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس دور میں بھی کوئی ایسا معاشرہ روئے زمین پر ہمارے علم میں نہیں ہے، جہاں شوہر کے ہوتے ہوئے عورت کو سربراہ خاندان قرار دیا گیا ہو۔ (ہفت روزہ الاعتصام 17 تا 24 مارچ 1989ء، صفحہ 23)

کسی بھی پہلو سے سیاست کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر نہیں اٹھا سکتی۔ اسلام نے عورت کے ساتھ نہ تو تعصب برتا ہے نہ کسی قسم کی زیادتی کی ہے۔ اس پر وہی ذمہ داریاں ڈالی ہیں جو وہ آسانی اٹھا سکتی ہو، اور وہ ذمہ داریاں جو اس کی طاقت سے باہر ہیں ان سے سبکدوش کر دیا ہے۔ یہ نا انصافی نہیں عین انصاف ہے۔ یہ زیادتی نہیں بلکہ اس کی فطرت کا لحاظ اور پاس ہے۔

عورت کی نفسیات

جذباتیت:

”جذبات مرد کی زندگی کا فقط ایک جز ہیں مگر عورت کے دل و دماغ پر گہرے، دور رس اور دیر پا اثرات مرتب کرتے ہیں، بلکہ عورت کی ساری زندگی جذبات سے عبارت ہے۔ وہ اس کا سرمایہ حیات ہیں، عورت کی زندگی سے جذباتیت کو نکال دیجیے تو پھر کچھ نہیں بچتا۔

جذبات کی یہ فراوانی عورت کو چند مصلحتوں کی خاطر عطا کی گئی ہے۔ حیاتِ انسانی کی بقا کا ضامن فقط ایک جذبہ ہے اور وہ ہے ممتا۔ یہ خالص نسائی جذبہ ہے۔ ایک خاص عمر تک ماں ہی بچے کی حیاتیاتی اور جذباتی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ وہی اس کے دکھ اٹھاتی ہے۔ باپ کا رول تو کچھ دیر کے بعد ہی بچے کی جذباتی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔

اگر جذبات کی یہ فراوانی عورت کو ودیعت نہ ہوتی تو وہ نوزائیدہ ناتواں جان کبھی پروان نہ چڑھ سکتی۔ اس خیر کثیر سے فطرت نے اسے اسی لیے نوازا ہے۔ محبت، ہمدردی، شفقت، رقتِ قلب اور لطافتِ جذبات اس میں وافر موجود ہیں۔

تاہم دوسری طرف اس کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ عورت ہر معاملے میں عقل کی بجائے جذبات سے کام لیتی ہے۔ ہر کام میں اس کا پہلا ردِ عمل جذبات پر مبنی ہوتا ہے، جس پر اسے بعد میں پچھتانا بھی پڑتا ہے۔ اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ان کو ”سیکنڈ تھاٹ“ یعنی بعد میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی تربیت دی جائے۔

اسی طرح گریہ زاری عورت میں بکثرت موجود ہے۔ اعصابی تناؤ کو کم کرنے میں بلاشبہ

آنسوؤں کا رول بڑا اہم ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو عورت کب کی ٹوٹ پھوٹ چکی ہوتی۔ مردانہ جارحیت سے بچنے، مردوں سے بات منوانے اور انہیں رام کرنے، اکسانے، جوش دلانے یا اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ان کا رول بلاشبہ اہم ہے۔ اس کے برعکس مرد روتے تو نہیں مگر وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں (اکثر خودکشی مرد کرتے ہیں کیونکہ وہ روتے نہیں)۔

بسیار گوئی بھی ان کی خاص بات ہے (اپنے اندر کے جوش کو خارج کرنے کا اہم ذریعہ) مگر اس سے پھر وہ راز افشائی کی مرتکب ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ جو دیکھتی ہیں یا محسوس کرتی ہیں، اس پر فوراً رد عمل ظاہر کرتی ہیں۔ زیادہ باتیں کرنے سے ضروری راز بھی افشا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سراغرساں ایجنسیاں حصول مقاصد کے لیے دشمن قوم کی خواتین سے مراسم کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ وہ جلد ہی مرعوب ہو جاتی ہیں، اس لیے بھی راز افشاں کر دیتی ہیں۔

عدل و انصاف کا فقدان:

ماہرین نفسیات و حیاتیات اس بات پر متفق ہیں کہ خواتین میں کسی ایسے منصب کی اہلیت قدرے کم ہے، جس میں ذہنی توازن و اعتدال کو برقرار رکھتے ہوئے غیر جانبدارانہ انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی ضرورت ہو۔ ہیولاک ایلس، البرٹ اور بعض دوسرے مغربی ماہرین کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اس کی زندگی میں کچھ ایام ایسے آتے ہیں کہ کسی بڑے منصب کی ذمہ داری کا بار اٹھانے یا کوئی اہم جسمانی یا دماغی محنت کرنے کی صلاحیت اس میں نہیں ہوتی۔

آمرانہ مسند اقتدار پر متمکن خواتین کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تمام تر ذہانت و تدبیر کے باوجود ان میں سے بیشتر عالم اضطراب میں کسی جذباتی لہر کے زیر اثر کوئی ایک آدھ عاجلانہ قدم ایسا ضرور اٹھا لیتی ہیں، جو ان کی سابقہ کامیابیوں کو گہنا دیتا ہے۔ مثلاً اندرا گاندھی کا سکھوں کے مقدس مقام پر حملہ، جو بالآخر ان کی اپنی تباہی پر منج ہوا، مبصرین کی رائے میں کچھ ایسا ہی عاجلانہ قدم تھا۔

جہاں خواتین خود تو با اختیار نہ ہوں لیکن کوئی آمر مطلق ان کا تابع فرمان ہو، وہاں اُس کے عاجلانہ اقدامات کی بالعموم وہی محرک ہوا کرتی ہیں۔

ادھر گونا گوں حیاتیاتی، نفسیاتی اور جذباتی عوامل کی بنا پر خواتین میں شہادت یا گواہی کی اہلیت کو بھی ماہرین نفسیات نے محل نظر قرار دیا ہے۔ واقعات کے بیان میں مبالغہ آرائی یا رنگ آمیزی کا رجحان ان میں غالب ہے۔ داخلی اور بیرونی دباؤ کے تحت حقائق سے انحراف اور کذب بیانی کا سرزد ہو جانا بھی بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔^[۱]

اجماع امت:

قرآن و سنت کے مذکورہ بالا دلائل کی بنیاد پر امت مسلمہ میں ہمیشہ اس امر پر اجماع رہا ہے کہ اسلامی حکومت میں عورت حکمران نہیں ہو سکتی۔ (آپؐ کے اس ارشاد کی تعمیل میں تاریخی طور پر بھی کسی بھی مسلم ریاست میں کسی خاتون کو حکمران نہیں بنایا گیا) علامہ ابن حزم نے ”مراتب الاجماع“ کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں ان مسائل کو جمع فرمایا ہے، جن پر امت کا اجماع و اتفاق رہا ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

وَاتَّفَقُوا أَنَّ الْأَمَامَةَ لَا تَجُوزُ لِامْرَأَةٍ^[۲]

”اس بات پر تمام علماء متفق ہیں کہ حکومت کی سربراہی کا منصب کسی عورت کے لیے جائز نہیں ہے۔“

اور علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ”نقد مراتب الاجماع“ میں ان کے اس قول کی تصدیق کی ہے۔

علامہ ماوردی:

اسلامی سیاست میں علامہ ماوردی کی کتاب ”الاحکام السلطانیہ“ اہم ترین ماخذ سمجھی جاتی ہے، اس میں وہ عورت کو سربراہی تو کجا، وزارت کی ذمہ داری دینا بھی ناجائز قرار دیتے ہیں، اس میں وہ وزارت کی دو قسمیں قرار دیتے ہیں۔ ایک وزارت تفویض جس میں پالیسی

[۱] عورت کی نفسیات، باب سوم کے اقتباسات، از: مشہور پامسٹ و نفسیات دان ایم اے ملک

[۲] مراتب الاجماع لابن حزم، صفحہ 129

کا تعین بھی وزیر کا کام ہوتا ہے، دوسری وزارتِ تنفیذ جو پالیسی کا تعین نہیں کرتی بلکہ طے شدہ پالیسی کو نافذ کرتی ہے۔ چنانچہ وزارتِ تنفیذ کے بارے میں وہ تحریر کرتے ہیں:

”جہاں تک وزارتِ تنفیذ کا تعلق ہے، وہ نسبتاً ہلکی ہے اور اس کی شرائط بھی کم ہیں..... لیکن یہ جائز نہیں کہ کوئی عورت اس کی ذمہ دار بنے۔ گو عورت کی خبر مقبول ہے مگر یہ وزارت ایسی ذمہ داریوں پر مشتمل ہے جن سے شریعت نے عورت کو الگ تھلگ رکھا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات کسی عورت کے سپرد کر دیئے۔“ اس لیے کہ اس وزارت کے لیے جو اصابتِ رائے اور اولوالعزمی مطلوب ہے، وہ عورتوں میں کم ہوتی ہے۔ پھر اس وزارت کے فرائض بجالانے میں اس انداز سے لوگوں کے سامنے آنا پڑتا ہے جو عورتوں کے لیے شرعی طور پر ممنوع ہے۔“ [۱]

امام الحرمین علامہ جوینی:

علامہ جوینی جو اسلام کے سیاسی نظام پر ایک سند سمجھے جاتے ہیں، وہ اپنی کتاب ”غِیَاثُ الْأُمَمِ“ صفحہ 82 پر سربراہ حکومت کی شرائط بیان کرتے ہیں: ”جو لازمی صفات سربراہ کے لیے شرعاً معتبر ہیں وہ اس کا مذکر ہونا، آزاد ہونا اور اس کا عاقل و بالغ ہونا بھی ہے اور ان شرائط کو ثابت کرنے کے لیے لمبے چوڑے تفصیلی دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“

یہی امام الحرمین علامہ جوینی اپنی ایک دوسری کتاب ”الْإِرْشَادُ فِي أُصُولِ الْإِعْتِقَادِ“ میں لکھتے ہیں: ”اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ مملکت نہیں بن سکتی۔ اگرچہ اس بات میں اختلاف ہے کہ جن معاملات میں عورت گواہ بن سکتی ہے، کیا ان میں وہ قاضی بھی بن سکتی ہے یا نہیں؟“ [۲]

امام بغوی:

امام بغوی پانچویں صدی کے مشہور مفسر، محدث اور فقیہ ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں: ”اس

[۱] الاحکام السلطانیہ، صفحہ 25 تا 27

[۲] صفحہ 359، 427

بات پر امت کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی، کیونکہ امام کو جہاد کے معاملات انجام دینے اور مسلمانوں کے امور نمٹانے کے لیے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے اور عورت پوشیدہ رہنی چاہیے۔ اس کا مجمع عام میں ظاہر ہونا درست نہیں۔“ [۱]

قاضی ابوبکر ابن عربی، حضرت ابوبکرہؓ کی حدیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں بن سکتی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔“ [۲]

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”سربراہی کی چوتھی شرط مذکور ہونا ہے لہذا کسی عورت کی امامت منعقد نہیں ہوتی، خواہ وہ تمام اوصاف کمال سے متصف ہو اور اس میں استقلال کی تمام صفات پائی جاتی ہوں۔“ [۳]

علامہ تفتازانی اپنی کتاب ”شرح المقاصد“ صفحہ 277، ج 2 میں تحریر کرتے ہیں:

”سربراہ حکومت کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ عاقل و بالغ ہو، آزاد ہو، مذکر ہو اور عادل ہو۔“

اس موضوع پر محدثین اور فقہاء کے یہ چند اقتباسات پیش کیے گئے ہیں، وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ علمائے اسلام نے جس کتاب میں بھی اسلامی سیاست پر روشنی ڈالی ہے، وہاں سربراہ کا ذکر ہونا شرط لازم کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ یہ علماء کے نزدیک اتنی مشہور و معروف بات تھی کہ بعض نے اس کے باقاعدہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی، ورنہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م 1176ھ) تحریر فرماتے ہیں:

”سربراہ حکومت کی شرائطِ اہلیت میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرد ہو عورت نہ ہو، اس لیے کہ عورت کی عقلی قوت ناقص ہے، جنگ و پیکار میں بے کار ہے اور محفلوں میں شرکت کے قابل نہیں ہے، تو اس سے مطلوبہ ذمہ داریاں پوری نہ ہو سکیں گی۔“ [۴]

[۱] شرح النسبة للبغوی، صفحہ 77، ج 10، باب کراہیۃ تولیۃ النساء

[۲] احکام القرآن لابن عربی، صفحہ 1445، ج 3، تفسیر سورۃ النمل

[۳] فضائح الباطنیۃ للغزالی، صفحہ 180

[۴] ازالۃ الخفاء عن خلائۃ الخلفاء، صفحہ 4

مشہور محدث مولانا عبدالرحمن مبارکپوری (م 1353ھ) لکھتے ہیں: ”امام خطابی نے کہا کہ اس حدیث (لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورت سربراہ نہیں بن سکتی۔“ [۱]

مولانا اشرف علی تھانوی (م 1362ھ) لکھتے ہیں: ”ہماری شریعت میں عورت کو حکمران بنانے کی ممانعت ہے۔ پس بقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا، دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کو برقرار بھی رکھا ہو تب بھی شرح محمدی کے خلاف ہوتے ہوئے کوئی حجت نہیں۔“ [۲]

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں: ”عورتوں کے ہاتھ میں عہدہ و منصب دے دینا یہاں تک کہ انہیں پورے ملک کی فرمانبرداری دینا یورپ کی ایجاد نہیں ہے، مشرک قوموں کے ہاں ہر دور میں یہ دستور رہا ہے۔ یہ تو اسلام تھا جس نے آکر بریک لگایا اور اس دستور کو ناجائز قرار دیا۔ صحیح بخاری کی صاف حدیث ہے: لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَوْ أَمَرَهُمْ امْرَأَةٌ۔“ [۳]

مفکر اسلام مولانا مودودی (م 1399ھ) نے سورۃ النساء، آیت 34 اور بخاری کی یہ حدیث کہ ”وہ قوم کبھی کامیاب نہ ہوگی جس نے عورت کو اپنا حکمران بنایا“ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”یہ دونوں نصوص اس بات میں قطعی ہیں کہ مملکت میں ذمہ داری کے مناصب خواہ وہ صدارت ہو یا وزارت، یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا مختلف محکموں کی ادارت، عورتوں کے سپرد نہیں کیے جاسکتے۔ اس لیے کسی اسلامی ریاست کے دستور میں عورتوں کو یہ پوزیشن دینا یا اس کے لیے گنجائش رکھنا نصوص صریحہ کے خلاف ہے اور اطاعت خدا اور رسول کی پابندی قبول کرنے والی ریاست اس خلاف ورزی کی سرے سے مجاز ہی نہیں ہے۔“ [۴]

[۱] تختہ الاحوذی، صفحہ 542، ج 6

[۲] تفسیر بیان القرآن، سورۃ النمل: 23

[۳] تفسیر ماجدی، سورۃ النمل، آیت 23

[۴] اسلامی ریاست، صفحہ 379، صفحہ 506 تا 513

پس ثابت ہوا کہ عورت کو سربراہ بنانا دین اسلام کے اجتماعی نظام کے خلاف بغاوت پر

بنی ہے۔

دورِ حاضر کے چند فتوے:

مصر کی جامع ازہر کی کمیٹی برائے فتویٰ نویسی نے بھی مندرجہ بالا آیات و احادیث کی روشنی میں فتویٰ دیا تھا کہ عورت کو سربراہ حکومت بنانا حرام ہے۔ اس فتوے کا ایک فقرہ یہ ہے: ”اس حدیث (لن یفلح قوم... الخ) کا یہی مفہوم صحابہ کرامؓ اور تمام ائمہ سلف نے لیا ہے کہ عورت سربراہ نہیں بن سکتی۔ انہوں نے اس حکم سے نہ کسی عورت کو مستثنیٰ رکھا ہے نہ کسی قوم کو۔ بلکہ ان سب نے اس حدیث کو اس حکم کی دلیل قرار دیا ہے کہ عورت کو کسی حکومت کا سربراہ بنانا حرام ہے۔“

سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز کا فتویٰ:

کویت کے ہفت روزہ ”المجتمع“ کے پیش کردہ ایک سوال کے جواب میں شیخ عبدالعزیز بن باز لکھتے ہیں: ”عورت کو حکمران بنانا اور حکمرانی کے لیے اسے منتخب کرنا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے اور اس پر قرآن کریم، سنت رسولؐ اور اجماع امت دلیل ہے۔“ [۱]

اسلامی ممالک کے دساتیر میں سربراہ حکومت کے لیے مرد ہونا لازم ہے:

جامعہ ازہر کے قانون کے استاد ڈاکٹر فواد النادی لکھتے ہیں:

”یورپی ممالک کے اکثر دستوروں میں تو مرد اور عورت کو ہر لحاظ سے مساوی قرار دیا گیا ہے اور سربراہ حکومت یا سربراہ ریاست کے لیے مرد ہونا ضروری نہیں قرار دیا گیا مگر مسلمان ممالک میں سے عراق، الجزائر، کویت اور اردن کے دستوروں میں واضح طور پر حکومت کی سربراہی مرد کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے اور تیونس اور شام کے دستوروں کے سیاق و سباق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حکمرانی کے لیے مرد ہونا ضروری ہے۔ (مصر کے بارے میں ڈاکٹر فواد لکھتے ہیں کہ) مصر کے دستور 1971ء میں اگرچہ صریح طور پر اس بارے میں کوئی دفعہ نہیں

رکھی گئی مگر اس دستور کی دفعہ 11 میں کہا گیا ہے کہ شریعت کے احکام کو نقصان پہنچائے بغیر مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہوں گے اور شریعت تو عورت کی حکمرانی کو ناجائز قرار دیتی ہے۔ اس دفعہ 11 سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مصر کا دستور عورت کی سربراہی کو جائز قرار نہیں دیتا۔
ڈاکٹر فواد اپنی اس آئینی بحث کو سمیٹتے ہوئے تحریر کرتے ہیں: ”کسی اسلامی ملک میں حتیٰ کہ وہ اسلامی ملک بھی جن کے آئین سربراہ ریاست کی نامزدگی کے لیے کسی جنس کے ذکر سے خالی ہیں، یہ جائز نہیں ہے کہ عورت ریاست کی سربراہ بن جائے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی ممالک کے عام نظام (دین اسلام) میں از خود شامل ہے۔“ [۱]

(تاہم جدیدیت سے متاثر ہو کر 2007 میں مصر کے مفتی اعظم نے عورت کو سربراہ

مملکت بنانا صحیح قرار دے دیا۔) [۲]

جائزہ: پاکستان کے دستور کی رو سے عورت کی سربراہی جائز نہیں:

1940ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد پاکستان کے لیے دستوری خاکہ مرتب کرنے کے لیے جو کمیٹی قائم کی گئی تھی، اس کی سفارشات میں سربراہ مملکت و حکومت اور دیگر کلیدی مناصب کے لیے مسلمان ہونے کے علاوہ مرد ہونے کی شرط بھی عاید کی گئی تھی، قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی نے تعلیمات اسلامی بورڈ کی تشکیل کی۔ اس نے بھی دستور پاکستان کے لیے اپنی تجاویز میں ”مسلمان مرد“ کی شرط قائم رکھی۔ مختلف مکاتب فکر کے 32 نمائندہ علماء کے جنوری 1951ء میں مرتب کردہ 22 نکات تھے، جو بعد میں قرارداد مقاصد کا حصہ بنے۔ ان 22 نکات کے نکتہ 12 میں سربراہ حکومت کے لیے مسلمان مرد ہونا لازمی قرار دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے 1954ء اور 1956ء کے دستور میں مسلمان مرد کی شرط شامل تھی۔ گویا عورت کی سربراہی کا سرے سے کوئی تصور ہمارے دستور سازوں کے ذہن میں نہ تھا۔ یہ ایک صدیوں پرانی اور مسلمہ روایت تھی۔ اس لیے 1975ء کے دستور میں اس کے صراحتاً

[۱] ”المجمع“ شمارہ 25 اکتوبر 1988ء، صفحہ 17

[۲] روزنامہ نوائے وقت مورخہ 5 فروری 2007ء

ذکر کی طرف کسی کی توجہ نہ جاسکی اور لغت کی زبان میں he کا مفہوم قانون کی زبان میں she تک کے مفہوم کی وسعت اختیار کر گیا۔ اسی کا فائدہ اٹھا کر عورت کی سربراہی کو آئین کے مطابق یا آئین کے منافی نہ ہونے کی سند مہیا کی جا رہی ہے (لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ جس بات کو آپ مغربی قانون کا سہارا لے کر آئین کے مطابق کہیں، تو اس کو پھر شرعی جواز بھی لازماً مہیا کریں اور مطابق شریعت ثابت کرنے پر اصرار کریں.....؟)

اگر 1973ء کے آئین کو سیاق و سباق کی روشنی میں دیکھیں تو وہ بھی عورت کی سربراہی کو ناجائز قرار دیتا ہے..... ملاحظہ فرمائیں:

دفعہ نمبر 2: اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔

دفعہ نمبر 2: الف۔ قرارداد مقاصد کے اصول و احکام کو دستور کا مستقل حصہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی قرارداد مقاصد میں کہا گیا ہے: ”جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصولوں کو، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا۔“ جب اسلام مملکت کا مذہب ہے اور اسلامی اصول مساوات میں وزیراعظم بننے کی اہلیت میں مرد اور عورت دونوں مساوی نہیں ہیں، بلکہ اس منصب کے لیے مرد ہونا لازم ہے تو اس کا مطلب ہے کہ عورت وزیراعظم نہیں بن سکتی اور اگر عورت کو وزیراعظم بنادیا جائے تو دفعہ 2 اور دفعہ 2 الف کی خلاف ورزی لازم ہو جاتی ہے۔

دفعہ 42 کی رو سے صدر اور دفعہ 3/91 کی رو سے وزیراعظم کو اپنے عہدے پر فائز ہوتے وقت جو حلف اٹھانا پڑتا ہے، اس کی عبارت میں مذکر ہی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ وزارت عدل و پارلیمانی امور کی جانب سے دستور کا جو اردو ترجمہ شائع ہوا ہے، اس میں صدر اور وزیراعظم دونوں کے حلف کی عبارت یہ ہے:

”میں صدق دل سے حلف اٹھاتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں اور وحدت و توحید قادر مطلق، اللہ تبارک و تعالیٰ، کتب الہیہ جن میں قرآن پاک خاتم الکتب ہے، نبوت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت خاتم النبیین، جن کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، روز قیامت اور قرآن پاک

اور سنت کی جملہ مقتضیات و تعلیمات پر ایمان رکھتا ہوں۔“ [۱]

اس حلف نامے میں دو جگہ مذکر کا لفظ آیا ہے: ”اٹھاتا ہوں“ اور ”رکھتا ہوں“۔ یہ ترجمہ خود حکومت کے وزارت عدل و پارلیمانی بورڈ کا شائع کردہ ہے۔ اگر دستور سازوں کے ذہن میں یہ بات نہ ہوتی کہ پاکستان کے صدر اور وزیراعظم مرد ہی ہوں گے تو وہ حلف نامے میں مذکر اور مونث دونوں کے صیغے درج کرتے اور اس طرح لکھا جاتا: ”اٹھاتا/ اٹھاتی ہوں اور رکھتا/ رکھتی ہوں۔“ نیز حلف کے الفاظ خود ظاہر کر رہے ہیں کہ دستور 1973ء کے آئین کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی عورت صدر یا وزیراعظم نہیں بن سکتی۔ جب وہ ”قرآن پاک اور سنت کی جملہ مقتضیات و تعلیمات پر ایمان رکھتا ہوں۔“ کا حلف اٹھاتا ہے تو پھر اسلام کا قطعی حکم تو یہ ہے کہ عورت صدر یا وزیراعظم بننے کی اہل نہیں ہے۔ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کا اجماع ہے کہ عورت حکمران نہیں بن سکتی۔ اگر کسی عورت نے یہ حلف اٹھایا ہے تو پھر وہ حلف کا تقاضا پورا کرتے ہوئے صدارت یا وزارت عظمیٰ کے عہدہ کو چھوڑ دے۔ کیونکہ شریعت نے تو اس کو حکمران تسلیم ہی نہیں کیا۔ حلف نامہ کی مخالفت شرعی طور پر کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتی ہے۔ تو گویا عورت نے وزیراعظم بن کر ”اسلامی آئیڈیالوجی کی حفاظت کرنے کے بجائے“ پہلے ہی قدم پر اس کی مخالفت کر دی۔ پھر دستور کی دفعہ 62 اور 63 (اہلیت و نااہلیت) سے بحث کرتی ہیں، انہی دفعات کی رو سے اتنے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والی خاتون کیا آئینی لحاظ سے بھی پاکستان کی وزیراعظم رہ سکتی ہے.....؟ وہ اسمبلی کی ممبر بھی نہیں رہ سکتی، کجا کہ وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہو

لگتی ہے کلی کتنی بھلی شاخ چمن پر
ہاتھوں میں پہنچ کر کوئی قیمت نہیں رہتی
مردوں کے اگر شانہ بشانہ رہے عورت
کچھ اور ہی بن جاتی ہے، عورت نہیں رہتی

بے نظیر بھٹو کا سربراہ مملکت بننا:

1988ء میں ایک خاتون بے نظیر بھٹو کا پاکستان میں وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہونا ایک ایسا افسوسناک سانحہ تھا، جس سے پاکستان کا اسلامی تشخص عالم اسلام میں بہت زیادہ مجروح ہوا۔ عام طور پر پاکستان کو عالم اسلام کا سربراہ اور اسلام کا قلعہ تصور کیا جاتا ہے اور کون نہیں جانتا کہ قیام پاکستان کے موقع پر اسلام ہی کو پاکستان کا بنیادی نظریہ اور مقصد قرار دیا گیا تھا۔ چنانچہ ایسی صورت میں ”اسلام کے قلعہ میں“ اسلام ہی کی کھلی خلاف ورزی یقیناً افسوسناک تھی۔ اسلام کا ایک مسلمہ اصول نہایت بے دردی سے پامال کر دیا گیا تھا۔ کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم نے مسٹر نواز شریف کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بننے پر مبارکبادی، اس موقع پر صحافیوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم بننے پر مبارکباد کیوں نہیں دی؟ تو سردار عبدالقیوم نے کہا: ”میرا ان سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے۔ وہ پاکستان کی وزیراعظم ہیں مگر جس بات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا فعل نہ قرار دیا ہو میں اسے کیونکر اچھا قرار دے سکتا ہوں۔“ [1]

انہی دنوں میں پاکستان کے مولانا صہیب حسن (صدر قرآن سوسائٹی لندن) تبلیغ اسلام کی خاطر جرمنی گئے۔ وہ اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں: ”ترک حضرات کی ایک مسجد میں میرا خطاب رکھا گیا، لیکن خطاب سے قبل میں ایک غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہو گیا، ایک ترک بھائی نے بلند آواز میں کہا: ”آپ لوگ یہاں ہمیں تبلیغ کرنے کیوں آئے ہیں؟ جب کہ آپ کے اپنے ملک میں تبلیغ کی زیادہ ضرورت ہے، جہاں ایک عورت کو حکمرانی کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے۔ یہاں (برلن) کے ایک مقامی اخبار نے پاکستان میں نومبر 1988ء کے انتخابات کے بعد یہ سرخی لگائی تھی:

”خدا کے مقابلے میں ایک عورت کامیاب ہو گئی۔“

صد حیرت ہے کہ کتاب و سنت کے نام پر قائم ہونے والا یہ ملک قرآن و سنت کی تعلیمات سے روگردانی کے باعث کب تک مسلمانوں کی جگہ ہنسائی کا باعث بن رہے گا۔ [2]

[1] روزنامہ جنگ لاہور، 3 دسمبر 1988ء، صفحہ 3

[2] مولانا صہیب حسن کے سفرنامہ برلن سے ایک اقتباس، از: اردو آن لائن، جولائی 1989ء، صفحہ 134

اس پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون! پھر مزید ستم یہ ہوا کہ بے نظیر صاحبہ دوبارہ 1993ء میں پاکستان کی وزیراعظم منتخب ہوئیں اور دونوں دفعہ ہی نااہلی کی بنا پر اپنی مقررہ مدت پوری نہ کر سکیں۔

پاکستان کی عوامی نفسیات:

”قارئین کو غالباً یاد ہوگا کہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے وزیراعظم ہونے اور انتخابات میں کامیاب ہونے سے پہلے میں نے ”نوائے وقت“ کے اسی کالم میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ ”کیا پاکستان کی بے حد مذکور عوامی نفسیات مونث قیادت کی متحمل ہو سکتی ہے؟“ میں نے یہ کوئی فقہی مسئلہ نہیں اٹھایا تھا..... بلکہ خواتین نے پاکستان میں جو معاشرتی زندگی اختیار کر لی ہے اور معاشرے نے اسے جس طرح قبول کر لیا ہے، اس کی وضاحت میں نے اپنے کالم میں کی تھی اور یہی عرض کیا تھا کہ مونث قیادت کے لیے اس مذکور عوامی نفسیات کی جارحیت کا مقابلہ کرنا بہت دشوار ہوگا۔“ [1]

2- عربی اور اردو قواعد کی رو سے وزیر، مشیر اور وزیراعظم سب الفاظ مذکر ہیں اور مردوں ہی کے لیے استعمال ہونے چاہئیں جبکہ عورتوں کے لیے وزیرہ، مشیرہ اور وزیرہ عظمیٰ (وزارت عظمیٰ کی طرح) کے الفاظ بولے جاسکتے ہیں۔ مگر مسئلہ یہی ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی عورت کو اپنی سربراہی کے لیے مردوں کے سہارے کے ساتھ ساتھ مردانہ الفاظ کی بھی ضرورت ہے۔

ایسے دینی و معاشرتی ماحول میں بے نظیر بھٹو اس ملک کی وزیراعظم بنی، تو پھر کچھ صحافیوں نے اخبارات و رسائل میں اس خالص علمی و دینی مسئلے کو صحافت کے لیے تختہ مشق بنالیا اور اپنی عادت کے مطابق سطحی قسم کے استدلال کر کے بے نظیر کی حکومت کو شرعی جواز مہیا کرنے کی ذمہ داری اٹھالی۔

اخبارات و رسائل میں اس موضوع پر لمبے چوڑے مضمون تحریر کیے گئے، شبہات اور غلط بحث کے ذریعے سے انہوں نے عوام کو باور کرانے کی کوشش کی کہ علماء محض تعصب اور تنگ نظری سے کام لے کر مخالفت کر رہے ہیں، وگرنہ اسلام میں تو عورت کی سربراہی کی پوری گنجائش موجود ہے۔ پھر یہ مسئلہ بڑھتا گیا۔ 1988ء سے 1990ء کے دوران میں ترکی میں بھی خاتون

[1] روزنامہ ”نوائے وقت“ 3 مارچ 1989ء، ابن الحسن کے کالم ”جملہ معترضہ“ سے ایک اقتباس

ہانسو چلر حکمران بنی اور بنگلہ دیش میں ایک خاتون خالدہ ضیاء حکمران منتخب ہوئی۔ چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مغالطوں اور شبہات کا کتاب و سنت کی روشنی میں ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مجھ جیسی عاجز و بے بضاعت کو توفیق عطا فرمائے، آمین!

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے

ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

وگرنہ اہل مغرب تو یہی چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ اپنے دین کے تمام واضح احکام کی حرمت پامال کرتی چلی جائے۔ اب یہ تو ہمارا کام ہے کہ اپنے دین کے مسلمات کا مقدور بھر دفاع کریں اور اللہ و رسولؐ کی ناراضگی سے خود بچنے اور دوسرے مسلمانوں کو بچانے کی بھرپور سعی کریں۔

مخالفانہ شبہات اور ان کا تجزیہ:

یکم مئی 1992ء کے اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ موجودہ دور کے محقق محترم ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے الحمراء ہال (لاہور) میں لیکچر دیتے ہوئے کہا: ”اسلام میں تنگ نظری نہیں۔ عورت حکمران بن سکتی ہے۔ وہ چہرے پر نقاب رکھ کر حکومت کر سکتی ہے۔ پردہ حکمرانی کے فرائض میں رکاوٹ نہیں بن سکتا، انہوں نے اپنی تحقیق کی تائید میں رضیہ سلطانہ کی حکمرانی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں بلقیس کی حکومت کا حوالہ دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یمن کی حکمران بھی عورت تھی۔“

اسی طرح ارشاد احمد حقانی (جو ملک کے مسلمہ سیاسی مبصر اور معروف سیاسی تجزیہ نگار سمجھے جاتے تھے) انہوں نے صحیح بخاری کی حدیث: لن یفلح قوم... پر اعتراض کیا اور اس کی سند کو ضعیف قرار دیا، پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر اسلام صاحب نے اس حدیث کی تاریخی حیثیت کو مشکوک بنا دیا کہ فارس میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں کوئی عورت حکمران بنی ہی نہیں تھی۔ لہذا اس حدیث کی صحت مشکوک ہے۔

اپنی حکومت بننے کے فوراً بعد خود بے نظیر بھٹو نے ”اپوا“ کے ایک اجلاس منعقدہ کراچی میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تمام علماء 1960ء میں عورت کی سربراہی کے جواز پر فتویٰ دے چکے ہیں۔ قرآن نے بھی تو مرد و عورت کے درمیان مساوات بیان کی ہے۔

مخالفین کے دلائل اور ان کا تجزیہ:

دلیل نمبر 1:

خود قرآن کریم نے مرد و زن کی مساوات اور برابری کا اصول پیش کیا ہے، لہذا اصول کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت کرنے کے حق میں بھی مرد و عورت مساوی ہوں۔ عورت کو اس حق سے محروم کرنا عورت کی حق تلفی ہے اور اس پر ظلم ہے۔

جواب: انسانی وقار اور شرافت میں یقیناً مرد اور عورت از روئے قرآن برابر ہیں۔ قرآن پاک کا فرمان ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ﴾ [۱] یعنی ”ہم نے انسان (بنی آدم) کو بزرگی عطا فرمائی ہے۔“ پھر مرد اور عورت پیدائش میں بھی یکساں ہیں: ﴿خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ [۲] یعنی ”اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا۔“ پھر ایمان و تقویٰ اور دینداری کے لحاظ سے بھی دونوں برابر ہیں: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [۳] ”اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز ترین وہ ہے جو تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔“ (یہ مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی ہو سکتی ہے)

پھر آخرت میں اجر و مرتبہ اور نجات پانے کے لحاظ سے بھی مرد و عورت دونوں یکساں ہیں۔ بنیادی انسانی حقوق جو اللہ و رسولؐ نے متعین کیے ہیں، ان میں بھی دونوں برابر ہیں۔

مگر قرآن و سنت نے یہ بات کہیں نہیں فرمائی کہ صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے بھی دونوں یکساں ہیں..... کیا پیدائش میں اور انسان ہونے میں مساوی ہونا اس بات کی ضمانت بن سکتا ہے کہ دونوں کو یکساں قسم کی صلاحیت اور یکساں قسم کی ذمہ داریاں عطا کی گئی ہیں؟ اگر یہ بات ہوتی تو منحنث اور پاگل آدمی بھی انسان ہوتے ہیں، ان کی پیدائش بھی عام لوگوں ہی کی طرح ہوتی ہے، مگر کیا منحنثوں یا پاگلوں کو اہم ذمہ داریاں دی جاتی ہیں؟ کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی منحنث

[۱] بنی اسرائیل: 70

[۲] النساء: 1

[۳] الحجرات: 13

کسی فوج کا سربراہ ہو یا کوئی پاگل آدمی اپنے ملک کا سفیر بنا کر بیرون ملک بھیج دیا جائے؟ آخر ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ اس کی محض ایک ہی وجہ ہے کہ پیدائشی طور پر مساوی انسان ہونے کے باوجود منٹ فوج کی سربراہی کی اہلیت نہیں رکھتا، نہ ہی کوئی پاگل شخص کسی باشعور حکومت کی نمائندگی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسی طرح مرد و عورت پیدائش، انسانیت، شرافت و کرامت، دینداری و تقویٰ، اخروی اجر و نجات اور بنیادی حقوق و فرائض میں بے شک یکساں ہوں مگر دونوں کی فطری صلاحیتوں میں فرق ہے۔ اس لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بھی الگ الگ نوعیت کی ہیں۔ قرآن و سنت کی رو سے عورت کی جسمانی، عقلی و ذہنی صلاحیتیں مردوں سے کمتر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو معاش کے مسائل سے سبکدوش کیا گیا ہے (اس کی معاش کی ذمہ داری مرد پر ڈالی گئی ہے)۔ مرد کے مقابلے میں عورت کی شہادت آدھی قرار دی گئی ہے۔ اسی طرح مرد و عورت کی ذمہ داریاں بھی الگ الگ ہیں۔ عورت کی جسمانی ساخت اور ذہنی نفسیات کے پیش نظر امور خانہ داری اس کے سپرد کیے گئے ہیں اور مرد پر معاشی مسائل کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بیرون خانہ کی تمام ذمہ داریاں اس کے سپرد کی گئی ہیں۔

عورت پر اللہ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس کو معاش کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا گیا ہے (لیکن یہاں بھی مساوات مرد و زن کے حاملین نے اعتراض کیا کہ عورت کو معاش کمانے کے ”حق“ سے محروم کیا گیا ہے)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عورت پر مزید یہ احسان کیا کہ حکومت و سیادت کی پیچ دار گھٹیاں سلجھانے سے اسے مستثنیٰ کر دیا۔ تاکہ یکسوئی سے اپنی فطری ذمہ داریاں ادا کرے، گھر سنبھالے، شوہر کی خدمت کرے، بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے۔ یہ خانگی ذمہ داریاں تو اس کو بہر صورت ادا کرنا ہی ہیں..... تو پھر اس صنفِ نازک کے ساتھ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس کی اصل ڈیوٹی بھی برقرار رہے، مزید سربراہ مملکت، سربراہ حکومت، گورنر اور کمانڈر انچیف کی بھاری ذمہ داریاں بھی اس کے سر پر ڈال دی جائیں؟ حکومت اور سربراہی وہ بھی پورے ملک کی، یہ کام اسلامی نکتہ نظر سے شیر مادر کی طرح میٹھا نہیں۔ حق نہیں بلکہ یہ ”فرض“ ہے۔ پوری قوم کے تمام معاملات کی ذمہ داری کا عظیم بوجھ، اپنی اصل ذمہ داریوں کی موجودگی

میں مزید حکومتی ذمہ داریوں کا بوجھ خود مانگنا اور نہ ملنے پر احتجاج کرنا اور مظاہرے کرنا دانشمندی تو نہیں! یہ تو دیوانگی کی علامت ہے۔

اگر کسی مرد کو کمانے کے جھنجھٹ میں پڑے بغیر معاشی وسائل میسر آ جائیں، تو کیا وہ پھر بھی اپنی جان ہلاک کر کے کمانے کے لیے نکلے گا؟ عجیب لطیفہ ہے کہ عورتوں کو اللہ تعالیٰ گھر بیٹھے ان کی ضرورتوں کا انتظام فرما رہا ہے اور وہ پھر بھی باہر نکل کر کمانے یا حکومت کرنے کے ”گرانقدر حقوق“ مانگتی پھر رہی ہیں۔ جو عورت اپنے گھر میں (اپنی فطری اہلیت کے پیش نظر) سربراہ نہیں بن سکتی، وہ پورے ملک کی سربراہ کیسے بن سکتی ہے! جدید دور ہو یا قدیم، کسی بھی معاشرے میں (چند ایک جنگلی وحشی قبائل کے سوا) عورت کو گھر کا سربراہ نہیں سمجھا جاتا، مرد ہی اپنے گھر کا سربراہ ہوتا ہے۔

یہ حکومتی منصب عورتوں کی فطری استعداد کے برعکس ہیں۔ مساواتِ مرد و زن کے قائل مغربی ممالک خود ذمہ داری کے اونچے مناصب عورتوں کو نہیں دیتے بلکہ مردوں کو ہی دیتے ہیں۔ فرانس میں ایک دفعہ سروے کیا گیا کہ عورتوں کو وزارتیں دی جائیں یا نہیں؟ تو کثرت رائے نے یہ فیصلہ دیا کہ یہ منصب ان کو نہیں دینے چاہئیں..... چنانچہ مغربی ممالک میں بھی عورتوں کو اونچے منصب بہت کم دیئے جاتے ہیں۔ فرانس، امریکہ، برطانیہ کی پارلیمنٹوں میں کتنی خواتین موجود ہیں؟ خود امریکہ میں کبھی کوئی خاتون سربراہ مملکت نہیں بن سکی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا سبھی ممالک نے عورتوں کے خلاف سازش کر لی ہے؟ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ عورت کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں حکومت و سربراہی کے بھاری بوجھ کو نبھانے کی اہل نہیں ہیں۔ اسلام کا عورت پر کوئی ظلم یا حق تلفی نہیں ہے بلکہ اسلام نے اس کو اس کی صلاحیتوں کے برعکس ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے۔ خود بے نظیر صاحبہ کا دونوں دفعہ اپنی مدتِ حکومت پوری نہ کر سنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ یہ بار نہیں اٹھا سکتی۔

سوال یہ ہے کہ روس میں آج تک کتنی عورتیں سربراہی کے منصب تک پہنچ سکی ہیں؟ برطانیہ، فرانس، جرمنی میں اور دیگر مغربی ممالک میں ان کے سربراہ مملکت بننے کی کیا شرح ہے

امریکہ کے ایوان بالا تک کتنی عورتیں پہنچ سکی ہیں؟ بلکہ امریکہ کا ایک نادر تجربہ پڑھ کر خود فیصلہ فرمائیے کہ کیا عورت کو یہ منصب دیا جائے؟

1870ء میں امریکن عورتوں کی ایک شاندار کانفرنس زیر صدارت ”میڈم مارٹین“ منعقد ہوئی۔ جس نے اپنے پولیٹیکل حقوق کا مطالبہ کیا اور بہت سے ایسے پولیٹیکل مردوں کو بھی زیر کر لیا، جو قبل از تجربہ عورتوں کے سیاسی معاملات میں داخل ہونے کو مضرت رساں خیال کرتے تھے۔ اس کانفرنس کی ممبر عورتوں نے عام جمعوں میں لیکچر دیئے، اخبارات میں مضامین لکھے اور پارٹیوں کے رئیسوں کو پر زور دلائل سے قائل کرنے میں مصروف رہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے مجلس وزراء سے اس بات کا اقرار کرا لیا کہ وہ انہیں پولیٹیکل حقوق عطا کرے گی۔ پھر 1872ء کے آتے ہی میڈم مارٹین نے اپنے آپ کو امریکہ کی پریزیڈنسی کے لیے امیدوار بنالیا اور پھر کثرت رائے سے وہ پریزیڈنٹ منتخب کر لی گئی۔ اس کا کرسی صدارت پر بیٹھنا ہی تھا کہ اس کی ساتھ والیوں میں پھوٹ پڑ گئی اور وہ سب اس سے کنارہ کشی کر گئیں۔ حکومت نے یہ صورت حال دیکھی تو فوراً ہی اس قانون کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ کیونکہ اسے معلوم ہو گیا کہ عورتوں میں باہم مل کر کام کرنے کی صلاحیت نہیں۔ ولایت متحدہ امریکہ کی تاریخ کا یہ ایک مشہور واقعہ ہے اور ”ریویو آف ریویوز“ کی اٹھارہویں جلد میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔^[۱]

دلیل نمبر 2:

حدیث: لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ... جس سے اسلام میں عورت کی سربراہی کے عدم جواز کو ثابت کیا جاتا ہے، محل نظر ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے، علاوہ ازیں تاریخی لحاظ سے بھی یہ حدیث مشکوک ہے۔ اس لیے یہ حدیث ناقابل قبول ہے۔

جواب: بعض لوگ مندرجہ بالا حدیث کو رد کرنے کے لیے اس کے راوی حضرت ابو بکرؓ کو مطعون کرتے ہیں، بعض لوگ حضرت ابو بکرؓ کے بعد کے راویوں پر جرح کر کے صحیح بخاری کی عظمت و اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں، بعض کا اعتراض یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ

کو مطعون کرنے کے لیے یہ حدیث وضع کی گئی تھی۔ بہر صورت ذیل میں اس کا تجزیہ کر کے ان شاء اللہ! ثابت کیا جائے گا کہ حدیث ہر لحاظ سے صحیح ہے:

حدیث کی صحت:

یہ حدیث صحیح بخاری کی ہے۔ اس لیے بہت زیادہ ترجیح کی حامل ہے، علاوہ ازیں اسے مسند احمد، ترمذی اور نسائی نے بھی بیان کیا ہے۔ صحیح بخاری میں بھی دوبار آئی ہے، اس لیے اس کی صحت کے بارے میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ پوری حدیث درج ذیل ہے:

حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ فارس والوں نے کسریٰ کی بیٹی بوران کو حکمران بنا دیا ہے تو اس پر آپؐ نے فرمایا:

لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَوْ أَمَرَهُمْ امْرَأَةٌ^[۱]

”یعنی وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جس نے اپنا حکمران عورت کو بنالیا۔“

حضرت عائشہؓ یا کسی صحابی نے اس حدیث کا انکار نہیں کیا۔ حضرت ابوبکرؓ 8ھ میں محاصرہ طائف کے دوران میں مسلمان ہوئے، ملکہ فارس کا یہ واقعہ بھی 8ھ میں ہی پیش آیا۔ حضرت عائشہؓ کی موجودگی میں آپؐ نے مذکورہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ بعد میں حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ جمل کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا۔ گویا سب صحابہ اور حضرت عائشہؓ خود اس حدیث سے واقف تھے۔

اہل سنت کا ایک مسلمہ اصول یہ ہے کہ الصحابہ کلہم عدول (تمام صحابہ عادل ہیں) جس کا مطلب یہ ہے کہ جس روایت کا سلسلہ سند صحابی تک بالکل درست ہو تو وہ روایت صحیح ہے اور صحابیؓ کے بارے میں سرے سے کوئی تحقیق ہی نہیں کی جائے گی کیونکہ تمام صحابہؓ عادل ہیں، یعنی حدیث رسولؐ بیان کرنے میں کسی بھی صحابی سے کذب اور تلبیس کا امکان نہیں ہے۔ اس لیے جو لوگ حضرت ابوبکرؓ کی کردار کشی کر رہے ہیں وہ اس مسلمہ اصول کے خلاف ہے، جس کی کوئی اہمیت نہیں (خود انہوں نے 8ھ میں نبی پاکؐ سے یہ حدیث سنی تھی)

اسی طرح حدیث کے دوسرے راویوں پر جرح کر کے روایت کو مخدوش قرار دینے کا مطلب صحیح بخاری کی اہمیت (یعنی کتاب اللہ کے بعد سب سے صحیح کتاب) کو مجروح کرنا ہے حالانکہ صحیح بخاری کے بارے میں بھی امت مسلمہ کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کے بعد حدیث رسول کا صحیح ترین مجموعہ ہے اور اس کی کسی روایت کی تضعیف و تردید اس مسلمہ عقیدے کے منافی ہے، اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بجاطور پر یہ ارشاد فرمایا ہے:

”صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے بارے میں محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان کی تمام روایات مُثَبِّہ، مرفوع اور قطعی طور پر صحیح ہیں اور ان کے مصنفین تک متواتر ہیں اور ہر وہ شخص جو ان دونوں کتابوں کی اہمیت گھٹاتا ہے، بدعتی ہے۔ مومنوں کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کا پیروکار ہے۔“ [۱]

یہی وجہ ہے کہ سوائے ان چند لوگوں کے جو پردیزی حیلے سے کام لے کر حدیث کو مشکوک اور ضعیف بنانے لگتے ہیں، اہل علم میں اس حدیث کی صحت کے بارے میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔ عورتوں کو حکمران بنانا اور ملک کی باگ ڈور ان کے حوالے کرنا ایرانی بادشاہ کسریٰ کے خاندان کی سنت اور موروثی بادشاہوں کی رسم ہے۔ اسی فرمان رسولؐ کی روشنی میں آج تک کسی عورت کو اپنا حکمران بنانا امت مسلمہ میں کبھی بھی پسند نہیں کیا گیا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں، جو چودہ سو سال پر محیط ہے، سوائے رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی چند حکمران بیگمات کے مسلمان عورتوں کی حکمرانی کی مثالیں ناپید ہیں۔ یہ دو تین مثالیں بھی اس لیے قابل توجہ نہیں ہیں کہ ان خواتین کو حکمران بنانے میں عوام کا قطعاً کوئی اختیار نہ تھا۔ یہ خواتین تو موروثی بادشاہت ہی کے اصول پر حکمران بنی تھیں۔ مگر ان کی حکمرانی کو بھی امت نے چنداں پذیرائی نہ بخشی۔

دلیل نمبر 3:

یہ اعتراض کہ دور نبویؐ میں فارس میں کوئی عورت حکمران بنی ہی نہیں، تاریخی طور پر یہ بات غلط ہے۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ عہد نبویؐ میں فارس میں ایک عورت حکمران بنی

ہے۔ تاریخ طبری میں اس کا نام بوران بنت کسریٰ پرویز بن ہرمز بتلایا گیا ہے۔ [۱]

حافظ ابن حجر نے اپنی تصنیف ”فتح الباری“ میں بھی اس عورت کا نام بوران بنت شیرویہ بن کسریٰ بن پرویز لکھا ہے۔ جبکہ طبری نے اسے بنت کسریٰ لکھا ہے۔ عربی اور اردو میں کسریٰ پرویز کو خسرو پرویز پڑھا جاتا ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام مطبوعہ ”تاریخ ایران“ میں اس عورت کے بارے میں لکھا ہوا ہے:

”اس کے بعد خسرو پرویز کی بیٹی بوران دخت تخت نشین ہوئی۔ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوران دخت کے تخت نشین ہونے کی خبر ملی تو فرمایا: ”وہ قوم جو ایک عورت کو عنانِ حکومت سونپتی ہے، وہ کبھی آسائش نہیں دیکھ سکتی۔“ وہ چھ ماہ ہی حکومت کر پائی تھی کہ بیمار ہو گئی اور بیماری سے جانبر نہ ہو سکی۔ [۲]

دراصل 7ھ کے اوائل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام قبول کرنے کے لیے کسریٰ ایران کو مکتوب لکھا، اس نے گستاخی سے کام لیتے ہوئے آپ کا مکتوب پھاڑ دیا، تو نبی پاکؐ نے اس کے بارے میں بددعا فرمائی کہ اب اس کی حکومت بھی اس طرح پارہ پارہ ہو جائے گی۔ [۳]

اس کے فوراً بعد کسریٰ کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا۔ اس ظالم نے صرف اپنے باپ ہی کو قتل نہیں کیا بلکہ اپنے سولہ بھائیوں کو بھی اس اندیشے کے پیش نظر قتل کر دیا تاکہ کوئی اس کی حکومت چھیننے والا نہ رہے۔ مگر چھ ماہ ہی حکومت کر پایا تھا کہ ایک وہابی مرض کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن گیا۔ اب اس کی بہن بوران دخت ہی رہ گئی تھی، وہی ملک فارس کی حکمران بنی۔ نبی پاکؐ کو جب یہ خبر ملی تو آپؐ نے مذکورہ بالا فرمان ارشاد فرمایا۔ یہ 8ھ کا واقعہ ہے، اس کی صداقت بھی چند سالوں میں دنیا نے دیکھ لی کہ دنیا سے یہ مجوسی حکومت ہی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ وہاں اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔

[۱] تاریخ طبری، ج 2، صفحہ 231

[۲] تاریخ ایران، مؤلفہ: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، ج 1، صفحہ 525، طبع 1967ء

[۳] صحیح بخاری، کتاب المغازی

دلیل نمبر 4: غیر مسلم خواتین کی حکمرانی کو سندِ جواز بنانا:

اس حدیث کے بارے میں بعض لوگوں کا قول ہے: ”نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان وقتی تھا یعنی صرف بورانِ دخت کے بارے میں تھا۔ آپ کا یہ فرمان بطور اصول اور کلیہ کے نہیں تھا، جس کی دلیل یہ ہے کہ تاریخ میں اپنی ہوں یا غیر بہت سی خواتین حکمران رہی ہیں اور ان کا دور حکومت کامیاب رہا ہے۔ مثلاً روس کی ملکہ کیتھرائن، برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ، تاریخِ اسلام میں رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی یا شاہجہاں والیہ بھوپال وغیرہ۔ اس لیے مفتیوں کو اس حدیث کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔“

تاریخ کے سٹیج پر حکمران بننے والی غیر مسلم خواتین کی کارگزاری:

جواب: روس و برطانیہ کی ملکاؤں ملکہ کیتھرائن، ملکہ وکٹوریہ اور دیگر علاقوں کی حکمران خواتین کے دور کو جو کامیاب بتایا گیا ہے، وہ صرف تصویر کا ایک پہلو ہے ملکہ این (Ane) ہو یا ملکہ الزبتھ، ہندوستان کی اندرا گاندھی ہو یا اسرائیل کی گولڈا میسر یا سری لنکا کی بندرانائیکے ہو یا فلپائن کی کوری اکینو، ان کے کامیاب ہونے کا جو اتنا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے، یہ سب حقائق کے برعکس ہے۔ برطانیہ کی ملکہ میری کو تاریخ اس کے ظلم و ستم کی بنا پر ”خونی میری“ (Bloody Marry) کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اسی طرح مصر کی ملکہ قلوپطرہ کا معاملہ ہے۔ اس کے حجلہٴ قیث میں روم کے مرد آہن سیزر اور پھر انٹونی دادِ عیش دیتے رہے اور ملکہ سمیت سب ہلاکت کو پہنچے۔ ان مذکورہ بالا خواتین کے دور کو کامیاب کہنا دراصل ”دور کے ڈھول سہانے“ کے مترادف ہے۔ یہ سب خواتین وراثتاً شاہی حکومتوں اور ریاستوں کی حکمران بنی تھیں، ان کے انتخاب میں عوام کی رائے کو کوئی دخل نہ تھا۔ رہ گئی مثالیں زمانہ حال کی منتخب شدہ خواتین کی! مثلاً اندرا گاندھی، بندرانائیکے یا اسرائیل کی مسز گولڈا میسر وغیرہ، تو واقعہ یہ ہے کہ ان کے دور حکومت کو کامیاب کہنا حقائق کے قطعی برعکس ہے۔ اندرا گاندھی کا دور کیا اس لیے کامیاب کہا جاسکتا ہے کہ اس کے دور میں ہم اہل پاکستان کو ہزیمت کا داغ اٹھانا پڑا اور پاکستان دو لخت ہو گیا۔ اس میں اس کی تدبیر سے زیادہ ہماری اپنی حماقتوں اور کوتاہیوں کا دخل ہے۔ خود اہل ہند کو اس کی بدانتظامیوں اور بے تدبیروں

کے بہت سے شکوے ہیں۔ اسی کے دور میں سکھوں کے، آسام اور سری لنکا جیسے مسئلے بھی پیدا ہوئے اور ملک کی اقتصادی حالت بھی بدتر ہو گئی۔

خود اہل مغرب کے معلمِ اوّل ارسطو نے کہا تھا: ”سیاست میں عورت کا کوئی رول نہیں، ان فیصلوں میں جو گھر سے باہر خلقِ خدا کی بہتری کے لیے کیے جاتے ہیں، عورت کا کوئی ہاتھ نہیں ہونا چاہیے۔“

علاوہ ازیں ان خواتین کے دورِ حکومت کو کامیاب کہا جاتا ہے، ان کے اپنے حوالے سے! ہر ایک کا کامیابی کا معیار الگ الگ اور مختلف ہوتا ہے، ایک ہی شخص کے دورِ حکومت کو چند لوگ کامیاب کہہ دیتے ہیں اور کچھ لوگ اسی کو انتہائی ناکام کہہ دیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ جسے ایک مورخ نے کامیاب کہا وہ دوسروں کے نزدیک بھی واقعی کامیاب ہو۔ مثلاً ہمارے ہاں تاریخِ اسلام میں بعض مورخین نے بنی امیہ کے دور کو بری طرح مسخ کیا ہے۔ حالانکہ دورِ نبویؐ کے قریب ترین ہونے کی بنا پر بہ حیثیتِ مجموعی تاریخِ اسلام کا بہترین دور ہے۔

باقی رہی بات ان خواتین کے کامیاب دورِ حکومت کی! اگر تو کامیابی اس بات کا نام ہے کہ فتوحات حاصل کر کے نوآبادیاں قائم کر دی جائیں اور معاشی میدان میں خوشحالی آجائے، تو یہ حقیقی کامیابی نہیں ہے۔

اہلِ نظر اور باخبر اہلِ علم کے نزدیک کامیابی اور فلاح یہ ہے کہ ایسا پاکیزہ معاشرہ قائم کیا جائے جس میں عدل و انصاف کی حکومت ہو، اخلاقی اقدار کی سربلندی اور قلب و نظر کی پاکیزگی عام ہو جائے۔ جن غیر مسلم ملکوں اور خاتون حکمرانوں کی کامیابیوں کا چرچا کیا جا رہا ہے، ان کے دور میں انسانیت کی ترقی نہیں ہوئی تھی، صرف مادی وسائل کی ترقی ہوئی تھی اور انسانی اقدار سے عاری اسی مادی ترقی کی وجہ سے دنیا کو دو عالمگیر جنگوں کا سامنا کرنا پڑا، جن میں لاکھوں نہیں کروڑوں انسان تباہ ہوئے تھے۔ اگر حال کی خوشحالی مستقبل کی تباہی و بربادی کا ذریعہ بن جائے تو یہ ناکامی و نامرادی ہے، کامیابی ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ مسز تھیچر جس کو ”دی گریٹ“ کہا جاتا ہے، کے دور میں برطانیہ واضح طور پر زوال پذیر رہا۔ معاشی حالت ابتر ہو گئی، کساد بازاری زوروں پر تھی اور بیروزگاری نے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔

دلیل نمبر 5: چند مسلمان خواتین کی حکمرانی کو سندِ جواز بنانا:

یہاں عورت کی حکمرانی کے جواز کے لیے رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بھوپال کی خواتین حکمرانوں کو بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایک اصولی اور دینی مسئلے میں بادشاہوں اور شہزادیوں کا طرز عمل دلیل کی کنسی قسم ہے؟ موروثی حکومتوں کے نتیجے میں یہ خواتین ضرورت کے تحت برسرِ اقتدار آئیں تھیں، تو پھر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں موروثی حکومت بھی جائز ہے؟ بیشک تاریخ اسلام میں بعض بہت نیک دل اور پابندِ شریعت حکمران موجود رہے ہیں، مگر اس کے باوجود ان کا نظام حکومت شرعی اصولوں کا پابند نہیں تھا۔ سلطانِ اتمش نے رضیہ سلطانہ کو اپنا جانشین مقرر کیا، اس کے اس عمل کو تو دلیل بنایا جا رہا ہے، چاند بی بی اور بھوپال کی شہزادیوں کی حکومتوں کو دلیل بنایا جا رہا ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، بنو امیہ، بنو عباس کے حکمرانوں کے طرز عمل کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، جنہوں نے صحابیات اور شہزادیوں کو جانشین بنایا تھا نہ حکمرانی کے تحت پر بٹھایا تھا۔ آخر ان چند خواتین کو، جن کی تعداد تاریخ اسلام کے پورے چودہ سو سال میں 2% تک بھی نہیں پہنچتی، کیوں دلیل بنایا جا رہا ہے اور کس قاعدے کی رو سے دلیل بنایا جا رہا ہے؟ ان ہزاروں حکومتوں کو آخر کیوں دلیل نہیں قرار دیا جاسکتا، جن کے سربراہ مرد تھے!

اصل بات یہ ہے کہ اصول اور کلیہ ایک ہی ہے۔ بعض استثنائی صورتیں بھی پیش آ جاتی ہیں، مگر استثنائی صورتوں سے اصول اور کلیہ نہیں ٹوٹتا۔ ہزاروں لاکھوں مرد حکمرانوں کے مقابلے میں چند کامیاب خواتین کا آخر تناسب کیا ہے؟ چند عورتوں کی حکمرانی سے یہ اصول اور کلیہ ختم نہیں ہو سکتا کہ عورتوں کی حکومت میں خیر و فلاح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہ ایک کلیہ ہے کہ مرد بہادر ہوتے ہیں۔ اب اگر چند خواتین بھی خوب دائرِ شجاعت دے دیں، تو یہ اصول اور کلیہ ختم نہیں ہوگا کہ مرد بہادر ہوتا ہے۔ کیا لاکھوں کروڑوں مردوں میں سے 10، 20 عورتوں کے بہادر ہونے سے مردوں کی مردانگی اور بہادری یا عورتوں کی نسوانی کمزوری والا کلیہ ختم ہو جائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں! بالکل اسی طرح چند عورتوں کی حکمرانی سے یہ کلیہ ختم نہیں ہو سکتا کہ عورتیں عموماً اپنے ناتواں

کندھوں پر حکومت کا بار اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ اب ان مسلم خواتین کی حکومت کے اسباب اور ان عورتوں کی نام نہاد کامیابی کا ترتیب وار تذکرہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

رضیہ سلطانہ:

رضیہ سلطانہ کے ساتھ بھائیوں کی موجودگی کے باوجود اس کا درویش صفت باپ سلطان شمس الدین التمش کہا کرتا تھا کہ: ”اس کے بیٹے نکمے اور نا اہل ہیں اور بیٹی نظم حکومت پوری طرح چلانے کی اہل ہے۔“ اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ رضیہ سلطانہ کا اقتدار بطور اضطرار اور مجبوری کے تھا۔

چاند بی بی:

اسی طرح بیجاپور اور احمد نگر دکن کی حکمران عورت چاند بی بی کا اقتدار بھی ایک مخصوص صورت حال کا نتیجہ تھا۔ بیجاپور کا حکمران علی عادل قتل کر دیا گیا، اس کی کوئی زینہ اولاد تو تھی نہیں، صرف ایک بھتیجا وارث تھا جس کی عمر صرف نو سال تھی، اسی کو تخت کا وارث قرار دیا گیا اور علی عادل کی بیوہ چاند بی بی اس کی نگران مقرر ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد چاند بی بی اپنے باپ حسین شاہ کی ریاست احمد نگر میں آئی، تو وہاں اس کا اکلوتا بھائی ذہنی امراض کا شکار ہو گیا۔ مجبوراً یہ ریاست بھی چاند بی بی کو سونپ دی گئی اور وہ بیجاپور اور احمد نگر کی مشترکہ حکمران بن گئی۔^[۱]

ان دونوں خواتین میں بے شک انتظامی صلاحیت موجود تھی اور وہ سیاسی معاملات خوب پنپا سکتی تھیں، مگر یہی بات ان دونوں خواتین کے کامیاب دور حکومت کی؟! تو سچی بات یہ ہے کہ ان کے دور حکومت کو عبرت انگیز ہی کہا جاسکتا ہے۔ رضیہ سلطانہ کی حکمرانی کو اس کے دور کے بیشتر امراء نے تسلیم ہی نہیں کیا۔ رضیہ سلطانہ ان کو زیر کرنے کی کوشش کرتی رہی، مگر کامیاب نہ ہوئی۔ بالآخر ایک بہادر حاکم اختیار الدین التونیہ سے شادی کر کے اپنا اقتدار تسلیم کروانا چاہا، مگر اس میں بھی کامیاب نہ ہوئی۔ بالآخر رضیہ اور التونیہ دونوں کو قتل کر دیا گیا۔^[۲] اسی طرح اس کا دور حکومت صرف 3 سال چھ دن رہ سکا۔

[۱] ملخص، از: اردو دائرہ معارف اسلامیہ، مطبوعہ: پنجاب یونیورسٹی، ج 7، صفحہ 613، 614

[۲] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج 10، صفحہ 310، 311

اسی طرح چاند بی بی کو بھی مسلسل بغاوت اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر اپنی فوج کے باغی سپاہیوں کے ہاتھوں ماری گئی۔^[۱]

اسی طرح مصر میں ایک خاتون شجرۃ الدُّر حکمران بنی تھی، مگر عباسی خلیفہ نے پیغام بھیجا کہ اسلام کی رو سے عورت کی حکومت ناجائز ہے۔ اگر مصر میں کوئی مرد حکمرانی کے قابل نہیں رہ گیا تو ہم وہاں کسی کو حاکم بنا کر بھیج دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بھی دستبردار ہونا پڑا۔

دراصل امت مسلمہ کا اجتماعی ضمیر ہی یہ ہے کہ اس میں خاتون کی حکمرانی کامیاب نہیں ہو سکتی اور عورت کا مختصر سادہ حکومت بھی سازشوں کی نذر ہو کر ناکامی پر منتهی ہوتا ہے۔ البتہ بھوپال کی شہزادیوں کا مسئلہ ذرا مختلف ہے اور اس میں سے شاہجہاں بیگم کا دور حکومت کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے، مگر اس کی بھی مخصوص وجوہات ہیں۔ مثلاً بلاشبہ قانوناً ریاست کی حکمران یہی بیگمات تھیں، مگر اول انہوں نے شریعت کی پابندی سختی کے ساتھ برقرار رکھی، وہ شرعی پردے کی بھی پابند تھیں۔ دوم اسی پردے کی پابندی کی وجہ سے اپنے اختیارات کا زیادہ تر استعمال انہوں نے خود نہیں کیا بلکہ اپنے دیندار وزیروں، مشیروں اور اپنے خاوند کے ذریعے سے کیا، شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن خاں حکومت کے بیشتر معاملات خود سرانجام دیتے تھے۔

”ماثر صدیقی“ کے مصنف لکھتے ہیں: ”رئیسہ عالیہ (شاہجہاں بیگم) احکام شرع متین کے مطابق ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور وسیع رقبہ مملکت پر حکمران اور کثیر التعداد مخلوق کے سیاہ و سفید کی مالک تھیں، اس لیے ضروری تھا کہ ان کے دست و بازو ایسے مشیران ریاست اور ایسے دین دار حکام ہوں جو آغازِ دورِ جدید میں اپنی خداداد قابلیت، دیانت و تدبیر، خدا ترسی اور خدا پرستی سے حسن انتظام ریاست و ترقی مالیات، سرسبزی ملک، رفاهِ خلق، تہذیب اخلاق رعایا اور ازدیاد مراتب ریاست میں کافی امداد و اعانت کر سکیں“..... وہ ان کے شوہر نواب صدیق حسن خاں کے متعلق لکھتے ہیں: ”وہ اپنی تجویز و مشورہ سے رئیسہ عالیہ کے صدورِ حکم کے بعد کلی و جزئی انتظامی اور اصلاحی امور ریاست انجام دیتے تھے۔“^[۲]

[۱] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج 7، صفحہ 614

[۲] ماثِر صدیقی، حصہ سوم، صفحہ 2، مطبوعہ لکھنؤ 1924ء

بلکہ نواب صدیق خاں (شاہجہان بیگم کے شوہر) پر انگریزوں نے یہ الزام لگا کر ان کے تمام خطابات و اعزازات چھین لیے کہ انہوں نے شاہجہاں بیگم سے شادی کرنے کے بعد ان کو پردہ نشین بنا کر خود تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ [۱]

رہ گئی بات کہ بھوپال کی خواتین کو حکمران بنایا ہی کیوں گیا تھا؟ تو یہ معاملہ بھی اضطراب کا ہی نتیجہ تھا، اس ریاست کے چھٹے (6) حکمران نواب وزیر محمد خاں کے بیٹے نظیر محمد خاں نے 1816ء میں جانشین بننے پر انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا، جس کی رو سے انگریزوں نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ ریاست بھوپال کا علاقہ اس کے اور اس کی اولاد کے لیے محفوظ رہے گا، وہ اس کے عوض بعض انگریزی مفادات کا تحفظ کرے گا۔

جب 1820ء میں نظیر محمد خاں فوت ہوا تو اس کی اولاد زینہ نہ تھی لہذا مجبوراً سکندری بیگم، شاہجہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم ترتیب وار حکمران بنیں۔ پھر جب سلطان جہاں بیگم کے ہاں اولاد زینہ پیدا ہوئی تو ان کے بیٹے نواب حمید اللہ خاں کو ریاست کا ولی عہد مقرر کیا گیا۔ جب وہ بالغ ہوا تو یہ کہہ کر کہ ”اب امانت حقدار کو ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے“ تو سلطان جہاں بیگم اس کے حق میں دستبردار ہو گئیں۔ بہر صورت یہ بات مسلم ہے کہ رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور بیگمات بھوپال یا دوسری مسلم خواتین [۲] کی حکومت کو جواز کا فتویٰ علماء کی طرف سے نہیں ملا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ

[۱] ماثر صدیقی، ج 3، صفحہ 73

[۲] کئی دیگر مسلم خواتین نے بھی اضطرابی کیفیت میں اپنے اپنے علاقوں کے انتظامی معاملات سنبھالے اور خوش اسلوبی سے معاملات انجام دیے۔ مگر کبھی وہ بذات خود سربراہ نہیں ہوتی تھیں، بلکہ اپنے نابالغ بیٹے یا بھتیجے کی سرپرستی کے طور پر نام اور سکھ ان منتظم عورتوں کا نہیں بلکہ ان نابالغ سربراہوں کا ہی چلتا تھا۔ پھر جب وہ بالغ ہو جاتے تو عنان حکومت خود سنبھال لیتے۔ مثلاً

- 1- آٹھویں عباسی خلیفہ المقتدر باللہ (295ھ تا 320ھ) کی والدہ قطر الندی۔
- 2- دیلمی فرمانروا امجد الدولہ (387ھ میں تخت نشین ہوا، وہ نابالغ تھا) کی والدہ ملکہ سیدہ۔
- 3- المکرم احمد 473ھ میں یمن کے تخت حکومت پر بیٹھا۔ بہت نالائق اور عیش پرست تھا، تو اس کی بیوی بی بی سیدہ نے سارا کاروبار حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑی کامیابی سے سنبھالا۔ باہر کی سفارتوں سے بھی سارے معاملات وہی طے کرتی تھیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)

کہا جاسکتا ہے کہ وہ حالات کے دباؤ کی بناء پر خاموش ہو گئے تھے، وگرنہ اس فتنے کو امر واقعہ کے طور پر کسی نے قبول نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ نواب صدیق حسن خاں نے بھی اگر بھوپال کی شہزادیوں کی مخالفت نہیں کی تھی، تو ان کے سامنے یقیناً کچھ مصلحتیں تھیں۔ وگرنہ جواز کا فتویٰ انہوں نے بھی

4۔ کرمان کے تیسرے قتلغ خانی حکمران قطب الدین ایبک (650ھ تا 655ھ) کی اہلیہ۔ اس کی وفات پر امراء نے اسی کو اپنا فرمانروا منتخب کر لیا (655ھ تا 681ھ) پورے چھبیس سال تک بڑی کامیابی سے کرمان کی حکومت سنبھالے رکھی۔ ملکہ قتلغ خاتون اس کا نام تھا۔

5۔ ملکہ مخدومہ جہاں: شمالی دکن کے جمہنی فرمانروا ہمایوں شاہ (862ھ تا 865ھ) کی ملکہ تھی۔ شوہر کی وفات پر اپنے کسمن بیٹے نظام شاہ کی نائب بن کر معاملات حکومت حسن تدبیر اور کامیابی سے سنبھالے۔ 865ھ سے لے کر 875ھ تک دس سال انتظام حکومت سنبھالا۔ اس اثنا میں نظام شاہ فوت ہو گیا، دوسرا کسمن بیٹا محمد شاہ فرمانروا بنا۔ یہ بیٹا جب 14 برس کا ہوا تو حکومت کی امانت اس کے حوالے کر کے خود گوشہ نشین ہو گئی۔

6۔ ملکہ ماہ پیکر: اٹھارویں عثمانی خلیفہ سلطان مراد چہارم کی والدہ تھی۔ تخت نشین ہوتے وقت سلطان مراد کی عمر صرف بارہ سال تھی اور سلطنت کے حالات بہت ابتر تھے، ملکہ ماہ پیکر نے عنان حکومت کامیابی سے سنبھالی، وہ جلد ہی لاؤلفوت ہوا تو اس کا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا۔ مگر وہ بڑا نااہل تھا۔ لہذا امراء نے اس کو معزول کر کے اس کے بیٹے محمد کو فرمانروا بنا دیا۔ محمد صرف سات سال کا تھا۔ ملکہ ماہ پیکر نے اس کی بھرپور سرپرستی جاری رکھی۔ گویا 1032ھ سے لے کر اپنی وفات (1064ھ) تک ملکہ ماہ پیکر نے ترکی کے سیاسی و انتظامی معاملات کامیابی سے سنبھالے رکھے۔

7۔ کابل کے گورنر امیر خان (1677ء تا 1698ء) کا اکیس سالہ دور گورنری اس کی بیوی بی بی صاحبہ کی بیدار مغزی اور تدبیر مملکت کے باعث کامیاب رہا۔ تاریخ سے مسلمان خواتین کی کامیاب و بیدار مغز حکمرانی کی اور بھی مثالیں مل جاتی ہیں، مگر ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ کسی کی نائب بن کر حکومت کرتی رہیں۔ خود مستقل طور پر حکمران نہ تھیں بلکہ کسی اضطرار کا نتیجہ تھیں اور پردہ کے پیچھے رہ کر وہ امور مملکت انجام دیتی تھیں۔

یہ تمام تفصیلات ہفت روزہ ”الاعتصام“ 28 ربیع الثانی 1409ھ مطابق 9 دسمبر 1988ء، ص 14، 15 میں محمد اسلم رانا کے مضمون سے لی گئی ہیں۔

نہیں دیا تھا۔ مصلحت اس میں یہ تھی کہ اس طرح بھوپال کی وسیع و عریض اور خوشحال ریاست مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کے بہت سے کام انجام دے رہی تھی۔ علم و فضل کی خدمت کے لیے اس ریاست کے وسائل وقف تھے۔ اگر ان بیگمات کی حکومت نہ رہتی تو یہ ریاست انگریزوں کے قبضہ میں چلی جاتی اور مسلمان اتنے بڑے وسائل سے محروم رہ جاتے۔

دلیل نمبر 6: ملکہ بلقیس کی حکومت کو سندِ جواز بنانا:

ارشاد احمد حقانی صاحب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں قوم سبا پر ایک خاتون ملکہ بلقیس کی حکمرانی کا ذکر آیا ہے، قرآن کریم نے اس کی حکومت پر نکیر نہیں کی۔ لہذا یہ ثبوت ہے کہ قرآن نے خاتون کی حکمرانی کو جائز قرار دیا ہے۔

جواب: قرآن پاک میں سورۃ نمل، آیت نمبر 23 میں ملکہ بلقیس کی حکمرانی کا یقیناً ذکر آیا ہے۔ اس کے بارے میں صراحت موجود ہے کہ وہ مشرک تھی، وہ خود اور اس کی قوم سورج پرست تھی۔ تو کیا سورج پرست مشرکوں کا عمل ہمارے لیے شرعی دلیل بن سکتا ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے جب اس کو مکتوب ملا کہ سرکشی مت کرو اور فرمانبردار ہو کر میرے پاس آ جاؤ، تو وہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئی اور اللہ رب العالمین پر ایمان لے آئی۔ کیا یہ واقعہ عورت کی حکمرانی کی کمزوری کی نشاندہی نہیں کرتا؟ اگر بادشاہ کوئی مرد ہوتا تو کیا وہ اتنی آسانی سے بغیر کسی مزاحمت کے سرطاعت خم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا؟

باقی رہی یہ بات کہ ایمان لانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس سے شادی کر لی تھی اور اسے اس کی سابقہ حکومت پر بحال کر دیا تھا! تو عرض یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس کے ساتھ نکاح کرنے اور اسے سابقہ حکومت پر بحال کرنے کا ذکر نہ تو قرآن پاک میں آیا ہے نہ کسی صحیح سند والی حدیث میں۔ جب قرآن و سنت نے اسلام لانے کے بعد بلقیس کی حکومت کا ذکر نہیں کیا، صرف حالتِ کفر میں حکومت کرنے کا ذکر کیا ہے تو ہم ایک فرضی بات کو کیسے دلیل بنالیں! نہ ہی کافروں کے طرزِ عمل سے اس قسم کی کوئی حجت قائم ہو سکتی ہے۔

اس کے برعکس تفسیر خازن، ج 3، صفحہ 414، تفسیر کبیر، ج 6، صفحہ 569، تفسیر الکشاف، ج 3، صفحہ 370 میں یہ منقول ہے کہ حضرت سلیمان نے اس کی خواہش کے

مطابق اس کی شادی تُبَّعْ ملک ہمدان سے کردی اور بلقیس کی بجائے ہمدان کو یمن کا حاکم بنا دیا۔ بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے (جیسا کہ اسرائیلی روایات کا بیان ہے) کہ ملکہ بلقیس ایمان لانے کے بعد بھی یمن پر حکمران رہی تو پھر بھی اس کی نوعیت اب پہلے سے بدل گئی تھی۔ اب شام و فلسطین کی طرح یمن پر بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت تھی۔ آپؑ نے اس کے اعزاز کو برقرار رکھتے ہوئے اسے یمن کی ملکہ برقرار رکھا، وہ حضرت سلیمان کے ماتحت تھی، اب اس کا منصب سربراہ ریاست یا حکمران کا نہیں رہا تھا، بلکہ وہ حضرت سلیمان کے ماتحت شریعت کے مطابق کام کر رہی تھی۔ مگر قرآن پاک میں اس کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ قرآن پاک نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسلام لانے سے پیشتر جب وہ مشرک تھی، تب یمن کی حکمران تھی۔

دلیل نمبر 7: اُمّ ورقہؓ والی روایت سے استدلال:

ڈاکٹر حمید اللہ نے بہاولپور میں کچھ لیکچرز دیئے تھے۔ جن کو بعد میں ”خطبات بہاولپور“ کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ حضرت ام ورقہؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا، جیسا کہ سنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل میں ہے، اور ان کے پیچھے مرد بھی نماز ادا کرتے تھے۔ ان کا مؤذن ایک مرد خود نبی پاکؐ نے مقرر فرما دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی کے ان کے پیچھے نماز ادا کرتا ہوگا۔ لہٰذا ان کا استدلال ہے کہ جب وہ نماز میں امام بن سکتی ہے تو پھر سربراہ مملکت بھی بن سکتی ہے۔

جواب: پہلے اس حدیث کا پورا متن پیش کیا جا رہا ہے۔ سنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل، ج 6، صفحہ 405 میں عبدالرحمان بن خلّاد انصاری، ام ورقہؓ بنت نوفل سے روایت کرتے ہیں کہ جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کی تیاری کی تو میں نے عرض کیا کہ مجھے بھی جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے۔ میں آپ کے مریضوں کی دیکھ بھال کروں گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنے گھر میں رہو، اللہ عزّوجلّ تمہیں شہادت سے نوازے گا۔ تب انہوں نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے گھر میں ایک مؤذن رکھنے کی اجازت طلب فرمائی تو آپؐ نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت عطا فرمادی۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان کے لیے ایک مؤذن مقرر فرما دیا، جو ان کے لیے اذان دیا کرتا تھا اور آنحضرتؐ نے حضرت اُمّ ورقہؓ کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھر والوں کی امامت کر دیا کریں۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ مؤذن ایک بہت بوڑھا آدمی تھا۔

1- ڈاکٹر حمید اللہ نے یہاں عربی کے الفاظ ”وَأَمَرَهَا أَنْ تَوُمَّدَ أَهْلَ دَارِهَا“ کے ترجمہ میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ اہل دارہا میں دار سے مراد ان کا گھر نہیں بلکہ ”کالونی“ کیا ہے اور پھر خود ہی اندازہ لگایا ہے کہ ان کے لیے مرد مؤذن مقرر کیے جاتے تھے۔ پھر انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ اذان دینے کے بعد ان کے پیچھے نماز بھی پڑھتا ہوگا حالانکہ یہ ان کا ذاتی خیال ہے، جس کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ عمر رسیدہ شخص اذان دینے کے بعد کسی قریب والی مسجد میں جا کر مردوں کے ساتھ نماز میں شامل ہوتا ہو، کیونکہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ عورت مرد کی امام نہیں ہو سکتی۔

2- ویسے بھی یہ حدیث سنداً سخت ضعیف ہے۔ ”حافظ ابن حجر عسقلانی نے ”تہذیب التہذیب“ ج 6، صفحہ 168 میں اس حدیث کے اصل راوی عبدالرحمان بن خلاد کے بارے میں ابوالحسن بن قطان کے حوالے سے نقل کیا ہے: ”حالہ مجہول“ (اس کے حال کے بارے میں کچھ معلوم نہیں) تو پھر مجہول الحال راوی کی روایات کو بنیاد بنا کر لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا ڈاکٹر حمید اللہ جیسے سکالر کے لیے مناسب نہیں۔“ [۱]

3- اس روایت سے جو استدلال کیا جاتا ہے کہ عورت مردوں کی امام بن سکتی ہے۔ خلاف واقعہ ہے، خود حدیث کا متن بھی اس کی نفی کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت ام ورقہؓ کو مرد مؤذن مقرر کروانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان کو خود اذان دینے کی اجازت کیوں نہ ملی؟ سیدھا سا جواب ہے کہ اسلام میں کوئی عورت مؤذن نہیں بن سکتی۔ اگر ہو سکتی تو ام ورقہؓ کو مؤذن کی تقرری کے لیے درخواست کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ جب عورت مردوں میں کھڑی ہو کر اذان نہیں دے سکتی تو پھر وہ مردوں کی امام کیسے بن سکتی ہے؟ پس ثابت ہوا کہ عورت مردوں کی امام نہیں بن سکتی اور حضرت ام ورقہؓ کی نماز میں بھی صرف عورتیں ہی شریک ہوتی تھیں، مرد نہیں۔ ان کے مؤذن کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ تو ضرور ان کے مقتدی ہوں گے ہی، ایک خلاف واقعہ بات

ہے۔ یہ کیوں نہیں قیاس کیا جاسکتا کہ وہ مؤذن صاحب اذان دینے کے بعد کسی دوسری مسجد میں جا کر نماز پڑھتے ہوں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ جماعت ان کے گھر میں ہوتی تھی اور اس میں صرف خواتین شرکت کرتی تھیں۔

4- حدیث میں الفاظ ”أَنْ تَوُفَّ أَهْلُ دَارِهَا“ استعمال ہوئے ہیں۔ اس میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے لفظ ”دار“ کا ترجمہ کالونی یا محلہ لیا ہے۔ بلاشبہ ”دار“ کے مفہوم میں (بیت یعنی گھر) سے زیادہ وسعت ہے۔ مؤذن بھی تو اسی لیے مقرر کیا گیا کہ آواز پانچ دور تک پہنچے، تاہم اس کے باوجود یہ ماننا بہت مشکل ہے کہ حضرت ام ورقہؓ نے پیچھے کالونی یا محلے کے عام مرد بھی نماز پڑھتے ہوں گے۔ بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ کالونی کی دوسری خواتین بھی آکر حضرت ام ورقہؓ کے پیچھے نماز پڑھتی ہوں گی۔

5- اگر مندرجہ بالا استدلال صحیح ہوتا تو لم از لم ایسا مسجد تو دینے میں ایسی ضرور ہوتی ہوتی خاتون امام کے لیے وقف ہوتی۔ عورت کا مردوں کا امام نہ بن لینے میں مسلمات یہ ہے:

1- دراصل عورت اپنے اندر اشد رخصتی ہے۔ اس لیے عورت امام ہونے کی اہل میں مرد و عورتی سے نماز ادا نہیں کر سکتے۔

2- جس مسجد کا امام خود ہفتہ ہفتہ بھر مخصوص ایام کی بنا پر نماز سے غیہ حاضر رہے وہ جماعت کیسے بنے گی؟

3- ام ورقہؓ والی روایت ثناء ہے اور این طایات پر منحصر ہوتا ہے۔ مسلمانیاں تو یہ کہہ رہی ہیں کہ وہ قانون بن نہیں سکتیں۔ قانون دینی ہو گا تو اس کا اطلاق ان پر بھی ہو گا۔

4- خواتین نے اپنے مردوں کی امامت تو درکنار، اگر خواتین کی امامت دیکھ لی تو ان سے جو کہہ بھی آکر لوئی تحسین ملے گی تو ہم ان کے خط و کتابت سے یہ استنتاج کر سکتے ہیں کہ مسجداً ان کے لیے وقف ہوتی جس میں وہ نماز پڑھتی تھیں۔

مختصہ یہ ہے کہ اس حدیث سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ مردوں کی طرف سے عورتوں کی امامت مساجد میں امام بن جاتی تھی اور ہم اس استدلال پر ایک اور حکایت ملتی ہے کہ جب وہ نماز میں امام بن جاتی تھیں تو ہم ملے کی۔ بلکہ عورتوں کی امامت تو ان کے لیے

دلیل نمبر 8: خلافت سے متعلق عام آیات کو سندِ جواز بنانا:

بعض مضمون نگاروں نے لکھا ہے کہ قرآن پاک میں خلافت و امارت کے بارے میں جتنی آیات آئی ہیں ان میں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں، مثلاً سورۃ النور آیت نمبر 55 ”وعدہ کیا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، وہ ان کو زمین پر حکومت دے گا۔ جس طرح ان سے پہلے والے لوگوں کو حکومت دی تھی۔“

یا سورۃ الحج، آیت نمبر 41 میں ارشادِ رب العزت ہے: ”یہ وہ لوگ ہیں، اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے، برائی سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے پاس ہے۔“

چنانچہ مندرجہ بالا آیات اور اس مضمون کی دیگر آیات میں اللہ تعالیٰ نے خلافت، حکومت اور اقتدار کی نسبت عام مسلمانوں کی جانب کی ہے، جس میں مرد و عورت دونوں شامل ہیں۔ لہذا اس عمومی طرزِ ادا سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خلافت میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی اس کی اہل ہیں۔

جواب: ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ان کی رائے اور مشورے سے بنے گی اور اس کی تشکیل میں سب مسلمان (مرد ہو یا عورتیں) کی رائے اور رضامندی شامل ہوگی۔ وہ اس کو اپنی حکومت سمجھیں گے اور اس کی برکات سے بھی سب بہرہ ور ہوں گے۔

ان آیات کے ذریعے سے دراصل موروثی بادشاہت اور مطلق العنان آمریت کی جڑ کاٹی گئی ہے۔ ایک خاندان یا ایک فرد کی حکومت کو اسلام کی تائید حاصل نہیں ہے۔ مسلمانوں کی حکومت مسلمانوں ہی کے مشورے سے چلنی چاہیے۔ ان مشورہ دینے والوں میں مرد بھی شامل ہیں اور عورتیں بھی۔ باقی رہ گئی سربراہ حکومت کی اہلیت کی شرائط! وہ یہاں بیان ہی نہیں ہوئی ہیں۔ سربراہ حکومت کی اہلیت کی شرائط پیچھے بیان ہو چکی ہیں (ص 458)۔ اگر ان آیات کے عموم سے ہر مرد یا عورت کا حکمران بننا ثابت ہوتا ہے تو پھر محنت حضرات، بچے، پاگل افراد، ان پڑھ جاہل، جسمانی طور پر معذور شخص بھی اس میں شامل ہو سکتے ہیں اور کوئی ان کا یہ حق دبا نہیں سکتا۔ لیکن یہ بات امر واقعہ کے خلاف ہے۔ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت شورائی اور جمہوری ہوتی ہے، جو پوری قوم کی رائے سے بنتی ہے اور پوری قوم اس سے

استفادہ کرتی ہے مگر عملاً ملک کا نظم و نسق چلانے والا بہر حال ایک مرد ہی ہوتا ہے، جو حکومت کی پوری مشینری کو کنٹرول کرتا ہے۔ جو معاشرے میں حکمران اور سربراہ مملکت کے لیے اہلیت کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اسلام نے جو معیار مقرر کیا ہے اس کی شرائط میں حکمران کے لیے عاقل، بالغ، بہادر اور سمجھدار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا مرد ہونا بھی شامل ہے۔

دلیل نمبر 9: جنگِ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شرکت سے استدلال:

حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینے کی نیت سے حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ مکہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ ام المومنین ہیں، ہمارے ساتھ بصرہ جائیں، لوگ آپ کے احترام کی بنا پر اس نیک کام میں ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے یہ درخواست قبول کر لی اور بصرہ جانے پر آمادہ ہو گئیں۔ آپ اس وقت ایک اونٹ پر سوار تھیں۔ اس لیے اس واقعہ کو جنگِ جمل کا نام دیا گیا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی اس شرکت کو کچھ لوگ عورت کی حکمرانی کے لیے سند جواز بناتے ہیں۔

جواب: 1- جنگِ جمل میں حضرت عائشہؓ کی شرکت کسی اقتدار کے حصول کی خواہش نہ تھی بلکہ ایک ہنگامی صورت حال پر ایک فوری رد عمل تھا۔ وہ حضرت علیؓ کے مقابلے میں کسی خلافت کی امیدوار نہ تھیں۔ وہ صرف حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلہ لینے اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کروانے کی غرض سے مکہ سے نکلی تھیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے ساتھ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ کے مذاکرات ہوئے۔ آخر کار صلح ہو گئی۔ فریقین نے اطمینان کا سانس لیا۔ دونوں طرف اصحاب رسولؐ! اور مخلص صحابہ کرامؓ تھے۔ دونوں کی نیت نیک تھی، اس لیے ان کی غلط فہمیاں بھی دور ہو گئیں۔ طے یہ پایا کہ صبح صلح نامہ لکھ لیا جائے گا۔ مگر دونوں جانب شورش پسندوں کے ایجنٹ پھیلے ہوئے تھے۔ انہی میں قاتلین عثمانؓ بھی شامل تھے۔ ان کو فکر تھی کہ اگر واقعی صبح صلح ہو گئی تو ہماری خیر نہیں، لہذا انہوں نے رات کو ہی (جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ خوشی کی اس رات کو آرام فرما رہے تھے) ایک دوسرے پر حملہ کر کے جنگ شروع کر دی۔ اس طرح ام المومنینؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان دوبارہ غلط فہمیاں پیدا کر دیں، جن کے نتیجے میں جنگِ جمل وقوع پذیر ہوئی۔

2- اگرچہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کا یہ عمل خلوص نیت کے ساتھ حالات کی اصلاح کے لیے تھا اور اس میں حکومت کی خواہش بالکل نہیں تھی، مگر اس کے باوجود اپنے اس فعل پر اپنی باقی ماندہ زندگی میں بہت پریشان اور پشیمان رہتی تھیں۔ وہ جب بھی آیت ”وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ“ (تم اپنے گھروں میں وقار سے ٹکی رہو) پڑھتیں تو بہت روتی تھیں، حتیٰ کہ ان کا دوپٹہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا تھا۔ [۱]

کسی جگہ آپؐ کے یہ الفاظ مذکور ہیں: ”اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بات پسند ہے کہ کاش! میں آج سے بیس سال پہلے ہی مر گئی ہوتی۔“ [۲]

3- ایک ہنگامی صورت حال سے عورت کی سربراہی کا جواز نکالنا کسی طرح بھی مناسب نہیں، مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کروانے کے لیے ٹکنا اور دوسری طرف سربراہ حکومت بننا، دونوں یکساں ہرگز نہیں ہو سکتے۔

دلیل نمبر 10: مولانا اشرف علی تھانوی کا عورت کی حکمرانی کے جواز پر فتویٰ:

مولانا اشرف علی تھانوی کا فتویٰ عورت کی سربراہی کے حق میں ہے۔ وہ اپنی کتاب امداد الفتاویٰ (ج 5، صفحہ 93، 91، مطبوعہ کراچی) میں لکھتے ہیں:

”جمہوری حکومت میں عورت حکمران بن سکتی ہے۔ اس لیے کہ جمہوری حکومت کی حقیقت مشورہ ہے اور عورت مشورہ دینے کی اہل ہے..... حدیث میں عورت کو گھر کی نگران (راعیہ) کہا گیا ہے۔ یہ بھی ایک نوع کی حکومت ہی ہے مگر یہ کامل حکومت نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی نگرانی ہے، تو اس پر جمہوری حکومت کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ بھی کامل حکومت نہیں ہوتی بلکہ مخصوص مشورہ اور نگرانی ہوتی ہے۔ فقہاء نے امامت الکبریٰ یعنی کامل حکومت کے لیے تو مرد ہونا شرط قرار دیا ہے لیکن نگرانی اور شہادت کے لیے مرد ہونا شرط قرار نہیں دیا۔ رسول اللہ کا یہ ارشاد: ”وہ قوم کبھی کامیاب نہ ہوگی جس نے عورت کو اپنا حکمران بنالیا“ کامل حکومت کے بارے میں ہے، جس میں صرف مشورہ دینا اور نگرانی کرنا نہیں ہوتا بلکہ کامل اور مکمل حکمرانی ہوتی

[۱] طبقات ابن سعد، طبع: بیروت، ج 8، صفحہ 81

[۲] تاریخ طبری، ج 3، صفحہ 221۔ ابن خلدون، ج 2، صفحہ 64

ہے۔ جمہوری حکومت چونکہ محض مشورہ و نگرانی پر مشتمل ہوتی ہے، کامل حکومت نہیں ہوتی لہذا اس پر یہ حدیث منطبق نہیں ہو سکتی۔“

جواب: 1- یہ تحریر مولانا صاحب نے اپنی وفات سے 32 سال قبل ایک سوال کے جواب میں تحریر کی تھی۔ اس میں مولانا کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ جمہوری حکومت کا کام صرف مشورہ دینا اور نگرانی کرنا ہوتا ہے اور عورت مشورہ کی اہل ہے، یا کہیں شخصی حکومت بھی ہے مگر ملکہ ہر کام اپنی انفرادی رائے سے نہیں بلکہ مشورے سے کرتی ہے تو ایسی حکومت جائز ہے۔ اسی طرح ایسی ریاستیں جو عورتوں کے زیر فرمان ہیں، عدم فلاح کے حکم سے بری ہیں۔

دراصل اس فتوے کا ایک پس منظر ہے۔ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں۔ ان میں سے ایک ریاست بھوپال کی زمام کار عورتوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ مسلمان حکمران عورتیں احکام شریعت کی پابند تھیں۔ انہوں نے اپنی ریاست میں بھی اسلامی شریعت کے احکام نافذ کر رکھے تھے۔ حکمران خاندان میں موزوں مرد نہ ہونے کی وجہ سے ان کو زمام کار سنبھالنا پڑی۔ انہوں نے حکمران ہونے کے باوجود بے پردگی اختیار نہ کی۔ مردوں سے بے باکی سے گفتگو نہ کی، نہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھا بلکہ معاملات ریاست اہل علم و اہل دانش کے مشورے سے چلاتی رہیں۔ تاہم ان کے دل میں حدیث مذکور کی بنا پر ایک خلش موجود تھی، جس کا جواب مولانا تھانوی نے اس توجیہ کے ذریعے سے پیش کیا۔

2- یہ تاویل تو توجیہ صرف انہی کی ہے، جس کے لیے دیگر علماء پابند نہیں ہیں۔ تاہم اس تاویل و توجیہ کو قبول بھی کیا جائے تب بھی وہ پس منظر اور آج کے موجودہ حالات بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً:

وہ خواتین موروثی طور پر گھر بیٹھے حکمران بن گئیں۔ ان کو گھر سے باہر نکلنا ہی نہ پڑا۔ کجا یہ کہ آج کے دور میں عورت کو مردوں کی طرح جلسے جلوسوں، مظاہروں، احتجاجی مہم اور بے شمار دیگر سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ پہلے قدم پر ہی یہ ساری سرگرمیاں تو اسلامی احکام و ضوابط کے خلاف ہیں۔ جن میں مردوں سے بے باکانہ اختلاط، اپنی آواز و شخصیت کا جادو جگانا، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا اور اپنے جسمانی حسن کی نمائش کرنا بھی شامل ہے۔ پھر وہ حکمران خواتین نہ کبھی کسی بیرونی دورے پر گئیں، نہ غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کی۔ جبکہ آج صورت حال مختلف ہے۔ غیر ملکی سفیروں سے ملنا، بیرونی دوروں پر جانا اور ہر چھوٹے بڑے سے ملنے کا

اہتمام اس میں شامل ہے، اس طرح تو تمام اسلامی اصول مکمل طور پر پامال ہو رہے ہیں۔ لہذا بھوپال کی حکمران ریاستوں کا آج کے دور کی خاتون حکمرانوں سے کیا مقابلہ! دونوں کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

3- مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ فتویٰ 1330ھ کا ہے۔ اس کے 4 سال بعد 1334ھ میں ان کی تفسیر ”بیان القرآن“ طبع ہوئی، اس میں انہوں نے ملکہ سبا کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا: ”ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے۔ پس بلیقیس کے قصے سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا، دوسرے اگر شریعت سلیمانہ نے اس کی تقریر بھی کی (یعنی برقرار رکھا ہو) تو شرع محمدیؐ میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجت نہیں۔“ [۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی سابقہ تحقیق سے رجوع کر لیا تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ عورت کی حکمرانی کا جواز ڈھونڈنے والے مضمون نگار ”امداد الفتاویٰ“ کی عبارت کا حوالہ تو بکثرت دیتے ہیں، جو مخصوص حالات کے پس منظر میں دیا گیا ہے۔ مگر ان کی بعد میں بیان کیے گئے اصل موقف کا حوالہ نہیں دیتے، جو ان کی تفسیر ”بیان القرآن“ میں بیان ہوا ہے اور جو ان کی آخری تحقیق ہے۔

دلیل نمبر 11: غزوات میں صحابیاتؓ کی شرکت سے استدلال:

صحیح بخاری کی روایت ہے: ”دور نبویؐ میں بعض اوقات صحابیاتؓ غزوات میں شریک ہوتی تھیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں، شہیدوں کی لاشیں اٹھاتی تھیں اور مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں۔“ اس سے ثابت ہوا کہ خواتین بھی مردوں کے دوش بدوش سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں۔

جواب: جہاد میں شرکت کو حکمرانی کی دلیل سمجھ لینا یا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے برابر سمجھنا کس طرح مناسب سمجھا جاسکتا ہے! حالت جنگ تو ایک ایمر جنسی کی کیفیت ہوتی ہے، جبکہ پورے ملک کی سربراہی ایک مستقل اور اہم ذمہ داری ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے پر کس طرح قیاس کیا جاسکتا ہے! پھر جو خواتین جاتی تھیں، وہ لڑنے کی نیت سے نہیں بلکہ زخمیوں کی مرہم پٹی اور تیمارداری کی خاطر جاتی تھیں۔ یہ بات واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ اس دور میں مرہم پٹی،

[۱] تفسیر بیان القرآن، پارہ 19، صفحہ 74، ج 8، مطبع مجتہائی دہلی

زخمیوں کو پانی پلانا۔ ان کو دوا وغیرہ پلانا عورتوں ہی کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ زنگ کا الگ سے کوئی شعبہ نہیں ہوتا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ کچھ غزوات میں کچھ خواتین اپنے باپ، بھائی یا شوہر کے ساتھ شامل ہوتی تھیں۔ جس سے ان کا مقصود زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، کھانے پینے کا بندوبست کرنا اور تیر پکڑانا، پانی پلانا وغیرہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ احادیث و تفسیر کی کتابوں میں غزوات میں خواتین کی شرکت کے اِکاد کا واقعات ہی ملتے ہیں اور وہ بھی ان خواتین کو اپنے محرم رشتہ داروں کے ساتھ ہی جانا ہوتا تھا۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ نہ تو عورتوں کو جہاد پر جانے کا نبی پاک کی طرف سے حکم ملا اور نہ ہی سب عورتیں سب غزروں میں شامل ہوئیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں خواتین نے اپنے شوق سے جہاد میں شامل ہونے کی اجازت مانگی، تو آپؐ نے فرمایا: ”تمہارا جہاد توجج ہے۔“ [۱] لغزوہ خیبر کے موقع پر آپؐ نے چند خواتین کو لشکر میں دیکھا تو پوچھا: ”تم کس کے ساتھ آئی ہو اور کس کی اجازت سے آئی ہو؟“ پھر آپؐ نے انہیں ساتھ جانے کی اجازت نہیں دی بلکہ انہیں واپس جانے کا حکم دیا اور وہ واپس چلی گئیں۔ [۲]

اس لیے مذکورہ استدلال اپنے اندر کوئی قوت نہیں رکھتا۔ عہد نبویؐ ہو یا بعد کا خلفائے راشدینؓ کا دور، امت کو بہت سے اجتماعی و سیاسی مسائل پیش آتے رہے۔ مگر ان کے حل کے لیے کسی خاتون کو کبھی نامزد نہیں کیا گیا، نہ کوئی عورت فوج کی کمانڈر بنائی گئی، نہ کسی علاقے کی گورنر مقرر ہوئی، نہ قضا کا محکمہ اس کو دیا گیا، نہ مالی امور کا سرپرست بنایا گیا۔ غرض اس دور کے اسلامی معاشرے میں عورتیں کہیں بھی مردوں کے دوش بدوش نظر نہیں آئیں۔ بالخصوص سیاست و جہان بینی کا شعبہ تو اس سے بالکل خالی رہا ہے۔ پھر وہ خواتین غزوات میں اپنے محرم کے ہمراہ نبی پاکؐ کی اجازت سے جاتی تھیں، جبکہ آج کل خاتون سربراہ کو حلف ”تہا“ اٹھانا ہوتا ہے اور پھر پوری ذمہ داری تہا اٹھانا پڑتی ہے۔ ان دونوں مثالوں کا آپس میں کیا اور کیسے موازنہ ہو سکتا ہے!

دلیل نمبر 12: فاطمہ جناح کی نامزدگی سے استدلال:

صدر ایوب خاں کی آمریت سے نجات حاصل کرنے کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کو

[۱] صحیح بخاری

[۲] سنن ابی داؤد

صدارتی انتخاب میں امیدوار نامزد کیا گیا تھا۔ اس وقت مولانا مودودی جیل میں تھے۔ انہوں نے جیل سے رہائی پانے کے بعد محترمہ فاطمہ جناح کی صدارتی انتخابات میں نامزدگی کی توثیق کر دی، اس کی نامزدگی کو بھی بے نظیر بھٹو کے حمایتی بڑے زور شور سے پیش کر رہے ہیں۔ بلکہ خود بے نظیر نے بھی قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر عورت اس وقت سربراہ بن سکتی تھی تو آج کیوں نہیں بن سکتی؟

جواب: اس سوال کا مفصل جواب ایک باخبر صحافی جناب محمد صلاح الدین، مدیر ”تکبیر“ کراچی، کے حسب ذیل اقتباس میں ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

1- ”اس وقت معاملہ یہ تھا کہ ایوب خاں کی آمریت سے نجات پانے کی کوئی مناسب صورت حال تلاش کی جا رہی تھی۔ پہلے اعظم خاں کا انتخاب کیا گیا۔ لیکن اس کی بھنک پڑتے ہی خصوصی پیغامبر مولوی فرید احمد کولہو رائیر پورٹ پر گرفتار کر لیا گیا اور اعظم خاں بھی گرفت میں لے لیے گئے۔ چودھری محمد علی، نواب زادہ نصر اللہ خاں اور دیگر حضرات نے مادرِ ملت کی شخصیت میں ایوب خاں کا توڑ تلاش کیا۔ ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا۔ مولانا مودودی اس وقت جیل میں تھے۔ فتویٰ کے لیے پہلے مولانا مفتی محمد شفیع سے رجوع کیا گیا۔ ان پر دباؤ بڑھا تو دوسٹر کا فتویٰ جاری کر دیا کہ:

”دو برائیوں میں سے کمتر برائی کا انتخاب کر لیا جائے۔“

ایوب خاں اپنی پرویز نوازی، رویت ہلال اور عائلی قوانین کی وجہ سے دینی حلقوں میں خاصے ناپسندیدہ قرار پا چکے تھے۔ مادرِ ملت صرف عورت نہیں تھیں، بلکہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح کی بہن تھیں۔ پختہ کردار، نیک نام، انتہائی محترم خاتون تھیں، سن رسیدہ تھیں، متنازعہ نہ تھیں۔ ان کے کردار پر کسی حرف گیری کی گنجائش نہ تھی، ان کی ذات سے کوئی سیکنڈل وابستہ نہ تھا۔ ان سے قوم کو گہری عقیدت تھی۔ مولانا مودودی کی رہائی سے قبل ہی وہ رائے عامہ کی ترجمان بن چکی تھیں۔ مولانا نے رہائی پاتے ہی ان کے حق میں رائے دے دی..... وہ عمر کے اس حصے میں تھیں جہاں شریعت پردے وغیرہ کی پابندیوں کو خود ہی نرم کر دیتی ہے۔ جہاں وہ قباحتیں باقی نہیں رہتیں، جن کے پیش نظر ٹک کر گھر بیٹھنے اور پردہ کے حدود قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان سب

کے باوجود مولانا مودودی کی رائے سے اختلاف کیا گیا۔ ان کی اپنی جماعت کے لوگوں نے اختلاف کیا..... یہ ایسی رائے نہ تھی جسے علمائے کرام اور عام مسلمان آسانی سے ہضم کر لیتے..... خود مولانا کے فیصلے میں خصوص تھا، عموم نہیں۔

2۔ اس معاملے کا دوسرا اور زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ مادر ملت سربراہ حکومت بننے کی امیدوار نہیں تھیں۔ انہوں نے مذاکرات کرنے والے لوگوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں تحریک کی قیادت کر سکتی ہوں، ملک کی صدارت مجھے منظور نہیں۔ انہیں جب بتایا گیا کہ موجودہ نظام میں امیدواری صدارت کے بغیر کوئی تحریک نہیں چل سکتی تو انہوں نے عبوری مدت کا سوال اٹھایا اور پوچھا کہ میری جگہ اصل صدر لانے میں تمہیں کتنا عرصہ لگے گا؟ تو جواب دیا گیا کہ تقریباً ایک سال۔ مگر انہوں نے اس طویل عرصے کو مسترد کر دیا اور صرف تین ماہ کے اندر اندر نیا صدر منتخب کرنے کی مہلت دے دی۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو وہاں حصول حکومت کا محرک ہی موجود نہ تھا۔ وہ کسی خواہش اقتدار کے بغیر محض آمریت سے نجات دلانے کے لیے میدان میں نکلنے پر آمادہ ہوئی تھیں۔ اب ان کی عمر، مخصوص حالات، محدود اور متعین مقصد، حصول اقتدار کے محرک کی عدم موجودگی اور صفات کردار سب کو ذہن میں رکھا جائے تو اس مثال سے عورت کی حکمرانی کا عام جواز نکال لینے کا کوئی قرینہ نہیں بنتا۔ اس کا کہیں اور اطلاق ہوگا تو عمر، صفات کردار اور مخصوص و محدود مقصد سب ہی کو پیش نظر رکھا جائے گا، محض ہم جنس ہونا کافی نہیں ہوگا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اب بھی تو آمریت سے نجات پانے کے لیے ایک طاقتور حریف کی ضرورت تھی۔ جواباً عرض ہے کہ وہ آمر (جنرل ضیاء الحق مرحوم) تو جنگ اقتدار سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اب اس کے مقابل آنے کی کیا ضرورت؟ دوسرے مادر ملت کی طرح خواہش اقتدار ترک کیجیے! قوم کی قیادت کا حق ادا ہو گیا، جمہوریت کی منزل سر ہو گئی۔ اب اپنا متبادل آگے لائیے! یہاں کوئی ایسی ہنگامی یا اضطراری صورت حال نہیں کہ عورت کی سربراہی کے بغیر ملک و ملت کا کام ہی نہ چل سکے۔“ [1]

عام حالات میں تو مولانا مودودی بہر صورت عورت کی سربراہی کے مخالف ہیں۔ ان کی رائے پیچھے اجماع امت کے عنوان کے تحت گزر چکی ہے۔ انہوں نے صرف اس خصوصی صورت

حال کے بارے میں فتویٰ دیا تھا جس میں سربراہ بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا۔

دلیل نمبر 13: اسمبلیوں کی رکنیت سے استدلال:

جب خواتین اسمبلیوں کی رکن بن سکتی ہیں تو حکومت کی سربراہ بھی بن سکتی ہیں کیونکہ سربراہ ارکان اسمبلی میں سے ہی بنایا جاتا ہے، تو جو شخص رکن اسمبلی بننے کا اہل ہے اسے حکومت کی سربراہی کا اہل بھی ہونا چاہیے۔

جواب: اسمبلیاں ایک طرف تو قانون ساز ادارے ہیں، دوسری طرف انہی ارکان اسمبلی میں سے وزیراعظم، صدر مملکت یا گورنرز اور وزراء اعلیٰ کا انتخاب ہوتا ہے۔ قانون سازی ایک الگ کام ہے، جو علم و فضل اور غور و فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح مرد اپنی علمی صلاحیت کے مطابق قانون سازی اور پالیسی سازی میں حصہ لے سکتا ہے، اسی طرح عورت بھی اپنی علمی و فکری استعداد کے مطابق اس میں حصہ لے سکتی ہے۔ اسی طرح وہ وزیراعظم یا صدر مملکت، گورنرز اور وزراء اعلیٰ کے عہدوں کے انتخاب میں اپنی رائے دے سکتی ہے۔ قرآن کریم اور احادیث سے عورتوں سے مشورہ لینا اور اگر موزوں و صائب ہو تو اس پر عمل کرنے کا جواز ثابت ہے۔ پھر مجلس شوریٰ میں خواتین کی منتخب کردہ نمائندہ عورتیں، عورتوں سے متعلق قوانین و اصلاحات کے بارے میں عورتوں کے نقطہ نظر سے حکومت کو آگاہ کر سکتی ہیں اور حکومت عورتوں سے متعلق مسائل میں ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی قدم اٹھائے گی۔ مثلاً حدیث میں اسماء بنت یزید انصاریہ کا واقعہ بڑا مشہور ہے کہ وہ کس طرح خواتین کی نمائندہ بن کر نبی کریم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور خواتین کے مسائل آپ سے پوچھے۔ خلفاء راشدین حضرت عائشہؓ سے خصوصاً اور دیگر امہات المؤمنینؓ سے عموماً پیش آمدہ مسائل میں رائے لیا کرتے تھے۔ صلح حدیبیہ میں احرام کھولنے کے سلسلے میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ کا مشورہ صائب پا کر قبول فرمایا اور اس پر عمل کیا۔ حضرت عمرؓ اپنے دور میں حضرت شفاء بنت عبد اللہ کو مشورہ میں مقدم رکھا کرتے تھے اور عموماً ان کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔ لہذا اصولی مسئلہ یہی ہے کہ اگر قومی یا صوبائی اسمبلی کی رکنیت کا شرعی معیار اہلیت موجود ہو تو صرف عورت ہونے کی بنا پر عورتوں کو ان

اداروں کی رکنیت سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اسمبلی کا رکن بننا الگ ذمہ داری ہے اور سربراہ مملکت بننا الگ ذمہ داری ہے۔ حکومت کی سربراہی کو قانون ساز اداروں کی رکنیت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر قرآن و سنت کی نصوص موجود ہیں، جبکہ عورتوں سے صلاح مشورہ لینے اور اس پر عمل کرنے کی مثالیں دور نبویؐ اور دور خلفاء راشدینؓ میں موجود ہیں۔

دوم: ان اداروں کا رکن بننا، علم و فضل اور غور و فکر سے مشورہ دینا یا اونچے مناصب کے لیے ذمہ داران کا انتخاب کرنے تک محدود ہے۔ جبکہ سربراہ حکومت کی ذمہ داریاں عام رکن اسمبلی کے مقابلہ میں بہت وسیع ہیں۔ وہ پورے ملک کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوتا ہے، یعنی فوج، مالیات، امن عامہ کے مسائل، خارجہ پالیسیاں، بیرونی ممالک کے دورے وغیرہ۔ اس واضح فرق کے ہوتے ہوئے آخر کس طرح حکومت کی سربراہی کو عام رکن اسمبلی پر قیاس کیا جاسکتا ہے؟

علمائے کرام نے عورت کی حکمرانی کے جواز کا کبھی فتویٰ نہیں دیا:

27 فروری 1989ء کو راولپنڈی میں عورت کی سربراہی کے مسئلے پر اہل سنت کے تمام مکاتب فکر کے علماء کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا تھا۔ جس میں ملک بھر سے علمائے کرام شریک ہوئے اور انہوں نے متفقہ طور پر عورت کی حکمرانی کے عدم جواز کا فتویٰ دیا۔^[۱]

جمعیت علماء اسلام (درخواستی گروپ) کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی نے وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے نام اپنے ایک مراسلے میں ان کے اس موقف کو کہ 1960ء میں علمائے کرام نے عورت کی حکمرانی کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا، غلط قرار دیتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ علمائے کرام نے کسی دور میں بھی عورت کے حکمران ہونے کے جواز میں فتویٰ نہیں دیا۔ 1951ء میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ مسالک سے تعلق رکھنے والے 31 علماء کرام نے جن 22 دستوری نکات کا متفقہ طور پر اعلان کیا تھا، ان میں یہ صراحت موجود ہے کہ حکمران کے لیے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا مرد ہونا بھی ضروری ہے۔ 1960ء میں بھی تینوں

بڑے مکاتب فکر (دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث) کے علماء کرام نے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ عورت شرعاً مسلم ملک کی حکمران نہیں بن سکتی۔ 1973ء میں بھی اس ضمن میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ عورت کا حکمران بننا شرعاً جائز نہیں مگر پیپلز پارٹی نے دستور ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر یہ تجویز مسترد کر دی تھی۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کی قائم کردہ مجلس شوریٰ میں جو آئینی کمیٹی قائم کی گئی تھی، اس کی رپورٹ میں بھی قاضی عبداللطیف کا یہ اختلافی نوٹ موجود ہے کہ حکمران کے لیے مسلمان مرد ہونے کی شرط ضروری ہے۔ اس لیے موجودہ وزیراعظم کا کراچی میں ”اپوا“ کی طرف سے اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالے میں یہ کہنا کہ علماء عورت کی حکمرانی کے جواز میں فتویٰ دے چکے ہیں، تاریخی لحاظ سے درست نہیں۔ [۱]

ہمارا اصل مسئلہ

آخر میں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ ایمان کی کمزوری اور یقین کے اضمحلال کا ہے، جس کے نتیجے میں ہمارا مسلمان کی طرح جینے اور اسلام کی حالت میں مرنے کا ارادہ کمزور پڑ گیا ہے۔ اسی بنا پر شریعت کے احکام کے ضمن میں تمام چور دروازوں کی تلاش میں ہم سرگرداں رہتے ہیں اور مغربی تہذیب کے جھوٹے نگوں کی صنّاعی سے مرعوب ہو کر شریعت کے احکامات کی کتر بیونت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ رشد و ہدایت کے اصل منبع اور علم و عرفان کے اصل مخزن، قرآن کی طرف صدق دل سے رجوع کریں، اس کی تعلیم و تربیت سے اپنے ایمان کو تقویت پہنچائیں اور پورے معاشرے میں تعلیم قرآنی کو پھیلا دیں۔ جب معاشرے میں ایمان راسخ اور مستحکم ہوگا تو خود بخود شریعت کے احکام کی پیروی کا جذبہ بیدار ہوگا بلکہ یہ جذبہ آہستہ آہستہ اتنا قوی ہوگا کہ ہمیں کوئی چور دروازہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی

۔ گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

بے نظیر کی ناکامی:

لیکن اگر اس سے گریز کیا گیا، تو خواتین کو بار بار سربراہ بنانے کے المناک سانحات پیش آتے ہی رہیں گے۔ حالانکہ خود بے نظیر صاحبہ دوبار منتخب ہوئیں، مگر دونوں بار اپنی نااہلی کی بنا پر اپنی مقررہ میعاد پوری نہ کر سکیں۔ جب یہی بات شریعت کہتی ہے کہ عورت یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی تو پھر اس کی تردید کیوں کی جاتی ہے؟ اب تو تاریخ نے بھی اس کی دوبارہ توثیق کر دی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ محترمہ بے نظیر صاحبہ کی ناکامی کا بہت بڑا سبب ان کا شوہر آصف زرداری تھا، جس نے بیوی کو دبا کر زرا ندوزی، کرپشن اور لوٹ مار کے وہ ریکارڈ قائم کیے کہ وطن عزیز پاکستان دنیا میں کرپشن میں دوسرے نمبر پر شمار ہونے لگا۔

بے نظیر حکومت پر تبصرہ:

سیاسی مخالفوں کے تبصرے تو پڑھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ مخالفت پر مبنی ہوتے ہیں، مگر خود ان کے منتخب کردہ صدر فاروق لغاری جو، ان کی اپنی پارٹی کے بھی بڑے وفادار تھے، ان کی حکومت توڑنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے الزامات کی ایک لمبی چارج شیٹ ان کی حکومت کو برخاست کرنے کے لیے پیش کی۔ اسی طرح ان کے ایک حلیف نوابزادہ نصر اللہ خاں کا بیان تھا: ”بے نظیر حکومت پاکستان کی تاریخ کی سب سے زیادہ غیر معقول حکومت تھی۔“ [۱] ”پاکستان میں اضطراب آخری حد کو پہنچ گیا تھا۔“ [۲]

15-11-1996 کے روزنامہ نوائے وقت ہی میں یہ خبر شائع ہوئی: ”بے نظیر حکومت کی برطرفی پر مغرب میں بھی کسی نے آنسو نہ بہایا۔ بے نظیر صاحبہ کو اپنی برطرفی کے بعد اس بات پر بڑا دھچکہ لگا کہ 5 نومبر (جب ان کی حکومت برخاست کی گئی) سے آج تک کسی بھی ملک نے نہ تو ان کی برطرفی کی مذمت کی، نہ اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ذرائع کے مطابق وزارت خارجہ نے

[۱] ہفت روزہ ندائے ملت، 15 نومبر 96ء، صفحہ 2

[۲] نوائے وقت 15 نومبر 96ء

تبدیلی کے متعلق عالمی رائے عامہ کے بارے میں اپنی سمری نگران وزیراعظم کو پیش کر دی ہے کہ پاکستان کی امداد کرنے والے ملک اس برطرفی کو پاکستان کا اندرونی معاملہ قرار دیتے ہیں۔ خود بی۔بی۔سی نے بھی بے نظیر دور کی ناکامی اور ابتری کی رپورٹ کئی بار نشر کی تھی۔“

بہر صورت مسلمانوں کے لیے جواں سال اور خوبصورت بے نظیر کی حکومت کا جو سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو تھا، وہ ان کی بھرپور جوانی، بھرپور فیشن پرستی کے ساتھ ساتھ ان کے خانگی مسائل تھے۔ پہلے دور حکومت میں ان کے ہاں بچی کی پیدائش ہوئی۔ حمل کے آغاز سے لے کر وضع حمل تک کس طرح وہ عالمی ذرائع ابلاغ کا موضوع بنی رہی! آخری آٹھ دس دن جس انداز میں پاکستانی وزیراعظم کی خبریں چھپتی رہیں، عزت ماب اور عفت باز خواتین کے سر جھکا دینے کو وہی خبریں کافی تھیں۔

قبل ازیں جو مسلم خواتین بد قسمتی سے مسلمانوں کی سربراہ مختلف اوقات میں بنتی رہی ہیں، کم از کم اس طرح کی چٹارے دار خبروں کا موضوع ہرگز نہ بنی ہوں گی۔

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْاَبْصَارِ

علامہ اقبال کی پیشین گوئی کس طرح پوری ہوئی

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند

غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اوٹ چاہے گی

آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض

کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہے گی

کیا اب بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ”جس قوم نے اپنے معاملات

عورت کے سپرد کر دیئے، فلاح ہرگز نہیں پائے گی“ کسی وضاحت کا محتاج رہ گیا ہے؟

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

”يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ وَاللَّهِ! مَا مِنْ أَحَدٍ أَغْيَرُ مِنَ اللَّهِ
أَنْ يَزِنِي عَبْدُهُ أَوْ تَزِنِي أَمَّتُهُ...“

(صحیح بخاری: 1044)

اے امت محمد! اللہ کی قسم! جب اللہ کا کوئی بندہ یا بندی

زنا کا ارتکاب کرتے ہیں تو (اس مکروہ فعل پر)

اللہ سے زیادہ کسی کو غیرت نہیں آتی۔“

غیرت کا قتل اور اسلامی احکام

- ❁ سمیعہ عمران کیس
- ❁ مشرق و مغرب کا فرق
- ❁ این۔ جی۔ اوز کا سنگین جرم
- ❁ پاکستان میں قتل غیرت کی اصل حقیقت
- ❁ پاکستانی معاشرہ اور اسلامی احکامات
- ❁ قتل غیرت کے حوالے سے فقہی احکامات کا مختصر جائزہ
- ❁ مطلوب طرزِ عمل
- ❁ قتل غیرت کا حکم مختلف مواقع کے لحاظ سے مختلف ہوگا
- ❁ قتل کی صورت میں احکامات
- ❁ خلاصہ بحث
- ❁ چند ضروری مباحث
- ❁ ہمارا این جی اوز سے بنیادی اختلاف
- ❁ پاکستانی رواج اور قتل غیرت
- ❁ 2016ء کا قانون قتل غیرت
- ❁ مسئلہ کا اسلامی حل

غیرت کا قتل اور اسلامی احکام

گزشتہ کئی سالوں سے مغرب کے سرمائے سے چلنے والی ”انسانی حقوق“ کی علم بردار این جی اوز کی طرف سے مسلسل یہ مطالبہ کیا جاتا رہا ہے کہ پاکستان میں غیرت کے جرائم کا خاتمہ کیا جائے۔ یعنی غیرت کے نام پر قتل کرنے والے قاتلوں کے لیے سزائے موت کا قانون نافذ کیا جائے۔ اگست 1997ء میں خواتین تحقیقاتی کمیشن کی سفارشات جب منظر عام پر آئیں تو اس میں ایک مندرجہ ذیل سفارش بھی شامل تھی۔

”غیرت کے ہاتھوں قتل کو قانون کے تحت قتلِ عمد قرار دیا جائے اور اس کے لیے مناسب

قانون سازی کی جائے۔“ [۱]

مذکورہ ”خواتین تحقیقاتی کمیشن“ نے جسٹس ناصر اسلم زاہد کی سربراہی میں اپنی یہ رپورٹ پیش کی تھی مگر اس کمیشن کی اصل روح رواں پاکستان میں یو این او کی طرف سے ”بنیادی انسانی حقوق“ کی علم بردار عاصمہ جہانگیر اور ان کی مغرب زدہ اپوائی بیگمات تھیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ کوئی لڑکا اور لڑکی گھر سے بھاگ کر نکاح کے بغیر آپس میں جنسی تعلقات قائم کر لیں یا والدین کی مرضی کے بغیر نکاح کر لیں تو یہ ان کا حق ہے۔ خاندان کے افراد ان کو کیوں قتل کر دیتے ہیں؟ پھر عدالتیں بھی ایسے مقدمات کو غیرت کا قتل قرار دے کر ان کی سزائیں کیوں تخفیف کر دیتی ہیں؟ بجائے اس کے کہ ان کو قتلِ عمد کی سزا ملے اور قصاص کے طور پر ان کو بھی قتل کیا جائے، عدالتیں تو اس کو قتلِ خطا قرار دے کر ان کو چند سال کے لیے قید کی سزا دے دیتی ہیں۔ چند سالہ سزا بھگت کر

وہ پھر چھوٹ جاتے ہیں۔ اس طرح تو غیرت کے ہاتھوں خواتین کا قتل ہوتا رہے گا اور شوہروں یا قریبی عزیزوں مثلاً باپ بھائیوں کے ہاتھوں خواتین کا استیصال جاری رہے گا۔ یہ کمیشن اپنی رپورٹ میں ہر سال ایسے قتل کی باقاعدہ تعداد بھی ریکارڈ کراتا ہے۔ چنانچہ ان کی رپورٹ کے مطابق 1995ء میں پورے ملک میں 110 خواتین غیرت کی بھینٹ چڑھا دی گئیں اور 98ء میں یہ تعداد 286 بیان کی گئی۔

سمیعہ عمران کیس

اس مسئلہ کو زیادہ شد و مد سے پشاور کی سمیعہ عمران [۱] کے کیس میں اٹھایا گیا۔ شادی شدہ سمیعہ اپنے آشنا نادر خاں کے ساتھ بھاگ کر لاہور آئی تھی۔ عاصمہ جہانگیر کے ادارہ ”دستک“ میں نادر خاں نے اسے ٹھہرایا۔ پھر وہ روزانہ کئی گھنٹے دستک میں آ کر اس سے گفتگو کرتا۔ اس کے والدین جب حج سے واپس آئے اور بیٹی کے کرب و ماتم سے واقف ہوئے تو فوراً سمیعہ کا باپ، ماں اور چچا اپنے ملازم حبیب الرحمن کے ہمراہ لاہور آئے۔ لڑکی کی والدہ، اس کا چچا اور حبیب الرحمن تینوں ”دستک“ میں آئے۔ والدہ نے پہلے بیٹی کو سمجھایا بچھڑا دیا۔ جب وہ نہ مانی تو والدہ کے اشارے سے ملازم حبیب الرحمن نے اسے قتل کر دیا۔ اس پر ”دستک“ کی نگران حنا جیلانی نے اپنے چوکیدار کو بلایا۔ اس نے آنا فانا سمیعہ کے قاتل حبیب الرحمن کو ڈھیر کر دیا۔ بعد ازاں حنا جیلانی نے واویلا مچایا کہ حبیب الرحمن نے سمیعہ کو قتل کیا ہے، یہ غیرت کا قتل ہے۔ اس غیرت کے قتل کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ اگلے دن این جی اوز نے 15 اپریل 1999ء کو ”غیرت کے نام پر قتل“

[۱] روزنامہ نوائے وقت کی تفصیلات کے مطابق یہ سمیعہ عمران کی بیوی تھی۔ اپنے ماں باپ کی بہت لاڈلی تھی، باپ نے خود اس کو گھر تعمیر کروا کر دیا، گاڑی لے کر دی مگر وہ اپنے گھر میں دل نہ لگاتی تھی بلکہ نادر خاں سے آشنائی جوڑی تھی۔ وہ اس کو نادر خاں کی آشنائی سے ہر ممکن روکنے کے لیے اس کی دل جوئی کرتا رہا۔ شوہر کسی کام کے سلسلے میں گھر سے باہر تھا۔ اسی اثناء میں والدین کو حج کے لیے جانا پڑا۔ ان کے پیچھے سمیعہ اپنے آشنا نادر خاں کے ساتھ پشاور سے بھاگ کر لاہور آ گئی۔ (روزنامہ نوائے وقت، 9 اپریل 1999ء)

کے موضوع پر پریس کلب لاہور میں ایک سیمینار منعقد کیا۔ جس میں عاصمہ جہانگیر، حنا جیلانی اور ان کے دیگر ہم خیال دانشوروں نے جارحانہ انداز میں غیرت کے قتل کے خلاف دل کی خوب بھڑاس نکالی۔ 16 اپریل کو روزنامہ ”دن“ میں اس سیمینار کی روداد اس طرح شائع ہوئی۔

حنا جیلانی کی دہائی: غیرت، غیرت، غیرت، خواتین کو بھی جینے کا حق دیا جائے۔ اس کے نیچے بیان یہ تھا: ”سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عورت کے متعلق عدالتوں کا رویہ امتیازی ہے۔ عدالتوں کو چاہیے کہ وہ عورت کو عزت و وقار سے جینے کا حق دیں۔ انہوں نے کہا کہ غیرت کے نام پر قتل، مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کی اصطلاح ہے اور آج ہمیں اسٹیٹ کے تمام اداروں کو اس سوچ کے خلاف جھنجھوڑنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ سمیعہ عمران کے قتل کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

حنا جیلانی کا مذکورہ بالا بیان ان این جی اوز کی قلبی واردات کی مکمل غمازی کر رہا ہے۔ بظاہر تو وہ عورتوں کے حقوق کی محافظ بن رہی ہیں مگر درحقیقت وہ پورے پاکستانی معاشرہ بلکہ پاکستان کے عدالتی نظام کی بھی توہین کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔

اس واقعہ کے بعد حقوق انسانی کے ان نام نہاد علم بردار این جی اوز کی طرف سے یہ سوال ہر پلیٹ فارم پر بکثرت اٹھایا گیا۔ پریس کانفرنسز اور اجتماعات میں ایک ہی سوال جگہ جگہ گھوم رہا تھا کیا آپ غیرت کے قتل کو جائز سمجھتے ہیں یا ناجائز؟ گویا اس قتل کو ناجائز سمجھنا تو ترقی پسندی کی دلیل ہے اور جائز سمجھنا رجعت پسندی بلکہ دہشت گردی کی علامت ہے۔

چنانچہ بیجنگ پلس فائیو کانفرنس میں بھی پاکستان کے سرکاری وفد کو یو این او کے ادارے میں اس سوال کا جواب دینا پڑا۔ غیرت کے جرائم کا پاکستانی وفد نے یوں جواب دیا کہ آپ کے ہاں مغرب میں بھی تو جذبات کے تحت قتل ہوتے ہیں۔ غیرت کا قتل اور جذبات کا قتل بس ایک ہی چیز ہے۔ اس طرح یو این او والوں کو سر دست تو چپ کرنا پڑا۔ مگر ہنوز ان کا قتل غیرت کو ختم کرنے کا دباؤ پاکستان پر موجود ہے۔

یہ عجیب تضاد دیکھنے میں آتا ہے کہ عام حالات میں این جی اوز سزائے موت کی مخالف

ہیں، کیونکہ عملاً مغرب میں سزائے موت کو وحشیانہ قرار دے کر مدت سے معطل کر دیا گیا ہے۔ مگر یہاں قتل غیرت کو سنگین مسئلہ قرار دے کر وہ قاتل کے لیے سزائے موت کا مطالبہ خود کر رہی ہیں۔

بہر حال 21 جولائی 2016ء کو پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی نے غیرت کے نام پر جرائم کا بل 2016ء متفقہ طور پر پیش کیا گیا۔ اور پھر پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں اسے 16 اکتوبر 2016ء کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ نئی قانون سازی میں مغربی این جی اوز کی خواہش کے مطابق وہ تمام نقص دور کر دیئے گئے جن کا فائدہ اٹھا کر ایسے قاتل جو رشتہ دار بھی ہوتے، اہل خاندان سے معافی حاصل کر کے سزا سے بچ جایا کرتے تھے۔ غیرت کے نام پر قتل کے خلاف ایکٹ میں قصاص کا حق برقرار رکھا گیا، تاہم قصاص کے حق کے باوجود عمر قید کی سزا لازماً ہوگی اور غیرت کے نام پر قتل کے مقدمات میں اب پہلے کی طرح صلح نہیں ہو سکے گی۔

مشرق و مغرب کا فرق:

دراصل مشرق اور مغرب کی معاشرتی و اخلاقی اقدار بالکل جدا گانہ ہیں۔ اہل مغرب کے ہاں غیرت، حیا اور عصمت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ نکاح بھی ان کے ہاں ایک فرسودہ رسم بنتی چلی جا رہی ہے۔ وہاں ایک مرد بیک وقت کئی عورتوں سے تعلق رکھ سکتا ہے اور بیوی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اسی طرح بیوی کے بھی کئی جگہ مراسم ہوتے ہیں۔ مگر اس پر شوہر کو اعتراض کا حق نہیں۔ لہذا وہ اہل مشرق کے غیرت و حمیت کے جذبات و احساسات کو محسوس نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی اسی آبرو باختہ معاشرت کو بہترین سمجھ کر اسلامی ممالک میں اس کو پھیلانا اپنے لیے لازمی سمجھتے ہیں۔ یو این او کی طرف سے ممبر ممالک میں یہ منحوس کام این جی اوز کے ذریعے سرانجام دیا جاتا ہے۔ مزید برآں میڈیا کے ذریعے اسلامی تہذیب و ثقافت کے خلاف اور مغربی ثقافت کے حق میں زبردست پروپیگنڈہ جارحانہ انداز میں برپا کیا جا رہا ہے۔ اسلام کے مضبوط خاندانی نظام میں دراڑیں ڈالنے کے لیے وہ اپنے یہ بظاہر پرکشش اور لبرل نظریات پیش کرتے رہتے ہیں۔ عورت کو ترقی کے نام پر گھر سے باہر نکالنا، بچوں کو والدین سے متنفر کرنا، ولی کے بغیر پسند کی شادی کو جائز قرار دلوانا وغیرہ ان کے اہم مقاصد ہیں۔

این جی اوز کا سنگین جرم:

این جی اوز پاکستان میں قتل غیرت کو بھیانک جرم اور دہشت گردی بنا کر پیش کر رہی ہیں۔ ان کی ساری ہمدردی مفرور ہونے والی خواتین سے ہے جو گھروں سے اپنے آشناؤں کے ساتھ بھاگ رہی ہیں۔ شادی شدہ ہونے کی شکل میں ان کے معصوم بلکتے بچے اور ان کے شوہر اور اجڑا گھرانہ کو نظر نہیں آتے۔ کنواری ہونے کی شکل میں والدین کی عزت کی تباہی و بربادی اور عمر بھر کی بدنامی کا وہ شعور و ادراک کر ہی نہیں سکتیں۔ نہ انھیں معاشرتی اقدار کی پامالی کا کوئی شعور ہے۔ اگر وہ عورتوں کے حقوق کے لیے اتنی ہی مخلص ہیں تو کشمیر، فلسطین، بوسنیا، کوسوو، برما اور دیگر مقامات پر جو عورتوں کی عزتیں پامال ہو رہی ہیں اور دشمنوں کے ہاتھوں گاجر مولیٰ کی طرح کٹ رہی ہیں۔ کچھ ان پر احتجاج کرتیں، کچھ ان کے انسانی حقوق کی بھی دہائی دیتیں۔ مگر ان کا تو مقصد ہی کچھ اور ہے! اگر وہ پاکستان میں یہ قتل ختم کرنا چاہتی ہیں تو پھر فحاشی، عریانی اور شہوت رانی کے سد باب کے لیے بھی کوششیں کریں۔ لڑکیوں کی اخلاقی تربیت کے مراکز قائم کریں تو ہمیں بھی اندازہ ہو کہ وہ ایسے قتل رکوانے میں کچھ مخلص ہیں۔ وگرنہ یہی سمجھا جائے گا کہ وہ پاکستانی معاشرے سے غیرت کے قتل کے خلاف چلائی جانے والی مہم کے بجائے خود غیرت اور عصمت و آبرو ہی کے خلاف ہیں۔ انھیں صرف عورتوں کو گھروں سے فرار کرانے اور کو میرج کرانے سے ہی دلچسپی ہے۔ کسی بھی دین دار خاتون کی معمولی سی کمزوری کو خوب مریج مصالحہ لگا کر عالمی ذرائع ابلاغ میں بھرپور کوریج دلا کر پاکستان کو بدنام کرتی ہیں۔ چنانچہ صائمہ کیس کا من پسند فیصلہ کروا لینے کے بعد عاصمہ جہانگیر کی ان جارحانہ کارروائیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی لڑکیاں گھروں سے فرار ہونے لگیں۔ آخر خود جسٹس رمدے جس نے صائمہ ارشد کیس ^[1] کا فیصلہ سنایا تھا، کو یہ فیصلہ دینا پڑا:

”گھر سے بھاگ کر کی گئی شادی کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔“ لاہور ہائی کورٹ

^[1] یہ بھی سمیعہ عمران جیسا کیس ہے یہ 97-1996 کا کیس ہے دیندار گھرانے کی صائمہ وحید اپنے ٹیوٹر ارشد کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ دستک کے ادارے میں پناہ لی۔ کورٹ میرج کر لی تو جسٹس رمدے نے ان کے نکاح کو پاکستانی قانون کے مطابق جائز قرار دے دیا تھا۔ پھر ادارہ دستک نے ان کو بیرون ملک بھجوا دیا تھا۔

متن: بالغ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ گھر سے بھاگ کر ماں باپ کی عزت خاک میں ملا دی جائے۔ ہمارا مذہب لڑکیوں کو بے لگام ہونے کی اجازت نہیں دیتا اور ہماری معاشرتی قدریں بھی لڑکیوں کو اتنا بے لگام ہونے کی اجازت نہیں دے سکتیں۔

عدالت میں اس وقت سنا نا چھا گیا جب گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی لڑکی نے فاضل جج سے کہا: میں عاقل و بالغ ہوں۔ آپ مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کریں۔ اس پر عدالت نے ان کو توہین عدالت کا نوٹس دیا جس پر لڑکی نے معافی مانگی مگر اس کو شوہر کے ساتھ نہیں بھیجا گیا بلکہ دارالامان بھجوا دیا گیا۔^[i]

اسی طرح سابق وفاقی وزیر مشاہد حسین نے بھی کہا کہ ”ایمنسٹی انٹرنیشنل نے غیرت کے نام پر پاکستان میں خواتین کے قتل پر اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ہم بھی اس تشویش میں ان کے ہمنوا ہیں۔ قتل تو قتل ہی ہے خواہ غیرت کے نام پر ہو یا بے غیرتی کے نام پر۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہماری ترقی پسند خواتین غیرت کے نام پر قتل کو نہیں بلکہ خود غیرت ہی کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔“

پاکستان میں قتل غیرت کی اصل حقیقت:

عاصمہ جہانگیر کا نام نہاد انسانی حقوق کمیشن اندرون سندھ اور جنوبی پنجاب میں رسم ”کاروکاری“ یا ”کالا کالی“ کے واقعات کے متعلق اس طرح مبالغہ انگیز رپورٹیں دیتا رہتا ہے۔ گویا کاروکاری کے واقعات ایک دن میں کئی کئی مرتبہ وقوع پذیر ہوتے ہیں اور پاکستانی ثقافت کا اہم حصہ ہیں۔ جبکہ حقیقت کچھ اور ہے۔

جس رسم کو اندرون سندھ میں کاروکاری کہا جاتا ہے اسی کو راجن پور اور ڈیرہ غازی خاں کے قبائلی علاقوں میں کالا کالی کہا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ماضی میں ان علاقوں میں کسی جوڑے کو بدکاری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جاتا تو عورت کا خاندان اسے کالی قرار دے کر فوراً قتل کر دیتا اور مجرم مرد کے قبیلے سے بھی مطالبہ کیا جاتا کہ وہ اس مرد کو کالا قرار دے کر قتل کر دے۔ اگر وہ اپنے مرد کو خود قتل کر دے تو ٹھیک، اگر ایسا نہ کرتے تو پھر عورت کا متاثرہ خاندان خود موقع پا کر اسے بھی قتل کر دیتا۔ یہ ماضی کی بات ہے۔ اب تو جنوبی پنجاب میں ایسے واقعات

بالکل نہیں ہوتے اور اندرونِ سندھ میں بھی ان کا تناسب وہ نہیں ہے جس کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ مگر قتلِ غیرت اور کاروکاری میں ایک بنیادی فرق ہے۔ کاروکاری کے واقعات میں متعلقہ قبیلے یا قبائل کے بزرگ جمع ہو کر باقاعدہ جرگہ کی شکل میں ایک فیصلہ کرتے ہیں۔ قبائلی روایات کا یہ خود کار نظام ہے جو پولیس کے بغیر ان علاقوں میں اخلاقی جرائم کی روک تھام کے لیے بڑا موثر کردار ادا کرتا ہے جبکہ قتلِ غیرت میں اس طرح کا جرگہ کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ بلکہ عورت کے خاندان کا مرد فوراً مشتعل ہو کر اس عورت اور ملزم مرد دونوں کو قتل کر دیتا ہے۔ اس طرح کے جذبات کے قتل تو امریکہ و یورپ میں بھی کبھی کبھار سننے میں آ جاتے ہیں۔ پھر عورتوں کے قتل کے جتنے واقعات ریکارڈ ہوتے ہیں ضروری نہیں وہ غیرت کے نام پر ہی ہوں بلکہ کوئی خاندانی دشمنی، جائیداد کی تقسیم، میاں بیوی کی کشیدگی یا کوئی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ مگر این جی اوز عورتوں کے ہر قسم کے قتل کو قتلِ غیرت قرار دینے پر اصرار کرتے ہیں۔

پھر معاشرے میں مردوں کے قتل کے بھی بہت سے واقعات ہوتے رہتے ہیں، عورتوں کے قتل کے واقعات مردوں کے نصف سے بھی کم ہوتے ہیں۔ مقتول مردوں کی اچھی خاصی تعداد تو وہ ہوتی ہے جنہیں عورتوں کو چھیڑنے سے منع کرنے پر قتل کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قبائلی علاقوں میں غیرت کے نام پر قتل کا زیادہ تر شکار مرد ہی ہوتے ہیں۔ پھر عورت کی عصمت دری کے بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جہاں عورتیں جبر کا شکار ہوتی ہیں۔ عموماً ایسے معاملات میں عورتوں کو بری کر دیا جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ اور اسلامی احکامات:

اس تمام پروپیگنڈے کے در پردہ مقاصد کچھ اور ہیں۔ وہ بنیادی انسانی حقوق کی آڑ میں پاکستان میں آزاد جنسی معاشرہ قائم کرنے کی مذموم کوشش میں مصروف ہیں جبکہ ہم اہل پاکستان مسلمان ہیں۔ ہماری تہذیب جاندار، معقول اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ان مغربی اقدار سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ لہذا اہل مغرب کی مکر وہ مساعی کو روک کر کے اسلام کے احکامات کی وسیع پیمانے پر اشاعت کرنا اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں کی وضاحت پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

غیرت کے جوش میں آ کر اپنی عورتوں کو قتل کر دینے کا تصور عرب کے جاہلی معاشرے میں بھی رائج تھا۔ جب پاک دامن عورتوں پر الزام لگانے کے نتیجے میں ”قذف“ کا حکم قرآن پاک میں نازل ہوا تو اچانک یہ سوال زور شور سے اٹھا کہ غیر عورت کے بارے میں تو انسان ایسے موقع پر خاموش رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی خاوند اپنی بیوی کو کسی غیر کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھے تو کیا کرے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے یہ سوال نبی پاکؐ کی خدمت میں پیش کیا اور ایک بار نہیں دو تین بار پیش کیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے الفاظ ہیں: ”حد قذف کا حکم جب نازل ہوا تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ غیر مرد اور عورت کی بدچلنی دیکھ کر تو آدمی صبر کر سکتا ہے، گواہ موجود نہ ہوں تو زبان پر قفل چڑھا لے اور معاملے کو نظر انداز کر دے۔ لیکن اگر وہ اپنی بیوی کی بدچلنی دیکھ لے تو کیا کرے؟ قتل کرے تو الناسزاکا مستوجب ہو۔ گواہ ڈھونڈنے جائے تو ان کے آنے تک مجرم کب ٹھہرا رہے گا۔ صبر کرے تو آخر کیسے؟ طلاق دے کر عورت کو رخصت کر سکتا ہے مگر نہ اس عورت کو کسی قسم کی مادی یا اخلاقی سزا ملی، نہ اس کے آشنا کو۔ اور اگر اس کو ناجائز حمل ہو تو غیر کا بچہ الگ گلے پڑا۔ یہ سوال ابتداءً تو حضرت سعد بن عبادہؓ نے ایک فرضی سوال کی حیثیت میں پیش کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر خدا نخواستہ میں اپنے گھر میں یہ معاملہ دیکھوں تو گواہوں کی تلاش میں نہیں جاؤں گا بلکہ تلوار سے اسی وقت معاملہ طے کر دوں گا۔^[۱] لیکن تھوڑی سی مدت گزری تھی کہ بعض ایسے مقدمات عملاً پیش آ گئے جن میں شوہروں نے خود یہ معاملہ دیکھا۔ ہلالؓ بن امیہ نے آ کر اپنی بیوی کا معاملہ پیش کیا جسے انہوں نے پچشم خود ملوث دیکھا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ثبوت لاؤ ورنہ تم پر حد قذف جاری ہوگی۔“ صحابہؓ میں اس پر عام پریشانی پھیل گئی اور ہلالؓ نے کہا ”اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو نبی بنا کر بھیجا ہے میں بالکل صحیح واقعہ عرض کر رہا ہوں۔ جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ میرے معاملے میں ایسا حکم نازل فرمائے گا جو میری پیٹھ بچا دے گا۔ اس پر آیت لعان نازل ہوئی۔“^[۲]

[۱] بخاری و مسلم

[۲] تفہیم القرآن، ج 3، ص 356

سورۃ نور کی آیت 6 سے لے کر 9 تک میں لعان کے قانون کی وضاحت کی گئی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ الزام لگانے والے شوہر اور اس کی بیوی دونوں کو اللہ کو گواہ بنا کر پانچ پانچ مرتبہ اپنی بات کے ثبوت میں قسمیں کھانا پڑتی ہیں۔ اگر دونوں پانچ پانچ قسمیں کھالیں تو پھر دونوں میں جدائی کروادی جاتی ہے۔ چنانچہ ہلال بن امیہ کی بیوی کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار فرمایا تھا۔ لعان کے بعد پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں آپؐ نے فیصلہ فرمایا کہ وہ ماں کی طرف منسوب ہوگا اور اگر بالفرض اس بچہ کی شکل اس شخص سے ملتی جلتی ہو جس کے بارے میں الزام لگایا گیا تھا تب بھی لعان کے بعد عورت کو کوئی سزا نہیں دی جاسکتی۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ اگر عورت لعان کے موقع پر خاموش ہو جائے اور قسمیں کھانے سے انکار کر دے تو پھر شریعت اس کو زانی محصن کی سزا کے طور پر رجم کی سزا دینے کا حکم دیتی ہے۔ باقی رہ گیا یہ مسئلہ کیا ایسی صورت حال میں مرد خود اپنی بیوی کو قتل کر سکتا ہے؟ تو حضرت سعد بن عبادہؓ کا بار بار سوال کرنا اور آپؐ کا یہ جواب ”اپنے سردار کو دیکھو وہ کتنا غیور ہے مگر اللہ تعالیٰ تو سعد سے بھی زیادہ غیور ہے ظاہر کرتا ہے کہ از خود قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔“ آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی فرمائی: ”یا اللہ تو اس بارے میں فیصلہ فرما۔“ گویا آپؐ نے قتل کی اجازت ہرگز نہیں دی۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہے کہ نبی کریمؐ نے جب قتل سے منع فرمایا تو قتل کرنا پھر جرم ہی ٹھہرا۔ یہاں یہ نکتہ توجہ طلب ہے کہ آیا وہ قاتل ہے یا مجرم؟ کیونکہ نبی کریمؐ نے اس کو منع کر دیا تو وہ مجرم ہی ٹھہرا، یہ امر مختلف حالات پر موقوف ہے کہ کبھی از خود اقدام کرنے والا قاتل ہوتا ہے اور کبھی محض قانون کو ہاتھ میں لینے کا مجرم اور دونوں کے شرعی احکام مختلف ہیں جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

لعان کے اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے سید مودودی رقمطراز ہیں:

”جو شخص بیوی کی بدکاری دیکھے مگر لعان کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے قتل کا مرتکب ہو جائے، اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اسے قتل کیا جائے گا کیونکہ اسے بطور خود حد جاری کرنے کا اختیار نہ تھا، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ اس کے فعل پر کوئی مواخذہ ہوگا بشرطیکہ اس کی صداقت ثابت ہو جائے۔ امام احمد اور اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں کہ اس امر کے دو گواہ لانے ہوں گے کہ قتل کا سبب یہی تھا۔ مگر جمہور فقہاء کا

مسلک یہ ہے کہ اس کو قصاص سے صرف اس صورت میں معاف کیا جائے گا جب وہ زنا کے چار گواہ پیش کرے۔ یا مقتول مرنے سے پہلے خود اس امر کا اعتراف کر چکا ہو کہ وہ اس کی بیوی سے زنا کر رہا تھا اور مزید یہ کہ مقتول شادی شدہ ہو۔“ [۱]

اس تمام بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ بیوی کی بدچلنی دیکھ کر مرد خود کارروائی نہ کرے بلکہ معاملہ عدالت میں لائے اور اگر خود قتل کر ہی دے تب بھی اس قتل کا ثبوت اسے عدالت کو مہیا کرنا پڑتا ہے۔ باقی رہ گیا مسئلہ اپنی بیٹی یا بہن وغیرہ کو کسی غیر مرد کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں دیکھنے کا، وہاں بھی یہی حکم ہے کہ خود قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں۔ انسانی جان کو قتل کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ایسے موقع پر بھی معاملہ عدالت کے ہاں لے جایا جائے گا۔ عہد نبویؐ میں پھر خلفائے راشدین کے عہد میں جو ایسے اکا دکا واقعات پیش آئے تو متعلقین نے خود معاملہ عدالت میں پہنچایا۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ ایسے معاملات پر ستر پوشی کی تلقین کرتے۔ وگرنہ قانون کے مطابق کارروائی کرتے۔ وہ غیر شادی شدہ مرد و عورت کو پہلے سزائے تازیانہ دیتے۔ پھر بعض مناسب صورتوں میں توبہ کے بعد ان کا نکاح بھی کروایا گیا۔ [۲] (یہ بات صحابہ کرام میں اتنی جانی پہچانی تھی کہ کوئی شخص ایسے مواقع پر بذات خود قتل نہیں کر سکتا بلکہ وہ عدالت کو معاملے سے آگاہ کرے گا)۔ حضرت علیؓ کے عہد میں ایک ایسا واقعہ ملک شام میں پیش آیا۔ حضرت معاویہؓ حاکم شام نے صورت حال معلوم کرنے کے لیے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو کوفہ میں حضرت علیؓ کے پاس روانہ کیا۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر فرمایا: ”یہ معاملہ ہمارے ہاں پیش نہیں آ سکتا کیونکہ لوگوں کو اس کا حل بخوبی معلوم ہے کہ جو قتل کرے گا وہ لازماً بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اب اگر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اسے پوری سزا ملنی چاہیے۔“ [۳]

[۱] تفہیم القرآن، ج 3، ص 389 از سید مودودی، بحوالہ نیل الاوطار، ج 6، ص 228

[۲] رضامندی سے زنا کرنے والوں کا باہمی نکاح توبہ کے بغیر ناجائز ہے اور یہ امام احمد بن حنبل اور امام ابن تیمیہ، حافظ ابن کثیر اور شیخ ابن باز رحمہم اللہ کا موقف ہے جس کی دلیل سورۃ النور کی آیت نمبر 3 کا آخری جملہ ہے۔

[۳] فقہ علیؓ، ص 229، بحوالہ موطاء، ج دوم، ص 737

قتل غیرت کے حوالے سے فقہی احکامات کا ایک مختصر جائزہ

قتل غیرت کے معاملے میں دو چیزوں کی وضاحت انتہائی بنیادی اہمیت کی حامل ہے: پہلا غیرت کا تصور اور دوسرا قتل کا جواز۔ ان کی وضاحت سے معاملہ کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔

اسلامی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات مترشح ہو جاتی ہے کہ جذبہ غیرت ایک ناپسندیدہ امر نہیں ہے بلکہ اسے دینی معاملات میں بہت مستحسن قرار دیا گیا ہے تاہم اس کے بلا حدود و قیود استعمال پر پابندی لگائی گئی ہے۔ اس کی وضاحت سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکالمے سے ہوتی ہے:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ راوی ہیں کہ سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم سے استفسار کیا کہ آپ کا کیا خیال ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو پائے تو کیا وہ اسے قتل کر دے؟

آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”نہیں۔“

سیدنا سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: سنو سنو تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے؟^[۱]

صحیح مسلم میں اس سے اگلی حدیث میں یہ مزید وضاحت بھی موجود ہے:

سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے لگے یا رسول اللہ! میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو پالوں تو کیا میں کچھ نہیں کہہ سکتا حتیٰ کہ میں چار گواہ لے آؤں؟

[۱] پیچھے یہ سارا واقعہ گزر چکا ہے۔ اسی واقعے کی تفصیل سے سارے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ہاں

سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے لگے ہرگز نہیں، اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں تو فوراً ہی اپنی تلوار سے اس کا کام تمام کر دوں گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سنو اپنے سردار کی سنو۔ یہ بڑا غیور ہے اور میں اس سے زیادہ غیور ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ غیرت مند ہیں۔

اس حدیث سے ان دونوں امور یعنی غیرت اور قتل کے جواز کے حوالے سے درج ذیل نکات مستنبط ہوتے ہیں:

- 1- غیرت ایک مستحسن امر ہے، خود نبی کریم نے غیرت کو پسند فرمایا بلکہ خود کو بھی غیور قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کو بھی غیرت میں سب سے بڑھ کر قرار دیا۔
 - 2- وہ غیرت مستحسن ہے جو حدود الہی اور احکام شریعت پر پابندی اور عمل درآمد کے حوالے سے ہو۔ اس سے ہٹ کر غیرت کا کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔ قوم، قبیلے یا کسی رسوم و رواج کے حوالے سے غیرت کا اسلام سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اسلام میں صرف وہ غیرت پسندیدہ ہے جو احکام الہی اور حدود شریعت کے پامال ہونے پر ظاہر ہوتی ہے۔
 - 3- تاہم غیرت کے پسندیدہ ہونے کے باوجود اصولی حکم یہی ہے کہ غیرت کھانے والا قانون اپنے ہاتھ میں نہ لے اور مستوجب سزا کسی بھی ایسے واقعہ کو مجاز عدالت یا حکومت کے پاس شواہد ساتھ لے کر جائے۔
 - 4- اگر غیرت کے قوی جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے قتل جیسا ممنوع قدم اٹھا بھی لیا ہے تو اب اس قتل کو علی الاطلاق قتلِ عمد قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس کی وضاحت آگے آئے گی۔ اصولی طور پر تو اس قسم کے قتل کی ممانعت ہے۔ تاہم شریعت نے قتل کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا اور اس معاملہ کو عام قتلِ عمد یا قصاص والے معاملہ سے مختلف قرار دیا ہے جیسا کہ علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس حوالے سے یہ وضاحت موجود ہے:
- ”اس حدیث کا آخری حصہ اس امر کی دلیل ہے کہ اگر وہ قتل کر دے تو اس سے

قصاص نہ لیا جائے، کیونکہ سعدؓ نے کہا ہر گز نہیں اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔“

اس کی دلیل سیدنا عمر فاروقؓ کا وہ ارشاد بھی ہے جس میں آپ نے ایسا کرنے والے قاتل کو ارشاد فرمایا تھا: ”إِنَّ عَادَ فَعُدَّ“ اگر دوبارہ کبھی ایسا ہو تو پھر ایسا ہی کرنا۔

اگر قاتل پر قصاص واجب ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حلف کو برقرار نہ رہنے دیتے اور سعد کی تعریف نہ فرماتے بلکہ یوں فرماتے کہ اگر تو نے قتل کیا تو جواباً تجھے بھی قتل کر دیا جائے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ٹوکا اور نہ ہی قتل سے منع کیا۔ کیونکہ منع کرنے کی صورت میں آپ کا قول ایک لازمی حکم بن جاتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ امت کے لیے عام اصول ٹھہرتا۔ اب آپ اگر زانی کے قتل کا حکم دے دیتے تو یہ بھی آپ کا آرڈر ہو جاتا اور اس طرح مقتول کا خون ظاہر و باطن ہر لحاظ سے شرع میں رائیگاں قرار پاتا اور لوگ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اس جواز کی آڑ لے کر قتل کیا کرتے اور یہ دعویٰ کر دیتے کہ مقتول کو انہوں نے اپنی بیوی کے ساتھ پایا۔ سو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سد ذریعہ، فساد کا خاتمہ اور جانوں کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لیے محض قاتل کے دعوے کو غیر معتبر قرار دیا۔

5۔ ایک طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جذبہ غیرت کی تحسین فرمائی اور دوسری طرف قتل کے انتہائی اقدام کو اصولی طور پر ممنوع ہونے کے باوجود مسترد نہیں کیا۔ شرعی مصالح کی بنا پر قتل کو واضح طور پر ناجائز تو نہیں قرار دیا تاہم اس کے امکان کو یکسر مسترد بھی نہیں کیا۔

ہمارے خیال میں یہی توازن ہمیں آج بھی قتل غیرت کے مقدمات میں ملحوظ رکھنا ہوگا۔ ہر واقعہ پر ایک جیسا حکم لاگو نہیں ہو سکتا۔ ان دورویوں یعنی غیرت اور قتل کے درمیان بے شمار ایسے امکانات موجود ہیں جو تفصیلی تجزیہ کے متقاضی ہیں۔ ذیل کی بحث میں ان امکانات پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے:

مطلوب طرزِ عمل:

جذبہ غیرت کے تحت کسی کو قتل کر دینا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ اقدامِ قتل سے قبل درج ذیل نکات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

لڑکیوں کا گھر سے بھاگ جانا یا زنا جیسے فبیح فعل کی نوبت آ جانا، یہ سب کچھ اچانک ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ یہ تو اللہ کی نافرمانیوں پر مشتمل ایک طویل سفر کا شرمناک انجام ہے۔ جو بچے بچیاں گھر سے چوری چھپے بھاگتے ہیں یا عملاً اس فعلِ شنیع کے مرتکب ہوتے ہیں وہ کئی حدوں اور حفاظتی بندوں کو توڑ کر یہاں تک پہنچتے ہیں۔ اگر بروقت ان کا نوٹس لیا جائے تو شاید قتل جیسے معاملہ کی نوبت ہی نہ آ پائے۔ نبی کریم کا فرمان ہے:

”آ نکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ

کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا چلنا ہے۔ دل کا زنا آرزو اور تمنا کرنا ہے اور شرم

گاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔“ [۱]

اس لیے ولی، محرم اور سرپرستوں کو اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ اگر ان کے ارد گرد ان باتوں کے شواہد نظر آنے لگے ہیں تو بروقت اس کا نوٹس لیا جائے اور غیر شرعی افعال کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اس سے قتل جیسے انتہائی اقدام کی نوبت کم سے کم آئے گی۔

بظاہر ولی یا سرپرست ایسے کسی واقعہ کے نتیجے میں مرتکبین کو قتل کر کے بزعمِ خویش ذلت و رسوائی سے اپنی جان چھڑا لیتا ہے، لیکن درحقیقت اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالتا ہے۔ جو کام یعنی صحیح تعلیم و تربیت، جو دورانِ کفالت اس کی ذمہ داری تھی وہ تو اس نے پوری نہیں کی، الناکل کر کے اور کئی مسائل گلے لگا لیے۔ اور بزعمِ خویش اپنی حفاظتِ ناموس کی ذمہ داری پوری کر لی۔ حالانکہ یہ غیرت کی جانب نہیں بلکہ اس کے لیے شرم کا مقام ہے۔

بچوں خاص طور پر لڑکیوں کی شادی میں ان کی پسند و ناپسند کا احترام کیا جائے۔ اور بھاگ

کر شادی کرنے سے قبل ہی ان کی مطلوبہ جگہ شادی کر دی جائے۔ اگر ولی کی رائے مختلف بھی ہے تو پھر بھی یہ قتل سے کم تر برائی ہے۔ قتل کی اجازت نہ دینے کی حکمت یہی ہے کہ مجرم کو توبہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ نیز قتل بہر حال زنا سے زیادہ بڑی سزا ہے۔

اس لیے اگر ایسا کوئی واقعہ عملاً پیش آ گیا ہے تو طیش میں آ کر فاعل و مفعول کو قتل کر دینا مستحسن نہیں۔ سرپرست یا ولی کو چاہیے کہ وہ اس کی پردہ پوشی کرے۔ قتل کر دینے کی صورت میں مقتول توبہ کا موقع ملنے سے محروم ہو جائے گا۔ زنا کے جرم کی پردہ پوشی کرنے سے اس کے اثرات بد کو کم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قتل کی صورت میں تو الٹا زیادہ تشہیر ہوگی۔ عدالتی چارہ جوئی بھی بھگتنا ہوگی اور معاشرے میں ہونے والی رسوائی اور شرمندگی اس پر مستزاد ہوگی۔ لہذا حکمت عملی اور نتائج کے اعتبار سے بہتر راستہ پردہ پوشی ہی ہے۔

اگر گناہ کا مرتکب مرد یا عورت شادی شدہ نہیں تو اس کی جلد شادی کی کوشش کی جائے اور اگر ممکن ہو تو امر حرام کے مرتکب مرد و عورت ہی کا توبہ کروانے کے بعد باہم نکاح کر دیا جائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایسے معاملات میں بعض اوقات یہی صورت اختیار کیا کرتے تھے۔

زنا جیسے فبیح جرم کا ارتکاب کرنے کی جو سزا شریعت نے مقرر کی ہے اس سے زیادہ دینا یا مختلف دینا بھی درست نہیں۔ کنوارہ ہونے کی صورت میں سزا سو کوڑے سے زیادہ نہیں اور بیوی ہونے کی صورت میں لعان کا راستہ موجود ہے۔ ان کے علاوہ دیگر صورتوں میں رجم کی سزا ہے، جس کی شرائط انتہائی کڑی ہیں اور ایک شرط بھی پوری نہ ہونے کی صورت میں حد نافذ کرنے کی بجائے تعزیراً کوئی اور سزا دی جائے گی۔

مختصراً اسلامی احکامات کا اگر جائزہ لیا جائے تو ماورائے عدالت قتل اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی سخت حوصلہ شکنی کی گئی ہے اور اس بات کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ از خود اقدام قتل کے بجائے ایسے کسی بھی معاملہ کو عدالت کے علم میں لایا جائے اور ملزمان کو صحیح تفتیش کے بعد قرار واقعی سزا دلوائی جائے۔ اصولی طور پر مطلوب یہی طرز عمل ہے۔

مختلف مواقع کے لحاظ سے قتلِ غیرت کا حکم مختلف ہوگا!

سب سے پہلے اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ فعلِ قتل کب سرانجام دیا گیا؟

• اگر قتل عملِ فعلِ زنا کے وقوع سے قبل ہوا، اگرچہ مبادیاتِ زنا موجود تھے، تو پھر یہ قتلِ خطا ہے۔ بوجہ غیرت اسے قتلِ عمد نہیں کہا جائے گا اور یہ مستوجبِ قصاص نہیں ہوگا۔ دیت کی ادائیگی البتہ لازمی ہے۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

”اگر مقتول نے بدکاری کا ارتکاب نہ کیا ہو لیکن وہ اس بد مقصد سے آیا ہو تو اس کے قاتل کی سزا میں اختلاف ہے۔ اگر قاتل کفارہ ردیت ادا کر دے تو یہی محتاط رویہ ہے کیونکہ کفارہ قتلِ خطا میں ہی عائد ہوتا ہے۔“ [۱]

• اگر قتل عین وقوع کے وقت ہوا۔ فریقین رضامندی کے ساتھ شریک تھے تو دونوں کا خون رائیگاں قرار دیا جائے گا۔ اگر جارج صرف مرد تھا اور عورت مجبور تھی اور دورانِ وقوع وہ قتل ہو گئی تو عورت کے قتل کو قتلِ عمد قرار دیا جائے گا اور قاتل کو قصاص ردیت کا سامنا کرنا ہوگا۔

• اگر قتل فعلِ زنا کے وقوع کے بعد ہوا ہے تو اس صورت میں بھی یہ کبھی قتلِ عمد اور کبھی قتلِ خطا (جبکہ فریقین کے ہاں رضامندی سے مبادیاتِ زنا کو ثابت کر دیا جائے) ہر دو صورت میں جرم و سزا کے احکام ثبوتِ جرم کے لحاظ سے جاری ہوں گے۔

• یہ بات ذہن نشین رہے کہ شبہ کی بنیاد پر قتل کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔

• واضح رہے کہ اوپر دی گئی تینوں صورتوں میں پہلے زنا کے وقوع یا مبادیاتِ زنا کو ثابت کرنا قاتل کی ذمہ داری ہوگی۔ قانونی لحاظ سے اگر وہ ثابت کر پائے گا تو پھر یہ قتلِ خطا یا رائیگاں خون کی ذیل میں آئے گا۔ بصورتِ دیگر قتلِ عمد شمار ہوگا اور قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔

مقتول کی قانونی پوزیشن

- ☆ اگر عورت پر زیادتی ہوئی یا وہ مجبور پائی گئی تو عورت کا قتل جائز ہی نہیں ہے، وہ نہ صرف معذور بلکہ مظلوم اور رعایت کی مستحق قرار پائے گی۔
- ☆ اگر عورت اپنی مرضی سے شریک ہے تو بیوی کی صورت میں لعان کا راستہ شریعت نے فراہم کیا ہے اور یہی قابل ترجیح ہے۔ افضل ہے۔
- ☆ بیوی نہ ہو لیکن اور کوئی محرم رشتہ دار ہو یا کوئی اجنبی خاتون ہو تو بھی پالا ولی قتل کی اجازت نہیں ہے، ہاتھ روکنا افضل ہے۔
- ☆ قاتل کو یہی ہدایت ہے کہ ہر ممکن طریقہ اختیار کرے کہ قانون شکنی سے باز رہے اور قانون ہاتھ میں لے کر اقدام قتل نہ کرے۔

قتل کی صورت میں احکامات

- قتل سے پہلے جو اقدامات موثر ہو سکتے ہیں وہ ضرور بروئے کار لائے جائیں مثلاً شور شرابہ کرنا، ڈرانا دھمکانا، مار پیٹ کرنا اور زبردستی علیحدگی کروادینا وغیرہ۔
- اگر مندرجہ بالا اقدامات کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور روکتے روکتے قتل ہو گیا، اب ---؟
- سب سے پہلے تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ قتل کا محرک مبادیاتِ زنا یا فعلِ زنا ہے، نہ کہ دشمنی یا کوئی اور دنیاوی مذموم مقصد۔
- بارِ ثبوت قاتل پر ہوگا اور قرائن و آثار اور شہادتوں سے بھی مدد لی جائے گی۔ قتل مرد کا بھی ہو سکتا ہے اور عورت کا بھی، اور باہمی رضامندی کی صورت میں دونوں کا بھی۔
- دو گواہوں کا موقف بھی موجود ہے اور چار گواہوں کا بھی اور ثانی الذکر یعنی چار گواہوں والا ہی رائج ہے۔
- قاتل اگر وقوعہ ثابت نہ کر سکے تو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ کسی رعایت کا مستحق نہیں ہوگا۔ اور اگر اس نے وقوعہ ثابت کر دکھایا تو حدیث نبوی کی رو سے وہ قانون کو ہاتھ میں لینے کا مجرم ہوگا۔ جبکہ بعض اہل علم نے جواز کا قول بھی اختیار کیا ہے۔

قتل کے جواز کے مختلف دلائل ہیں:

1- وقوعہ کے وقت کچھ فقہاء اس قتل کو نہی عن المنکر کے تحت درست سمجھتے ہیں۔ جس کی مزید تفصیل حنفی علما نے یوں پیش کی ہے کہ نہی عن المنکر کے تحت قاتل کا اصل مقصد گناہ سے روکنا ہی ہو اور اس دوران قتل ہو جائے تو اس کی گنجائش ہے۔ تاہم اگر قاتل آغاز ہی قتل سے کرے تو تب بھی وہ قانون کو ہاتھ میں لینے کا مجرم ہے۔

اقدام دفاع ناموس کسی مرد کی طرف سے بھی اٹھایا جاسکتا ہے اور مجبور یا نشانہ بننے والی عورت کی طرف سے بھی اور دفاع کے لیے جسٹس عبدالقادر عودہ شہید نے قرار دیا ہے کہ حملہ کا تصور غالب درجہ میں ہوا اگرچہ زیادتی بالفعل واقع نہ بھی ہوئی ہو، تب بھی وہ اقدام دفاع ناموس ہی شمار ہوگا اور اس مقتول کا خون رائیگاں قرار دیا جائے گا۔

بعض اوقات دفاع کے نتیجے میں مقتول کو وہ سزا ملتی ہے جو اس کی اصل سزا نہیں ہوتی۔ مثلاً کنوارے مرد و عورت کی سزا اس فعل کے نتیجے میں سو کوڑے یا جلا وطنی ہے لیکن قتل اس کی نسبت ایک بڑی سزا ہے۔ تاہم فقہاء نے لکھا ہے کہ یہاں اصل مقصود سزا دینا یا نافذ کرنا نہیں بلکہ بالقوہ برائی کو وقوع پذیر ہونے سے روکنا ہے اس لیے اس کی گنجائش ہے۔

ان کا استدلال اس حدیث پر ہے جس میں ایک شخص نے کسی دوسرے کا ہاتھ اپنے دانتوں میں چبایا۔ دوسرے نے زور سے کھینچا تو پہلے کے دانت ٹوٹ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے شخص کے قصاص کے مطالبہ کو مسترد کر دیا اور فرمایا کیا وہ اپنا ہاتھ تیرے منہ میں باقی رہنے دیتا اور تو سائنڈ کی طرح اسے چباتا رہتا۔

واضح رہے یہاں بات دفاع کی ہو رہی ہے۔ دفاع کے نتیجے میں جارح اگر قرار واقعی سے زیادہ بھی سزا پالے تو روا ہے۔ تاہم جرم ہونے کے بعد اس کو شریعت کی مقرر کردہ سزا دینا ہی اولیٰ ہے۔

2- جبکہ حنبلی فقہاء اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ اسے مستقل جرم بتاتے ہوئے

حفاظتِ ناموس کی خاطر کیا جانے والا قتل کہتے ہیں جس کے احکام بھی مستقل ہیں اور مقتول کے خون کو رائیگاں قرار دیتے ہیں۔ اور ان کی دلیل حدیث سعد بن عبادہ کے آخر میں نبی کریمؐ کا تعریفی اسلوب اور سیدنا عمر بن خطاب کے واقعات وغیرہ ہیں۔

3- پاکستان میں پہلے قانون کے مطابق اور اس وقت زیادہ تر مسلمان ممالک میں رائج قانون کے مطابق یہ فوری اشتعال (Sudden Provocation) کے تحت کیا جانے والا قتل ہے۔ قاتل کا عزم یا ارادہ اس میں شامل نہیں تھا بلکہ یہ کسی فوری واقعہ کا رد عمل ہے۔ لہذا اسے عمومی قصاص والے معاملے سے مختلف تصور کیا جائے گا۔

نبی عن المنکر کے تحت اس قتل کو گوارا کرنے والوں کا موقف ہے کہ نبی کریمؐ نے منکر کو دیکھنے پر ہر مسلمان کو بقدر استطاعت اس کے خاتمے کا حکم دیا ہے۔ ان کی دلیل حضرت عمرؓ کا وہ فیصلہ بھی ہے کہ ایک شخص ان کے پاس تلوار لہراتا ہوا آیا۔ اس کی تلوار خون میں لت پت تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ اس نے ہمارے آدمی کو قتل کر دیا ہے (غیر شادی شدہ کو)۔ آپؐ نے اس شخص سے سوال کیا تو اس نے کہا ”میں نے اپنی بیوی کی دونوں رانوں کو کاٹا ہے اگر ان کے بیچ میں کوئی تھا تو وہ بھی کٹ گیا ہوگا۔“ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس نے اپنی بیوی کی دونوں رانوں کو کاٹا اور بیچ میں ہمارے آدمی کو کمر سے دو ٹکڑے کر دیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے قاتل کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”اگر یہ دوبارہ ایسا کریں تو تم بھی ان کے ساتھ اسی طرح سے کرو۔“

فقہاء کے نزدیک یہ اجازت اس بنا پر نہیں تھی کہ قاتل کو غیرت آگئی کہ اس کی بیوی یا بیٹی کے ساتھ بدکاری ہو رہی ہے اور وہ فوری اشتعال کے تحت اقدام کر بیٹھا بلکہ اس اجازت کی بنیاد منکر کو اپنے ہاتھ سے تبدیل کرنا ہے اور یہ ہر اس آدمی پر واجب ہے جو اس کی طاقت رکھتا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا استدلال گھر میں جھانکنے والے کی آنکھ کو پھوڑ دینے والی حدیث پر ہے۔ جھانکنا اگرچہ چھوٹا عمل ہے تاہم یہ کسی کی ناموس یا پرائیویسی پر حملہ ہے اس

لیے اس کی زیادہ سخت سزا ہے، بہ نسبت جرم کے۔ اس لحاظ سے فعل زنا اس سے کہیں زیادہ قبیح جرم ہے، اس لیے ان کے نزدیک یہ قتل روا ہے۔

اس موقف کے حاملین سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ دوران سفر لونڈی کو حوالے کرنے کے مطالبہ پر انہوں نے دو افراد کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ عملاً فعل زنا کے وقوع پذیر ہونے سے قبل کا معاملہ ہے اور حفاظت ناموس کی ذیل میں آتا ہے۔ حفاظت ناموس کی خاطر قتل کرنے پر دیت لازم نہیں ہوگی بلکہ وہ خون رائیگاں قرار دیا جائے گا۔ جو لوگ فوری اشتعال کو اس قتل کا محرک قرار دیتے ہیں وہ برصغیر میں پہلے سے نافذ برطانوی قانون، مسلمان ممالک اور چند مغربی ممالک میں رائج الوقت قانون سے اپنے موقف کی نظیر حاصل کرتے ہیں۔

عورت اگر از خود عزت پر حملہ آور شخص کو قتل کر دے، چاہے وقوع ہوا ہو یا نہ ہو، محض ابھی امکانی طور پر ہی نظر آ رہا ہو تو اس صورت میں بھی مقتول کا خون رائیگاں قرار دیا جائے گا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مرد کی طرف سے زیادتی کا نشانہ بنانے پر ایک انصاری کی بیٹی کی طرف سے اقدام قتل کو جائز قرار دیا تھا اور مقتول کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔

جہاں تک قاتل کو سزا دینے کا معاملہ ہے تو تینوں موقف رکھنے والے افراد مختلف سزا کے قائل ہیں:

- 1۔ نہی عن المنکر کے قائلین قانون کو ہاتھ لینے کے جرم میں صرف تعزیری سزا کے قائل ہیں، بشرطیکہ قاتل رضامندی سے بدکاری کے شواہد پیش کر دیتا ہے۔
- 2۔ حنبلی فقہانے جب اصولاً ہی ناموس کے جرائم کو مستقل حیثیت دے کر جواز کا موقف اپنا لیا تو ان کے نزدیک ایسے قاتل کی کوئی سزا نہیں جب کہ وہ بدکاری کو شرعی تقاضوں کے مطابق ثابت کر دے۔
- 3۔ اشتعال کے تحت قتل کا موقف رکھنے والا اگر وہ بھی اس قتل کو قتل عمد شمار نہیں کرتا۔ ان کے

نزدیک یہ قتل خطا ہوگا۔ تاہم اس رعایت کے حصول کے لیے مقتولہ کا رشتہ دار ہونے کی یا وقوعہ کی اطلاع ملنے کے فوری بعد اقدام کی شرط کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جس میں دیت، صلح صفائی یا کسی تعزیری سزا کا امکان موجود ہے، جو مقدمہ کی نوعیت کو سامنے رکھتے ہوئے طے کیا جائے گا۔

خلاصہ بحث:

غیرت کے قتل میں دو ممکنہ صورتیں ہو سکتی ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ عورت غلط کاری میں برضا و رغبت شریک نہیں تھی بلکہ اس کی آبروریزی کی کوشش کی گئی اور اس صورت میں عورت نے خود یا کسی دوسرے شخص نے حملہ آور کو قتل کر دیا۔ تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے گا اور اس سے دیت نہیں لی جائے گی۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رقم طراز ہیں:

”کوئی فاسق و فاجر شخص اگر کسی عورت کی آبرو پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے تو فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت کے لیے واجب ہے کہ ممکن حد تک اپنی عزت کا دفاع کرے۔ کیونکہ کسی عورت کا اپنے آپ کو کسی مرد کے حوالے کرنا حرام ہے۔ اور عورت کا دفاع نہ کرنا گویا اپنے آپ کو اس ظالم کے حوالے کر دینا ہے۔ نیز عورت کو یہاں یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اس جبر کرنے والے شخص کو قتل کر دے، جب کہ عورت کے لیے قتل کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو۔ اس صورت میں اس ظالم کا خون رائیگاں قرار پائے گا۔ [یعنی عورت پر نہ دیت ہوگی اور نہ قصاص]۔“

ایسے ہی ایک شخص جب دیکھے کہ کوئی غیر مرد کسی عورت کے ساتھ زیادتی کی کوشش کر رہا ہے تو اس مرد کے لیے اس عورت کا دفاع کرنا واجب ہے، خواہ وہ قتل کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ غلط کاری میں عورت مرد کے ساتھ برضا و رغبت شریک تھی اور خود آمادہ برگناہ تھی۔ اس حالت میں مختلف کیفیات کے تحت مختلف حکم ہوگا۔ اولیٰ یہی ہے کہ مرتکبین کو قتل کر کے قانون ہاتھ میں نہ لیا جائے اور دوسرے ذرائع اختیار کیے جائیں۔ تاہم اگر فوری

اشتعال Sudden Provocation کی بنا پر قتل کا صدور ہو گیا تو آثار و قرائن اور گواہان کی مدد سے اصل جرم کا تعین کیا جائے گا۔ علی الاطلاق اس کو قتل عمد قرار نہیں دیا جائے گا۔ تاہم غیرت کے قتل کے قابل قبول شواہد فراہم کر دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قاتل ہر قسم کی سزا سے بچ جائے، بلکہ ایسی صورت میں اسے قاضی کی صوابدید کے مطابق کوئی تعزیری سزا لازماً دی جاسکے گی۔ اس لیے کہ غیظ و غضب کی حالت میں بھی اپنے اوپر کنٹرول رکھنا اور اپنی غیرت کو اللہ اور اس کے رسول کے احکامات کے تابع رکھنا بھی یقیناً شریعت ہی کا حکم ہے۔

چند ضروری مباحث:

نہی عن المنکر کے قائلین ہر شخص کو، چاہے وہ مرتکبین کے والی وارث ہوں یا رشتے دار یا عام اجنبی مسافر و رہزور، ہر ایک کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ تدریجاً یعنی زبان، ہاتھ اور پھر طاقت یعنی تلوار سے کام لے کر اپنی آنکھوں کے سامنے جاری کسی منکر کو روک دیں۔ ان کے استدلال کی بنیاد تغیر منکر والی معروف حدیث پر ہے، جس کا مخاطب ہر مسلمان ہے۔

تاہم یہ ملحوظ رہے کہ قتل غیرت میں صرف وہ قتل جو وقوعہ کے دوران یا اس سے بالکل متصل، یعنی بالکل ماقبل و مابعد واقع ہوا ہو، صرف اسی قتل میں خون رائیگاں شمار ہوگا۔ نہی عن المنکر کا اطلاق صرف اسی صورت ہی میں ممکن ہے۔ جب وقوعہ ہو گیا تو نہی عن المنکر کا موقع ختم ہو گیا۔ اس کے بعد حد جاری کرنے کا حق حکمران یا عدالت کو ہے۔ اب اگر کوئی شخص قانون ہاتھ میں لے گا تو مستوجب سزا ہوگا اور اس کو اس قتل کی دیت ادا کرنا ہوگی۔

قتل غیرت میں اگر اس کو قتل خطا قرار دیا گیا ہے تو اس صورت میں ولایت کے احکام یہاں بھی لاگو ہوں گے۔ باپ کی طرف سے قتل کی صورت میں شریعت جو استثناء دیتی ہے، اس سے کسی کو محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اولیائے مقتول کو معافی کے حقوق بھی حاصل ہیں۔

☆ واضح ہو کہ جب نام شرعی سزا کا ہوا اور اصطلاح دین متین کی ہو تو پھر ضوابط بھی اسی سے لینے ہوں گے، من مانے نہیں۔

☆ اگر قاتل کا شرعی حدود سے تجاوز شرعاً و قانوناً ثابت ہو جائے تو پھر وہ اور اس کے معاونین کو کوئی رعایت حاصل نہیں رہے گی، چاہے وہ مقتولہ کا کسی بھی نوعیت کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ بصورت دیگر خاندان کو قرآن کریم کے عطا کردہ قصاص میں معافی اور نرمی کے حقوق برقرار رہیں گے اور اس امر کا فیصلہ اصولی و قانونی کی بجائے کیس ٹو کیس قاضی/جج کرے گا۔

قتل غیرت پر اقدام کی صورت میں اصل موقف تین ہیں:

۱۔ جمہور علماء: جو وقوعہ کے وقت اور بعد از وقوعہ کا فرق کر کے، انکار منکر کا ہر مسلمان کو پابند کرتے اور روکتے روکتے قتل ہو جانے پر مؤاخذہ نہ ہونے کے قائل نہیں اور انکار منکر یا بعد از وقوعہ اقدام قتل کرنے والوں کو مجرم قرار دیتے ہیں اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کا موقف اختیار کرتے ہیں۔ جو سابقہ جرم کے تناظر میں دیکھے جائیں گے۔ اگر جرم ثابت نہ کر سکے تو قاتل کو سزائے قصاص کا سامنا کرنا ہوگا اگر اس نے مبادیات زنا ثابت کر لیے تو قتل خطا کا مجرم ہوگا۔ یا جرم تو ثابت کر لیا لیکن شرعی تقاضوں سے زیادہ اقدام کر لیا تو اتنی سزا کا سامنا کرنا ہوگا اور اگر جرم ثابت بھی کر لیا اور اقدام بھی شرعی تقاضوں سے ہم آہنگ تھا تو اس کو معاف کیا جاسکتا ہے اور بکثرت ایسے اقدامات ہونے پر ایسے شخص کو قانون ہاتھ میں لینے کی تعزیری سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

۲۔ حنبلی علماء: جو اصلاً جرائم ناموس کو مستقل جرم قرار دے کر قاتل پر بار ثبوت ڈال کر اقدام قتل کے اصولی جواز کے قائل ہیں۔

۳۔ حنفی قانون: فوری اشتعال کی بنا پر رعایت حاصل ہوگی جس کی شرط میں رشتہ دار اور آگاہی کے فوری بعد اقدام کی شرطیں ہیں تاہم شرعی قانون اس سے جامع تر اور عدل و انصاف کے زیادہ قریب ہے۔

جہاں کوئی شوہر یا برائی دیکھنے والا چار گواہوں کو نہ پائے اور نہ قرآن کے ذریعہ ہی وقوعہ کا ثابت کرنا اس کے لیے ممکن ہو تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ دیگر ذرائع سے کام لے کر برائی کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرے اور قتل جیسے انتہائی اقدام سے باز رہے۔ کیونکہ خلفائے راشدین کے نظائر سے یہ بات ثابت ہے کہ وقوعہ کے قابل قبول شواہد پیش نہ کرنے کی صورت میں انہوں

نے قصاص اور دیت کے احکامات کو لاگو کیا ہے، فوری اشتعال کی بنا پر کوئی رعایت نہیں دی۔
لہذا یہ امر ہمیشہ ملحوظ رہے کہ قتل کے بعد قصاص کی سزا سے بچنے کے لیے وقوعہ کے قابل قبول ثبوت فراہم کرنا قاتل کی ذمہ داری ہے اور ایسا نہ کر سکنے کی صورت میں اس پر قصاص کی حد کو نافذ کیا جائے گا۔

عورت کی اگر جبری آبروریزی ہو رہی ہو، لیکن اس کے باوجود اس کو قتل کر دیا جائے تو قاتل اگر شبہ کے قابل قبول شواہد فراہم کرے گا تو پھر یہ قتل خطا شمار ہوگا اور اس کی دیت ادا کی جائے گی بصورت دیگر قتل عمد ہوگا اور اس پر حد جاری ہوگی۔ عورت تو مجبور تھی اور اس کا مجبور ہونا بھی واضح تھا۔ اس کے باوجود اس کا قتل کسی بدنیتی پر ہی مبنی ہو سکتا ہے، لہذا یہ مستوجب قصاص ہے۔ ایسی غیرت دین میں نہ جائز ہے اور نہ مستحسن۔ اور فی الواقع ہمارے معاشرے میں ایسے واقعات کی روک تھام از حد ضروری ہے جس میں مجبور یا صرف شبہ کی بنیاد پر عورت کو قتل کر دیا جائے اور قابل قبول شواہد فراہم نہ کیے جائیں۔ ایسے بدنیتی پر مبنی واقعات کی روک تھام کے لیے اسے قتل عمد قرار دے کر قصاص کا حکم نافذ کرنا ہوگا۔

اقدام دفاع کے نتیجے میں جارح اگر قتل ہو جائے اور بالفعل ابھی زیادتی وقوع پذیر نہ ہوئی ہو تو ایسی صورت میں بعض فقہاء مقتول کی دیت احتیاطاً لازمی قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ خلفائے راشدین کے نظائر میں جہاں جہاں خون رائیگاں قرار دیا گیا وہاں وقوعہ کا بالفعل ہونا بھی ثابت ہے۔ تاہم کچھ فقہاء اسے ضروری نہیں بھی سمجھتے کیونکہ سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ والے واقعہ میں وقوعہ سے قبل ہی آپ نے جارحیت پر مائل افراد کا کام تمام کر دیا۔ دونوں طرح کے موقف کی گنجائش موجود ہے۔

ہمارا این جی اوز سے بنیادی اختلاف:

این جی اوز کا معاملہ یہ ہے کہ وہ صرف عورت کی جان کی حفاظت چاہتی ہیں۔ عورت کی عصمت و آبرو کی حفاظت کی وہ قائل ہی نہیں ہیں۔ حالانکہ عورت کی عصمت محفوظ نہ ہو تو اس کی جان بھی عملاً محفوظ نہیں رہ سکتی۔ ہمارے اور ان کے نکتہ نظر میں اختلاف دراصل اس بنیادی بات پر

ہے۔ چنانچہ مغرب میں جہاں عورت کی رضا مندی سے بدکاری جائز ہے وہاں بھی عورت کی جان محفوظ نہیں اور عورتوں کو اپنی جان کی حفاظت کے لیے بے شمار تنظیمیں بنانا پڑتی ہیں۔ اور پھر حدِ رجم (جس کے عملی نفاذ کی نوبت اگرچہ بہت کم آتی ہے) اس سے بھی معاشرہ اخلاقی برائیوں کا شکار ہونے سے بھی بچ جاتا ہے۔ عورت کی عزت محفوظ ہونے کے ساتھ اس کی جان بھی محفوظ ہوتی ہے۔ تو پھر حدِ رجم سے بچنا اور اس سے گریز کرنا آخر کہاں کی عقل مندی ہے؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف معاشرہ کو اخلاقی برائیوں سے بچانے کے لیے حدِ رجم جیسی سخت سزا رکھی۔ دوسری جانب اس حد کے ثبوت کے لیے چار گواہوں کی کڑی شرط رکھی تاکہ کوئی شخص محض شک یا ذاتی عناد کی بنا پر کسی کو رسوا نہ کر سکے۔ ایسا خوبصورت توازن اور عورت کی جان و عزت دونوں کا تحفظ آج دورِ جدید کا کوئی بھی انسانی دستور یا نظام پیش کرنے سے قاصر ہے۔ شریعت نے بے گناہ خاتون پر تہمتِ زنا کی سزا 80 کوڑے رکھی ہے۔ اور اسے سات کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ نبی پاکؐ کے دور میں ایک عورت کھلی فاحشہ تھی۔ مگر اس کے خلاف بدکاری کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ اس لیے اس کو کوئی سزا نہ دی گئی حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اگر کسی کو بغیر ثبوت سزا دی جاسکتی تو میں اس کو ضرور دیتا، مگر آپؐ نے اس کو کوئی سزا نہ دی۔^[۱]

پاکستانی رواج اور قتلِ غیرت:

2016ء سے قبل پاکستانی قانون میں بیوی، بیٹی، بہن کو کسی غیر کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں پا کر قتل کر دینے کو قتلِ عمد قرار نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ اسے قتلِ خطا قرار دیا جاتا۔ قاتل چند سال سزا کاٹ کر واپس گھر آ جاتا۔ جہاں تک اس قانون کے غلط استعمال کا تعلق ہے تو مختلف لوگوں نے اسے مخصوص مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً ہمارے دیہاتوں میں عام سی بات ہے کہ بہن، بیٹی، بیوی کو بد چلنی کے الزام میں ٹوکے، چھری، کلہاڑی وغیرہ سے فوراً موقع پر ہی قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح قتل و قتال کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ بسا اوقات اپنے مذموم عزائم کی

[۱] مفہوم تفہیم القرآن، سورۃ نور، حاشیہ نمبر 2، ص 333، ج 3

تکمیل کے لیے بے قصور اور بے گناہ عورتوں کو اپنے دشمنوں کے ساتھ ملوث دیکھنے کا بہانہ بنا کر دشمنوں کو اور ساتھ اپنی خواتین کو بے دریغ قتل کر دیا جاتا ہے۔

گویا قتل غیرت کو قتلِ خطا قرار دینے کا یہ نتیجہ نکلتا کہ وڈیرے، جاگیردار اپنی دشمنیوں کا بدلہ قتل غیرت بنا کر لیتے۔ اپنی بہن، بیٹی بے قصور ماری گئی۔ مگر اس طرح دشمن تو ہلاک ہو گیا۔ اب کیس غیرت کے قتل کا بنایا گیا، نہ کہ قتلِ عمد کا۔ لہذا چند سال قید کاٹ کر واپس گھر آ گئے۔ لیکن اس سے قتل و قتال اور دشمنیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا چکر چل نکلتا۔

2016ء کا قانون قتل غیرت

تاہم ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ 18-2017 کے مطابق پاکستان میں غیرت کے متعلق نیا قانون بھی زیادہ سودمند ثابت نہیں ہو رہا اور غیرت کے نام پر ہونے والے قتل کی وارداتوں میں کوئی واضح کمی نہیں آئی۔ موجودہ قانون کے مطابق غیرت کے نام پر قتل کے مجرم کو دی گئی موت کی سزا کو اگر مقتولہ کے خاندان والے معاف بھی کر دیں گے تو اُسے پچیس برس کی عمر قید ہر صورت میں بھگتنا ہوگی اور یہ کیس ناقابلِ تصفیہ ہوگا۔

لیکن اس نئے قانون میں بھی کئی قسم کے سقم سامنے آئے ہیں۔ اس قانون کے مطابق جج کو یہ اختیار ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ آیا لڑکی کا قتل غیرت کے نام پر یا کسی دوسری وجہ سے کیا گیا تھا۔ ایمنسٹی کے مطابق سن 2017 میں متعدد ایسے کیس تھے، جن میں ملزمان نے یہ ثابت کیا کہ متاثرہ خاتون کا قتل غیرت کے نام پر نہیں بلکہ کسی دوسری وجہ سے کیا گیا تھا۔ اور پھر مقتولہ کے خاندان والوں نے قصاص اور دیت کے قانون کے تحت قاتل کو معاف کر دیا۔ یعنی قانون کا غلط استعمال پہلے بھی تھا اور اب بھی جاری ہے۔

مسئلہ کا اسلامی حل:

- 1۔ اس مسئلہ کا اصل حل تو انصاف کی فراہمی اور اسلامی سزاؤں کا نفاذ ہے۔ بروقت انصاف مہیا کیا جائے اور ہر کہ و مہ کے لیے انصاف کا حصول عام کیا جائے تاکہ جرائم کی حوصلہ شکنی کے لیے

حالات و ضرورت کے مطابق قاضی حد یا تعزیر نافذ کر کے بڑھتے ہوئے جرائم کا تدارک کرے۔ اس وقت بڑا ضروری ہو گیا ہے کہ جرائم کی سنگینی کے مطابق قاضی سزا نافذ کرے۔ اگر عورت مظلوم تھی اور محض بد چلنی کے شبہ میں اس کو قتل کیا گیا تو قاتل کو قتل عمد کی پوری سزا دی جائے اور اگر مقتولہ واقعاً جرم میں ملوث تھی اور اس کے گواہ موجود ہیں تو پھر بھی قاتل کو تعزیر دی جائے۔ اس بات پر کہ اس نے قانون اپنے ہاتھ میں کیوں لیا اور عدالت کو اس سے آگاہ کیوں نہیں کیا؟

2- اس کے علاوہ درج ذیل اقدام کرنے بھی ضروری ہیں:

☆ ایک طرف تو فحش کے مظاہر قانوناً بند کیے جائیں۔

☆ ٹی وی اور ویڈیو سے گھٹیا فلمیں بند کر کے اس کو اسلامی پروگراموں کی اشاعت کے لیے وقف کیا جائے۔

☆ بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے خصوصاً اسلامی تصورِ عفت و حیا ان میں اجاگر کیا جائے۔ نگاہوں میں جھجک اور عفت، محرم اور غیر محرم کے تصور کی سختی سے پابندی کرانے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ نیز اسلامی قانونِ ستر و حجاب کی پابندی کرائی جائے۔

3- شادی کرنا آسان بنایا جائے۔ قانوناً جہیز کا مطالبہ منع کر دیا جائے۔ جہیز کی نمود و نمائش پر بھی پابندی لگائی جائے۔ شادی بیاہ پر لمبے چوڑے کھانے پر بھی پابندی لگنی ضروری ہے۔ ولیمہ کا کھانا صرف سو آدمیوں کے لیے اور صرف ایک سالن اور ایک میٹھی ڈش تک محدود کیا جائے۔

☆ بروقت بچوں کی شادیاں کی جائیں، بلا وجہ شادی کو مؤخر نہ کیا جائے۔

☆ بچی سے پوچھ کر اس کا رشتہ طے کیا جائے۔

4- اگر کسی بچے میں بغاوت کا رجحان پیدا ہونے لگے (اور ماں باپ کو عموماً اپنے بچوں کے جذبات کا علم ہوتا ہے) تو فوراً اسے کنٹرول کیا جائے۔ ان کو گھر میں نظر بند کر دیا جائے اور جس لڑکے کے ساتھ وہ ملوث ہے وہیں خاموشی اور سادگی سے اس کی شادی کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔ قبیلہ، خاندان اور مال و دولت کے پیمانے وہاں فی الفور ترک کر دیے جائیں۔ عقل مند ماں باپ ایسے واقعات کو آگے بڑھنے نہیں دیتے اور خاموشی سے اپنے ہاتھوں بچی کو وہیں بیاہ دیتے ہیں

جہاں اس کی خواہش ہوتی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے پاس اگر کوئی نوجوان جوڑا جرم زنا میں ملوث لایا جاتا تو آپؐ ان دونوں کو پہلے سزائے تازیانہ دیتے، پھر ان سے توبہ کرواتے پھر ان کی باہمی شادی کر دیتے۔ اس صورت میں بچیوں کے گھروں سے فرار کے واقعات کی روک تھام کی جاسکتی ہے۔

5۔ طاغوتی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے افراد کو تیار کیا جائے۔ ان کے باقاعدہ ریفریشر کورسز اور تربیتی ادارے قائم کیے جائیں تاکہ وہ ایک طرف اپنے عوام کو اس باطل نظام کی تباہ کاریوں سے آگاہ کرتے رہیں، دوسری طرف مغربی پروپیگنڈے کا دندان شکن جواب دے سکیں۔

6۔ اسلامی معاشرتی اقدار کے بارے میں زبانِ طعن دراز کرنے والوں کو قانوناً سزا دی جائے۔ اگر ایسے چند لوگوں کو تعزیری سزائے تو ایسے سب پروپیگنڈے فوراً دم توڑ جائیں۔ ذرا ہمت کرنے کی ضرورت ہے۔

19

1- وَعَاشِرُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (النساء: 19)

”عورت کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو۔“

2- الْجَنَّةُ تَحْتَ أَقْدَامِ الْأَمَّهَاتِ (فرمان نبوی)

”جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔“

صرف اسلام ہی طبقہ نسواں
کا محسن ہے

- ✿ اشتراک کی معاشرہ
- ✿ برطانیہ، فرانس
- ✿ یو۔ این۔ او اور حقوق
- ✿ اسلام اور شرف نسوانیت
- ✿ قرآن کے احکام
- ✿ زوجین کا قریبی تعلق
- ✿ ماں کا مقام
- ✿ خاندانی ادارہ
- ✿ عفت کا تحفظ
- ✿ عورت کا نان نفقہ کا حق
- ✿ عورت کا حق وراثت
- ✿ حقوق ملکیت
- ✿ مذہبی حقوق
- ✿ علمی حقوق
- ✿ نجی زندگی کا تحفظ
- ✿ تمدنی حقوق
- ✿ عملی مواقع
- ✿ ملی خدمات
- ✿ خواتین کی علمی سرگرمیاں
- ✿ حربی خدمات
- ✿ اصل دائرہ کار
- ✿ اسلام کا احسان
- ✿ مغربی مصنفین کا اعتراف
- ✿ عورت کا احترام تاریخ کی روشنی میں

صرف اسلام ہی تحفظِ حقوقِ نسواں کا ضامن ہے

دینِ فطرت، اسلام نے عورت کے جملہ حقوق کا بہترین انداز میں تحفظ عطا فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں اسے معاشرہ میں اعلیٰ و ارفع مقام و مرتبے سے نوازا ہے۔ اس مضمون میں مختصر طور پر اسلام کی طرف سے عورت کو دیئے گئے حقوق اور پھر اس کے مطابق اسے ملنے والے احترام و مرتبہ کا ذکر کیا جائے گا، مگر اس سے پہلے غیر مسلم معاشروں کی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ ہو۔

اشتراکِ معاشرہ:

اشتراکیت کے مطابق انسان معدے اور مادے کا مجموعہ ہے اور معاشی جدوجہد اس کا واحد مقصدِ حیات ہے۔ اب اسے روٹی، کپڑے، مکان اور علاج کے علاوہ اور کیا چاہیے یا اس کے علاوہ اس کے اور کون سے حقوق ہو سکتے ہیں؟ اس لیے اشتراکِ معاشرہ صرف انہی مادی ضرورتوں کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ عورت کے معاشی حقوق کا تحفظ اس طرح ہو رہا ہے کہ دنیا بھر میں عورت اشتراکِ معاشرہ میں سب سے زیادہ زبوں حال اور خوار ہے۔ گھر کی ذمہ داری، بچوں کی پرورش، مرد کے ساتھ برابر فیکٹریوں پر کام کرنا، سڑکیں کوٹنا، پل بنانا، نہریں کھودنا، کھیتی باڑی کرنا، غرض ہر کام جو مرد کرتا ہے وہ اسے بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے بدلے میں ایک طرف عورت دوسرے مال و اسباب کی طرح ریاست کی ملکیت ہے جس کی عفت کا معاشرہ میں کوئی تصور نہیں، دوسری طرف وہ ہر وقت مردوں کی طرف سے ظلم و زیادتی اور جسمانی تشدد کا شکار بنتی رہتی ہے۔ روسی عورت حقیقتاً دنیا کی مظلوم ترین عورت ہے۔

برطانیہ:

برطانیہ میں عورت کے بنیادی حقوق نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جس طرح مظلوم وہ صنعتی انقلاب سے پہلے تھی، ویسے ہی اب بھی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب وہ ہر جگہ مردوں کے ساتھ

شانہ بشانہ ہانپتی کانپتی دوڑ لگا رہی ہے مگر عملاً مساوات اسے نہیں مل رہی۔ بڑے بڑے مناصب ابھی بھی مردوں کے پاس ہیں، مردوں کی تنخواہیں عورتوں کی نسبت سے کہیں زیادہ ہیں۔ دوسری طرف میک اپ اور ملبوسات پر بے تحاشا خرچ کرنے کے باوجود مردوں کے جنسی اور جسمانی تشدد کا بہت زیادہ شکار ہے۔ سکارمین سرلیزلی (Scarman Sir Leizlie) اپنی کتاب ”انگریزی قانون“ (English law) میں لکھتا ہے (واضح رہے کہ وہ ایک جج ہے):

”برطانوی قانون میں انسانی حقوق کا کوئی ضابطہ ہے ہی نہیں۔ اگر ہوتا تو شمالی آئرلینڈ میں تفتیش کے جو انتہائی اذیت ناک طریقے اختیار کیے گئے ہیں، کیا وہ ممکن تھے؟“

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہاں عورت کے کون سے حقوق ہو سکتے ہیں!

فرانس:

فرانس میں شادی کی شرح بہت کم ہو گئی ہے۔ بیشتر افراد شادی کے بغیر زندگی گزارتے ہیں۔ پھر اس قلیل شادی شدہ تعداد میں سے بھی بہت کم ہیں جو واقعی باعصمت اور پاکدامن رہنے کی نیت سے نکاح کرتے ہیں۔

اسی طرح نیویارک میں بھی شادی شدہ آبادی کا ایک تہائی حصہ اپنی عائلی زندگی میں مخلص نہیں ہے، کم سن محرمات سے زیادتی کرنا ایک معمول کی بات ہے حتیٰ کہ بیٹی اور پوتی تک محفوظ نہیں ہیں۔ اب وہاں اس کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اب تو جدید عورت دراصل ایک گمشدہ جنس ہے، وہ جنس جس نے دنیا کو اگلی نسل دینی تھی، تربیت یافتہ نسل! اب وہ جنس یورپ و امریکہ میں معدوم ہو چکی ہے۔ باعفت و پاکدامن عورت دور، بہت دور کہیں کھو چکی ہے۔ نہ عورت کو اپنی عصمت کی فکر ہے نہ معاشرے کو اسے تحفظ مہیا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سفاح اور زنا کو جس طرح مرد اپنے لیے جائز سمجھتا ہے، عورت بھی اسی طرح اپنے لیے جائز سمجھنے لگی ہے۔ بلکہ اب یہ ”مہذب“ معاشرے عورت کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے وہ ہم جنس پرستی کی آغوش میں پناہ لے رہے ہیں۔ وہاں باقاعدہ ہم جنسوں سے شادی کرنے کے لیے قانون سازی ہو چکی ہے۔ وہاں برہنہ لوگوں کے باڑے عام ہیں۔

باقی رہ گئی اقوام متحدہ:

یو۔ این۔ او کی جنرل اسمبلی نے 10 دسمبر 1948ء کو انسانی حقوق سے متعلق 30 دفعات پر مشتمل عالمی منشور کا اعلان کیا تھا، جو گویا بنیادی حقوق کے ضمن میں انسانی کوششوں کی معراج ہے۔

یو۔ این۔ او نے 1952ء میں خواتین کے سیاسی حقوق کے لیے، 1957ء میں شادی شدہ عورتوں کی قومیت کے تعین کے لیے مختلف قراردادیں منظور کیں۔ مگر بنیادی حقوق کے محافظ کی حیثیت سے یو۔ این۔ او اپنے رکن ممالک سے اس پر عمل نہ کرا سکی۔ 1975-76ء کی رپورٹ کے مطابق 142 ارکان ممالک میں سے 113 ممالک میں ان قراردادوں کی سنگین خلاف ورزیاں ہوئیں۔

پھر یو۔ این۔ او کے تحت اب تک عالمی سطح پر خواتین کی بے شمار کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ جن میں سے چوتھی عالمی کانفرنس جو بیجنگ میں منعقد ہوئی، درحقیقت تذلیلِ نسوانیت کی کانفرنس تھی۔ جس کا مقصد وحید عورتوں کو مادر پدر آزادی دلانا تھا تا کہ وہ بچوں کو جنم دینے کے ”فریضہ“ بلکہ جھنجھٹ سے آزاد ہو سکیں، اگر ہو جائے تو اپنی مرضی سے اسقاطِ حمل کروا سکیں، ہم جنس پرستی اور آزادانہ شہوت رانی میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو سکے۔ یہ ہے یو۔ این۔ او کی حقوقِ نسواں اور شرفِ نسواں کے سلسلے میں کوششوں کی معراج! وہ عورت کو مساوات، حقوق اور ترقی دینے چلے ہیں مگر بقول اقبال

مردوں کے اگر شانہ بشانہ رہے عورت
کچھ اور ہی بن جاتی ہے، عورت نہیں رہتی

☆☆☆

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

☆☆☆

اسلام اور شرفِ نسوانیت

اس کے برعکس اسلام نے عورت کو تحفظ مہیا کیا ہے، اسے عزت و احترام دیا ہے۔ اسے وقار عطا کیا ہے، سچی بات ہے کہ عورت نے جتنا اعلیٰ و ارفع مقام اسلام کے جوارِ رحمت میں پایا ہے، اس کی نظیر تمام مذاہبِ عالم میں تو کجا، خود موجودہ دور کی نام نہاد مہذب مغربی تہذیب میں بھی پایا جانا بلکہ اس کا صرف عشرِ عشر بھی پایا جانا ناممکن ہے۔ قرآن و سنت میں اس صنفِ نازک کے حقوق کی پاسداری، تمام معاملات میں اس کی خصوصی نگہداشت اور فطری کمزوری کے باعث اس کی رعایات پر نظر ڈالی جائے، تو بے اختیار یہ بات زبان سے نکلتی ہے کہ یہ واقعی خالقِ کائنات ہی کی حکمت بھری تعلیم ہے۔

قرآنِ پاک کے تاکیدِ احکام عورت کے سلسلے میں:

ہر حیثیت میں عورت کو قرآن و سنت نے عزت و احترام سے نوازا ہے۔ ماں، بیوی، بیٹی، بہن ہر لحاظ سے معاشرہ میں اس کو شرف اور وقار کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ مرد کو شریعت نے گھر کا قوام اور سربراہ بنایا ہے اور اسے تاکید کی ہے کہ وہ عورت سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ کہیں بھی اور کسی انداز میں بھی عورت پر ظلم اور زیادتی کا مرتکب نہ ہو، بلکہ ہر وقت اس سے ہمدردی کا رویہ رکھے!

قرآنِ پاک کے احکام:

عَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ^[۱]

”عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا۔“

فَاِمْسَاكِ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِحْ بِاِحْسَانٍ^[۲]

”عورت کو (اگر رکھنا ہے تو) بھلے طریقے سے روک لو یا بھلے طریقے سے اسے

[۱] النساء: 19

[۲] البقرہ: 229

رخصت کر دو۔“ (دونوں صورتوں میں بہر حال شائستہ انداز اختیار کیا جائے)

لَا تُمَسِّكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا [۱]

”محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رکھنا کہ یہ زیادتی ہوگی۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کرم نوازیوں کی انتہا دیکھیے! آپ اگر محسنِ انسانیت ہیں تو اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم محسنِ نسواں بھی ہیں۔ آپ نے حقوق کی رعایت اور حسن سلوک میں عورت کو تین گنا زیادہ مقدم قرار دیا۔ اشیائے دنیا میں سے عورت کو اپنے لیے پسند فرمایا۔ ماں کے قدموں تلے جنت کی بشارت دی۔ بیٹیوں اور بہنوں کو گھر والوں کے لیے باعثِ رحمت و برکت اور ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کو دوزخ سے نجات کا ذریعہ قرار دیا۔ آپ نے عورتوں کو نازک آبگینوں سے تشبیہ دی۔ صالح بیوی کو دنیا کی سب سے قیمتی متاع قرار دیا اور حجۃ الوداع کے موقع پر عورتوں سے حسن سلوک کی خصوصی ہدایات فرمائیں۔

قرآن پاک نے زوجین کے قریبی تعلق کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ [۲]

”وہ عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔“

دونوں میاں بیوی کو اللہ رب العزت ایک دوسرے کے لیے لباس قرار دے رہا ہے۔ لباس کی یہ تشبیہ (میری ناقص رائے کے مطابق) پورے عالمی ذخیرہ علم و ادب میں سے بہترین تشبیہ ہے، جو ان کے تعلق کی صحیح نوعیت کو بیان کر رہی ہے۔ یہ تشبیہ آخر بہترین کیوں نہ ہو! یہ انسانی فطرت بنانے والے ربِّ حی و قیوم نے خود ارشاد فرمائی ہے۔

لباس اور انسان میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لباس انسان کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ وہ اس کو گرمی سردی سے بچاتا ہے، وہ اس کو حسن و جمال عطا کرتا ہے، لباس سے انسان کے وقار اور رعب و جمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی طرح مرد و عورت دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر

[۱] البقرہ: 231

[۲] البقرہ: 187

ہیں، نہ مرد تنہا مکمل ہے نہ عورت تنہا مکمل۔ دونوں کے باہمی تعاون سے ہی ان کے روحانی و جسمانی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی ستر پوشی کرتے ہیں۔ عزت و اخلاق پر حرف لانے والے اثرات سے ایک دوسرے کو بچاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث بنتے ہیں۔ مل کر اپنی اولاد کی پرورش کرتے ہیں۔ اس طرح دونوں کے تعاون ہی سے جہاں تمدن کی گاڑی درست سمت میں سفر طے کرتی ہے، وہاں خود ان کی اپنی صلاحیتوں کی نشوونما بھی ہوتی رہتی ہے۔ اگلی نسل کی تربیت بھی بہترین انداز میں ہوتی رہتی ہے اور یہ سارے کام اعتماد اور سکون کی فضا میں انجام پاتے ہیں۔

ماں:

اسلام عورت کو اپنے گھر کی ملکہ قرار دیتا ہے۔ اندرون خانہ کے تمام مسائل وہ اپنے ناخن تدبیر سے حل کرتی ہے۔ ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ دنیا میں جتنے بھی نبی، صدیق، شہید اور ولی ہوئے ہیں، سب عورتوں کے بطن سے ہی پیدا ہوئے، انہی کی گود میں تربیت پائی اور پروان چڑھے۔ اسلام نے عورت کے اس مرتبہ و مقام کو اس طرح تسلیم کیا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور رسول کریم کے بعد جو ہستی سب سے زیادہ قابلِ تکریم ہے، وہ صرف ماں ہے۔ جس کی خوشنودی میں اللہ کی خوشنودی اور جس کی ناراضی میں اللہ کی ناراضی ہے۔ بڑے بڑے ولی اور بزرگ اللہ کے ہاں اسی وقت کوئی مقام حاصل کر سکتے ہیں جب ان کی بوڑھی، کمزور اور نحیف و نزار ماں ان سے راضی ہو۔ اس طرح اسلام عورت کو ”خیر کی بنیاد“ قرار دیتا ہے۔

(اس کے برعکس ہندو، عیسائی اور یہودی مذاہب سب میں عورت کو گناہ کی جڑ اور ناگزیر برائی سمجھا جاتا ہے۔ ان کا نکتہ نظریہ ہے کہ معاشرہ میں ہر جگہ عورت کو مرد کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیے، اس کی خدمت کرنے اور اس کا دل بہلانے کے لیے۔ اس کے بغیر مردوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا، اس لیے وہ ناگزیر برائی ہے۔ مرد حاکم ہے اور عورت کا کام اس کی خدمت بجالانا ہے۔ اس کی اپنی کوئی رائے ہے نہ مرضی اور نہ حق)

خاندانی ادارہ:

اسلام نے نکاح کے ذریعہ سے عورت کو تحفظ دیا۔ ولی اور گواہوں کی موجودگی میں اس کا نکاح اس کے وقار و احترام میں اضافہ کرتا ہے جبکہ سرمایہ داروں نے عورت کو گھر سے باہر نکال کر نکاح اور سفاح کی تمیز ختم کر دی۔ کمیونسٹوں نے گھر کو سرمایہ داروں کے ہتھکنڈوں کا مرکز اور ان کی کمینہ حرکات کی آخری کمین گاہ قرار دے کر ختم کر دیا۔ سترہ سے بتیس سال کی لڑکیاں ریاست کی ملک قرار دی گئیں، جو جس سے چاہے اپنی جنسی ضرورت پوری کر لے۔ اولاد کو ماں باپ کی جاسوسی پر لگا دیا گیا۔ حرامی اور حلال بچوں کی تمیز ختم کر دی گئی، نکاح اور طلاق کی ضرورت سے آزاد کر دیا گیا..... (1917ء سے 1935ء تک یہی کیفیت رہی)

عفت کا تحفظ:

1- اپنی عزت کو محفوظ رکھنا مسلمان عورت کا حق ہے اور معاشرے کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ عورت کی عفت و پاکدامنی کی حفاظت کے لیے ہر ممکن ذرائع استعمال کرے۔ زنا بالجبر کی صورت میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے۔ جس کے نتیجے میں مرد کو سو کوڑوں یا رجم کی سزا دی جائے گی۔ خود عصمت دری کرنا اسلام میں گناہ کبیرہ ہے ہی، اسلام نے تو زنا کی تہمت لگانے کی بھی بہت سزا یعنی اسی (80) کوڑے مقرر کر رکھی ہے۔

2- اسلام نے عورت کی عفت اور پاکدامنی کی غیر معمولی حفاظت فرمائی ہے۔ پہلے تو مرد عورت دونوں کو اپنی نگاہیں جھکا کر رکھنے (غض بصر) کا حکم ہوا۔ پھر کسی پاکدامن کے کردار پر الزام تراشی کی ممانعت کی گئی۔

ارشاد ہوا (اندازہ کریں کہ قرآن کریم ناموسِ خواتین کے لیے کتنا غیر معمولی انداز اختیار کرتا ہے):

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لَعُنُوا فِي
الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾^[1]

”جو لوگ پاکدامن، بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا و آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔“

3- اگر کوئی آدمی اپنی بیوی پر الزام لگائے تو ہمارے ہاں جہالت کی بنا پر مرد اپنی بیویوں کو صرف شک و شبہ کی بنا پر ہی قتل کر ڈالتے ہیں اور اگر واقعی جرم ثابت ہو جائے تو مرد و عورت دونوں کو فی الفور اگلے جہان پہنچا دیتے ہیں مگر شریعت کسی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس لیے اس نے ایسے موقع پر لعان کا حکم دیا ہے۔

کتب حدیث میں لعان کے دو واقعات تفصیل سے ملتے ہیں، ایک تو ہلال بن امیہ کا واقعہ اور دوسرا عویمر عجلائی کا۔

عویمر عجلائی کے مقدمے کی روداد سہل بن سعد ساعدی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ملتی ہے۔ عویمر اور ان کی بیوی دونوں مسجد میں بلائے گئے۔ لعان سے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میاں بیوی کو تنبیہ کرتے ہوئے تین بار ارشاد فرمایا: ”اللہ خوب جانتا ہے کہ تم میں سے ایک تو ضرور جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟“ جب کسی نے توبہ نہ کی تو پھر ان میں ملاعنیت کروادی گئی۔ جب عویمر لعان سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے: ”یا رسول اللہ! اب اگر میں اس عورت کو رکھوں تو گویا میں جھوٹا ہوں“ یہ کہہ کر انہوں نے تین طلاقیں دے دیں، بغیر اس کے کہ رسول اللہ نے انہیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہوتا۔ ان طلاقوں کو حضورؐ نے نافذ فرما دیا اور ان کے درمیان تفریق کرادی نیز آپؐ نے فرمایا: ”یہ تفریق ہے ہر اس جوڑے کے لیے جو باہم لعان کرے۔“ پھر سنت یہ قائم ہوگئی کہ لعان کرنے والے زوجین کو جدا کر دیا جائے۔ اس وقت عورت حاملہ تھی اور عویمرؓ کہہ رہے تھے کہ یہ حمل میرا نہیں ہے۔ لہذا بچہ ماں کی طرف منسوب کیا گیا اور سنت یہ قائم ہوگئی کہ اس طرح کا بچہ ماں سے میراث پائے گا اور ماں ہی اس کی میراث پائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ اگر اس لعان میں عورت خاموش رہے تو پھر اس کو سنگسار کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اس کے خاموش رہنے سے ثابت ہو گیا کہ وہ قصور وار ہے۔ اگر دونوں نے قسمیں کھالیں تو دونوں میں جدائی کروادی جائے گی اور اگر مرد نے عورت پر جھوٹا الزام لگایا، پھر وہ اپنے جھوٹا ہونے کا اقرار کر لے تو اسے حد قذف لگائی جائے گی۔

عورت کی عصمت محفوظ ہے:

انہی ہدایات کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں ظلم و ستم اور جور و تشدد کی بے شمار داستانوں کے درمیان بھی کوئی ایک ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی مسلم حکمران نے اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے ان کی بہو بیٹیوں یا ماؤں بہنوں کی بے حرمتی کی ہو۔ وہ تو عورت، اپنی ہو یا پرانی، کی عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے کٹ مرتے تھے۔

سید امیر علی لکھتے ہیں کہ اسلام کا سپاہی کمزوروں اور مظلوموں کی دادرسی کرنے کے لیے ہر وقت اتنا ہی تیار رہتا تھا جتنا اللہ کے دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے کے لیے مستعد ہوتا تھا۔ حجاج بن یوسف کے کانوں میں لنکا کی مسلمان مظلوم عورت کی پکار و فریاد پڑی تو فوراً اپنے کمن بھتیجے اور داماد محمد بن قاسم کو فوج دے کر اس دختر اسلام کی دادرسی کے لیے روانہ کیا۔ بالآخر اس پوری ہندو راجدھانی کو فتح کر کے اس خاتون کو اس کا حق دلایا۔

اسی طرح عباسی خلیفہ معتصم کے عہد میں جب رومیوں نے ہزاروں میل دور کچھ مسلمان عورتوں کو قیدی بنالیا تو ایک ہاشمی عورت نے چیخ کر معتصم کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ جونہی معتصم کو اس عورت کی فریاد کا پتہ چلا فوراً بیقرار ہو گیا۔ پندرہ دن کا پیادہ پاسفر کر کے عموریہ جا پہنچا اور رومیوں پر فتح حاصل کر کے اس عورت کو بلایا۔ جس رومی فوجی نے اس کو ایذا دی تھی، اس کو بھی بلایا۔ اس عورت نے معتصم کے حکم سے اس رومی کو اسی طرح تھپڑ مار کر اس سے اپنا انتقام لیا جس طرح اس فوجی نے اس کو مارا تھا۔ اس موقع پر معتصم نے کہا: ”اے بہن! اب تم اس ظالم کو بتا دو کہ مسلمانوں کا خلیفہ تمہاری بے عزتی اور توہین برداشت نہیں کر سکا۔ تمہارا انتقام لینے کے لیے وہ تمہاری مدد کو آن پہنچا ہے۔“

تحفظِ جان:

اسلام نے انسانی جان کے احترام کی بڑی تاکید کی ہے۔ دنیا کے کسی بھی مذہبی، اخلاقی یا قانونی لڑچر میں تحفظِ جان کی یہ مثال نہیں ملتی، جس میں اسلام کی طرح ایک آدمی کے قتل کو تمام آدمیوں کا قتل ٹھہرا کر انسانی جان کے قتل سے روکا گیا ہو۔ چنانچہ اسلام عورت کی جان کے تحفظ کی بھی

بڑی تاکید کرتا ہے۔ مثلاً بیٹی کی حیثیت سے اسے زندہ درگور کرنے سے منع فرمایا، ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِمَّنْ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ

”اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان

کو بھی دیں گے۔“

عرب لوگ عورت کو باعث ذلت و عار سمجھتے تھے۔ کبھی اندیشہ فقر سے اور کبھی واقعی غربت کی بنا پر اسے پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ [۲] وہ اولادِ زینہ کو ترجیح دیتے تھے کہ یہ بڑا ہو کر کمائے گا اور دشمن کا مقابلہ کرے گا۔ اس لیے اسلام نے اس قبیح حرکت سے سختی سے روکا۔ اس طرح عورت کی زندگی کو تحفظ عطا فرمایا۔ عورتوں سے خصوصی طور پر یہ بیعت لی جاتی تھی:

وَلَا يَقْتُلَنَّ أَوْلَادَهُنَّ ۖ

”وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔“

اسی طرح اسلام نے بیوی کو بھی تحفظ عطا فرمایا کہ مرد کسی بھی موقع پر بیوی کو قتل نہیں کر سکتا۔ اس کو بیوی کے کردار پر کوئی شبہ ہے تو اس کے لیے لعان کا طریقہ کار رکھا گیا ہے۔ مگر وہ خود اس کو قتل نہیں کر سکتا۔

جب کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی معاشروں میں 25% قتل گھروں کے اندر ہوتے ہیں۔ مرد اپنے ہاتھوں سے اپنی بیویوں کو قتل کر ڈالتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ یہ اسلامی معاشرہ کا خصوصی مزاج ہے کہ مرد عورت پر ہاتھ اٹھانا اپنے لیے باعثِ عار سمجھتے ہیں۔ عورت کے

[۱] انعام: 151

[۲] آج کل بھی ہندوستان (خصوصاً بہار کا صوبہ) اور چین وغیرہ میں بیٹیوں کو قتل کر ڈالنے کی قبیح رسم ایک اور انداز سے جلوہ گر ہو رہی ہے۔ ان مقامات پر یا تو لڑکی پیدا ہوتے ہی مار دی جاتی ہے یا پھر الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے سے پتہ چلنے پر وضع حمل سے پہلے پیٹ میں ہی اس کو ختم کر دیا جاتا ہے، یعنی اسقاطِ حمل کروا دیا جاتا ہے۔

[۳] الممتحنہ: 12

احترام کی بنا پر بھی ایسا کیا جاتا ہے اور ویسے بھی مرد اس کو اپنی مردانگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ حجاج بن یوسف ثقفی جیسے سفاک اور ظالم شخص کے سامنے ایک عورت اُمّ علقمہ نامی گرفتار ہو کر پیش کی گئی۔ پہلے اس کے قتل کا حکم دیا، مگر پھر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ امّ علقمہ نے کہا: ”آپ ایک عورت کے قتل کا مشورہ دے رہے ہیں؟“ حجاج پر اس کی بات کا ایسا اثر ہوا کہ اسے آزاد کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی اسے نصیحت کی: ”جا اپنے گھر بیٹھ! اپنے اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جا اور آئندہ میری مخالفت سے باز آ جا۔“ اور اگر کوئی عورت قتل ہو جائے تو اسلامی شریعت مرد کی طرح عورت کے قتل عمد کی صورت میں اس کا قصاص دلاتی ہے اور قتلِ خطا کی صورت میں دیت دلاتی ہے۔

عورت کا نان نفقہ:

خاندان کے ادارے میں مرد قوام ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی اور بچے سب کی معاشی ضروریات پوری کرے، ان کی جملہ ضروریات پوری کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کرے۔ اگر کوئی مرد عمداً اس ذمہ داری کو اٹھانے میں تامل برتتا ہے یا بالکل ہی گھروالوں کا نان نفقہ ادا نہیں کرتا تو اس صورت میں عورت کو یہ قانونی تحفظ حاصل ہے کہ وہ عدالت کے ذریعے سے اپنا یہ حق وصول کر سکتی ہے۔

عورت کسی بھی شکل میں بچوں کے مالی اخراجات کی کفیل نہیں ہے۔ نہ شوہر کے گھر میں، نہ طلاق کی شکل میں اور نہ بیوگی کی صورت میں (ہاں اگر اپنی خوشی سے وہ بچوں پر خرچ کرتی ہے، یا ان کی خاطر مجبوری کے وقت کام کرتی ہے تو اس کو اس کی نیکی کا اجر و ثواب ملے گا۔ مگر قانونی لحاظ سے بہر صورت یہ اس کی ذمہ داری نہیں ہے)

اس کے برعکس سرمایہ دارانہ اور اشتراکی معاشروں میں عورت کی کوئی شنوائی نہیں۔ پندرہ سال کی عمر میں لڑکی، بیٹی اپنے اخراجات کی خود ذمہ دار ٹھہرا دی جاتی ہے، باپ اس کا خرچ اٹھانے سے انکار کر دیتا ہے۔

عورت کا حق وراثت:

صرف اسلام نے عورت کو وراثت کا حق دیا ہے۔ وہ مرد کے مقابلے میں آدھی وراثت

کی حقدار ہے اور کوئی اسے حق وراثت سے محروم نہیں کر سکتا۔ بیوی یا بہن یا کسی ماں کو وراثت سے محروم کرنا اسلام کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔

حقوقِ ملکیت:

پھر اسلام نے ہی عورت کو ملکیت کا حق عطا کیا ہے۔ مہر، ہدیہ، وراثت کی شکل میں ملنے والے اپنے مال میں وہ خود ہی تصرف کرے گی۔ چاہے اپنے اوپر خرچ کرے، اولاد پر خرچ کرے، وصیت کرے، ہبہ کرے یا کسی فلاحی کام میں لگا دے۔ عورت کو جائیداد رکھنے کا یہ حق اسلام نے چودہ سو سال پیشتر دے دیا تھا۔ یہ ان اسلامی تعلیمات ہی کی برکت ہے کہ آج سعودی عرب (جو مغرب کے نزدیک سب سے زیادہ تاریک خیال اور رجعت پسند ملک ہے اور ان کا ہدف تنقید بنا رہتا ہے) کی کل دولت کا 40% خواتین کی ملکیت ہے۔ ریاض میں کل جائیداد کا 25% اور جدہ میں 50% خواتین کی ملکیت ہے۔ وہ خود کاروبار کرتی ہیں۔ وہاں کاروباری خواتین کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ریاض کے چیمبر آف کامرس میں دو ہزار سے زائد خواتین نے اپنے کاروبار رجسٹر کروا رکھے ہیں۔ خواتین کی دکانوں پر ”مردوں کا داخلہ ممنوع ہے“ کے بورڈ آویزاں ہوتے ہیں اور وہ پردے کے ساتھ اپنا کاروبار کرتی ہیں۔

مذہبی حقوق:

عورت پر دین کی پابندی اور شعائرِ اسلام کی بجا آوری اسی طرح لازم ہے جس طرح مرد پر۔ شریعت اسلامی کے مخاطب مرد و عورت دونوں ہیں۔ جو بھی دینداری اور تقویٰ کے حصول میں کوشاں ہو، اللہ سے اجر و مرتبہ پائے گا۔ رضائے الہی کا حصول، اتباعِ سنت، فکرِ آخرت میں مرد آگے بڑھ جائے، وہ مرتبہ و مقام حاصل کر لے گا اور اگر عورت مرد سے آگے نکل جائے تو عورت مرد سے زیادہ ثواب اور اجر حاصل کرے گی اور تقربِ الہی میں سبقت حاصل کر لے گی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عورت پر بھی برابر کا عائد ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشروں میں عورت پادری نہیں بن سکتی، اکیلی دعا نہیں مانگ سکتی، کوئی مذہبی فیصلہ نہیں دے سکتی، قاضی نہیں

بن سکتی، گواہی نہیں دے سکتی اور اشتراک کی معاشرہ تو مذہب کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔

جبکہ اسلام میں عورت نماز میں عورتوں کی امامت بھی کروا سکتی ہے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے، تبلیغ کے ذریعے سے عورت حفاظتِ اسلام کا بہت کام انجام دے سکتی ہے۔ بلکہ حرم وہ آخری جائے پناہ ہے، جہاں اسلام کو از سر نو تازگی اور شادابی نصیب ہوتی رہتی ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر بیرونی خراب ماحول سے سب مرد بھی بگڑ جائیں تو آنے والی نسل تو عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اللہ کے احکام کے مطابق بچوں کی پرورش کر کے، ان میں خدا خونی، حب رسول اور فکرِ آخرت کے جذبات و احساسات پیدا کر کے ان کو مخلص مسلمان بنا سکتی ہیں۔

علمی حقوق:

مغرب میں نیولین کے قول: ”عورت ایک ہاتھ سے بچے کا جھولا جھلاتی ہے تو دوسرے ہاتھ سے وہ چاہے تو سارے عالم کا جھولا جھلا سکتی ہے۔“ کو تعلیم نسواں کے لیے ایک انقلابی تصور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مگر عورت کے متعلق اصل انقلابی تعلیم اسلام ہی نے دی ہے۔ اسلام نے تعلیم مرد کی طرح عورت کے لیے بھی فرض اور لازمی قرار دی، اور اس دور میں قرار دی تھی جب کہ خود مرد بھی پڑھنا لکھنا بیکار لوگوں کا مشغلہ سمجھتے تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب جس طرح مرد تھے، اسی طرح عورتیں بھی تھیں۔ وہ بھی تعلیم دین حاصل کرنے کے لیے اتنی ہی مشتاق اور کوشاں رہتی تھیں، جس طرح مرد حصولِ علم میں سبقت کی کوشش کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ کی تعلیمی خدمات کس سے پوشیدہ ہیں! پروفیسر محمد عثمان تعلیم نسواں کے بارے میں لکھتے ہیں: ”اسلام یہ نہیں کہتا کہ بچیوں کو پڑھنا لکھنا نہ سکھاؤ، وہ عورتوں کو کسی ایسے ہنر کی تربیت سے بھی منع نہیں کرتا جو ان کا ذریعہ معاش بن سکے، وہ ان کے جائز طریقوں سے کمانے اور اپنے کام کاج کے لیے گھر سے باہر نکلنے پر بھی پابندی نہیں لگاتا مگر مغربی معاشرت میں عورت کی آزادی کا جو مفہوم لیا جا رہا

ہے اسلام یقیناً اس کی تائید نہیں کرتا۔ جنسی بے راہروی اور بے حیائی اسلامی معاشرت کی ضد ہے۔“ [۱]

نجی زندگی کا تحفظ :

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْذِنُوا [۲]

”اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک گھر

والوں کی رضائے لے لو۔“

ہر گھر کی بے تکلفی اور پردہ برقرار رہنا چاہیے۔ چادر اور چادر یواری کا تحفظ ضروری ہے۔

ہر گھر دوسروں کی تاک جھانک اور مداخلت سے محفوظ رہنا چاہیے۔ چنانچہ ہر عورت کو اپنی گھریلو

زندگی کا تحفظ اسلام نے دیا ہے۔

شخصی آزادی کا تحفظ :

امریکہ و یورپ میں آج تک عورت اپنے نام سے نہیں پکاری جاتی۔ وہ اپنی شخصیت کو

نمایاں نہیں کر سکتی۔ شادی سے قبل مس ٹامن ہے تو شادی کے بعد مسز جانسن بن جاتی ہے، اس کی

اپنی کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ مگر مسلمانوں کے معاشرے میں ہر عورت کا ذاتی تشخص ہے۔ اس

کا ذاتی نام ہے۔ اس کی اپنی رائے ہے۔ اس کی اپنی ملکیت ہے اور یہ سب کچھ اس کو چودہ سو

سال پہلے سے حاصل ہے۔ عورتوں کے بلند مقام کا عالم یہ تھا کہ عورتوں کے باقاعدہ حلقہ ہائے

درس ہوتے تھے۔ مردان سے درس لیتے، وہ اپنی خواتین اساتذہ کا ذکر کرتے، اہم معاملات

میں عورتوں سے مشورہ لیا جاتا۔ صائب ہونے کی صورت میں اس پر عمل بھی کیا جاتا۔

[۱] اسلام پاکستان میں، صفحہ 153

[۲] نور: 27

امریکہ و یورپ میں عورت کو اپنی رائے کا حق اس بیسویں صدی میں جا کر ملا ہے۔ اس سے پہلے وہ ہر قسم کے شخصی و ذاتی حقوق سے محروم تھی۔

تہذیبی حقوق:

عورت کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اس کا نکاح اس کی رضا مندی اور مشورے سے ہو۔ غیر شادی شدہ ہو یا طلاق یافتہ یا بیوہ سب کے حقوق شریعت نے مقرر فرمائے ہیں۔ اگر بیوہ یا مطلقہ عورت اپنے بچے کی رضاعت کا فریضہ انجام دیتی ہے تو اس صورت میں بچے کے والد یا اس کے وارثوں سے نان نفقہ کی حقدار ہے۔ اسی طرح طلاق کی شکل میں بچہ اگر ماں کے پاس رہنا چاہتا ہے یا جب تک وہ نابالغ ہے، تو ماں ہی اس کو اپنے پاس رکھنے کی زیادہ حقدار ہے۔ اس کا خرچ اس کا باپ یا باپ فوت ہونے کی شکل میں اس کے وارث ادا کریں گے۔ بیوہ اور مطلقہ کو نکاح ثانی کا حق حاصل ہے۔ شوہر کے ساتھ نبھاہ نہ ہو سکے تو اسے خلع کا حق دیا گیا ہے۔

سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، ج اول میں ایک روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طلاق ملنے کے بعد بچے کی کفالت کے سلسلے میں حاضر ہوئی تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ اَنْتِ اَحَقُّ بِہٖ مَا لَہٗ تَنْکِحِیْ ”جب تک تو دوسرا نکاح نہیں کر لیتی، تو اس بچے کی (باپ سے زیادہ) مستحق ہے۔“

عملی مواقع:

عورتیں اپنے امور خانہ داری انجام دینے کے ساتھ ساتھ کام کے اور بھی بہت سے مواقع اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق حاصل کر سکتی ہیں، مثلاً کپڑے سینا، کاشتکاری کرنا، تجارت، طب، جراثیم وغیرہ۔ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک عورت قتیلہ نامی چقدر کا سالن بنا کر مسجد نبوی کے پاس بیچا کرتی تھی، خصوصاً جمعہ کے روز۔ ایک صحابیہ اسماء بنت مخرمہ حضرت عمر کے دور میں عطر بیچا کرتی تھیں۔ حضرت جابر بن عبد اللہ کی خالہ کھیتی باڑی کے کام انجام دیا کرتی تھیں۔ اسی طرح حضرت اسماء بنت ابی بکر اپنے شوہر حضرت زبیر کی زمین میں کھیتی باڑی کا کام

کرتی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی اہلیہ ایک کاریگر خاتون تھیں اور مختلف چیزیں بنا کر بیچا کرتی تھیں۔

ملی خدمات:

مسلم خواتین مختلف تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ملی خدمت کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھیں۔ اشاعتِ اسلام، شرکتِ جہاد اور خدمتِ مجاہدین میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ اگر مسلم دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بلاشبہ اس میں ہمیں صنفِ نازک کے عظیم الشان کارناموں کا سراغ ملتا ہے۔ اگر مصر اپنی تاریخ میں سے آسیہ زوجہ فرعون کا عظیم الشان نام پیش کر سکتا ہے تو انجیل مریم عذرا کا نام سامنے لائے گی۔ بیشک یہ دونوں ہستیاں یعنی آسیہ بنت مزاحم (زوجہ فرعون) اور حضرت مریم (والدہ عیسیٰ) علیہما السلام دونوں ہستیاں بڑی عظیم الشان ہیں، ان کی عصمت مسلم ہے مگر کیا تاریخ نے ان کی ذاتی عظمت و تقویٰ سے بڑھ کر ان کا کوئی مذہبی یا اصلاحی کارنامہ بھی یاد رکھا ہے؟ اس کے برعکس اسلام کے دامن میں آنیوالی پردہ نشینوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ حضرت عمرؓ جیسا اولوالعزم شخص اپنی بہن کی ثابت قدمی دیکھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا اور اسلام کے لیے انہوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ حضرت سمیہؓ کا اسلام کی پہلی شہید خاتون ہونے کا اعزاز حاصل کرنا، حضرت خدیجہؓ کا پوری امت میں سے سب مرد و خواتین میں سے پہلی مسلمان ہونے کا شرف اور پھر اس کے بعد پیغمبرِ اسلام اور خود اسلام کے لیے ان کی بیش بہا خدمات، حضرت عائشہؓ اور دیگر امہات المؤمنینؓ کی تدریسی و تربیتی خدمات..... یہ تو ایک طویل فہرست ہے۔

خواتین کی علمی سرگرمیاں:

نبی پاکؐ نے علم حاصل کرنا ہر مرد و عورت کے لیے لازمی قرار دیا تھا، ان کو الگ سے وعظ و تلقین بھی فرماتے۔ خواتین کا علم و تعلم کے سلسلے میں ذوق و شوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں بہت سی تعلیم یافتہ خواتین کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ ابن حجر عسقلانی نے

ابنی کتاب "الاصابة في تمييز الصحابة" میں اسلام کے قرونِ اولیٰ کی پندرہ سو تینتالیس (1543) محدث خواتین کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سرفہرست حضرت عائشہؓ ہیں۔ شعبہ قضا، واقعاتِ جاہلیہ، اشعارِ عرب، علم و فرائض، طب غرض کوئی ایسا شعبہ نہ تھا، جس میں کوئی خاتون بلکہ مرد بھی ان کے ہم پلہ ہوں، خود عمر رضا کحالی نے اپنی کتاب "أعلام النساء"، جزء ثالث، صفحہ 105 پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ بلکہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ دینی و شرعی احکام کا چوتھا حصہ ان سے منقول ہے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں سے تقریباً 130 لوگوں کے فتوے منقول ہیں۔ پھر ان میں سات اشخاص ایسے ہیں جن کے فتوے بیان کرنے کے لیے بڑی بڑی کتابوں کی ضرورت ہے اور وہ ہیں: حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ام المومنین حضرت عائشہؓ۔ گویا طبقہ اولیٰ کے سات مفتی صحابہ کرامؓ میں حضرت عائشہ ام المومنین کا اسم گرامی بھی شامل ہے۔

مفتی صحابہ کی دوسری صف میں حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے ساتھ ساتھ حضرت اُم سلمہؓ بھی نظر آتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے فتووں سے ایک ایک رسالہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ تیسرے درجے کے مفتی صحابہ میں (جنہوں نے بہت کم فتوے دیے ہیں) حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ اور حضرت ابوذرؓ، حضرت ابوعبیدہؓ وغیرہ کے ساتھ ساتھ ام عطیہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت فاطمہ الزہراءؓ، فاطمہ بنت قیسؓ، زینب بنت ام سلمہؓ، ام ایمنؓ، ام درداءؓ، عاتکہ بنت زیدؓ، ام شریکؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

حیدر آباد دکن کے شہر مالوہ کا حکمران سلطان غیاث شاہ خلجی (1475ء تا 1500ء) عورتوں کی تعلیم و تربیت میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے دربار عام کی طرح اپنے محل سرا میں ایک شاہی دربار قائم کیا تھا جس میں عورتوں کو مختلف فنون اور ہنر سکھائے جاتے تھے، مثلاً زرگری، آہن گری، محمل بانی، کپڑا بننا، خیاطی، نجاری، کفش دوزی، تیرگری، کمان گری، برتن سازی وغیرہ۔ "تاریخ فرشتہ" کے مطابق اس کے محل میں ایک ہزار کنیزیں حافظہ قرآن تھیں۔ وہ اکثر

تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتیں۔ [۱]

نواب صدیق حسن خاں نے اپنی کتاب ”تذکرہ شمع انجمن“ میں نواب شاہجہاں بیگم والیہ ریاست بھوپال (1868ء تا 1901ء) کے بارے میں لکھا ہے:

”نواب شاہجہاں بیگم نے اہل علم و فضل اور اصحاب ہنر و کمال کی تربیت پر جس ہمت خداداد سے توجہ مبذول فرمائی اس کی نظیر خواتین ہند میں زیب النساء بیگم دختر عالمگیر اعظم کے سوا کہیں نہیں ملتی۔“

نواب شاہجہاں بیگم خود بڑی عالمہ و فاضلہ خاتون تھیں۔ وہ نہایت فراخ دلی سے اہل علم و ہنر کی سرپرستی کرتی تھیں۔ خود بھی انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں، جس میں سے ”تاج الاقبال“، ”خزینۃ اللغات“ اور ”تہذیب نسواں“ زیادہ مشہور ہیں۔ [۲]

عثمانی خلافت میں صرف قسطنطنیہ میں چار سو ابتدائی مدارس تھے، جہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے تعلیم پاتے تھے۔ سلاطینِ دہلی کے عہد میں بعض مقامات پر عورتوں کے جداگانہ مدارس بھی موجود تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں بمبئی کے ایک شہر ”بنور“ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں کی تمام خواتین حافظہ قرآن ہوتی ہیں۔ اس شہر میں 13 مکتب لڑکیوں کے لیے اور 23 مکتب لڑکوں کے لیے ہیں۔ یہ بات اس شہر کے علاوہ اور کہیں میں نے نہیں دیکھی۔ بادشاہ ہمایوں کی بھتیجی سلیمہ بیگم ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صاحب دیوان شاعرہ تھی، اورنگ زیب کو تو تعلیم نسواں سے خصوصی دلچسپی تھی، اس کی بیٹی زیب النساء اپنے عہد کی بہت بڑی عالمہ اور بہت بڑی شاعرہ تھی۔ فرن خطاطی میں بھی بہت ماہر تھی، اس کا کتب خانہ نادر و نایاب کتب کا بہت بڑا مخزن تھا جس سے علماء و فضلاء فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ اس نے ”زیب التفاسیر“ نامی ایک اعلیٰ پایہ تفسیر قرآن بھی لکھوائی۔ اس کی بہنیں بھی عالمہ و فاضلہ تھیں۔ علاوہ ازیں بدر النساء بیگم، زبدۃ النساء اور مہر النساء بیگم نے بھی عبادت، تقویٰ اور حصول علم میں زندگی بسر کی۔ تعلیم نسواں عام تھی۔

[۱] چار سو باکمال خواتین، از: طالب ہاشمی، صفحہ 334 بحوالہ ہندوستان کی قدیم درس گاہیں از تاریخ فرشتہ

[۲] چار سو باکمال خواتین، از: طالب ہاشمی، صفحہ 525

خواتین دینی اور تعلیمی اغراض کے لیے مجالس و عظ میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ شیراز کی خواتین بہت پاکباز اور باحیا ہیں۔ وہ موزے پہن کر برقعہ پہن کر، لپٹی لپٹائی گھر سے نکلتی ہیں، وعظ کی مجالس میں شرکت کرتی ہیں۔ ان مجالس میں حاضری عموماً دو ہزار تک ہوتی ہے۔ ویسے بھی وہ صدقہ و ایثار میں بہت آگے بڑھی ہوئی ہیں۔“ [۱]

طبی خدمات:

عرب میں فرسٹ ایڈ اور ابتدائی طبی امداد کا شعبہ دراصل امور خانہ داری ہی میں شمار ہوتا تھا۔ کئی خواتین اس میں ماہر تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، بیماروں کی تیمارداری کرنا، زخمیوں کو پانی پلانا یہ کام بنیادی طور پر خواتین ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ ہر غزوہ میں کچھ خواتین ان امور کی انجام دہی کے لیے ہمراہ ہوا کرتی تھیں۔ وہ مجاہدین کے کھانے پکانے کا بند و ست بھی کرتیں اور دوسری ہر ضروری خدمت بھی بجالاتیں تھیں۔ لڑنا اور شمشیر زنی کرنا ان کے فرائض شامل نہیں تھا۔ اگر کسی نے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر از خود دشمنوں کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا تو یہ ایک ہنگامی نوعیت کا مسئلہ ہوتا تھا۔ ام عطیہ انصاریؓ سات غزوات میں شامل ہوئیں۔ کیونکہ وہ علم طب میں ماہر تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی خوب کر سکتی تھیں۔

میدان جنگ میں:

ہنگامی وقت و موقع پیش آنے پر مسلمان خواتین نے میدان حرب میں بھی بڑی خدمات سر انجام دی ہیں۔ عہد فاروقیؓ میں شام کے محاذ پر اجنادین اور یرموک کے معرکے عظیم ترین تھے، تو ایران کے محاذ پر قادیسیہ کا معرکہ بہت اہم اور فیصلہ کن تھا، ان سب معرکوں میں خواتین نے عظیم کارنامے انجام دیئے۔

جنگ قادیسیہ میں حضرت خنساءؓ کا کردار مثالی ہے، اپنے چاروں بیٹوں کے ہمراہ وہ اس میں شامل ہوئیں اور ان کی ترغیب سے وہ چاروں شہید ہوئے۔ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ کا

کردار حجاج کے مقابلے میں بے مثال تھا۔ اسماء بنت یزید بن سکن نے 9 رومیوں کا سر جنگ یرموک میں پھوڑ کر دشمنوں کو عورتوں کے خیمے کی طرف آنے سے روک رکھا۔

اجنادین کی جنگ میں خولہ بنت ازور نے کفار کو عورتوں کے خیمے کی طرف آنے سے روک رکھا، ان پر اتنی زبردست تیر اندازی کی کہ وہ ادھر آنے کی جرات نہ کر سکے۔

مشہور مجاہد صحابیات خولہ بنت حکیمؓ، ام سلمہؓ، ام عمارہؓ، ام عطیہؓ انصاری اور خولہ بنت ازور تھیں۔ سب نے میدان جنگ میں خوب داد شجاعت دی تھی۔ ام حکیمؓ حضرت عکرمہؓ کی بیوی تھیں۔ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئیں، بعد ازاں ان کی شادی خالد بن سعید سے ہوئی۔ ابھی دمشق میں دعوت ولیمہ ہو رہی تھی کہ رومیوں نے حملہ کر دیا۔ خالد بن سعید فوراً مقابلے کو نکلے مگر شہید ہو گئے، حضرت ام حکیمؓ شوہر کی شہادت کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ جوش سے انھیں، خیمے کی چوب اٹھا کر جنگ میں شامل ہو گئیں۔ اس دن سات رومیوں کو انہوں نے جہنم واصل کیا۔^[۱]

بلکہ جنگوں میں مسلمان فوجوں کی کامیابی کا بڑا ذریعہ ثابت قدم خاتونانِ حرم تھیں، جس لڑائی میں خواتین ساتھ ہوتیں، عرب جان پر کھیل جاتے تھے کہ اگر شکست ہو گئی تو خواتین بے حرمت ہوں گی۔^[۲]

(بہر حال بوقت ضرورت میدان جنگ میں مرہم پٹی کی اجازت دینے کا یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ دفاتروں اور کارخانوں میں بھی کام کر سکتی ہیں)

حضرت ہند بنت عمرو بن حزام انصاری وہ مسلمان خاتون ہیں، جن کے جنگ احد میں بھائی، بیٹا اور شوہر شہید ہو گئے تھے مگر وہ ایک ہی بات کہتی تھیں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خیرت سے آگاہ کرو۔ جب انہیں پتہ چلا کہ نبی کریمؐ خیر و عافیت سے ہیں تو انہوں نے ایک جملہ کہا

[۱] اعلام النساء

[۲] سیرت النبی، از: شبلی نعمانی، حصہ اول

جو بعد میں ضرب المثل بن گیا۔ انہوں نے کہا تھا: كُلِّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیر و عافیت سے ہیں تو پھر باقی تمام مصائب بچے ہیں۔ بیٹا، باپ، بھائی سب کی شہادت کی پروا نہیں۔^[۱]

پھر اُمّ سُلَیْم ہیں جو حضرت ابوسعید خدریؓ کی والدہ ہیں۔ (بخاری) انہوں نے غزوہ احد میں بہت سی خدمات انجام دی تھیں۔ یہ ساری عورتیں ایک طرف شمشیر زنی و نیزہ اندازی میں ماہر تھیں تو دوسری طرف اپنے دامنِ عفت کو بچانے میں بھی کامیاب تھیں۔

الغرض مسلم خواتین نے نہ صرف علم و فن میں کمال حاصل کیا، کہیں وہ میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دے رہی ہیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہی ہیں، کیمپ سنبھال رہی ہیں، اپنے مردوں کو پسپائی کے وقت حوصلہ دلا کر واپس لوٹنے پر مجبور کر رہی ہیں، ساتھ ہی ساتھ گھر میں شوہر کی خدمت و دلجوئی اور اولاد کی تربیت میں مستعد نظر آتی ہیں، بلکہ درحقیقت ان کے علم نے ان کو اپنے فرائض کی بجا آوری میں مستعد بنا دیا تھا۔ کیونکہ ان کے دل میں حصولِ رضائے الہی کا جذبہ اور محاسبہ آخرت کا خوف تھا اور یہی وہ حقیقی علم ہے جس سے ہر مسلمان خاتون کا آراستہ ہونا ضروری ہے۔

اصل دائرہ کار:

مسلم خواتین کی مندرجہ بالا تمام علمی، عملی اور حربی سرگرمیاں بجا، مگر شریعت نے ان کا اصل دائرہ کار بہر صورت گھر ہی کو قرار دیا ہے۔ ایک غزوہ میں ایک صحابیہؓ نے شرکت کے لیے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا:

مَنْ قَعَدَتْ مِنْكُمْ فِي بَيْتِهَا فَإِنَّهَا تُدْرِكُ عَمَلَ الْمُجَاهِدِينَ
 ”جو تم میں سے اپنے گھر میں بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل (کے ثواب کو)

[۱] اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر نبی کریمؐ زندہ سلامت ہیں تو شوہر، بیٹا، بھائی سب کی شہادت بچے ہے۔ اس کی کوئی پروا نہیں۔ یہ واقعہ ”تذکارِ صحابیات“ از طالب ہاشمی، 478 پر موجود ہے۔

پالے گی۔“^[۱]

مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن!

اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ فلاطون

عورت کا کام اگلی نسل کی تربیت اور انسان سازی ہے، گھر انسان سازی کے کارخانے ہیں، ماؤں کی گود بچہ کا ابتدائی مکتب ہے۔ اگر اس مکتب میں اس کی بہترین تربیت ہوگئی تو آخر تک وہ اپنے فرائض حسن و سلیقہ سے ادا کرتا رہے گا اور اگر خدا نخواستہ شروع ہی میں بری تربیت ہوگئی تو پھر بعد میں اس کی اصلاح ہونا بہت مشکل ہے۔

عورت کا دوسرا اہم فریضہ جو اس پر دین کی طرف سے عاید ہوتا ہے، وہ گھروں کو جائے سکون و اطمینان بنانا ہے۔ جب مرد دن بھر کا تھکا ماندہ گھر آتا ہے تو گھر کی اطمینان بخش اور پرسکون فضا میں راحت و آرام پاتا ہے۔ یہ راحت رسانی اور سکون کی فراہمی نیک و صالح عورت ہی کا کام ہے۔ اہل مغرب ہوس رانی تو جانتے ہیں مگر راحت و سکون کے اس تصور سے یکسر نا آشنا ہیں۔

تمدن کی حقیقی ترقی:

یہ امر واقعہ ہے کہ گھر عورت کے بغیر گھر نہیں بلکہ ویرانہ ہے۔ میرا یہ یقینِ وثاق ہے کہ تمدن کی حقیقی ترقی خواتین کے عفت مآب رہنے اور باپردہ خاتونِ خانہ بننے ہی سے ممکن ہے۔ اگر وہ گھر میں رہ کر مرد کو سکون مہیا کرتی ہے، تو مرد باہر جا کر اپنے حصے کا کام پوری دیانتداری، یکسوئی اور لگن سے انجام دے سکتا ہے۔ اگر اس کو گھر میں سکون میسر نہ ہو کہ گھر کی مالکہ تو ملازمت اور بیرون خانہ سرگرمیوں کے سلسلے میں گھر کو پورا وقت دے ہی نہیں سکتی تو پھر مرد گھر میں بھی سکون حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ دوسری طرف معاش کے سلسلے میں قدم قدم پر غیر عورتیں ساتھ ہوں تو خیالات میں ایک انتشار برپا رہتا ہے، طبیعت میں ہيجان اور احساسات میں آگ لگی رہتی ہے۔ جو دن بھر مرد کو بھی اپنے فرائض انجام دینے کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔

ایک عورت اگر خود گھر میں رہ کر معاشرے کو دیا نندار کمانے والا مرد اور بچوں کی شکل میں دس اچھے کارکن مہیا کر دے تو اس نے یقیناً معاشرے کی خدمت اس عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ انجام دی ہے، جو خود بیرون خانہ سرگرمیوں میں اپنے گھر، شوہر اور بچوں کو نظر انداز کر دیتی ہے، دوسری طرف مردوں سے مساوات کے شوق میں اپنا وقار، شرف اور نسوانیت کھو بیٹھتی ہے۔

اسلام کا احسانِ عظیم:

یہ تو اسلام کا عورت پر احسان ہے کہ وہ عورت کو باہر کی ذمہ داریوں سے بری قرار دیتا ہے۔ اہل خانہ کے جملہ مصارف خوراک، لباس، علاج، رہائش اور تمام ضروریات کا ذمہ دار مرد کو قرار دیتا ہے۔ مسلمان عورت کا غتیو رب یہ نہیں چاہتا کہ وہ فیکٹریوں میں جا کر مشینوں کا دھواں کھائے، دفاتروں میں جا کر افسرانِ بالا کی جھڑکیاں کھائے، کڑی دھوپ میں محنت مزدوری کرے، سارا دن مشین کی طرح سیلنگرل بن کر دکان پر چلتی پھرے۔ درد کی خاک چھاننے اور اوباش و بد قماش لوگوں کی ہوسناک نظروں کا نشانہ بننے کے بجائے غتیو رب کی تعلیم یہ ہے کہ وہ باعزت و باوقار طریقے سے گھر میں رہے اور گھر کی ذمہ داریاں ادا کرے اور پھر شریعت اس کو اعلیٰ مقام عطا کرے گی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ [۱]

”دنیا کی نعمتوں میں سے بہترین نعمت نیک بیوی ہے۔“

ایک اور مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي [۲]

”تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہترین ہے اور

میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہوں۔“

[۱] صحیح مسلم، کتاب النکاح

[۲] ترمذی

صرف اسلام ہی طبقہ نسواں کا محسن ہے

اب اگر عورت ملازمت کا حق مانگتی ہے تو مرد تو بہت فائدے میں رہے گا۔ وہ تمام مالی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائے گا اور یہ سارا بار عورت کے ناتواں کندھوں پر آ جائے گا۔ اس کی عفت و پاکدامنی ویسے مجروح ہوگی اور اپنا پورا اور مرد کا آدھا کام بھی عورت کے حصے میں آ جائے گا، گویا عورت 3/4 حصہ کام کرے گی اور مرد صرف 1/4 حصہ)

مغربی مصنفین کا اعتراف:

قرآن پاک، حدیث اور فقہ کی کتب میں جو مسائل حضانت، رضاعت، قصاص، طلاق، خلع، نکاح، مہر وغیرہ کے بالتفصیل مذکور ہیں، وہ صرف کتابوں کی زینت بننے کے لیے نہیں تھے۔ ابتدائی دور اسلام اور قرون وسطیٰ میں مسلمان عورت ہر جگہ ان سے شخصی طور پر مُتَمَتِّع ہوتی رہی ہے اور پھر ادارہ قضا اس کی پشت پر تھا۔ اپنے حقوق نہ مل سکنے کی شکل میں بذریعہ عدالت بھی اپنے حقوق حاصل کرتی رہی ہے۔ یہ احکام شریعت کے نظریاتی موقف کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرہ کے عملی اور حقیقی حالات کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ ایس۔ پی سکاٹ لکھتا ہے: ”اسلام کے طفیل خواتین کا احترام اتنا بڑھ گیا گویا ان کی پرستش ہونے لگی۔“ [۱]

گستاؤلی بان لکھتا ہے: ”ان قانونی حقوق کے علاوہ عورت کو بڑے عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ مشرقی عورتوں کی حالت اس قدر عمدہ ہے کہ سیاحوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ موسیوڈے ایس لکھتا ہے: ”عورتوں کا عموماً بہت احترام ہے اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص راستہ میں کسی عورت پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہیں کرتا۔“ [۲]

عورت کا احترام تاریخ کی روشنی میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احترام نسوانیت کے متعلق جو مزاج بنادیئے تھے، اس کا پرتو تاریخ کے ہر دور میں مسلم معاشرے میں ہمیں نظر آتا رہا ہے، عائلی اور اجتماعی طور پر ہر اعتبار سے

[۱] یورپ پر اسلام کے احسان، از: غلام جیلانی برق، صفحہ 93

[۲] تمدن عرب، صفحہ 550

عورتوں کی تکریم اور تحفظ کے مظاہرے موجود رہے ہیں۔ عثمانی خلفاء، سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کے محلات، حرموں کے اندر عام طور پر ملکہ کا اثر، ماں کا احترام اور بیٹیوں پر شفقت و رعایت بے پناہ ہوتی تھی۔ عثمانی سلاطین ہر معاملہ میں اپنی خواتین کی رائے اور مشورہ لیا کرتے، سلاطین دہلی عورتوں کا بڑا احترام کرتے، ابن بطوطہ کے نزدیک سلطان تغلق اپنی ماں کے احترام و اطاعت میں کوئی کمی نہ کرتا تھا۔^[۱]

تمام مغل بادشاہ بھی اپنی ماؤں کے ساتھ انتہائی محبت و احترام کے ساتھ پیش آتے۔ بابر بادشاہ اپنے خاندان کی بیگمات کا بڑا احترام کرتا اور اپنی رشتہ دار خواتین کی عزت و احترام کا بڑا اہتمام کرتا۔ ان کو وظائف دیتا، ان کے اخراجات پورے کرتا، بوقت ضرورت ان سے مشوروں کا طالب ہوتا۔ مشکلات میں ان کی ہمدردی اور دلجوئی سے سکون حاصل کرتا تھا۔ یہی روش دیگر مغل فرمانرواؤں اور عام رعایا کی بھی تھی۔ گستاوی بان کہتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے دربار میں عورتوں کا بڑا درجہ تھا۔^[۲]

عورت کا احترام معاشرہ میں:

اجتماعی سطح پر مساوات کا جو مزاج اسلام نے مسلمانوں میں پیدا کر دیا تھا، ہمیشہ اور ہر دور میں مسلمانوں میں جاری و ساری رہا، یہ مساوات مسلمانوں میں عملی طور پر بہت مستحکم اور مشرقی طرز معاشرت کا جز بنی رہی۔^[۳]

مشہور سیاح ابن بطوطہ نے لکھا ہے: ”ترک باشندے عورتوں کی بے انتہا تعظیم کرتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں مردوں سے زیادہ شان والی ہیں۔ سفر میں عورتوں کے ساتھ ان کے شوہر بھی ہوتے ہیں لیکن دیکھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی خادم ہے (کیونکہ

[۱] سفرنامہ ابن بطوطہ، ج اول، صفحہ 240

[۲] از: سید علی بلگرامی، تہذیب ہند، صفحہ 365

[۳] لیبان کا قول، از مجلہ ”منہاج“ (حیثیت نسواں نمبر) حصہ دوم، صفحہ 99

وہ سفر میں عورتوں کی تمام ضروریات کا پورا خیال رکھتے ہیں)۔^[۱]

عہد مغلیہ میں بھی عورتوں کی عزت و تکریم مکمل طور پر قائم تھی۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ امراء بلکہ عام لوگ اپنی بچیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے تھے۔ گلبدن بیگم، ماہم انگہ، نور جہاں، ممتاز محل، جہاں آرا بیگم، زیب النساء وغیرہ بڑی فاضل خواتین تھیں۔ ”الیکزینڈر ڈو“ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں عورتوں کا اتنا احترام کیا جاتا ہے کہ عام سپاہی بھی قتل و غارت کے ہنگامہ میں بھی انہیں کوئی ایذا نہیں پہنچاتے۔“^[۲]

علامہ اقبالؒ نے کیا خوب لکھا ہے:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کر ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطون نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرارِ فلاطون

(ضربِ کلیم، عنوان: عورت)

[۱] سفرنامہ ابن بطوطہ، ج اول، صفحہ 34839

[۲] منہاج ”حیثیت نسواں نمبر“، حصہ دوم، صفحہ 100

20

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝﴾

(المائدہ: 50)

”اللہ پر یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر

فیصلہ کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟“

﴿ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۝﴾

(البقرہ: 208)

”اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔“

قانونِ الہی نہ ماننے والے
مسلمانوں کا انجام

❁ قانونِ الہی کی حکمتیں

❁ چند قابلِ توجہ امور .

قانون الہی نہ ماننے والے مسلمانوں کا انجام

مغربی نظریہ مساواتِ مرد و زن ایک مصنوعی اور غیر فطری نظریہ ہے۔ جس کی بے شمار قباحتیں پیچھے بیان کی جا چکی ہیں، انسان کا بنایا ہوا قانون افراط و تفریط کا حامل ہونے کی بنا پر انسان کا مسئلہ حل کرنے کے بجائے بہت سی الجھنوں میں مبتلا کر دیتا ہے، جبکہ اللہ کا دیا ہوا نظام متوازن اور معتدل ہونے کی بنا پر انسان کے لیے سرتاپا رحمت و برکت کا باعث ہوتا ہے۔ جس طرح کوئی مصنوعی آفتاب پوری دنیا کو منور نہیں کر سکتا بالکل اسی طرح انسانوں کا بنایا ہوا نظام زندگی، زندگی کے پورے گوشوں کو منور نہیں کر سکتا۔ انسان کی عقل محدود، اس کی بصیرت کمزور، اس کا تجربہ ناقص ہے اور اس کا ذاتی لالچ اس کو دوسروں کا مفاد ملحوظ رکھنے ہی نہیں دیتا۔ اس کی فکرو نظر کے مصنوعی آفتاب وقتی طور پر بیشک ایک بڑا ہنگامہ کھڑا دیتے ہیں، مگر ان سے انسانی زندگی روشن نہیں ہو سکتی۔ انسان کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے ماہتاب جاہلیت اور جہالت کی تاریکیوں کا مقابلہ کس طرح کریں گے؟ انہیں دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے آفتابِ ہدایت کی ہی ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ آفتابِ ہدایت اسی شکل میں روشنی دے گا، جب اسے کئی طور پر اختیار کیا جائے گا۔ اگر اس کو اجزاء میں تقسیم کر کے من پسند اجزاء لے لیے جائیں اور بقیہ چھوڑ دیئے جائیں تب بھی یہ آفتاب فائدہ نہ دے سکے گا۔

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾^[۱]

”یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ سے بڑھ کر کس کا قانون اچھا ہو سکتا ہے!“

قانونِ الہی کی حکمتیں:

مولانا محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں: ”حق تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام و ممنوع قرار دیا ہے، وہ پوری انسانیت کے مفاد اور فائدہ پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ بخل یا اللہ تعالیٰ کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہو سکتا کہ وہ ان چیزوں کو اپنے کسی فائدے کی خاطر روکنا چاہتا ہو، یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ علیم و خبیر ہے۔ اس کا کوئی حکم فضول اور بے فائدہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس نے جن چیزوں کو حرام اور بے فائدہ قرار دیا ہے، وہ لامحالہ انسان اور انسانیت کے لیے ضرور رساں ہیں، اگر ان میں کوئی نفع محسوس ہو بھی تو مضرت کا پہلو بہر حال نفع پر غالب ہوگا۔“

مندرجہ بالا اقتباس ظاہر کر رہا ہے کہ اسلام کا معاشرتی و عائلی نظام (یعنی مرد کو قوام بنانا، عورت کو گھر میں رہنے کی تاکید کرنا، اس کا الگ دائرہ کار مقرر کرنا، باہر ستر و حجاب کا اہتمام، محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کی تمیز وغیرہ) اپنے اندر بے پناہ حکمتیں لیے ہوئے ہے، یہ الگ بات ہے کہ انسانی فہم ان کا احاطہ نہ کر سکے، بہر حال ہمارے لیے اس کو برضا و رغبت ماننا اور شرح صدر سے قبول کرنا لازم ہے جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلًّا مُبِينًا﴾ [۱]

”جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مرد یا عورت کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنا اختیار استعمال کرے اور جو اللہ و رسول کی نافرمانی کرے وہ بہت زیادہ گمراہ ہو گیا۔“

شریعتِ الہی کے من پسند احکام کو مان لینا اور جو ناگوار گزریں ان کو چھوڑ دینا یا ان کے متعلق تاویلیں کرنا اللہ و رسول پر ایمان لانے کے منافی ہے۔ اہل ایمان کا معیار یہی ہے کہ وہ کس حد تک اللہ اور رسول کے احکام کے پابند ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ يَكُونَ هَٰؤُلَاءِ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ [۲]

[۱] الاحزاب: 36

[۲] مشکوٰۃ بحوالہ اربعین نووی

”تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات میری لائی ہوئی تعلیم کے ماتحت اور تابع نہ ہو جائیں۔“

پھر اللہ تعالیٰ شریعتِ مطہرہ کے چند اجزاء ماننے اور بقیہ چھوڑ دینے والوں کو متنبہ فرماتا ہے:

﴿وَأَفْتَوْهُمُنَّ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۖ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيُؤَمَّرُ الْقِيمَةُ يُرْتَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۖ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ (۱۸۵)

”کیا تم کتاب الہی کے کچھ حصوں پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصوں کا انکار کرتے ہو! جو کوئی تم میں سے ایسا کرے اس کی اس کے سوا اور کیا سزا ہو سکتی ہے کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلیل و خوار ہو اور آخرت میں بھی انہیں سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔“

چونکہ یہ مذموم عادت یعنی شریعت کے چند من پسند اجزاء کو اختیار کر لینا اور بقیہ چھوڑ دینا یہودیوں میں موجود تھی، اس لیے قرآن کریم نے ہر جگہ ان کے لیے ﴿وَضَرَبَ لَهُمُ الدِّلَّةَ وَالْمُسْكِنَّةَ وَبَاءَ وَبِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ﴾ (۱۸۵) کے الفاظ ارشاد فرمائے، نور نبیہ النبی لاری سزا ہے! کیا اسلامی قانون کو مغربی رنگ دینے والے مسلمان اسی سزا کے مستحق بننا چاہتے ہیں؟

دنیا میں ذلیل و خوار کرنے سے یہ مراد ہے کہ یہ معاشرتی و خاندانی نظام دینے سے عورت پر تعمیرِ انسانیت کی عظیم الشان ذمہ داری ڈالی گئی ہے، یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، خاندانی فضا کا انتشار پورے معاشرے کو خفاشاں میں مبتلا کر دے گا، ایسے فساد زدہ معاشرے میں لین، سالن، ہٹلر، بش، اسحاق اور ببرک کارمل جیسے بنی نوع انسان کی تباہی کے ذمہ دار تو بننے لگتے ہیں، مگر سیدنا عمر فاروقؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، خالد بن ولیدؓ، سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ جیسے نمونے کا ایک فرد بھی پیدا نہ ہو سکے گا۔

اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان کے غالب طبقہ نسواں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے حقوق پر

[۱] البقرہ: ۸۵

[۲] ”ان پر ذلت و محتاجی مساط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔“

کوئی گلہ شکوہ نہیں، کوئی اعتراض نہیں بلکہ وہ اسی کو اپنے لیے محفوظ جائے پناہ سمجھتی ہیں اور اس کے دامن میں پناہ لینے کو اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھتی ہیں، ویسے بھی مغرب کے تجربات نے اسلامی قوانین کی برتری پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ جس سے ماشاء اللہ پاکستانی خواتین کے ایمان پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئے ہیں۔ [۱]

البتہ ہمارے ملک کا فرنگ زدہ طبقہ اسلام کے ہر حکم پر اعتراض کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، اس کا طریق واردات یہ ہے کہ پہلے ایک بہت نادر الوقوع مگر اشتعال انگیز واقعہ گھڑ لیا جاتا ہے، پھر اس مفروضہ کو اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس اس کے تدارک کی ایک ہی شکل رہ جاتی ہے، اور وہ یہ کہ اسلام کے دقیانوسی و ظالمانہ قوانین کو چھوڑ کر مغرب کے بظاہر چمکتے دھمکتے قوانین کو بے دھڑک اختیار کر لیا جائے۔ مقام صد حیف ہے کہ خود اہل مغرب آہستہ آہستہ صدیوں کے تجربات کے بعد اسلامی قوانین کی بہتری اور برتری کے قائل ہو رہے ہیں مگر ہمارے ہاں کے نام نہاد مرعوب مسلمان مغربی قوانین پر مرے جا رہے ہیں وہ اپنے ہاں کے جواہرات کو چھوڑ کر ان سنگریزوں کو در آمد کر کے فخر محسوس کر رہے ہیں۔

چند اہم نکات:

اسلامی قانون کو اختیار کرتے وقت چند امور کا خیال رکھا جانا ضروری ہے:

- 1- حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں چند لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا، تو آپؐ نے انکے ساتھ اسی طرح جہاد فرمایا جس طرح کافروں کے ساتھ جہاد کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت اس بات پر شاہد ہے کہ اسلام میں کسی شخص یا قوم یا پوری دنیا کو بھی اس بات کا اختیار نہیں کہ اس میں کسی طرح کی ترمیم یا تبدیلی کرے۔ ترمیم یا تبدیلی کرنے کا عمل تو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خود ہم اپنے دین کو ناقص سمجھتے ہیں۔ جس دین کے بارے میں اس کے اپنے ماننے والے اس طرح کے خیالات رکھتے ہوں وہ اسے دوسروں کے لیے کس طرح باعث کشش بنا سکیں گے؟
- 2- جو شخص بھی اسلام کے اندر انتخاب اور اختیار کی پالیسی کا قائل ہے، وہ درحقیقت اللہ کا

[۱] روس نے صرف بیس برس کے تجربات کے بعد اپنی خواتین کو گھر کے محاذ پر واپس آنے کی تلقین کر دی تھی، صرف بیس برسوں میں اتنی بڑی تباہی ہو گئی جو، ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھی۔

بندہ نہیں بلکہ اپنی خواہشات کا غلام ہے، اور خواہشات کا غلام شخص یا گروہ یا قوم کبھی دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کامیابی تو اصولوں کی مکمل پیروی سے حاصل ہوتی ہے، اصولوں کو نفس کے مطالبہ کے تحت توڑنے موڑنے سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مسلمان کامیاب تب ہو سکتے ہیں، جب دین کے معاملے میں یکسو ہو جائیں۔ اسی یکسوئی پر ہمارے مستقبل کی کامیابی کا دارومدار ہے۔

3۔ پھر کامیابی کے لیے ایک اور لازمی شرط یہ ہے کہ اسلام کے ساتھ ہمارا تعلق کسی دنیاوی غرض کے لیے نہ ہو، بلکہ خاص اللہ کے لیے ہو۔ تب یہ نظام ہمیں آخرت میں بھی سرخرو کرے گا اور دنیا میں بھی کامیابی عطا فرمائے گا۔ بصورتِ دیگر اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے یا من پسند اجزاء کو اختیار کرنے سے ہم عبرتناک انجام سے دوچار ہو کر رہیں گے۔ بقول علامہ اقبالؒ

خداے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اور

گمان آباد بستی میں یقین مردِ مسلمان کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

اس بات پر ہمیں یقین محکم ہونا چاہیے کہ اسلامی احکام ہمارے انفرادی اور اجتماعی دونوں دائروں کے لیے بہترین اساس ہیں یہ ایک طرف فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامتی، اخلاق میں مضبوطی اور روح میں لطافت پیدا کرتے ہیں، تو دوسری طرف معاشرتی زندگی میں حسن سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدن میں توازن اور معیشت میں عدل و مساوات کے بھی ضامن ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ

یقین افراد کا سرمایہ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورتِ گرِ تقدیرِ ملت ہے

ویسے بھی مردوں سے مساوات کا مطالبہ کرنے والوں کو یورپ میں اس تحریک کے پس منظر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یورپ میں آزادی نسواں کا سفر

یورپ میں آزادی نسواں کا قصہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ”ترقی یافتہ“ صنعتی معاشرے میں مرد نے عورت کی کفالت کرنے سے انکار کر دیا اور عورت اپنے بچوں کی کفالت پر خود مجبور ہو گئی، مل مالکان نے عورت کا خوب استحصال کیا اور مرد سے نصف اجرت پر اسے مزدوری پر لگا دیا، ایک ہی کارخانے میں ایک وقت میں ایک ہی کام پر مرد کو دگنی اجرت مل رہی تھی اور عورت کو اس سے آدھی۔ ”انصاف“ کی ایسی اعلیٰ ترین مثال مغرب کا ”تہذیب یافتہ“ معاشرہ ہی دے سکتا تھا۔

اب عورت کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنا طبعی اور منطقی حق مانگے، لہذا عورتوں نے ہڑتالیں، مظاہرے، احتجاج غرض ہر طریقہ آزما دیکھا، مگر پتہ چلا کہ قانون تو مرد کے ہاتھ میں ہے اور وہ یہ حقوق عورت کو آسانی سے دینے پر تیار نہیں ہوگا۔ یہ قانون انسانی تھا اور صرف مرد کے مفاد میں تھا۔ کوئی الہی قانون تو نہیں تھا جو مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق و مراعات کا بھی خیال رکھتا۔ چنانچہ عورتوں نے تحریک نسواں برپا کی، حق انتخاب، پارلیمنٹ کی ممبری، ملازمتوں اور تعلیم میں مساوات کا مطالبہ کر دیا۔ پھر یہ مطالبے رفتہ رفتہ بڑھنے لگے، مگر مردوں نے مذہب اور روایات کے نام پر اس کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت نے مذہب اور روایات سے دست برداری میں بھی مرد سے مساوات کا مطالبہ کر دیا اور اخلاقی بے راہ روی..... میں مرد کے دوش بدوش آ گئی۔ اس طرح عورت روزی کمانے اور فتنہ پیدا کرنے کے لیے تجارت گاہوں، منڈیوں، بازاروں، کارخانہ غرض ہر جگہ مرد کے ساتھ قدم بقدیم چلنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کی بندش ختم ہو گئی اور وہ بے راہ روی کا وہ طوفان آیا کہ الّا مان الحفیظ!

مگر سوال یہ ہے:

مسلمان عورت پر تاریخ میں ایسا کون سا دور آیا ہے کہ مردوں نے اسے خود گھر سے باہر نکل کر کمانے پر مجبور کر دیا، یا اس طرح کا صریح جبر اس پر ہوا ہو؟ معاشرے میں انفرادی طور پر چھوٹی موٹی زیادتیاں عورت پر ہوئیں۔ مگر مسلمان عورت پر کبھی ایسی افتاد نہیں آئی، کہ وہ گھر کا محاذ چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ لہذا مسلمان عورتوں کو محض بھیڑ چال اور نقالی کے طور پر لغو اور فضول مطالبوں میں مغربی عورت کا ہمنوا نہیں بننا چاہیے۔

21

موجودہ مسلمان عورت کی
زبوں حالی اور اصلاح احوال

- ✽ عورت تاریخ اسلام کی روشنی میں
- ✽ اس کے مختلف مصائب
- ✽ مغربی استعمار کے بعد
- ✽ ترکی میں خلافت کا خاتمہ
- ✽ دینی تعلیم سے دوری
- ✽ عورت کی موجودہ حالت زار اور معاشرتی ابتری
- ✽ اسلامی ثقافت
- ✽ عام عورت کے مسائل اور جہالت
- ✽ ادھوری تعلیم
- ✽ شریعت سکول و کالج
- ✽ مطلوبہ مقصد
- ✽ عروج و زوال کا اصول
- ✽ عورت کے لیے نظام تعلیم
- ✽ غیر مخلوط تعلیم
- ✽ آج کے دور میں خواتین کے لیے عملی دائرہ کار
- ✽ حدود اللہ کو توڑنا ممنوع ہے
- ✽ عورتوں کا حصول معاش
- ✽ خواتین کی ملازمت کا دائرہ
- ✽ فوجی ٹریننگ
- ✽ خواتین کے لیے عدالتی چارہ جوئی کا حق
- ✽ اشتہارات پر کنٹرول
- ✽ خواتین تنظیموں کا کردار

موجودہ مسلمان عورت کی زبوں حالی اور اصلاح احوال

تاریخ میں عورت ہمیشہ مظلوم رہی ہے:

مختلف مذاہب و نظریات نے عورت کے سلسلے میں افراتفریطے کام لیا ہے۔ مسئلے کے حل کے لیے اسلام نے انسانیت کو اعتدال کا راستہ دلھایا تھا اور اس کو وہ مقام و مرتبہ عطا کیا جس سے وہ ہمیشہ سے محروم چلی آرہی تھی۔ یہ صرف اسلام تھا جس نے اسے انسانی اور سماجی حقوق عطا کیے، وراثت کا حقدار ٹھہرایا، اس سے نرمی و درگزر کی تاکید کی، اسے انتخاب رفیق کا حق دیا اور اسے مجموعی طور پر عزت و وقار اور احترام کے ایسے مقام پر فائز کیا کہ انسان کو اپنی نجات کے لیے ماں کے قدموں تلے جنت کی تلاش کی تاکید کی گئی۔ مگر المیہ یہ ہے کہ اس مشکل مسئلے کے حل کے لیے اسلام نے جو فیصلے دیئے اور قرآن و سنت نے جن اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی تھی، مسلمانوں نے عملاً ان کی نفی کر کے عورت کو پھر پہلے کی طرح مظلوم و محروم بنادیا۔

عملی طور پر صرف عہد نبویؐ اور خلفائے راشدینؓ کے دور سعادت میں خواتین اپنے حقوق سے پوری طرح متمتع ہوئیں۔ بعد ازاں جب خلافت موروٹی بادشاہت میں بدلی تو اسلام کے دیگر احکام کی طرح خواتین کے حقوق اور مراعات پر بھی زد پڑی اور آہستہ آہستہ دوبارہ وہ حالات عود کر آئے جس میں عورت یا تو محبوبہ ہوتی تھی یا کنیز۔ بحیثیت مجموعی اس کا وہ اعزاز باقی نہ رہا جو اسلام نے اسے عطا کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت کو مسلم معاشرے میں بہت احترام اور شرف ملا، ماں کی حیثیت سے بیشک اس کا ایک مرتبہ و مقام تھا مگر شاہی طبقے اور چند خاص طبقوں کو چھوڑ کر عام خاتون جہالت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ ناظرہ قرآن پاک پڑھ لینا اس کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا خصوصاً برصغیر کی خاتون۔ برصغیر کی خاتون کی حالت تو ہندو معاشرت کے زیر اثر اور بھی کمزور ہو گئی تھی۔ حکمران طبقہ کی خواتین گھروں میں تعلیم بیشک حاصل

کرتی تھیں مگر خواتین کے الگ مدرسے کا ہمیں کوئی ذکر نہیں ملتا اور مخلوط تعلیم کا تو اس دور میں رواج ہی نہ تھا۔ علاوہ ازیں:

☆ انتخاب شوہر کے سلسلے میں اس سے مشورہ یا رائے نہیں لی جاتی تھی۔ وہ ہندو عورت کی طرح بے آواز تھی۔

☆ مہر کے بارے میں یہ تصور تھا کہ یہ صرف طلاق کے موقع پر ادا کرنا ہوتا ہے۔ یا پھر موت کی صورت میں بخشوا لیا جاتا ہے۔ اس طرح عملاً وہ حق مہر سے بھی محروم تھی۔

☆ بیوہ کو دوسرے نکاح سے محروم رکھا جاتا تھا بلکہ اس کو بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔

☆ بیوی ہو یا بہن، عملاً وہ وراثت سے بھی محروم رکھی جاتی تھی۔

☆ پردے کو مبالغہ آمیز حد تک بڑھا دیا گیا تھا۔ شرفاء کی عورتیں بہت کم گھروں سے باہر نکلتی تھیں۔ اگر نکلتی بھی تھیں تو ڈولیوں اور کئی دبیز پردوں کے اندر رہتے ہوئے۔

☆ اس کی سب سے بڑی محرومی یہ تھی کہ وہ حصول علم کے حق سے محروم تھی۔ صرف چند اونچے گھرانوں کی لڑکیاں قرآن پاک ناظرہ پڑھ لیتی تھیں اور کچھ ابتدائی درسی کتب، عام عورتوں کے بارے میں تصور یہ تھا کہ یہ پڑھ لکھ کر خود سر ہو جائیں گی۔ گویا مردانہ طبقہ ان کو تابع مہمل بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ عورت تو ہمارے عقیدہ اور عمل کی بہت سی خرابیوں میں مبتلا تھی، رسوم و رواج کی پابند تھی۔

☆ خاوند کو مجازی خدا کہہ کر اس کی بے چون و چرا اطاعت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر اس کے اپنے حقوق کا کہیں ذکر ہی نہیں ہوتا تھا۔

اس طرح عورت عملی زندگی میں حصہ لینے سے بالکل محروم تھی۔ اپنے تحفظ کے سلسلے میں ناکام تھی۔ اپنے حقوق کا اسے شعور تھا، نہ اس کے حصول کے لیے اس کے اندر کوئی آرزو یا تمنا تھی۔ اس صورت حال کا بدترین نتیجہ 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت سامنے آیا جب ہزاروں کی تعداد میں مسلم خواتین نے اپنی ناموس کی حفاظت کے لیے یا تو زہر کھالیا یا تالابوں اور کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ اگر ان کو اپنے تحفظ کے لیے تربیت دی گئی ہوتی تو یہ صورت حال بالکل پیش نہ آتی۔

اسلام کی یہ تعلیم کہ علم حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔ عملاً معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ بالائی طبقہ کی خواتین گھروں میں پرائیویٹ بندوبست سے بے شک پڑھ لیتی تھیں اور ان میں علم کا واقعی چرچا بھی تھا، مگر ایک عام عورت اس حق سے محروم تھی۔ بلکہ ایک وہ وقت بھی آیا کہ فتویٰ دے دیا گیا کہ عورتوں کے لیے لکھنا پڑھنا مضر ہے۔ طبقہ نسواں کے علم سے محرومی کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ گھر کی چار دیواری تک محدود ہو کر رہ گئی اور اس طبقے کے بارے میں پھر وہی بحثیں چھڑ گئیں کہ عورت برائی کی جڑ ہے یا خیر کی بنیاد؟ بہر حال عورتیں اپنے دین کی حقیقی روح سے بڑی حد تک بیگانہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ چنانچہ ہندوستان میں اسلامی حکومتوں کے دور میں اکاؤنڈ کا زنا نہ مدارس کے علاوہ عام خواتین کی تعلیم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

برصغیر میں شاہ اسماعیل شہید علیہ الرحمہ نے سب سے پہلے طبقہ نسواں کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ آپ نے اپنی بیوہ پھوپھی کا دوبارہ نکاح کر کے نکاح بیوگان کی سنت کو زندہ کیا۔ عورتوں کو دینی تعلیم دی۔ ان کے بہت سے غلط عقائد کی اصلاح کی اور بہت سی غلط رسوم و رواج کے خلاف تحریک برپا کی، ان کوششوں سے طبقہ نسواں کو بہت سے فوائد بھی حاصل ہوئے۔ بعد میں سرسید نے بھی تعلیم نسواں کے لیے ایک موثر تحریک برپا کی، اور بچوں کے ساتھ ساتھ بچیوں کو بھی تعلیم دلوانے پر زور دیا، تاکہ وہ معمولات زندگی میں حصہ لے سکیں۔ بھوپال کی حکمران بیگم شاہجہاں نے بھی اپنی کتاب ”تہذیب النسواں“ میں نکاح بیوگان پر بڑا زور دیا ہے۔

عورت اس دور میں کچھ فقہی موشگافیوں کی بنا پر بھی مظلوم بنا کر رکھ دی گئی تھی۔ مثلاً جس عورت کا شوہر مفقود الخبر ہو گیا ہو وہ 90 سال تک شوہر کا انتظار کرے۔ پھر 15 سال بعد اس کے بارے میں اعلان کروائے (یہ مسئلہ ہی عقل سلیم کے خلاف ہے۔ کیا یہ عورت اتنی لمبی عمر پاسکتی ہے یا اتنا انتظار کر سکتی ہے؟) اسی طرح عورت عملاً خلع کے حق سے بھی محروم کر دی گئی تھی۔ پھر تین طلاق کا مسئلہ بھی ہمیشہ مسلمان عورت کے لیے پریشان کن رہا ہے۔ غلطی مرد کی ہو اور سزا کے طور پر عورت حلالہ کروائے، بہر صورت طلاق کی تلوار ہر وقت عورت کے سر پر لٹکتی رہتی ہے اور مرد بڑی کثرت سے عورتوں کو طلاق کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں۔ حالانکہ شریعت نے تمام حلال چیزوں میں سے اس کو سب سے زیادہ ناپسند قرار دیا ہے۔

جہیز کا مسئلہ:

اسی طرح ہندو معاشرت کے زیر اثر مسلمانان پاک و ہند کے لیے جہیز کا مسئلہ بڑا پریشان کن ہے۔ اگر کوئی عورت تھوڑا جہیز لے کر جائے تو ساس، نندیں اور خود شوہر آنے والی بیو اور بیوی کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ اس غریب کو بے تحاشا طعنے اور کوسنے دیئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات غریب عورتیں کم جہیز کے طعنے سن سن کر تنگ آ جاتی ہیں یا وہ مستقل طور پر میکہ میں بھیج دی جاتی ہیں اور یا پھر وہ کسی نہ کسی بہانے سے خودکشی کر لیتی ہیں۔

داماد کا اپنے سسرال والوں سے تحقیر آمیز رویہ:

ہندو معاشرت کا ایک اور کرب ناک پہلو جو مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے، وہ داماد کا اپنے سسرال والوں کے سامنے نواب اور شہزادہ بن کر رہنے والا رویہ ہے۔ ”سالا“ اور ”سورا“ دو گالیاں عام لوگوں میں رائج ہو گئی ہیں۔ (”سالا“ اپنی بیوی کے بھائی کو کہتے ہیں اور ”سورا“ بیوی کے باپ کو) اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بیوی کے والدین اور بہن بھائی کا شوہر کے دل میں کیا احترام ہوتا ہے۔ ان کو ہر وقت اپنے شاہانہ مزاج اور رعب داب سے مرعوب کیے رکھنا عموماً داماد کا وطیرہ رہتا ہے اور بیوی کے ماں باپ بھی اپنے داماد کے چاؤ چونچلے مجبوراً پورے کرتے ہیں، اس کی خوب خاطر خدمت کرتے ہیں، کہ کیا کریں؟ مجبور ہیں، بیٹی کو تو بسانا ہے۔ کسی طرح اس کا معاملہ نبھ جائے، گڑ بڑ نہ ہونے پائے۔

عورت کے ساتھ سسرال والوں کا اور خود شوہر کا سلوک:

مرد باہر سے ہنستا مسکراتا گھر آئے تو گھر آتے ہی ایک دم منہ پر اس طرح تیوریاں چڑھ جاتی ہیں کہ بیوی کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جائے۔ ہر وقت اس کو مرعوب رکھنا، وقت بے وقت اس کو ڈانٹنا، گالم گلوچ کرنا کئی مردوں کا وطیرہ ہے۔ بلکہ بعض بڑے بڑے مولوی حضرات کا بھی یہ انداز ہے کہ باہر عورت کے احترام کے موضوع پر خطبہ دے کر گھر آ رہے ہیں اور آتے ہی بیوی کو بے نقط سنانے لگے۔ طلاق کی دھمکی دینا تو مردوں کا دل پسند موضوع ہے۔

”لاؤ ذرا کاغذ، میں تمہیں دو حرف لکھ دوں“ کئی مردوں کا یہ اپنی بیویوں سے طرز کلام ہے۔

پھر سسرال میں سے ساس، نندیں بھی اپنی بہو اور بھابھی کے نقائص تلاش کرنے میں مصروف رہتی ہیں۔ بیٹے اور بھائی سے لگائی بجھائی کر کے اس کو شوہر کی نظروں میں گرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور آج تک مجھے یہ منظر نہیں بھولتا، دواڑھائی سال کا بچہ تو تلی زبان سے گالیاں دے رہا تھا، پاس دادی اور پھوپھیاں بڑی خوش ہو ہو کر اسے سکھا رہی تھیں کہ اپنی ماں کو یہ گالیاں دو اور پھر جب اس نے ماں کو گندی گالی دی تو سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ بہت سے آٹھ دس سال کے بچوں کو میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ ماں کو اتنی غلیظ گالیاں دیتے ہیں جن کا مطلب و مفہوم بھی وہ نہیں جانتے ہوتے۔ بسا اوقات اس میں عورت کی اپنی جہالت اور بچوں کی تربیت نہ کرنے کا بھی دخل ہو سکتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ دادی اور پھوپھی کے سکھانے پر معصوم بچے اپنی ماں کو گالیاں دیتے ہیں۔ اس طرح اس کی زندگی تلخ بنا دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پھر ایسے گھروں میں مائیں بھی غصہ میں بچوں کو غلط اور نامناسب گالیاں اور بددعائیں دیتی ہیں، جو جہالت کا ایک شاخسانہ ہے۔

عورت کی زبوں حالی کا اہم سبب: 1- جہالت:

بہر حال اس جہالت نے عورت کی زندگی کو ایک عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پھر بچپن سے عورتوں کی تربیت اس انداز میں کی جاتی ہے کہ اصل قابلِ قدر کام تو وہ ہے جو مرد انجام دیتے ہیں، وہ ہر گرم سرد حالات میں کما کر لاتے ہیں لہذا اچھی خوراک کی ضرورت صرف مردوں کو ہے اور بچی کھچی کھا لینا اور اگر کچھ نہ بچے تو پھر ویسے ہی گزارہ کر لینا عورت کا مقدر ہے۔ عورت کو اچھی خوراک صرف شدید بیماری کے وقت دی جاتی ہے۔

غرض ایک ہندوستانی مسلمان خاتون کی حیثیت ایک مسکین گائے کی سی رہی ہے، جس کا کام صرف مردوں کی ہاں میں ہاں ملانا اور ان کے ہر جھوٹ بچ پر آمنا و صدقنا کہنا ہے۔ یہ صورت حال ادنیٰ سے تغیر کے ساتھ اب بھی جاری ہے، انہی حالات سے بغاوت کر نیوالی خواتین نے مغربی نظریہ مساوات مرد و زن کو بے دھڑک اختیار کر لیا۔

مغربی استعمار کے بعد:

اٹھارویں صدی میں جب مسلمانوں کے زوال کے بعد استحصالی قوتوں نے اسلامی ممالک پر فرداً فرداً قبضہ کر لیا تو وہاں اپنا نظام تعلیم رائج کر دیا، یہ نظام تعلیم سیکولر اور مادی تھا، اخلاقی اقدار سے عاری تھا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے تلخ ثمرات مسلمان نوجوانوں میں منتقل کرنے لگا، مگر اس میں تیزی اس وقت آئی جب مسلمان خواتین بھی یہ سیکولر اور دین بیزار تعلیم حاصل کرنے لگیں۔

ترکی میں خلافت کا خاتمہ:

جب 1923ء میں ترکی میں جنگ عظیم اول کے خاتمہ کے بعد ادارہ خلافت کو ختم کر کے مصطفیٰ کمال پاشا نے مغربی تہذیب کو اپنے ہاں کلی طور پر رواج دینے کا پروگرام بنایا، تو اس کے نتیجے میں خواتین کا پردہ اتر اور خواتین نے بھی مغربی تعلیمی اداروں میں پڑھنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہاں آزادی نسواں کی لہر بڑی شد و مد کے ساتھ ابھری۔ ان کی دیکھا دیکھی مصر میں بھی یہی آزادی نسواں کی تحریک شروع ہوئی اور پھر ایران اور دوسرے مسلمان معاشرے بھی اسی رو میں بہنے لگے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد یہاں بھی ”اپوا“ (APWA) کی بیگمات نے آزادی نسواں کا سوال بڑی شدت سے اٹھایا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ خواتین سکولوں، کالجوں میں پڑھ رہی تھیں۔ وہ مردانہ نصاب تعلیم، مردانہ اداروں میں ہی پڑھ رہی تھیں۔ یہ نصاب تعلیم سیکولر اور دین بیزار تو پہلے ہی تھا جو صرف مادی اقدار سکھانے والا تھا، اب جو یہی مردانہ تعلیم خواتین نے، مردانہ تعلیمی اداروں میں حاصل کی، نہ ان کے لیے الگ سے نصاب بنایا گیا، نہ الگ تعلیمی ادارے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلاس رومز میں اختلاط مرد و زن بڑھا، پردہ اور چادر اتری، خواتین نے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہر عملی میدان میں بھی مردوں کے ساتھ مقابلہ بلکہ مسابقت شروع کر دی۔ اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ زن، عملی طور پر نازن بن گئی۔ وہ اپنی نسوانیت کھونے لگی، اپنے بنیادی فرائض کو خود ہی حقیر سمجھنے لگی اور ملازمت کو اپنی ترقی کی معراج گردانا۔ اب چونکہ وہ مردوں کے ساتھ ہر میدان میں ملازمت کر رہی تھی اس لیے دوپٹہ تک اتار پھینکا۔ بھرپور میک اپ کے ساتھ

گھر سے باہر نکلنے لگی۔ شرم و حیا کا زیور دور قدیم کی یادگار قرار پایا۔ اب صرف دل کے پردے اور آنکھوں کی حیا پر اکتفا کیا جانے لگا۔

اب ماں کے پاس بچوں کی پرورش اور تربیت کے لیے وقت نہ رہا تھا، لہذا ”بچے دو ہی اچھے“ کا نعرہ گونجا۔ گھروں میں بیویاں چونکہ مردوں ہی کی طرح پڑھی لکھی تھیں اور کما بھی رہی تھیں، لہذا خم ٹھونک کر مردوں کے مقابلے پر آ گئیں۔ گھر نگل بننے لگے۔ اعلیٰ طبقہ کی بیگمات جو ملازمت نہیں بھی کرتی تھیں وہ بھی کلبوں کو رونق بخشنے لگیں۔ وہ سماجی سرگرمیوں کے نام پر گھروں سے باہر نکل آئیں۔ اس طرح امت مسلمہ کی اگلی نسل ماں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے اس کی شفقت و محبت سے محروم ہو گئی اور خود رجھاڑ جھنکار کی طرح پلنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے مغربی تعلیم پڑھنے اور پھر گھر سے باہر نکلنے سے جو اخلاقی بگاڑ بلکہ بحران امت مسلمہ میں اس وقت پیدا ہو چکا ہے، اس کی مثال گزشتہ چودہ سو سالوں میں کہیں نہیں ملتی۔ مناسب محبت اور شفقت نہ ملنے کی وجہ سے نوجوان نسل جرائم، تشدد اور ماردھاڑ کی عادی بن رہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب مسلمان جادہ ترقی پر گامزن ہیں، عورتیں پردہ کی قید و بند کو توڑ کر باہر نکل آئی ہیں اور مردوں کے دوش بدوش قومی و ملکی خدمات سرانجام دے رہی ہیں اور میں حیران و پریشان ہو کر سوچتی ہوں۔

کیسے اعتبار انقلاب آسمان کر لوں!

کیا یہی تعمیر قوم ہے کہ عورت اپنے بنیادی فرائض اور خانگی امور کو چھوڑ کر کمانے کے لیے گھر سے باہر نکل آئے اور دوسری طرف گھر میں شوہر اور بیوی میں کشمکش شروع ہو جائے۔

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بے کار و زن تہی آغوش؟

2- دینی تعلیم سے دوری:

امت مسلمہ کے ہمہ پہلو بگاڑ اور خصوصاً طبقہ نسواں کی زبوں حالی کا دوسرا اہم سبب قرآن و سنت کی تعلیم سے دوری ہے۔ جوں جوں مغربی تعلیم بڑھتی جاتی ہے، اسی نسبت سے عوام میں اپنی دینی و اخلاقی اقدار سے بیگانگی بڑھتی جاتی ہے۔ پہلے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم مدارس اور مساجد میں ہوتی تھی، جو دین کی بنیادیں ملت کے ہر بچے کے اندر راسخ کر دیتی تھی۔ مگر اب بچوں کی بنیاد

انگریزی میڈیم سکولوں سے ہوتی ہے۔ جو بلی و کتے سے محبت اور ناچ گانے جیسے ”بنیادی فرائض“ سکھا رہے ہیں:

- 1- C...CAT
- 2- D...DOG
- 3- SHE IS DANCING
- 4- SHE IS SINGING

اور ساتھ بے مقصد، فضول انگریزی نظمیں رنائی جاتی ہیں۔ اللہ رسول کا نام سرے سے غائب کر دیا گیا ہے اور یہ ان کی بالکل ابتدائی تعلیم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے بقول ماہر القادری مرحوم ۔

قوم کی وہ بیٹیاں کہ جن کو بننا تھا بتول
مدرسوں میں سیکھتی ہیں ناچ گانوں کے اصول

یہی وجہ ہے کہ اس وقت امت مسلمہ رقص، گانے اور موسیقی کی دلدادہ ہے (حالانکہ موسیقی بالاتفاق سب مسلمانوں کے نزدیک حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم مزامیر (آلات موسیقی) کو توڑنے کے لیے بھیجے گئے تھے) اسی رسول کی امت اب اغیار کی دیکھا دیکھی موسیقی کو اپنی روح کی غذا قرار دیتی ہے اور ناچ گانے کو تفریح کا سامان۔ [۱] معاشی میدان میں سود کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ مسلمان کراہ رہے ہیں مگر سود کے جال سے نکل نہیں پا رہے۔ سیاسی میدان میں مغربی جمہوریت نے مسلم ممالک میں اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑ رکھے ہیں۔ مغربی جمہوری استعمار کے کارندے مسلم حکمرانوں کے ذریعے سے مغربی مفادات کی مکمل حفاظت کر رہے ہیں۔ اب مسلمانوں کا معاشرتی نظام بھی اس طرح ابتری کا شکار ہے کہ تیرہ سو سال تک مسلمانوں میں جو امور بالاتفاق حرام اور ممنوع تھے اب خود مسلمان ان کی نئی نئی تاویلیں کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً گھروں میں مردوں کی حاکمیت، شوہر کی خدمت، عورت کا چراغ خانہ بن کر

[۱] اور اب تو بچوں کو پرائمری کلاس میں ہی جنسی تعلیم دینے کی باتیں ہو رہی ہیں، بلکہ مغربی دباؤ کے پیش نظر اس پر اصرار کیا جا رہا ہے۔

رہنا، پردہ کی پابندی، اگر گھر سے باہر نکلنا پڑے تو سادگی و وقار کے ساتھ۔ عورت کی نصف شہادت، نصف دیت، نصف وراثت، طلاق، ولایت کا حق مرد کے پاس ہونا، عورت کا اسلامی مملکت کی سربراہ نہ بن سکتا وغیرہ..... یہ سب باتیں دین سے کھلی بغاوت کے مترادف ہیں۔

عورت کی موجودہ حالت زار اور معاشرتی ابتری:

اب اسلامی معاشرہ میں عورت کے بارے میں نقطہ نظر ہی بدل گیا ہے۔ اس کی حیثیت محترم ماں اور محترم بہن کی تھی۔ مگر اب ایسا معاشی کارکن بنایا جا رہا ہے، جو زندگی کی جدوجہد میں مردوں کے برابر جدوجہد کرے۔ خاندان کی کمائی میں اضافہ کرنے کے لیے اسے گھر سے باہر نکلنا پڑے گا۔ عورت کی عفت و عصمت کا تصور بھی اب گئے دور کی یادگار سمجھا جانے لگا ہے۔ اب نیٹ اور سوشل میڈیا کا دور دورہ ہے۔ اب چھ ماہ کا بچہ بھی صرف موبائل ہی سے بہلتا ہے۔ اب خاندانی نظام کے اوپر بھی مسلسل وار کیے جا رہے ہیں۔ گھر کا ہر فرد اپنی من مانی کرنا چاہتا ہے۔ بزرگوں کا احترام قصہ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ کنواری دوشیزائیں بھی اپنے نکاح خود ہی رچانا چاہتی ہیں اور ہماری عدالتیں اسے قانونی جواز فراہم کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب معاشی خود مختاری اور مادہ پرستانہ نقطہ نظر دونوں مل جائیں تو پھر یہی نتیجہ نکلے گا۔ طلاقیں بکثرت ہونے لگی ہیں، بچے آیاؤں کے رحم و کرم پر رزل گئے ہیں۔ وہ ماں کے شفقت بھرے لمس اور پاکیزہ دودھ کی دھاروں سے محروم رہ جانے کی وجہ سے جرائم پیشہ، وحشی اور ماڑ دھاڑ کے عادی بن رہے ہیں۔ اوپر سے نیٹ اور موبائل نے رشتوں کے تقدس ختم کر دیئے ہیں۔

جب خاندانی وقاداریاں ختم ہو جاتی ہیں تو بوڑھے والدین بھی کسی مہر سی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب گھر والیاں کمانے کے لیے گئی ہوں تو بوڑھے معذور سر، ساس کی کون تیمارداری کرے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ آزادی نہیں عذاب ہے، ترقی نہیں بلکہ وبال ہے، جس نے معاشرے کا پورا نظام دگرگوں کر دیا ہے۔ ہمارے اخبارات اور ریڈیو، مختلف ٹی۔وی چینلوں نے باقاعدہ مہم چلا رکھی ہے۔ وہ بنت حوا کے نام سے مختلف ڈرامے پیش کر کے اور مختلف تحریریں

شائع کر کے سب خواتین کو گھر سے باہر نکال لانا چاہتے ہیں۔ خواتین کے مصائب کا تذکرہ بڑے دردناک انداز میں کرتے ہیں، مگر کبھی حقیقی مظلوم اور محنت کش عورت کے مسائل کا صحیح تجربہ نہیں کرتے۔ وہ دینی اور اسلامی تعلیمات کو وحشیانہ اور بربریت پر مبنی کہہ کر اس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق تو ماں محترم اور واجب الاطاعت ہے۔ لیکن اب یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکال کر فیکٹریوں، سڑکوں، دفتروں اور کارخانوں میں کام کرنے کے قابل بنانا گویا طبقہ نسواں پر بہت بڑا احسان ہے۔ صورت حال کتنی گھمبیر ہے! ذرا اندازہ کیجیے، اکتوبر 1995ء میں ایک پاکستانی ایکٹرس..... کا بیان دو کالمی سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں چھپا، وہ کہتی ہے: ”ہمارے ہاں بھی ایسی فلمیں بنی چاہئیں جو خون میں حرکت پیدا کریں۔“ ”میں جسم کو چھپانا نہیں چاہتی، جو نہیں دیکھنا چاہتا آنکھیں بند کر لے۔“ ”سین کی ڈیمانڈ پوری کرتی ہوں۔ تنگ کپڑے اور بارش کا سین ایک ایک انگ نمایاں کرتا ہے۔“ پھر آگے ان سرخیوں کا متن ملاحظہ ہو:

”کراچی۔ (پی۔ پی۔ اے) عالمی شہرت یافتہ ماڈل گرل اور اداکارہ نے کہا ہے کہ بھارت کے بعد اب پاکستان میں بھی سیکی فلمیں بنی چاہئیں۔ مخصوص علاقے کی لڑکیاں فلم بینوں کی ڈیمانڈ سے بخوبی واقف ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر شخص میرے جسم کو دیکھ کر اس کی تعریف کرے اور اگر کوئی دیکھنا نہیں چاہتا تو اپنی آنکھیں بند کر لے۔“

اس نئی ذہنی ساخت کا ایک نمونہ سابق گورنر پنجاب الطاف حسین نے (1994ء میں) پیش کیا۔ انہوں نے رونا مہ ”نوائے وقت“ اور اسی ادارے کے انگریزی روزنامے ”دی نیشن“ کے سینئر صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: ”عوام کو ذہنی گھٹن سے نجات دلانے کے لیے ضروری ہے کہ ناچنے گانے کی آزادی ہو۔ موصوف نے اس حسرت کا اظہار بھی کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی پر طوائفوں کو بلانا چاہتے تھے (مگر کسی وجہ سے شاید نہ بلا سکے)۔“

اب بے دھڑک ٹی وی پر اور انٹرنیٹ پر لوگ سب کچھ عریاں اور برہنہ دیکھ رہے ہیں کہ الحفیظ، الامان اور اس طرز فکر کا ایک نمونہ ”اسلامی جمہوریہ پاکستان کی وزیراعظم“ بے نظیر بھٹو نے بھی پیش کیا۔ انہوں نے لندن میں پاکستانیوں کے ایک اجتماع سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:

”اگر میں اسلامی لباس پہنتی تو ملک کی وزیراعظم نہیں بن سکتی تھی“ (واضح رہے کہ اس وقت فرانس میں ان مسلمان طالبات کو جنہوں نے سر ڈھانپنے پر اصرار کیا تھا اس پر ان کو تعلیمی ادارہ سے نکال دیا گیا تھا اور اس وقت وہی مسلمان طالبات اور ان کا سر ڈھانپنے پر اصرار والا مسئلہ ہی زیر بحث تھا) اس پر مستزاد ملک میں گینگ ریپ کے بھیانک اور لرزہ خیز واقعات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مساواتِ مرد و زن کو پاکستان میں عملاً نافذ کرنے والے خواتین و حضرات اس بے پردگی، بے حیائی، حسن فروشی اور خود نمائی کو آرٹ اور کلچر و ثقافت کی ترقی کا نام دے رہے ہیں۔ جس سے نئی نسل گمراہی کی طرف جا رہی ہے۔ فلموں، ڈراموں، مصنوعات کی تشہیر کے لیے اخبارات اور دیگر اشتہارات وغیرہ میں مختلف شرمناک پوز کے ذریعے سے عورت کی جو تذلیل کی جا رہی ہے، اس کے خلاف ان کا لب کشائی کرنا تو کجا اس کو ”شوہز“ کا نام دے کر اس سے سکونِ قلب حاصل کیا جا رہا ہے۔ اب تو ایسی جنسی آگ بھڑکائی جا رہی ہے کہ معاشرہ میں تین تین اور چار چار سال کی بچیاں محفوظ نہیں رہیں۔ ظالم درندے ہر دوسرے تیسرے دن ایک نوخیز کلی کو اغوا کرتے، اس سے درندگی و بربریت کرتے پھر اسے قتل کر ڈالتے ہیں اور کوڑے کے ڈھیر پر پھینک جاتے ہیں۔ خصوصاً قصور میں تو ایسے آٹھ دس واقعات مسلسل پیش آچکے ہیں۔

شوہز، خاص طبقہ کی ثقافت:

اسلام کی اپنی ثقافت ہے جو آفاقی اور بلند نصب العین کی حامل ہے۔ اس ثقافت میں انسانوں کی خود ساختہ ثقافت والی بے پردگی، آوارگی، عریانی، فحاشی اور فحش اخلاق شوہز کی بالکل گنجائش نہیں۔

یہ بات محلِ نظر رہے کہ عورت کے حقوق اور اس کی ترقی کی آڑ میں ”شوہز“ کی دلدادہ عورتیں ہمارے ملک و قوم کی تمام عورتوں کی نمائندہ نہیں ہیں۔ ان کی تعداد تو چند سو تک محدود ہے۔ مگر ذرائع ابلاغ کا یہ ظلم اور زیادتی ہے کہ وہ انہی خواتین کو کورج دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری عام عورت (جو ملک میں دس کروڑ سے زائد ہے اور وہ تو حیا دار اور باپردہ رہنے کی خواہشمند ہے۔) لہذا ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ان بگڑی ہوئی عورتوں کی اصلاح کی جائے کیونکہ وہ اسلامی تعلیم اور اسلامی کلچر کی تذلیل کر رہی ہیں۔

عام عورت کے مسائل اور جہالت:

ہماری عام عورت کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ ناخواندہ اور جاہل ہے۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ ہی اس کی جہالت اور دین سے ناواقفیت ہے۔ دیہاتوں کی محنت کش خواتین جو اپنے مردوں کے تشدد کا شکار بنتی ہیں، وہ بھی ہیں، جن کے شوہر منشیات کے عادی ہیں اور وہ دوسرے گھروں میں کام کر کے، برتن دھو کر، صفائی کر کے اپنے بال بچوں اور شوہروں کو پال رہی ہیں، پھر دن بھر کام کاج سے تھکی ماندی واپس لوٹتی ہیں تو شوہر اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے مار پیٹ کر ان سے ان کی مختصر سی جمع پونجی جو انہوں نے بچوں پر خرچ کرنا تھی، وہ بھی چھین کر لے جاتے ہیں۔ وہ خواتین بھی ہیں جو صرف اپنے بھائیوں کا منہ دیکھنے کے لیے وراثت سے عملاً دستبردار ہو جاتی ہیں۔ پھر عورت کی ایک مظلومیت یہ ہے کہ والدین چند پیسوں یا کسی ذاتی غرض کے عوض اکثر جائیداد بچانے کے لیے اپنی بیٹی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کسی نااہل شخص سے کر دیتے ہیں۔ یہ سب جہالت کے نقصانات ہیں۔ پھر عورت پر خود عورتوں کے مظالم کی فہرست بڑی طویل ہے۔ نند بھابھ، ساس بہو، سوکن کی لڑائیاں اور پھر غالب رہنے والی عورت کا دوسری کو گھر سے نکال دینا، پھر بعض اوقات خود عورت بھی مرد کے لیے ظالم کا روپ دھار لیتی ہے۔ پسند کے مرد سے شادی کے لیے حقیقی شوہر کو قتل کروانا، آوارگی اور فحاشی سے روکنے والے بھائی، باپ اور بیٹے کو قتل کروانا وغیرہ پھر نرم مزاج یا کمزور شوہر پر سخت مزاج عورت کے مظالم ایک الگ داستان ہے۔

تعلیم مسائل کا حل ہے:

میں تو یہ کہوں گی کہ ہمارے معاشرے میں ہر قسم کی برائیاں ہمارے مردوں اور عورتوں کو دینی تعلیم حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اصل موضوع یہی ہے کہ عورت کو اگر دین و دنیا کی کماحقہ تعلیم دی جائے تو وہ یقیناً نہ خود مظالم کا شکار بنے نہ کسی پر ظلم ڈھائے۔ یقینی امر ہے کہ تعلیم ہی ایک ہتھیار ہے جو انسان میں خدا خونی خود شناسی اور خود اعتمادی پیدا کر کے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے جرأت مند بنا دیتا ہے۔ دوسری طرف اپنے فرائض کا شعور دے کر دوسروں کی حق تلفی کرنے سے بھی روکتا ہے اور یقیناً یہ دینی و اسلامی تعلیم ہی ہے جو انسان کو ہر قسم کی

خود اعتمادی فراہم کرتی ہے۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے جری بناتی ہے۔ دوسری طرف اس طرح کی خدا خونی پیدا کرتی ہے کہ انسان اپنے رب کی رضا کے لیے اور اپنی نجات کے لیے دوسروں کے حقوق ادا کرنے پر آمادہ و مستعد نظر آتا ہے۔ سزا و جزا کا پختہ یقین جو انسان کو ہر قسم کے ظلم اور برائی سے روک دے، صرف اور صرف دینی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے۔

لہذا ہر انسان اور بالخصوص عورت کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ دین اسلام کی پوری تعلیم حاصل کر کے اپنے حقوق و فرائض سے بہرہ ور ہو، اس میں حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی ہمت پیدا کر دی جائے۔

ادھوری تعلیم:

اس وقت ایک اور الجھن پیدا ہو رہی ہے، وہ یہ کہ تعلیم کو دینی اور دنیاوی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جو لوگ عصری سکولوں، کالجوں سے تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں وہ دین سے بالکل ناواقف اور کورے ہوتے ہیں، دوسری قسم کی تعلیم وہ دینی مدارس ہیں جو اپنے مسلک کی تعلیم تو دیتے ہیں مگر رائج الوقت مسائل سے بالکل بے بہرہ رکھتے ہیں۔ اس وقت وطن عزیز میں بمشکل ہزار میں سے ایک آدمی ہوگا جو دین و دنیا کے علوم سے بیک وقت صحیح طور پر آگاہی رکھتا ہو۔ جبکہ دین اسلام تو دین و دنیا دونوں کی رہنمائی کرنے والا ہے۔ تو پھر کیوں اس کو بابو اور ملا میں تقسیم کر دیا گیا ہے؟ گویا ہماری تعلیم جو بھی ہے وہ ادھوری ہے۔ رائج الوقت عصری تعلیم گاہوں کا تو یہ حال ہے کہ یہاں مسلمان داخل کیا جاتا ہے، مگر جب وہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتا ہے تو وہ دین بیزار اور ملحد بن چکا ہوتا ہے۔

شریعت سکول:

لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس وقت ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جو بیک وقت دینی اور عصری تعلیم فراہم کریں۔ مثلاً طلبہ اور طالبات کے لیے الگ الگ شریعت سکول و کالج قائم کیے جائیں۔ جن میں تعلیم کا آغاز تو قرآن پاک اور دین کے بنیادی لوازم سے ہو۔ ساتھ ساتھ اردو و نوشت و خواند اور بنیادی حساب بھی کروایا جائے اور پھر درجہ بہ درجہ دین

اور دنیا کی تعلیم بیک وقت دی جائے۔ میٹرک تک تعلیم پانے والے کو قرآن پاک کا ترجمہ، روزمرہ زندگی میں رہنمائی کرنے والی حدیث اور فقہ کی ضروری تعلیم دی جائے۔ میٹرک سے آگے جانے والے کو اسلامی علم و ادب یعنی قرآن مجید کی تفسیر سے مکمل آگاہی ہو۔ پوسٹ گریجوایشن تک پہنچنے والے کو مذاہب عالم اور اسلامی علوم کا تقابلی مطالعہ کروایا جائے۔ کسی مضمون میں ایم۔ اے یا پی۔ ایچ ڈی کرنے کے لیے کسی ایک مضمون کا انتخاب کرنے کے بجائے دو لازمی مضمون ہوں، ایک تو اسلامیات کا اور دوسرا اپنا مطلوبہ مضمون۔ الغرض قرآن کا اور سنت کا گہرا شعور دینا اور زندگی کا محور اور مرکز سیرت طیبہ کو بنانا لازمی ہونا چاہیے۔

مطلوبہ مقصد:

مطلوبہ مقصد یہ ہے کہ ہر طالب علم کو دین اور دنیا کا ضروری علم ہونا چاہیے، امید ہے کہ ان شاء اللہ! اسی طرح مثالی معاشرہ وجود میں آئے گا۔ جس میں کمزور پر مظالم کا (خصوصاً عورت پر) اور دیگر معاشرتی جرائم کا خاتمہ ہو سکے گا۔ حکومت کو بھی اس طرح کے شریعت سکول اور شریعت کالج قائم کرنے چاہئیں اور نجی شعبہ کو بھی آگے بڑھ کر اس کا رخیہ میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔ ہمارے ہر بچے کے قلب و ذہن میں یہ بات راسخ ہونی چاہیے کہ اسلام ہی مکمل اور صحیح ترین شکل میں جدید دور کے سائنسی اور تمدنی تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ یہی دین انسان کو مکمل رہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ باقی سارے مذاہب اور نظریے دم توڑ چکے ہیں۔ ان کے لیے دور حاضر کی پیچیدگیوں اور فکر و نظر کی تاریکیوں میں راستہ بنانا ناممکن ہو چکا ہے۔

چنانچہ بنیادی تعلیم کی ملک گیر مہم چلانے کی ضرورت ہے پہلے تو ناخواندہ لوگوں کو تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلانا اور ان کو حصول تعلیم کے لیے آمادہ کرنا۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کو لازمی اور مفت قرار دینا۔ کتابوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مساجد و مدارس میں بک بینک قائم کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ تاکہ غریب و نادار افراد اس سے استفادہ کر سکیں۔ ساتھ ساتھ اس کو ہندوانہ طرز معاشرت سے نجات دلانا۔ اسے اسلام کے دیئے ہوئے حقوق دینے کے لیے مردوں کی بھی ذہن سازی کی شدید ضرورت ہے۔

اس غرض کے لیے اساتذہ، علماء، صحافی، سیاستدان اور دیگر سب لوگ مل کر یہ تحریک برپا کر دیں کہ عورت کو وہ تمام مقام اور حقوق دیئے جائیں، جو اس کو اسلام نے دیئے ہیں۔ مہر اور وراثت کے حقوق عورت کو دیئے جائیں۔ نان نفقہ کی ذمہ داری میں کمی بیشی کو مرد کے وارث پورا کریں۔ عورت کے بارے میں مردوں کے عمومی رویے درست اور خیر خواہانہ ہوں، تاکہ غیروں کو غلط قسم کے پراپیگنڈے کا موقع نہ مل سکے۔

مناسب یہ ہے کہ شادی سے پہلے لڑکوں کو کم از کم تین تین ماہ کے ریفریشر کورسز کروائے جائیں۔ یہ کورس فیملی کورسز کروائیں یا نکاح رجسٹرار۔ یہ کورس مساجد میں ہوں یا فیملی کورسز اس کا اہتمام کروائیں۔ ان کو اس کورس میں عائلی زندگی کے تمام مسائل عورتوں سے حسن سلوک اور نکاح و طلاق کے مسائل وغیرہ سے آگاہ کیا جائے۔ ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود بنیادی خرابیوں اور تصورات کے بارے میں بھی آگاہی دی جائے۔ جاگیر دارانہ نظام اور قبائلی نظام میں دیہاتی معاشروں میں توہین نسواں کا جو کلچر پایا جاتا ہے۔ اس کی شدید اصلاح کی ضرورت ہے۔ اور یہ سب کچھ ان ریفریشر کورسز میں لڑکوں کو سکھانا از بس ضروری ہے۔

جملہ اقوام عالم کے عروج و زوال کے احوال میں یہ بات یکساں ہے کہ جب عورت اپنے محترم مقام پر فائز ہوئی اور اس نے اپنے فطری فرائض ذمہ داری سے ادا کیے تو کسی اور کوشش کے بغیر زندگی کے تمام شعبوں کے لیے معاشرے کو دیندار، قابل اور محنتی افراد میسر آئے اور خوشحالی اور خوش بختی کے باب کھلتے چلے گئے۔ اور یہ سب کچھ تب ہو سکتا ہے جب ہر مرد اور ہر عورت دینی و دنیاوی تعلیم سے آراستہ ہو۔ عورت کا احترام سے محروم ہونا اور اولاد کا ماں کی محبت اور توجہ سے محروم ہونا کسی معاشرہ کی نہایت ابتر حالت ہے۔ جب گھروالی ہی گھر میں نہ رہے بلکہ کمانے کے لیے نکل کھڑی ہو تو گھر میں جو بد نظمی، بد سلیقگی ہوگی اس سے زندگی کی اعلیٰ قدریں قدم قدم پر پامال ہونے لگتی ہیں۔ امن و سکون، عنقا اور عدل و انصاف نایاب ہو جاتا ہے۔ لہذا عورت کو اس کا صحیح احترام ملنا بھی نتیجہ ہوتا ہے صحیح دینی و تعلیمی نظام اور درست انداز فکر کا۔

عورت کے لیے نظام تعلیم:

ان شریعت سکولز اور شریعت کالجوں میں ابتدائی مرحلہ میں طلبہ و طالبات کی تعلیم یکساں ہو سکتی ہے، لیکن ثانوی مرحلہ سے عورتوں کے لیے خصوصی مضامین اور کورسز کا اہتمام بھی کیا جانا چاہیے۔ ثانوی کے بعد کے مرحلہ میں ایسے اداروں کا جال بچھا دیا جائے جہاں تربیت پاکر وہ ملازمت کرنے کی پابند نہ ہوں، بلکہ گھر میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے سکیں اور اسے ان کی تعلیم و تربیت میں سرمایہ کاری کا مفید نتیجہ سمجھا جائے۔

ان نصابات میں لازمی طور پر عورت کی شخصیت، نفسیات اور اس کے فطری فرائض کو پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔ مثلاً:

- 1- خواتین کا منصب اور ان کے حقوق و فرائض
 - 2- دائرہ زوجیت اور فریضہ امومت کے متعلق اسلامی حکمت عملی
 - 3- خواتین کی عہد نبویؐ سے لے کر دورِ حاضر تک ایمانی، اخلاقی، عملی و فکری، ملی، رفاہی، تعلیمی و تصنیفی خدمات اور کارہائے نمایاں۔
 - 4- ترقی نسواں اور مساواتِ مرد و زن کے نظریے کا تنقیدی جائزہ
 - 5- پردے کے موضوع پر عقلی تجربات اور مشاہدے کی روشنی میں دینی احکام کی حکمت و مصلحت
 - 6- خانگی امور مثلاً ابتدائی طبی معلومات، گھریلو معاشیات، سلائی کڑھائی وغیرہ
- خواتین کے لیے یہ نظام تعلیم مغرب کے دیئے گئے نظریہ فکر کے بالکل برعکس ہے۔ جہاں ابتدا سے لے کر انتہا تک کسی مرحلے پر بھی مرد و عورت میں فرق نہیں کیا جاتا۔
- غیر مخلوط تعلیم:

خواتین کے لیے تعلیم شروع سے لے کر آخرت تک طلبہ سے بالکل الگ اور غیر مخلوط ہونی چاہیے۔ مخلوط تعلیم خواتین کی عملی و فکری استعداد کو پوری طرح نشوونما پانے سے روکتی ہے۔ دوسرے بے شمار مفاسد کے علاوہ خالص تعلیمی نقطہ نظر سے بھی مخلوط تعلیم عورتوں کی تعلیم کے راستے

میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لیے خواتین یونیورسٹیوں کا قیام بھی از بس ضروری ہے۔ [۱]
آج کے دور میں خواتین کے لیے عملی دائرہ کار:

بلاشبہ اسلامی معاشرہ میں اولیٰ اور افضل یہی ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں عزت و احترام سے رہیں اور ان کے حقوق مکمل طور پر ادا کیے جائیں۔ زندگی کی تمام سہولتوں میں وہ برابر کی شریک ہوں اور اجتماعی سرگرمیوں میں حدود اسلامی کے ساتھ شرکت کریں۔ گھر میں رہ کر امور خانہ داری انجام دینے والی اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں اپنا حصہ ادا کرنے والی خواتین کو عزت و مرتبہ کا مقام دیا جائے۔ یہی حکومت کی پالیسی ہونی چاہیے اور یہی عوام کا رجحان ہونا چاہیے۔

حدود اللہ کو توڑنا ممنوع ہے:

لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ عورت کا گھر سے باہر نکلنا، یا باہر نکل کر حصول معاش کرنا یا کرنے میں تعاون کرنا سرے سے ممنوع ہے۔ ممنوع جو چیز ہے وہ حدود کو توڑنا ہے۔ حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے حالات کی گنجائش کے مطابق معاشرے میں خواتین چند ذمہ داریاں انجام دے سکتی ہیں۔ مثلاً پورے ملک میں ہر مرحلہ پر لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خواتین اساتذہ، ادارے کے انتظام و انصرام کے لیے خواتین عملہ، عورتوں کے علاج معالجہ کے لیے خواتین ڈاکٹرز اور خواتین نرسز وغیرہ۔ لہذا ان سب کی تعلیم و تربیت کا انتظام اسلامی نظام تعلیم کا جز ہونا چاہیے۔ ان سب کو تعلیم دینے والی خواتین اسلامی معاشرہ کی مسلمان خواتین ہی ہو سکتی ہیں۔

عورتوں کا حصول معاش:

عورتوں کا حصول معاش میں حصہ لینا کچھ خواتین کے لیے مفید بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ان کی کوئی ذاتی مجبوری، یا ان کی اپنی صلاحیت و قابلیت جو معاشرہ کی تعلیم و تربیت میں نفع بخش ثابت ہو سکتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں وہ گھر سے باہر کام کر سکتی ہیں بشرطیکہ:

1- یہ جزوقتی کام ہو، پورا وقت نہ اس ملازمت کے لیے وقف کیا جائے۔ یا حالات کے تحت

[۱] افسوس، آجکل کچھ خواتین یونیورسٹیاں وجود میں آ بھی چکی ہیں مگر حالات وہی مخلوط تعلیم والے ہی ہیں۔

ان میں سی۔ ڈا۔ کا مغربی ایجنڈا ہی نصابات کا اہم جز ہے۔

زندگی کے کسی خاص دور میں وہ اس میں سرگرم عمل ہوں۔ بہر صورت اس سے گھر اور ننھے منے روتے بلکتے بچوں کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ میری ایک تجویز ہے کہ 25 سے 40 سال تک کی عمر کے لیے خواتین کو ملازمت سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اس عمر میں بچے عموماً بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں 40 سال کی عمر میں عورت سنجیدہ فکر اور پختہ کار ہو جاتی ہے۔ اس کے باہر معاشرے میں نکلنے کے مفاسد بہت کم رہ جاتے ہیں۔ گھر کو بھی نقصان زیادہ نہیں پہنچتا۔ یا وہ ایسا کوئی ہنر سیکھ لیں جس سے گھر بیٹھے کچھ کما سکیں۔ سلائی، کڑھائی، بوتیک بنانا، کپڑے فروخت کرنا وغیرہ۔

2- وہ شرعی حدود کی پابندی کے ساتھ سادگی، وقار اور پردے کے ساتھ گھر سے باہر نکلیں۔ یہ نہ ہو کہ وہ اپنی عیاشی اور ذوقاتی کے لیے کھلے بندوں معاشرے میں گھومتی پھریں۔

خواتین کی ملازمت کا دائرہ:

معاشرہ میں کچھ کام تو وہ ہیں جو صرف مردوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں اور کچھ کام ایسے ہیں جو صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں اور ان میں مردوں سے واسطہ نہیں پڑتا۔ تو جو کام مردوں کے لیے مخصوص ہیں اور ان کو انجام دینے کے لیے مردوں سے واسطہ پڑنا ضروری ہوتا ہے، ایسے کام عورت کے لیے ہرگز مناسب نہیں ہیں۔

عورتیں وہ کام بآسانی انجام دے سکتی ہیں جو ان کی افتاد طبع کے مطابق ہیں اور پردہ کی حدود کے اندر رہ کر وہ اس کو انجام دے سکتی ہیں، مثلاً:

1- تعلیمی کے پیشہ کا وسیع دائرہ خواتین کے لیے ہے۔ دینی و عصری تعلیم، تبلیغی سرگرمیاں، تعلیم و تربیت کے ادارے اور میڈیکل کالج وغیرہ

2- خواتین کو ایلو پیٹھک، ہومیو پیٹھک اور علاج نبوی کے شعبوں میں تربیت دینا۔

3- اگر عورتوں کے لیے یہ اہتمام ہو کہ ان کے لیے دندان ساز ڈاکٹر خواتین ہی ہوں تو خواتین دندان ساز ڈاکٹروں کی وسیع ضرورت معاشرہ کو درپیش ہوگی۔

4- تمام خواتین کے تعلیمی اداروں کا تعلیمی و انتظامی عملہ اور کلرک خواتین، پھر ان خواتین کی تربیت کے لیے خواتین ادارے۔

5- دستکاری کی مختلف گونا گوں صنعتیں، جو عورتوں ہی کے ہاتھوں انجام پاتی ہیں، اس شرط کے

ساتھ کہ وہاں مردوں سے اختلاط کے مواقع نہ ہوں گے اور مردان کا ناجائز استحصال نہیں کریں گے۔

6- بہت بڑا علمی و تحقیقی کام خواتین کا منتظر ہے۔ مثلاً دیگر زبانوں سے تراجم وغیرہ۔ یہ کام خواتین گھر میں بیٹھ کر بھی سرانجام دے سکتی ہیں۔ خواتین کا اعلیٰ تعلیم میں انگریزی، عربی اور بعض دوسری زبانوں میں مہارت پیدا کرنا اور پھر مفید کتب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا، اس کے لیے خواتین کی خصوصی تربیت کی جائے اور کچھ ترجمہ ان کے کورس و نصاب کا حصہ بنا دیا جائے، جس سے ان کی بہتر تربیت ہو سکے۔ یہ تربیت بھی خواتین ہی کریں گی۔

غرض یہ ایک مختصر سی فہرست آج کے حالات کے مطابق دے دی گئی ہے۔ یہ بطور نمونہ ہے، ورنہ میدان وسیع ہے مگر یہ کام کسی بھی عورت کی اپنی مجبوری، اس کے خاص ذوق یا اس کے اپنے ماحول و حالات کے مطابق حدود اللہ کی پابندی کے ساتھ کام کیا جائے۔ حدود اللہ کو توڑنے یا عیاشی کے لیے کسی خاتون کو بیرون خانہ اسلامی معاشرہ میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اسلامی معاشرہ جھوٹی مساوات کا قائل نہیں۔ (وہ تو خواتین کو صرف بے وقوف بنانے والا نظریہ ہے)۔ اس لیے اسلامی معاشرہ کے لیے ضروری ہے کہ:

- 1- عورت کے لیے شرائط کار اور اوقات کار میں خصوصی مراعات کا لحاظ بھی رکھا جائے۔
- 2- ساتھ وہ ان کے لیے عفت و عصمت کے تحفظ کا ضامن بھی ہو۔
- 3- اپنے دفتر یا ادارے تک جانے کے لیے ٹرانسپورٹ کا بندوبست بھی کرے تاکہ عورت سڑکوں پر نہ رلتی پھرے۔

فوجی ٹریننگ:

اسلامی معاشرہ کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کے لیے فوجی ٹریننگ کا بندوبست کرے تاکہ ضرورت پڑنے پر خواتین اپنے تحفظ کا خود بندوبست کر سکیں، کالجوں میں طالبات کا اس وقت این۔سی۔سی کا ایک نظام تھا اس کے تحت ^[۱] تمام طالبات کے لیے فوجی ٹریننگ لازمی کردی

[۱] یہ این۔سی۔سی کا پہلے بندوبست ہوا کرتا تھا مگر بوجہ حکومت نے اس کو بند کر دیا تھا۔ ملکی حالات کے پیش نظر اس کو فوراً از سر نو جاری کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

جائے۔ یہ ٹریننگ دینے والا عملہ خواتین پر مشتمل ہونا چاہیے۔ یہ فوجی ٹریننگ (این۔سی۔سی) کا سلسلہ مدت سے شروع تھا، اب تک کتنی خواتین تربیت یافتہ ہو چکی تھیں۔ انہی تربیت یافتہ خواتین کو طالبات کی ٹریننگ کے لیے تیار کیا جائے یا پھر فوجی حضرات اپنی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں کو خود ٹریننگ دیں۔ پھر وہ آگے خواتین کے لیے اس ٹریننگ کا بندوبست کریں۔

خواتین کے لیے عدالتی چارہ جوئی کا حق:

بلاشبہ اسلام عورت کو بہت سے حقوق دیتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے سے وہ اپنے ان حقوق کا شعور بھی حاصل کرے۔ پھر بھی عملاً مردان کو بہت سے حقوق سے محروم رکھتے ہیں۔ آج کل عدالتی نظام بھی اس طرح کا ہے کہ عام عورت کے لیے اپنے مظالم کے سلسلے میں عدالت تک پہنچنا مشکل مرحلہ ہے۔ اگر کسی طرح پہنچ بھی جائیں تو وہاں ایسے دیوانی مقدمے دس دس سال تک لٹکتے رہتے ہیں۔ مقدمہ کرنے والے بسا اوقات قبروں میں پہنچ جاتے ہیں مگر مقدموں کے فیصلے ہونے میں نہیں آتے، ضرورت ہے کہ خواتین کی جائز دادرسی کی جائے۔ عدل و انصاف کے حصول کا نظام آسان اور سادہ بنایا جائے تاکہ خواتین اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے عدالتی کارروائی میں دقت محسوس نہ کریں۔ سستا اور فوری انصاف مہیا کیا جائے، نیز عائلی مقدمات کی کارروائی بند کمرے میں ہونی چاہیے تاکہ عوام میں برائی کی تشہیر نہ ہو۔ لہذا خواتین وکیل بنیں اور اپنی مصیبت زدہ بہنوں کے کام آئیں۔

اشتہارات پر کنٹرول:

ضروری ہے کہ حکومت ان تمام اشتہارات پر پابندی عائد کر دے جن میں عورت کو ذریعہ تشہیر بنایا گیا ہو۔ اشتہارات اور پبلٹی پر جو رقم لگائی جاتی ہے، وہ پرائس کنٹرول پر لگادی جائے۔ نیز ماڈلنگ اور شو بز جیسے منافی اسلام پروگرام، فحاشی و عریانی پر مبنی فلمیں اور آڈیو ویڈیو کیسٹیں بند کی جائیں۔ میک اپ کے سامان کی درآمد بند کر دی جائے اور ان کے مضر اثرات سے خواتین کو آگاہ کیا جائے۔ اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی میں وہ تمام دوائیں جن کے اثرات ماؤں اور بچوں پر پڑتے ہیں اور جن کا استعمال دوسرے ملکوں میں ممنوع ہے، پاکستان میں بھی ان کی درآمد پر پابندی لگائی جائے۔

خواتین تنظیموں کا کردار:

خواتین کی فلاحی تنظیموں کو بھی مردوں سے مسابقت اور محاذ آرائی کی پالیسی کو ترک کر کے اپنی توانائیاں خواتین میں مثبت اور تعمیری کاموں کے فروغ کے لیے صرف کرنی چاہئیں۔ انہیں مد مقابل سمجھنے کے بجائے ”رفیق“ اور معاون و مددگار سمجھتے ہوئے ان سے تعاون کرنا چاہیے۔ تاکہ عورت کا نسوانی تشخص ہر حال میں بحال رہے۔ عورت کو مرد بنانے کی غیر فطری روش میں نہ تو ان کا اپنا بھلا ہے اور نہ معاشرے کا..... [۱]

معاشرے کا کردار

”کفالت، نان نفقہ، وراثت، والدین اور شوہر کی جائیداد میں حصہ، اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے سودمند ذرائع معاش کا حصول، اپنی کمائی میں مکمل تصرف، حق ملکیت جس سے خاندان اور معاشرے میں عورت کو معاشی تحفظ حاصل ہو سکے، اسے فیاضانہ طور پر ملنے چاہئیں۔ تاہم خاندان کی کفالت اور کسب معاش اصولی طور پر مرد ہی کی ذمہ داری ہو۔“ [۲]

ہمیں خاندان کے قلعے کو بھی مضبوط بنانا ہوگا، جس میں بنیادی کردار ماں کا ہے۔ جس کی گود میں مستقبل کی نسل پروان چڑھ رہی ہے۔

عورت کے معاشی استحکام کی بحالی کے لیے شوہر کی طرف سے حسب حیثیت حق مہر کی فوری ادائیگی کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ شوہر کو حق مہر کی فوری ادائیگی پر مجبور کرے، اسی طرح شوہر، باپ، بھائی، بیٹے کی وراثت میں عورت کو حصہ دلا کر اس کا کھویا ہوا وقار بحال کیا جائے۔

غرض ہمارے استاد، علماء، صحافی، سیاستدان اور دیگر سب لوگ مل کر یہ تحریک برپا کریں کہ عورت کو وہ مقام اور حقوق دے دیئے جائیں جو اسلام کی رو سے اس کا حق ہیں۔ اگر عورت کو وہی حقوق دے دیئے جائیں، تو اس کا کھویا ہوا وقار اور شرف بحال ہو جائے گا۔

[۱] ”عورت کی نفسیات“، صفحہ 173، از: ایم۔ اے ملک

[۲] ایضاً

مساواتِ مرد و زن کا مغربی نظریہ ایک دھوکہ ہے، فریب ہے، جو عورت کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔ اس کے برعکس اسلام کا دیا ہوا نظام نہ صرف مسلمان خواتین کے لیے بلکہ دنیا بھر کی غیر مسلم خواتین کے لیے اپنے اندر بہت دلکشی اور جاذبیت رکھتا ہے۔ جو لوگ واقعی قوم کو ترقی پذیر اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں، وہ خالص معاشی نقطہ نظر سے بھی جتنا غور کریں گے اس نظام کو اپنے حق میں مفید اور معاون پائیں گے۔ آئندہ باب میں نو مسلم خواتین کے دیئے گئے تاثرات اس زندہ جاوید حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ البتہ اس نظام سے پریشانی صرف ان چند خواتین کو لاحق ہو سکتی ہے، جو آوارہ مزاج اور اوباش فطرت ہیں، اپنی فطرتِ مسخ کر کے مغرب کی نقالی کرتی ہیں اور مساوات کے تصور میں مگن مخلوط روزگار کو چند روزہ زندگی گزارنے کا پر لطف ذریعہ سمجھتی ہیں۔

میں یقین و ایمان کے ساتھ دعویٰ کرتی ہوں کہ اگر مسلمان ممالک عورت کو دیئے گئے اسلامی حقوق کو صحیح صورت میں اپنے ہاں رائج کر لیں تو اللہ کی رحمت و برکت کے دروازے کھل جائیں گے اور خوشحالی و ترقی مسلمان ملت کا مقدر بن جائے گی، ان شاء اللہ العزیز!

ہمیں اپنا یوسفِ گم گشتہ تلاش کرنے اور اپنانے میں کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، اللہ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ
الْمُحْسِنِينَ﴾ [۱]

”جن لوگوں نے ہماری جستجو میں کوشش کی، بے شک ہم ان کو اپنی راہیں دکھائیں گے اور اس میں شک نہیں کہ اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔“

22

تذکرہ چند اولوالعزم با کمال خواتین کا

ستر و حجاب کی پاسداری

✽ حضرت ام خلاؓ انصاریہ

✽ حضرت سببہ غامدیہؓ

✽ شوہر کی اطاعت و وفاداری

الف۔ ام دحداح انصاری

ب۔ فاطمہ بنت عبد الملک

✽ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے الفت و محبت

✽ والدین کی فرمانبرداری

✽ صبر و رضا

✽ مہمان نوازی

✽ اللہ و رسولؐ کے آگے سر تسلیم خم ہے

✽ بچے کی اعلیٰ تربیت

الف۔ حضرت ام عمارہؓ

ب۔ ام ربیعۃ الرائی

ج۔ حضرت امام شافعیؒ کی والدہ

✽ دین پر ثابت قدمی و عزیمت

الف۔ حضرت فاطمہؓ بنت خطاب

ب۔ حضرت سمیہؓ بنت خطاب

ج۔ حضرت خضاءؓ

✽ ایک افغانی گورنر کی مثال

تذکرہ چند اولوالعزم باکمال خواتین کا

اسلام کے سایہ عاطفت میں پناہ لینے کے بعد خواتین کی دنیا یکسر بدل گئی، ان میں قلب و نظر کی پاکیزگی و طہارت پیدا ہوئی تو دوسری طرف حسنِ عمل، رفعتِ کردار اور عصمت و عفت کے گوہرِ آبدار کے تحفظ کے بے مثال کارنامے وجود میں آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک کی مسلم خواتین یعنی صحابیات رضوان اللہ علیہن طبقہ نسواں کے وہ گل سرسبد ہیں، جن پر انسانی تاریخ تا قیامت نازاں و فرحاں رہے گی۔ تاریخ ان صحابیات کی حقیقتاً نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

ایک طرف تو باکمال خواتین کے وہ نمونے ہیں جنہوں نے وحی و نبوت سے کسبِ فیض کر کے ایک عالم کو فیض پہنچایا، دوسری طرف وہ ”کارنامہ“ ہے جو دورِ جدید میں آوارگی نسواں کی تحریک برپا کرنے والی خواتین کا ہے۔ انہوں نے اپنی عورت بگاڑ طوفانی مہم سے زن کو ”نازن“ بنا کر رکھ دیا، عورت نما مرد وجود میں آنے لگے اور گھروں میں تبدیل ہونے لگے۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اس مختصر ترین تذکرے میں امہات المؤمنینؓ اور بنات طاہرات (یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں اور صاحبزادیوں) کو شامل نہیں کیا گیا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ صفحہ دہر پر ان عفت مآب باکردار خواتین کی نظیر ملنا ناممکن ہے۔ یہاں عام خواتین کا ذکر ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ عام خواتین کی دنیا بھی کس طرح بدل گئی تھی۔ ان کے خیالات و اعتقادات، اخلاق و کردار، عزم و یقین، صدق و صفا اور شرم و حیا کی کیفیت کس طرح یک دم اوج کمال تک پہنچ گئی تھی۔

ستر و حجاب کی پاسداری کی مثال

1- حضرت ام خلاۃ انصاریہ:

ان کو خبر ملی کہ غزوہ بنی قریظہ میں ان کا بیٹا شہید ہو گیا ہے۔ یہ خبر سن کر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئیں۔ اس جانکاہ حادثہ کی خبر پا کر بھی وہ سمٹی سمٹائی باپردہ حاضر ہوئی تھیں۔ حاضرین میں سے کسی نے بے ساختہ کہا: ”تجب کی بات ہے! بیٹا شہید ہو گیا ہے مگر تم ایسی ہوش ربا خبر سننے کے باوجود چہرے پر نقاب ڈال کر باپردہ حاضر ہوئی ہو!“ تو ام خلاۃؓ نے اطمینان و سکون سے جواب دیا: ”اگر میں نے اپنا بیٹا کھو دیا ہے تو کیا اب شرم و حیا بھی کھو دوں؟“ □

خوفِ الہی

2- حضرت سبیبہ غامدیہ:

واللہ! کیا ایمان افروز تذکرہ ہے اس خوفِ خدا رکھنے والی خاتون کا! قبیلہ بنو غامد کی ایک شریف زادی حضرت سبیبہؓ سے ایک بار زنا کی لغزش سرزد ہو گئی۔ اگرچہ کسی کو پتہ نہیں چلا مگر ان کا اپنا احساسِ معصیت ان کو چین نہیں لینے دیتا تھا۔ بالآخر وہ بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

”یا رسول اللہ! مجھے پاک کر دیجیے مجھ سے معصیت کا ارتکاب ہو گیا ہے۔“ نبی پاکؐ نے گواہ طلب کیے تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! اس وقت اللہ کے سوا کوئی اور دیکھنے والا نہ تھا۔ اس پر ارشاد ہوا: ”واپس جاؤ! اللہ سے توبہ استغفار کرو۔ شاید وہ تمہیں معاف کر دے۔“

اس دن تو حضرت سببہؓ واپس لوٹ آئیں۔ مگر اللہ کی نافرمانی کا احساس اتنا شدید تھا کہ دوسرے دن پھر بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئیں: ”یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجیے۔ میں بدکاری کے نتیجے میں حاملہ ہوں۔ کیا آپ مجھے بھی اسی طرح واپس لوٹانا چاہتے ہیں جس طرح ماعز بن مالک اسلمی کو (بغیر سزا دیے) لوٹا دیا تھا۔“

آپؐ نے فرمایا: ”واپس جاؤ.....“ اور وہ چلی گئیں۔

مگر تیسری دفعہ پھر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں: ”یا رسول اللہ! مجھ پر حد جاری کیجیے تاکہ میں پاک ہو جاؤں۔“ حضورؐ نے فرمایا: ”واپس جاؤ اور بچہ پیدا ہونے کا انتظار کرو۔“

وہ خاتون واپس چلی گئیں۔ جب بچہ پیدا ہوا تو پھر بچہ کو گود میں لے کر نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور نبی کریمؐ سے درخواست کی کہ اب مجھ پر حد جاری کیجیے۔ مجھے گناہ سے پاک کیجیے۔ نبی پاکؐ نے فرمایا: ”اس بچہ کو جا کر دودھ پلاؤ۔ جب اس کی مدت رضاعت ختم ہو جائے گی تب آنا۔“ وہ واپس چلی گئیں۔ جب بچہ روٹی کھانے کے قابل ہو گیا تو روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں پکڑائے ہوئے نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں: ”یا رسول اللہ! اب تو روٹی کھانے لگ گیا ہے۔ اب مجھ پر حد جاری کیجیے۔“ اس پر حضورؐ نے سببہؓ پر حد جاری کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو سنگسار کر دیا گیا۔ جب اس کو پتھر مارے جا رہے تھے تو خون کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالد بن ولید کے چہرے پر پڑیں اور ان کے منہ سے حضرت سببہؓ کے لیے کوئی نازیبا کلمہ نکل گیا۔

تو نبی پاکؐ نے فرمایا: ”خالد! زبان کو قابو کرو! اللہ کی قسم! اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ ظلم و جور سے محصول چنگی وصول کرنے والا بھی اگر ایسی توبہ کرے تو بخش جائے۔“

بعد میں آپؐ نے اس خاتون کی نماز جنازہ پڑھائی اور ساتھ ارشاد فرمایا: ”اس خاتون نے تو راہ خدا میں جان قربان کی ہے۔ محض خوف خدا سے خود آ کر اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اپنی جان قربان کر دی۔“ [۱]

[۱] تذکار صحابیات از طالب ہاشمی ص 324 تا 326 بحوالہ صحیح مسلم حدیث نمبر 1695، 1696

3- شوہر کی اطاعت و وفاداری:

1- اُمّ الدحداحؓ مشہور صحابی حضرت ثابت بن الدحداح انصاریؓ کی اہلیہ تھیں۔ حضرت اُمّ الدحداح انصاریؓ اپنے شوہر کی اطاعت میں بے مثال تھیں۔ جب سورۃ الحدید کی یہ آیت ”تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟ تو اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے گا اور اس کے لیے بہترین اجر ہے“ نازل ہوئی تو حضرت ثابت (ان کی کنیت ابوالدحداح تھی) نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ! کیا اللہ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ تو پھر میں اپنا باغ اللہ کو قرض دیتا ہوں۔“

اس طرح حضرت ابوالدحداحؓ نے یہ باغ راہِ حق میں صدقہ کر دیا۔ اس باغ میں کھجور کے چھ سو درخت تھے۔ اسی میں ان کا اپنا گھر تھا، جس میں ان کے بیوی بچے رہتے تھے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کر کے سیدھے اپنے گھر پہنچے اور باہر ہی سے اہلیہ کو پکار کر کہا: ”اے اُمّ الدحداح! باہر آ جاؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے۔“

حضرت اُمّ الدحداح بولیں: ”اے ابوالدحداح! تم نے تو بہت نفع والا سودا کیا ہے۔“ یہ کہہ کر اپنا سامان اور بچے لے کر گھر سے باہر آ گئیں۔

اللہ اکبر! شوہر سے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے ہمارا کیا بندوبست کیا؟ پہلے ہمیں کسی اور گھر میں بٹھا دیتے، پھر یہ راہِ خدا میں دیتے۔ بلکہ ان کو مبارک دے رہی ہیں کہ تم نے بہت ہی فائدہ والا سودا کیا ہے۔ یہ ہے رب کی رضا جوئی، رسولؐ کی محبت اور شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کی بہترین مثال! [۱]

2- فاطمہ بنت عبد الملک کا کردار بھی شوہر کی اطاعت اور وفاداری میں بے مثال ہے۔ وہ پہلی صدی ہجری کی نہایت معزز اور بلند کردار خواتین میں سے تھیں، چار اموی خلفاء کی بہن، ایک اموی خلیفہ عبد الملک کی بیٹی اور ایک اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی اہلیہ تھیں، گویا بنی امیہ کے چھ خلفاء کے ساتھ ان کا براہِ راست تعلق تھا۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کتنے ناز و نعم

میں پرورش پائی ہوگی۔ ان کے شوہر حضرت عمر بن عبدالعزیز بھی بڑے نفاست پسند اور شاہ خرچ واقع ہوئے تھے۔

اچھی سے اچھی غذا کھاتے، بہترین لباس پہننے، خوشبو و عطر بکثرت استعمال کرتے اور بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ مگر 99 ہجری میں جب اموی خلافت کا بوجھ ان کے کندھوں پر آن پڑا، تو اسلامی مملکت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی یک دم ان کے اندر انقلاب آ گیا۔ انہوں نے تمام شاہی طور طریقے یکسر ختم کر دیئے اور حضرت عمر فاروقؓ کی طرح درویشی و سادگی اختیار کی۔ خلیفہ بنتے ہی تمام جاگیریں اصل مالکوں اور حقداروں کو واپس کر دیں اور اپنی اہلیہ یعنی فاطمہ بنت عبد الملک کو (جن کے پاس اپنے باپ اور بھائیوں کا دیا ہوا بہت سا زیور اور مال اسباب تھا) حکم دیا کہ یا تو تم سارا زیور اور مال اسباب شاہی بیت المال میں جمع کروادو یا پھر مجھے چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بیوی نے اطاعت شعاری اور وفاداری کا ایک نیار یکارڈ قائم کیا۔ انہوں نے باپ کا دیا ہوا بیش قیمت ہیرا اور بھائیوں کے دیئے ہوئے تمام مال اسباب فوراً بیت المال میں جمع کروا دیئے اور اپنے درویش صفت شوہر کی رفاقت کو ترجیح دی۔ ان کی بقیہ ساری زندگی عُسرت اور فقر و فاقہ سے گزری مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ گھر کا سارا کام کاج خود کرتی تھیں، بچے بھی اسی تنگی ترشی میں گزر بسر کرتے۔ ان کو بھی ہر وقت صبر و قناعت اور سیر چشمی کی تلقین کرتی رہتیں۔ شوہر کی وفات 101ھ میں ہوئی۔ بی بی فاطمہ ان کے بعد بھی کافی دیر زندہ رہیں۔ مگر تکلف والی زندگی دوبارہ مرتے دم تک اختیار نہ کی اور اسی سادگی و درویشی کو عمر بھر نبھایا۔ شاہی خاندان کے افراد بارہا ان کو ترغیب دیتے، مگر انہوں نے اپنے شوہر کی سکھائی ہوئی روش عمر بھر نہ بدلی۔^[۱]

4- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے الفت و محبت:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تو ہر مومن صادق کا حاصل زندگی ہے۔ جس طرح صحابہ کرامؓ نے آپ کی محبت کی لازوال نظیریں اور مثالیں پیش کیں، اسی طرح صحابیاتؓ نے بھی

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے لازوال نمونے چھوڑے۔ انہی میں سے ایک اعلیٰ نمونہ حضرت ہند بنت عمرو بن حرام کا ہے۔ اس انصاری خاتون نے جنگ احد کے موقع پر حبّ رسولؐ کا ناقابل فراموش مظاہرہ کیا۔ اس جنگ میں اس بہادر خاتون کے شوہر، بھائی اور بیٹا تینوں نے مردانہ وار لڑ کر مرتبہ شہادت حاصل کیا۔ حضرت ہندؓ نے جب باری باری شوہر، بھائی اور فرزند کے شہید ہونے کی خبر سنی تو بجائے پریشانی اور غم کے اظہار کے سوال کیا: ”مجھے صرف یہ بتادو کہ رسولؐ خدا کیسے ہیں؟ نصیب دشمنان، ان کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی۔“ جب ان کو اطلاع ملی کہ نبی پاکؐ بخیریت ہیں تو ان کو قرار آ گیا۔ میدان جنگ میں جا کر خود روئے انور کی زیارت کر لی، تو بے اختیار زبان سے ایک جملہ نکلا اور وہ تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو گیا۔ انہوں نے عرض کیا:

كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ ”اگر آپ سلامت ہیں تو پھر سب مصیبتیں ہج ہیں۔“ [۱]
 مولانا شبلی نعمانی نے اس واقعہ کو اس طرح شعر کا جامہ پہنایا ہے۔
 میں بھی اور باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا
 اے شہ دین! تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

5- والدین کی فرمانبرداری:

حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن تھیں۔ ان کی والدہ قتیلہ شرف اسلام سے بہرہ یاب نہ ہوئی تھی۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ہجرت سے قبل ان کو طلاق دے دی تھی۔ وہ ایک دفعہ حضرت اسماءؓ کے لیے کچھ تحفے تحائف لے کر مدینہ میں بیٹی سے ملنے آئیں۔ حضرت اسماءؓ کی دینی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ مشرک ماں کے تحفے قبول کریں یا انہیں اپنے مکان میں ٹھہرائیں۔ چنانچہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس موقع پر میرے لیے کیا حکم ہے؟ نبی پاکؐ نے فرمایا کہ ان کے تحائف قبول کر لو اور ان کو اپنے گھر میں مہمان رکھو۔ حضورؐ سے اجازت ملنے پر انہوں نے

تذکرہ چند اولوالعزم باکمال خواتین کا

والدہ کو اپنے مکان میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی اور انکے تحائف قبول کر لیے۔ پھر والدہ نے حضرت اسماءؓ سے ضرورت پڑنے پر کچھ رقم بھی ادھار مانگی۔ حضرت اسماءؓ ان کی مدد کرنا چاہتی تھیں۔ مگر ان کے شرک کی وجہ سے کچھ سوچنے لگیں۔ بالآخر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: ”یا رسول اللہ! میری والدہ مشرک ہیں۔ وہ مجھ سے کچھ رقم مانگتی ہیں۔ کیا میں ان کی مدد کر سکتی ہوں؟“ حضورؐ نے فرمایا: ”ہاں! اللہ تعالیٰ صلہ رحمی سے نہیں روکتا۔“

چنانچہ انہوں نے ضرورت کے مطابق اپنی مشرک والدہ کو ادھار دے دیا ان کو اپنے گھر میں ٹھہرایا اور ان سے حسن سلوک بھی فرمایا۔ [۱]

6- صبر و رضا:

1- ایک صحابیہ حضرت ام عطیہ انصاریؓ مدینے میں رہتی تھیں۔ خلافت راشدہ کے دور میں ان کے ایک فرزند جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اتفاق سے میدان جنگ میں سخت بیمار ہو گئے۔ جوں توں کر کے بصرہ پہنچے تاکہ وہاں ان کا علاج معالجہ ہو سکے۔ والدہ کو بیٹے کی بیماری کی خبر ملی تو وہ مدینہ سے بصرہ کو روانہ ہوئیں۔ مگر وہ ابھی راستے میں ہی تھیں کہ بیٹا اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔ بصرہ پہنچنے پر جب ماں کو علم ہوا کہ بیٹا تو دو دن قبل ہی خالق حقیقی سے جا ملا ہے تو شدت الم سے نڈھال ہو گئیں اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر خاموش ہو گئیں۔ نہ بین، نہ واویلا اور نہ رونا دھونا۔ جب تیسرا دن ہوا تو خوشبو منگوا کر اپنے ہاتھوں پر لگائی اور فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ شوہر کے علاوہ کسی کی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کیا جائے۔“ مجھے اس وقت خوشبو استعمال کرنے کی حاجت تو نہ تھی۔ مگر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ میں نے جو ان سال بیٹے کا سوگ حسب حکم رسولؐ ختم کر دیا ہے۔“ [۲]

2- صبر و رضا کی ایک بہترین مثال ایک اور جلیل القدر صحابیہ حضرت ام سلیمؓ کی ہے۔ ان کے ننھے بیٹے ابو عمیر تین چار سال کے تھے۔ انہوں نے کم سنی ہی میں وفات پائی۔ تو حضرت ام

[۱] تذکار صحابیات از طالب ہاشمی ص 195

[۲] ایضاً، ص: 400

سلیمؑ نے اپنے لاڈلے بچے کی رحلت پر کمال صبر و استقلال سے کام لیا۔ خاموشی سے اس کی میت کو غسل دے کر کفنایا اور پھر ایک طرف رکھ دیا۔ اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو منع کر دیا کہ ان کے شوہر ابو طلحہؓ کو ننھے بیٹے ابو عمیر کی موت کی خبر نہ دیں۔ رات کو حضرت ابو طلحہؓ گھر آئے۔ ام سلیمؑ نے انہیں کھانا کھلایا۔ جب وہ اطمینان سے بستر پر لیٹے تو ان سے مخاطب ہو کر کہا: ”اگر کوئی چیز آپ کو مستعار دی جائے اور پھر کچھ دیر بعد واپس لے لی جائے تو اس کا واپس لیا جانا آپ کو ناگوار تو نہ گزرے گا؟“ حضرت ابو طلحہؓ نے جواب دیا: ”ہرگز نہیں“۔ بولیں: ”پھر تمہارا لاڈلا بیٹا بھی اللہ کی امانت تھی۔ جو اس نے واپس لے لی۔ تمہیں اب اس کی طرف سے صبر کرنا چاہیے۔“ ابو طلحہؓ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور ان سے کہا: ”تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟“ بولیں: ”تا کہ تم اطمینان سے کھانا کھا لو۔“

صبح اٹھ کر ابو طلحہؓ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ عرض کیا۔ نبی پاکؐ نے بھی ان کے تسلیم و رضا کے شیوہ پر ان کی تعریف فرمائی اور دعا دی: ”اللہ تعالیٰ آپ دونوں کو ابو عمیر کا نعم البدل عطا فرمائے۔“ اس کے بعد اللہ نے ان کو ایک اور فرزند عطا فرمایا، جس کا نام عبد اللہ رکھا گیا۔ عبد اللہ نے طویل عمر پائی اور ان کی پرورش و تربیت بھی حضورؐ ہی کے سایہ رحمت میں ہوئی تھی۔ ❶

7- مہمان نوازی:

یہی حضرت ام سلیمؑ مہمان نوازی میں بھی بے مثال اور لا جواب تھیں۔ ایک دفعہ ان کے شوہر حضرت ابو طلحہؓ اپنے ساتھ ایک مہمان لائے اور اپنی اہلیہ ام سلیمؑ سے پوچھا: ”کیا گھر میں کھانے کے لیے کچھ ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ”بچوں کے لیے تھوڑا سا کھانا موجود ہے بس اور کچھ نہیں۔“ حضرت ابو طلحہؓ نے کہا: ”کوئی بات نہیں، بچوں کو کسی طرح بہلا پھسلا کر سلا دو۔ جب وہ سو جائیں تو ہم وہ کھانا مہمان کے آگے رکھ دیں گے۔ تم کسی بہانے سے چراغ گل کر دینا۔ اندھیرے میں مہمان کھالے گا اور ہم یوں ہی منہ چلاتے رہیں گے۔“ غرض اس طرح دونوں

میاں بیوی نے مہمان کو کھانا کھلا دیا۔ بچوں نے اور خود ان دونوں نے رات فاقے سے گزار دی۔ صبح جب ابو طلحہؓ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ آیت جاری تھی:

﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۖ﴾ [۱]

”وہ لوگ دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود ان پر تنگی کیوں نہ ہو۔“

پھر آپؐ نے حضرت ابو طلحہؓ سے فرمایا: ”رات کو مہمان کے ساتھ تم دونوں کا برتاؤ اللہ

تعالیٰ کو بہت پسند آیا۔“ [۲]

8- اللہ و رسولؐ کے فرمان کے آگے سر تسلیم خم ہے:

1- نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت سعد الاسودؓ سہمی، ظاہری حسن و جمال سے محروم تھے۔ اس لیے کوئی ان کو اپنی بیٹی کا رشتہ دینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنا مسئلہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا۔ تو نبی پاکؐ نے فرمایا: ”تم اسی وقت عمرو بن وہب ثقفی کے گھر جاؤ اور سلام کرنے کے بعد ان سے کہو کہ رسول اللہؐ نے آپؐ کی بیٹی کا رشتہ میرے ساتھ کر دیا ہے۔“ حضرت سعد عمرو بن وہب ثقفی کے گھر پہنچے اور انہیں حضورؐ کے فرمان سے آگاہ کیا۔

انہیں سعد کی بات پر اعتبار نہ آیا اور انہوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی صاحبزادی نے باپ کا جواب سنا تو لپک کر دروازے پر آئیں اور حضرت سعدؓ سے مخاطب ہو کر کہا: ”اے اللہ کے بندے! اگر واقعی رسول خداؐ نے تمہیں بھیجا ہے تو میں بخوشی تیرے ساتھ شادی کے لیے تیار ہوں۔“

حضرت سعدؓ نے واپس جا کر ساری بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتادی۔ تو آپؐ نے لڑکی کو دعائے خیر دی۔ ادھر لڑکی نے بھی اپنے باپ کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ وہ دربار نبویؐ میں حاضر ہو کر معافی کے طالب ہوئے۔ اس طرح نبی پاکؐ نے بنت عمرو کا نکاح حضرت سعدؓ سے کر

دیا۔ حضرت سعدؓ اپنی بیوی کو ابھی خصت کروا کر بھی نہ لائے تھے کہ ایک غزوہ میں شہید ہو گئے اور حضورؐ نے ان کا ترکہ بنت عمرو بن وہب کو دلایا۔ اس طرح انہیں شہید کی بیوہ ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ تسلیم و رضا کی یہ لازوال مثال! اللہ اکبر! [۱]

2- اسی طرح ایک اور صحابی حضرت جَلِیبِ انصاریؓ بھی ظاہری حسن و جمال سے محروم تھے۔ قد بھی چھوٹا تھا۔ کوئی ان کو رشتہ دینے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ آخر حضورؐ نے انصار کے ایک خاندان میں ان کی نسبت ٹھہرائی۔ لڑکی کے والدین نے رشتہ دینے میں پس و پیش کرنا چاہی تو خود سعادت مند لڑکی نے ان کے سامنے اللہ کا یہ حکم پیش کیا کہ ”جب اللہ و رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مسلمان کو اس میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں۔“ جو رسولؐ اللہ کی مرضی ہے وہ میری بھی مرضی ہے۔ میں جَلِیبؓ سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں۔“ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو بے حد خوش ہوئے اور دعا فرمائی: ”الہی! اس بچی پر خیر کا دریا بہا دے اور اس کی زندگی تلخ نہ کر۔“ پھر آپؐ نے اس کا نکاح جَلِیبؓ سے کر دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ آپؐ کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ حضرت جَلِیبؓ اور ان کی اہلیہ کی خانگی زندگی بہت بابرکت ثابت ہوئی۔ اللہ نے ان کو بہت خوشحالی عطا فرمائی تھی اور تمام انصار میں کوئی عورت بھی اہلیہ جَلِیبؓ سے بڑھ کر آسودہ حال اور شاہ خرچ نہ تھی۔ [۲]

9- بچے کی اعلیٰ تربیت:

1- جنگِ احد میں جب گھمسان کا رن پڑا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف گنتی کے چند سرفروش باقی رہ گئے، اس وقت حضرت ام عمارہؓ نے تلوار اور ڈھال سنبھال لی اور حضورؐ کے پاس پہنچ کر کفار کے سامنے سینہ سپر ہو گئیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر کفار کی یورش کو بار بار اپنے نیزے اور تلوار پر روکتیں۔ حضرت ام عمارہؓ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ بھی اس وقت اپنی والدہ کے ہمراہ کفار کا بھرپور مقابلہ کر رہے تھے۔ اچانک ایک مشرک تیزی سے آیا اور حضرت

[۱] رحمت دارین کے سوشیڈائی از طالب ہاشمی مرحوم، ص: 314 تا 318

[۲] تذکار صحابیات، ص 493، مجمع الزوائد 370/9 اور صحیح مسلم 2472

عبداللہؑ کا بازو زخمی کرتا ہوا نکل گیا۔ حضرت ام عمارہؓ نے اپنے ہاتھ سے بیٹے عبداللہؑ کا زخم باندھا اور فرمایا: ”بیٹے! جاؤ اور جب تک دم میں دم ہے ان سے لڑو، یہ آرام کا وقت نہیں بلکہ جہاد کا وقت ہے“ اور پھر ان کے ہاتھ میں تلوار پکڑادی۔ کوئی اور ماں ہوتی تو وہ کہتی کہ بیٹا! جا کر آرام کرو۔ مگر یہ ام عمارہؓ تھیں جو خود بھی بڑی بہادری سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنے والا ہر دار روک رہی تھیں۔ اس دن ام عمارہؓ کے جسم پر بارہ زخم لگے تھے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ان کی جاں سپاری اور سرفروشی کی تعریف فرمائی: ”جنگ احد کے دن دائیں بائیں جدھر نظر ڈالتا تھا ام عمارہ ہی ام عمارہ لڑتی نظر آتی تھیں۔“ [۱]

2- ام ربیعۃ الرائے:

حضرت ربیعۃ الرائے (م 136ھ) مدینہ کے ایک مشہور عالم اور امام مالک کے قابل فخر استاد تھے۔ ام ربیعہ اسی عالم اجل کی والدہ تھیں۔ ان کی شادی مدینہ کے ایک صالح نوجوان ابو عبد الرحمن فروخ سے ہوئی تھی۔ امام ربیعہ ابھی شکم مادر میں ہی تھے کہ ان کے والد فروخ کو خراسان کی مہم پر جہاد کے لیے جانا پڑا۔ جاتے وقت وہ اپنی بیوی کو تیس ہزار اشرفیاں خرچ کے لیے دیتے گئے۔ علاوہ ازیں ہونے والے بچے کی پرورش عمدہ طریقے سے کرنے کی تلقین کی۔ باپ کے جانے کے پانچ ماہ بعد ربیعہ پیدا ہوئے۔

ام ربیعۃ بہت نیک اور دین دار خاتون تھیں۔ انہوں نے خود تنگی ترشی سے گزارہ کر کے ساری رقم اپنے بیٹے ربیعہ کی تعلیم پر خرچ کر دی اور ان کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ سے اعلیٰ بندوبست کیا۔ حضرت ربیعہ بھی بے حد محنتی اور ذہین تھیں۔ چنانچہ انہوں نے چھوٹی عمر میں ہی قرآن پاک حفظ کیا، پھر حدیث، فقہ، ادب اور دوسرے تمام علوم پر عبور حاصل کر لیا۔ بیس بائیس برس کی عمر میں اپنے وقت کے امام تسلیم کیے گئے اور بڑے بڑے اہل کمال مسجد نبویؐ میں ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے حلقہ درس میں شامل ہونے لگے۔

پورے 27 برس کے بعد فروخ کو جہاد سے فرصت ملی تو سیدھا وطن کا رخ کیا۔ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر نیزے کی آئی سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ام ربیعہ دروازہ کھول کر باہر نکلے۔

[۱] تذکار صحابیات از طالب ہاشمی، ص 393 تا 395 بحوالہ طبقات ابن سعد

باپ بیٹا دونوں ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ فروخ بے تکلفی سے اندر جانے لگے تو امام ربیعہ نے انہیں ٹوکا، بات بڑھ گئی۔ دونوں کی آواز بلند ہونے لگی تو اندر سے فروخ کی اہلیہ نے اپنے شوہر کی آواز پہچان لی۔ سیدھی دروازے پر پہنچیں، دونوں کو اندر بلا بھیجا اور دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔

فروخ گھر میں بیٹے دنوں کے حالات پوچھتے رہے خصوصاً اپنی دی ہوئی رقم کے بارے میں پوچھا کہ اس کو کہاں خرچ کیا؟ بیوی نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔ وہ سب اشرفیاں محفوظ ہیں۔ آپ پہلے مسجد نبویؐ میں نماز پڑھ آئیں پھر میں آپ کو بتاؤں گی۔

حضرت فروخ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں گئے۔ نماز کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ایک مجلس میں بڑے بڑے علماء جمع ہیں۔ ان کے درمیان مسند درس پر ان کے بیٹے ربیعہ تشریف فرما ہیں۔ وہ سب کو درس دے رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر فروخ کو اس قدر مسرت ہوئی کہ خوشی سے آنسو چھلک پڑے۔ دوڑے دوڑے گھر آئے اور کہنے لگے: ”آج میں نے اپنے بیٹے کی جو عزت اور شان دیکھی ہے اس سے پہلے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی بھی نہیں دیکھی تھی۔“ اور پھر دیر تک اللہ کا شکر ادا کرتے رہے۔ نیک دل والدہ بھی اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں اور پھر شوہر سے کہنے لگیں: ”تیس ہزار اشرفیاں زیادہ عزیز ہیں یا ایسا انمول بیٹا؟ میں نے وہ ساری اشرفیاں اس کی تعلیم و تربیت پر خرچ کر دی ہیں۔“

فروخ نے بے ساختہ جواب دیا: ”خدا کی قسم! ان اشرفیوں کا اس سے بہتر کوئی استعمال نہ ہو سکتا تھا۔ تم نے بہت خوب کیا۔ ان اشرفیوں کو بیٹے کی تعلیم پر لگا کر اسے ایک ایسے خزانے کا مالک بنادیا، جس کو کبھی زوال نہیں۔“

امام ربیعہ کا علم و فضل میں اتنا بلند مقام تھا کہ بڑے جلیل علماء و فقہاء بلکہ سربراہان حکومت بھی ان کے سامنے عقیدت سے سر جھکاتے تھے اور یہ سارا مرتبہ ان کو اپنی دور اندیش اور علم دوست والدہ کی بدولت نصیب ہوا تھا۔ جنہوں نے اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے مال و دولت غرض ہر چیز نچھاور کر دی تھی۔^[۱]

3- امام شافعیؒ کی والدہ:

امام شافعی مکہ کے رہنے والے ایک مشہور عالم تھے۔ قرآن، حدیث فقہ اور شعر و ادب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کا اصل نام محمد بن ادریس تھا، قریش کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن میں ہی باپ کا انتقال ہو چکا تھا، گھر میں ان کی والدہ اور وہ دو افراد ہی تو تھے۔ امام شافعی کی ابتدائی زندگی بہت محنت و مشقت سے گزری، علم کا شوق بچپن سے تھا، چھوٹی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ مکہ میں جتنا علم حدیث حاصل کر سکتے تھے، وہ بھی حاصل کر لیا پھر تیرہ چودہ سال کی عمر میں ماں سے حصول علم کے لیے سفر پر جانے کی اجازت مانگی۔ والدہ نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ دو پرانی یمنی چادریں گھر میں تھیں۔ وہی بیٹے کو دیتے ہوئے کہا: ”جا! میں نے تجھے اس خدا کے سپرد کیا جس کی تو امانت ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ تجھے ضائع نہیں کرے گا اور غیب سے تیری تمام مالی و دیگر ضرورتیں پوری فرمائے گا۔ خدا تجھے آسمانِ علم پر سورج بنا کر چمکائے۔“ امام شافعی ماں سے رخصت ہو کر مدینہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تین سال ان کی خدمت میں رہ کر ان سے علم حاصل کیا، پھر کوفہ میں امام ابو حنیفہ کے شاگرد امام محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں بھی کافی مدت رہ کر امام محمد سے علم دین حاصل کر لیا۔

تین سال بغداد میں بھی گزارے۔ پھر دوبارہ امام مالک کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام مالک کے پاس اس وقت اللہ کا دیا بہت کچھ تھا۔ انہوں نے اپنے ہونہار شاگرد امام شافعی کو بہت سا مال اسباب دے دیا۔ اب امام شافعی اپنی بوڑھی والدہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔ اب تک وہ علم و فضل کے بے شمار خزانے حاصل کر چکے تھے۔ امام مالک نے امام شافعی کی مکہ روانگی کی تیاری کروادی اور بے شمار مال و اسباب دے کر ان کو روانہ کیا۔

نیک دل والدہ کو اپنے بیٹے محمد بن ادریس (امام شافعی) جواب ایک بہت بڑے عالم بن چکے تھے کی واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔ چنانچہ جب امام شافعی حد و حرم کے قریب پہنچے، تو والدہ کو اور خالہ کو اپنے استقبال کے لیے موجود پایا۔ ماں اور خالہ دونوں نے ان کی بلائیں لیں۔ مگر ماں امام شافعی کے ساتھ اتنا مال و اسباب دیکھ کر بڑی ملول اور دلگیر ہوئی۔ بیٹے نے عرض کیا کہ چلو

اماں جان! گھر چلیں تو والدہ نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور بولیں:

”بیٹے! گھر کیسے چلیں؟ میں نے تجھے حصولِ علم کے لیے روانہ کیا تھا اور جاتے وقت صرف دو بمبئی چادریں تجھے دی تھیں۔ میں نے تجھے یہ دنیا لانے کے لیے کب بھیجا تھا! بیٹے! یہ غرور کی پونجی تو اس لیے ساتھ لایا ہے کہ اپنے چچا کے بیٹوں پر اپنی بڑائی جتائے اور انہیں حقیر سمجھے۔“

بیٹے نے فرطِ ندامت سے سر جھکا لیا اور عرض کیا: ”اماں جان! فرمائیے، اب میں کیا کروں؟“ والدہ بولیں: ”بیٹے! کرنا کیا ہے۔ عام اعلان کر دو کہ بھوکے آئیں اور غلہ لے جائیں، پیادے آئیں اور سواری لے جائیں، ننگے آئیں اور کپڑے لے جائیں، نادار آئیں اور دولت لے جائیں۔“ چنانچہ والدہ کی خواہش کے مطابق اعلانِ عام کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ سارے اونٹ اور مال و اسباب مکے کے غریبوں اور ناداروں میں تقسیم ہو گیا۔ اب امام شافعی کے پاس جیب میں پندرہ دینار تھے اور ایک خچر جس پر وہ سوار تھے۔ یہ سارا قافلہ اب مکے میں داخل ہو رہا تھا۔ اتفاقاً راستے میں امام شافعی کا کوڑا نیچے گر گیا۔ پاس سے گزرنے والی ایک باندی نے وہ کوڑا امام صاحب کو پکڑا دیا۔ انہوں نے باندی کو انعام دینے کے لیے پانچ دینار جیب سے نکالے تو والدہ بولیں:

”اچھا تو ابھی تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟“ بیٹے نے عرض کیا: ”ابھی دس دینار اور ہیں۔“ ماں نے کہا: ”یہ دس دینار کس لیے رکھے ہیں؟“ بیٹے نے عرض کیا: ”اب غلہ بھی نہیں رہا۔ یہ رقم وقت بے وقت کام آئے گی۔“

اماں: ”ارے بیٹا! تعجب ہے کہ تمہیں اتنا کچھ پڑھ لکھ لینے کے باوجود ان پندرہ دیناروں پر اتنا بھروسہ ہے اور سب کچھ دینے والے پر ذرا بھروسہ نہیں۔ سارے دینار نکال کر اس باندی کے حوالے کر۔“ اب بیٹے نے وہ سارے دینار نکال کر باندی کو دے دیئے۔ اس طرح خالی ہاتھ دونوں ماں بیٹا اپنے گھر میں داخل ہو گئے۔ گھر جا کر ماں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بڑے پیار و محبت سے بیٹے کو فرمایا: ”آج تو اس حال میں جھونپڑے میں داخل ہوا ہے جس حال میں یہاں سے نکلا تھا۔ مگر آج میرے جھونپڑے میں وہ روشنی ہوگی، جو اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ اللہ نے تیری پیشانی میں علم کا نور رکھا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ نور دنیا کی فانی راحتوں سے میلا

تذکرہ چند اولوالعزم باکمال خواتین کا

ہو اور اس میں کمی آئے۔“ اللہ، اللہ! یہ استغناء اور قناعت! یہ کسی کسی کا نصیب ہے۔ [۱]

10- دین پر ثابت قدمی و عزیمت:

1- حضرت فاطمہؓ بنت خطاب، حضرت عمرؓ بن خطاب کی بہن تھیں۔ ابتدائے اسلام سے ہی اپنے شوہر حضرت سعیدؓ بن زید کے ہمراہ حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔ حضرت سعیدؓ بن زید تو ان خوش قسمت اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے تھے جن کو دنیا میں ہی جنت کی خوشخبری مل چکی تھی۔

جب اسلام آہستہ آہستہ مکہ میں پھیلنے لگا اور 38 سعید مسلمانوں نے اسلام قبول کر لیا، پھر امیر حمزہؓ بھی آغوش اسلام میں داخل ہو گئے تو کفار کے سینوں پر سانپ لوٹنے لگے کہ کسی طرح اس دین کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ کوئی جو شیلانہ جوان آگے بڑھ کر خود اسلام کے داعی اعظم ہی کو ختم کر کے رکھ دے۔ اس کام کے لیے عمر بن خطاب نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ خصوصاً جب حضرت حمزہؓ مسلمان ہوئے تو کافروں کا غیظ و غضب بہت بڑھ گیا، ابو جہل نے مشتعل ہو کر ایک اجتماع عام میں اعلان کیا: ”جو شخص محمد (ﷺ) کو قتل کرے گا، اسے سو سرخ اونٹ (جو بہت قیمتی سمجھے جاتے تھے) اور چالیس ہزار درہم نقد بطور انعام دیئے جائیں گے۔“ ابو جہل کی تقریر سن کر عمر بن الخطاب نے (جنہیں اپنی بہادری اور شہ زوری پر بڑا ناز تھا) اس کام کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔

چنانچہ اسلام کی شمع بجھانے کی نیت سے ننگی تلوار ہاتھ میں لیے گھر سے نکلے۔ راستے میں حضرت نعیمؓ سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ ننگی تلوار ہاتھ میں پکڑے دیکھ کر بولے کہ آج کیا ارادہ ہے؟ عمر بن خطاب نے جواب دیا: ”میں آج محمد (ﷺ) کا خاتمہ کرنے جا رہا ہوں۔ آج میں روز روز کا جھگڑا مٹانا چاہتا ہوں۔“ دوست نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن اور بہنوئی تو کب سے مسلمان ہو چکے ہیں۔

یہ سننا تھا کہ حضرت عمرؓ کے تن بدن میں آگ لگ گئی، پلٹ کر بہن کے گھر پہنچے۔ دروازہ

[۱] نیک ماؤں کا مثالی کردار از سعدیہ ملک، ص: 75 تا 78

تذکرہ چند اولوالعزم باکمال خواتین کا

پر ہی سے کچھ پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ حضرت عمرؓ نے یہ آواز سن کر زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضرت فاطمہؓ سمجھ گئیں کہ یہ عمر ہیں۔ فوراً قرآن پاک کے اجزاء چھپا کر دروازہ کھول دیا۔ عمر نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا کہ یہ کیسی آواز تھی جو ابھی میں نے سنی ہے؟

جب کوئی مناسب جواب نہ ملا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنے بہنوئی سعید بن زیدؓ کو مارنا شروع کر دیا۔ حضرت فاطمہؓ شوہر کو بچانے کے لیے اٹھیں، تو انہیں بھی پیٹنا شروع کر دیا۔ بہنوئی کو چھوڑ کر بہن پر پل پڑے۔ مارتے مارتے انہیں لہو لہان کر دیا۔ حضرت فاطمہؓ نے دیکھا کہ آج جان بچتی نظر نہیں آتی تو چٹان کی طرح ڈٹ گئیں اور بولیں: ”ہاں! ہم نے دین حق کو قبول کر لیا ہے۔ تم جو کر سکتے ہو کر لو۔ دین حق کو اب ہم کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ الفاظ حضرت فاطمہؓ نے تین چار بار کہے: ”جو کرنا ہے کر لو، ہم اسلام کو نہیں چھوڑ سکتے۔“

خون میں نہائی ہوئی بہن کے منہ سے یہ الفاظ سن کر حضرت عمرؓ حیران و پریشان ہو گئے اور ان کا غصہ ندامت اور غور و فکر میں بدل گیا، بہن کے زمین پر بہتے ہوئے خون نے بھائی کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد بولے: ”اچھا جو کچھ تم پڑھ رہے تھے مجھے بھی دکھاؤ۔“ بہن نے کہا: ”ہم اللہ کا کلام پڑھ رہے تھے۔ تم اس وقت تک اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے جب تک غسل نہ کر لو۔“ حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا اور حضرت فاطمہؓ نے وہ صحیفہ جس میں سورہ طہ الکھی ہوئی تھی، ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ اب گویا بڑی چٹان چھوٹی چٹان (یعنی بہن) سے ٹکرا کر ٹوٹ چکی تھی۔ حضرت عمرؓ نے آیات قرآنی کو پڑھا، غور کیا تو دل پر رقت طاری ہو گئی۔ بے اختیار پکارا اٹھے: مَا أَحْسَنَ الْكَلَامَ (یعنی یہ کلام کتنا عمدہ ہے) پھر پکارا اٹھے: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ پھر بہن اور بہنوئی سے اپنی زیادتی پر معافی بھی مانگی اور اس کے بعد حضرت خبابؓ بن ارت کے ہمراہ دارِ ارقم کی طرف روانہ ہوئے، جہاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو دین کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ نبی پاکؐ نے ان کو دیکھ کر پوچھا: ”ابن خطاب! کس نیت سے یہاں آئے ہو؟“ حضرت عمرؓ جلالِ نبوت سے لرز گئے اور

عرض کیا: ”اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔“

ایک طرف کفار مکہ منتظر تھے کہ کب عمر پیغمبرؐ اسلام کا سر لے کر آتے ہیں، دوسری طرف حضرت عمرؓ اپنی کمزور ناتواں بہن کا پہاڑ سے زیادہ مضبوط عزم دیکھ کر پسپا ہو گئے تھے۔ اب وہ اپنے بہن اور بہنوئی کے زخم بھی صاف کر رہے تھے۔ ان سے معافی بھی مانگ رہے تھے اور پھر نبی پاکؐ کے در پر حاضر ہو کر اپنی گزشتہ اسلام دشمنی کی تلافی کرنے کی بھی فکر میں لگے تھے۔ یہ حضرت فاطمہؓ کی استقامت اور عزیمت تھی، جس نے کفر کے اس مرد آہن کو پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ [۱]

2- حضرت سمیہؓ بنت خباب:

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں اسلام کی آواز مکہ کے گلی کوچوں میں بلند کی تو جن ہستیوں نے آگے بڑھ کر پہلے پہلے آپؐ کا ساتھ دیا ان میں حضرت سمیہؓ بنت خباب بھی ہیں۔ ساتھ ہی ان کے شوہر یاسرؓ بن عامر اور ان کے سعادت مند بیٹے عمارؓ بن یاسر بھی مسلمان ہو گئے۔ حضرت سمیہؓ جب مسلمان ہوئیں تو وہ ایک تو اس وقت بوڑھی تھیں، دوسرے ان کا تعلق ایک غلام خاندان سے تھا اور وہ خود لونڈی تھیں۔ اس دور میں مسلمان ہونا کافروں کے شدید غیظ و غضب کا نشانہ بننے والی بات تھی۔ ان کے شوہر حضرت یاسرؓ بھی ضعیف العمر تھے۔ ان دونوں کی ایمانی قوت اور استقامت کا یہ عالم تھا کہ مشرک ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے اور ان کو اسلام چھوڑنے پر مجبور کرتے مگر ان کے قدم لمحہ بھر کے لیے بھی جادہ حق سے نہ ڈل گئے۔ ان مظلوموں کو لوہے کی زرہیں پہنا کر مکہ کی تبتی ریت پر لٹانا، سینہ پر بھاری پتھر رکھنا، پشت کو آگ کے انگاروں سے داغنا، پانی میں غوطے دینا کفار کا روز کا معمول تھا۔ حضرت سمیہؓ کا مالک ولید بن مغیرہ مکے کا صاحب اقتدار شخص تھا۔ وہ مکے کے شریر لوگوں کو ان کے پیچھے لگا دیتا۔ یہ شریران کو اس طرح مسلسل ستاتے رہتے جیسے وہ دیوانی ہوں۔ ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت یاسرؓ، حضرت سمیہؓ اور ان کے بچوں کو بتلائے مصیبت دیکھا تو فرمایا: ”اے آل یاسر! صبر کرو۔ تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔“ یہ ظلم سہتے سہتے بوڑھے یاسرؓ تو خالق حقیقی سے جا ملے، مگر مشرکوں کو پھر بھی رحم نہ آیا اور حضرت سمیہؓ اور ان کی اولاد پر ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک دن حضرت سمیہؓ دن بھر کفار کی سختیاں جھیل کر شام کو گھر آئیں تو ابو جہل نے ان کو گالیاں دینی شروع کر دیں اور پھر یک دم اسے اتنا غصہ آیا کہ اپنا برچھا حضرت سمیہؓ پر کھینچ مارا۔ وہ اس کی تاب نہ لاسکیں۔ زمین پر گر پڑیں اور اپنے رب کو پیاری ہو گئیں۔

بوڑھی جان نے کفار کے کتنے ظلم سہے، مگر چٹان کی طرح ڈٹی رہیں، آخر اس راہ میں اپنی جان قربان کر دی، مگر پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ اس بے کسی کی شہادت کی اطلاع ان کی اولاد نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، آپؐ نے ان کو صبر کی تلقین کی اور فرمایا: ”اے اللہ! آل یاسر کو دوزخ سے بچا۔“ بعد میں جب غزوہ بدر میں ابو جہل مارا گیا تو نبی پاکؐ نے حضرت عمارؓ سے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے تمہاری والدہ کے قاتل سے بدلہ لے لیا۔“ حضرت سمیہؓ وہ پہلی شہید خاتون ہیں جنہوں نے اسلام کے راستے میں اپنی جان قربان کر دی تھی۔ [۱]

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا:

حضرت خنساءؓ بنت عمرو عرب کی مشہور مرثیہ گو شاعرہ ہو گزری ہیں۔ دور جاہلیت میں ان کا ایک بھائی صخر دشمن کے نیزے سے زخمی ہو گیا تھا۔ پورے ایک سال تک بہن نے بھائی کی تیمارداری کی، مگر آخر وہ فوت ہو گیا۔ اس حادثہ نے بہن کو دیوانہ بنا دیا۔ دن رات بھائی کی یاد میں روتیں۔ درد انگیز مرثیے لکھتیں۔ عام مجموعوں میں ان کو پڑھتیں خود بھی روتیں دوسروں کو بھی رلاتیں۔ ان کے یہ مرثیے عربی ادب کے بہترین مرثیے سمجھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد ایک وہ موقع بھی آیا کہ اپنے وفد کے ہمراہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اسلام قبول کر لیا۔ اس موقع پر خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی

ان کا کلام سنا۔ وہ سناتی جاتی تھیں اور نبی پاکؐ ان کی فصاحت و بلاغت پر تعجب کا اظہار کرتے رہے۔ مسلمان ہونے کے بعد واپس اپنے قبیلہ میں گئیں۔ زبان میں تاثیر اللہ نے بہت دے رکھی تھی۔ ان کی تبلیغ سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ بعد میں وقتاً فوقتاً نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھیں۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں ایک دفعہ مدینے آئیں۔ اس وقت حضرت عمرؓ کے بھائی زیدؓ بن خطاب ایک معرکہ میں شہید ہو چکے تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت خنساءؓ سے اس کا مرثیہ کہنے کے لیے کہا، تو اس کے جواب میں حضرت خنساءؓ نے ایک فصیح و بلیغ بات کہی: ”خدا کی قسم! میں صخر اور معاویہ (اپنے بھائیوں) کی موت پر ہرگز نہ روتی اگر ان کو بھی نیک اور پرہیزگار زیدؓ کی طرح کی شہادت نصیب ہوتی۔“ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا: ”خنساءؓ سے بہتر میرے بھائی کی تعزیت کسی نے کبھی نہیں کی۔“

مگر حضرت خنساءؓ کی زندگی کا سب سے تابناک واقعہ وہ ہے جب وہ قادیسیہ کی جنگ میں (عہد فاروقیؓ میں) اپنے چاروں جوان بیٹوں کے ہمراہ شریک ہوئیں۔ یہ چاروں بچے ان کے بڑھاپے کا سہارا تھے۔ ان کورات کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا۔ اس کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

”تم جانتے ہو کہ مسلمانوں کے لیے راہ خدا میں جہاد کرنا بڑا ثواب کا کام ہے۔ تم خوب سمجھ لو کہ ہمیشہ رہنے والی آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا کچھ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ سورۃ آل عمران میں ارشاد فرماتا ہے: ”مسلمانو! صبر سے کام لو، ثابت قدم رہو اور آپس میں مل کر رہو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ فلاح پاؤ۔“ تو اے بیٹو! کل جب گھمسان کا رن پڑے گا اور جنگ کے شعلے خوب بھڑکنے لگیں گے تو تم دشمن کی فوجوں میں گھس جانا اور بے دریغ تلوار چلانا، اللہ تعالیٰ سے نصرت اور کامیابی کی دعا بھی کرتے رہنا۔ اللہ نے چاہا تو آخرت کے دن شرف پاؤ گے اور کامیاب ہو گے۔“

حضرت خنساءؓ کے چاروں بیٹوں نے بیک زبان کہا: ”اے مادرِ محترم! ان شاء اللہ! ہم

آپ کی توقعات پر پورا اُتریں گے اور آپ ہمیں ثابت قدم پائیں گی۔“

چنانچہ صبح جب معرکہ کارزار گرم ہوا تو خوب وارفتگی سے لڑے، لڑائی پورے شباب پر تھی۔ وہ دشمن کی فوج میں گھس گئے۔ بہت دیر تک بہادری سے لڑتے رہے۔ آخر یکے بعد دیگرے چاروں شہید ہو گئے۔ جب حضرت خنساءؓ کو ان کی شہادت کی خبر ملی تو فرمایا: ”اللہ! تیرا شکر ہے کہ میرے بیٹوں کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا۔ مجھے اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ میں اپنے بچوں سے اللہ کی رحمت کے سائے میں ملاقات کروں گی۔“ یہ ضعیف العمر خاتون جنہوں نے تسلیم و رضا اور صبر و تحمل کا ایسا مظاہرہ فرمایا کہ چشمِ فلک نے کبھی اس کی نظیر نہ دیکھی تھی، ان کے اس کارنامہ نے ان کے نام کو جریدۂ عالم پر دوام کا مستحق بنا دیا تھا۔ اگر ملت اسلامیہ ان پر تابدار کرتی رہے تو وہ بجا طور پر اس کی مستحق ہیں۔ یہ وہی خنساءؓ ہیں جو اسلام لانے سے قبل بھائیوں کی وفات پر دیوانی ہو رہی تھیں، حالانکہ اس وقت جوان تھیں اور اب اسلام لانے کے بعد کس طرح بدلیں کہ اپنے جگر گوشوں کو بلکہ بڑھاپے کے جوان سہاروں کو خود شہادت کے لیے تیار کیا اور ان کو تلقین کی کہ کسی نے پشت پر زخم نہیں کھانا۔ پھر ان کی شہادت پر بارگاہِ الہی میں سجدہ شکر بجالائیں۔ اسلام کی تعلیم اور ایمان کے تقاضوں نے ان کو کتنا بدل کر رکھ دیا تھا اور انہوں نے اپنے بچوں کی کیسی اچھی تربیت کی۔ اولاد کی اس سے اچھی تربیت کیا ہو سکتی ہے! [۱]

.....

صحابیاتؓ اور ان کے بعد تابعات کا تذکرہ بھی بہت روح پرور اور ایمان افروز ہے۔ ملت کی تعمیر میں انہوں نے فی الواقع گراں قدر کارنامے انجام دیئے۔ ایک سے ایک بڑھ کر نمونہ! سمجھ نہیں آتی کہ کس کا ذکر چھوڑا جائے اور کس کو لیا جائے؟ ہر تذکرہ ہی ایمان و یقین کو دل میں راسخ کرنے والا اور ملت کی تقدیر کو بدل کر سنوار دینے والا ہے، رضی اللہ عنہن!

یہ تو ایمان و عمل اور صدق و وفا کی ایک سلکِ مروارید ہے جس کا ہر موتی یا قوت اور مرجان کی طرح خالص اور قیمتی ہے۔ بارہ صدیوں تک مسلمانوں کا معاشرتی نظام اسی طرح چلتا رہا۔ ایک طرف خواتین کا معاشرے میں بھی بڑا احترام تھا، دوسری طرف خواتین نے، پردہ نشینانِ حرم نے بھی اللہ و رسولؐ کی محبت، دینداری، اخلاص نیت، شوہر کی وفاداری، علم پروری، تربیت اطفال، غرباء پروری، خودداری، درویشی و قناعت غرض ہر میدان میں پیش بہا خدمات انجام دی تھیں۔

ہر بڑے آدمی کی پشت پر اس کی عظیم المرتبت والدہ کی تربیت کا بڑا دخل رہا ہے، حضرت عبدالقادر جیلانی کی والدہ نے اپنے بیٹے کو ہر حال میں سچ بولنے کی تربیت دے کر امت پر کتنا احسان کیا۔ سرسید اور علامہ اقبال کو عظیم بنانے میں ان کی ماں کا کردار کتنا اہم اور عظیم الشان تھا۔ مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی شوکت علی کی عظیم ملتی خدمات کے پیچھے ان کی عالی مرتبت والدہ بی اماں کی گہری تربیت شامل تھی اور اب ماضی قریب کی ایک مثال بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے میں اپنی بات ختم کرتی ہوں:

ایک افغانی گورنر:

ایک افغانی گورنر نے اپنے بیٹے کو دشمن کے خلاف مہم پر بھیجا۔ ایک ماہ گزر گیا، مگر کوئی اطلاع نہ ملی۔ آخر کچھ دیر کے بعد گورنر کو اڑتی اڑتی خبر ملی کہ تیرا بیٹا تو دشمنوں سے شکست کھا کر بھاگ گیا ہے۔ وہ گورنر فوراً اپنی بیوی کے پاس پہنچا اور بولا: ”تو نے اپنے بیٹے کی کیسی پرورش کی تھی! جو وہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔“ اس راسخ العقیدہ اور پارسا بیوی نے کہا: ”یہ ممکن ہی نہیں کہ میرا بیٹا میدان جنگ سے بھاگ جائے۔ وہ جہاد میں شہید ہو سکتا ہے یا فتیاب ہو کر غازی بن کر واپس آ سکتا ہے، مگر دشمن کے مقابلے میں پیٹھ نہیں دکھا سکتا۔“

پھر کچھ دیر کے بعد اطلاع ملی کہ پہلے والی خبر غلط تھی۔ قافلے کے سپہ سالار نے تولڑتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی ہے۔ گورنر سجدہ شکر بجالایا اور بیوی سے اس کے یقین محکم کے بارے میں استفسار کیا تو وہ خاتون بولی: ”میں نے جب بھی بیٹے کو دودھ پلانا ہوتا تھا تو

پہلے وضو کرتی، نماز ادا کرتی پھر اس کے لیے دعا کرتی کہ یا اللہ! میرے بیٹے کو سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت سے نوازنا، پھر اس کو دودھ دیتی تھی۔ بعد میں اس کے لیے کھانا بھی میں ہمیشہ با وضو ہی تیار کرتی تھی۔ مجھے اپنے لاڈلے کے کردار کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ میدانِ جنگ سے بھاگنے والا نہیں تھا۔“ [۱]

نوٹ: اس باب میں صحابیات رضی اللہ عنہن کے اکثر واقعات مرحوم طالب ہاشمی صاحب کی کتاب تذکارِ صحابیات ایڈیشن سوم سے لیے گئے ہیں۔

23

جدید مغربی نو مسلم خواتین کے
اسلام کے بارے میں تاثرات

- ❁ اکیسویں صدی ان شاء اللہ اسلام کی صدی ہے
- ❁ محترمہ امینہ (امریکہ)
- ❁ محترمہ جمیلہ (امریکہ)
- ❁ ثریا (امریکہ)
- ❁ ڈاکٹر خدیجہ (آسٹریلیا)
- ❁ فاطمہ (چیکوسلوواکیہ)
- ❁ فاطمہ ہیرین (جرمنی)
- ❁ عائشہ (انگلستان)
- ❁ شاہین گلغام (ہالینڈ)
- ❁ خولہ کاتا (جاپان)
- ❁ ملائشیا کی ایک نو مسلم طالبہ
- ❁ حرف آخر

چند نو مسلم خواتین کے اسلام کے بارے میں تاثرات

اکیسویں صدی ان شاء اللہ اسلام کی صدی ہے:

آج کا دور تہذیبوں کے تصادم کا دور کہلاتا ہے، اہل مغرب اسلام کی جاندار، لچکدار، فطری اور قابل عمل تعلیم کو اپنے لیے زہر قاتل تصور کرتے ہیں، وہ مغرب میں قبول اسلام کی بڑھتی ہوئی رفتار سے خوفزدہ ہیں۔ اس لیے وہ اسلامی تہذیب کو مٹانے کے لیے فکرو عمل کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں استعمال کر رہے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا ہر ایک سے متواتر بھیانک پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ اسلام انسانیت دشمن مذہب ہے، مسلمان دہشت گرد، رجعت پسند اور متشدد ہیں۔ تمام غیر ملکی ریڈیو سٹیشن اس وقت اسلام کے خلاف زہریلے پروگرام پیش کر رہے ہیں۔ بعض مقامات پر تو ریڈیو سٹیشن اپنی 75% نشریات اسلام کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ، جرمنی، ماسکو ہر جگہ کم و بیش یہ مسموم پروگرام جاری ہیں۔ بین الاقوامی طور پر نیٹ پر اسلام کو دہشت گردی کا مذہب قرار دینے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔

اس شدید پروپیگنڈے کی وجہ

ہمارے دشمن اس بات سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ اگر اسلام غالب آگیا، تو کفر اور باطل کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں رہے گی، اسی لیے وہ مسلمانوں کو ہر حربے اور ہتھیار سے دبا رہے ہیں۔ یہود و ہنود کا گٹھ جوڑ، امریکہ کا ورلڈ آرڈر، یو۔ این۔ او کی چھتری، عالمی ذرائع ابلاغ کی پوری جدوجہد سب اس لیے ہے کہ کہیں سوئے ہوئے مسلمان جاگ نہ جائیں اور صحیح مسلمان نہ بن جائیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود حالات بتا رہے ہیں کہ اگلی صدی ان شاء اللہ اسلام کی صدی جائے گی۔ اب اسلام مشرقی ممالک سے نہیں بلکہ خود مغربی ممالک میں جاندار قوت بن کر ابھرے گا۔ فرانس اسلام دشمنی میں سب سے آگے ہے مگر خود فرانس میں ہر سال تین ہزار فرانسیسی دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ (اسلامک وائس آئی۔ آئی۔ این۔ اے) ایک جرمن ریسرچ سکالرنے دوران ریسرچ انکشاف کیا کہ جرمنی میں گزشتہ چار سالوں میں آٹھ ہزار خواتین نے اسلام قبول کیا۔ وہ بڑھتی ہوئی نفاشی اور عریانی کے خلاف اسلام کے سایہ عاطفت میں سکون و اطمینان کے حصول

کے لیے آئی ہیں۔^[۱]

الحمد للہ! ہم پیدائشی مسلمان ہیں، ہمیں دین حق اسلام کی نعمت وراثتاً حاصل ہوئی ہے۔ لہذا تمام پیدائشی مسلمانوں کو جو دنیا میں تقریباً ڈیڑھ ارب کی تعداد میں موجود ہیں، اسلام کی عظیم سعادت اور نعمت کی سچی قدر نہیں ہے۔ ہم اس کی وقعت اور مقام و مرتبہ سے ناواقف ہیں۔ نعمت اسلام کی قدر و قیمت تو ان نو مسلموں سے پوچھیے! جنہوں نے راہ حق کی تلاش میں بڑی ٹھوکریں کھائیں، مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا اور بالآخر اسلام ہی نے ان کی بے قرار روح کو اطمینان اور سکونِ قلب کی دولت سے مالا مال کیا۔ میں اپنے اس مختصر مضمون میں چند نو مسلم خواتین کے تاثرات بیان کرنا چاہتی ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ اسلام بحیثیت مجموعی بھی دنیا کا بہترین نظام ہے اور اس کا معاشرتی نظام خصوصاً اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ اتنا اعلیٰ و ارفع ہے کہ اسی نے مغرب کی بہت سی سسکتی پلکتی پریشان و بے قرار خواتین کو سکون و اطمینان سے بہرہ ور کیا ہے:

1- محترمہ امینہ صاحبہ (امریکہ):

امریکہ کی سسٹر امینہ پہلے سنڈے سکولوں میں عیسائیت کی تبلیغ کیا کرتی تھیں۔ 1977ء میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں۔ اپنے قبول اسلام کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

”میرے نزدیک عام یورپی لوگوں کی طرح اسلام وحشت و جہالت کا مذہب تھا اور مسلمان غیر مہذب، عیاش، عورتوں پر ظلم کرنے والے اور اپنے مخالفوں کو زندہ جلا دینے والے لوگ تھے۔ عیسائیت کی رضا کارانہ تبلیغ کے ساتھ ساتھ میں نے مزید تعلیم کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ بھی لے لیا، وہاں کچھ مسلمان کلاس فیلوز بھی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مسلمان طالب علموں کا رویہ دوسرے لوگوں سے مختلف تھا۔ وہ شائستہ، مہذب اور باوقار تھے۔ عام امریکی نوجوانوں کے برعکس نہ لڑکیوں سے بے تکلف ہونا پسند کرتے اور نہ آوارگی و عیش پرستی کے رسیا تھے۔ میں تبلیغی جذبے کے تحت ان سے بات کرتی اور ان کو عیسائیت کی دعوت دیتی مگر وہ بحث میں الجھنے کے بجائے مسکرا کر خاموش ہو جاتے، ویسے بڑے وقار اور احترام سے ملتے۔ ان کے اس رویہ نے مجھے خود اسلام کے بارے میں مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ ان سے گفتگو اور کچھ مطالعہ،

میں نے تاریخ اسلام کا مطالعہ کیا۔ مزید اطمینان کے لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کیا۔ دوسری طرف عیسائیت کی طرف سے میرے ذہن میں بہت سے شکوک و شبہات جنم لینے لگے۔ اسلام کا مطالعہ کرتی تو معلوم ہوتا کہ سارے اندھیرے چھٹ رہے ہیں۔

پیغمبر اسلام کی تعلیم کا مطالعہ کیا تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ مغربی مصنفین کے برعکس حضور بنی نوع انسان کے سچے محسن اور عظیم خیر خواہ ہیں۔ خصوصاً عورت کو انہوں نے جو مقام و مرتبہ عطا فرمایا اس کی پہلے یا بعد میں کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ ماحول کی مجبوریوں کی بات دوسری ہے ورنہ میں طبعاً بہت شرمیلی ہوں اور خاوند کے سوا کسی مرد سے بے تکلفی پسند نہیں کرتی۔ چنانچہ جب میں نے پڑھا کہ پیغمبر اسلام خود بھی بے حد حیا دار تھے اور خصوصاً عورتوں کے لیے عفت و پاکیزگی اور حیا کی تاکید کرتے ہیں تو میں بہت متاثر ہوئی اور اسے عورت کی ضرورت اور نفسیات کے مطابق پایا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کا درجہ جس حد تک بلند فرمایا اس کا اندازہ اس قول سے ہوا کہ ”جنت ماں کے قدموں میں ہے“ اور آپ کے اس فرمان پر تو میں جھوم اٹھی کہ ”عورت نازک آبگینوں کی طرح ہے اور تم میں سے سب سے اچھا شخص وہ ہے جو اپنی بیوی اور گھر والوں سے اچھا سلوک کرتا ہے۔“

سسٹر امینہ نے قبول اسلام کے بعد اپنی زندگی تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دی۔ وہ امریکی خواتین کو ان کی زبوں حالی اور اس کے مقابلے میں اسلام میں عورت کے مقام و مرتبہ کا تقابلی موازنہ کر کے خواتین کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیتی ہیں۔ چنانچہ ان کی تبلیغ سے تقریباً چھ سو امریکی خواتین مسلمان ہو چکی ہیں، خود ان کا خاندان جس نے ان کے مسلمان ہونے پر ان کا سوشل بائیکاٹ کر دیا تھا، اس کے بیشتر افراد بھی شرف اسلام سے بہرہ ور ہو چکے ہیں۔

محترمہ امینہ صاحبہ 1990ء میں انٹرنیشنل یونین آف مسلم وومین کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان آئیں۔ یہاں انہوں نے اسلام آباد اور لاہور کے کئی تعلیمی اداروں میں خطاب فرمایا۔ انہوں نے پاکستانی خواتین کو بار بار یہی بات سمجھانے کی کوشش کی کہ حجاب میں عورت کے لیے عزت و احترام ہے اور عورت کی سب سے بڑی ذمہ داری اپنے بچوں کی پرورش ہے۔ آپ امریکی خواتین کی نقالی نہ کریں، وہاں تو بوڑھے والدین شدید کس مہر سی کی زندگی گزارتے ہیں۔ جونہی کوئی خاتون 35 سال سے بڑھ جاتی ہے تو اسے اس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے کہ وہ زندہ درگور

ہو کر نفسیاتی مریض بن جاتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کے ذہنی امراض کے ہسپتال مریضوں سے بھرے پڑے ہیں۔ غرض وہاں عورتوں کو سکون حاصل ہے نہ بچوں کو اور نہ بوڑھوں کو۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پاکستانی خواتین اور مرد حضرات اس معاشرے کو اپنا آئیڈیل کیوں سمجھتے ہیں اور وہی اطوار کیوں اختیار کر رہے ہیں جنہوں نے امریکی اور یورپی سماج کو تباہ کر ڈالا ہے؟ [۱]

2- محترمہ مریم جمیلہ صاحبہ (امریکہ):

مریم جمیلہ نیویارک (امریکہ) کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ وہ شروع سے ہی امریکی معاشرہ کے برعکس پاکیزہ طور اطوار کی مالک تھیں۔ بچپن سے موسیقی سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ گیارہ سال کی عمر میں ایک دفعہ ریڈیو پر عربی موسیقی سن لی۔ جس سے دل و دماغ کو بڑی فرحت حاصل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عربی موسیقی سے خاصا لگاؤ پیدا ہو گیا۔ ایک دن سورۃ مریم کی بہت دلنواز تلاوت (جو مصر کی ام کلثوم کی سریلی آواز میں ریکارڈ کی گئی تھی) سنی تو دل کی دنیا ہی بدل گئی۔ بعد میں اکثر وہ سورۃ مریم کی تلاوت سنا کرتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور عربوں کے بارے میں جاننے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ تلاش حق کے ایک لمبے سفر کے بعد یقین ہو گیا کہ قرآن پاک واقعاً اللہ کا کلام ہے۔ توراۃ، تلمود اور انجیل میں عقیدہ آخرت مبہم ہے، اس کے برعکس قرآن پاک نے آخرت کے امکان اور وقوع کو بڑے واضح اور مدلل انداز میں بیان فرمایا ہے اور زندگی کا واضح مقصد دیا ہے۔ قرآن پاک کا یہ پہلو ان کے لیے بہت متاثر کن تھا۔ نیز سیرت طیبہ کا مطالعہ بھی ان کے لیے ایک مہمیز ثابت ہوا۔ اپنے تاثرات و احساسات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں:

”نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی تعلیمات کا مکمل و اکمل نمونہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اقدس کا ایک ایک پہلو مثالی ہے۔ ایک بچے کی حیثیت سے، ایک باپ کی حیثیت سے، ایک پڑوسی، ایک تاجر، ایک مبلغ، ایک دوست، ایک سپاہی اور ایک فوجی جرنیل کے اعتبار سے، ایک فاتح، ایک منصف، ایک قانون ساز، ایک حکمران اور سب سے بڑھ کر اللہ کے فرمانبردار بندے کے حساب سے وہ خدا کی کتاب کی ہو بہو مثال تھے۔ پھر آپ کی دن بھر کی مصروفیات کی تفصیل نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ دن کا ایک لمحہ ضائع نہ کرتے اور سارا

وقت اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے لیے وقف رکھتے۔ ان کا اپنی بیویوں سے سلوک نہایت منصفانہ اور مثالی تھا۔ انصاف، عدل اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ان کی لاڈلی بیٹی حضرت فاطمہؓ الزہراء رضی اللہ عنہا نے اپنی جائز ضرورت کے لیے ایک غلام کی درخواست کی تو آپؐ نے تقویٰ کی تلقین فرمائی اور اپنے کنبے پر دوسرے مسلمانوں کی ضرورتوں کو ترجیح دی۔ آپؐ روزمرہ زندگی کی ضروریات کا خاص لحاظ کرتے تھے۔ شگفتہ مزاج اور خوش بیان تھے۔ بچوں کے ساتھ کھیل بھی لیتے تھے مگر اصل توجہ کے قابل انہوں نے آخرت کی زندگی ہی کو سمجھا اور مادی و روحانی زندگی میں حد درجہ توازن پیدا کر دیا۔“

”پہلی مرتبہ میں نے توراۃ کی تنگ اور جامد قوم پرستی کے مقابلے میں قرآن کی ہمہ گیر بین الاقوامیت کا مشاہدہ کیا۔ میری بیقراری کو سکون مل گیا۔ میں نے اسلام میں ہر وہ اچھی، سچی اور حسین چیز پالی جو زندگی اور موت کو معنی اور مقصد عطا کرتی ہے جبکہ دیگر مذاہب میں حق مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ جو لوگ کسی اخلاقی ضابطے کے بغیر زندگی گزارتے ہیں اور خدا کی خوشنودی کو پیش نظر نہیں رکھتے، دنیاوی زندگی میں وہ خواہ کتنے ہی کامیاب ہوں مگر آخرت میں صریح خسارے میں رہیں گے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہمیں ہر وہ فضول اور بے فائدہ کام ترک کر دینا چاہیے، جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔“ یہ قرآن ہے اور اسلام ہے جس نے عربوں کو سربلندی عطا کی ہے۔ اسی کے طفیل عرب دنیا میں کامیاب و بامراد ہوئے ہیں۔“

یہ ہیں محترمہ مریم جمیلہ کے اسلام کے بارے میں تاثرات اور احساسات! اسلام قبول کرنے کے بعد وہ پاکستان آ گئی تھیں۔ انہوں نے تبلیغ اسلام کے لیے غیر معمولی قسم کی قابلِ قدر علمی و دینی خدمات انجام دیں، ایک درجن سے زائد کتب انگریزی میں لکھیں جو اپنی وقعت، سند اور خیالات کی گہرائی و معنویت اور وسیع اثرات کی وجہ سے دنیا بھر کے علمی حلقوں میں خراج تحسین وصول کر چکی ہیں اور بے شمار غیر مسلم مغربی خواتین کے قبولِ اسلام کا سبب بن چکی ہیں۔^[۱]

3- محترمہ ثریا صاحبہ (امریکہ):

مارچ 1990ء میں شمالی امریکہ میں مسلمانوں کے ایک ماہوار رسالہ ”یونٹی ٹائمز“ میں نو مسلم طالبہ ثریا کا انٹرویو شائع ہوا۔ انہوں نے بتایا:

[۱] ہمیں خدا کیسے ملا؟ از ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ص: 83 تا 87

”جب میں کالج میں حصول تعلیم کے لیے داخل ہوئی، وہاں مسلمان طلبہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ انہی کے ذریعہ سے اسلام سے تعارف حاصل ہوا۔ میں اسلام کے اس پہلو سے بہت متاثر ہوئی کہ یہ عیسائیت اور یہودیت کی طرح جزوقتی مذہب نہیں (یعنی ایک ہفتے میں صرف ایک گھنٹہ کے لیے اتوار کے روز چرچ جانا) بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے۔ یہ دن اور رات کے ایک ایک لمحے کے لیے راہنمائی دیتا ہے۔ دوسرا پہلو جس نے مجھے متاثر کیا، وہ یہ تھا کہ جو شخص اسے عملی طور پر اختیار کر لے، اس کی زندگی میں نظم و ضبط، سلیقہ اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے دو سال تک مختلف مذاہب کا مطالعہ کر کے اسلام کا انتخاب کیا جو ہر لحاظ سے بہترین اور عقل کے عین مطابق ہے۔ جو مکمل دین ہے۔ انسان کی فطرت کے بھی عین مطابق ہے، لہذا میں نے اسے دل و جان سے قبول کر لیا۔ پھر یہ نعمت بھی کچھ کم نہیں کہ اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت انسان کے اندرون کو تزکیہ اور سکون سے مالا مال کرتے ہیں۔ روح میں رفعت اور مقاصد میں بلندی پیدا ہوتی ہے اور انسان سرد و گرم ہر قسم کے حالات میں مایوسی سے محفوظ رہتا ہے۔“

جب ثریا صاحبہ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے اپنے بالوں کو ڈھانپا ہوا ہے، امریکہ کے عریاں ماحول میں آپ کو یہ کیسا لگتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ”میں نے اپنا سر ڈھانپ کر دراصل اس ماحول کی آلودگیوں سے تحفظ حاصل کیا ہے۔ عام عورت نیم برہنگی کی وجہ سے جس خوف اور سراسیمگی کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے، میں نے بڑی حد تک اس سے نجات پالی ہے۔ پھر میرا سر ڈھانپنا ایک قسم کا اعلان بھی ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں اللہ نے جو حکم دیا ہے میں اس کی پیروی کر رہی ہوں۔“^[۱]

4- محترمہ ڈاکٹر خدیجہ صاحبہ (آسٹریلیا):

51 سال کی عمر میں 1980ء میں لاہور میں اسلام قبول کیا۔ قبل از اسلام نام ”مارلینا گارسیا“ تھا۔ شروع سے فطرت صالح تھی۔ یونیورسٹی آف کیلفورنیا سے گریجوایشن کرنے کے بعد پرائیوٹ پریکٹس شروع کر دی، ساتھ ساتھ شراب، تمباکو نوشی اور دیگر منشیات کے خلاف لیکچر

[۱] ہمیں خدا کیسے ملا؟ از ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ص: 110 تا 114

بھی دیئے اور اخباروں میں مضامین بھی لکھے۔ عیسائیت کا تثلیث کا عقیدہ شروع سے ان کو مہمل اور مضحکہ خیز لگتا تھا۔ چنانچہ تلاش حق کی خاطر مختلف مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ (ان کے بقول) پھر ”محترمہ مریم جمیلہ کی اسلام پر لکھی گئی کتابیں میرے ہاتھ لگیں، تو دل اسلام کی حقانیت کا قائل ہونے لگا میں 60ء میں لگ بھگ صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ پاکستان آئی۔ یہاں مریم جمیلہ سے ملاقات ہوئی تو ان کی سادگی اور شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ مریم صاحبہ نے ایک ایسے شخص سے شادی کی جو پہلے ہی شادی شدہ تھا اور اس کے بچے بھی تھے۔ وہ اپنی ضعیف العمر ساس کی خوب خدمت کرتیں اور خاموشی و وقار سے خدمت دین میں مصروف رہتی تھیں۔ مریم جمیلہ نے مجھے مولانا مودودیؒ سے بھی متعارف کروایا اور ان کی ایک کتاب ”ٹو وورڈز انڈر سٹینڈنگ اسلام“ Towards Understanding Islam بھی دی۔ میں 80ء میں دوبارہ پاکستان آئی اور یہاں مریم جمیلہ صاحبہ کے مشورہ پر منصورہ گئی۔ میاں طفیل صاحب کی وساطت سے دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی۔ اس سعادت پر اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“

”میں اپنی مسلمان بہنوں تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہوں کہ وہ وہی طریقہ اختیار کریں جو پیغمبر اسلامؐ نے دیا ہے۔ میں نے شلوار قمیض، چادر اور برقعے سے بڑھ کر اچھا لباس خواتین کے لیے کوئی نہیں دیکھا۔ اسی سے خواتین کی عزت ہے اور یہی چیز معاشرے کو مختلف قباحتوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ میں پاکستانی خواتین تک یہ بات پہنچانا چاہتی ہوں کہ یورپ میں عورتوں کا لباس انتہائی لچر اور توہین آمیز ہوتا ہے۔ اللہ کے لیے ان کی نقالی سے بچیں اور پردے کا وہ انداز اختیار کریں جس کی تلقین اسلام نے کی ہے۔“ [۱]

5- محترمہ فاطمہ صاحبہ (چیکو سلواکیہ):

مسیحی نام مویکا تھا، بیس برس کی عمر میں 1963ء میں اپنے ایک ترک استاد عمر کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اپنی قبول حق کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں: ”میں بچپن سے غور و فکر کی عادی تھی۔ اپنا آبائی مذہب عیسائیت مجھے مطمئن نہ کر سکا کہ یہ غیر عقلی اور غیر منطقی تھا۔ پھر میں

نے دوسرے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا مگر دل کو اطمینان نہ ملا۔ انہی دنوں ہمیں چیکو سلواکیہ چھوڑ کر مغربی جرمنی (کاروبار کے سلسلے) آنا پڑا۔ یہاں لاکھوں کی تعداد میں مسلمان ترک باشندے ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں، میں نے ان لوگوں کے خاندانی اور معاشرتی نظام کو بہ نظر تحقیق دیکھا تو مجھے یہ لوگ یورپ کے اندھیروں کے مقابلے میں روشنی کے مینار نظر آنے لگے، اسی سے مجھے اسلام سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں نے اسلام کو سمجھنے کے لیے اس کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ قرآن پڑھا، اسلام کے بارے میں کئی کتب پڑھیں۔ ایک فاضل ترک استاد سے بھی کئی گفتگوئیں ہوئیں۔ اب اسلام کی بے میل اور پاکیزہ تعلیم مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی، میرے لیے سب سے زیادہ پرکشش اسلام کا مثالی معاشرتی نظام تھا، جو بلا تمیز رنگ و نسل سب انسانوں میں برابری اور مساوات پر استوار ہے۔ پھر روحانی و دنیاوی معاملات میں بے پناہ آسانی اور رخصت پھر دونوں کے تقاضوں کو توازن و اعتدال کے ساتھ انجام دینے کی ترغیب! علم و عقل کی یہ کارفرمائی کہ طلب علم مرد و عورت سب پر فرض کر دیا گیا، پھر عورت کو جو بلند مرتبہ اور عزت و احترام دیا گیا، اس سے میری روح جھوم جھوم اٹھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا اور انسان کے درمیان بلا واسطہ تعلق! ان سب چیزوں نے میرے دل و دماغ کو مسحور کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فلسفی نہیں ہیں۔ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں، اسلام ان کے ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ وحی الہی کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جس کی طرف شروع سے اللہ نے رہنمائی کی ہے اور آج بھی صرف اسی مذہب میں یہ حوصلہ ہے کہ زمانے کے مسائل کا سامنا کر سکے اور دکھی انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔ اس یقین کے فوراً بعد میں نے اسلام قبول کر لیا۔“

”حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کے لیے حالات بہت ہی سازگار ہیں۔ اس میں ایک عالمگیر دین بننے کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں اور اس دور کے انسان کی تمام روحانی و مادی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کے پیروکار اس موقع سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں؟“^[۱]

6- محترمہ فاطمہ ہیرین (جرمنی):

1934ء میں جرمنی میں پیدا ہوئیں۔ دوسری عالمی جنگ کو قریب سے دیکھا تو ظلم پر مبنی

مناظرہ دیکھ کر دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ عیسائیت کا مطالعہ کیا تو اس کی تعلیم سراسر خلاف عقل اور ناقابل عمل نظر آئی۔ اتفاق سے ایک یورپی مسلمان نو جوان سے ملاقات ہو گئی۔ ان کا نام عمر عبدالعزیز تھا (بعد میں اسی کے ساتھ فاطمہ کی شادی ہو گئی تھی) ان کے ساتھ فاطمہ کی اسلام کے موضوع پر تفصیلی گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ اسلام کی تعلیم ان کے اپنے الفاظ میں ”مجھے عقل عام کے مطابق نظر آنے لگی۔ میں نے جرمن زبان میں اسلام پر وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو غیر متعصب اور منصف مزاج مصنفین نے لکھی تھیں۔ خصوصاً محمد اسد کی کتاب ”اے روڈ ٹو مکہ“ نے میرے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

اب مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اسلام کی ہر تعلیم اپنے پس منظر میں کوئی نہ کوئی زبردست حکمت رکھتی ہے۔ ساتھ وہ ترک نو جوان (جواب میرے شوہر ہیں) بھی میرے ہر سوال کا جواب شرح و بسط کے ساتھ دیتے حتیٰ کہ مجھے کُل اطمینان قلب نصیب ہو گیا اور میں مسلمان ہو گئی۔“

قبول اسلام کے بعد دونوں میاں بیوی نے جرمنی چھوڑ کر کسی اسلامی ملک میں چلے جانے کا فیصلہ کیا، بالآخر پاکستان میں قیام اختیار کیا۔ لیکن بعد میں یہاں کے ماحول سے بھی بد دل ہو گئے اور واپس جرمنی چلے گئے دونوں میاں بیوی راسخ العقیدہ اور باعمل مسلمان ہیں اور آج کل جرمنی میں دعوت و تبلیغ میں مصروف ہیں۔

محترمہ فاطمہ ہیرین مکمل پردہ کرتی ہیں۔ ایسا پردہ جسے مثالی کہا جاسکتا ہے، ایسا پردہ پاکستانی خواتین بھی نہیں کرتیں۔ وہ جب پاکستان آئیں تو ”اپوا“ کی بیگمات نے اس عظیم جرمن خاتون کو ”ماڈرن“ سمجھ کر اپنی عید ملن پارٹی میں بلالیا۔ وہاں محترمہ فاطمہ نے ان کو بے پردہ دیکھا تو ان کی ایسی خبر لی کہ بیگمات بس بغلیں جھانکتی رہ گئیں۔ انہوں نے کہا: ”تم اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہو حالانکہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم نے تَبَوُّجِ جَاهِلِيَّة کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ اسلام تم سے سادگی اور پردہ کا تقاضا کرتا ہے اور تم نے مُسْرِفانہ طرز زندگی اور بے حجابی کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اسے تم ترقی سمجھتی ہو حالانکہ یہ بدترین گمراہی اور صریح جاہلیت ہے۔“^[۱]

7- محترمہ عائشہ (انگلستان):

محترمہ عائشہ نے 21 برس کی عمر میں اسلام قبول کیا، والدین عیسائی تھے مگر کبھی ان کو عبادت کرتے نہ دیکھا۔ بچپن میں عائشہ کو ایک مذہبی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ مگر عیسائیت کے عقائد ان کو بری طرح کھٹکنے لگے۔ خصوصاً تثلیث کا عقیدہ اور کفارہ کا عقیدہ (کہ حضرت عیسیٰ تمام انسانوں کے گناہوں کے بدلے میں صلیب پر چڑھ گئے۔ اب ہر عیسائی اپنے تمام افعال میں مکمل طور پر آزاد ہے) جب عیسائیت کے بارے میں شکوک و شبہات بڑھ گئے تو پھر انہوں نے دیگر مذاہب کا بھی مطالعہ کیا، مگر دل کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اکثر یہ سوال ذہن کو پریشان کرتا ”کیا کائنات حادثہ کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے؟ اس کا آغاز کیا ہے؟ انسان کا انجام کیا ہے؟“ بس یہی سوالات ان کو پریشان کرتے رہتے۔ اسی دوران میں انہوں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ وہاں کچھ مسلمان طالب علموں سے تعارف ہوا۔ ان سے گفتگو ہوئی۔ انہوں نے پورے صبر و تحمل سے عائشہ کے پریشان کن مسائل سنے اور پھر اسلام کی روشنی میں ان کا مدلل جواب دیا۔ ساتھ پڑھنے کو کچھ اور کتب بھی دیں، جن کو عائشہ نے سنجیدگی سے پڑھا تو ایک دم قلب و ذہن میں تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ پھر انہوں نے ایک ایک مسئلے میں اس مسلمان کلاس فیلو سے رہنمائی حاصل کی اور مسلمان ہو گئیں۔ وہ لکھتی ہیں:

”مجھ سے اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ میرے اسلام قبول کرنے کی بڑی وجوہات کیا تھیں؟ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی مثال جیومیٹری کے نقشے کی سی ہے جس کا ہر جز دوسرے جز کی تکمیل کرتا ہے اور نقشے کا اصل حسن تمام اجزاء کے تناسب اور ربط و تعلق میں ہوتا ہے۔ اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جو انسانوں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ ذرا فاصلے سے دیکھیں تو تمام انسانی ارادوں، مقاصد، اعمال اور عام اشیاء کی عمومیت میں اسلام گہری بصیرت کا ثبوت دیتا نظر آتا ہے، اس کے سیاسی اور حکومتی نظام کا مطالعہ کریں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اگر سماجی و انفرادی نقطہ نظر دیکھیں تو یہ سچی اخلاقیات کی مشعل لیے ایک ایک پہلو میں زندگی کی صاف اور سیدھی شاہراہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور ان معاملات میں دنیا کا کوئی اور نظام یا مذہب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مسلمان جب بھی کوئی کام کرتا ہے اللہ کا نام لیتا

ہے۔ جب وہ اللہ کا نام لیتا ہے تو گویا اپنا احتساب بھی کرتا ہے۔ اس طرح اونچے معیار کو پالیتا ہے۔ اس طرح روزمرہ زندگی میں اور مذہبی تقاضوں میں کوئی بُعد یا فرق نہیں رہ جاتا بلکہ دونوں میں ایک متناسب تعلق قائم ہو جاتا ہے، جو متوازن بھی ہوتا ہے اور بے حد ضروری بھی۔“

”پھر میں اپنے احباب سے اسلام کے بارے میں کھل کر بات کرتی تو وہ اسلام کی حکمتوں کو تسلیم کرتے۔ میرے احباب نے تسلیم کیا کہ عائلی زندگی کے مسائل کا بہترین حل وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے..... آخر میں، میں اسلامی ملکوں کے خاندانی مضبوط نظام اور صاف ستھری زندگی کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر ہم اس کا مقابلہ یورپ کی معاشرتی اور خاندانی قباحتوں سے کریں تو پتہ چلتا ہے کہ مسلمان عظمت کی کن بلندیوں پر فائز ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر فی الواقع اسلام کا سماجی نظام برسر عمل آ جائے تو رحمت و برکت کا کیا عالم ہوگا!“ [۱]

8- محترمہ شاہین گل فام (ہالینڈ):

پہلا نام کرونی تھا۔ پروفیسر شاہین گل فام قبول اسلام سے پہلے عیسائی مذہب کی پیروکار تھیں۔ فطرتاً طبع سلیم کی مالک تھیں۔ ہر بات پر غور و فکر کرنے کی عادی تھیں۔ سولہ برس کی عمر سے ہی عیسائیت کے بارے میں طرح طرح کے شکوک و شبہات قلب و ذہن میں پرورش پانے لگے، یونیورسٹی میں داخل ہوئیں تو عربی کا مضمون بھی منتخب کر لیا۔ اس طرح اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی ثقافت کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں یونیورسٹی میں ایک پاکستانی مسلمان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ایک عملی اور باکردار مسلمان تھا۔ کرونی نے اس سے شادی کر لی۔ شوہر ہر وقت اسلامی کتب بیوی کو برائے مطالعہ دیتا رہتا تھا، مگر کبھی مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ اس دوران میں وہ جس کتاب سے سب سے زیادہ متاثر ہوئیں وہ علامہ محمد اسد کی کتاب ”اے روڈ ٹو مکہ“ تھی۔ بالآخر شادی کے اڑھائی سال بعد کرونی نے اسلام قبول کر لیا، تو شوہر نے انکا اسلامی نام شاہین گل فام رکھا۔ شاہین گل فام صاحبہ نے اپنے مسلمان ہونے کے اسباب یوں بیان کیے: ”اگر میں عیسائی رہتی تو اب تک نن بن چکی ہوتی کیونکہ عیسائیت میں عورتوں کے لیے روحانی بالیدگی حاصل کرنے کے لیے نن

بننے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ مگر اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں روزمرہ کا ہر کام ہی عبادت ہے بشرطیکہ نیت درست ہو اور اخلاص کے ساتھ کام کیا جائے۔ اسلام کا کسی بھی لحاظ سے عیسائیت سے تقابل، میں سمجھتی ہوں، اسلام سے زیادتی کے مترادف ہوگا۔ صرف نماز ہی کو لیجیے! اسلام سے پہلے میں ورزش اور روحانی تسکین کے لیے یوگا کیا کرتی تھی۔ اب نماز پڑھتی ہوں تو اس سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ روحانی بالیدگی بھی ملتی ہے، جسمانی اعصاب کی تھکن بھی ختم ہوتی ہے اور اللہ کا قرب بھی حاصل ہوتا ہے۔“

محترمہ پروفیسر شاہین گلغام دس سال تک ایک بین الاقوامی ایئر لائن میں ملازمت کرتی رہی ہیں۔ وہ دنیا کی پہلی ایئر ہوسٹس تھیں، جو دوران پرواز بھی برقعہ میں ملبوس ہوتی تھیں۔ اس راہ میں انہیں بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر پردہ ترک نہ کیا، بعد میں ناگزیر حالات کی بنا پر ملازمت ترک کر کے ڈچ یونیورسٹی کی ملازمت اختیار کر لی، جہاں صرف تین سال کے بعد شعبہ ”الشرقیہ“ کا انہیں سربراہ بنادیا گیا۔

اب انہوں نے تن، من، دھن سے تبلیغ اسلام کے لیے کام شروع کر دیا۔ ایک انجمن قائم کی، جس کا نام ”النساء“ تھا اور پھر تبلیغ کا دائرہ وسیع ہوا تو ایک ماہنامہ بھی شروع کیا جس کا نام ”وائس آف اسلام“ تھا۔ اب اس رسالے کی گونج ولندیزی دانشوروں کے حلقے میں گونجنے لگی، تو شاہین گلغام صاحبہ کو ڈچ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اسلامی نظام زندگی کے مختلف موضوعات پر خطاب کے لیے بلایا جانے لگا، وہ خود بیان کرتی ہیں: ”مجھ سے ریڈیو، ٹی۔وی اور دیگر تقریبات میں ایک سوال اکثر پوچھا جاتا تھا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد عورتوں کو پردے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے؟“ میں اس کے جواب میں بتاتی کہ پردے کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ ہم برضا و رغبت اسلام کے اس حکم کی تعمیل کرتی ہیں، چونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے یہ حکم دے رکھا ہے لہذا اس حکم کی تعمیل ہی میں ہمارے لیے بہتری ہے۔ اسلام قبول کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے سامنے اپنا سر جھکا دیا جائے۔ اگر اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ہم نے ہر کام میں اپنی ہی مرضی کرنی ہے تو پھر اسلام قبول کرنے کا کیا فائدہ؟ میں لوگوں کو یہ بتاتی ہوں کہ عورت خواہ کسی بھی روپ اور مرتبے میں ہو، اس عظیم مذہب میں اسے یکساں عزت، محبت اور توقیر سے نوازا جاتا ہے۔ عالم اسلام کی خواتین پر اللہ

کا بہت بڑا احسان ہے کہ رسولؐ کی بعثت نے معاشرے کی سب سے کمزور مخلوق کو سب سے زیادہ طاقتور بنا دیا۔ مجھے آج تک وہ منظر کبھی نہیں بھولتا جب میں نے اپنے مرکز میں آئی ہوئی غیر مسلم خواتین کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنایا کہ ”جنت ماں کے قدموں تلے ہے“ تو عورتوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور جب میں نے انہیں حضورؐ کے مزید وہ ارشادات سنائے جو آپؐ نے عورت کی عظمت کے بارے میں تفصیل سے بیان کیے ہیں تو ”النساء“ کے مرکز میں آئی دس کی دس خواتین جب مرکز سے نکلیں تو وہ سب اسلام کی دولت سے مالا مال ہو چکی تھیں۔ یہ 4 دسمبر 1986ء کا واقعہ ہے۔“ یوں اس باہمت اور باعمل خاتون کی کوشش اور محنت سے تیرہ سال کے عرصہ میں چار ہزار ((4000 خواتین نے اسلام قبول کر لیا ہے۔^[۱]

9۔ محترمہ خولہ لکاتا (جاپان):

جاپان سے تعلق رکھنے والی نو مسلم خولہ لکاتا پیرس میں حصول تعلیم کے لیے گئیں۔ وہاں وہ اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوئیں اور تب سے باپردہ زندگی اختیار کر لی۔ وہ لکھتی ہیں: ”میں بعض اوقات مردوں کے گھورنے سے گھبرا جاتی تھی۔ اب حجاب اختیار کرنے کے بعد مجھے یک دم یوں محسوس ہوا گویا حجاب نے مجھے لوگوں کی ناشائستہ نظر بازی سے محفوظ کر دیا ہے۔ میرا پردہ اللہ کی فرمانبرداری کی علامت اور میرے ایمان کا اعلان تھا۔ وہ ہر دیکھنے والے کو یہ بتا رہا تھا کہ اب میں مسلمان ہو گئی ہوں۔ جیسے پولیس آفیسر ز اپنی وردی میں ہر وقت اپنی حیثیت اور ذمہ داری سے آگاہ رہتے ہیں، اسی طرح میں نے حجاب کے اندر اپنے آپ کو اہم مسلمان فرد محسوس کیا جو ہر وقت مجھے اللہ کی فرمانبرداری کی یاد دہانی کراتا رہتا ہے۔ میں نے اپنی عرب مسلمان بہنوں کے سیاہ خمار کو جب دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ رومن کیتھولک نونوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ تعجب ہے کہ لوگ کیتھولک نن کے پردے پر اعتراض نہیں کرتے، لیکن مسلمان عورت کے پردے پر سخت تنقید کرتے ہیں اور اسے دہشت گردی اور ظلم کی علامت قرار دیتے ہیں۔ جب کہ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ باپردہ عورتوں سے مرد دور رہتے ہیں اور انہیں بہن کہہ کر پکارتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پردے کے بغیر میرے کچھ راز ہیں

[۱] ہمیں خدا کیسے ملا؟ از ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ص: 215 تا 223

جو دیکھے جا رہے ہیں، گویا بے پردہ عورت سب کو عام دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔ اس کے برعکس پردہ دار خاتون ہر ایک کے رحم و کرم پر نہیں ہوتی، بلکہ اسے حجاب کے اندر امن و سکون ملتا ہے اور آزادی، لطف اور مزہ حاصل ہوتا ہے۔ اس احساسِ تحفظ کو وہی جان سکتا ہے جو اس تجربے سے گزرتا ہے۔ تجربے سے پہلے اس لطف اور سکون کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے۔ “اگر اسلام عورتوں پر پردہ کی پابندی لگا کر ان پر واقعی ظلم کرتا ہے تو پھر یورپ، امریکہ، جاپان، آسٹریلیا بلکہ ساری دنیا سے تعلق رکھنے والی خواتین جو بہترین تعلیم یافتہ اور نوجوان ہیں، اپنی آزادی اور خود مختاری کو ترک کر کے کیوں اسلام قبول کرتیں! [۱]

10۔ امریکہ میں زیر تعلیم ایک نو مسلم ملائیشی طالبہ نے ایک اسلامی پروگرام کے دوران اسلام کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا:

”میں ایک لڑکی ہوں۔ مغربی تہذیب نے تعمیر کے نام پر عورت کے ساتھ جو دھوکہ و فراڈ کیا ہے۔ اس سے مردوں سے کہیں زیادہ واقف ہوں پہلے میں بھی اسی مغربی تہذیب کی دلدادہ انتہائی ماڈرن لڑکی تھی۔ مجھے اصرار تھا کہ جو کچھ مرد کر سکتے ہیں وہی کچھ عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ میں عورت ہونے کے باوجود مغربی تہذیب کے زیر سایہ مردوں کی سی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ اس لیے تنہا اپنے ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ آ گئی، تاہم اس وقت میری زندگی میں زبردست انتشار تھا۔ امریکہ آ کر اپنی چند مسلمان بہنوں کی کوشش سے میں اسلام کے قریب ہوئی۔ آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اسلام سے دور رہ کر میں نے اپنے اوپر کتنا ظلم کیا ہے۔ اسلام نے عورت کی حیثیت سے میرے مقام کو تسلیم کیا اور میرے لیے ایک متوازن خوشگوار، باعزت اور با مقصد زندگی کی نشاندہی کی۔ آج میری زندگی سکون و اطمینان سے بھرپور ہے۔ اب میں نے اپنے ہم وطن مسلم نوجوان سے شادی کر لی ہے۔ میں اپنے گھر کی ذمہ دار ہوں۔ اپنی تعلیم اچھی طرح سے پوری کر رہی ہوں۔ اپنی مسلمان بہنوں کے ساتھ دینی پروگراموں میں حصہ لیتی ہوں اور ہفتہ میں ایک بار اس شہر کے مسلم بچوں کو دینی تعلیم بھی دیتی ہوں۔ آج میرے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہے۔ اب میں ایک باوقار مسلمان عورت ہوں اور مغربی تہذیب کی طرح کسی

[۱] ہمیں خدا کیسے ملا؟ از ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ص: 126 تا 143

کمتری کا شکار نہیں ہوں۔ اسلامی لباس اور حجاب میرے لیے وقار اور تحفظ کی علامت ہیں۔

تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ (یہ مکمل دس واقعات ہیں)

حرفِ آخر:

جدید تعلیم یافتہ نو مسلم خواتین کی یہ حکایات بہت دلچسپ اور لذیذ ہیں۔ باوجود اختصار کی کوشش کے دراز تر ہوتی جاتی ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ مندرجہ بالا سب نو مسلم خواتین انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں جو ڈاکٹری، انجینئرنگ، سائنس، معاشیات اور تعلیم کے شعبوں سے وابستہ ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اسلام کے مختلف فضائل و خصوصیات کو محسوس کر کے اس کی برتری کا مطالعہ اور مشاہدہ ہر طریقے سے جانچ پرکھ کر اختیار کیا ہے، مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے بعد انہوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ سب نو مسلم خواتین نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے حجاب اور ستر کے احکام کی پوری پابندی کی ہے۔ یہ سب خواتین راسخ العقیدہ اور باعمل ہیں۔ انہوں نے اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے بعد پوری کوشش سے یہ نعمت دوسری غیر مسلم بہنوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے سب سے زیادہ اسلام کے معاشرتی نظام اور خصوصاً پردہ کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ مگر اللہ کی قدرت اور شان دیکھیے! یہ اسلام کا معاشرتی نظام اور خصوصاً حجاب ہی تو ہے جو خود مغربی خواتین کو کشاں کشاں اسلام کی طرف کھینچ کر لا رہا ہے۔ انہیں اسلام میں عورت کا بلند مقام و مرتبہ دیکھ کر اسلام میں بے پناہ دلکشی محسوس ہو رہی ہے۔ یہ سب خواتین مساوات مرد و زن کے کڑے کیلے پھلوں کو چکھ چکی ہیں اور اب ان سے جان چھڑانا چاہتی ہیں۔ وہ اپنی جنتِ گم گشتہ (گھر) میں واپس آنا چاہتی ہیں لہذا یہ نو مسلم خواتین اسلام کے تمام احکام پر برضا و رغبت مکمل طور پر عمل پیرا ہو رہی ہیں۔ وہ اسلام کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ رہی ہیں۔ کیا اس صورت حال میں ہم پیدائشی مسلمان خواتین کے لیے کوئی درس عبرت اور پیغام موجود ہے؟ قرآنِ پاک کی آیت بے ساختہ میری زبان پر جاری ہو گئی ہے:

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي
وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا^[۱]

”آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا ہے۔“
یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے چودہ سو سال قبل سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل دین نازل فرما کر اپنے بندوں کے لیے انعامات و احسانات کی انتہا کر دی، سب سے بڑی نعمت سے ان کو بہرہ ور کر دیا۔ اب جو شخص مسلمان ہے اور اللہ کا اور رسول کا اطاعت گزار ہے، اسی سے اللہ راضی ہے۔ وہی ذہنی و قلبی سکون سے مالا مال ہے، اخروی اجر و ثواب کا مستحق ہے۔
ہم مسلمانوں کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے۔ بلا تحقیق و تنقید اہل مغرب کی ہر ادا پر مرتے جاتے ہیں، اپنے ہاں کی ہر روایت اور ہر ادا کو غیر مقبول اور ان کی ہر الٹی سیدھی بات کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔

سود کی زبردست حرمت کے باوجود سود ہماری رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ اب خود اہل مغرب سود کی تباہ کاریوں اور ہلاکتوں کا عملی تجربہ کر لینے کے بعد بلا سود بینکاری کی طرف رجوع کر رہے ہیں۔ سویٹز لینڈ میں سودی نظام کی جگہ بلا سود بینکاری لائی جا رہی ہے۔ یہی معاملہ تحریک آزادی نسواں کا ہے۔ جب وہاں یہ تحریک برپا ہوئی تو ان کے دانشور اور فلاسفرز مثلاً ڈول سیمان، آگسٹ کاؤنٹ، سامویل سائلز وغیرہ نے چیخ چیخ کر اس کے خلاف احتجاج کیا اور زن کو نازن بنانے پر مسلسل نوحہ کناں رہے۔

پھر جب اس تحریک کی بانی اور محرک خواتین نے خود اس کے کڑوے پھل چکھ لیے۔ ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں ابتری اور انتشار کا مشاہدہ کیا تو خود انہوں نے پھر ”گھر واپس چلو“ (BACK TO HOME) اور ”حجاب میں آزادی“ (FREEDOM IN HIJAB) یعنی ”مردوں کی ہوسناکی اور جنسی تشدد کے مقابلے میں پردہ اور حجاب ہمارے ہتھیار ہیں“، جیسی تحریکیں برپا کیں اور اس طرح اسلام کے اجتماعی بہبود کے نظام پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے! کیا اب بھی ہم اپنے دین کے سنہری اصولوں کی طرف رجوع کریں گے یا نہیں؟ میں اپنی بہنوں سے دسوزی سے گزارش کرتی ہوں کہ وہ اپنی جنت میں واپس آئیں۔ اپنے گھر اور اپنے خاندان کو پوری توجہ دیں۔ کیونکہ اگر گھروں کی حفاظت کے لیے گھر والیاں موجود نہ ہوں تو پھر میدانوں میں مرد بھی جنگ ہار جاتے ہیں۔

24

الدُّنْيَا كُلُّهَا مَتَاعٌ وَخَيْرُ
مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ۔

(فرمان نبوی: صحیح مسلم)

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دنیا ساری کی ساری فائدہ اٹھانے کی چیز ہے۔

اور دنیا کا بہترین سامان ”صالح بیوی“ ہے۔“

مضبوط اور باوقار عورت کون؟

مضبوط اور باوقار عورت کون؟

- ✿ پس منظر
- ✿ عورتوں کی ملازمت اور بیرون خانہ فرائض کی ادائیگی: اثرات و نتائج
- ✿ بچوں کے نصابات میں فیمنسٹ نظریات شامل کیے گئے
- ✿ خاندان کا ادارہ برباد ہونے لگا
- ✿ عورت کے لحاظ سے تحریک کا نتیجہ
- ✿ مغربی عورت کا شباب
- ✿ مسلم عورت کا بڑھاپا
- ✿ عورت کا احترام
- ✿ سب سے پہلے عورت کا تحفظ
- ✿ تاریخِ عالم کی مضبوط ترین خواتین
- ✿ طلاقِ دُخلع کے بڑھتے ہوئے واقعات
- ✿ تنہائی سے ڈسا ہوا مغرب
- ✿ پاکستانی عورت کی اسمبلیوں میں شرکت سے عورت کے کتنے مسائل حل ہوئے؟
- ✿ اصل مسئلہ
- ✿ لائحہ عمل
- ✿ ایک نظم: نعیم صدیقی

(1) ”مضبوط اور با اختیار عورت کون؟“

دو مین ایسپاؤرمنٹ Women Empowerment کا جائزہ
(اسلام اور جدید مغربی تہذیب کے تناظر میں)

فی زمانہ نیو ورلڈ آرڈر کا دنیا میں سب سے زیادہ گونجنے والا نعرہ Women Empowerment ہے۔ کہ عورت کو معاشرے میں عزت دو، اختیار دو، اور اسے مضبوط بناؤ۔

اسی تناظر میں مجھے اپنی کتاب میں اس نئے باب کا اضافہ کرنا پڑا ہے کہ اصل مضبوط اور طاقتور عورت ایک مسلمان عورت ہے یا جدید مغربی عورت.....؟ [1]

8 مارچ کو یو۔ این۔ او کی طرف سے عالمی یوم خواتین قرار دیا گیا تھا۔ یہ یوم خواتین پاکستان میں بھی عام رواج کے مطابق منایا جاتا تھا۔ مگر گزشتہ 3 سال سے اس یوم خواتین کو باہر سے آئی ہوئی این۔ جی۔ اوز بڑے جارحانہ انداز میں منانے لگی ہیں۔ لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں سڑکوں پر فضول قسم کے نعرے لگتے ہیں۔ کچھ مظاہرین نے مختلف پلے کارڈز اٹھائے ہوتے ہیں اور ان پر آبرو باختہ اور انتہائی بے ہودہ قسم کے مطالبات لکھے ہوتے ہیں۔ جن کو مجھے یہاں قلمبند کرنا بھی حیا کے منافی محسوس ہوتا ہے۔ اس سال اسلام آباد میں 8 مارچ 2021ء کو جو سرگرمی دیکھنے میں آئی وہ یہ تھی کہ ایک خاتون سٹیج پر کھڑی بڑی بے باکی سے نعرے لگا رہی تھی۔ ہمیں بس ”آزادی“ چاہیے۔ وہ پھر بازولہرا کر بول رہی تھی اور باقی خواتین، جو انتہائی بے پردہ لباس میں تھیں جواب میں کہتی تھیں۔ ”آزادی“، ”آزادی“۔ وہ کہہ رہی تھیں:

مُلا بھی سن لے

فضلو بھی سن لے (مراد مولانا فضل الرحمن ہیں)

عمران بھی سن لے (وزیراعظم پاکستان)

[1] اس باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سب کچھ گزشتہ اوراق میں آچکا ہے خصوصاً باب نمبر 19 دیکھیے (یعنی

اسلام ہی طبقہ نسواں کا محسن ہے)۔

اور یا بھی سن لے (صحافی)
انصار عباسی بھی سن لے (صحافی)
ہمیں بس آزادی چاہیے۔

مُلاً سے، فضلو سے، اور یا سے، انصار عباسی سے، اقبال سے، باقی سب خواتین اس کے نعروں کے جواب میں کورس کی شکل میں گا گا کر کہہ رہی تھیں..... ”آزادی..... آزادی.....“

قابل غور بات یہ ہے کہ یہ خواتین جو ایجنڈا پاکستان میں لانا چاہتی ہیں، وہ پاکستانی خواتین کے حقیقی مسائل سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ یہ تو بعینہ سی ڈاکا مغربی ایجنڈا ہے۔ جو فیمینسٹ تنظیموں کا ایجنڈا ہے۔ ظاہر ہے یہ خواتین باہر سے آتی ہیں۔ ان نعروں، بیوروں اور پوسٹروں کے پیچھے مغربی وسائل کام کر رہے ہیں۔ یہ خواتین ”آزادی مارچ“ اور ”عورت مارچ“ کے نام سے پاکستانی معاشرے کو انتہائی گندا اور آبرو باختہ بنانا چاہتی ہیں۔ یہاں مادر پدر آزادی، فحش، عریانی اور بے حیائی کو فروغ دینا چاہتی ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ انہوں نے آج تک پاکستانی خواتین، خصوصاً دیہاتی خواتین کے مسائل کو نہ سمجھا ہے۔ نہ اس کے لئے کوئی قدم اٹھایا ہے۔ افسوس ان کو مظلوم فلسطینی یا کشمیری خواتین کا کبھی کوئی مسئلہ بھول کر بھی یاد نہیں آتا..... انہیں مظلوم عافیہ صدیقی دکھائی نہیں دیتی۔

وہ صرف پاکستانی خواتین کو ان کے اپنے خاندان سے، اپنے بچوں سے اور اپنے شوہر سے وفاداری، محبت، تعاون اور ایثار کے جذبے کو ختم کر کے ان میں نفرت کے جذبات کو ابھارنا چاہتی ہیں۔ گھروں کو اٹھل پھٹھل کر کے ہمارے خاندانی نظام کو برباد کرنا چاہتی ہیں۔ ہمارے ستر و حجاب کے پابند معاشرے کو سر بازار رنگا کرنا چاہتی ہیں.....

2۔ اثرات و نتائج:

عورت کے حقوق اور مساوات کے نام پر مغرب میں جو تحریک نسواں برپا ہوئی تھی۔ اور جسے یو۔ این۔ او کے تحت منعقد ہونے والی بے شمار کانفرنسوں نے آگے بڑھایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ

نکلا کہ مغرب کی طرح مسلم ممالک میں بھی عورتوں کی ملازمت کا رجحان بڑھنے لگا۔ اُسے معاشی خود مختاری ملنے لگی، سیاست و حکومت میں ان کی شمولیت ہوئی، اپنی تنخواہ کو اپنی مرضی سے خرچ کرنے کا اختیار ملا، اپنے متعلق تمام فیصلے خود کرنے کی پوری آزادی اس کو ملنے لگی۔ کھیلوں کی دنیا میں بھی وہ اپنا برابر کا حصہ وصول کرنے لگی۔ بلکہ معاشرتی زندگی کے تمام شعبہ جات میں عورت کا عمل دخل بڑھا۔ غرض ہر جگہ اور ہر میدان میں عورت چھا گئی اور اس کو ”ومن ایماپاورمنٹ“ کا نام دیا گیا۔

اسی کے تحت عورت کو بااختیار بنانے کا سارا ایجنڈا آگے بڑھایا گیا۔ ”ومن ایماپاورمنٹ“ اور ”Gender Equility“ یعنی صنفی مساوات کی اصطلاحیں معاشرے میں عام ہوئیں۔ تو قومی و صوبائی اسمبلیوں میں بھی خواتین کی 33% نمائندگی کا اصول وضع کیا گیا۔ مقصد سب کا ایک ہی تھا کہ تمام قومی پالیسیوں میں مرد و زن میں مساوات قائم رکھی جائے۔ اس طرح مسلمانوں کی حیا و حجاب کی پابندیوں اور خاندانی نظام کی بنیادوں کو مسمار کرنے اور ان کی دینی و تعلیمی روایات کو تباہ کرنے کا پروگرام آگے بڑھایا گیا۔

اب عورت اپنے گھر کی جنت کو چھوڑ کر دفتروں، ہوٹلوں اور سڑکوں پر رُز لے لگی۔ گھر برباد ہونے لگے۔ دفتر، ادارے، ہوٹل اور بازار عورتوں سے آباد ہونے لگے۔ گھر کی ملکہ اب اپنے گھر کو رونق بخشنے کی بجائے شمع محفل بن گئی تھی۔ وہ ہر جگہ چمک دمک رہی تھی۔

حدود قوانین کے خلاف بڑا پروپیگنڈا ہوا۔ آخر این۔ جی اوز مارکہ مشرف حکومت نے 15 نومبر 2006 کو دھوکے اور چال بازی سے قومی اسمبلی کے فلور سے حدود قوانین کے اندر چند ترامیم کو منظور کروالیا۔ اور اس کا نام ”تحفظ نسواں بل“ رکھ دیا گیا۔ اس طرح حدود قوانین کے اصل جوہر اور مغز کو نکال کر اس حکومت نے این۔ جی اوز کی منظور کردہ ترمیمات کو منظور کروالیا۔ اس طرح ”تحفظ نسواں ایکٹ“ کو بھی مکمل طور پر سیکولر بنالیا گیا۔

مسلمان عورت کا حجاب بھی عالمی سطح پر موضوع گفتگو بن گیا۔ فرانس میں برقعہ پہننے والی عورت کو 750 یورو جرمانہ عاید کر دیا گیا۔ ڈنمارک میں بھی برقع پر پابندی لگا دی گئی۔ مقصد ایک ہی تھا کہ مسلمان عورت بھی مغربی عورت کی طرح حیا اور ستر کی پابندیوں سے آزاد ہو کر باہر نکلے اور معاشرے میں اپنا ”موثر“ کردار ادا کرے۔

ہمارے تعلیمی نظام کو بھی تلپٹ کرنے کے لیے اُسے لبرل اور سیکولر بنانے کے لیے زبردستی ہمارے نصابِ تعلیم تبدیل کرائے گئے تاکہ مسلم ممالک کے نصاب میں فیمینزم (Feminism) کے متعلق اور ”سیکس ایجوکیشن“ کے متعلق ابتداء ہی سے بچوں کو معلومات مہیا کی جائیں۔

انہوں نے اس بات پر سنجیدگی سے یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کیا کہ مڈل، میٹرک یا انٹرمیڈیٹ کے طلبہ و طالبات ان موضوعات کو سمجھ بھی پائیں گے کہ نہیں؟

حالانکہ خود مغربی یورپ اور شمالی امریکہ و کینیڈا وغیرہ جہاں کے تمام تعلیمی ادارے فیمینسٹ تحریک کے کنٹرول میں ہیں، وہاں بھی یہ نظریات یونیورسٹی لیول سے نیچے نصاب کا حصہ نہیں ہیں پھر وہاں بھی یہ نظریات صرف سوشل سائنسز، وومن سٹڈیز اور جینڈر (Gender) سٹڈیز کے گریجویٹ اور انڈرگریجویٹ لیول کے مضامین میں شامل ہیں۔ عام مضامین پڑھنے والے طلبہ و طالبات کے لیے یہ لازمی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہاں کے بہت سے ماہرین کو اعتراض ہے کہ انڈرگریجویٹ لیول کے سوشل سائنسز کے طالب علموں کو یہ نظریات پڑھا کر ان کا ذہن کیوں خراب کیا جا رہا ہے؟

سوال یہ ہے کہ خود یورپ و امریکہ کے ماہرین جن نظریات و تجربات کی حقیقت کو سمجھ کر اپنی قوم کو ان سے بچانا چاہتے ہیں، ہمارے پاکستانی فیمینسٹ اور لبرل حضرات انہی نظریات کو پاکستان میں مڈل اور میٹرک کے ”مطالعہ پاکستان“ کے نصاب میں شامل کر کے کیوں لازمی طور پر ہر بچے کا ذہن بگاڑنا چاہتے ہیں؟

شاید اس سے پاکستان اور اسلام کے دشمن تو خوش ہو جائیں، مگر ہماری نسل تو برباد ہو گئی، پھر آئندہ آنے والی نسلوں کا مستقبل کیا ہوگا اگر یہ نصاب پڑھایا جاتا ہے تو ہماری سیاسی، مذہبی، تعلیمی و صحافتی تنظیموں کی مجرمانہ خاموشی پر آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ کیا ہمارے سیاسی ناخدا ایسے نصاب کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر کے قوم کے نونہالوں کو اس ظلمِ عظیم سے بچالیں گے.....؟

ان سب اقدامات کا نتیجہ آخر کیا برآمد ہوا؟ خاندان کا مضبوط ادارہ ویران ہونے لگا۔ معاشرہ

برباد ہونے لگا۔ عورت کا اپنا گھر، بچے، شوہر بہت متاثر ہوئے۔ گھر اور ملازمت دونوں کو ساتھ ساتھ نبھانے سے عورت کی اپنی صحت بہت برباد ہوئی۔ بلکہ اس کی اپنی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی۔

عورت اور خاندان:

در اصل معاشرے کا بنیادی یونٹ تو خاندان ہے۔ ایک خاندان عموماً میاں، بیوی، بچوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس میں خاندان کے بزرگ افراد دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، پھوپھو، خالہ، بہن بھائی وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ عورت اگر گھر میں موجود ہے تو جب شوہر اپنی ملازمت کے بعد تھکا ماندہ گھر آئے، تو اس کی بیوی اس کے استقبال کو موجود ہے۔ بیوی کی خدمت اور مسکراہٹ مرد کا بوجھ اور تھکاوٹ ایک دم اتار دیتی ہے۔ بچے سکول سے پڑھ کر گھر آئیں تو ان کی ماں ان کے استقبال کو موجود ہے۔ بچے ایک دم خوش ہو جاتے ہیں۔ اگر گھر میں کسی کی طبیعت ناساز ہو جاتی ہے۔ تو خاتون خانہ کی گھر میں موجودگی کی وجہ سے اس کی خدمت اور تیمارداری ہو رہی ہے۔ مہمان گھر میں آتے ہیں تو گھر کی مالکہ ان کا والہانہ استقبال کرتی اور ان کی خاطر خدمت کرتی ہے گویا گھر ایک سدا بہار گلستان ہے جہاں سب کو سکون و اطمینان میسر ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ عورت ہی خاندان کا محور ہے، اس کا دھڑکتا ہوا دل ہے، معاشرے کی بنیاد ہے، مرد کی رفیق ہے، بچوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے والی ماں ہے، ان کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھنے والی معلمہ ہے۔ فطرت نے اسے بقائے نسل کا فریضہ سونپا ہے۔ اس کی وجہ سے افراد خانہ کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، ان کی تعلیم اور تربیت کا بھی بندوبست ہو رہا ہے گویا مستقبل کی تعمیر ہو رہی ہے۔ کیا یہ عورت جو فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہی ہے، کیا یہ عورت بیکار گھر میں بیٹھی ہے؟ کیا ایک ہاؤس وائف اور خاتون خانہ بیکار ہے؟ بلکہ ہر وہ سنجیدہ شخص جو دیدہ بینا رکھتا ہے، وہ عورت کے گھر کی چار دیواری کے اندر ادا کیے جانے والے اس رول کو بیکار نہیں سمجھے گا، اس کو اہم قرار دے گا۔ اور اس کو اپنے گھر کے اس محاذ پر ثابت قدمی سے ڈٹے رہنے کی حوصلہ افزائی کرے گا۔

حکیم الامت علامہ اقبال نے اپنے عہد میں آج سے ایک صدی قبل ہی یہ تنبیہ کر دی تھی۔

”جس قوم نے عورت کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی وہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پر پشیمان ہوتی ہے۔“

عورت پر قدرت نے اتنی اہم ذمہ داری عائد کر رکھی ہے کہ وہ اگر ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت مل ہی نہیں سکتی۔ اگر اسے اصل فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگا دیا جائے جنہیں مرد انجام دے سکتا ہے تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا۔“ [۱]

ڈاکٹر سید عبداللہ (مشہور دانشور، محقق، پرنسپل اور نیشنل کالج پنجاب یونیورسٹی) اپنے ایک مضمون ”خواتین کی تعلیم اور ملازمت کا مسئلہ“ میں خواتین کے فرائض کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”اسلام کی معاشرتی حکمت میں عورتوں کا فرض بچوں کی پرورش اور خانہ داری ہے۔ اور اس کے بدلے میں مردوں کا فرض بیویوں کی معاشی کفالت ہے تاکہ وہ بے فکر ہو کر اپنے دائرے میں خاندان کی خدمت کر سکیں۔ یہ خدمت ایک بہت بڑا منصب ہے اور جیسا کہ بعض روشن خیال حضرات یہ باور کراتے ہیں، یہ کوئی کمتر فریضہ نہیں۔ بلکہ اصل تعمیر انسانیت اسی فریضے کی ادائیگی میں ہی مضمر ہے اور اس کی ادائیگی میں مرد کا کام (اگر موجودہ اصطلاحوں میں سوچیں) تو خادم کا ہے، جو بنی نوع انسان کی اس معمار بیوی کو اس کے اہم فریضے کی ادائیگی کے قابل بناتا ہے۔ اس دو طرفہ عمل میں بیوی کا درجہ بلند تر ہے۔ شوہر کا درجہ دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ مگر مغربی معاشرتی تصورات نے اس ترتیب کو الٹ کر معاملہ دگرگوں کر دیا ہے۔“ [۲]

اسلام کا نقطہ نظر:

خود اسلام نے عورت پر جو ذمہ داری عائد کی ہے۔ وہ صحیح بخاری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل فرمان سے معلوم ہوتی ہے۔

الْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهَا وَهِيَ مَسْئُولَةٌ عَنْهُمْ

[۱] سید وحید الدین ”روزگار فقیر“ امجد اکیڈمی لاہور، ص: ۶۶

[۲] خواتین کی تعلیم اور ملازمت کا مسئلہ از ڈاکٹر سید عبداللہ، بحوالہ ”خواتین کے امتیازی مسائل“ از حافظ

صلاح الدین یوسف، ص: ۹۰

”عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگران ہے اور اس سے (ان ذمہ داریوں کے متعلق) باز پرس کی جائے گی۔“ [۱]

خود عورت کے لحاظ سے:

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورت گھر میں رہے، شوہر کی خدمت کرے، بچوں کی پرورش کرے اور خانہ داری کے تمام امور کی نگہداشت کرے۔ اسکے اخراجات کا ذمہ دار اس کا خاوند ہے۔ اگر خاوند فوت ہو گیا تو پھر باپ، بھائی، بیٹا چچا/ماموں، بالترتیب اس کے ذمہ دار ہیں اگر ان میں سے کوئی نہ ہو تو پھر خاندان کا کوئی اور مرد و گرنہ مسلمانوں کا بیت المال اس عورت کی مدد کرے گا۔ بہر صورت کمانا عورت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس کی ضروریات کا بندوبست کرنا بہر حال مرد کے ذمہ ہے۔ گرم و سرد حالات میں خون پسینہ ایک کر کے کمانا ایک مشکل کام ہے۔ اور نرم و نازک عورت کمانے کے لیے نہیں بنائی گئی۔

اس کے فرائض دوسری نوعیت کے ہیں۔ اس لیے اسے معاش کی گرانباری سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ یہ اسلام کا عورت پر بڑا احسان ہے کہ وہ اس کی حیات، نسوانیت اور احترام سب چیزوں کو برقرار رکھتا ہے۔ شوہر کی خدمت کا بڑا اجر ہے۔ بچوں کی پرورش کا بے پناہ ثواب ہے۔ خدمت اور حسن سلوک میں والدہ کا درجہ باپ سے تین گنا زیادہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس مغرب میں عورت کی ان نسوانی ذمہ داریوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔ وہاں عورت ماں، بہن، بیٹی کی حیثیت سے کوئی عزت و احترام نہیں رکھتی۔ وہاں عورت صرف گرل فرینڈ ہے اور بس۔ لہذا عورت کا کام ہے کہ مرد کو لبھانے کے لیے اپنے آپ کو ہر وقت دلکش اور جاذب نظر بنائے رکھے۔ سخت سردی میں بھی بوائے فرینڈ کی رضا جوئی کے لیے مختصر ترین لباس پہنے۔ اس لیے وہ اپنی کمائی کا زیادہ حصہ میک اپ، کاسمیٹکس وغیرہ پر صرف کر دیتی ہے۔ مختلف قسم کی مالشیں کرتی رہتی ہے۔ تاکہ وہ سمارٹ ہو اور ڈارلنگ بن سکے۔ پھر وہ اپنی فطری ذمہ داریوں سے بھی آزاد نہیں ہو سکتی۔ کمانا بھی اپنے لیے خود ہے بلکہ زیادہ تر بچے بھی اس کی ذمہ داری قرار پاتے ہیں۔ لہذا مغربی عورت کو

عورتوں کے فطری وظائف بھی ادا کرنا پڑتے ہیں (کیونکہ وہ ان سے کسی طرح پیچھا چھڑا نہیں سکتی) اس طرح مغربی معاشرے میں عورت کی نزاکت اور طبعی کمزوری کے باوجود اسے ڈیڑھ گنا کام کرنا پڑتا ہے اور مرد صرف آدھا کام کرتا ہے۔ یعنی صرف اپنے لیے کماتا ہے۔ بیوی کا خرچ برداشت کرنے کو وہ تیار نہیں ہے۔ بیوی کے مسائل اور پریشانیوں میں اس کا حصہ دار نہیں بن پاتا۔ مغرب میں عورت درحقیقت مردانہ ہوس، جبر اور استحصال کے ہاتھوں اس قدر مجبور، بے بس ہو چکی ہے کہ وہ بے تابانہ اسلام کے دامنِ عافیت میں پناہ لے رہی ہے۔ دوسری طرف وہ مردوں کے شانہ بشانہ بھاگ بھاگ کر تھک چکی ہے۔ اب وہ اپنے گھر میں واپس لوٹنے کی کوشش کرتی پھر رہی ہے۔ مگر وہ موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اب صرف اور صرف اسلام ہی ہے جو مغربی عورت کو گھر بیٹھ کر اپنی نسوانی ذمہ داریاں ادا کرنے پر سرور و مطمئن رکھ سکتا ہے۔ اور اسے معاش کمانے کی گرانبار ذمہ داریوں سے بچا سکتا ہے۔

مغربی عورت کا شباب:

مغرب میں نوخیز عورت ”گرل فرینڈ“ بن کر تو بڑی مصروف زندگی گزارتی ہے۔ پندرہ اٹھارہ سال کی عمر میں والدین خود بچوں کو تلقین کرتے ہیں کہ جاؤ کماؤ اور اپنے لیے زندگی خود بناؤ۔ جو لڑکی ”بوائے فرینڈ“ نہ بنائے اس کے والدین اس کے بارے میں پریشان ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح لڑکی اپنی راہ خود متعین کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جنسی ہوس ناکی کا طوفان ایسا اٹھاتا ہے کہ حیا اور شرم اس میں بہہ نکلتے ہیں۔ پھر جب عمر تیس پینتیس سال کی ہونے لگتی ہے تو ایک آدھ بچہ پاس ہے اور وہ اس کی اور اپنی زندگی کے لیے کما رہی ہے۔ اب اس کا سارا حسن شباب ڈھل چکا ہے۔ اب مرد اس سے صرف نظر کر لیتا ہے۔ اور مغربی عورت بیچ منجھار کے تن تنہا رہ جاتی ہے۔ بالکل افسردہ پریشان، پشیمان، حیران، اب اس کی تنہائی کا چارہ ساز کون ہو۔ چنانچہ اس مایوسی اور افسردگی کے دور میں کتے اور بلیوں سے مانوس ہونے لگتی ہے۔ سوشل ویلفیئر کے کام کرنے لگتی ہے۔ مثلاً ہسپتال میں نرس بن جانا کوئی رفاہی ادارہ کھولنا، ڈے کیئر سنٹر چلانا وغیرہ، جب آہستہ آہستہ قوی جواب دینے لگتے ہیں تو پھر دوست احباب، بیٹا بیٹی اس ازکار رفتہ خاتون کو دار الضعفا

(Old Age Centre) میں چھوڑ جاتے ہیں۔ جہاں وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تنہائی کسمپرسی میں گزارنے پر مجبور ہے۔ اس وقت ان کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کا کوئی بیٹا بیٹی ان کے پاس صرف چند لحظات گزار لے۔ ایسے بوڑھوں کی نگرانی حکومت کے ذمے ہوتی ہے اور وہ بوڑھوں کے دن منا منا کر اولاد کو اپنے بوڑھے والدین کے حقوق ادا کرنے کی طرف توجہ دلاتی رہتی ہے۔ مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ کیا اسی بوڑھی خاتون نے اپنی جوان بچی کو خود اپنے گھر سے باہر نہیں نکالا تھا کہ وہ جا کر اپنے لیے کمائے بھی اور ڈیٹس (Dates) بھی حاصل کرے۔ اب وہ اس کام میں مصروف ہے۔ اس کے پاس اس بوڑھی کھوسٹ والدہ کے لیے وقت کہاں سے آئے؟

مسلم عورت کا بڑھاپا:

اس کے برعکس مسلم عورت اپنی جوانی کا دور اولاد کی تربیت میں گزار دیتی ہے۔ جوانی کا وقت انتہائی کڑا اور مشقت طلب ہوتا ہے۔ شوہر کی خدمت، بچوں کی ولادت، ان کی تعلیم تربیت، گھرداری وغیرہ۔ یہ سارا وقت صبر و رضا کے ساتھ گزارنا پڑتا ہے اور جب اولاد جوان ہوتی ہے تو ماں ایک بار پھر جوان ہو جاتی ہے۔ بچوں کے اوپر کی گئی بھرپور محنت اپنا پھل لاتی ہے۔ اب اگرچہ عورت خود بوڑھی ہو چکی ہے۔ اس کے قویٰ کمزور ہو چکے ہیں مگر اس کے چھ سات بچے جوان ہیں۔ اس کا خاوند، بیٹے، بیٹیاں، پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں اور بہو، داماد سب اس بوڑھی خاتون کے مرتبہ و مقام سے واقف ہیں۔ وہ اس کے بوڑھے وجود کو اپنے لیے باعثِ برکت و سعادت سمجھتے ہیں۔ ہر کام میں اس کے پاس دعائے خیر کروانے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ اس کی ایک تکلیف پر سب اس پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں۔ اس کی خاطر خدمتِ علاج معالجے میں کمی کوتاہی نہیں کرتے۔ عورت کے اشارہ کرنے پر سب حسبِ توفیق اس کی خدمت میں حاضر ہیں۔

غور کیجئے: عورت کا شباب اور بڑھاپا اسلام میں محفوظ و مامون ہے یا مغربی تہذیب میں۔ یہ تو عرش اور فرش کا فرق ہے۔ یہ تو مشرق اور مغرب کا فرق ہے۔ عورت کی حیثیت کا دونوں تہذیبوں میں بعد المشرقین ہے۔ سمجھ نہیں آتا مسلمان عورت مغربی عورت کے سے حقوق کا مطالبہ کر کے کیوں خود فریبی کا شکار ہو رہی ہے۔

عورت کا احترام:

اگر آپ عورت کے احترام کی دلیل مانگتے ہیں تو دیکھئے ہمارے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں خواتین کا کتنا عمل دخل تھا۔ پیدا ہوئے تو والد فوت ہو چکے ہیں۔ صرف محبت کرنے والی دایہ کو دیکھا۔ پھر حلیمہ سعدیہ کی گود میں پرورش پائی۔ آپ کے رضاعی باپ اور بھائی کا نام کس کو یاد ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی والدہ اور رضاعی بہن شیمہ کا نام ہم سب کو معلوم ہے۔ آپ کی دایہ ام ایمن کا نام سب کو معلوم ہے۔ نبوت ملی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کس نے آپ سے ہمدردی اور خیر خواہی کا سلوک کیا۔ کیوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تاجر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا یاد رہیں۔ جب بھی ان کا ذکر خیر آتا آپ اشکبار ہو جاتے۔ ان کی سہیلیوں کو تحفے تحائف بھیجا کرتے۔ آپ کی گیارہ ازواج مطہرات کا کس کو علم نہیں۔ آپ کی زینہ اولاد کے نام بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چاروں بیٹیوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود کتنا تعلق خاطر تھا۔ اور آپ کس طرح ان کی دلداری فرماتے۔ خصوصاً سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کی یہ تکریم کہ وہ جب آتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر ان کا استقبال کرتے اور ان کو اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے جس نے اس کو تکلیف دی اس نے گویا مجھے تکلیف دی۔ اب آج کی مغرب زدہ خواتین بتائیں کیا یہ احترام مغرب آپ کو دے سکتا ہے؟

یہاں تو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یہ جانفزا خوشخبری دے رہے ہیں کہ:

”مسلمان کے لیے دنیا کا بہترین سامان اس کی نیک اور صالح بیوی ہے۔“ [۱]

پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ قریش کی عورتوں کی تعریف اس طرح فرمائی کہ:

”بہترین عورتیں قبیلہ قریش کی صالح عورتیں ہیں۔ جو اپنی چھوٹی اولاد پر بہت زیادہ

شفیق ہوتی ہیں۔ اور خاوند کے حال کی حفاظت بہت اچھی طرح کرتی ہیں۔“ [۲]

صحیح مسلم

[۱]

بخاری و مسلم

[۲]

فیملی ازم نہ کہ فیمنیزم:

ڈاکٹر سمیہ راحیل قاضی نے ”وومن اور فیملی کمیشن“ کی چیئر پرسن کی حیثیت سے لکھا ہے:

”فیملی اور وومن کمیشن“ کو جو سلوگن دیا ہے وہ ”فیملی ازم“ ہے نہ کہ فیمنیزم۔ اسی موضوع پر ان کا ایک مضمون ماہنامہ خواتین میگزین لاہور مارچ 2021 صفحہ 24 پر شائع ہوا ہے۔ جس میں وہ لکھتی ہیں کہ ”اسلام میں نہ مردانہ بالادستی کی کوئی گنجائش ہے نہ فیمنیزم کی، بلکہ اسلام خاندان کے ادارے کے استحکام پر زور دیتا ہے۔ اس لیے ہمیں ایک نئی ٹرم ”Familism“ کو اپنانا چاہیے۔“

”ہم فیمنیزم کی بات نہیں کرتے بلکہ فیملی ازم (Familism) کی بات کرتے ہیں۔“ کہ عورت خاندان کے اندر اپنی خدمات انجام دے رہی ہے تو وہ خود بھی محفوظ ہے اور اپنے کمال ارتقا کی منازل طے کر رہی ہے۔ اور اگر وہ خاندان کے باہر صرف اپنے حقوق اور مضبوطی کی بات کرتی ہے تو وہ مائے بے آب ہے، شتر بے مہار ہے، ڈور کٹی پتنگ ہے اور زمین پر بیکار گرا پڑا پھول ہے۔ جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

- میری نگاہ میں تاریخِ عالم میں چار/پانچ خواتین بے حد مضبوط اور باوقار ہو گزری ہیں۔
- 1۔ سیدہ ہاجرہ علیہا السلام زوجہ ابراہیم علیہ السلام، جن کی یاد میں مسلمان حج و عمرہ کے دوران صفا و مروہ کی سعی جاری کرتے ہیں اور یہ سعی تاقیامت جاری رہے گی۔
 - 2۔ سیدہ آسیہ بنت مزاحم جنہوں نے فرعون جیسے جابر، ظالم اور متکبر شوہر کی خدائی کو چیلنج کر کے اللہ بزرگ و برتر کی راہ میں جان دے کر دنیا میں ہی جنت الفردوس کی بشارت پائی۔
 - 3۔ سیدہ مریم بنت عمران والدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی عفت مآب خاتون۔
 - 4۔ اُم المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا جیسی مونس و غمخوار بیوی۔
 - 5۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن کی وجہ سے عالم اسلام کے لیے علم و فضل کے بہت زیادہ دروازے کھلے۔
 - 6۔ سیدہ فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی والدہ اور

خواتین جنت کی سردار ہیں۔

میرا بلکہ ہر سچے مسلمان کا دل تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لیے عزت و احترام سے ہر دم معمور رہتا ہے۔ جو دنیا کی سب سے زیادہ مضبوط و باوقار خاتون تھیں۔ جن کے بھرپور تعاون، محبت و ایثار سے نخلِ اسلام کو سیری و شادابی ملی۔ ان کے تعاون اور ایثار کے بغیر شاید عالمِ اسلام کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

پھر باختیار، مضبوط مگر باوقار عورت ہر وہ خاتون ہے، جو پس پردہ رہ کر اپنے بچوں کی اچھی تربیت کرتی ہے۔ ایک عورت خود انجینئر بن جائے، مگر بچے رُل جائیں، وہ بہتر ہے یا وہ خاتونِ خانہ جو گھر رہ کر اپنے پانچ چھ دین دار، دیانت دار محنتی اور جفاکش بچے قوم کو مہیا کرتی ہے۔ جو پورے خلوص و دیانت داری سے معاشرے میں اپنے فرائض انجام دیتے ہیں؟

پروفیسر خورشید احمد ”نئے دور، نئے چیلنجز اور مسلمان عورت“ کے پیش لفظ میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”اسلامی تاریخ میں مسلمانوں پر نشیب و فراز کے کئی دور آئے۔ اور عروج و زوال سب ہی سے ہمیں گزرنا پڑا۔ لیکن خواہ ترقی کا دور ہو یا تنزلی اور ابتری کا، ترقی انہی ادوار میں ہوئی ہے۔ جب خاندان کا ادارہ مضبوط تھا اور مسلمان عورت اپنے کلیدی کردار کو بخوبی انجام دے رہی تھی۔ زوال، تنزل اور تباہی کے دور میں بھی، اگر ہماری قوت کا کوئی آخری منبع اور پناہ کے لیے آخری حصار موجود تھا، تو وہ ماں کی گود اور خاندان کا ادارہ ہی تو تھا۔“ [۱]

اس کے مقابلے میں اگر عورت کو گھر کے محاذ سے اٹھا کر، کہیں بیرونِ خانہ ملازمت کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے تو وہ اگرچہ کچھ رقم تو کمالائے گی جس سے وہ شوہر کی اطاعت اور خدمت سے آزاد ہو جائے، مگر سوال یہ ہے کیا اس کی اپنی فطرت کے تقاضے بھی پورے ہو گئے؟ کیا معاشی آزادی اس کی ہر فطری خواہش کا جواب ہو سکتی ہے؟

یہاں مجھے کہنے دیجئے کہ ایک نکمّی ماں بھی اپنے بچوں کے حق میں بہترین آیا سے بھی

زیادہ اہم ہے۔ اپنے بچوں کے لیے جو خلوص و محبت اور سوز و ساز اس کے دل میں ہے کیا وہ ایک آیا کے دل میں ہو سکتا ہے..... پھر آیا کو بھی آپ نے کچھ نہ کچھ مالی معاوضہ دینا ہی ہے۔ مغربی دنیا میں ہر عورت کا اپنی معاش کے لیے مجبور ہونا اتنا بڑا المیہ ہے جس کو سوچ کر ہی ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سب سے پہلے عورت کا ”تحفظ“:

ایک عورت کو اپنی زندگی میں جس چیز کی سب سے بڑی ضرورت ہے وہ ”تحفظ“ ہے۔ جو اس کو مرد کے بغیر نہیں مل سکتا۔ وہ گھر کے اندر ہو، یا اگر اُس نے باہر جانا ہو۔ فطری طور پر وہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی مرد اس کے ساتھ ہو۔ شوہر، باپ، بھائی بیٹا وغیرہ۔ اگر کوئی مرد نہیں ہے تو وہ دو سال کے بیٹے کو ہی انگلی سے پکڑ کر نکل کھڑی ہوتی ہے ایک عام عورت تو اکیلی کہیں بھی جانے سے گھبراتی ہے۔

گھر میں شوہر بیمار پڑا ہو۔ تو ایک عام عورت اپنے لیے، بچوں کے لیے اور اپنے شوہر کے لیے باہر سے کما کر لاتی ہے۔ سارا دن محنت، مشقت اٹھاتی ہے۔ بیمار شوہر کا دوا دارو بھی کرتی ہے۔ مگر یہی چاہتی ہے کہ چاہے وہ بیمار ہے، مگر زندہ رہے اور لمبی عمر پائے کہ بچوں کے سر پران کا باپ تو موجود ہے۔ میرا جیون ساتھی تو موجود رہے کہ اس کی وجہ سے میری عزت تو محفوظ ہے۔ اسی بات کو علامہ اقبال نے یوں تحریر کیا ہے:

نسوانیتِ زن کا نگہاں ہے فقط مرد

قابل غور نکتہ ہی یہ ہے کہ عورت کو مضبوط اور طاقتور بنانے میں اس کا تحفظ پہلے نمبر پر ہے۔ اس کی نسوانیت کا تحفظ، اس کی مادریّت کا تحفظ، اس کی تعلیم کا تحفظ اس کی معیشت کا تحفظ، اس کی اپنی حیا و عصمت کا تحفظ اس کی صحت کا تحفظ، اس کی زندگی، پرورش اور تربیت کا تحفظ، پھر اس کے بڑھاپے اور وقار کا تحفظ وغیرہ۔

عورت کو یہ سارے تحفظ اسلام دے رہا ہے، گھر میں رہ کر، اپنی عزت کے تحفظ کے ساتھ وہ بچوں کو پال رہی ہے۔ مرد کے لائے ہوئے مال سے امور خانہ داری چلا رہی ہے۔ اور تمام افرادِ خانہ اس کی صحت، خوشی اور مسرت کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اکیلا مرد بھی معاشرہ نہیں بنا سکتا اور اکیلی عورت بھی معاشرے کی تشکیل نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں صنفوں کو یعنی مرد و عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ جس طرح لباس کے بغیر انسان اپنے آپ کو ادھورا اور غیر مکمل سمجھتا ہے۔ بعینہ مرد و عورت دونوں کے ملاپ سے معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ عورت بیکار ہے بغیر مرد کے اور مرد بے کار ہے بغیر عورت کے..... خاندان بنتا ہی مرد اور عورت دونوں کے تعاون، محبت اور ایثار سے ہے۔

گھر کی اس چار دیواری کے اندر مسلمان عورت کی عزت محفوظ ہے۔ باہر جاتی ہے تو جلباب، عبا، گاون وغیرہ لے کر نکلتی ہے۔ چہرہ حجاب سے ڈھانپ لیتی ہے۔ عورت کا یہ سکارف اور گاون/برقعہ اس کا محافظ ہے۔ یہی برقعہ/سکارف تو مغربی خواتین کے لیے بہت زیادہ کشش کا باعث ہے۔ جو اس کو مرد کی ہوس بھری للچائی ہوئی نگاہوں سے بچاتا ہے۔ یہ عورت کا وہ محفوظ قلعہ ہے جس نے مغرب کی سینکڑوں خواتین کو احساس تحفظ عطا کیا۔ وہ اسی پردے کی برکات سے متاثر ہو کر دامن اسلام سے وابستہ ہو گئیں۔ یہی تحفظ کی ہی ضمانت تھی۔ جس نے کیرالا (ہندوستان) کی ڈاکٹر کملا داس کو (جو نامور ناول نگار، شاعرہ اور بین الاقوامی شہرت کی حامل مصنف و محقق خاتون تھیں) کو اسلام کے دامن عافیت میں کھینچ لیا۔ 1999ء میں انہوں نے کہا ”میں نے ایک لمبے عرصے تک بڑی تحقیق کے ساتھ سنجیدگی سے گہرا مطالعہ کر کے اسلام قبول کیا ہے۔ میں آخر کار اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ دیگر بے شمار خوبیوں کے ساتھ اسلام عورت کو احساس تحفظ بھی عطا کرتا ہے۔ اور میں اس کی بڑی ضرورت محسوس کرتی تھی۔“ [۱]

عورت کے گھر سے باہر نکلنے سے جو بے پناہ مسائل پیدا ہو رہے ہیں، وہ عدم تحفظ، عصمت دری اور گینگ ریپ جیسے بڑھتے ہوئے واقعات ہیں۔ عورت تو اپنی جائے ملازمت پر بھی محفوظ نہیں ہے۔ راستے میں بھی آتے جاتے ایسے سنگین واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ عورتوں کا اغوا ان پر تشدد، تیزاب گردی کے واقعات روز افزوں ہیں۔ اب تو عدم تحفظ اتنا بڑھ چکا ہے کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے، نو خیز کلیاں، کھلتے ہوئے نو نہال بڑی طرح

جنسی درندوں کے ہاتھوں نوچے جارہے ہیں اور یہ وبا آکاس بیل کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ کوئی اخبار رسالہ اٹھا کر دیکھ لیں ایسے ہی آبروریزی کے واقعات سے بھرا پڑا ہوگا، افسوس اگر ایسے دو چار لوگوں کو اس جرم کی شرعی سزا چوک میں دے دی جاتی تو ان واقعات کی روک تھام کی جاسکتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسے قبیح جرائم کا قلع قمع صرف اسلامی سزائیں ہی کر سکتی ہیں۔

طلاق و خلع کے بڑھتے ہوئے واقعات:

عورت نے معاشی خود مختاری حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ گھروں میں بھی زیادہ سے زیادہ آزادی و خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ افراد خانہ کی بات سننے کی برداشت ختم ہونے لگی شوہر یا ساس ہمیں کیوں کچھ کہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر ٹوٹنے لگے..... ذرا انصار عباسی صاحب کے کالم پر غور فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں:

جس خبر کا ذکر میں کر رہا ہوں اُس کا تعلق پاکستان کے خاندانی نظام سے ہے جو اس قدر تیزی سے تباہ حالی کا شکار ہے کہ صرف صوبہ سندھ میں سال 2019 کے مقابلہ میں سال 2020 کے دوران شادی شدہ عورتوں کی طرف سے خلع لینے (یعنی اپنے شوہر سے عدالت کے ذریعے طلاق لے کر شادی ختم کرنے) کے مقدمات میں سات سو فیصد سے زیادہ (722 فیصد) اضافہ ہوا۔ خبر کے مطابق سال 2019 کے دوران صوبہ سندھ میں مجموعی طور پر خلع کے 632 کیس عدالتوں میں دائر کیے گئے جبکہ ایسی خواتین جو اپنی شادی ختم کرنے کی خواہاں ہیں اور اُس کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں، اُن کی مجموعی تعداد سال 2020 میں اس صوبہ میں پانچ ہزار سے بھی اوپر 5198 تک پہنچ گئی۔ خبر میں ایک متعلقہ خاتون وکیل کے حوالے سے کہا گیا کہ زیادہ تر خلع کے مقدمات دائر کرنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک طرف شوہر بیویوں کے متعلق اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو دوسری طرف میڈیا میں فلموں اور ڈراموں میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اُس کا حقیقی زندگی سے اگرچہ کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اُن ڈراموں اور فلموں کو دیکھ کر حقیقی زندگی کو تسلیم کرنا ایسی خواتین کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ وہ خبر ہے جو پاکستان کے معاشرتی اور خاندانی نظام کو لاحق اُس بہت بڑے خطرے کی

طرف توجہ دلا رہی ہے جس کے لیے ”میرا جسم میری مرضی“، عورت کی آزادی، حقوق نسواں اور برابری کے نام پر پاکستان میں بہت کام ہو رہا ہے جس میں این جی اوز کے ساتھ ساتھ پاکستانی میڈیا اپنی فلموں، ڈراموں حتیٰ کہ خبروں اور اشتہاروں کے ذریعے بہت بڑھ چڑھ کر (جیسا کہ وزیراعظم عمران خان بھی کہتے ہیں) وہ کچھ دکھا رہا ہے جس کا مقصد پاکستان کے خاندانی نظام کی تباہی اور فحاشی و عریانی کو پھیلانا ہے۔ پاکستانی ڈراموں اور فلموں کے موضوعات اور دکھایا جانے والا مواد اتنا گھٹیا ہو چکا ہے کہ کسی تعمیری موضوع یا معاشرہ کی کردار سازی کی بجائے ناجائز تعلقات، طلاق، قریبی اور حرمت والے رشتوں کی پامالی کی کہانیاں دکھائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے تو وہ این جی اوز اور میڈیا والے (میرا جسم میری مرضی) عورت کی آزادی، حقوق نسواں وغیرہ جیسے نعروں کے ذریعے پوری کر کے اس کوشش میں ہیں کہ کوئی گھر نہ بے۔ ”میرا جسم میری مرضی“ والے تو حالیہ برسوں میں اپنے مظاہروں میں طلاق کو بہت خوبصورت بنا کر پیش کرتے رہے ہیں۔ این جی اوز اور میڈیا پر مسلط ایک سوچ یہ بھی ہے کہ عورت جو جی چاہے کر لے، اُس کے باپ، شوہر وغیرہ کو کوئی حق نہیں کہ اُسے روکے۔ یہاں تو کرکٹر شاہد آفریدی کو میڈیا گردی کا سامنا کرنا پڑا جب اُس نے یہ کہا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو باہر کرکٹ کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہاں تو کہا جاتا ہے کہ شوہر کو کہو ”اپنا کھانا خود گرم کرو۔“

گویا ہمارے خاندانی نظام کو مغرب زدہ کر کے تباہ کرنے والے کامیاب ہو رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

ایسا نہیں کہ پاکستان میں خواتین کے ساتھ ناروا سلوک نہیں ہوتا اور شوہر کوئی بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ یقیناً یہاں ایسے مردوں کی کمی نہیں جو خواتین اور اپنی بیویوں کے ساتھ بہت بُرے انداز میں پیش آتے ہیں، انہیں مارتے ہیں، اُن کے حقوق پورے نہیں کرتے۔ اُس کے لیے میں بار بار جو کہتا ہوں کہ ہمیں اپنی قوم کی تربیت اور کردار سازی کی طرف توجہ دینا ہوگی جس کے لیے ریاست کچھ کر رہی ہے نہ ہی پارلیمنٹ اور نہ ہی سیاستدانوں اور میڈیا کو اس موضوع میں کوئی دلچسپی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق بہترین شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک روا

رکھے۔ اسلام میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس گردانا گیا ہے۔ ایک دوسرے کے متعلق دونوں کے حقوق و فرائض وضع کر دیے گئے لیکن اس تعلیم اور اس کی بنیاد پر معاشرے کی تربیت کا نہ کوئی نظام ہے اور نہ ہی کوئی اس نظام کے نفاذ کے لیے سنجیدہ ہے۔ نتیجتاً پاکستانی معاشرے کو ”میرا جسم میری مرضی“ عورت کی آزادی، حقوق نسواں اور برابری کے نعرے لگانے والوں کے ہاتھوں تیزی سے ایک ایسی تنزلی کا سامنا ہے، جسے اگر نہ روکا گیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔“^[۱]

مغربی معاشرے میں بلاشبہ ایسے خاندان بنائے جا رہے ہیں۔ جہاں صرف دو خواتین ہوں یا صرف دو مرد ہوں اور وہ باہم فطری تقاضے پورے کر رہے ہوں۔ مگر کیا اس عمل اہل سدوم سے معاشرہ بھی آگے چل سکے گا اور کیا کوئی نئی خرابی جنم نہ لے گی؟

تنہائی سے لڑتا ہوا مغرب:

مغرب میں اکثر ایسے واقعات پیش آرہے ہیں کہ بوڑھا مرد یا عورت جو اکیلے گھر میں رہ رہے ہیں اور اُن کے جوان بیٹے، بیٹی ان کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں..... (انسان تو فطری طور پر مدنی الطبع ہے وہ اکیلا نہیں رہ سکتا)۔ لہذا چند گھنٹوں کیلئے وہ ایسے ملازم رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جو ان سے باتیں کریں۔ ان کے دل کا دکھ درد سنیں، ان کو کوئی مشورہ دیں۔ یہ اہل مغرب تنہائی سے ڈسے ہوئے ہیں.....

مشہور کالم نگار محمد عاصم حفیظ لکھتے ہیں:

”سپین میں گزشتہ دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے ہر ایک کو ہلا کر رکھ دیا۔ میڈرڈ میں ایک خاتون کی لاش 15 سال تک گھر میں پڑی رہی ارد گرد کے کسی ہمسائے یا رشتہ دار نے بات کو نوٹ ہی نہ کیا۔ اس کے بجلی و گیس کے بل اس کے بینک اکاؤنٹ سے ادا ہوتے رہے۔ آخر ان کے ایک باہر سے آنے والے رشتہ دار نے اُس 78 سالہ خاتون کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو وہاں کی پولیس نے گھر کا تالا توڑ کر اس خاتون کی لاش اس کے اپنے گھر کے غسل خانے سے برآمد کی جو 2004ء کے قریب اپنے گھر کے غسل خانے میں نہاتے ہوئے پھسل کر فوت ہو

[۱] انصار عباسی کا کالم ”ہم برباد ہو جائیں گے“ بحوالہ ماہنامہ چین بتول، فروری 2021ء، ص: 77

گئی تھی..... وہ اپنے ساتھی کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر اس کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلی رہائش پذیر تھی۔ 15 سال تک اس کی لاش غسل خانے میں ہی پڑی رہی مگر اس کے ہمسایوں کو بھی اس کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔“

محمد عاصم حفیظ مزید لکھتے ہیں۔ ایک حالیہ ریسرچ میں جرمن دار الحکومت ”برلن“ کو تنہا لوگوں کا شہر قرار دیا گیا ہے۔ ہر دوسرے گھر میں فرد واحد مقیم ہے۔ 2018ء میں برلن کے ایک اخبار ”ٹاکس اشپسگل“ کے مطابق لاکھوں تنہائی کے شکار لوگوں کو صرف ایک ہزار تین سو افراد رضا کار دستیاب ہیں۔ جو ان سے مالی معاوضہ لے کر چند گھنٹوں کے لیے ان کے بیٹے/بیٹی کا کردار ادا کرتے ہیں، ان ممالک کو اب تنہائی کی وزارت قائم کرنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ برطانیہ میں بھی نوے لاکھ لوگوں کو تنہائی کے مرض کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لہذا اب برطانیہ میں بھی تنہائی کی وزارت قائم کر دی گئی ہے۔“ [۱]

پاکستانی عورت کی اسمبلیوں میں شرکت:

آج کثیر مالی اخراجات صرف کر کے خواتین کو قومی و صوبائی اسمبلیوں میں ان کا 33 فیصد کوٹہ بے شک دیا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے خود خواتین کے کتنے مسائل حل ہوئے۔ خواتین کو کیا عصمت و عفت کا تحفظ مل گیا۔ کیا اس کی صحت کے لیے طبی ادارے اور ہسپتال بن گئے۔ کیا خواتین کی تعلیم و تربیت کے لیے الگ تعلیمی ادارے وجود میں آ گئے۔ کیا اپنی عزت و شرافت کو قائم رکھتے ہوئے باوقار نوکریاں مل گئیں۔ اُسے تقریباً وہی نوکری ملتی ہے جس میں عورت اپنی مسکراہٹ اور ناز و خنوروں کی قیمت وصول کرتی ہے۔ ایئر ہوسٹس بننا، ہسپتالوں میں نرس بننا۔ استقبالیہ پر دوسروں کو خوش آمدید کہنا۔ اشتہاروں میں لہک لہک کر مردوں کی معمولی معمولی مصنوعات کیلئے دعوت دینا وغیرہ۔

جگہ جگہ ہوٹل کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ بیوٹی پارلرز کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور سنجیدہ تعلیمی اداروں، ہسپتالوں میں کمی واقع ہو رہی ہے۔

[۱] محمد عاصم حفیظ کا کالم ”تنہائی سے لڑتا مغرب اور آزادی نسواں“ ہفت روزہ ایشیاء 21 نومبر 2019ء، ص 15

عالم عرب کے دانشور جناب سید مجدی فتنی خواتین کے مغربی تہذیب کے دلفریب نعرہ ”مساوات مرد و زن“ کی حقیقت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”موجودہ دور میں مساوات مرد و زن کا بڑا غلط فہم ہے۔ مسلم خواتین کو اسلام کے بارے میں یہ کہہ کر بدظن کیا جاتا ہے کہ اسلام عورتوں کو مردوں جیسے مساوی حقوق نہیں دیتا۔ این۔ جی۔ اوز اور ان جیسی اخلاق باختہ خواتین اس مغربی نام نہاد مساوات کے لیے کوشاں ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اس چند روزہ فنا پذیر دنیا میں بھی مرد و زن کے حقوق اور مراعات کو مساوی رکھا ہے۔ اور آخرت کی لامحدود دنیا میں بھی مرد و زن کے لیے مساوی انعامات رکھے ہیں۔“ [۱]

اصل مسئلہ:

اس وقت ہمارا اصل مسئلہ دین سے دوری اور جہالت ہے۔ گھروں میں انٹرنیٹ، کیبل، ڈش موبائل وغیرہ کی وجہ سے نسلِ نو کی تعلیم و تربیت کا فقدان ہے۔ دوسری طرف سکولوں میں سیکولر نصاب ان کو پڑھایا جا رہا ہے۔ جس سے نوجوان نسل پریشان خیالی کا شکار ہے۔ اور مغرب کی طرف سے آنے والی ہر فضول و بیکار چیز کو اصل اور انمول سمجھ کر قبول کرتی جا رہی ہے..... وہ صرف ”کھاؤ، پیو اور مزے اڑاؤ“ کے اصول پر عمل پیرا ہو رہی ہے۔ اس لیے ہماری عورتیں، ہمارے مرد، ہمارے نونہال، سبھی صحیح دینی تعلیم و تربیت کے محتاج ہیں..... خواتین تو خصوصاً، جن کو نہ دینی تعلیم دی گئی، نہ دنیاوی جس کی بنا پر وہ ظلم و تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ اور بے شمار دینی و دنیاوی نقصان اٹھاتی رہتی ہیں۔ لہذا ان کو دینی تعلیم دینا بھی ضروری ہے، اور دنیاوی تعلیم بھی۔ تاکہ وہ اپنی اصل ذمہ داریوں سے آگاہ ہوں، اپنے حقوق و فرائض کو پہچانیں، خصوصاً اپنی شرم و حیا، ستر و حجاب کے تقاضوں سے آشنا ہوں اور اپنی صحت کو محفوظ رکھنے کی بھی تدابیر اختیار کریں۔ اگر وہ ملازمت پیشہ ہیں، تو اس کے لیے اسلام کی عائد کردہ ستر و حجاب کی پابندیاں بھی قبول کریں۔

[۱] (سید مجدی فتنی کا مضمون ”تُعْرِفُ الْأَشْيَاءُ بِأَضْدَادِهَا“ جس کا اردو ترجمہ جناب عبدالرحمن طاہر نے

”اے میری بہن“ کے نام سے کیا ہے۔ (مطبوعہ دارالسلام ریاض صفحہ 15، 16)

آج ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں اصل مسلمان بن کر رہنا ہے یا منافق بن کر غیروں کے پاؤں چاٹتے جانا ہے۔ ہمیں بحیثیت مسلمان سراٹھا کر چلنا ہے یا اندھے بہروں کی طرح ان یہود و ہنود و نصاریٰ کی ثقافتی یلغار کو قبول کر کے ان کے فرمانبردار خادم بن کر رہنا ہے۔

خواتین کی ملازمت کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی گھریلو ذمہ داریوں کو عموماً معاشرے میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس لیے والدین کا یہ نکتہ نظر ہوتا ہے۔ کہ وہ ملازمت کر کے اپنے سسرال میں اپنا مقام بنا سکیں گی۔

اس لیے لازمی ہے۔ کہ خواتین کو سسرال میں ہندوانہ رسم و رواج والے ظالمانہ رویوں سے بچایا جائے۔ بہوؤں کے ساتھ سسرال میں ہونے والا جبر و تشدد والا رویہ ہی ان کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لیے ملازمت پر مجبور کرتا ہے، اگر گھر میں خواتین کی فطری وظائف کی ادائیگی پر حوصلہ افزائی کی جائے، ان کے شوہر، سسر، ساس نندیں وغیرہ اس کی معقول اور جائز ضروریات کو نظر انداز نہ کریں۔ تو پھر عورت باہر نکل کر ہلکان کیوں ہو؟ اگر مرد کو عورت کے تعاون، ہمدردی اور ایثار کی ضرورت ہے۔ تو کیا پھر وہ اتنا نہیں کر سکتا۔ کہ بیوی کی وقتاً فوقتاً مشقت اور محنت کرنے پر ان کی تعریف کر دیا کرے۔ بچوں کو بھی اپنی ماں کا احترام کرنے اور ان کی اطاعت کرنے کی تاکید کرے کیونکہ خود اللہ رب العزت نے اپنی بیویوں سے حسن سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے، اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہمارے سامنے اپنا اسوہ حسنہ پیش فرما کر فرمایا کہ: ”تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہتر ہے۔“

لائحہ عمل

- 1۔ خواتین کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے چند نمائندہ خواتین کے لیے ایک الگ فورم بنا دیا جائے۔ یا ان کی الگ خاتون وزارت قائم کر دی جائے جو ان کے حقیقی مسائل پر بات کرے۔ باہمی مشورہ سے اپنے مسائل مرد ارکان تک پہنچائے، تاکہ ان کی اجتماعی رائے کے نتیجے میں پالیسی ساز ادارے ان عورتوں کے لیے صحیح فیصلے کر سکیں۔
- 2۔ خواتین کے لیے معقول تعلیمی ادارے کھولے جائیں۔ جہاں ان کی دینی، دنیاوی اور خانگی تعلیم کے لیے معقول بندوبست ہو۔
- 3۔ معصوم بچوں کے نصابات میں سے فیمنسٹ نظریات کو نکالا جائے۔
- 4۔ مردوں کو ان کی صلاحیت و قابلیت کے مطابق روزگار مہیا کئے جائیں، تاکہ مردوں کی بیکاری کی وجہ سے گھروں میں کھڑے ہونے والے لڑائی جھگڑوں کا تذراک ہو سکے۔ نااہل، نکٹھوشوہروں کو کوئی ہنر سکھا کر کام پر لگایا جائے۔
- 5۔ اسلام کے اکل حلال کے طریقوں کو رواج دیا جائے۔ رسوم و رواج کے بندھن ختم کیے جائیں۔ سادگی، دیانتداری اور کفایت شعاری کو معاشرے میں فروغ دیا جائے۔
- 6۔ عورتوں کے خلاف جاگیردارانہ اور قبائلی رسوم و رواج کو ختم کرنے کے لیے قانون سازی کی جائے اور پھر اس قانون کو سختی سے نافذ بھی کیا جائے اور جاگیرداروں سے بھی ان پر عمل کروایا جائے۔
- 7۔ خواتین کو صحت کے لیے بھی سہولتیں مہیا کی جائیں ان کے لیے خصوصی ہسپتال بنائے جائیں۔ جو وسائل خاندانی منصوبہ بندی پر پھونکے جا رہے ہیں۔ وہی اگر خواتین کی صحت، حمل اور زچگی کے امراض پر خرچ کیے جائیں تو مفید رہے گا۔

- 8۔ سب سے پہلے میڈیا کو ہمیں مسلمان اور محب وطن بنانے کی ضرورت ہے۔
 - 9۔ لڑکوں کی شادی کرنے سے پہلے فیملی یونین میں ان کو اور ان کی والدہ کو خصوصی ریفریشر کورسز کروائے جائیں۔ جو بیویوں اور بہوؤں کے سلسلے میں ان پر عائد ہونے والے فرائض سے ان کو آگاہ کریں۔ طلاق و خلع جیسے مسائل سے بھی آگاہ کریں۔ بلکہ عمومی طور پر نوجوانوں کے تعلیمی نصاب میں زوجین کے حقوق و فرائض اور حسن معاشرت جیسے مسائل شامل کیے جائیں۔ گھروں میں خندہ پیشانی والے رویوں کو فروغ دیا جائے۔ عورت کی خدمت اور وفا شعاری والے رویوں کی پذیرائی ہو اور مکمل حوصلہ افزائی ہو۔ بیویوں کے خلاف اکسانے اور طلاق دلانے والی ماؤں کے خلاف بھی قانون سازی کرنا ضروری ہے۔
 - 10۔ عورتوں پر تیزاب پھینکنے والوں اور گھر میں مردانہ تشدد کرنے والوں کا کڑا احتساب ہو۔
 - 11۔ ملازمت پیشہ خواتین پر ان کی ملازمت کے باعث ان کا کردار خواہ مخواہ مشکوک نہ بنایا جائے۔ گھروں میں ان کو ”دماغ خراب ہونے اور آگے سے لیکچر دینے“ کے طعنے نہ دیئے جائیں۔ بلکہ ان کی ذہری محنت کی قدر کی جائے۔ جائے ملازمت پر بھی ان کی عزت و تحفظ کو محفوظ بنایا جائے۔ پہلے سے ہونے والی قانون سازی پر موثر اقدامات کیے جائیں۔
 - 12۔ بیوہ یا مطلقہ ہونے کی صورت میں مناسب رشتوں کیلئے فضا ہموار کی جائے۔
 - 13۔ بہنوں کو والدین کی جائیداد میں سے لازماً وراثت دی جائے۔ اور جو نہ دیں ان سے جائیداد چھین کر دلائی جائے، ساتھ ایسے بھائیوں کو جرمانہ بھی کیا جائے۔
 - 14۔ عورت کے لیے کی گئی ہر قانون سازی میں عورتوں کو مردوں کے تعاون، محبت اور خلوص نیت کی از حد ضرورت ہے۔ اسی طرح، جہیز، بری، بارات کے بے تحاشا اخراجات پر بھی پابندی لگائی جائے۔
- جس معاشرے نے اس راز کو نہ سمجھا کہ مرد و عورت دونوں ہی معاشرے کے معمار ہیں۔ وہ معاشرہ جلد ہی انتشار اور تباہی سے دوچار ہو جائے گا۔

15۔ اگر مساجد میں نماز جمعہ پڑھانے والے خطیبوں کے مواد کی چیکنگ ہو سکتی ہے تاکہ مذہبی منافرت کو ہوا نہ ملے۔ تو پھر ”عورت مارچ“ میں بھارت سے اور دیگر مقامات سے آنے والی این۔ جی۔ اوز کے ڈراموں اور ان کے پلے کارڈز کی آخر چیکنگ کیوں نہیں ہو سکتی؟ ان کے شناختی کارڈز کیوں نہیں ان سے لے لیے جاتے، ان کے ٹکٹ اور بیرون ملک واپسی کینسل کر کے ان سے پوچھ گچھ کیوں نہیں کی جاتی؟ کیا پاکستان بیرونی قوتوں کے لیے کھلا اکھاڑا ہے۔ جہاں یہ غیر ملکی آکر جس طرح چاہیں، اودھم مچائیں اور کوئی ان کو چیک کرنے والا ہی نہ ہو؟ [۱]

[۱] اصلاح احوال کے لیے مزید تجاویز باب نمبر 21 کے آخر میں دی گئی ہیں، وہاں دیکھ لی جائیں۔

اے جان! اگر تم ساتھ نہ دو

از نعیم صدیقی مرحوم

تو تنہا مجھ سے کیا ہوگا؟
تہذیب بھی ویسی بنتی ہے
وہ کیسی نسلیں جنتی ہے
وہ کیا اخلاق سکھاتی ہے
بچے کو دودھ پلاتی ہے
وہ میٹھی لوری گاتی ہے
یہ تم ہی تو تھیں! کیا بھول گئیں
گودی میں سپاہی پال دیئے
تم نے ہی تو پرزے ڈھال دیئے
تو تم نے اپنے لال دیئے
منڈی میں لا کر ڈال دیئے
افسوس کہ تم نے ٹال دیئے
اتنی ہی تو ذمہ دار ہو تم
کیا ساتھ میرے تیار ہو تم
تو تنہا مجھ سے کیا ہوگا؟

اے جان! اگر تم ساتھ نہ دو
انسان بناؤ تم جیسے
تہذیب ہے عورت کے بس میں
وہ کیسے مرد بناتی ہے
کیا جذبے! گھول کے وہ
کس کیفیت کی مستی میں
گر رنج نہ ہو تو صاف کہوں
خود تم نے نظامِ باطل کو
بیداد کی کل یہاں کیسے چلی؟
ابلیس نے مانگے کارندے
تم نے تو کلیجوں کے ٹکڑے
تم سے جو تقاضے دین کے تھے
ہے مرد کے ذمے جتنی خطا
اب میں کفارہ دیتا ہوں
اے جان! اگر تم ساتھ نہ دو

(ایک لمبی مؤثر نظم کا چھوٹا سا اقتباس)

ضمیمہ

25

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

الصَّلَاةُ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

”اپنی نمازوں کی حفاظت کرو

اور اپنے لونڈی غلاموں کا خیال رکھو۔“

(مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ)

اسلام اور ملکِ یمین

- غلامی کا رواج
- اسلام میں قیدیوں سے حسن سلوک
- خواتین قیدی
- قبل از اسلام لونڈی کی حالت زار
- اسلام کی مغرب پر برتری
- مغربی تہذیب کو ملکِ یمن پر اعتراض کیوں ہے؟

اسلام اور ملکِ یمین

گزشتہ ابواب میں خواتین کے تمام مسائل جدید تحریک نسواں کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں۔ البتہ ایک ایسا مسئلہ رہ گیا ہے جس کا براہ راست جدید نسوانی تحریک سے تعلق نہیں مگر مستشرقین اور خود مغرب زدہ مسلمانوں نے اس پر بڑی شد و مد سے اعتراض اٹھائے ہیں کہ اسلام تو عورتوں کے حقوق کا محافظ ہے۔ اس نے چودہ صدی پیشتر عورت کو آزادی اور مساوات کے حقوق سے آشنا کیا۔ پھر اس نے ملکِ یمین سے بلا نکاح تمتع کی اجازت دے کر عورت کے استحصال کا دروازہ کیوں کھلا رکھا؟ اس طرح اس نے عورت کی غلامی کو برقرار رکھنے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

اس طرح ملکِ یمین کے مسئلے پر یورپی مستشرقین کی غیر منصفانہ تنقید اور خود مسلمانوں کی افراط و تفریط نے معاملہ اور بھی الجھا دیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس مسئلے پر اسلام کے صحیح موقف کو واضح کیا جائے۔

غلامی کا رواج:

اس سلسلے میں قابل غور امر یہ ہے کہ اسلام نے دنیا میں لونڈی غلاموں کا نظام متعارف نہیں کرایا۔ اس کا وجود تو زمانہ قدیم سے تمام قوموں اور تہذیبوں میں چلا آیا ہے اور یہ غلامی اس وقت کے معاشی و معاشرتی نظام کا ناگزیر حصہ بن چکی تھی۔ روم، ایران، ہندوستان غرض ہر جگہ غلاموں کی منڈیاں لگتی تھیں اور وہ حیوانوں کی طرح خریدے اور بیچے جاتے تھے۔ ان کی کمر گراں بارزہ داریوں اور مظالم سے جھکی ہوئی تھی، مگر ان کا کوئی حق نہ تھا۔ اسلام نے تاریخِ عالم

میں پہلی بار غلاموں کے حق میں آواز بلند کی اور غلاموں کی آزادی کے لیے ایک ایسی جاندار تحریک برپا کی جس کی مثال بعد کی بارہ صدیوں تک کہیں نہیں ملتی۔ اسلام نے قانوناً غلامی کی ہر شکل کو ختم کر دیا، سوائے ایک استثناء کے، اور وہ تھا، جنگی قیدیوں کا مسئلہ۔ میدانِ جنگ میں فاتح قوم یا قبیلہ اپنے مفتوح قوم کے تمام افراد کو یا تو تہ تیغ کر دیتا یا پھر ان کو لونڈی غلام بنالیتا۔ جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنالینا ایک ٹھوس روایت بن چکی تھی۔ ان حالات میں اسلام کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک طرفہ طور پر دشمن کے تمام قیدی رہا کر دے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ مصلحت سے بعید ہوتا اور دشمن کو مزید شہ ملتی۔ وہ کسی جوابی ردِ عمل کے خدشے سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں کے قیدیوں کو سنگین مظالم اور انتقامی کارروائیوں کا تختہ مشق بناتے۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کی یہ روایت اس وقت تک ختم نہ ہو سکتی تھی جب تک دیگر اقوام اس سلسلے میں مل کر ایک مشترکہ لائحہ عمل نہ طے کر لیں۔

دورِ جدید میں بین الاقوامی طور پر جنگی قیدیوں کے باہمی تبادلہ کا اصول رائج ہو گیا ہے، تو اب غلامی کا خاتمہ کرنا ممکن ہو گیا ہے۔

اسلام میں قیدیوں سے حسن سلوک:

- 1- اگرچہ اسلام نے اس وقت کے مخصوص حالات کے پیش نظر غلامی کو ختم تو نہیں کیا تھا، مگر اس نے غلاموں کے ساتھ ہر ممکن حد تک حسن سلوک کیا اور غلامی کو ختم کرنے کی ہر ممکن تدبیر کی۔ اس نے معاشرے میں غلاموں کو باعزت مقام دلایا اور بَغْضُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ (45) ”یعنی تم سب ایک ہی گروہ کے لوگ ہو“ فرما کر غلاموں کو آزاد انسانوں کے برابر لا کھڑا کیا۔
- 2- یاد رہے کہ صرف انہی قیدیوں کو لونڈی غلام بنایا جاتا جو لا وارث ہوتے اور کوئی ان کو واپس لے جانے والا ہی نہ ہوتا۔ اگر ان قیدیوں کو ان کے وارث زرفدیہ دے کر یا بطور احسان واپسی کا مطالبہ کرتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔
- 3- چونکہ اس دور میں حکومت کے لیے ان قیدیوں کو الگ جیلوں یا کیمپوں میں رکھنے کا بندوبست کرنا دشوار تھا، اس لیے سہولت کی خاطر قیدیوں کو فوج ہی کے افراد میں تقسیم کر دیا جاتا۔

قیدی چونکہ اس نئے ملک میں بالکل اجنبی اور نووارد ہوتا اس لیے اپنے مالک کے خاندان کے ایک جز (غلام) کی حیثیت سے اپنے مالک کے ساتھ مستقل طور پر وابستہ رہتا۔ مالک کو بھی اس سے ہر خدمت لینے کا اختیار حاصل تھا۔ مگر ساتھ اس کے قیام، طعام، لباس اور آرام غرض ہر ضرورت کا ممکن حد تک خیال رکھنا واجب تھا۔

4۔ چونکہ یہ لونڈی غلام فوجیوں کو ان کی فوجی خدمات کے عوض ملتے تھے، اس لیے انہیں یہ حق حاصل تھا کہ چاہے تو انہیں اپنے پاس رکھیں اور چاہیں تو کچھ معاوضہ لے کر انہیں آگے فروخت کر دیں۔ مگر یہ تاکید کی کہ اگر اپنے پاس رکھیں تو ان سے بالکل بھائیوں والا سلوک کریں۔

غلاموں سے حسن سلوک کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف ارشادات

ملاحظہ کریں:

☆ حضرت علیؓ ابن ابی طالب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے آخری وقت جو بات نکلی وہ تھی۔

الصَّلَاةُ. الصَّلَاةُ. وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ [۱]

نماز۔ نماز کا خیال رکھو اور جو تمہارے لونڈی غلام ہیں ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

اسی مفہوم کی ایک اور حدیث مسند احمد اور نسائی نے بھی بیان کی ہے۔

☆ آپ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا: تمہارے غلام، تمہارے غلام، تمہارے غلام۔ ان کو ویسا کھلاؤ، جیسا خود کھاتے ہو، اور اسی طرح کا پہناؤ جس طرح کا خود پہنتے ہو۔ اور اگر وہ ایسا گناہ کریں کہ تم ان کو معاف نہیں کرنا چاہتے تو پھر اللہ کے ان بندوں کو

بیچ دو۔ مگر ان کو سزا نہ دو۔ [۲]

☆ ہر روز ستر مرتبہ ان سے درگزر کرو۔ [۳]

[۱] ابوداؤد 5156، ابن ماجہ 2698 اور 2696

[۲] الصحیحۃ للابانی 740، احمد، طبرانی

[۳] الصحیحۃ: 488، ابوداؤد۔ ترمذی۔ احمد

☆ صحیح بخاری میں ارشاد ہوتا ہے: ”تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ سو جس کے تحت اس کا بھائی ہو اس کو ویسا ہی کھلائے جیسا وہ خود کھاتا ہے۔ ویسا پہنائے، جیسا خود پہنتا ہے۔ ان کو ایسے کام کرنے کا نہ کہو، جو ان کے لیے دشوار ہوں۔ اگر تم ان کو ایسا کام کرنے کے لیے کہتے ہو تو پھر ان کی مدد بھی کرو۔ [۱]

☆ تمہیں اپنے کمزور و ضعیف لوگوں کے سبب نصرتِ الہی مہیا کی جاتی ہے اور انہی کی وجہ سے رزق مہیا کیا جاتا ہے۔ [۲] لہذا ان سے حسن سلوک کیا کرو۔

5- اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے لونڈی غلاموں کو آزاد کرنے کی بہت سی ترغیبات دیں۔ مثلاً مختلف گناہوں کے کفارے میں لونڈی غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مصارفِ زکوٰۃ میں غلاموں کی آزادی کو ایک مستقل مدّ قرار دیا۔ پھر غلاموں کو آسان شرائط پر اپنی آزادی خریدنے کا حق دیا جس کا شرعی نام ”مکاتبت“ ہے۔ مسلمانوں کے بیت المال کو بھی مکاتبت کرنے والے غلاموں کی مدد کرنے کا حکم دیا۔ علاوہ ازیں آپؐ نے غلاموں کی نفسیات کو بدلا۔ ان میں آزادی کی تڑپ اور امنگ پیدا کی۔ ان سے آزاد لوگوں نے رشتے ناطے کیے۔ ایک غلام کی جان کو آزاد انسان کے برابر قرار دیا گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کی آزادی کی جو مہم برپا کی تھی۔ اس کے تحت سب اصحاب بڑھ چڑھ کر اس نیکی میں اپنا حصہ ڈالنے کے آرزو مند تھے چنانچہ

خود نبیؐ پاک نے آزاد کیے	63 غلام
حضرت عائشہؓ نے آزاد کیے	67 غلام
حضرت عباسؓ نے آزاد کیے	70 غلام
حضرت عثمانؓ نے صرف دورانِ محاصرہ آزاد کیے	20 غلام
حضرت حکیمؓ بن حزام نے آزاد کیے	100 غلام

[۱] صحیح بخاری: 2545

[۲] صحیح بخاری: 2896

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آزاد کیے	1000 غلام
ذوالکلاع حمیری نے آزاد کیے	8000 غلام
حضرت عبدالرحمن بن عوف نے آزاد کیے	30000 غلام [۱]

خواتین قیدی:

اگر یہ غلام عورت (لونڈی) ہوتی تو اس کے مالک کو اس سے ہم بستری کا بھی حق حاصل تھا۔ قابل غور امر یہ ہے کہ اس اجازت کے بغیر لونڈی کو مرد کے ماتحت کر دینے کا نتیجہ بھی تو وہی برآمد ہوتا جس کی جھلک عموماً مرد افسروں کے ماتحت ملازم خواتین کی صورت میں نظر آتی رہتی ہے۔ دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ جو عورتیں اس طرح قیدی بنیں خواہ ان کے شوہر دارالحرب میں موجود ہوں، ان کے قیدی بننے سے ہی ان کے سابقہ نکاح ٹوٹ گئے۔ اب ایسی عورتوں سے ان کے نئے مالکوں کو تمسُّع (یعنی فائدہ اٹھانا) کا حق حاصل ہے۔ اگر مالک اس غلام عورت کی حسن تربیت کرے اور پڑھائے لکھائے، پھر آزاد کر کے اس سے باضابطہ نکاح کر لے تو پھر اس کو دوسرا اجر ملے گا۔ ایک اس کی حسن تربیت کرنے اور اس کو پڑھانے لکھانے کا اور دوسرا اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرنے کا۔ [۲]

ہاں اگر دونوں میاں بیوی ایک ساتھ گرفتار ہوں تو پھر ان کے سابقہ نکاح باقی رہتے ہیں یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا فتویٰ یہ ہے کہ نکاح باقی رہے گا جبکہ امام شافعی و امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ ان کا سابقہ نکاح باقی نہیں رہے گا۔ لونڈیوں سے تمتع کے مسئلے میں چونکہ بہت سی غلط فہمیاں عوام الناس میں پائی جاتی ہیں، لہذا ان امور کو واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

1- جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں ان کو پکڑنے پر ہی ہر سپاہی ان سے تمتع کرنے کا مجاز

[۱] صحیح بخاری: 2518، کتاب العتق صحیح مسلم، ابن ماجہ، مسند احمد

تفہیم القرآن، ج 3، سورۃ النور حاشیہ نمبر 54

[۲] بخاری و مسلم

نہیں ہے بلکہ وہ سب خواتین حکومت کی تحویل میں ہیں اور حکومت ہی ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ چاہے ان کو ویسے ہی رہا کر دے اور چاہے فدیہ لے کر رہا کرے، چاہے تو اپنے مسلمان قیدیوں کے تبادلے میں واپس کر دے اور چاہے تو اپنی فوج میں ہی تقسیم کر دے۔

2- ایک سپاہی صرف اسی عورت سے تمتع کرنے کا مجاز ہے جو باضابطہ اس کو حکومت کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ حاکم کی طرف سے باضابطہ دیا جانے کا نکاح کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ اب وہ اس کی تمام ذمہ داریوں کا ضامن ہے۔

3- جو عورت اس طرح کسی فوجی کی ملک میں آگئی ہے، وہ اسی وقت اس سے مباشرت نہیں کر سکتا۔ جب تک اس کو ماہواری نہ آجائے اور یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ حاملہ تو نہیں ہے۔ اس سے پہلے مباشرت کرنا حرام ہے اور اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل تک اس سے تمتع ناجائز ہے۔

4- جو عورت جس شخص کو دی گئی، صرف وہی شخص اس سے تمتع کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے شخص کو اس سے جنسی تعلق رکھنا حرام ہے۔ اس عورت سے اس شخص کی اولاد جائز اولاد ہوگی۔ اس اولاد کے قانونی حقوق وہی ہوں گے جو شریعت میں صلیبی اولاد کے لیے مقرر ہیں۔ صاحب اولاد ہونے والی لونڈی کو ”ام الولد“ کہا جاتا ہے۔ ام الولد کو فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسلام کی طرف سے اپنے مالک کے فوت ہوتے ہی وہ خود بخود آزاد ہو جائے گی۔

5- لونڈی کی اگر اولاد نہ بھی ہو تب بھی باپ کی مدخولہ لونڈی اولاد کے لیے اسی طرح حرام ہے جس طرح اپنے باپ کی منکوحہ بیوی۔ اسی طرح دو سگی بہنیں بھی بطور لونڈی کے ایک شخص کے پاس نہیں رہ سکتیں۔

6- جو عورت اس طرح کسی کی ملک میں آتی ہو، اگر اسے اس کا مالک کسی دوسرے شخص کے نکاح میں دے دے تو پھر مالک کو اس سے عام خدمت لینے کا حق تو حاصل رہتا ہے مگر اس سے جنسی تعلق رکھنا حرام اور ممنوع ہوگا اور مالک اس لونڈی کا ولی شمار ہوتا ہے، لیکن نکاح کے لیے خود لونڈی کی رضا مندی ضروری ہے۔ اسی طرح وہ مہر کی بھی حقدار ہوگی۔ اس کا مہر آزاد عورت کے مقابلے میں آدھا ہوتا ہے۔

7- جس طرح شریعت نے بیویوں کی تعداد کو چار تک محدود کر دیا ہے، اسی طرح کی کوئی پابندی لونڈیوں پر نہیں لگائی گئی۔ اس معاملہ میں کوئی حد مقرر نہ کرنے سے شریعت کا منشا یہ نہیں ہے کہ امیر لوگ بے شمار لونڈیاں خرید خرید کر اپنے گھروں کو عیاشی کے اڈے بنالیں بلکہ اس عدم تعین کی اصل وجہ جنگی حالات کا عدم تعین ہے۔ اگر دولت مند لوگ اپنی عیاشی اور فحاشی کی خاطر ایسا کریں تو اسلام کی روح اور منشا کے خلاف ہے۔ اسلام تو غلامی کو ختم کرنا چاہتا ہے نہ کہ نت نئے طریقوں سے اس کو بحال رکھنا۔ لہذا ایسا کرنے والے لوگ مجرم ہیں۔

8- حکومت کی طرف سے حقوق ملکیت کا باقاعدہ عطا کیا جانا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جس طرح نکاح ایک قانونی فعل ہے۔ جب آدمی نکاح کے بعد جنسی فعل میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتا بالکل اسی طرح ملکِ یمین سے بھی تمتع کرنے میں خواہ مخواہ کی کراہت محسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

9- حکومت ایک بار کسی کو اسیرانِ جنگ قرار دے کر واپس لینے کی مجاز نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی عورت کا ولی اس کو کسی کے نکاح میں دے کر واپس لینے کا حقدار نہیں رہتا۔

10- اگر کوئی فوجی کمانڈر محض وقتی اور عارضی طور پر اپنے سپاہیوں کو قیدی عورتوں سے اپنی شہوانی خواہشات پوری کرنے کی اجازت دے دے اور کچھ وقت کے لیے انہیں فوج میں تقسیم کر دے تو یہ اسلامی قانون کی رو سے قطعاً ایک ناجائز فعل ہے۔ اس میں اور زنا میں کوئی فرق نہیں اور اسلامی قانون میں زنا حرام ہے۔

11- لونڈی کی جنسی خواہش پوری ہونی چاہیے، چاہے مالک اس سے خود تعلق رکھے یا اس کا آگے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر دے۔ یہ بات اس لیے ضروری ہے کہ ممکن ہے کہ مرد کی اپنی بیوی بھی ہو یا کوئی اور ملکِ یمین ہو، جہاں وہ اپنی خواہش پوری کر لیتا ہو۔ مگر اس صورت میں یہ عورت اپنے جنسی داعیات کو کیسے پورا کرے؟ لہذا اس کا کسی اور جگہ نکاح کرنے کا حکم ہے۔ اگر یہ دونوں بند و بست نہ ہو سکیں تو اس کا مطلب ہے کہ عورت کو خود حرام کاری کی راہ دکھائی جا رہی ہے۔ اس لیے ملکِ یمین سے خود تمتع کرنا یا اس کا دوسری جگہ نکاح کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

12- اس (مالک کے تمتع یا نکاح) کے باوجود اگر لونڈی زنا کی مرتکب ہو تو اسے بھی سزا دی جائے گی، جو آزاد عورت کی سزا کا نصف ہوگی یعنی صرف پچاس کوڑے (النساء: 25) کیونکہ نکاح ہونے پر اسے شوہر کی جو حفاظت حاصل ہوئی ہے وہ ادھوری ہے۔ چونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی وہ اپنے مالک کی ملک سے آزاد نہیں ہوئی اور نہ اسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہے جو خاندانی عورت کو حاصل ہے، لہذا اس کی سزا بھی آزاد خاندانی عورت کی سزا سے آدھی یعنی پچاس کوڑے ہوگی۔

13- بہر صورت لونڈی کو منکوحہ بیوی جیسے حقوق و مراعات حاصل نہیں ہو سکتے۔ جنگی قیدیوں کو فاتحین جیسے پورے شہری حقوق و مراعات نہ آج تک کبھی دیئے گئے ہیں نہ کبھی دیئے جاسکتے ہیں۔ اسی لیے لونڈی سے تمتع کے باوجود وہ قابل فروخت ہے اور اگر اس کا نکاح ہو جائے تو زنا کے ارتکاب کی شکل میں اس کی سزا آزاد عورت کی سزا سے نصف ہے۔

قبل از اسلام لونڈی کی حالت زار:

اسلام نے لونڈیوں پر کتنے احسان کیے اور ان پر کس طرح رحمت و برکت کے دروازے کھول دیئے؟ یہ معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قبل از اسلام قیدی خواتین کی حالت زار کا مطالعہ کیا جائے۔ قیدی عورتوں کو بھی اس دور میں ان تمام مظالم اور مصائب کا نشانہ بنایا جاتا تھا جو اس دور میں غلاموں کے لیے مقرر سمجھی جاتی تھیں۔ اس پر مزید یہ کہ ان کا دامن نسوانیت بار بار تارتا رہتا تھا۔ قیدی عورتوں کی عصمت ریزی میں فاتحین کو کوئی باک نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو باپ بیٹے اور بہت سے دوست احباب مل کر ایک ہی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے اور وہ ان کی مشترکہ داشتہ قرار پاتی تھی۔ اس پر بھی صبر نہیں آتا تھا تو ان سے طوائف اور کسی کا کاروبار کر داتے، اس طرح وہ لونڈیوں کے ذریعہ کمائی کرتے تھے۔ دور کیوں جائیں! زمانہ حال کے تہذیب یافتہ دور کو بھی دیکھ لیں، عراق میں، افغانستان میں اور گوانتانامو بے کے جزیرے میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ حال ہی میں سربیا نے بوسنیا پر 1992ء میں جو حملہ کیا تو اس دوران بے شمار بوسنیائی خواتین سربی دروندوں کی ہوس اور درندگی کا نشانہ بنیں اور کثیر بوسنیائی بچوں کو جنم دینے پر

مجبور کر دی گئیں۔ 1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں کے بعد جب پاکستانی خواتین بھارت کی قید سے آزاد ہو کر واپس آئیں تو انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں کسی کے بازو شکستہ تھے تو کسی کی ٹانگیں نہیں تھیں اور ہر عورت کے پاس ایک دو بچے ضرور تھے۔

اسلام کی مغرب پر برتری:

مگر اسلام کو یہ برتری اور فضیلت حاصل ہے کہ وہ غلامی اور قید کی حالت میں بھی عورتوں کی نسوانیت کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ کسی مسلمان فوجی کو انہیں بے آبرو کرنے یا مال غنیمت کا جز سمجھتے ہوئے ان پر قابض ہونے کی اجازت نہیں، نہ ہی وہ قوم کی مشترکہ ملکیت قرار پاتی ہیں۔ اس کے برعکس صرف اور صرف اپنے مالکوں کے لیے مخصوص ہیں۔ ان کے مالک ان کی کفالت کے ذمہ دار ہیں اور کسی غیر کے لیے ان سے جنسی تعلقات جائز نہیں رہے۔ پھر ”ام ولد“ کو اپنے مالک کی موت کے بعد آزاد قرار دیا گیا، مکاتبت کے ذریعہ ان کے لیے آزادی کی راہیں کھول دی گئیں۔ کیا یہ قیدی عورتوں کے ساتھ اسلام کے فیاضانہ اور کریمانہ برتاؤ کا ثبوت نہیں ہے۔ کیا اسلام ملکِ یمین کے حق میں دینِ رحمت ثابت نہیں ہوا کہ وہ ان کو کسی معاشی یا جنسی مجبوری اور اضطراب کی بنا پر غلط کاری اور بے راہ روی کا شکار ہونے سے نہ صرف بچاتا ہے بلکہ اپنے مالک کے تحفظ میں اس کو صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔

مغربی تہذیب کو ملکِ یمین پر اعتراض کیوں ہے؟

جدید مغربی معاشرت میں لذت پرستی اور عیاشی کی خوگر سوسائٹی گریز جس ”آزادی“ اور بے باکی سے اپنے جسموں کو دوسروں کے حوالے کرتی نظر آتی ہیں کیا اسی کا نام ”آزادی“ ہے؟ یہ تو غلامی کی وہ بدترین قسم ہے جس میں غلام برضا و رغبت غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ جدید یورپ کے ہاں یہ آزادانہ صنفی اختلاط ہی ترقی کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ وہ بدکاری کو جرم یا گناہ سمجھتا ہی نہیں، اسی لیے چودہ صدی پیشتر اسلام کے لونڈیوں کے متعلق طرزِ عمل کی آڑ لے کر اس پر زبانِ طعن و تشنیع دراز کرتا ہے۔ وہ یہ بات فراموش کر جاتے ہیں کہ ملکِ یمین کے متعلق اسلام کا طرزِ عمل بھی مسئلے کا عارضی حل تھا کہ (جب تک دنیا غلاموں کے متعلق کوئی مشترکہ

لائحہ عمل اختیار نہیں کر لیتی اس وقت تک معاملہ ایسے ہی رہے گا۔ اور جوں ہی دنیا والے جنگی قیدیوں کے بارے میں کوئی بین الاقوامی ضابطہ اختیار کر لیں گے تو مسلمان بھی اسی کے مطابق عمل کریں گے) اور یہ عارضی حل بھی ان کی بیسویں صدی کی تہذیب سے کہیں زیادہ پاکیزہ، فطری، اکمل اور اعلیٰ ہے۔

بدقسمتی سے کچھ مسلمان امراء و حکام نے اسلام کے بہت سے دیگر احکام کی طرح لونڈی غلاموں کے متعلق اسلام کی روح کو فراموش کر دیا اور دوسرے ممالک سے بچے پکڑ کر ان امراء کے ہاں بیچے جانے لگے اور انہوں نے یہ کہہ کر شغل جاری رکھا کہ انہوں نے باقاعدہ قیمت دے کر خریدے ہیں، لہذا ان لونڈیوں سے تمتع جائز ہے۔ مگر ان مسلمان امراء اور حکام کا یہ طرز عمل اور لونڈیوں کے ساتھ عیاشی و فحاشی کسی طرح بھی منشاء اسلام نہ تھی، لہذا یہ ان کا ذاتی گناہ ہے، جس کا اسلام پر کوئی الزام نہیں بنتا، لہذا اسلام پر اعتراض نہیں۔ وہ اپنے طرز عمل کے خود ذمہ دار ہیں نہ کہ اسلام۔

حرف آخر:

مسئلہ کوئی بھی ہو! مرد کا، عورت کا، بچوں کا، قیدی و لونڈی غلام کا، اسے صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ اس لیے ہم سب مرد، عورتوں اور بچوں کا اولین فرض یہی ہے کہ مل جل کر صحیح اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کوشش کریں اور اپنی زندگیاں بھی اسلام کے مطابق ڈھالیں۔ یہ کام جب ہم کر لیں گے تو عملی دنیا میں بھی اپنے عقائد و نظریات کو غالب کر سکیں گے، زندگی میں توازن اور اعتدال پیدا کرنے کا یہی راستہ ہے۔ جو ہر قسم کی بے انصافی، ظلم و استبداد اور جور و ستم سے پاک ہے۔

کتابیات

- 1- قرآن پاک
- 2- کتب احادیث: صحاح ستہ، مشکوٰۃ المصابیح، کنز العمال
- 3- پردہ از مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ
- 4- اسلام کا نظام عفت و عصمت مولانا ظہیر الدین
- 5- عورت معرض کشمکش میں نعیم صدیقی
- 6- اسلام میں عورت کے حقوق جلال الدین عمری
- 7- اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام امین احسن اصلاحی
- 8- ”قوتیں“ از: ”زندگی بے بندگی، شرمندگی“ (دسواں حصہ) بنت الاسلام
- 9- اسلام اور مساوات مرد و زن محمد رفیق چودھری
- 10- اسلام اور جدید ذہن کے شبہات سید محمد قطب، (اردو ترجمہ): محمد سلیم کہانی
- 11- گھر سے مفروض کیوں کے عشق بازانہ نکاح نعیم صدیقی
- 12- فقہ حضرت عمرؓ ڈاکٹر محمد رواں قلعہ جی،
- 13- جدید فقہی مسائل (اردو ترجمہ): ساجد الرحمن صدیقی
- 14- عورت کی نصف دیت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
- 15- مقالات سیرت کا نفرنس فہیم عثمانی
- 16- عورت کی سربراہی آپاٹارفاطمہ زہرا
- 17- عورت کی سربراہی کا مسئلہ مولانا گوہر الرحمن
- 18- تذکار صحابیات حافظ صلاح الدین یوسف
- طالب ہاشمی

- 19- تیسیر القرآن، ج ۱ عبد الرحمن کیلانی مرحوم
- 20- 400 باکمال خواتین طالب ہاشمی
- 21- راہِ حق کے مسافر یوسف اصلاحی
- 22- چٹانیں مائل خیر آبادی
- 23- ہم کیوں مسلمان ہوئے؟ عبدالغنی فاروق
- 24- عورت کی نفسیات ایم۔ اے۔ ملک
- 25- اسلام میں عورت کی حکمرانی جائز نہیں فضل الرحمن بن محمد
- 26- عورت اپنی جنت میں سید نظر زیدی
- 27- اسلامی ریاست میں نظام تعلیم مسلم سجاد
- 28- عورتوں پر مظالم و معاشرتی جرائم اور ان کا حل محمد اسحق بھٹی
- 29- مترادفات القرآن عبد الرحمان کیلانی (مرحوم)
- 30- ”خواتین میگزین“ کا حجاب نمبر
- 31- عورت اسلامی حکومت کی سربراہ نہیں ہو سکتی مولانا فضل الرحمان (2 قسطیں)
- 15 مئی اور 22 مئی 1992ء، ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور
- 32- ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ جون و جولائی 1984ء
- 33- ہفت روزہ ”الاعتصام“ قانون قصاص و دیت نمبر 21 دسمبر 1990ء
- 34- مختلف روزنامے ”نوائے وقت“ ہفت روزہ ”ندائے ملت“ ماہنامہ محدث“ وغیرہ
- 35- ماہنامہ ”الحسنات“ مئی 1997ء

تبصرے

1۔ ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ:

(پروفیسر امریطس، شعبہ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور، سابقہ ڈین کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ اور پینل لرنگ)

”آزادی نسواں اور اسلام“ کے موضوع پر اہل علم کی کاوشیں موجود ہیں لیکن عموماً یہ تحریریں عورت سے متعلق کسی خاص مسئلہ اور پہلو پر محیط ہیں۔ موضوع کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ کوئی صائب فکر و فہم صاحب علم اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا مدلل اور جامع تجزیہ کرے۔ ثریا بتول علوی صاحبہ کا نام دین کا ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے نیا نہیں۔ انہوں نے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر، اس کے مختلف پہلوؤں پر ایک جامع اور مدلل علمی کاوش پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔

سیکولر اور لبرل حلقے عورت کے حقوق و فرائض کے حوالے سے اسلام پر معترض ہیں۔ مغرب نے بھی اسلام کے جن پہلوؤں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہوا ہے ان میں نمایاں عورت کے حدود کار، معاشی حالت، شہادت، دیت، وراثت، ملازمت کا مسئلہ، معاش و معاشرتی زندگی میں آزادانہ رول، مسئلہ حجاب، حکومت کی سربراہی وغیرہ ہیں۔ مغرب اور مسلمان معاشروں میں مغرب زدہ طبقے اسلامی قانون میں عورت کے متعین کردہ حقوق کو عورت کے ساتھ نا انصافی اور ظلم سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسلام نے ایک معتدل اور متوازن نظام انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق عطا کیا۔ اس نظام کی تفصیلات قرآن حکیم، حدیث اور کتب فقہ میں مل جاتی ہیں جو بعض صورتوں میں فقہی تعبیرات میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے جو ایک فطری امر ہے۔

مؤلفہ نے اس کتاب میں آزادی نسواں کے حوالے سے متجددین اور اسلام دونوں پہلوؤں سے گفتگو کی ہے۔ اسلام کی ہدایات کی روشنی میں عورتوں سے متعلق وہ تمام پہلو جو قابل اعتراض قرار دیے گئے ہیں یا ہو سکتے ہیں ان کو زیر بحث لایا گیا ہے اور معترضین کے اعتراضات کا مدلل جائزہ لیا گیا ہے۔

دیت، شہادت، وراثت، ولایت ایسے دقیق پہلوؤں پر علمی محاکمہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ مؤلفہ کی اسلام کے بنیادی قانونی مصادر تک نہ صرف رسائی ہے بلکہ انہوں نے موجودہ حالات پر ان کو عملدگی کے ساتھ منطبق بھی کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں بعض اہم خواتین کے اسلام کے بارے میں تاثرات کو شامل کیا گیا ہے جس سے عورت کو اسلام کے عطا کردہ حقوق و فرائض کی افادیت مبرہن ہو گئی ہے۔

کتاب مجموعی طور پر اسلامی نقطہ نظر سے ایک متوازن فریم ورک میں لکھی گئی ہے۔ زباں رواں اور آسان ہے۔ مواد حتی الامکان مستند حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ اللہ کریم مولفہ کی اس کوشش کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اللہ کرے یہ کتاب مسلمان خواتین کو دوست و دشمن میں تمیز کرنے کا باعث بنے۔

2۔ مسلم سجاد:

اقوام متحدہ نے اپنی یکے بعد دیگرے کانفرنسوں کے ذریعے عالمی تحریک نسواں کو جو ہمیز دی ہے اس کی وجہ سے خواتین کے مسائل معاشرے کے اہم اور سرفہرست مسائل بن گئے ہیں۔ ان کانفرنسوں کی اس افادیت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ انہوں نے معاشرے کے ان مسائل کی طرف توجہ دلائی جو عدم توجہ کا شکار تھے۔ لیکن انسانیت کی بد نصیبی یہ ہے کہ یہ عالمی دانشور، خواتین و حضرات، جب ان مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں تو گمراہی کی وادیوں میں بھٹکنے لگتے ہیں، لیکن پُر زور مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ ساری انسانیت ان کے پیچھے پیچھے چلے۔

اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر مرد و عورت کو زندگی گزارنے کے لیے بھیجا تو زندگی گزارنے کے آداب بھی ساتھ ہی سکھائے۔ نفس انسانی کی کمزوریوں اور پیچیدگیوں سے خالق کائنات سے زیادہ واقف کون ہو سکتا ہے۔ اس نے مرد و عورت دونوں کو ان کے حقوق و فرائض بتائے، جن پر عمل ہو تو زندگیاں سکون سے گھری رہیں، رسولؐ نے اس باب میں واضح تعلیمات دیں اور خود اپنا اسوہ پیش کیا۔

جب سے مغربی تہذیب کو عروج ہوا ہے اور انسان نے اپنی عقل اور نفس کو اپنا الہ مانا ہے، سب کچھ الٹ پلٹ گیا ہے۔ زندگیاں مصائب و آکام کا شکار ہیں، لیکن آنکھ نہیں کھلتی!

لیکن جادو وہ جو سرچوہ کر بولے، خود مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مغرب کی چکا چوند پر فریفتہ ہیں۔ اچھی بھلی مسلمان خواتین نام نہاد آزادی پر سمجھ کر اپنے آپ کو بھلا بیٹھی ہیں۔ ہمارے ملک کے حکمران مغربی ایجنڈے کو بہ دل و جان پورا کر رہے ہیں۔

اس صورت حال میں، محترمہ ثریا بتول علوی صاحبہ نے اس گراں قدر تصنیف میں اسلام پر تہذیب جدید کے حملوں کا مؤثر جارحانہ دفاع پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی آشکارا کیا کہ مسلمان معاشروں میں مسلمان عورتیں رسوم و رواج کے باعث، اپنے کن اسلامی حقوق سے محروم ہیں۔

امید ہے کہ یہ کتاب اس حوالے سے بیداری پیدا کرے گی اور عورتوں کے اسلامی حقوق کی راہ کی رکاوٹیں دور ہوں گی۔

(اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے یہ پیش لفظ لکھا تھا)۔

3- ام عبدغیب:

محترمہ ثریا بتول علوی صاحبہ کا نام تدریسی اور تصنیفی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یوں تو انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھا ہے لیکن ایک عورت ہونے کی حیثیت سے خواتین کے مسائل، مشکلات اور حالات کا اسلامی نقطہ نظر سے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی زیر نظر کتاب بھی خواتین سے متعلق ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے عورت کو زندگی میں پیش آنے والے ہر معاشرتی رویے..... یا اس سے متعلق قانون اور ضابطے کا جائزہ لیا ہے..... عورت کے حقوق کی علمبردار نام نہاد تنظیموں کا پول کھول کر حقیقت واضح کی ہے..... دیہی آبادی سے لے کر اپوائی بیگمات تک کا احاطہ کیا ہے..... موصوفہ نے جا بجا اپنے موقف کی تائید میں قرآن و حدیث سے استدلال کیا ہے۔ یورپی حالات و واقعات کے نتائج اور ان پر ان کے دانشوروں کے تبصرے بھی پیش کیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب عورت کے تہذیبی سفر کا انسائیکلو پیڈیا بن گئی ہے۔

ہفت روزہ الاعتصام، مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۹۹ء، ماہنامہ بتول اگست ۱۹۹۹ء

4- فرزانه چیمہ:

محترمہ ثریا بتول علوی بھی نہ جانے کتنی دعائیں سمیٹ رہی ہوں گی کہ ان کی تازہ تصنیف "جدید تحریک نسواں اور اسلام" ایک قابل قدر شاہکار ہے۔ کتاب کا عنوان ہی اس قدر واضح اور اہم ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

۲۲ ابواب پر مشتمل یہ خوبصورت کتاب مصنفہ کے علم و آگہی اور غیرت ایمانی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ محترمہ نے کہیں بھی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کیا۔ کسی بھی اعتراض سے صرف نظر نہیں کیا۔ مغرب کے نظریہ مساوات مرد و زن سے لے کر ستر و حجاب، تعدد ازواج، طلاق و خلع، عورت کی نصف شہادت، نصف دیت، نصف وراثت اور عورت کی سربراہی سمیت تمام نازک سے نازک مسائل پر اس طرح رواں دواں انداز میں صداقت و حقیقت کے پھول کھلاتے ہیں کہ اگر تعصب کا زکام نہ ہوا ہو تو ان پھولوں کی مہک دل و جاں کو مہکا کر رہتی ہے اور قاری مصنفہ کا ہم خیال ہو کر رہتا ہے۔ مگر شرط صرف یہی ہے کہ دل اور آنکھیں اللہ نے اندھی نہ کر دی ہوں۔

"جدید تحریک نسواں اور اسلام" ایک کتاب ہی نہیں ایک دستاویز ہے اس زریں شہادت کی کہ اسلام ہی طبقہ نسواں کا اول و آخر محسن ہے۔ چند اولو العزم، با کمال اور جذبہ ایمانی سے سرشار خواتین کے ایمان افراد تیز کرے ان کی اس خوبصورت تصنیف کے ماتھے کا جھومر میں۔ اس کے ساتھ ساتھ چند نو مسلم مغربی خواتین کے اسلام کے بارے میں تاثر بھی ایک عمدہ اضافہ ہے۔

اس کتاب کو اول سے لے کر آخر تک پڑھنے کے بعد ہماری دیانتدارانہ رائے ہے کہ اسے ہر گھر، ہر لائبریری بلکہ ہر باشعور خاتون کے پاس ضرور ہونا چاہیے تاکہ اس کے مطالعہ کے بعد وہ بڑے اعتماد سے مغرب زدہ خواتین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلائل کے زور پہ انہیں لاجواب کر سکیں۔

محترمہ ثریا بتول علوی کا نام سنجیدہ علمی و ادبی حلقوں میں قطعاً نیا نہیں۔ اس سے پہلے بھی بے شمار مقالات اور ”اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ“ جیسی کتاب ان کی روانی قلم اور سوز نہاں کا نتیجہ ہیں۔ وہ ایک عالم باپ کی قابل فخر بیٹی اور بے شمار طالبات کی قابل تقلید استاد ہیں۔ اخلاص اور خیر خواہی کا جذبہ انہیں ہر دم مصروف و متحرک رکھے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں صحت و عافیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حنات سمیٹنے کی توفیق ملتی رہے اور ایسی گرانقدر کتابیں ان کے قلم سے رقم ہوتی رہیں تاکہ قارئین اور خاص کر خواتین ان کے افکار عالیہ سے اور ان کی تحقیق و تصنیف سے مستفید ہوتی رہیں اور اپنے قلب و روح کو منور کرتی رہیں۔

ماہنامہ بتول لاہور مارچ ۱۹۹۹ء، خواتین میگزین مارچ ۱۹۹۹ء

5- محترمہ عائشہ منور: (سابقہ قیہ حلقہ خواتین جماعت اسلامی پاکستان و ممبر قومی اسمبلی)

محترمہ ثریا بتول علوی صاحبہ نے ”جدید تحریک نسواں اور اسلام“ پر جو کتاب مرتب کی ہے، وہ ایک ایسی کاوش ہے جس کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ یہ کتاب عورت کی ضرورت تھی اور رہے گی۔ اس تحریر کی خوبی یہ ہے کہ اسلام نے عورت پر جو احسانات کیے ہیں، وہ ہر پہلو سے واضح کیے گئے ہیں۔ عورت کی شخصیت سے متعلق تمام مسائل پر مکمل آگہی دی گئی ہے اور اس کے مقابلے پر عورت کی آزادی جو درحقیقت اس کی بربادی ہے، کے بھی تمام پہلو نمایاں کیے گئے ہیں۔ عورت کو اس کے گھر، خاندان اور ہمدرد و مددگار معاشرے سے جدا کرنے کی ہر کوشش پر مفصل بات کی ہے اور جدید مغربی نظام اور مسلم معاشروں میں عورت کو آزاد اور خود مختار بنانے کے لیے مسلم حکومتوں کے غلط فیصلے، NGOs کی اسلام دشمن سرگرمیاں خصوصاً پاکستان کی مسلم عورت کو بغاوت پر آمادہ کرنے کے لیے NCSW کے فیصلے، CEDAW پر عملدرآمد کرانے کی انتھک اور ادارہ جاتی کوششیں اور اس کے نقصانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

میرے خیال میں اگر ہماری حکومتیں سنجیدہ ہوں، اور انہیں اپنی اس ذمہ داری کا احساس ہو کہ اللہ کے دربار میں وہ جواب دہ ہیں، تو نہ صرف وہ خود اس کتاب سے فائدہ اٹھائیں بلکہ اس کو تعلیمی نظام کا حصہ بنا کر مختلف جماعتوں کے کورس میں اس کو شامل کریں، تاکہ مسلم عورت و مرد اپنے فرائض منصبی سے بھی آگاہ ہوں اور معاشرے کو خوشحال رکھنا اور وہ نسل معاشرے کے حوالے کرنا، جس سے ایک پرسکون اور حقوق پہنچانے والا معاشرہ وجود میں آئے اور یہ ذمہ داری فیملی سطح پر پوری بھی کی جاسکے۔

ثریا بتول صاحبہ کی اس کاوش کو اللہ قبول فرمائے اور ان کی اس تحریر کے ذریعے عورت کے مسائل حل ہوں اور وہ اپنے غم و فکر سے نجات پاسکے، آمین۔

۶ مارچ ۲۰۱۵ء

6۔ افشاں نوید صاحبہ: (کالم نگار و محقق، مرکزی ڈائریکٹر جامعۃ المحسنات، پاکستان)

عہد حاضر میں ملت اسلامیہ کے احیاء اور اہل مغرب کے غلبہ و تہذیبی تسلط کے خاتمے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں مسلمان خواتین ان میں اہم رول ادا کر رہی ہیں۔ دوسری جانب استعمار کا اصل ہدف ہی مسلمان عورت، مسلم نوجوان اور خاندانی نظام ہے جن کا ہکا بکا ان کی کوششوں کی ترجیح اول ٹھہرا اور اس کے لیے جتنے دماغ اور سرمایہ خرچ کیا جا رہا ہے اس کے اثرات مسلم معاشرے پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہمارا میڈیا بھی اسی ایجنڈے پر عمل پیرا ہے اور خاندانی نظام میں پڑتی ہوئی دراڑیں اور نوجوان نسل کو طاؤس و رباب کا رسیا بنانا انہی ایجنڈوں کی تکمیل کا حصہ ہے.....!!!

ایسے میں حالات کی سنگینی کو محسوس کرنا اور مضطرب رہنا کسی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ باطل کی ان منظم کوششوں کے مقابلے میں ہماری اس تہذیبی کشمکش میں اپنے حصے کا کردار ادا کرنے پر صرف ہو رہا ہے۔ پروفیسر ثریا بتول علوی صاحبہ جو علمی حلقوں کا ایک معتبر نام ہیں قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے تیرگی میں اپنے حصے کی شمع جلانے کی سعی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھلائی کا کوئی کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا مگر اللہ کی توفیق سے اور نہ ہی کسی برائی سے بچا جاسکتا ہے مگر اللہ کی توفیق سے اور اس توفیق کا حاصل ہو جانا بجائے خود بڑی سعادت اور انسان کے خلوص کا مظہر ہے۔ یہ اللہ کا خصوصی فضل ہے کہ محترمہ ثریا بتول صاحبہ کو یہ توفیق، داعیہ اور عزم عطا فرمایا کہ انہوں نے یہ دقیق فکری کام سرانجام دیا جو یقیناً اسلام کے ساتھ ان کی محبت اور گہری وابستگی کی عملی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو ان کے لیے زادِ راہ بنائے، ان کی اس سعی جمیل کو قدر کی نگاہ سے دیکھے اور ہمیں دین کے لیے صحیح اتباع و پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ربنا آمین)

۲۰ فروری ۲۰۱۵ء

7۔ محمد طاہر نقاش:

یہ کتاب محترمہ ثریا بتول علوی کی ہے (جو کہ مولانا عبدالرحمن کیلانی مرحوم کی صاحبزادی ہیں) جو جہاں عورت کو موجودہ دور میں اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ہے وہاں ہی اسے جنت اسلام کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے آگاہ بھی کرتی ہے اور اسے یہ بھی بتاتی ہے کہ اس نے اسلام کی روشنی میں اپنے گھر کو کس طرح چلانا

ہے، کس طرح بچوں کی پرورش کرنی ہے اور کس طرح اس نے مغربی میڈیا کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک بہترین اور مجاہد نسل کو پروان چڑھانا ہے، تاکہ کفر کے منصوبے اور سازشیں اپنی موت آپ مر جائیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے آخر میں آزادی نسواں کے علمبردار ملکوں کی خواتین کا دل پذیر تذکرہ ہے کہ جنہوں نے مغربی مادر پدر آزاد معاشرہ کو خیر باد کہہ کر اسلام کے دامن عافیت میں پناہ لی اور پھر ان خواتین ہی کی زبان سے اسلام کے متعلق ان کے ایمان افروز تاثرات بیان کیے گئے ہیں، جن کے پڑھنے سے مغرب کے ”آزادی نسواں“ کے ڈسے ہوئے معاشرے کے خدوخال سامنے آتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ جو مقام اسلام نے عورت کو بخشا ہے وہ نہ تو کوئی دیگر مذہب دے سکتا ہے اور نہ ہی عصر حاضر کی انسانی حقوق اور آزادی نسواں کی علمبردار طاقتیں دے سکتی ہیں۔ بلکہ وہ تو اس کا عشر عشر بھی نہیں دے سکتیں۔ کتاب اس لائق ہے کہ ہر بہن، ہر ماں اور خاص طور پر سکولوں میں طالبات کو پڑھائی جاسکے، تاکہ ان کے ذہن ہموار ہوں اور وہ مستقبل میں ایک بہتر نسل کو کفر کے مقابلے میں کھڑا کر سکیں۔

ماہنامہ الدعویہ جون ۱۹۹۹ء

8۔ محترمہ عافیہ سرور صاحبہ:

تحریک آزادی نسواں نے جب مغرب سے نکل کر مشرق کا رخ کیا تو سب سے پہلی ضرب اسلام میں عورت کے حقوق پر لگائی۔ مسلمان معاشرے میں صدیوں کی کم علمی اور غلامی سے پیدا شدہ ظلم و ستم کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور ساتھ ہی اپنا ایجنڈا اروشاس کروایا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد معاشرے میں سیکولر اور لبرل خواتین نے پیش قدمی کی۔ وقت کے ساتھ این۔ جی اوز نے عورت کے حقوق کے نام پر عورت کی آدمی گواہی، وراثت میں آدھا حصہ، تعدد ازدواج، طلاق، خلع، ولی کی موجودگی، نفالت، مرد کی قوامیت، مساوات مرد و زن پر اپنا محاذ گرم کیا۔ اعتراضات کی اس دنیا میں ہم ”ویمن اینڈ میملی کیشن“ کے پلیٹ فارم سے باہر نکلے تو ثریا بتول علوی صاحبہ کی اس کتاب سے دوستی ہو گئی اور خوب ہو گئی۔

بیجنگ + نائیو کانفرنس کے بعد UNO کے ممبر ممالک کو نظام تعلیم، میڈیا، عورت کی سیاسی نمائندگی اور قانون سازی میں تبدیلی کروانے کے لئے اپنے ایجنڈے کو اسلامی ممالک میں نافذ کروانا تھا۔

ثریا باجی چونکہ شروع سے ہی شعبہ تعلیم سے وابستہ رہی ہیں۔ انہوں نے تعلیمی اداروں میں اس ایجنڈے کے نفاذ کے اثرات محسوس کیے۔ ان کی دینی حمیت نے انہیں قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ مسلمان عورت پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں وہ اپنا یہ حقیقی کام اس کتاب کی شکل میں سامنے لے کر آئیں۔ اس کتاب کے ہر باب کے آغاز میں قرآن و سنت کے مستند حوالوں کے ساتھ موضوع کی وضاحت کی۔ این۔ جی۔ اوز کی حقیقت، ان کے اعتراضات کا جائزہ، درپیش چیلنجز، ان کے مدلل جوابات اور اس کے بعد ہمارا کرنے کا کام کیا ہو، یہ سب نکات بغیر کسی مداہنت کے بہت ہی سادہ، آسان اور مدلل طریقے سے پیش کیے گئے ہیں۔

تبصرے

آج بھی وہ لوگ جو اسلام میں عورت اور خاندان کے حوالے سے یقین اور اعتماد کے ساتھ میدانِ عمل میں کھڑے ہیں۔ یہ کتاب ان کی انفرادی اور اجتماعی لائبریری میں موجود رہنی چاہیے۔ اور یہ صرف تحقیق کے معاملات میں رہنمائی نہیں دیتی بلکہ اس کتاب کے موضوعات کو پڑھنے سے سوچ و فکر کو غذا فراہم ہوتی ہے۔ روح یقین اور اعتماد سے سرشار ہو جاتی ہے۔ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے، تاکہ اصلاحِ معاشرہ اور دین کے صحیح تصور کو نئی نسل تک پہنچایا جاسکے۔ ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات کے جواب دیے جاسکیں۔

جزاک اللہ خیر۔ پیاری ثریا باجی، عمر کے اس حصہ میں آپ نے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کی فکر کی اور اس پر نظر ثانی کے بعد اپنے خیالات کو نئی نسل تک پہنچایا ہے۔ اللہ آپ کی اس کاوش کو صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین!

29 مارچ 2021

سابقہ چیئر پرسن ”ووین اینڈ فیملی کمیشن“ لاہور

9- ماہنامہ ترجمان القرآن، اپریل ۱۹۹۹ء

چند سال پہلے ثریا بتول علوی کی ایک معرکہ آرا تصنیف ”اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ“ منظر عام پر آئی تھی۔ اب زیر نظر کاوش میں انہوں نے جدید تحریک نسواں کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی جامع، مدلل اور بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ آزادی نسواں کے حوالے سے متجدد دین اور اسلام دونوں پہلوؤں سے گفتگو کی ہے۔ اسلام کی ہدایت کی روشنی میں وہ تمام پہلو زیر بحث آئے ہیں جو مغرب کے ناقدین اور ملک کے سیکولر اور برل حلقے کی نظر میں قابل اعتراض قرار پاتے ہیں، پھر ان کے بھرپور اور جامع جوابات دئیے گئے ہیں۔

ثریا علوی صاحبہ نے زیر نظر کتاب میں نہ صرف ستر و حجاب، نکاح، طلاق، مہر، خلع، تعدد ازواج اور عورت کی سربراہی وغیرہ جیسے مسائل پر قرآن و حدیث کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے امت مسلمہ کے لیے جو لائحہ عمل متعین فرمایا ہے وہ ہر اعتبار سے امت کے لیے نفع مند ہے، بلکہ دیت، شہادت، وراثت اور ولایت جیسے اہم اور نازک مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مصنفہ نے موجودہ حالات پر ان کو عہدگی سے منطبق بھی کیا ہے۔

کتاب مجموعی طور پر اسلامی نقطہ نظر سے ایک متوازن فریم ورک میں لکھی گئی ہے۔ اس کے ابواب، فہرست، مضامین اور عنوانات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کی جامعیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آغاز میں جدید نسوانی تحریکوں کا مغرب میں اور مسلمان ممالک میں مرحلہ دار ارتقا بیان کیا گیا ہے۔ بعد ازاں مرد و زن کے درمیان مساوات کے موضوع پر مغربی تہذیب اور اسلامی احکام کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مشہور زمانہ اسلام دشمن خواتین کانفرنسوں کا احوال، خواتین انکوائری کمیشن کی شرمناک سفارشات، اہل مغرب کی معاشرتی و اخلاقی تباہی اور پھر مصنفہ کے اپنے مشاہدات، تاثرات اور جذبات کا تذکرہ معلومات افزا بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ تحریر کی روانی، درد مندی اور اثر انگیزی پڑھنے والے کے ذہن پر ایک گہرا تاثر چھوڑتی ہے۔ آخری باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اب خود مغرب کے بنجیدہ دانشور اور پڑھے لکھے طبقے اسلام کی پر حکمت متوازن اور قابل عمل تعلیم کی حقانیت کے معترف ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں جن میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے۔ کتاب کے آخر میں چند اولوالعزم خواتین کے ایمان افروز تذکرے بھی شامل کیے گئے ہیں جس سے عورت کو اسلام کے عطا کردہ حقوق و فرائض کی افادیت واضح ہو جاتی ہے۔

محترمہ ربیعہ رحمان ماہنامہ ترجمان القرآن اپریل ۱۹۹۹ء، ص ۸۳

10- نوائے وقت ۱۴/۱۲/۱۹۹۹ء

ٹریا ہول علوی نے ”جدید تحریک نسواں اور اسلام“ کے نام سے یہ کتاب لکھ کر فرض کفایہ کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں خواتین کے بارے میں اسلامی احکامات کی وضاحت بیان کی گئی ہے اور دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ ایک صحت مند اور پاکیزہ معاشرہ کا قیام اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہی ممکن ہے۔ اس کتاب کے ۲۲ ابواب ہیں جن میں مہر، تعدد ازواج، مسئلہ طلاق، خلع کا حق، اسلام میں عورت کی نصف شہادت، نصف دیت اور نصف وراثت کے ابواب خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ کتاب کا دیباچہ مشہور سیرت نگار طالب ہاشمی نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب ہر اس شخص کے مطالعہ میں رہنی چاہیے جو اسلام کی روشنی میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ خواتین کے علاوہ مرد حضرات بھی اس کتاب سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

مصنفہ کا تعارف

محترمہ پروفیسر ثریا بتول علوی صاحبہ (پ 1947ء - کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ) نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم۔ اے عربی، بی۔ اے آنرز عربی، ایم۔ اے اسلامیات، بی ایڈ امتیازی نمبروں سے کیا۔ تمام تعلیمی کیریئر شاندار رہا۔ 1968ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔ اے عربی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ وہ گولڈ اور سلور میڈلسٹ ہیں۔

1975ء میں گورنمنٹ کالج برائے خواتین گوجرانوالہ سے اپنی سروس کا آغاز کیا۔ پھر لاہور میں ٹرانسفر کے بعد 1984ء میں گورنمنٹ کالج برائے خواتین سمن آباد لاہور میں اپنے تدریسی فرائض انجام دیے لگیں۔ 2007ء میں وہاں سے صدر شعبہ اسلامیات کی حیثیت سے ریٹائر ہوئیں۔

آپ کا علمی خانوادے سے تعلق ہے۔ آپ کے والد مولانا عبدالرحمن کیلانی مرحوم متوفی: (1995ء) ایک معروف عالم دین، ماہر خطاط اور 20 سے زیادہ مہتمم بالشان کتب کے مصنف تھے۔ تاج کمپنی کے بیشتر قرآن پاک آپ ہی کے موئے قلم کا شہکار ہیں۔ سعودی عرب کا شاہ فہد کمپلیکس، برصغیر پاک و ہند کے حجاج کرام اور عمرہ کرنے والوں کو جو قرآن پاک تحفہً دیتا ہے۔ وہ بھی مولانا عبدالرحمن کیلانی ہی کے موئے قلم کا شہکار ہے۔ ان کی معروف ترین تصنیف چار جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآن کریم ہے۔ جس کا نام ”تیسرا قرآن“ ہے۔ جو کتاب و سنت کے حوالوں پر مشتمل آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ آپ کے شوہر مولانا عبدالوکیل علوی ساری عمر ”ادارہ معارف اسلامی“ لاہور سے وابستہ رہے۔ 8 جلدوں میں لکھی گئی ”تفہیم الاحادیث“ کے مرتب اور ”سیرت سرورِ عالم“ کے شریک مرتب رہے ہیں۔

بچپن ہی سے محترمہ ثریا بتول کو علم دین کے حصول کا بہت شوق تھا۔ والد مرحوم نے ان کے شوق و ذوق کا بندوبست کیا۔ اس طرح انہوں نے مولانا عبدالسلام کیلانی مرحوم، مولانا ابوبکر سلفی حفظہ اللہ، اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی مرحوم جیسے مستند اور جید علمائے دین سے

کسب فیض کیا۔

پروفیسر صاحبہ سادہ مزاج ہیں۔ عام عورتوں کی طرح کپڑوں اور زیور کے شوق سے بے نیاز ہیں۔ وہ ریٹائر ہونے کے بعد اپنی وسیع لائبریری میں لکھنے اور پڑھنے میں مصروف رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ گھر میں بھی ساری عمر ”تدریس قرآن و حدیث“ کا کام کرتی رہی ہیں اور آجکل بھی یہ کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔

متعدد علمی رسائل میں مقالات لکھتی رہیں۔ 100 سے زائد ان کے مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ اور وہ خود 10 کتب کی مصنفہ ہیں۔

- 1 اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ، 1992ء، حراپبلی کیشنز، مکتبہ خواتین میگزین۔
 - 2 جدید تحریک نسواں اور اسلام، 1998ء، مکتبہ خواتین میگزین، منشورات خواتین کمیشن رپورٹ کا جائزہ، جنوری 2000ء منشورات
 - 3 حدود و قوانین اور رضوی کمیشن، جنوری 2005ء منشورات
 - 4 استاد ملت کا محافظ، اکتوبر 2005ء تنظیم اساتذہ خواتین پاکستان
 - 5 اسلام اور توہین رسالت، جون 2006ء، تنظیم اساتذہ خواتین پاکستان
 - 6 قیام پاکستان کے حقیقی عوامل، اگست 2008ء، تنظیم اساتذہ خواتین پاکستان
 - 7 ہماری بدلتی قدریں، اگست 2009ء، تنظیم اساتذہ خواتین پاکستان
 - 8 طرز زندگی میں تبدیلی لائیے، جون 2010ء، تنظیم اساتذہ خواتین پاکستان
 - 10 اربعین للنساء من احادیث المصطفیٰ ﷺ، ستمبر 2013ء، تنظیم اساتذہ خواتین پاکستان
- ان کی 4، 5 کتب زیر طبع ہیں۔

ہماری مطبوعات

- 1- استاد ملت کا محافظ _____ پروفیسر ثریا بتول علوی (تنظیم اساتذہ خواتین)
- 2- ہماری بدلتی قدریں _____ " " "
- 3- قیام پاکستان کے حقیقی عوامل _____ " " "
- 4- جدید تحریک نسواں اور اسلام _____ " " "
- 5- طرز زندگی میں تبدیلی لائیے _____ " " "
- 6- اربعین للنساء من احادیث المصطفیٰ _____ " " "
- 7- تحفظ ناموس رسالت: امن عالم کی ضمانت _____ " " "
- 8- حدود و قوانین _____ " " (منشورات، لاہور)
- 9- خواتین کمیشن رپورٹ کا جائزہ _____ " " "
- 10- اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ _____ " " (مکتبہ خواتین میگزین)

تنظیم اساتذہ پاکستان (خواتین ونگ)

تنظیم منزل 47 ایک پارک - 3 بہاول شیر روڈ مزنگ لاہور

فون: 042-8431969, 7117012